جنوری ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

طابع و مطبع	مقام اشاعت	ناشر
ملک محمد عارف	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	محمد اشرف ڈار
دین محمدی پریس لاہور	کلب روڈ ، لاہور	اعزازی معتمد

فون ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۶	جنوری ۱۹۸۳ ربیع الاوّل ۱۴۰۳	شمارہ ۱

ترتیب

تاثرات

نہایت افسوس ہے کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ کو رات کے گیارہ بجے جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری انتقال کر گئے۔ مرحوم کچھ عرصے سے بیمار تھے اور چند روز سے سروسز ہسپتال (لاہور) میں داخل تھے۔ ہسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حفیظ جالندھری برصغیر پاک وہند کے ممتاز اور نامور شاعر و ادیب تھے۔ نصف صدی سے زائد عرصے تک پورے برصغیر میں ان کی آواز گونجتی رہی اور اس خطہ ارض کے تمام گوشوں میں ان کو قبولیت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا۔ انھوں نے بیاسی برس عمر پائی اور اپنے فن پر عبور کی وجہ سے بھرپور ادبی زندگی بسر کی۔ وہ اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے اور بہر حال ان کو اس دنیا سے رخصت ہونا ہی تھا، تاہم بعض شخصیتیں اپنے کمالات کے اعتبار سے اس درجے اہم ہوتی ہیں کہ ان کی موت ایک بہت بڑا سانحہ قرار پاتی ہے اور اس سے لوگوں پر حزن و ملال کی کیفیت طاری ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ مرحوم حفیظ جالندھری کا شمار شعر و سخن کی دنیا میں اسی قسم کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کی وفات سے اردو شاعری کا ایک بہت بڑا دور ختم ہو گیا ہے۔

مرحوم نے نظم و نثر کی ترویج و اشاعت میں بہت کام کیا۔ وہ بے شک جسمانی طور پر اس دنیا کو چھوڑ گئے ہیں لیکن انھوں نے جو قلمی خدمات انجام دی ہیں، وہ انھیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گی۔ ان کے بہت سے کارناموں میں دو کارنامے ایسے ہیں جنھیں بجا طور پر لازوال کارنامے کہا جا سکتا ہے۔ ایک "شاہنامۂ اسلام" جو چار جلدوں پر محیط ہے اور دوسرے پاکستان کا قومی ترانہ۔ یہ دو وہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے ان کا نام اور فن قیامت تک زندہ رہے گا۔

حفیظ جالندھری کی موت ایک قومی المیہ بھی ہے اور شعر و سخن کا نقصان عظیم بھی۔ اس قابلیت کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین و احباب کو صبر جمیل سے نوازے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

رسالت محمدی کی وسعت و عمومیت

علم و دانش کی دنیا میں یہ حقیقت اب کسی بحث و تحقیق یا استدلال و اثبات کی محتاج نہیں رہی کہ ہمارا یہ نظام کائنات تطور و ارتقا کا مرہونِ منت ہے۔ عالمِ انسانیت بھی اسی نظام کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے تطور و ارتقا کے اسی قانون کے تابع ہے، وہ بھی عدم سے وجود میں آنے کے بعد قدرتِ ربانی اور ہدایتِ رحمانی کی روشنی میں ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ جس طرح ایک فردِ انسانی شکمِ مادر میں تطور اور ارتقا کے قانون کے مطابق تخلیقی مراحل طے کرتا ہے اور پھر مہد سے لحد تک ارتقائی منازل سے گزرتا ہے، اسی طرح اوّل الناس یعنی اولین انسان نے بھی ارتقا کی منزلیں طے کی ہوں گی۔ ابوالبشر حضرت آدمؑ مادرگیتی کے گہوارۂ خاک سے جسمِ فانی کے لباسِ فاخرہ سے مزین ہونے کے بعد ارتقائی منازل سے گزرے۔ یہ منازلِ ارتقا گہوارۂ جنت سے لے کر خلافتِ ارضی کا منصب سنبھالنے اور معمورۂ جہاں میں مشقت اور جد و جہد کی تھکا دینے والی مگر پُرعزم و پُرعمل زندگی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ آدم کی اولاد بھی اپنے ذہنی و فکری ارتقا میں کئی مراحل سے گزرتی رہی۔ انسانیت کے ذہنی ارتقا کا پہلا مرحلہ طفولیت کے مرحلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر تربیت و نشو و نما کے مراحل سے گزرنے کے بعد فکر و ذہن کی پختگی کا عہدِ شباب بھی آیا اور یوں انسانی تمدن و تہذیب کا قافلہ آگے بڑھتا رہا اور خلیفۃ اللہ کی اولاد خلافتِ ارضی کا بارِ امانت اٹھائے تسخیرِ کائنات کی راہ پر گامزن رہی۔ مگر یہ سب مراحل اللہ کی حکمتِ جاوداں اور ہدایتِ سرمدی کی ازلی و ابدی روشنی میں طے پاتے رہے۔

قرآن کریم کی رو سے خلافتِ ارضی کے منصب کا بارِ امانت اٹھانے کے ساتھ ساتھ الہام و القائے ربانی کا شرف بھی سب سے پہلے حضرت آدم ہی کو حاصل ہوا اور ان کے توسط سے اُن کی اولاد کے لیے جو پیغامِ الٰہی عام ہوا وہ یہ تھا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (الاعراف : ۳۵)

اے اولادِ آدم ! اگر تمھارے پاس تم ہی میں سے رسول آئیں (جو) میری آیات تمھارے سامنے بیان کریں تو جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا اور اصلاح کا کام کرے گا تو ان کو نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

علم و معرفت کی یہ روشنی جس کی بدولت آج انسان سمندروں اور پہاڑوں کا جگر چیرتے ہوئے گزر کر مہر و مہ کی تسخیر پر کمر بستہ ہے، تمدن اور تہذیب کی یہ رعنائیاں جنھوں نے کرۂ ارضی کو حسین سے حسین تر اور زندگی کو دلچسپ سے دلچسپ تر بنا دیا ہے یا فکر و ذہن کی یہ بلندیاں جو عظمتِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کا زینہ نظر آتی ہیں، یہ سب کچھ اسی سلسلۂ نبوت کا ثمرہ و نتیجہ ہے جو اس ارشادِ ربانی کے مطابق جاری ہوا تھا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ رسالتِ محمدی پر سلسلۂ نبوت کا اختتام وہ نقطہ ہے جو تاریکی و روشنی کے درمیان حدِ فاصل ہے، جہالت اور علم کے درمیان ایک ایسا فیصلہ کن لمحہ ہے جس کے بعد اجالا ہی اجالا ہے۔ اس نقطے پر آپ کی توجہ بعد میں مبذول کرائی جائے گی، سردست کہنے کی بات یہ ہے کہ قافلۂ انسانیت کی قیادت کا جو فریضہ انبیائے کرام کے سپرد ہوا تھا، اسی کے نتیجے میں انسانیت اپنے ذہن و فکر کے مختلف تکمیلی مراحل سے گزری ہے۔

انسانی قیادت و رہنمائی کا یہ سلسلۂ نبوت، جس کا روزِ ازل میں خالقِ ازل و ابد نے اولادِ آدم سے وعدہ کیا تھا اور اس وعدۂ ربانی کے مطابق انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کا سامان ہوتا رہا، قرآنِ مجید کی رُو سے ہر خطۂ زمین اور ہر قوم میں جاری و ساری رہا، ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (فاطر: ۲۴)

یعنی کوئی بھی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی نہ کوئی پیغامِ حق کے ذریعے ڈرانے والا ہادیِ برحق مبعوث نہ ہوا ہو۔

ایک اور مقام پر انسانی قیادت کے اس سلسلے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان یوں ہے:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد: ۷)

یعنی ہر قوم و نسل کے لیے کوئی نہ کوئی ہادیِ برحق اللہ کی طرف سے مبعوث ہوتا رہا ہے۔

قرآن کریم کے اس نظریۂ نبوت و قیادت کی رو سے دنیا کا کوئی خطہ یا قوم ایسی نہیں ہو سکتی جس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی نبی اور ہادیِ برحق مبعوث نہ کیا ہو۔ تاریخِ انسانی میں جہاں اور جب کوئی قوم یا انسانی گروہ آباد ہوا اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدۂ ازلی کے مطابق ان کی ہدایت و رہنمائی کا سامان فرمایا اور انہی میں سے ایک برگزیدہ و پاکیزہ ہستی کو منصب نبوت پر فائز کیا اور ان کی ہدایت و رہنمائی کا کام اسی کے سپرد کیا۔ ایک روایت کے مطابق ایسے نفوسِ قدسیہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوئی ہے۔ اس عدد سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ نبوت و قیادت کا یہ سلسلہ ہر خطے اور ہر قوم تک وسیع ہونا چاہیے۔

تاریخ ادیان و مذاہب اور قرآن کریم کے مطالعے سے یہ بات کسی شک و شبے کے بغیر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کیے جانے والے یہ نفوسِ قدسیہ صرف اپنی اپنی قوم کی رہنمائی کا فریضہ لے کر مبعوث ہوئے تھے۔ ان کی تعلیمات ایک محدود زمانے اور محدود لوگوں کے لیے تھیں۔ کسی نبی کی نبوت میں یہ اعلان نہ تھا کہ وہ سب کے لیے ہے اور تمام انسانوں یا ایک سے زیادہ اقوام کے لیے اسے مبعوث کیا گیا ہے۔ تاریخ انبیاء میں دو موڑ ایسے آئے ہیں جن کا انسانیت کی محفوظ و معلوم تاریخ میں واضح طور پر تذکرہ موجود ہے۔ یہ دو موڑ تھے نبوتِ موسوی اور نبوتِ عیسوی کا اعلان، اللہ کے ان دونوں اولوالعزم پیغمبروں نے تاریخ انسانی میں عظیم الشان اور اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان دونوں کے ماننے والے آج بھی اہم حیثیت و مقام کے ساتھ موجود ہیں، آئیے ذرا ان دو عظیم المرتبت نبیوں کے پیغامِ ربانی کی حدود معلوم کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پُرہیبت اور عظمت و جلال والے پیغمبر تھے۔ فرعونِ وقت کے سامنے جس عزم و استقلال اور ثابت قدمی و اعتماد کے ساتھ انھوں نے کلمۂ حق بلند کیا، اس کے متعلق قرآن مجید کی رُو سے وہ بنی اسرائیل کی نجات اور قیادت کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور فرعون سے ان کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۝ (الاعراف، ۱۰۵) (یعنی اولادِ اسرائیل کو تو میرے ساتھ بھیج دے)۔ تورات میں بھی نبوتِ موسوی کی حدود واضح طور پر متعین ہیں، چنانچہ کتابِ خروج کے باب سوم کے فقرات ۲ سے ۱۰ تک میں یوں بیان ہوا ہے،

" موسیٰ نے ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلے نکلتے دیکھے اور دیکھا کہ وہ بوٹا جل نہیں جاتا۔ وہ یہ دیکھنے

ہو گئے ہوئے۔ تب خدا نے جو نے لے ان سے پکارا: میں نے اپنے لوگوں کی تکلیف جو مصر میں ہیں یقیناً دیکھی
جو خراج کے محصلوں کے سبب سے ہے سنی اور میں ان کے دکھوں کو جانتا ہوں اور میں نازل ہوا ہوں کہ
انھیں مصریوں کے ہاتھ سے چھڑاؤں اور اس زمین سے نکال کے اچھی زمین میں جہاں دودھ اور شہد موج
مارتا ہے کنعانیوں اور حتیوں اور اموریوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کی جگہ لاؤں۔ اب دیکھ بنی اسرائیل کی
فریاد مجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری ان پر کرتے ہیں، دیکھا ہے، پس اب تو جا۔ میں تجھے فرعون کے
پاس بھیجتا ہوں، میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔"

کتابِ مقدس کے اس بیان سے نبوتِ موسوی کی حدود اور مقاصد واضح طور پر متعین ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید اور تورات کے بیان میں کوئی فرق نہیں، جہاں تک رسالتِ موسوی کا تعلق ہے تو اس کی حدود قرآن کریم اور تورات کی رو سے ایک سی ہیں۔ یعنی بنی اسرائیل کی پنجۂ فرعون سے رہائی اور رہنمائی۔ لیکن قرآن مجید اس معاملے میں تورات سے مختلف ہے کہ اللہ کی ذات کی ربوبیت اور رحمت صرف بنی اسرائیل یا کسی اور قوم تک محدود ہے، قرآن کی رو سے موسیٰ نے اللہ کو رب العالمین فرمایا اور اس کی رحمت کے متعلق فرمایا: وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف: ۱۵۶) (یعنی میری رحمت تمام کائنات کی ہر ہر شے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیے ہوئے ہے)۔

نبوتِ موسوی کے ساتھ ساتھ شریعتِ موسوی کو بھی صرف بنی اسرائیل کے لیے نوشتۂ ہدایت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ تورات کی کتاب استثنا کے تینتیسویں باب میں یوں آیا ہے کہ:

"موسیٰ نے ہم کو ایک شریعت دی جو یعقوب کی جماعت کی میراث ہو۔"

یہ تو تھا حالِ موسوی، اب ذرا حالِ عیسوی کا ملاحظہ ہو۔ حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام بھی حضرت موسیٰ کی طرح ایک صاحبِ شریعت نبی تھے۔ تمام انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کے بعد ان کا مقام ہے۔ قرآن مجید کی رو سے وہ بھی بار بار یہی اعلان فرماتے ہے کہ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ (الصف: ۶) کہ اے اولادِ بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ اور دوسرا کام یہ بیان ہوا ہے کہ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصف: ۶) یعنی ایک ایسے رسول کے آنے کی خوش خبری سنانے آیا ہوں جو میرے بعد مبعوث ہوگا اور اس کا اسم گرامی احمد ہوگا۔

قرآنِ مجید کے علاوہ انجیل مقدس سے بھی نبوتِ عیسوی کی حدود صرف بنی اسرائیل کی ہدایت تک سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انجیل متی کے پندرھویں باب میں ایک غیر اسرائیلی عورت کا ذکر ہے جو حضرت مسیح کی خدمت میں اپنی بیمار بیٹی کو لے کر حاضر ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اپنے اعجازِ مسیحائی سے اس کے دکھ درد کا علاج کر دیں، مگر حضرت مسیح نے اس غیر اسرائیلی عورت سے خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا تھا کہ: میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ پر وہ آئی اور اسے سجدہ کرتے ہوئے کہا: اے خداوند میری مدد کر، لیکن حضرت مسیح نے جواب میں فرمایا تھا: مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو پھینک دیں!

انجیل متی میں ہی یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت مسیح ناصری نے اپنے بارہ شاگردوں کو تبلیغ کے لیے روانہ کیا تو انھیں یہ نصیحت و ہدایت فرمائی تھی کہ: "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔"

قرآن مجید اور انجیل مقدس کے اس بیان کو ملا کر پڑھیے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جمالِ عیسوی صرف بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی ہدایت اور رکھوالی کے لیے تھا اور انھیں لڑکوں کی روٹی کتوں کو دینے کا حکم نہ تھا؛ وہ سلسلۂ نبوت کی وہ کڑی تھے جس کا ایک مقصد محدود نبوت کے سلسلے کی تکمیل اور جمال و جلالِ محمدی کی رحمۃ للعالمینی کی بشارت دینا بھی تھا۔

فکر و تحقیق نے اس نتیجے کا اعلان کر دیا ہے کہ شریعتِ موسوی میں تشدد اور سخت گیری تھی، اس لیے کہا جاتا ہے کہ جلالِ موسوی کا پرتو ایک سخت گیر قانون کا ظہور تھا جب کہ شریعتِ عیسوی میں بے حد نرمی اور سہولت ہے، اس لیے کہا گیا کہ جمالِ عیسوی کی خصوصیت ہی پُر امن عاجزی اور مشفقانہ سہولت ہے، لیکن رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام توازن اور اعتدال کا نظریۂ زندگی ہے جس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، سختی بھی ہے اور نرمی بھی؛ مگر نہ انتہائی نرمی ہے اور نہ انتہائی سختی ہے، بلکہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک توازن اور اعتدال کی راہ ہے، جس میں دوست و دشمن سے یکساں محبت کا حکم تو نہیں مگر دونوں سے یکساں عدل و انصاف کا حکم موجود ہے۔ دوست سے محبت تو ممکن العمل ہے مگر دشمن سے محبت ممکن العمل نہیں۔ ہاں دونوں کو عدل و انصاف کے طے شدہ اصولوں پر تولا جا سکتا ہے، اسی

لیے حکم ہوا کہ :

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ

(المائدہ ، ۸)

کسی قوم کی دشمنی تمھیں ناانصافی کے جرم پر آمادہ نہ کرنے پائے ، انصاف کرو ، یہی تقویٰ کے قریب ترین راستہ ہے۔

قرآنِ مجید میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو کسی خطے یا کسی قوم کے ساتھ مختص نہیں کیا گیا۔ آپ کو یہ حکم ہوا کہ اپنے عشیرہ اقربین یا قریب ترین رشتہ داروں کو ڈرائیں یا عرب کے لڑاکا اور جھگڑالو گروہوں کو راہِ ہدایت پر لائیں مگر یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو صرف قریشِ مکّہ یا اہلِ عرب کے لیے نبی مبعوث کیا ہے بلکہ آیاتِ قرآنی میں جہاں عرب میں نبوتِ محمدی کے ظہور کا ذکر ہے وہاں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ آپ صرف عرب کے لیے مختص تھے۔ عرب کے اُمّیوں کی رہنمائی آپ کا اوّلین فریضہ تھا کیوں کہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطبین وہی تھے، مگر جہاں اس کا ذکر آیا وہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کو اُمّیوں کی طرف مبعوث کیا ہے۔ (بعث الی الامیین) بلکہ کہا گیا کہ ہم نے آپ کو اُمّیوں میں مبعوث کیا، دونوں اندازِ بیان الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ آپ کا اُمّیوں میں مبعوث ہونا تو حقیقت واقعی ہے لیکن صرف اُمّیوں کی طرف مبعوث ہونا خلافِ واقعہ ہے۔ سورۃ الجمعہ میں ارشاد ہوتا ہے :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ق (الجمعہ : ۲)

یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے اُمیوں میں رسول بنا کر مبعوث کیا جو انھی میں سے ہے ، وہ انھیں آیات پڑھ کر سناتے ہیں۔ انھیں پاکیزہ بناتے ہیں اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں نبوتِ محمدی کو اہلِ ایمان کے لیے ایک احسان اور نعمت قرار دیا گیا ہے مگر یہاں بھی یہ تخصیص نہیں ہے کہ آپ صرف مومنین کے لیے رسول اور ہادی ہیں کیوں کہ آپ کی نبوت عام ہے اور تمام انسانیت کے لیے ہے ، جس میں مومن و کافر، ماننے والے اور نہ ماننے والے سب شامل ہیں ، قرآنِ مجید کے الفاظ ہیں

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ج (آل عمران : ۱۶۴)

یعنی بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر یہ احسان کیا ہے کہ ان میں ایک رسول مبعوث کیا ہے جو انہی میں سے ہے جو ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انھیں پاکیزہ بناتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

قرآن کریم کی ان دو آیات میں اس حقیقت واقعی کو تو بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے اُمّیوں میں پیدا ہوئے اور انہی میں رہتے ہوئے منصب نبوت پر فائز ہوئے۔ اسی طرح یہ مسلّم حقیقت بھی بیان ہوئی کہ آپ کی نبوت اہلِ ایمان کے لیے ایک عظیم احسان ربانی ہے اور یہ کہ آپ اہلِ ایمان میں مبعوث ہوئے لیکن یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ آپ کو عرب کے اُمّیوں یا مومنین کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن کریم دیگر انبیا کی نبوت و رسالت کا اعلان کرتے وقت "الی قومہ" کہتا ہے مگر نبوتِ محمدیؐ کے اعلان میں "الی الامیین" یا "الی المومنین" کے بجائے "فی الامیین" اور "فیھم" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ "الی" میں نبوت کی تخصیص ہو جاتی ہے مگر "فی" سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش اور موجودگی عرب میں تھی جو ایک تاریخی حقیقت ہے اور جس سے انکار بے معنی ہے۔

سورہ الاعراف ایک مکی سورت ہے۔ مکی دور کی سورتوں میں سے نبوت اور رسالت کے باب میں یہ سورت خاص اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ اس میں ان انبیا کا ذکر ہے جو مختلف زمانوں میں اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے رہے۔ ہر نبی کو الی قومہ (اس کی اپنی قوم کی طرف) کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر نبی کے منہ سے یا قوم (اے میری قوم!) کے الفاظ ادا ہوئے ہیں لیکن جب رسالتِ محمدیؐ کے اعلان کا وقت آتا ہے تو الفاظ بدل جاتے ہیں، اسلوب بیان بدل جاتا ہے اور آپؐ کو یوں حکمِ اعلان ہوتا ہے :

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا ۨ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج (الاعراف : ۱۵۸)

یعنی آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کے لیے

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے!

ناقدینِ ادب کے ہاں اکانومی آف ورڈز یا اقتصادِ لفظی ایک بہت بڑی خوبی ہے جو کسی اسلوبِ بیان کو امتیاز عطا کرتی ہے۔ قرآن کے اسلوبِ بیان سے بحث کرنے والے یہ جانتے ہیں کہ اس کا کوئی لفظ زائد نہیں اور کوئی لفظ بے موقع نہیں یعنی اگر کوئی لفظ اپنی جگہ سے مٹا دیا جائے تو بات ناقص اور ادھوری معلوم دے اور جو مقصد اس موقع پر بیان کرنا ہے وہ سمجھ میں نہ آسکے۔ اگر یہ بات ہے تو آیتِ کریمہ میں تین الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ ایک لفظ "ناس" ہے جو تمام افرادِ انسانی کے لیے بولا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی ابہام رہ سکتا ہے کہ شاید کچھ خاص لوگ مراد ہوں، چنانچہ اس کا ازالہ ایک دوسرے لفظ "جمیعًا" سے کیا گیا یعنی لوگ مگر سب! گویا اس میں استثنا کی گنجائش باقی نہ رہی، نسلِ انسانی کے تمام افراد اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن حق تعالیٰ علام الغیوب کو اب بھی ایک کمی معلوم تھی جسے ملک السموات والارض کے الفاظ سے دور کر دیا گیا یعنی جس طرح اللہ رب العالمین کی ربوبیت اور بادشاہت تمام جہانوں کے لیے ہے، اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و رحمۃ للعالمینی تمام جہانوں کے لیے ہے۔ رب العالمین کی ربوبیت اور رحمۃ للعالمین کی نبوت کی وسعت و عمومیت تمام جہانوں پر محیط ہے۔

قرآنِ مجید کی ایک اور مکی سورت ہے جو سورتِ سبا کے نام سے معروف ہے، نبوت کے مکی دور میں بہت پہلے نازل ہوئی تھی، اس سورت کی ایک آیت میں بھی رسالتِ محمدی کی وسعت و عمومیت کا اعلان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمام انسانیت کے لیے آپ کو بشیر و نذیر بنا کر مبعوث کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سبا: ۲۸)

یعنی ہم نے تو آپ کو تمام ہی لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر مبعوث کیا ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے!

اس آیت کے الفاظ میں "کافۃ للناس" کی ترکیب نہایت اہم ہے جس میں سے نسلِ

انسانی کے کسی فرد کا استثنا ناممکن ہے، جس جس فرد پر لفظ انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے وہ رسالت محمدی کا مخاطب ہے۔ "بشیر و نذیر" بنا کر مبعوث کرنا رسالتِ محمدی کی اس خصوصیت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ آپ کا پیغام توازن و اعتدال کا حامل ہے۔ اس میں جلالِ موسوی اور جمالِ عیسوی کا امتزاج ہے جو دینِ اسلام کو دینِ فطرت ہونے کا درجہ عطا کرتا ہے، جس میں انسانی فطرت کو متوازن و معتدل انداز میں ڈھالنے اور اس کی زندگی کے کسی پہلو کو فراموش کرنے کی اجازت نہ دینے کی تاکید ہے۔ آیت کے آخری الفاظ میں اس حقیقت کی پیشین گوئی ہے کہ جہالت و تاریکی رسالتِ محمدی کی وسعت و عمومیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے گی مگر حقیقت کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہمیشہ عیاں ہو کر رہتی ہے۔

رسالتِ محمدی کے مکی دور کے بالکل ابتدائی دنوں کی ایک اور قرآنی سورت ہے جو سورتِ انبیا کے عنوان سے مشہور ہے۔ اس سورت میں انبیائے سابقین کے منصب نبوت اور پیغامِ حق سنانے کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہ جد الانبیا موحد اعظم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نبوت کے مخاطبین بھی ان کی اپنی قوم ہی کے لوگ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی وسعت و عمومیت کا یوں اعلان فرمایا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیا : ۱۰۷)

یعنی ہم نے تو آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

قرآنِ کریم کی یہ آیت آپ سب کا وردِ زبان ہے۔ آپ اس کے معنی اور مفہوم پر بھی یقیناً غور فرماتے ہوں گے، اس لیے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جمالِ عیسوی کا اعجازِ مسیحائی اور شفقت صرف اسرائیل کے لڑکوں کے لیے تھی جسے دوسروں پر عام کرنا اللہ کے فرمان کی خلاف ورزی تھی مگر رسالتِ محمدی کی رحمۃ للعالمینی کا دائرہ تو تمام جہانوں کو محیط ہے۔ اس رحمتِ عامہ کی حدود تو عالمِ انسانیت سے تجاوز کر کے دیگر جہانوں کو بھی اپنے سایۂ عاطفیت میں لیے ہوئے ہیں۔

آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ یہ تمام آیات مکی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی کوشش ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مکی دور کے فلاں زمانے سے تعلق رکھتی ہے، اس

کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ معاندینِ اسلام اور یورپ کے مستشرقین یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت شروع میں صرف اہلِ عرب یا اہلِ مکہ کے لیے تھی اور یہ کہنا کہ آپ تمام انسانیت کے لیے ہادی اور رہنما ہیں بعد کی ایجاد ہے مگر آپ نے دیکھ لیا کہ یہ آیات مکی سورتوں میں آئی ہیں جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسالتِ محمدی کو صرف عرب تک محدود قرار دینا سراسر جہالت اور عناد کی پیداوار ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے منصبِ نبوت پر فائز فرماتے ہی آپ کو رحمۃ للعالمین اور کافۃ للناس نبی ہونے کا شرف عطا کیا اور آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اعلان فرمائیں کہ میں سب انسانوں کے لیے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس لیے صہیونیت پسند مستشرقین کا یہ خیال بھی باطل ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد یثرب کی بستیوں کے یہودیوں سے میل ملاپ کے بعد ان سے متاثر ہو کر رسالتِ محمدی کی عمومیت و شمول کا اعلان ہوا بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ مکی دور کی آیاتِ قرآنی میں تو تمام انسانیت سے خطاب ایک عام معمول کی چیز ہے جب کہ مدنی دور کی آیات میں اکثر و بیشتر خطاب جماعتِ مومنین سے ہے، اگرچہ اس دور میں رسالتِ محمدی کی وسعت و عمومیت اور ایک عالم گیر پیغامِ ہدایت ہونے کے قوی ترین شواہد بھی سامنے آتے ہیں۔

عرب قومی نخوت و غرور کے نشے سے چور تھے، قومی تفوق و تفاخر ان کا مرغوب ترین مشغلہ اور سب سے قیمتی سرمایہ تھا، لیکن سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ یا مبہم اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ آپ نے عربوں کے اس جذبۂ قومیت کی تسلی یا تسکین کی کوئی بات کبھی کی، بلکہ اس مذموم جذبہ تفاخر کو مسترد کر دیا اور ایسے عناصر کو دبا دیا جو اس کے مدعی یا آرزومند تھے۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں عربی زبان کی اہمیت کے ضمن میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ: عرب کا ایک بادیہ نشین نومسلم قیس بن مطاطہ مدینہ منورہ میں وارد ہوا، اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک حلقے میں تشریف فرما تھے، مہاجرین و انصار کے ساتھ حضرت صہیب رومی، سلمان فارسی اور بلال حبشی بھی موجود تھے۔ یہ دیکھ کر کہ عربوں میں غیر عرب کیوں ہیں، بدو کی رگِ قومیت پھڑک اٹھی اور کہنے لگا، ھذا الاوس والخزرج قد قاموا بنصرۃ ھذا الرجل فما بال ھؤلاء؟ کہ اوس اور خزرج کا تو آپ کی مدد کرنا سمجھ میں آتا ہے مگر یہ تین

غیر عرب یہاں کیا لینے آئے ہیں ؟ حضرت معاذ بن جبل بھی وہاں موجود تھے، بدو کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے اور عرض کیا کہ اس شخص پر عرب قومیت کا بھوت سوار ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غصے کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے، چادر زمین پر گھسیٹتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے، پھر اعلان ہوا کہ الصلاۃ جامعۃ وقت نماز ہے، آکر جمع ہو جاؤ۔ آپ منبر پر چڑھے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا :

ایھا الناس ! ان الرب رب واحد والاب اب واحد والدین دین واحد و ان العربیۃ لیست لاحدکم باب ولا ام انما ھی لسان فمن تکلم العربیۃ فھو عربی ۔

یعنی اے لوگو ! رب بھی ایک ہے۔ باپ بھی سب کا ایک ہے، دینِ حق بھی سب کا ایک ہے، رہی عربی زبان تو یہ تم میں سے کسی کی نہ ماں ہے نہ باپ، یہ تو بس ایک زبان ہے، اس لیے جو بھی عربی بولے گا وہ عرب ہی ہے !

اس کے ساتھ اگر خطبہ حجۃ الوداع، جو انسانی حقوق کی سب سے پہلی سرکاری دستاویز ہے، کے یہ الفاظ بھی اس واقعہ کے بعد پڑھ لیں تو رسالتِ محمدی کی وسعت و عمومیت کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :

ایھا الناس ! ان ربکم واحد وان اباکم واحد، کلکم لآدم وآدم من تراب ۔ اکرمکم عند اللہ اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقویٰ ۔

اے لوگو ! تمھارا رب ایک ہے، تمھارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے پیدا ہوئے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں معزز ترین وہ ہے جو تم میں سب سے بڑا متقی ہو، کسی عرب کو کسی غیر عرب پر کوئی فضیلت نہیں۔ سوائے تقویٰ کی وجہ سے !

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ٹھیک ہے رنگ و نسل کو آپ نے مذموم قرار دیا۔ قوم پرستی اور قومی تفاخر کو مسترد کیا مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے کبھی جزیرہ عرب سے باہر کے لوگوں سے براہِ راست خطاب کیا۔ انھیں اسلام کی دعوت تو نہیں دی، آپ کے یہ دونوں خطبات قومیت اور قومی تفاخر کے تو خلاف ہیں مگر ان سے غیر عرب انسانوں کو دعوتِ اسلام کا ثبوت نہیں ملتا، اس

سے رسالتِ محمدی کی وسعت و عمومیت واضح طور پر ثابت نہیں ہوتی!

لیکن نہیں! اس کا ثبوت موجود ہے۔ ذرا چشمِ تصور سے چودہ صدیاں پیچھے مڑ کر دیکھیے، فتح مبین حاصل ہو چکی ہے۔ جزیرۂ عرب دعوتِ اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکا ہے، خدا کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منصبِ تبلیغ کا حصہ مکمل کر چکا ہے۔ اور اللہ کی بارگاہ سے وصالِ حق کا پیغام بھی مل چکا ہے۔ رفیقِ اعلیٰ سے ملاقات کے لیے روحِ محمدی بے قرار ہے، مدینہ کی اسلامی حکومت ابھی نوزائیدہ بچہ ہے کسی طاقت سے ٹکرانے کی ظاہری و مادی صلاحیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر رسالتِ محمدی نے ابھی تمام انسانیت سے خطاب کرنا ہے، چنانچہ داعیٔ حق اللہ کے حکم سے اس وقت کے دنیا کے تمام بادشاہوں کے ذریعے تمام عالمِ انسانیت سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ہر بادشاہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسلم تسلم! مسلمان ہو جاؤ سلامت رہو گے! اور اگر انکار کیا تو تمھاری قوم کے کفر و عصیان کی ذمے داری بھی تمھاری گردن پہ ہو گی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسے نازک موقع پر اور ناموافق حالات میں اس وقت کے دو ہیبت ناک جابر بادشاہوں یعنی روم اور ایران کے شہنشاہوں کو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کی دعوت دینا کوئی معمولی بات تھی؟ مگر یہ حکمِ ربانی تھا، قدرت کا منشا تھا، رسالتِ محمدی کی وسعت و عمومیت کا تقاضا تھا کہ بارگاہِ ربانی میں حاضری سے پہلے تمام انسانیت تک دعوتِ اسلام پہنچا دی جائے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نبوت کا آغاز محدود دائروں کی شکل میں ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ دائرے سمٹ کر ایک دائرے کی شکل اختیار کر گئے۔ انسانیت کا ذہنی شعور جیسے جیسے ترقی کرتا رہا، علم و معرفت کی روشنی عام ہوتی گئی، اسی قدر پیغامِ ربانی کا طریقہ بھی بدلتا رہا، حتّٰی کہ رسالتِ محمدی کی وسعت و عمومیت کے دائرے نے سب کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ سب انبیائے کرام کی تصدیق ہو گئی۔ سب کی تعلیمات کا مرکز ایک ہی بتا دیا گیا کہ آدم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک نبوت کے توسط سے جو پیغامِ حق انسانوں تک پہنچتا رہا، اس کا نقطۂ مرکزیت ایک ہی تھا، سب توحید کے داعی اور ایک ہی دینِ حق کی تبلیغ کے لیے آتے رہے، جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ پرائمری سے تعلیم کا آغاز

ہوتا ہے، یونیورسٹی پر مکمل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انبیائے سابقین اپنے اپنے مکاتب کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی کرتے رہے جس کی تکمیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو گئی۔ آپ کی آمد سے دنیا میں علم اور آزادی کا اجالا ہو گیا، اس کے بعد اندھیارے چھٹتے چلے گئے اور روشنی عام ہوتی چلی گئی، انگریز مستشرق نکلسن کے الفاظ ہیں:

with the appearane of Muhammad (peace be upon him) the almost impenetrable veil thrown over the preceding age is suddenly lifted and we find ourselves on the solid ground of historical tradition.

اللہ نے ازل میں اولادِ آدم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کی آخری کڑی کا وقت آ گیا۔ قدرت کا نظامِ ہدایت تکمیل کو پہنچا۔ پہلے نبیوں کی تعلیمات ایک وقت کے لیے تھیں اس لیے محفوظ نہ رہیں، رسالتِ محمدی تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لیے تھی، اسی لیے یہ جامع اور مکمل شکل میں محفوظ ہو گئی۔ یہاں سے آپ کو ختمِ نبوت کی حکمت بھی معلوم ہو گئی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قرار پائے کہ ان پر وہ روشنی مکمل ہو گئی جو خلافتِ ارضی کا کام چلانے کے لیے حضرتِ انسان کو درکار تھی۔ اب علم حاصل کرنا سب کا فرض ٹھہرا، علم اور سائنس پر کوئی پابندی نہ رہی اور ساتھ ہی انسانیت کو ایک جامع و مکمل ضابطۂ حیات بھی مل گیا۔

اس کائنات کی وسعتیں بے انتہا ہیں اور اس کی حدود انسانی عقل و فہم سے برتر و ماوراء ہیں، انسانی ذہن کی قوت فکر کی وسعت و گیرائی کی جہاں انتہا ہوتی ہے وہاں سے قدرتِ ربانی کے اس پُر ہیبت کارخانے کی ابتدا ہوتی ہے۔ کائنات کی یہ وسعتیں خالقِ کائنات کا اعجاز پیش کرتی ہیں۔ اس وسعتِ اعجاز پر خالقِ کائنات کو فخر بھی ہے اور اس نظامِ کائنات کی ان وسعتوں اور حقیقتوں کا علم بھی صرف وہی رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کا فرمان واجب الاذعان ہے:

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ (المدثر، ۳۱)

تیرے پروردگار کے عجائب مخلوقات کو صرف وہی جانتا ہے۔

اس میں اشارہ اس بات کا ہے کہ کائناتِ فطرت کی روح دراصل وسعت و عمومیت ہے، فطرت کو وسعت و عمومیت پسند ہے، ایسی وسعت و عمومیت جو دائرۂ حدود سے باہر ہو، جو تنگی و تحدید سے آشنا نہ ہو، فطرت کو تنگی اور تنگ نظری سے نفرت ہے، اس لیے فطرت کے اس وسیع نظامِ کائنات میں بقا اور دوام صرف اسے حاصل ہو سکتا ہے جو وسعت کو قبول کرے، اس لیے رسالتِ محمدیؐ کو اللہ تعالیٰ نے یہ وسعت اور عمومیت اس لیے دی ہے کہ اسے بقا اور دوام بخشنا مقصود تھا۔ اسلام کی بنیاد وسعت آشنا ہے، اس کی تعلیمات کا غالب پہلو وسعت اور عمومیت ہے، ان کی رو سے مومن تو مومن کا بھائی ہے ہی، انسان بھی انسان کا بھائی ہے۔ سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، سب یکساں طور پر قابلِ عزت و احترام ہیں، سب ایک دوسرے کا درد بٹانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اسی جذبۂ انس و ہمدردی نے تو انسان کو انسان کے لقب سے نوازا!

انسان کے تمام دکھ درد کا خلاصہ صرف دو باتیں ہیں، گزشتہ زمانوں میں بھی انسان کے یہی دو مسئلے تھے، آج بھی یہی دو مسئلے ہیں اور کل بھی اس کرۂ ارضی پر انسان کے اصل مسئلے دو ہی رہیں گے۔ ایک آزادی کی زندگی اور دوسرا زندہ رہنے کا سامان! یا دوسرے لفظوں میں غلامی اور بھوک انسان کے لیے دو مشکلات ہیں۔ رسالتِ محمدیؐ ان دو مشکلوں کو حل کرنے کو انسان کی کٹھن ذمے داری اور بنیادی فریضہ قرار دیتی ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ (البلد ۱۰-۱۴)

ہم نے انسان کو دو مشکل راستے دکھا دیے مگر وہ مشکل گھاٹی میں نہ کود سکا، تجھے معلوم ہے وہ مشکل یا کٹھن گھاٹی ہے کیا؟ غلاموں کو آزاد کرانا اور بھوک والے دن کھانا کھلانا!

اگر آپ کرۂ ارضی پر بسنے والی انسانیت پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ آج کی دکھی انسانیت یا تو آزادی چاہتی ہے، ہر قسم کے ظلم و تسلط اور استحصال و محکومیت سے آزادی اور یا پھر وہ افلاس و احتیاج اور بھوک سے نجات حاصل کر کے خوش حالی اور سکون کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ قرآن کے مطابق یہ دو کام ہر انسان کا پیدائشی و بنیادی فریضہ بھی ہے اور حق بھی، حقیقت وہ قرآن کریم کہتا ہے کہ ان سے ہی حقیقی سکھ اور چین والی زندگی میسر آ سکتی ہے۔

رسالتِ محمدی کے پیغام برحق میں کہا گیا تھا کہ الخلق عیال اللہ یعنی مخلوق تو اللہ کا کنبہ ہے۔ کسے معلوم تھا کہ دنیا سمٹ کر ایک دن ایک کنبہ ہی بن جائے گی؟ مگر دنیا آج ایک ہی خاندان کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ وقت اور مسافت کے فاصلے مٹ گئے ہیں، سارا کرۂ ارضی ایک گھر نظر آتا ہے، جس کے مکین ایک خاندان کے افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ افراد ایک ایسے نظامِ حیات کے طالب ہیں جو اس گھر کو ابتری و بدنظمی سے بچائے، سکون اور خوش حالی کو عام کر دے تاکہ دنیا میں صلح و امن اور تحمل و بردباری کے ساتھ بلند اخلاق کا دور دورہ ہو جائے، اس گھر کو ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو تمام افرادِ خاندان کو ایک ہی لڑی میں پرو دے تاکہ وہ باہم شیر و شکر ہو کر منشائے ربانی کے مطابق زندگیاں بسر کر سکیں۔ ایسا نظامِ حیات رسالتِ محمدیؐ میں پیش کیا گیا ہے جو اپنی وسعت و عمومیت کی بنیاد پر نسلِ انسانی کو وحدت کی لڑی میں پرو سکتا ہے اور اسلامی اخوت ایک ایسا رشتہ پیش کرتی ہے جس سے آدم کے تمام بیٹے عزت و احترام کے ساتھ سکھ چین کی خوش حال زندگی گزار سکتے ہیں، مشہور مستشرق جے ایس ہوئے لینڈ بھی اسی نتیجہ پر پہنچا تھا۔

"Islam inculcated a solid and practical spirit of brother-hood and equality. The fellow feelings of the Muslims, from Morocco to China, whatever their race or colour, language or nationality, is a great object lesson to the man kind in the possibility of a universal brother-hood based on spiritual ideals!

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

ایک زائرِ بیت اللہ کے تاثرات

بیت اللہ کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہونے والی تھی۔ جہاز زمین سے کئی ہزار میٹر کی بلندی پر بجانب حجاز محو پرواز تھا۔ جہاز اور زمین کے درمیان سفید اور سنہرے بادلوں کی ایک دبیز تہہ حائل تھی۔ ایک ایسا مقام جس کا نام ہم سب انتہائی ادب اور احترام سے لیتے ہیں، آنے والا تھا۔ دل میں جس شہر کی والہانہ محبت ہے، جس کی طرف تمام عمر منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، وہ شہر جس کے دامن میں اسلام پروان چڑھا، جس علاقے کے ریگ زاروں، پہاڑوں اور جس کی فضاؤں نے اسلام کے فدائین کو اسلام کی سربلندی کے لیے سرگرم دیکھا، اب میری گنہگار آنکھیں اس شہر کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ مگر ابھی بہت دیر تھی۔ تھک کر جہاز کی آرام دہ کرسی پر سر ٹکا لیا۔ ذہن بہت اونچی پرواز کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے دور نکل گیا۔ چشمِ تصور نے خانہ کعبہ کو دیکھا اور چار ہزار پرانی تاریخ کے باب کھل گئے ــــ تاریخ و سیر کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق فرشتوں نے بیت المعمور کے نمونے پر خانہ کعبہ کی موجودہ جگہ پر بنیاد رکھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی، حضرت جبریل نے حجرِ اسود نصب کیا۔ حضرت آدم کا تیار کردہ بیت اللہ حضرت نوح علیہ السلام کے وقت تک رہا۔ پھر سیلابِ نوح کی وجہ سے منہدم ہوگیا اور صرف ایک ٹیلہ رہ گیا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے دوبارہ اسی جگہ بیت اللہ کی تعمیر کی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پتھر اور گارا دیتے جاتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کو نصب کرتے جاتے اور فرماتے جاتے:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراہیم: ۳۷)

اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے زراعت میدان میں آباد کر دیا ہے، تیرے

معظّم گھر کے قریب (یہ اس لیے) اے ہمارے پروردگار کہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں، سو تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں کھانے کو پھل دے، جس سے یہ شکر گزار رہیں۔

اس وقت اس عمارت کے دو دروازے تھے اور چھت نہیں تھی۔ اس تعمیر کے بعد ایک صدی کے اندر یہ عمارت پھر منہدم ہو گئی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے سسرالی عزیزوں (بنی جرہم) نے پھر اس کی تعمیر کر دی۔ یہ تعمیر دوبارہ سیلاب کی نذر ہو گئی۔ تب مصر کے حکمران عمالقہ نے اس عمارت کی مضبوط تعمیر کرائی، مگر چوں کہ چھت نہیں تھی لہٰذا پانی بھر جانے کی وجہ سے پھر منہدم ہو گئی۔ اہلِ قریش نے ہر چند مرمت کرائی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایک مرتبہ آتش کی نذر ہو گئی۔ اب عملاً قسم کی چھت ڈالنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی مشاورتی کمیٹی میں تھے۔ مناسب لمبائی کے شہتیر نہ مل سکے، اس لیے سب کے مشورے سے عمارت کی لمبائی شمالی جانب سے کم کر دی گئی اور جو حصہ کھلا چھوڑ دیا گیا، وہ "حطیم" کہلایا جو آج تک موجود ہے۔ ۶۴ھ میں عبد اللہ بن زبیر نے اہلِ قریش کی عمارات کو شمالی جانب سے گرا کر دوبارہ حضرت ابراہیم کی اصل بنیادوں پر تعمیر کرایا اور آمنے سامنے دو دروازے قائم کر دیے۔ اموی دورِ حکومت کے مشہور کارپرداز حجاج بن یوسف نے اپنے دورِ اقتدار میں پھر شمالی دیوار گرا کر اہلِ قریش کی بنیادوں پر کعبے کی دیوار تعمیر کرا دی جس میں غربی دروازہ بند کرا دیا۔ گیارھویں صدی میں یہ عمارت پھر خستہ ہو گئی، تب سلطان مراد نے از سرِ نو اہلِ قریش کی بنیادوں پر عمدہ مصالحے سے خانہ کعبہ کی تعمیر کرائی جو آج تک قائم ہے۔ میں ان ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے میری رفیقۂ حیات نے یہ کہہ کر چونکا دیا "جہاز سرزمینِ حجاز پر اتر رہا ہے" ادھر مسافروں میں ہلچل مچ گئی اور جہاز لبیک اللھم لبیک کی صداؤں سے گونجنے لگا۔

جدہ کے ہوائی اڈے پر امیگریشن اور کسٹم کے جھمیلوں سے جان چھڑا کر ہوش میں آئے تو خود کو سنبھالا اور محسوس کیا کہ ہم ارضِ مقدس میں آ چکے ہیں۔ ایک مدت سے جس سرزمین کو دیکھنے کی بے تاب اور بے قرار نگاہیں منتظر تھیں اور دل مضطرب تھا، وہاں آن پہنچے، یہ خیال آتے ہی نفل ادا کیے۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے تیرا

مختلف بازاروں سے گزر کر ایک عظیم الشان اور باوقار عمارت کے سامنے جب اُترے تو معلوم ہوا کہ یہی حرم شریف ہے۔ بے چین نگاہوں نے بے قراری سے ادھر ادھر دیکھا، تجسس تھا کہ وہ مقامِ عالی قدر کہاں ہے جو ہمارا کعبہ ہے، قبلہ ہے۔ بیرونِ حرم نظر نہیں آتا۔ باب عمرہ سے بسم اللہ کرکے اندر داخل ہوئے۔ دل کی عجب کیفیت تھی۔ ابھی چند قدم آگے بڑھے تھے کہ سامنے خداوندِ قدوس کا وہ گھر تھا جو حضرت خلیل اللہ اور ان کے بیٹے نے بنایا تھا، ہم سکتے میں آگئے۔ رعب، جاہ و جلال، عظمت و موعظت نے زبان گنگ کردی۔ روشنیوں سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ یہاں تمام افراد ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی طرح کے انداز و والہیت کے ساتھ ایک ہی دھڑکن اور لگن کے ساتھ خلیل اللہ اور حبیب اللہ کی سنتِ جاریہ پر عمل پیرا تھے۔ یہی وہ مقام ہے جو عالمِ اسلام اور امتِ مسلمہ کی یکسوئی اور یک جہتی، وحدت اور اتحاد کی علامت ہے۔ جسے سورۂ آل عمران میں ہدایت کا سرچشمہ بتایا گیا ہے، جو اس گھر میں داخل ہوگیا وہ امن میں آگیا۔ یہ سوچ کر صحنِ کعبہ میں قدم رکھا۔ نگاہ نیچی، انتہائی عجز و انکساری میں اللہ جل شانہٗ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور وہ ربِ جلیل مجھے دیکھ رہا ہے۔ ذہن کی عجب کیفیت ہوگئی۔ آنکھیں پھٹی پھٹی، دل کی دھڑکن تیز تر، تمناؤں کا ہجوم، ہیبتِ کعبہ سے قدم بوجھل ہوگئے۔ اعضا میں اعتدال نہ رہا۔ کہاں میری روسیاہی اور کہاں اللہ کے حضور حاضری۔ اپنی سیاہ کاریوں اور گناہوں کو کاندھے پر اٹھائے آگے بڑھا، پھر رکا کہ خوف و شرم سے قدم نہ اٹھتے تھے۔ یک دم دل و دماغ پکارنے لگا، رکتے کیوں ہو؟ ڈرتے کیوں ہو؟ اگر تو گناہوں کے سمندر میں غرق ہے تو بخشنے والا بھی رحیم ہے اور غفار ہے۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ حرم شریف میں زیادہ ہجوم نہ تھا۔ میں اور میری اہلیہ دوڑ کر مقامِ ملتزم پر خانہ کعبہ کو چمٹ گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رحمتِ خداوندی منتظر تھی۔ نامعلوم کتنی دیر آنسوؤں کا سیلاب رواں رہا۔ مغفرت کی التجائیں ہونٹوں سے نکلتی رہیں۔ زبان اور ہونٹوں کے تعاون سے جس قدر دعائیں یاد تھیں، بارگاہِ ایزدی میں پیش کردیں۔ دل کو قدرے سکون ملا۔ کانپتے ہوئے جسم سے خوف اور ندامت قدرے دور ہوئی تو حجرِ اسود کے مقامِ مقدس سے طواف شروع کیا۔ طواف میں ہر شخص کے بشرے سے انتہائی تضرع، انکساری، ادب اور خشوع عیاں تھا۔ نہ یہاں

مرد کوچہ گرد کی تمیز تھی اور نہ مسند نشین بلند بام کی۔ نہ صاحبِ ثروت و حشمت کے لیے الگ طواف، نہ شاہ و گدا کا امتیاز، نہ عربی و عجمی کی تفریق، نہ ذاتی شان و شکوہ کا رعب۔ طواف کی تکمیل پر نوافل ادا کیے اور زم زم سے تشنگی قلب و ذہن کو دور کیا اور سعی بین الصفا و المروہ شروع کر دی۔

سعی بین الصفا و المروہ کی ماہیت اور اسرار پر نظر ڈال کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ایک عفیفہ ماں اور اس کے بیٹے کی ابدی یادگار کو تازہ رکھنے کے لیے سعی ضروری ہے۔ دوسری طرف اس سعی کے ہر قدم پر بندگی کی تصویر ابھرتی ہے۔ جیسے جاں باز سپاہی اپنے حاکم کے تابع فرمان میدانِ جنگ میں جاتا ہے۔ ان جذبات کو سمجھنے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کی ہیئت ہی سب کچھ بتا دیتی ہے۔ لاکھوں احرام پوش، کفن بر دوش، منظم اجتماعیت کا مظہر بنے ہوئے ہیں اور اس گروہ کی تمام سعی ایک طرف تو دین کی نصرت و سربلندی کے لیے وقف ہے اور دوسری طرف اس عزم بالجزم کا سنگِ میل کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کا راستہ ہی ہمارا راستہ ہے اور اس پر چلنے کے لیے ہم ثابت قدم رہیں گے۔

اس کے بعد حطیم میں نوافل ادا کیے۔ تمام رات انوار و تجلیات کی بارش ہوتی رہی۔ تہجد کی اذان ہوئی اور پھر فجر کی۔ لوگ انتہائی سرور کے عالم میں اپنے رب کے گھر کے سامنے تسبیح و تہلیل میں معروف رہے۔ نظریں کعبہ شریف سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔ یہاں کی ایک نگاہ میں اہلِ نظر کے لیے اَن گنت تقدس کے پہلو مضمر ہیں۔

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

صبح کا منظر بھی عجب کیف پرور تھا۔ غلافِ کعبہ کی کشش ایسی کہ کیا مجال کہ نگاہ کسی اور طرف چلی جائے۔ اس پر اسمائے حسنہ اور آیاتِ قرآنی کارچوب سے تحریر ہیں۔ شمالی جانب حطیم میں بندگانِ ربِ جلیل سجدہ ریز ہیں۔ کبھی یہ جگہ خانہ کعبہ کے اندر تھی۔ قریشِ مکہ کی تعمیر میں عمارت کو مسقف کرنے کے لیے یہ جگہ کھلی چھوڑ دی گئی۔ یہاں نماز پڑھنا کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کے مترادف ہے۔ یہاں خانہ کعبہ کی چھت پر سے ایک پرنالہ گرتا ہے، جسے میزاب رحمت کہتے ہیں۔ چاروں جانب جو جگہ ہے، مطاف کہلاتی ہے۔ فرش سنگِ مرمر کا ہے، کہیں کہیں سنگِ سیاہ و سرخ کی آمیزش ہے۔ قدیم مطاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بہت کم تھا۔

مگر حضرت عمر فاروق اور عثمان رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں قرب و جوار کے مکانات خرید کر حرم میں داخل کر دیے گئے تھے۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً توسیع ہوتی رہی۔ صحن کے اختتام پر تہرے چوہرے دالان اندر دالان ہیں۔ ڈاٹ دار چھتیں، کشادہ محرابیں، بلند ستون، دو منزلہ عمارت ہے۔ پچی کاری کے نادر نمونے چھتوں پر مرصع ہیں۔ ہر طرف ٹھنڈے پانی کے کولر بھرے ہوئے ہیں بقایہ کا اس قدر عمدہ انتظام کہ کسی وقت بھی پانی کی کم یابی نہ تھی۔

میرے عزیز امجد صاحب مدینۃ المنورہ میں اور برخوردار سلیم اختر صاحب مکہ معظمہ میں مقیم ہیں اور جدہ میں ملازمت کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے لیے اپنی ائر کنڈیشنڈ قیام گاہوں میں طعام قیام کا اعلیٰ بندوبست کر رکھا تھا اور اپنی کاریں مستقل طور پر ہمارے حوالے کر دی تھیں۔ ان مراعات اور سہولتوں کی وجہ سے ہم مناسکِ حج احسن طریقے سے ادا کرنے کے ساتھ تمام مقاماتِ مقدسہ و زیارات سے خوب فیض یاب ہوئے جو کہ بالعموم دورانِ حج ممکن نہ تھیں۔

امجد صاحب کی کار میں ہم ناشتے کے بعد مدینہ طیبہ کو روانہ ہوئے۔ ظہر کے قریب میدانی علاقہ ختم ہو گیا اور پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہی پہاڑیوں میں ایک مختصر سی وادی میں زندگی کے عجیب و غریب آثار نظر آئے، معلوم ہوا کہ یہ مقام بدر ہے۔ مدینہ شریف ہنوز ۱۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور یہ مقام مکہ اور مدینہ کی شاہراہ پر سرِراہ واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ تجارتی قافلوں کی جولاں گاہ رہی تھی۔ بحیرۂ احمر یہاں سے صرف دس کلومیٹر پر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ دور دور تک میدان سنگلاخ ہے اور کہیں کہیں ریتلا ہے۔ آبادی سے گزر کر مسجد عریش پہنچے جہاں ۱۲ رمضان المبارک ۲ھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیمپ لگایا گیا تھا۔ اس مسجد کی اوّل تعمیر حکومتِ مصر کے مہتمم جوش قدم نے ۲۱ ربیع الاوّل ۹۰۶ھ میں کرائی جب کہ مصر کے حکمرانوں میں سے برجی مملوک حکمراں تھا۔ یہاں ایک میدان میں شہدائے بدر کی یادگار میں ایک قطعہ زمین پر لوہے کے پائپ سے نشان لگا دیے گئے ہیں۔ وہاں دعا کی اور مسجد العریش میں نوافل ادا کیے۔ یہی مقام بدر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کی اوّلین امتحان گاہ بنایا۔ حق کو ظاہری وسائل و اسباب کی کمی کے باعث بھی کامرانی سے سرشار کیا۔ قرآن پاک میں اس جنگ کا صراحت سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ باطل کو اپنے ساز و سامان، آلاتِ حرب و ضرب کی کثرت اور افرادی

قوت کے باوجود ذلت و نامرادی نصیب ہوئی اور اس جنگ کے بعد صرف سات سال کے اندر حالات نے جو پلٹا کھایا وہ بالکل واضح ہے۔

جس قدر مدینۃ المنورہ قریب آتا جا رہا تھا اسی قدر جذبۂ شوق و اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ آقائے دوجہاں کی آرام گاہ کے دیدار کا شوق ماہیِ بے آب کی طرح تڑپا رہا تھا۔ درود و سلام وردِ زبان تھا۔ ذوالحلیفہ کا مقام آیا تو یاد آیا کہ سرورِ کائنات نے یہاں سے احرام زیب تن فرمایا تھا۔ یہاں سے مدینہ منورہ چھ میل کے فاصلے پر ہے، ارادہ ہوا کہ یہاں سے ننگے پاؤں چلا جائے۔ مگر اب تو نہ وہ راستے ہیں نہ وہ پگڈنڈیاں، جہاں سے شاہِ کونین کی سواری گزرتی ہوگی۔ ان کی جگہ کشادہ و عریض شاہراہیں دکھائی دے رہی ہیں۔

عصر کے وقت انتہائی ادب و تعظیم کے ساتھ مدینۃ الرسول میں داخل ہوئے۔ یہاں کا چپہ چپہ قابلِ احترام ہے۔ جی چاہتا ہے کہ قدم قدم پر سجدہ کرتے چلیں۔ مگر شوقِ زیارت کشاں کشاں لیے جاتا تھا۔ یہ سامنے روضہ مبارک آ گیا۔ گنبدِ خضریٰ ترکی حکومت کی عظمت و محبت اور سلطان محمد بن عبدالحمید کی عقیدتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار ہے۔ پُرنور نظارے نے اپنی جانب مائل کر لیا۔ چشمِ پُرنم سے دیکھتے رہے۔ ہونٹ کپکپاتے رہے، دل دھڑکتا رہا۔ سلام و درود سے کچھ سکون میسر ہوا تو عقل نے یارا کیا۔ ۶۷۸ھ تک حجرۂ مبارک پر کوئی گنبد نہ تھا۔ اوّلاً اس عمارت پر لکڑی کا ایک قبہ بنایا گیا۔ اس کے بعد ۸۹۲ھ میں سلطان ترکی قائتبائی نے پنج گوشہ دیوار پر ایک مضبوط پتھر اور اعلیٰ مصالحے سے ایک گول گنبد تعمیر کرایا، جس پر جستی چادر چڑھا دی گئی۔ ۱۲۲۳ھ میں سلطان محمد بن عبدالحمید نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا جو موجودہ شکل میں موجود ہے۔ اس پر گہرا سبز رنگ کرایا گیا اور جب سے اس کا نام گنبدِ خضریٰ پڑ گیا۔ ۱۲۹۰ھ میں پہلی مرتبہ سعودی حکومت نے گنبدِ خضریٰ پر سبز رنگ کرایا۔ سبحان اللہ! کیسا روح پرور منظر ہے۔ اے گنبدِ خضریٰ کے مکین! آپ پر میں اور میرے ماں باپ نثار۔ آپ پر لاکھوں سلام!!

گنبدِ خضریٰ کے سایہ تلے باب جبریل سے مسجدِ مقدسہ میں عجز و عاجزی کی تصویر بن کر داخل ہوئے تمام عمر کی کمائی اور مال و متاع اس ایک نظر افروز سعادت کے سامنے ہیچ نظر آنے لگے۔ تمنا اور تڑپ نے ولولہ اور جوش پیدا کیا کہ جالی مبارک کو چمٹ جاؤں، چوموں اور اپنا سر گوں کر لوں مگر یہ خوف دامن

ہے کہ اس مجسم خطا کار سے کہیں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ سو ادب ملحوظ ہے، ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں، ہونٹ کپکپانے لگے، آنکھوں سے عقیدت کا سیلاب امڈ آیا، دل ایسا دھڑکا کہ ابھی باہر آتا ہے۔ قدر و منزلت اور عزت و تکریم کا یہ عالم کہ سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ یقین کیسے آئے کہ یہ رُو سیاہ سرکارِ دو عالم رحمت للعالمین کے حضورِ اقدس میں پیش ہو گیا ہے۔ ہونٹ بھینچ گئے کہ آواز نہ نکل جائے۔ کیوں، وہیں دروازہ مبارک کے اوپر پیتل کے حروف سے لکھا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ (الحجرات، ۲)

اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کیا کرو۔

بمشکل خود کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ حضورؐ پر درود پڑھنا شروع کر دیا کہ سامنے دیوار پر پیتل کے حروف میں تحریر ہے: اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ○ (الاحزاب، ۵۶)

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔

حضورؐ پر درود و سلام تو اللہ تعالیٰ اور فرشتے بھی فرماتے ہیں۔ غالبؔ نے اس نکتے کو کیسے عمدہ رنگ میں بیان کیا ہے:

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم کہ آں ذاتِ پاک خود ثنا خوانِ محمدؐ است

یوں تو پوری مسجد ہی خیر و برکت کا خزانہ ہے مگر یہ ایک خاص گوشہ جسے ریاض الجنۃ کہتے ہیں، اس خزانے کا نگینہ ہے۔ حدیثِ نبوی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین بیتی و منبری روضۃ من ریاض الجنۃ۔

میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں سے ایک باغ ہے۔

یہ علاقہ سات ستونوں سے متعین کیا جاتا ہے، جس میں سے دو ستون حجرہ شریف کے اندر آگئے۔ ہر ستون کا تاریخ و سِیَر میں ذکر موجود ہے۔ یہ عظیم تر عمارت حسنِ ظاہری کے علاوہ نہایت تعظیم و تکریم، عظمت و شرف اور نور و برکت سے معمور و منور ہے۔ ہر سو تسبیح و تہلیل،

تلاوتِ قرآن، ادب و احترام، عاجزی و ورع کے دل کش اور جاذب و پرکشش مناظر آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ یہ سامنے ایک چبوترہ ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں مسکین و نادار صحابہ کرام قیام فرماتے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں صحابہ کرام شب و روز تلاوت و تسبیح میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں روئے زمین کے عظیم معلم کا سلسلۂ درس و تدریس قائم تھا۔ جہاں روئے زمین کی پہلی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی اور جہاں فخرِ موجودات کی محبتِ مقدسہ سے ہزاروں جاں نثار صحابہ مستفیض ہوتے تھے۔ ان کی عظمت کو لاکھوں سلام!

روضۂ مبارک کے گرد بنو امیہ کے دور میں ایک لکڑی کی جافری بنا دی گئی تھی۔ اب یہاں لوہے اور پیتل کی خوب صورت مرصع جالی ہے۔ اس مبارک جالی کو صرف ہاتھ لگانے یا چومنے سے بہرہ ور ہونے کے لیے ہزاروں زائرین دلِ بے تاب کو سنبھالے آنکھوں میں عقیدت کا سمندر لیے تڑپتے اور ترستے رہتے ہیں۔ بعض خوش نصیب پہرے دار کو تحفہ دے کر سرفراز بھی ہو جاتے ہیں۔ آج سے آٹھ نو سو سال قبل چند بدکرداروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک کو نکالنے کے لیے ایک سرنگ کھود ڈالی تھی۔ ۵۵۷ھ میں سلطان نور الدین زنگی کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور اس شر سے حفاظت کی آگاہی فرمائی۔ سلطان فی الفور مدینہ منورہ پہنچا اور پنج گوشہ عمارت کے چاروں طرف اتنا گہرا گڑھا کھدوایا کہ پانی نکل آیا اور پھر لاکھوں من سیسہ پگھلوا کر بھروا دیا تاکہ ان میں سوراخ نہ کیا جا سکے۔ روضہ مبارک کے چاروں طرف جو جالی اب موجود ہے، دراصل یہ انہی بنیادوں پر بنی ہیں۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (التوبہ: ۱۰۸)

(البتہ جس) مسجد کی بنیاد تقوے پر اول روز سے پڑی ہے وہ (واقعی) اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں (ایسے) آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

سورہ توبہ کی جب یہ آیت تلاوت کرتا تھا، ایک کسک سی دل میں اٹھتی تھی کہ وہ لوگ کس قدر خوش نصیب ہیں جو اپنی آنکھوں سے اس مقام کو دیکھتے اور اس کی زیارت سے فیض یاب ہوتے

ہیں۔ یہ ذکر والاشان مسجد قبا کا ہے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی مسجد ہے اور حضور سرور کائنات نے اپنے دستِ مقدس سے اس مسجد کی بنیاد رکھی تھی۔ محدثین اور مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کا شانِ نزول یہی مسجدِ قبا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر ہفتے کی صبح کو مسجد قبا کی زیارت کو تشریف لے جاتے تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مسجدِ قبا میں دو رکعت نماز پڑھنا ایک عمرہ کرنے کے ثواب کے برابر ہے۔ ہم مسجد نبوی سے فجر کی نماز کے بعد مسجد قبا کی جانب اشراق کی نماز ادا کرنے کی آرزو لیے چل دیے۔ امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام، صحابہ کرام پتھر اور مٹی ڈھوتے تھے اور تعمیر میں برابر کے شریک تھے۔ یہ خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جسم میں کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ درود و سلام کے ورد کے ساتھ مسجد قبا میں قدم رکھا۔ میری خوش نصیبی کہ وہ متبرک جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم امامت فرماتے تھے، اب خالی تھی، دو رکعت نفل ادا کیے اور اپنی جبین نیاز اس عظیم بنیاد کے سامنے رکھ دی۔ سجدے میں بہت دیر تک پڑا رہا۔ وہ لذت اور کیفیت ناقابلِ بیان ہے جو اس تصور میں ہے کہ ختم الرسل نے جہاں امامت فرمائی وہاں اس گنہ گار کو سجدہ ریز ہونے کا موقع ملا۔

مسجد قبا سے جنوب مشرقی جانب پون میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسے مسجد جمعہ کہتے ہیں۔ ایک کشادہ سڑک کی توسیع نے اور پشت پر ایک کوٹھی کے تالاب پیرا کی نے اس مسجد کو بھینچ کر رکھ دیا ہے۔ مسجد کی زبوں حالی سے دل کو بہت صدمہ ہوا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث ایسی یادگار خستہ حالی کا شکار ہے۔ سید الکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری چودہ دن قبا میں قیام کے بعد جب سوئے مدینہ رواں دواں تھی، اس مقام پر قبیلہ بنو سالم نے آپ کو روک لیا۔ عین اس وقت فرضیت جمعہ کا حکم جناب جبریل امین لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ پس فوری طور پر اسی مقام پر آپ نے نماز جمعہ ادا فرمائی۔ ۱۵۰ھ میں اس مقام پر ایک مسجد تعمیر کی گئی جو مسجد جمعہ کے نام سے موسوم ہے، مگر لوگوں کو اس کا اتا پتا کم ہی معلوم ہے۔ اس خاکسار نے صحنِ مسجد کو کسی قدر صاف کیا اور نفل ادا کیے۔

مسجد ابو ذر اب شہر کے وسط میں آگئی ہے اور شارع المطار پر واقع ہے۔ یہ علاقہ بہت پر رونق ہے اور اس میں یہ مختصر سی مسجد کوشش کے بعد ہی نظر آتی ہے۔ امام بیہقی نے عبدالرحمٰن

بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک رات وہ مسجد نبوی کے صحن میں لیٹے ہوئے تھے کہ حضور علیہ التحیات باہر تشریف لائے اور اسواف کے باغ میں تشریف لے گئے جو موجودہ مسجد کی جگہ واقع تھا ۔ یہاں آپؐ نے طویل سجدے کے بعد جب چہرۂ مبارک اوپر اٹھایا تو عبدالرحمٰن بن عوف کو منتظر پایا ۔ ارشاد ہوا ، اللہ جل شانہٗ نے میری امت پر ایک عظیم الشان انعام فرمایا ہے جس کے شکرانے میں یہ سجدہ کیا تھا ۔ عرض کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا انعام ہے ۔ فرمایا جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ جل شانہٗ اس کے لیے دس نیکیاں رقم فرمائیں گے اور اس کے دس گناہ معاف فرمائیں گے ۔ رب العزت کے اس انعام کی صحابہ کرام نے اس قدر تعظیم کی کہ اس جگہ نماز ادا فرمانے لگے ۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک مسجد بنائی جو اب بھی باعثِ سکونِ قلب ہے اور عشق مصطفویؐ کے دیوانوں کو فروغِ نظر بخشتی ہے ۔

مسجد قبلتین میری رہائش گاہ واقع تبوک روڈ کے قریب تر تھی ۔ روزانہ مسجد نبوی آتے جاتے میاں صاحب سے درخواستِ دیدار پیش کرتا ۔ آخر ایک دن فجر کی نماز مسجد نبوی میں ادا کی اور مسجد شمس کی بے سود تلاش سے واپس آ رہے تھے ۔ (واضح رہے کہ مسجد شمس شمع رسول کے پروانوں کا ایک قیمتی اثاثہ تھا جو محکمۂ آثار و توسیع شاہراہ کی دستبرد میں صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئی) ۔ کہ میاں صاحب نے ایک دم کار روک دی ۔ سامنے مسجد قبلتین تھی ۔ کبھی یہ مسجد وادیِ عقیق میں تھی ، مگر آج ایک کشادہ شارع تبوک پر ہے ۔ عموماً قفل لگا ہوتا تھا مگر آج چند زائرین موجود تھے اور مسجد کھلی ہوئی تھی ۔ ایک بوتل پانی ایک ریال میں لے کر وضو کیا ۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں خانہ کعبہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نازل ہوا تھا ۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد میں بیت المقدس کی جانب ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے ، دو رکعت تمام ہوئی تھیں کہ تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا ۔ باقی دو رکعت نماز کی حالت میں رخِ مبارک خانہ کعبہ کی جانب موڑ کر ادا فرمائیں ۔ پرانے قبلہ بیت المقدس کی جانب قبلہ کا نشان شمالی دیوار میں اب بھی موجود ہے ۔ کافی وقت نوافل و سامانِ طمانیتِ قلب میں گزرا ۔ تاریخ کے اوراق سمیٹ کر باہر نکلا تو دھوپ تیز ہو چکی تھی ۔

یہ ذکر ۵ھ کا ہے کہ عرب کے مختلف قبائل مل کر جن کی تعداد اندازاً دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے۔ جب حضور رحمۃ للعالمین کو اطلاع ہوئی تو آپ نے شہر طیبہ کے دفاع و تحفظ کے لیے صحابہ کرام کی معیت میں مدینہ کے اطراف میں ایک طویل خندق کھود ڈالی۔ تقریباً چالیس دن یہ محاصرہ جاری رہا۔ اس مقام کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی اسکیموں کی اہمیت کا اندازہ بہ خوبی ہو سکتا ہے۔ آج کل خندق کی شکل کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ کچھ نشیبی علاقہ ضرور باقی ہے جہاں کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔ میں یہاں سلع پہاڑ کے غربی علاقے میں اوپر تک گیا جہاں بغیر چھت کے چند کمرے نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ چودہ سو سال پرانے ہیں۔ ان کمروں کے بارے میں مختلف لوگوں سے استفسار کیا، مگر کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ سلع پہاڑ کی ترائی میں پانچ مساجد ہنوز باقی ہیں، کبھی یہاں سات مسجدیں تھیں، اس لیے کہ اس شاہراہ کا دیرینہ و موجودہ نام سبع مساجد روڈ ہے۔ پہلی مسجد، مسجد الفتح ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما تھے اور انتہائی انکساری سے اللہ کے حضور دعا فرما رہے تھے کہ بارِ خدایا مسلمانوں کو فتح نصیب فرما۔ اس وجہ سے اس مسجد کو مسجد الفتح کہتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کو اس مسجد کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا۔ پھر ۵۷۰ھ میں سیف الدین حسین یمن کے ایک وزیر نے اس کی مرمت و تجدید کرائی، جیسا کہ مسجد کے ایک کتبے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس گنہگار نے محرابِ مسجد میں نفل ادا کیے اور بارگاہِ ایزدی میں پاکستان کی فتح و کامرانی کے لیے دعا کی۔ مسجد فتح کے علاوہ اس پہاڑ کے دامن میں چار دیگر مساجد ہیں جن میں سے مسجد فاطمہ، مسجد ابوبکر، مسجد علی اور مسجد سلمان فارسی بہت خستہ حالت میں ہیں۔ مسجد فاطمہ کی تو چھت بھی نہیں ہے۔ ان مساجد کی نسبت ان حضرات کے اسمائے گرامی سے تو معلوم نہ ہو سکا، البتہ قیاس کہتا ہے کہ جنگِ خندق کے موقع پر ان حضرات کے کیمپ ان مقامات پر نصب ہوں گے اور مستورات کا خیمہ موجودہ مسجد فاطمہ کی جگہ ہوگا اور شاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتاً فوقتاً ان کیمپوں میں نماز ادا فرمائی ہوگی۔ میں ذہن میں بہت دیر تک تاریخ کے اوراق الٹتا رہا کہ ان یادگاروں کی چھٹی سے دسویں صدی ہجری تک باقاعدہ مسلمان امرا و عمالِ حکومت تعمیر و مرمت میں مستعدی سے حصہ لیتے رہے، مگر اب ان کا اللہ مالک ہے۔

مسجد نبوی سے باب السلام کے راستے سے باہر نکلیں تو نہایت دلکش دو رویہ بجلی کے فانوسوں کے اختتام پر مسجد غمامہ واقع ہے۔ یہ مسجد بڑی خوب صورت اور سیاہ و سفید پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲ ھ میں نماز عید یہاں ادا فرمائی تھی۔ مسجد کے دالان اور اندرونی فرش دلکش قالینوں سے مزین ہیں۔ اس مسجد کے ارد گرد چار اور مساجد کا دائرہ ہے۔ اول مسجد فاطمہؓ ہے جو کہ بہت مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر خاص کشش رکھتی ہے۔ دوسری جانب ایک چھوٹی سی مسجد علیؓ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دوران محاصرہ میں حضرت علیؓ اس مقام پر مقیم ہوں گے۔ بعد میں یہاں مسجد تعمیر ہو گئی۔ مسجد ابوبکر بائیں طرف اور مسجد عمر دائیں طرف قبا روڈ پر پڑتے ہی واقع ہیں۔ یہ دونوں مساجد قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ ان کے اندر جدیدیت قطعی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرصۂ دراز سے ان کی مرمت و تزئین کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ان مساجد سے ان خلفائے کرام کی وجہ نسبت معلوم نہ ہو سکی۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ان مساجد میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق نے ضرور کبھی نمازیں ادا کی ہوں گی۔ غرض مسجد غمامہ کے اطراف میں مساجد کا یہ سلسلہ بہت شاندار دکھائی دیتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مسجد غمامہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز استسقا بھی ادا فرمائی تھی۔ نماز کے فوراً بعد بادل آ گئے تھے اور خوب برسے تھے۔ غمامہ عربی زبان میں بادلوں کے لیے مستعمل ہے۔ اسی لیے یہ مسجد غمامہ مشہور ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

رحمت دو عالم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بیر رومہ کو خریدے اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دے، میں اس کو مغفرت کی ضمانت دیتا ہوں۔ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ فرمان نبوی سنا تو فوراً آپ نے یہ کنواں یہودی مالک سے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ ۳ ھ کا ذکر ہے کہ مدینہ طیبہ کے مسلمانوں کو پینے کے پانی کی بہت تکلیف تھی۔ کھاری پانی کے کنویں خاصی تعداد میں موجود تھے۔ مگر شیریں پانی نہ ملتا تھا۔ بیر رومہ ایک یہودی کی ملکیت میں تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اسے خریدنے کا شرف حاصل کیا۔ اس کے علاوہ چند اور مقامات میں بھی پینے کا پانی موجود تھا مگر اب وہ مقامات شہر مدینہ کی توسیع میں آ چکے ہیں۔ اب بیر رومہ صرف یادگار کے طور پر باقی ہے۔

جمعۃ المبارک کو فجر کی نماز کے بعد اس مبارک یادگار کی تلاش میں نکلے۔ شہر طیبہ کے شمال مغربی گوشہ میں شاہراہ سے اتر کر ایک کچی سڑک ایک چار دیواری تک نشاندہی کرتی ہے جس کے اندر ایک مسجد بھی ہے اور اس کے عقب میں عظیم مالی ایثار کی یادگار واقع ہے۔ اب یہ کنواں کھنڈر بن چکا ہے۔ امکان قوی ہے کہ اگر اس کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہ کیا گیا تو کسی وقت یہ قیمتی اثاثہ معدوم ہو جائے گا۔ بیر رومہ کے کنارے کھڑے ہو کر تصور ہوتا ہے کہ شیریں پانی کی کم یابی کے باعث تشنہ لب مسلمان سنگ دل یہودی کے دروازے پر پانی کی دست یابی کے لیے آتے ہوں گے اور کئی قسم کی باتیں سنتے ہوں گے۔ جبھی تو عثمان غنی ذوالنورین کو خداوند قدوس کی جانب سے متعین فرمایا گیا۔ رسولِ عربی اعلان فرماتے ہیں کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار، ہے کوئی بخشش کا خواست گار۔ یہ شرف، یہ فخر، یہ سعادت قسامِ ازل نے عثمانؓ بن عفان کے مقدر میں ہی لکھا تھا۔ کنواں خرید جاتا ہے، مسلمانوں کے لیے وقف ہوتا ہے مگر یہودیوں کے پانی پینے پر قدغن نہیں لگتی، جو یہودی مالک نے مسلمانوں پر لگائی تھی۔ اس کمالِ ایثار اور انتہائی تقویٰ کو دیکھ کر وہ یہودی بھی مسلمان ہو جاتا ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایک دن فجر کی نماز کے بعد شہدائے اُحد پر جانے کا قصد کیا۔ میاں صاحب نے ایک پہاڑیوں کے سلسلے کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ اُحد کا پہاڑ ہے۔ معاً میرے کانوں میں حضور علیہ السلام کی حدیث "کوہِ احد سے ہم محبت کرتے ہیں اور یہ ہم سے محبت کرتا ہے" گونج اٹھی۔ میں نے چلتی گاڑی سے جبل اُحد کو عقیدت سے سلام کیا، چوں کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے محبت تھی اور اس پہاڑ کو جنت کی بشارت بھی ہے۔ میں سوچنے لگا کاش میں اس پہاڑ کا ایک پتھر ہی ہوتا۔ ایک موڑ کاٹ کر ہماری گاڑی ایک احاطے کے قریب رک گئی۔ اس احاطے میں شہدائے اُحد کے مزار ہیں۔ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبرِ مبارک کو تو کچھ نمایاں سی خصوصیت حاصل ہے مگر اور کسی قبر کا تعین ممکن نہیں ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر اور عبداللہ بن جحش اسلام کے عظیم سپوتوں کی قبریں تلاش کرتا رہا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میری نم ناک آنکھوں میں جنگ کا نقشہ کھنچ گیا۔ ۵ شوال ۳ھ کو حضرت انسؓ نے حضورؐ کو مطلع کیا کہ قریش کا لشکر مدینہ منورہ کے قریب آ چکا ہے۔ ۱۱ شوال بروز جمعہ سید الکونین ایک ہزار جاں بازوں کو لے کر سینہ سپر ہو گئے۔ ستر فدائیان اسلام قربان ہو چکے ہیں جبیر بن مطعم کے غلام وحشی نے ہندہ سے ساز باز کر کے

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے نیزہ مارا۔ عم نبیؐ فرشِ زمین پر گر پڑے۔ عقبہ کی بیٹی اور ابوسفیان کی بیوی نے آپ کے ناک، کان اور انگلیاں کاٹ کر ہار بنایا، گلے میں ڈالا، خنجر سے شکم مبارک چاک کر دیا اور کلیجہ نکال کر چبا ڈالا۔ یہ تمام واقعہ یہیں ہوا۔ آنکھیں ان تصورات میں غلطاں تھیں، آخر تاب نہ لا سکیں اور بہہ پڑیں۔ بہت دیر دامنِ کوہ میں اس غار کو تلاش کرتا رہا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرے آرام فرمایا تھا، مگر کوشش ثمر بار نہ ہو سکی۔

روضۃ النبی سے مشرق کی جانب پتلی سی گلی سے گزر کر ایک کشادہ شاہراہ کے کنارے جنت البقیع ہے جس کے بارے میں متعدد احادیث میں بتایا گیا ہے کہ یہاں کے مدفون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شرفِ شفاعت سے اولاً مشرف ہوں گے۔ یہاں لاتعداد قدسی صفات نفوس اور آفتابِ رسالت سے فیض یاب ہونے والے حضرات محوِ خواب ہیں۔ اس کی خاک جس کو نصیب ہو گئی، سمجھو کہ جنت الفردوس مرحمت ہو گئی۔ اس خاک گوہر بار پر تمام دنیا و مافیہا کی دولتیں اور ثروتیں نثار کی جا سکتی ہیں۔ ایک تمنا تھی، ایک تڑپ تھی، اس خاک صد افتخار کی زیارت کرنے کی، جس میں وہ لوگ مدفون ہیں جن کی ضو فشانیوں نے تاریخ اسلام کو درخشندگی و تابندگی بخشی۔

سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا کہ سلامِ عقیدت اور کششِ محبت دامن میں لیے ہوئے جنت البقیع پہنچا۔ یہ سامنے جنت البقیع ہے۔ چھوٹی بڑی پتھروں کی لاتعداد ڈھیریاں ہیں جن کے درمیان خم کھاتے، اونچے نیچے راستے، نہ کہیں سایہ نہ سبزہ۔ ہر چیز انجانی نہ کسی کا پتا نہ نشانی۔ میت کی تدفین میں انتہائی عجلت۔ اللہ کریم کہا اور رخصت! یہاں کے مکینوں کی جائے رہائش کا تعین مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ بعض قبور کا صرف تاریخی روایات سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہ بھی معتبر نہیں۔ اہل بیت کے علاوہ دس ہزار کے قریب صحابہ کرام، ہزاروں تابعین اور اس سے زیادہ تبع تابعین، لاکھوں اولیاء اللہ رضوان ... حیرت و تعجب سے ہر طرف تکتا رہا۔ کیا کچھ دیکھتا، کدھر کدھر ڈھونڈتا ان ہستیوں کو! سبحان اللہ! یہاں کا تو چپہ چپہ متبرک ہے۔ کہیں شاہِ دو عالم کے لختِ جگر خوابیدہ ہیں تو کہیں آپ کے نواسے آرام فرما ہیں، اور کہیں امہات المومنین محوِ خواب ہیں۔ اس عاصی اور گنہگار کا ... (باقی آئندہ)

ڈاکٹر صادق ندیم

سلیمان البستانی کا مقدمۂ الیاذہ

سلیمان البستانی جدید عربی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا وطن لبنان تھا۔ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔ بیروت میں تعلیم حاصل کی جہاں انھیں ناصیف الیازجی اور یوسف الاسیر جیسے اساطین فکر سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی میں بھی اچھی خاصی دسترس بہم پہنچالی تھی۔ ان کی علمی استعداد سے متاثر ہو کر مشہور ادیب المعلم بطرس البستانی نے انھیں اپنے مدرسے میں تدریس کی پیش کش کی جو انھوں نے قبول کر لی اور ساتھ ہی دائرۃ المعارف وغیرہ میں لکھنا شروع کر دیا۔ ۱۸۸۷ء میں انھوں نے یونان کے عظیم شاعر ہومر (HOMER) کی شہرہ آفاق تصنیف الیاذہ (ILIAD) کے منظوم ترجمے کا آغاز کیا۔ ابتدا میں فرانسیسی اور انگریزی تراجم کی مدد سے ترجمہ کیا مگر مطمئن نہ ہوئے اور یونانی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک عیسائی پادری سے یونانی زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور مفید حواشی لکھے اور فہارس و معاجم کا اضافہ بھی کیا اور اس کا مقدمہ بھی لکھا۔ یہ ترجمہ ان تمام اوصاف کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں مصر کے مطبع الہلال سے شائع ہوا۔ یہ ۱۲۶۰ صفحوں کی بڑے سائز کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے، جس سے راقم الحروف مستفید ہوا ہے۔ الیاذہ کا مقدمہ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہومر اور الیاذہ سے متعلق معلومات کے علاوہ عربی ادب و ثقافتِ اسلامیہ پر بھی بہت سا مواد موجود ہے۔

سلیمان البستانی نے مقدمۂ الیاذہ کا آغاز ہومر کے حالاتِ زندگی سے کیا ہے۔ اس کے نام و نسب و مولد اور دیگر ضروری امور پر محققانہ نظر ڈالی ہے اور بڑی اہم اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں، جن کے متعلق تاریخی شواہد بھی دیے ہیں۔ انھوں نے ہومر کے متعلق مختلف ادوار میں مختلف آرا کا ذکر کیا ہے اور انگریزی، فرانسیسی اور جرمن کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بحث کو عربی ادب اور اسلامی ثقافت سے مربوط کرتے ہیں۔ وہ جہاں بھی موقع ملتا

ہے، یونان وعرب کا تقابل ضرور کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے "قول العرب فیہ" کے عنوان سے ایک مختصر سا باب تحریر کیا ہے، جس سے عہد عباسیہ کے دور کی اسلامی ثقافت اور ہومر شناسی کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسی عربی تصنیف نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کلام ہومر کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔ عہدِ عباسیہ کے خاص خاص علما کلام ہومر سے شناسا تھے، اور بعض خواص مجالس میں الیاذہ کو پڑھا جاتا تھا اور اہلِ ذوق اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مگر اس کا عربی زبان میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ یونانی اور سریانی زبانوں سے تراجم کرنے والے مقربینِ خلفا ہومر کے اشعار یونانی میں پڑھتے تھے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ دورِ عباسیہ میں ایرانی اور کلدانی خواص میں ہومر کے کلام کے مطالعے کا رواج تھا۔ اس دور کا ایک مترجم تاوفیلس الرہاوی ہے جس نے ہومر کا سریانی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ وہ خلیفہ مہدی کا منجم تھا جیسا کہ البستانی نے الیاذہ کے حواشی میں صفحہ ۲۶۲ پر ثابت کیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ اپنی کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطبا میں حنین بن اسحٰق کے سوانح حیات میں یوسف بن ابراہیم کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خرشی (رشید کی یونانی کنیز) نے اس لڑکے (اسحٰق المعروف بابن الخصی) کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اسے یونانی آداب و کتب سے مؤدب کیا، اس نے یونانی زبان ایک عالم کی طرح سیکھ لی اور اس زبان کا منتہائے کمال بن گیا۔ ہم اکثر اہلِ ادب کی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ ایک دفعہ اسحٰق بن الخصی بیمار ہوا تو میں اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر گیا۔ میں نے وہاں ایک لمبے بالوں والے شخص کو دیکھا جس کے بالوں نے اس کے چہرے کے کچھ حصے کو ڈھانپ رکھا تھا اور وہ یونانی زبان میں یونان کے عظیم شاعر اومیرس (ہومر) کے اشعار سنا رہا تھا۔ اس کی آواز کا ترنم حنین کی آواز کے ترنم سے ملتا جلتا تھا۔ حنین سے ملے ہوئے مجھے اس وقت دو سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسحٰق بن الخصی سے پوچھا کہ کیا یہ شخص حنین ہے؟ مگر اس نے ایسا انکار کیا جو در اصل اقرار تھا۔ چنانچہ میں نے اسے حنین کہہ کر پکارا تو اس نے میری پکار کا جواب دیا"[۱]

۱؎ عیون الانباء ج ۱ ص ۱۸۵

اس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ اس عہد میں یونانی زبان سے اہلِ بغداد آشنا تھے اور اس کی تعلیم دی جاتی تھی، لوگ اسے پڑھتے بھی تھے، خلفا کے محلوں میں بھی اس کی تدریس ہوتی تھی اور ہومر کی منظومات غیر ملکی زبانوں سے دلچسپی رکھنے والوں میں معروف تھیں۔"

سلیمان البستانی نے "عیون الانباء فی طبقات الاطبا" سے چند اور حوالے نقل کیے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس عہد کے لوگ ہومر سے آشنا تھے۔ انھوں نے نامور مسلمان مصنفین کی کتب سے ہومر کا تذکرہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابو ریحان محمد البیرونی کی الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ سے ان کا مندرجہ ذیل دلچسپ قول نقل کیا ہے: "متقدم الذکر امیروس (ہومر) کا یونانیوں کے ہاں وہی مقام ہے جو امرء القیس کا مقام عربوں میں ہے۔"[۳]

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمے میں ہومر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شاعری کچھ عربوں تک ہی مختص نہیں، دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ یہاں عرب و عجم کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ایران و یونان میں شعرا ہوئے ہیں، ان میں سے ارسطو نے اپنی کتاب المنطق میں اومیروس (ہومر) شاعر کا ذکر کیا ہے اور اس کی مدح و ثنا کی ہے۔"[۴]

شہرستانی "کتاب الملل و النحل" میں رقم طراز ہیں:

اومیروس عہدِ قدیم کا عظیم شاعر ہے جسے افلاطون اور ارسطو اعلیٰ مرتبے کا شاعر سمجھتے ہیں اور اس کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں۔ ان اشعار میں علم کی پختگی، متانت، حکمت، جودتِ رائے اور جزالت اللفظ مجتمع ہوتی ہیں۔"[۵]

شہرستانی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں اور البہاء العاملی نے "الکشکول" میں ہومر کے کلام سے شواہد پیش کیے ہیں۔

ابو الفرج الملطی المعروف با بن العبری نے اپنی کتاب "تاریخ مختصر الدول" میں ہومر کا تذکرہ

---

[۳] الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ، طبع پیرس، ص ۸۶

[۴] مقدمہ ابن خلدون: باب اشعار العرب و اھل الامصار

[۵] الملل و النحل، ج ۲، ص ۱۵

سے تذکرہ کیا ہے۔

مندرجہ بالا حوالوں سے عہدِ عباسی اور اس کے بعد کی اسلامی ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے اسلاف ادبیاتِ عالم سے آگاہ تھے، اور خواص ہومر کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تھے، مگر اس امر کا کوئی حوالہ صاحبِ مقدمہ الیاذہ کو نہیں مل سکا جس سے یہ پتا چلے کہ ہومر کی منظومات کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تھا۔ چنانچہ سلیمان بستانی کی تحقیق یہی ہے کہ ان سے پہلے کسی نے ہومر کو عربی میں منتقل نہیں کیا۔ اس کی تائید میں انھوں نے سید جمال الدین افغانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک مجلس میں انھوں نے ان (سلیمان البستانی) سے کہا "ہمیں اس بات سے انتہائی مسرت ہوگی اگر تم وہ کام کرو جو عربوں کو آج سے ایک ہزار سال پہلے کرنا چاہیے تھا۔ کتنی اچھی بات ہوتی کہ وہ تمام ادیب جنھیں مامون نے جمع کر رکھا تھا، الیاذہ کا فوری طور پر عربی میں ترجمہ کرنا شروع کر دیتے، خواہ ایسا کرنا انھیں فلسفۂ یونانی کے عربی میں منتقل کرنے سے یکسر غافل کر دیتا۔"

ہومر کی "الیاذہ" سے متعلق مختلف موضوعات پر بحث کرتے ہوئے (جو کئی صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے) وہ ترجمۂ الیاذہ سے عربوں کی کوتاہی کے اسباب تلاش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے تین اسباب ہیں، (۱) دین (۲) عربوں کی یونانی زبان سمجھنے میں دشواری اور (۳) مترجمین کا نظمِ شعر پر قادر نہ ہونا، وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام الیاذہ کے ترجمے کی راہ میں حائل ہوا۔ چوں کہ اس میں دیوی دیوتاؤں کا ذکر ہے، اس لیے اس کا ترجمہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ راقم الحروف کے خیال میں یہ کوئی وزنی وجہ نہیں ہے۔ مسلمان نہایت ہی وسیع الخیال تھے اور اس زمانے میں اس طرح کی کوئی تنگ نظری نہ تھی۔ دراصل یہ بات انھوں نے نصرانیت کے نقطۂ نظر سے کہی ہے۔ وہ "الیاذہ اور نصرانیت" کے باب میں عیسائیوں کی اس بنا پر شروع میں ہومر کی مخالفت کا ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہی بات اسلام اور مسلمانوں پر بھی چپکا دی۔ حالاں کہ خود بہت سے علمائے [illegible] کہتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمان عیسائیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ فراخ دل تھے۔

دوسری وجہ قرینِ قیاس ہے یعنی چوں کہ عرب شعرا یونانی زبان سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے تھے، اس لیے وہ الیاذہ کو عربی میں منظوم نہیں کر سکتے تھے۔ مگر تیسری وجہ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر مترجمین (یعنی حنین بن اسحٰق وغیرہ) شعر کہنے اور نظم لکھنے کی قدرت نہ رکھتے تھے

تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ الیاذہ کا سرے سے ترجمہ ہی نہ کیا جاتا - آخر اس کا ترجمہ نثر میں بھی کیا جا سکتا تھا جیسا کہ فردوسی کے شاہ نامہ کا منثور ترجمہ کیا گیا۔ اس اعتراض کا وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ عربوں اور ایرانیوں میں جو اختلاط تھا وہ یونانیوں اور عربوں کے میل جول سے کہیں زیادہ تھا، اس لیے یونانی ادب کی نسبت فارسی ادب کی طرف زیادہ رجحان ہونا قدرتی امر ہے، اور یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ خود الیاذہ اور شاہ نامے کے مصنفوں کے مابین بھی بہت فرق ہے، اور وہ یہ کہ ہومر کا تعلق ایک بت پرست قوم سے تھا اور فردوسی ادبائے اسلام میں سے تھا۔ مگر اس کے باوجود شاہ نامے کا عربی ترجمہ اس وقت تک نہ ہو سکا جب تک کہ ایک ایسا حکمران پیدا نہ ہوا، جو عربی اور فارسی کا بیک وقت فہم رکھتا تھا - جب وہ اصل زبان فارسی میں شاہ نامے سے لطف اندوز ہوا تو اسے خیال آیا کہ وہ اس کی تعریب کے ذریعے اپنی قوم کو لذت اندوز کرے۔[۵] اور یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جب شعر کا نثر میں ترجمہ کیا جائے تو اس کا حسن ختم ہو جاتا ہے اور اس کی روایت کرنے والے بھی درماندہ ہو جاتے ہیں - یہی معاملہ شاہ نامہ کی تعریب کے ساتھ پیش آیا۔ لوگوں نے اسے گل دستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا۔

سلیمان البستانی لکھتے ہیں کہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ادبائے عرب کی راہ میں تعریبِ الیاذہ کے سلسلے میں جو بھی رکاوٹیں تھیں، اب وہ رکاوٹیں باقی نہیں رہیں، بلکہ اب تو زمانے کا تقاضا ہے کہ الیاذہ کو عربی زبان کا جامہ پہنایا جائے - خصوصاً بت پرستی کی کہانیوں کا اس عہد میں کسی قسم کا اثر باقی نہیں رہا۔ چنانچہ وہ پہلے شخص ہیں جو الیاذہ کو عربی میں منتقل کرنے کا اعزاز حاصل کرتے ہیں۔

الیاذہ کا یہ مقدمہ گوناگوں معلومات کا خزانہ ہے - ہم نے اس میں سے اسلامی اور عربی ثقافت کا پہلو اجاگر کیا ہے - بستانی نے اپنی مربوط بحث کے دوران عربی ادب اور زبان کا دلچسپ اور فکر انگیز جائزہ لیا ہے، جس کے بیان کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے - ان میں سے چند عناوین یہ ہیں: التعریب، معربو العرب، اوزان الشعر و البوامیہ، الالیاذہ والشعر العربی،

---

[۵] فتح بن علی البغدادی الاصبہانی نے ملک المعظم عیسیٰ بن العادل ابی بکر الایوبی کے لیے شاہ نامہ فردوسی کا عربی نثر میں ترجمہ کیا تھا - یہ ترجمہ ۶۲۰ھ میں مکمل ہوا - (کشف الظنون)

الشعر القدیم ، القرآن ولغۃ القریش ، المقابلۃ بین لغۃ القریش المضریۃ ولغۃ الانباذ ، الیونانیہ وکیف ماشت الاولی وتلاشت الثانیہ ، اطوار الشعر العربی اوطبقات الشعرا ، ملاحم العرب ، ملاحم الاعاجم ، علوم الادب عند المولدین ۔

برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علم فقہ سے کس طرح روشناس ہوا ، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج واشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دور حکومت میں کتب فقہ مرتب کی گئیں ، ان کے عہد اور طریق حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے ، اس کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں جن کو مسائل فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۴۰۸ قیمت ۳۰ روپے

ملنے کا پتا ، ادارہ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

ڈاکٹر مبارک علی

برصغیر پاک وہند میں تمباکو نوشی

ابتدا ہی سے انسان کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ آرام کے لمحوں میں یا ذہنی پریشانی کے عالم میں یا تنہائی میں کسی نشہ آور چیز کے کھانے کا عادی رہا ہے۔ وہ اکثر ایسی اشیا کا بھی عادی رہا ہے جو نشہ آور تو نہیں ہیں لیکن اسے ایک قسم کا سرور، اطمینان اور تسلی دیتی ہیں۔ ایسی اشیا میں تمباکو کا استعمال قابلِ ذکر ہے جو اپنی دریافت کے فوراً بعد بہت جلد دنیا میں مقبول ہوگیا اور دوسری اشیا کے مقابلے میں اس نے زیادہ مقبولیت حاصل کرلی[۱]۔ تمباکو کا استعمال سب سے پہلے اہلِ سپین نے ۱۴۹۲ء میں کیوبا کے مقامی باشندوں سے سیکھا اور پھر اسے اہلِ یورپ سے روشناس کرایا۔ یورپ کے بعد یہ ترکی، مصر اور ہندوستان میں آیا اور بہت جلد یہاں کے لوگوں میں استعمال کیا جانے لگا۔

ہندوستان میں تمباکو لانے کا کام پرتگیزیوں نے کیا جو اسے اپنے ساتھ جنوبی ہندوستان میں لائے۔ وہاں سے اکبر کے زمانے میں یہ شمالی ہندوستان میں آیا۔ اکبر نے اپنے ایک ملازم اسد بیگ کو جنوبی ہندوستان کی ریاستوں میں بحیثیت سفیر کے بھیجا تھا۔ اس نے جب وہاں اوّل اوّل تمباکو کو دیکھا تو اس خیال سے کہ اکبر کو نادر اور عجیب و غریب اشیا سے دلچسپی ہے، اسے ۱۶۰۴-۰۵ء میں اپنے ساتھ لایا، اپنی کتاب "حالات اسد بیگ" میں اس نے اس کی انتہائی دلچسپ تفصیل لکھی ہے کہ اس نے اکبر کی خدمت میں تمباکو پیش کرنے کی غرض سے ایک خوبصورت حقہ تیار کرایا، اسے ہیرے اور جواہرات سے مزین کرایا، سونے کی چلم بنوائی اور تمباکو کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے تمباکو کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس پر مرزا عزیز کوکہ خانِ اعظم نے جواب دیا کہ یہ تمباکو ہے جو مکہ اور مدینہ میں بہت مقبول ہے۔

---

[۱] F. W. Fairholt: Tobacco, its history and association London 1875- repr. Detroit 1968.

اکبر نے بطور تجسس حکم دیا کہ اس کے لیے حقہ تیار کیا جائے، جب حقہ تیار ہوا تو اکبر نے اسے پینا شروع کر دیا، اس پر دربار کے حکیم نے اسے منع کیا، لیکن بادشاہ نے اسد بیگ کی دل جوئی کی خاطر چند کش لیے اور منہ سے دھواں بھی نکالا۔ اس کے بعد اس نے خان اعظم کو حکم دیا کہ وہ بھی پیئے، شاہی حکم پر اس نے بھی دو تین کش لیے۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک جڑی بوٹی والے کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ اس میں کیا خصوصیات ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اس کی کتابوں میں اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے، کیوں کہ یہ ایک نئی چیز ہے مگر اس پر اہل یورپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس پر دربار کے ایک حکیم نے کہا کہ یہ ایک ایسی دوا ہے جس کو استعمال ہی نہیں کیا گیا، لہٰذا ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں، لیکن بادشاہ کو یہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اسد بیگ نے حکیم کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ یورپ کے لوگ کوئی بے وقوف نہیں ہیں، ان میں عقل مند لوگ ہیں جو مشکل سے کوئی غلطی کرتے ہیں، لہٰذا تم کیوں کر ایک ایسی چیز کے متعلق جسے تم نے استعمال ہی نہیں کیا ہے، کوئی فیصلہ دے سکتے ہو؟ اس پر حکیم نے کہا کہ ہم یورپی اقوام کی روایات کی پابندی کرنا نہیں چاہتے جب تک کہ ہمارے عقل مند لوگوں کی طرف سے ان کی منظوری نہیں حاصل ہو جاتی۔ اسد بیگ نے اس کے جواب میں کہا کہ دنیا کی ہر روایت کسی نہ کسی وقت نئی اور جدید رہی ہے اور جب یہی چیز لوگوں میں آئی تو انھوں نے آہستہ آہستہ اسے اختیار کر لیا، لہٰذا حکیموں کو چیزوں کے بارے میں ان کے اچھے یا بُرے ہونے کی بنا پر تسلیم کرنا چاہیے۔ اکبر نے یہ گفتگو خاموشی سے سنی اور پھر خان اعظم سے مخاطب ہو کر کہا کہ اسد بیگ نے بڑی عقل مندی کی بات کہی ہے۔ پھر بادشاہ نے دربار میں دوسروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "ہمیں ان باتوں سے جو دوسری قوموں کے عقل مندوں نے اختیار کی ہیں، صرف اس بنا پر انکار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ہماری کتابوں میں نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ترقی کیسے کریں گے؟"

اسد بیگ تمباکو اور پائپ کافی مقدار میں اپنے ساتھ لایا تھا جسے اس نے امرا میں تقسیم کیا۔ یہاں سے شمالی ہندوستان، اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تمباکو نوشی کی ابتدا ہوئی، بعد میں تاجروں نے اسے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچا دیا، یہاں تک کہ اس کا رواج پڑ گیا۔ اکبر نے بہر حال اس کے بعد کبھی حقہ نہیں پیا[۵۲]

[۵۲] Elliot & Dowson, History of Hindustan as told by its own

مآثر رحیمی کے مصنف نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ تمباکو ابتدا میں دکن سے اکبر کے دربار میں آیا[۵۳] تمباکو اگرچہ اکبر کے عہد میں دربار میں آیا لیکن آتے ہی بہت جلد امرا اور عوام میں مقبول ہوگیا۔ یہاں تک کہ جہاں گیر کے عہد (۱۶۱۷) میں اس پر پابندی لگادی گئی۔ اس پابندی کا ذکر کرتے ہوئے جہاں گیر توزک میں لکھتا ہے کہ "تمباکو کے مضر اثرات کی وجہ سے جو اکثر مزاجوں اور طبیعتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، میں نے اپنے حدود سلطنت میں حکم دیا کہ کوئی شخص تمباکو کو استعمال نہ کرے گا"[۵۴]

ایران کے حکمران شاہ عباس نے بھی ایران میں تمباکو کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ خان عالم جو ایران میں جہاں گیر کا سفیر ہو کر گیا، تمباکو کا عادی تھا، جب اس کی اطلاع شاہ عباس کو ہوئی تو اس نے اسے یہ شعر لکھ کر بھیجا :

رسول یار می خواہد کند اظہار تنباکو   من از شمع وفا روشن کنم بازار تنباکو

اس کے جواب میں خانِ عالم نے یہ شعر لکھ بھیجا :

من از بے چارہ بودم از اظہار تنباکو   زلطف شاہ عادل گرم شد بازار تنباکو[۵۵]

دلچسپ چیز یہ ہے کہ جیمس اوّل بادشاہ انگلستان جو جہاں گیر کا ہم عصر تھا، اس نے بھی اُسے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اسی عہد میں عثمانی سلطنت میں سلطان مراد (۱۶۲۳ – ۱۶۴۰) نے بھی تمباکو کے خلاف سخت اقدامات کیے اور اس کے استعمال کرنے والوں کے لیے سزائے موت رکھی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہاں گیر کے حکم کی کچھ عرصہ سختی سے پابندی ہوئی لیکن سیر المتاخرین اور خلاصۃ التواریخ میں یہ غلط لکھا ہے کہ جہاں گیر حقہ پینے والوں کے ہونٹ کٹوا دیتا تھا۔ طامس رو جو ۱۶۱۵ سے ۱۶۱۸ تک مغل دربار میں رہا، تمباکو پر پابندی کے بعد اُسے تمباکو کے حصول میں سخت دشواری پیش آئی۔ لہٰذا اس نے انگلستان میں اپنے دوست پیپ ویل

---

[۵۳] عبدالباقی نہاوندی : مآثر رحیمی (کلکتہ، ۳۱-۱۹۱۰)۔ جلد اوّل، ص ۹۲۶

[۵۴] جہاں گیر : توزکِ جہاں گیری (اردو ترجمہ) لاہور ۱۹۶۸ء جلد اوّل، ص ۵۷۷

[۵۵] ایضاً، ص ۷۸ – ۵۷۷

(Papwal) کو لکھا کہ اسے چار یا پانچ پاؤنڈ تمباکو بھیجے ۔

شاہ جہاں کے عہد میں پابندیوں کے باوجود تمباکو کے استعمال میں اضافہ ہو چکا تھا اور ہر طبقے میں اسے پیا جانے لگا تھا۔ مشہور جرمن سیاح مانڈلسلو (Mandelslo) جب شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تو اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ حقہ امرا اور عوام دونوں میں مقبول ہو چکا ہے ۔ جب وہ گجرات کے حاکم اعظم خاں سے احمد آباد میں ملا تو اس نے دیکھا کہ ایک ملازم ہاتھ میں حقہ لیے کھڑا ہے ۔ گورنر کا کام بھی کرتا جاتا ہے اور حقہ بھی پیتا جاتا ہے ۔

تمباکو کے استعمال کے ساتھ ہندوستان میں اس کی کاشت بڑھ گئی اور اس کی مختلف اقسام ہندوستان میں پیدا ہونے لگیں ۔ برطانوی سیاح ایڈورڈ ٹیری نے (Terry) جو ہندوستان میں ۱۶۱۶ء سے ۱۶۱۹ء تک رہا اس بات کی تصدیق کی ہے کہ یہاں بکثرت تمباکو ہوتا ہے لیکن اہل ہندوستان اسے تیز بنانا نہیں جانتے۔ انگلش فیکٹری ریکارڈ میں بھی اس بات کی تصدیق کی گئی کہ ۱۶۲۳ء تک تمباکو کی کاشت بہت ہونے لگی تھی ۔ ٹاورنیر (Tavernier) نے دکن کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں تمباکو کثرت سے پیدا ہوتا ہے لیکن لوگ اس کی پروا نہیں کرتے اور آدھی کے قریب فصل ضائع ہو جاتی ہے ۔

سترھویں صدی کے نصف آخر کے مورخ سجان رائے بٹالوی نے اپنی کتاب "خلاصۃ التواریخ"

Thomas Roe: The Embassy of Sir Thomas Roe to the Court of the Great Moghul (1615-1619) London 1899. Repr. 1926, p 311 ...

M.S. Commissariat: Mandelslo's Travels in western India. Oxford 1931, p. 34.

William Foster: Early Travels in India (1583-1619) London 1921. Repr. Lahore 1978, p 299.

Idem: English Factories in India. Oxford, 1923, p 163.

J.B. Tavernier: Travels in India. London 1925, p ii, p 22.

میں تمباکو نوشی کے بارے میں دلچسپ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ اس کی مقبولیت کے بارے میں کہتا ہے کہ :

"امیر و زیر، غریب فقیر، درویش علما و فضلا، خرد و کلاں، رذیل و شریف سب کے سب دھواں اُڑانے کے شائق ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ تمام نشوں بلکہ کھانے پر مقدم قرار پایا ... دوسروں کی جھوٹی چیز کو منہ لگانے سے ہر شخص کراہت کرتا ہے مگر جھوٹا حقہ یا چلم پینے سے کسی کو عار نہیں۔"[۱۱۵]

اس کے بعد اس نے شاعرانہ انداز میں تمباکو کے فوائد بیان کیے ہیں :

"انسان کا مصاحب اور سفر حضر میں اچھا ہمدم و ہمراز ہے۔ گوشہ گیر درویشوں کی کوٹھری سے لے کر اقبال مند امیروں کی محفلوں تک ہر جگہ اس کا گزر ہے، ایسا معشوق ہے کہ اس کا دھواں انسان کے دل کو اسیر کرنے میں گیسوئے محبوب سے زیادہ ہے۔ آگ کو دیکھ کر شائقین کے دلوں میں شمع تمنا روشن ہو جاتی ہے۔ حقہ نہیں کوئی عاشق ہے جو پری پیکروں کے لبوں کو چومتا اور ماہ جبینوں کے ہونٹوں کا رس چوستا ہے، پیچوان کو بلبل ہزار داستان کہتے ہیں کہ جس کی آواز مشتاقوں کو نغمہ و سرود سے بہتر معلوم ہوتی ہے، حقے کو بادشاہ سمجھیے کہ چلم کا تاج رکھے، نے کا جھنڈا اٹھائے گڑگڑاہٹ سے اپنی جہاں گیری کا نقارہ بجا رہا ہے۔"[۱۲۵]

لیکن اس کے فوراً بعد اس کے نقصان بیان کرتا ہے :

"یہ کالی بلا (تمباکو) سب نشوں سے بدتر اور تضییع اوقات کا موجب ہے۔ زبان کو ذکر خدا سے اور منہ کو یادِ الٰہی سے روکنے میں قفل کا کام کرتا ہے، بوالہوس شراب خور، ٹھرے باز البتہ اسے دوست رکھتے ہیں، ورنہ نیک ذات، خوش صفات اہل دل اس کے پاس تک نہیں پھٹکتے ... اس کے استعمال سے چہرہ بونق، رنگت سیاہ ہو جاتی ہے۔"[۱۳۵]

تمباکو نوشی کی مذہبی مخالفت بھی ہوئی، اس کے خلاف فتوے بھی جاری کیے گئے، لیکن اس کے باوجود اس کا استعمال بڑھتا گیا اور حقے نے بہت جلد ہندوستانی ثقافت میں انتہائی اہم مقام حاصل کر لیا۔ اس کے استعمال میں طبقاتی تخصیص قائم ہوتی چلی گئی، حقہ اور اس کے لوازم میں

---

۱۱۵ سجان رائے بٹالوی : خلاصۃ التواریخ (اردو ترجمہ) لاہور ۱۹۶۶، ص ۵۸۴

۱۲۵ ایضاً۔ ص ۸۵ - ۵۸۴

۱۳۵ صباح الدین عبدالرحمن - ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے ... عظم گڑھ ۱۹۶۳ء، ص ۱۸۰

اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ امرا کے حقے خوب صورتی، زیب و زینت اور آرائش میں عوام کے حقّوں سے بڑھتے گئے۔ امرا کے حقے کو چاندی یا گنگا جمنی طشت میں رکھا جاتا تھا، جس میں گلاب کا پانی بھرا ہوتا تھا، اسے فرشی بھی کہتے تھے، حقے میں نے لگائی جاتی اور اس کے اوپر چلم رکھی جاتی، چلم کو سرپوش سے ڈھکا جاتا تھا جو "چنبر" بھی کہلاتا تھا۔ منہلالی وہ چیز تھی جس کو لبوں سے لگا کر حقہ پیا جاتا تھا، حقے کو خس سے بھی ٹھنڈا کرتے تھے اور اسے عطر میں بھی بسایا جاتا تھا اسی طرح تمباکو مختلف انداز میں خوشبوؤں میں بسایا جاتا تھا۔

آخری عہد مغلیہ میں حقہ بادشاہ کے دربار میں جگہ پا چکا تھا۔ محمد شاہ کے دربار میں پیچوان کا رواج ہوا۔ جب بادشاہ تختِ رواں پر سیر کے لیے جاتا تو حقہ بردار ساتھ ہوتا، ابتدا میں پیچوان دربار میں صرف بادشاہ کے سامنے لگتا تھا لیکن بعد میں درجہ اول کے امرا کو دربار میں اس کی اجازت مل جاتی تھی کہ وہ حقہ پئیں۔

مغلیہ دور میں حقہ اور تمباکو نوشی کے انتظامات کی غرض سے ایک علیحدہ محکمہ قائم ہوا جو بھنڈار خانہ کہلاتا تھا اور حقہ پلانے والے ملازم کو بھنڈار بردار کے نام سے پکارا جاتا تھا، بزمِ آخر کے مصنف نے آخری دو مغل بادشاہوں کے دربار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کے حقے کی عادت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ صبح کے وقت جب بادشاہ حقہ پیتے تھے تو :

"بھنڈے خانہ والیوں نے بھنڈہ تازہ تیار کر کارچوبی، زیر انداز بچھا چاندی کے تامش میں لگا دیا۔ کٹوری تیار کر کے بھنڈے پر رکھ دی، بادشاہ نے بھنڈا نوش کیا۔"[۱۴]

جب ابتدا میں انگریز ہندوستان میں آئے تو انھوں نے جہاں ہندوستان کی دوسری روایات کو اختیار کیا وہاں حقہ پینے کی عادت بھی ان میں پڑ گئی۔ انگریز گھروں میں حقے کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازم ہوتا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ حقے کی نے کو جو سونے کی بنی ہوتی تھی صاف ستھرا اور چمکا کر رکھے، کوئلے سلگائے اور گلاب کا پانی تبدیل کرے۔ یہ اپنے آقا کے ساتھ ہر دعوت میں جاتا تھا اور کھانے کے بعد تمام ملازمین خاموشی سے حقے لے کر کمرے میں آتے اور اپنے اپنے

---

[۱۴] منشی فیض الدین ــــ بزمِ آخر ــــ لاہور ۱۹۶۳ء ۔ ص ۱۴

کے پاس حقہ تھام کر کھڑے ہو جاتے، بعد کے زمانے میں خواتین نے بھی حقہ پینا شروع کر دیا تھا اور اگر وہ کسی مرد کو نے پیش کرتیں تو یہ اس کے لیے بڑا اعزاز ہوتا تھا[۱۵]

ہندوستان کی ریاستوں میں بھی حقہ شانِ امتیاز بن گیا، مثلاً اودھ کے دربار میں اسے کوئی بھی بادشاہ کی موجودگی میں نہیں پی سکتا تھا جب تک کہ اسے اس کی اجازت نہ ملے۔ بادشاہ کی موجودگی میں حقہ پینے کا امتیاز گورنر جنرل، کمانڈر ان چیف، ریذیڈنٹ اور کلکتہ کے بشپ کو تھا۔ اس اعزاز کو برقرار رکھنے کے لیے یہاں تک ہوتا تھا کہ اگر کوئی گورنر جنرل یا ریذیڈنٹ حقے کا عادی نہ ہوتا تھا تو اس کے لیے بغیر تمباکو اور بغیر آگ کے حقہ لایا جاتا اور وہ اس کی نے کو محض منہ میں رکھ کر اپنے اعزاز کا اظہار کرتا تھا[۱۶]۔ ۱۸۴۰ء تک انگریز سوسائٹی میں حقہ عام رہا، بعض انگریز تو اس کے اس قدر عادی ہوئے کہ اس کو اپنے ساتھ انگلستان تک لے گئے لیکن اس کے بعد اس کا استعمال کم ہوتا چلا گیا۔

امرا کے طبقے کے ساتھ ساتھ حقہ عوام میں بھی بہت جلد مقبول ہو گیا اور ان کی محفلوں اور مجالس میں جب حقہ گردش کرتا اور محفل کا ہر شخص باری باری حقے کا کش لگاتا تو یک جہتی کی بہترین مثال پیش کرتا اور جب کسی کو ذات برادری سے خارج کر کے اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا تو اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہوتی تھی۔

---

۱۵ Dennis Kincaid : British social life in India (1600 - 1937) London 1938 - Repr. 1973, p 93.

۱۶ Meer Hasan Ali (Mrs) : observations of The Mussulmauns of India. London 1832 - Repr. Karachi 1937, p, 178. Fany Parks : wanderings of a Pilgrim in search of The Picturesque. London 1850 - Repr Karachi 1957, i, p 189.

پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج

شاہد حسین رزاقی

پاکستانی معاشرے کو نئے سانچے میں ڈھالنے اور قومی ترقی کی راہ ہموار کرنے کے لیے رسوم و رواج کی اصلاح بہت ضروری ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے رسوم و رواج بڑی تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں اور ان رسموں کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی گئی ہے جو اخلاقی اور اقتصادی لحاظ سے بہت بری اور نقصان رساں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ رسوم میں ضروری ترمیم و اصلاح کرنے اور معیوب و مضر رسم و رواج کو بالکل ختم کر دینے کے لیے مفید اور قابلِ عمل تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب پر مصنف کو یونیسکو کا انعام ملا ہے۔

صفحات ۲۸۶ قیمت -/۱۲ روپے

عقلیاتِ ابنِ تیمیہ

مولانا محمد حنیف ندوی

غزالی کے بعد علامہ ابن تیمیہؒ دوسرے شخص ہیں جنھوں نے اسلام کے نظامِ حیات کا اس وقتِ نظر سے جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ تفسیر، حدیث، تصوف اور فقہ و اصول کی تشریح میں ہمیں کن پیمانوں سے کام لینا چاہیے۔ علامہ کی پوری زندگی الحاد و زندقہ کے خلاف جہاد میں بسر ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے جس کامیابی و ہنرمندی کے ساتھ کتاب و سنت کے رخِ زیبا کو نکھارا ہے، بدعات کی پُرزور تردید کی ہے، اور اسلام کے چہرۂ روشن سے یونانیت اور عجمیت کے دبیز نقابوں کو ہٹایا ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے "عقلیات" کو بہ کمال ژرف نگاہی کھنگالا ہے اور تنقید و احتساب کے بعد ثابت کیا ہے کہ ان کے مقابلے میں اسلام کا عقلی موقف کہیں زیادہ صحیح، استوار اور متوازن ہے۔ اس کتاب کا موضوع ان کی یہی گراں قدر تنقیدات ہیں۔

صفحات ۴۵۹ قیمت ۳۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

خالدہ اختر

لاہور کی تاریخی، علمی اور ثقافتی حیثیت

لاہور دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا زمانہ موہنجو ڈرو اور ہڑپہ کا زمانہ ہے لیکن ہم کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے کہ یہ کبھی بے آباد نہیں ہوا، ہمیشہ آباد ہی رہا ہے۔ حفیظ جالندھری نے اپنی ایک نظم میں لاہور کی اس خصوصیت کو یوں بیان کیا ہے:

وہی لاہور ہے وہی در و بام ۔۔۔ وہی ہنگامۂ خاص و عام
زلزلے، آگ، آندھیاں، سیلاب ۔۔۔ لائے تشریف، چل دیے ناکام

اصلی لاہور دریائے راوی کے جنوب میں ایک میل اور ضلع کی مشرقی حد سے تقریباً ۲۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے یہ شہر ۷۰۶ فٹ کی بلندی پر ہے[۱]۔ لاہور کو مختلف مصنفین نے مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی مصنف نے اس کے کئی نام لکھے ہیں۔ مختلف مورخین اور جغرافیہ دانوں نے اس کو جن مختلف ناموں سے لکھا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں: "لہانور"، "الاھوار"، "لہاور"، اور "لاہور" ہیں[۲]۔

عموماً مشہور یہ ہے کہ مہاراجہ رام چندر اوتار کے فرزند مسمی "لو" نے یہ شہر آباد کیا تھا اور "لوپور" نام رکھا تھا۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال گزرنے کے سبب "لوپور" کا لفظ بگڑ کر "لاہور" ہو گیا۔

کئی سو سال یہ شہر پنجاب کا دارالحکومت رہا ہے۔ کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اگرچہ شاہانِ چغتائی کی عملداری سے پہلے پنجاب کا دارالحکومت دیپال پور تھا، مگر بابر و ہمایوں کے عہد میں شہر لاہور ہی دارالسلطنت قرار پایا۔ جب اسلام کا زمانہ آیا اور مسلمان بادشاہوں نے کئی ملکوں میں قوت حاصل کی تو

۱۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری "وہی لاہور" نقوش لاہور نمبر ۹۲۔ فروری ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۲۲
۲۔ محمد باقر، لاہور۔ لاہور پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص ۱۔ لاہور، پنجاب یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۲ء
۳۔ ایضاً

سلطان سبکتگین غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا، اس وقت بھی اس شہر کا نام لاہور تھا اور راجہ جے پال برہمن پنجاب کا فرماں روا لاہور میں صاحبِ تخت و تاراج تھا۔ پہلے اس شہر کی کھلی آبادی تھی۔ پھر اس کے گرد فصیل بنا دی گئی۔ یہ بلند فصیل سکھوں کے عہدِ حکومت تک قائم رہی۔ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں اس قدر بلند فصیل کو فضول تصور کیا گیا۔ چنانچہ پہلے نصف اور دوسری دفعہ باقی ماندہ فصیل بھی گرا دینے کا حکم ہوا۔[۵۴]

لاہور بے شمار تاریخی ادوار سے گزر چکا ہے اور ہر تاریخی دور میں اس کو علم و حکمت کے لحاظ سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، خصوصاً مسلمانوں کے عہد میں اس کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی۔ جہاں تک تعلیمی ترقی کا تعلق ہے، وقت کے حکمرانوں کی بیشتر توجہ اس شہر کے علمی اداروں کی ترقی پر مرکوز رہی۔ سلاطینِ دہلی اور مغل بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ اس امر کی روشن دلیل ہیں۔[۵۵]

خاندانِ مغلیہ کا دورِ حکومت برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی سمجھیے یا درسِ عبرت کہ اس سرزمین کے مسلمانوں کی سطوت و اقبال کا اختتام ایک ایسے باب پر ہوا کہ جس کے ایک ایک صفحے پر ایسی دلآویز اور پرشکوہ داستانیں بکھری پڑی ہیں، جن کے سامنے تمام گزشتہ حکایتوں کی دلچسپیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ یہ عہد اس برِصغیر میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا نقطۂ عروج ہے۔ کیوں کہ اس زمانے میں مسلمان سیاسی، ثقافتی، علمی اور ادبی غرض ہر گوشے اور ہر میدان میں انتہائے کمال پر نظر آتے ہیں۔ اسی خاندان کا پہلا فرماں روا بابر خود صاحبِ علم اور علما و فضلا کا مربی تھا۔ اس کے بعد ہمایوں بھی علمی رجحانات لے کر اٹھا۔ بعد ازاں اکبر کا عہد بھی علم و فضل کا مرقع نظر آتا ہے۔ سید محمد لطیف کا یہ بیان قابلِ غور ہے کہ "لاہور، پنجاب کا پہلا شہر ہے، جسے مغلیہ سلطنت کے قیام پر فائدہ ہوا۔ ابتدائی مغل شہنشاہوں کے زمانے (جسے لاہور کی تاریخ کا درخشاں باب کہا جاتا ہے) میں ہی لاہور شاہی مستقر بن گیا۔ یہ بادشاہ علم و ادب کے بہترین سرپرست تھے۔ ان کی شاہانہ عنایات سے لاہور جلد ہی علوم و معارف کے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا اور یہ شہر ادبا، شعرا، مورخین

---

۵۴ رائے بہادر کنہیالال، تاریخ لاہور۔ ص ۸۔ لاہور، وکٹوریہ پریس ۱۸۸۴ء

۵۵ خواجہ نور الٰہی "پنجاب پبلک لائبریری" نقوش لاہور نمبر ۹۲۔ فروری ۱۹۶۲ء۔ ص: ۹۰

اور علمائے معقول و منقول کا ملجا و ماوی قرار پایا۔ یہ ارباب کمال بخارا، سمرقند، ماوراء النہر اور دوسرے ایشیائی ممالک سے کشاں کشاں لاہور میں جمع ہو گئے تھے۔[۵۵]

دورِ حاضر میں بھی یہ شہر ہماری تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کی سب سے قدیم اور مشہور دانش گاہ (پنجاب یونیورسٹی) اسی شہر میں ہے۔ کالجوں اور سکولوں کی سب سے زیادہ تعداد اسی شہر میں ہے۔ علمی دنیا میں اس کی مرکزی حیثیت کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہاں کتب خانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ پاکستان کے دو قدیم ترین اور ہر لحاظ سے بڑے کتب خانے بھی اسی شہر کی شہرت کو دوبالا کیے ہوئے ہیں۔ قدیم اور تاریخی عمارات بھی سب سے زیادہ اسی شہر میں ہیں۔ یہاں کے باغات، مزارات اور نوادر امتدادِ زمانہ کی ابھری ہوئی تصویریں ہیں۔ یہاں کی مساجد، مسلمانوں کے عہدِ گزشتہ کی زریں یادگار ہیں۔ یہاں کا شاہی قلعہ، شالامار باغ، جہانگیر کا مقبرہ مغل دور کی یاد دلاتا ہے۔ حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت میاں میرؒ کے مقابر مسلمانوں کی روحانیت کے علم بردار ہیں۔ یہاں کے کالج تعلیم و تدریس کی ایک ایسی شمع روشن کیے ہوئے ہیں، جس کی روشنی سے سارا پاکستان جگمگا رہا ہے۔ یہ وہ خطۂ پاکستان ہے، جہاں مجدد الف ثانی جیسی ہستیوں نے دین کی شمع کو ازسرِ نو روشن کیا اور مخلوقِ خداوندی کے ایمان تازہ کیے۔ لاہور کی سرزمین اپنے اندر بے شمار بزرگانِ دین کے علاوہ کئی تاریخی ہستیوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ "مغلوں کے عہدِ فرماں روائی کی واحد دانش ور ملکہ نور جہاں اسی لاہور میں آسودۂ لحد ہے۔ ہندوستان کا پہلا مسلمان فرماں روا قطب الدین ایبک اسی لاہور میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ جہانگیر بادشاہ یہیں مدفون ہے۔ ممتاز محل کا والد آصف خاں بھی یہیں محوِ خواب ہے۔ حتیٰ کہ مشرق کی نشاۃِ ثانیہ کے محرک اور پاکستان کے نقاش علامہ اقبال بھی اسی خاک کے مدفن میں سوئے ہوئے ہیں۔ سکھوں کے پہلے تاج دار رنجیت سنگھ کی سمادھی بھی لاہور ہی میں ہے۔"[۵۶] بہرحال بہت سے مشہور علما اور معروف فضلا اس شہر میں محوِ استراحت ہیں۔

---

[۵۵] سید محمد لطیف، لاہور۔ اِٹس ہسٹری، آرکیٹکچرل ریمنز اینڈ اینٹیکوٹیز، ص ۲۱۔ لاہور۔ سید منہاج الدین، ۱۹۵۶ - ۵۷

[۵۶] شورش کاشمیری، سیاسی تحریکیں، نقوش لاہور نمبر ۹۲ فروری ۱۹۶۲

لاہور پاکستان کا دل ہے۔ یہ علاقہ اپنی تاریخی، عمرانی، صنعتی اور معاشی خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس علاقے کی اپنی روایات و خصوصیات ہیں، جن کا عکس شہر لاہور میں اپنی پوری رنگا رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی مقام کی عظمت و اہمیت اس کی تہذیبی ثقافتی روایت سے وابستہ ہوتی ہے جو وہاں کے رہنے والے قائم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے زندہ دلانِ لاہور ایسی روایت قائم کرنے میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ اَوْ اِنْسَانٌ اَوْ بَهِيْمَةٌ اِلَّا كَانَ لَهُ بِهٖ صَدَقَةٌ۔

(صحیح بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ وما جاء فیہ۔ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کاشت کرتا ہے، پھر اس سے کوئی پرندا یا انسان یا ڈھور ڈنگر کچھ کھا لیتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باغبانی، درخت لگانے اور زراعت و کاشت کاری کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور باغ بانوں اور زراعت پیشہ لوگوں کی تعریف کی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو انتہائی محنت اور مشقت سے کام کرتا ہے۔ بنجر زمینوں کو آباد کرتا اور زمین کا سینہ چیر کر اپنے لیے بھی سامان خورد و نوش مہیا کرتا ہے، دوسروں کو بھی غذا بہم پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جفاکشی اور مشقت جو اس طبقے کے حصے میں آئی ہے، اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کی محنت اور کمائی سے انسان بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، پرندے بھی اپنی روزی حاصل کرتے ہیں، ڈھور ڈنگر بھی اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور درندے بھی جو انسان کے دشمن ہیں، زندہ رہنے کے لیے اسی کے دست نگر ہیں۔ اس اعتبار سے یہ پیشہ نہایت اہم ہے کہ بلا کسی امتیاز کے ہر ذی روح اور جاندار کو اس سے برابر فائدہ پہنچ رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسان اور کاشت کار طبقہ اللہ کے نزدیک بڑی اہمیت کا مالک ہے اور وہ صرف زراعت کا کام کرنے کی وجہ سے اجر و ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے اس کی نیت اگرچہ ثواب حاصل کرنے کی نہ بھی ہو۔ اس لیے کہ اس کے فعل زراعت سے تمام خلق خدا کو فائدہ پہنچتا ہے، خواہ وہ قصداً کسی کو فائدہ پہنچانا چاہے یا نہ چاہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اصل نیکی اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانا اور وہ کام کرنا ہے جو اس کی بہتری کا سبب

ہو۔ جس کام سے خلقِ خدا کو جتنا زیادہ فائدہ پہنچے گا، اس کا کرنے والا اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ زراعت اور کاشت کاری میں چوں کہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور عام خلقِ خدا کی نفع رسانی کا پہلو زیادہ واضح اور نمایاں ہے، اس لیے اس کی فضیلت بھی بہر صورت زیادہ ہے۔

علامہ بدرالدین عینی اپنی مشہور کتاب عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وفیہ حصول الاجر للغارس والزارع وان لم یقصد ذٰلک، حتٰی لو غرس وباعہ اوزرع وباعہ کان لہ بذلک صدقۃ لتوسعتہ علی الناس فی اقواتھم[1]

یعنی اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ درخت لگانے اور کھیتی کرنے والے کو اجر و ثواب حاصل ہوگا، اگرچہ اس کام سے اس کی نیت حصولِ ثواب کی نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے سبب وہ لوگوں کی روزی میں وسعت اور اضافہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اگر وہ درخت لگا کر بیچ دے یا کھیتی کا غلہ فروخت کر دے، جب بھی اس کو اس کا اجر ملے گا۔

کھیتی باڑی کرنا اور درخت لگانا وہ کام ہے جو کرنے والے کے لیے صدقۂ جاریہ ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس کے اثرات نہایت وسیع ہوتے ہیں۔ اس سے اللہ کی ہر قسم کی مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔ غلہ خود کھاؤ یا دوسرے کو کھلاؤ یا بیچ دو، بہر حال مخلوق اس سے غذا حاصل کرتی اور نفع اندوز ہوتی ہے۔ اسی طرح درخت، زمین میں برقرار رہے تو انسان، چرند پرند اور ڈھور ڈنگر اس کے سائے سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر اسے کاٹ دیا جائے تو لکڑی کی صورت میں اس سے بہت سے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں۔

غرض کاشت کار اور زراعت پیشہ لوگوں کا شمار اللہ کی بہترین مخلوق میں ہوتا ہے اور ان کا کام ان کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہے، اس لیے کہ ان کی زرعی کوششوں اور سرگرمیوں سے تمام خلقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہے۔

---

[1] عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ج ۵ ص ۱۱۷

نقد و نظر

حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں

تصنیف : عبداللہ قریشی

ناشر : بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور

کاغذ، طباعت، جلد، سرورق دیدہ زیب صفحات ۳۶۴ - قیمت ۴۰ روپے

جناب عبداللہ قریشی صاحب پاکستان کے مشہور اہلِ قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں" ان کی عمدہ ترین کتاب ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی ان علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو اس سے پہلے لوگوں کے علم میں نہ تھیں۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں اس کتاب کو بہت بڑی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بڑے بڑے عنوانات آٹھ ہیں۔ جو یہ ہیں :

(۱) جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست (۲) لاہور کے مشاعرے (۳) انجمن کشمیری مسلمانان، (۴) اقبال کا تعلیمی سفر (۵) اقبال اور فوق (۶) اقبال اور طریقت (۷) اقبال اور کشمیر (۸) عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں ـــ پھر ان عنوانات کے ذیلی عنوانات ہیں۔

علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف گوشوں کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے واقعی حیاتِ اقبال کی بہت سی گم شدہ کڑیاں نکھر کر قاری کے سامنے آجاتی ہیں، اور یہ کڑیاں بہت دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی ـــ! کتاب کے فاضل مصنف عبداللہ قریشی صاحب کہنہ مشق مصنف اور مانے ہوئے محقق ہیں۔ زبان اور اسلوبِ بیان ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ "پیشِ کلام" ممتاز ادیب و مصنف جناب احمد ندیم قاسمی صاحب نے تحریر کیا ہے جو کتاب اور صاحبِ کتاب کے تعارف پر مشتمل ہے۔ کتاب معنوی حسن کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے اور بہترین ٹائپ میں طبع ہوئی ہے۔ ۳۶۴ صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب واقعات و معلومات کا گنجینہ ہے۔ ہم اپنے

معزز قارئین سے گزارش کریں گے کہ وہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

میری نئی بیاض

از : راسخ عرفانی

ناشر : مکتبۂ نور ادب، چوک نیا ئیں۔ گوجرانوالہ

کاغذ، طباعت، جلد خوب صورت۔ صفحات ۱۱۲ قیمت، ۲۰ روپے

راسخ عرفانی کا شمار اردو کے مستند اور کہنہ مشق شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے شعر میں مشاہدہ بھی ہے اور پختگی بھی، گہرائی بھی ہے اور تجربہ بھی، حسن بھی ہے اور فن سخن وری پر عبور بھی۔ غرض وہ ہر لحاظ سے کامیاب شاعر ہیں۔ شاعری کی وساطت سے انھوں نے اردو زبان کی بہت خدمت کی ہے۔ ان کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو کر اصحاب ذوق سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ راسخ کی شاعری حقیقت کی ترجمانی اور واقعات کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔

ان کا تازہ مجموعہ کلام "میری بیاض" شان دار چیز ہے۔ یہ مجموعہ ان کے اپنے خط (ہینڈ رائٹنگ) میں طبع ہوا ہے۔ کتنے عمدہ شعر ہیں :

زلزلے آئے کبھی آگ کے طوفاں گزرے — حادثے کتنے سر شہرِ غریباں گزرے
سر کسی در پہ قناعت نے جھکانے نہ دیا — کوچۂ زر سے کبھی ہم خاک بداماں گزرے
تپتے صحراسے گزرنا ہی جو لازم ٹھہرا — آدمی کیوں نہ بہ اندازِ غزالاں گزرے

راسخ عرفانی کا یہ مجموعہ لائق مطالعہ ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی ۔ دسمبر ۱۹۶۲ء

ترجمہ اسلام کے قرنِ اولیٰ میں (مسلسل)	مولانا محمد عبد اللہ رازق دہلوی
عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں محرکات، مسائل اور مقاصد (مسلسل)	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
شریف التواریخ (مسلسل)	پروفیسر محمد اسلم
وشوا بھارتی یونیورسٹی کے فارسی، عربی اور اردو مخطوطات (مسلسل)	جناب عبد الوہاب بستوی

بینات، کراچی ۔ نومبر ۱۹۸۲

شیخ فرید الدین پشاوری	ڈاکٹر محمد حنیف
مولانا قاضی قمر الدین چکڑالوی	مولانا عبد اللہ
حضرت علیؓ کے بارے میں چند شبہات کا ازالہ	مولانا محمد یوسف لدھیانوی

تعمیرِ انسانیت، لاہور ۔ دسمبر ۱۹۸۲

دِل	خواجہ بدر الدین باندے
مشکلات القرآن	علامہ رشید رضا ۔ ترجمہ، یوسف عصمت ایم اے
نظامِ قرآن (مسلسل)	قمر بھٹ
قرآن اور رحمت	ایم بشیر احمد
عصرِ حاضر میں اسلامی تحقیق کی ضرورت	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
احترامِ آدمی	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

جامعہ، دہلی ۔ اکتوبر ۱۹۸۲

گرو چیلا خادم کسب کا بھائی	پروفیسر محمد مجیب
اقتصادیات کا مطالعہ	مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم
ہمارے کتب خانے ویرانے	مولانا شوکت علی مرحوم

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن : مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرالیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایہ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اُٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری

جلد اول — محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیات غالب : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

فروری ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس لاہور

فون ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

۱۶	فروری ۱۹۸۳	ربیع الثانی ۱۴۰۳	شمارہ ۲

ترتیب

تاثرات

اسلام، دین فطرت ہے اور انسانی ذہن و فکر سے ہم آہنگ ہے! اس کے کسی پہلو کو لیجیے، عبادات ہوں یا معاملات۔ کسی میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے فکرِ انسانی کو اجنبیت یا بیگانگی کا احساس ہوتا ہو۔ جس معاملے میں جو ہدایات دی گئی ہیں اور جن امور پر عمل پیرا ہونے کے لیے کہا گیا ہے، وہ عین انسانی فطرت کے مطابق اور انسانی ذہن کے موافق ہیں۔

سب سے پہلے عبادات کو سامنے رکھیے، اس میں توحید الٰہی، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو بنیادی ارکانِ دین کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ پانچ ارکان ہیں جن کو ماننا اور جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ان میں کوئی رکن ایسا نہیں جو ذہن پر گراں گزرتا ہو اور جس پر عمل کرنے سے انسانی فطرت ابا کرتی ہو۔ پھر اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں جس پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ ہر رکن کو مدارِ عمل ٹھہرانا اور اپنی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالنا نہایت آسان ہے۔ عمل کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ انسان کی سستی اور کاہلی ہے۔ اگر اس کو دور کر دیا جائے تو راہ کی تمام مشکلات خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور انسان ارکانِ اسلام کا پوری طرح پابند ہو جاتا ہے۔

اسلام کا دوسرا پہلو معاملات کا ہے۔ اس کو بھی اساسی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً صلہ رحمی، لوگوں سے حسنِ سلوک، اخلاقِ حسنہ، کمزور کی مدد کرنا، تجارت اور کاروبار میں بہتر فضا قائم رکھنا، نکاح، طلاق اور وراثت کے معاملات میں کسی فریق کو تکلیف میں نہ ڈالنا اور کسی کو دھوکے اور فریب میں مبتلا نہ کرنا۔ سچ بولنا اور معاملات کو اچھے طریقے سے طے کرنا، ہمسایوں سے بہتر سلوک روا رکھنا اور ہر شخص سے اس کے مرتبے کے مطابق پیش آنا۔ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا اور کسی کو ذاتی رنجش کی بنا پر انصاف سے [illegible] نہ رکھنا۔

اسلام کے یہ وہ اصول ہیں جو انسانی فطرت سے کلی طور پر موافقت رکھتے ہیں اور کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ ان پر عمل کرنا اور ان کے مطابق اپنی زندگی کے شب و روز کو گزارنا ہمارا فرض ہے۔

محمد صادق ندیم

اسلامی قضا

اسلام میں دیگر امورِ شرع کی طرح قضا کا آغاز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو گیا تھا، چنانچہ شارع علیہ السلام ہی اسلام کے پہلے قاضی تھے [1] جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نے بعض علاقوں میں اپنے والی بھیجے جو بیک وقت حاکم بھی ہوتے تھے اور قاضی بھی، مثلاً حضورؐ نے معاذ بن جبل کو یمن اور عتاب بن اسید کو مکہ کی طرف بھیجا [2] اور ان اصحاب نے حضورؐ کی زندگی میں قاضی کے فرائض انجام دیے۔ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے آقا کی اتباع میں خود مدینے میں فرائضِ قضا انجام دیتے تھے اور ان کے والی دیگر بلادِ اسلامی میں عامل ہونے کے علاوہ قاضی بھی ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور تک یہی صورتِ حال رہی۔ چوں کہ خلیفۂ ثانی کے عہد میں فتوحات کا دائرہ پھیل گیا اور سلطنتِ اسلامی وسعت اختیار کر گئی، اب خلیفہ یا ان کے نائب کے لیے دشوار ہو گیا کہ حکومت کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ قضا کے بوجھ کو بھی اٹھائیں۔ چنانچہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قاضی اور حاکم کے مناصب کو جدا جدا کر دیا۔ انھوں نے مدینہ میں اپنے ساتھ ابو الدردا کو قاضی مقرر کیا اور شریح کو بصرہ اور ابو موسیٰ الاشعری کو کوفے کا قاضی مقرر کیا۔ انھوں نے مؤخر الذکر کو جو خط لکھا وہ بہت مشہور ہے اور اس پر احکامِ قضا کا انحصار ہے جو اس میں مکمل طور پر آ گئے ہیں۔ اسلامی فقہ کے مؤلفین کی اکثریت نے اس خط کو اپنی تصنیفات کی اساس بنایا ہے۔ ابن حزم اندلسی (المتوفی ۴۵۶ھ) نے اس خط کو جعلی قرار دیا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہیں بلکہ حضرت عثمان کے زمانے میں کوفے کے والی تھے اور اس وقت کوفے کے قاضی شریح تھے۔ اس خط کی روایت میں قدرے اختلاف بھی ہے۔ ہم

---

[1] محمود بن محمد بن عرنوس، تاریخ القضاء فی الاسلام (قاہرہ، ۱۹۳۴ء) ص ۱۱

[2] کاسانی، بدائع الصنائع۔ مطبعۃ الجمالیہ مصر ۱۹۱۰ء ص ۲

اسے ابن قیم الجوزیہ کی کتاب اعلام الموقعین سے نقل کرتے ہیں:

"امابعد، قضا فرض محکم اور سنت متبعہ ہے - جب تمھارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو سمجھ بوجھ سے کام لو کیوں کہ جس حق کا نفاذ نہ ہو سکے اسے کہنے کا کوئی فائدہ نہیں - اپنی مجلس، توجہ اور قضا میں مساوات کو ملحوظِ نظر رکھو تاکہ صاحبِ منزلت کو تمھارے ظلم سے فائدہ اٹھانے کی رغبت نہ ہو اور نہ کسی ضعیف کو تمھارے انصاف سے مایوسی ہو - شہادتِ شرعی کا پیش کرنا مدعی کی ذمے داری ہے اور مدعا علیہ کے لیے قسم ہے - مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے مگر ایسی صلح نہ ہو کہ حرام کو حلال کر دے اور حلال کو حرام بنا دے - اگر مدعی کہے کہ مدعا علیہ اور شہادت غیر حاضر ہے تو اس کے لیے مدت متعین کر دو اگر مدعی شہادت پیش کر دے تو اس کا حق اسے دے دو - اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کے خلاف فیصلہ دے دو - یہ بہترین عذر ہے اور غلطی سے بچنے کی مناسب ترین صورت ہے - تیرا آج کا فیصلہ آئندہ کے لیے بہتر اور ہدایت یافتہ فیصلے کو مانع نہ آئے جب کہ تو حق کی طرف مراجعت کر رہا ہو، حق ہی قدیم ہے حق کو کوئی چیز باطل نہیں کر سکتی، حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں پڑے رہنے سے بہتر ہے - مسلمان ایک دوسرے کے خلاف شہادت دے سکتے ہیں، بجز اس کے جسے جھوٹی شہادت کی سزا مل چکی ہو یا کوڑوں کا سزا یافتہ ہو یا جس پر دوستی یا قرابت داری کی تہمت ہو - بے شک اللہ نے باطن کو بندوں سے مخفی رکھا ہے اور حدود کھلی ہوئی شہادتوں پر ہی قائم کی جائیں گی یا پھر بذریعہ قسم کے - اگر کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے لیے قرآن یا سنت سے معاملہ معلوم نہ ہو سکے تو فہم سے کام لو اور امور میں قیاس کرو اور امثال تلاش کرو - پھر اس بات کا قصد کرو جو اللہ کو محبوب ترین ہے اور حق کے قریب ترین ہے - خبردار! غضب، قلق، ملال، اذیت، جھگڑے یا جھگڑے والوں کی ناپسندیدگی سے بچو (یہاں ابو عبید کو شک ہے کہ لفظ خصومت ہے یا خصوم) کیوں کہ قضا ایسا حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر دیتا ہے اور لوگوں میں بھی اس کا ذکر خیر ہوتا ہے، جس کی حق کے معاملے میں نیت درست ہو، اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے معاملے میں اس کے لیے کافی ہوتا ہے - اور جو جھوٹی زینت ظاہر کرتا ہے اللہ اسے ناپسند کرتا ہے - کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف مخلص بندوں کو ہی قبول فرماتا ہے - اللہ تعالیٰ ثواب و رزق عطا کرتا ہے اور اس کی رحمت کے خزانوں کی انتہا نہیں. والسلام علیکم و رحمۃ اللہ"

یہ خط نقل کر کے ابن القیم سند کے متعلق لکھتے ہیں: "ابو عبید کہتے ہیں: میں نے کثیر سے پوچھا:

کیا جعفر نے اس کی سند دی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ تاہم ابن القیم کہتے ہیں کہ یہ خط مکتوبِ جلیل ہے اور علما نے اسے شرفِ قبولیت بخشا ہے اور اس پر شہادت اور فیصلے کے اصولوں کی عمارت تعمیر کی ہے۔ حاکم اور مفتی اس پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے بعد وہ اس خط کی شرح لکھنی شروع کرتے ہیں جو اعلام الموقعین کی پہلی اور دوسری جلد پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ خط کے مندرجات کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دراصل احکامِ قاضی کا مرجع و اساس کتاب و سنت و قیاس اور امثال و نظائر ہیں اور دلیل کے طور پر حدیث معاذ کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ جلد اوّل کے صفحہ ۲۰۲ پر فرماتے ہیں[۱۳]: " خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو نص قرآن و حدیث نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد کی اجازت دی ہے۔ جب آپ نے معاذ کو یمن بھیجا تو پوچھا: اگر تمہیں عدالتی فیصلہ کرنا پڑے تو کیا کرو گے؟ معاذ نے عرض کیا: میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پھر پوچھا: اگر وہ فیصلہ کتاب اللہ میں نہ ہوا تو کیا کرو گے؟ عرض کی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کروں گا۔ پھر فرمایا: اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی فیصلہ نہ ملا تو کیا کرو گے؟ معاذؓ نے عرض کیا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کے طریق کار پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔"

خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں مندرجہ بالا احادیثِ نبوی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق ہی عمل ہوتا رہا۔ ہر شہر میں علما کی ایسی جماعت موجود ہوتی تھی جو احکامِ شریعت اور تفقہ فی الدین کے اعتبار سے معروف تھی۔ قاضی کو جب کوئی دقت پیش آتی تو اس جماعت کی امداد حاصل کرتا تھا۔ بہت سے قاضی مشکلاتِ قضا خلیفۂ وقت کے پاس بھیجتے تھے۔ مصر کے قاضی عیاض بن عبید اللہ ازدی نے اپنے دور کے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے شفعہ کے مسئلے میں خط لکھ کر استفسار کیا۔ بعض قاضی انتہائی ذہین تھے۔ قاضی شریح، شعبی اور ایاس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کی ذکا کو بطور مثال مشہور شاعر ابوتمام نے مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

---

[۱۳] ابن القیم الجوزیہ: اعلام الموقعین، مطبعہ سعادۃ مصر ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۲

اقدام عمرو فی سماحۃ حاتم فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد ابن القیم الجوزیہ نے اپنی کتاب الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ میں قضاۃ کی فراست کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے:

خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے دور میں قاضی اجتہاد سے کام لیتے تھے اور اپنے احکام میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ بلکہ لوگ تقلید سے مایوس نا آشنا تھے، کیوں کہ ابھی مذاہب اربعہ وغیرہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ دین و دنیا کے امور میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، خلفا اور فقہا صحابہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ دولت عباسیہ کے اوائل میں بھی یہی کیفیت رہی، مگر جب خلیفہ منصور نے بغداد کو عروس بلاد اسلامیہ بنایا تو وہاں دنیائے اسلام کے علما، فقہا، صناع، تجار سبھی جمع ہو گئے اور بہت سے علوم کا نشو و نما ہوا اور بہت سے اہل فارس، اہل روم اور اہل مصر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ فارسی، یونانی اور لاطینی زبان کی بہت سی کتابیں عربی میں نقل کی گئیں اور دوسری اقوام کے علوم اور عقائد کی نشر و اشاعت ہوئی۔ جدل اور مناظرے کا دروازہ کھل گیا۔ عقل کا بازار گرم ہو گیا اور فکر کی جولانیاں تیز ہو گئیں۔ احکام شرعیہ میں خلل کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لہذا تدوین شریعت اور قواعد تفریع من اصول الشریعۃ کی ضرورت پیش آئی چناں چہ ابو جعفر المنصور نے حضرت مالک بن انس کو اس سلسلے میں ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کے لیے کہا جو حضرت ابن عباس کی رخصت (ڈھیل) اور حضرت ابن عمرؓ کی سخت گیری سے اجتناب کرے، لہذا امام مالک بن انس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب المؤطا تصنیف فرمائی۔ اسی عہد میں عظیم فقہا کا ظہور ہوا اور امام ابو حنیفہ کے علاوہ باقی تین امام بھی عہد عباسیہ ہی میں ہوئے اور اہل سنت میں مذاہب اربعہ کی ترویج ہوئی۔ اسی عصر میں قاضی القضاۃ (قاضیوں کے رئیس اعلیٰ) کا منصب معرض وجود میں آیا۔ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم (المتوفی ۱۸۲ھ) پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، انھوں نے فقہ کی تدوین کی اور اہم کتابیں لکھیں مگر ان میں سے بہت کم ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے کتاب الخراج سب سے زیادہ مشہور ہے جو انھوں نے خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھی تھی۔

اگرچہ فقہ کی تدوین سے قاضیوں کے پاس قوانین کا ڈھانچہ تیار ہو گیا اور مقدمات کا فیصلہ کرنے میں سہولت ہو گئی مگر فقہی اختلافات بڑھ گئے اور مختلف مذاہب فقہ باہم برسر پیکار رہنے لگے

ت بڑھ گئے۔ جج کا منصب تو یہ ہے کہ تعصبات سے بالاتر ہو، مگر محکمۂ قضا کسی نہ کسی مذہب فقہ کے
ے بغیر نہ رہ سکا۔ ہر حکمران کا ردِعمل اس صورتِ حال میں مختلف تھا، مگر سب سے عمدہ کام بلاد
کے امیر یوسف بن عبدالمومن (المتوفی ۵۷۹ھ) نے کیا۔ جب اس نے فقہا کے درمیان اختلافِ کثیر
یہ حکم دیا کہ قاضی فقہ کی فروعات کو چھوڑ دیں اور صرف قرآن شریف اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
بق مقدمات کا فیصلہ کریں، کسی کی تقلید نہ کریں، خود اجتہاد کریں اور قیاس اور اجماع پر انحصار کریں۔
علمائے اسلام نے منصبِ قضا پر فائز ہونے والے شخص کے لیے چند شرائط کا ذکر کیا ہے۔
پہلی شرط اسلام ہے اور قبولِ شہادت کی بھی شرط ہے، اس کی تائید میں یہ آیتِ کریمہ پیش کی جاتی ہے:
وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا۔
اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں پر کوئی اختیار نہیں دیا۔
لہٰذا کافر کا فیصلہ نہ مسلمانوں پر نافذ ہو سکتا ہے اور نہ کفار پر، مگر چونکہ اس آیت میں صرف کافر
ان پر اختیار کی ممانعت ہے، اس لیے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کافر کفار کا قاضی ہو سکتا ہے۔
دوسری شرط یہ ہے کہ قاضی کے لیے بالغ اور عاقل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ نابالغ کے ذمے
اہم کام نہیں لگایا جا سکتا اور عقل کے بغیر مقدمات کی گتھیاں کیسے سلجھ سکتی ہیں۔ چنانچہ امام ماوردی
اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
حتی یکون صحیح التمییز، جید الفطنۃ، بعیداً عن السہو والغفلۃ متوصلاً
بہ الی ایضاح ما اشکل وفصل ما اعضل
حق و باطل میں تمیز کرنے والا، نہایت ذہین اور غفلت اور سہو سے دور رہنے والا ہو تاکہ اپنی ذہانت سے
کی وضاحت کر سکے اور مشکلات کا حل ڈھونڈ لے۔
تیسری شرط ذکورۃ یعنی قاضی کا مرد ہونا ہے۔ اکثر علما نے عورت کے لیے عدمِ جوازِ قضا کا فتویٰ
ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جن امور میں عورت کی شہادت درست ہے، ان میں قضا بھی
ہے۔ کاسانی اس رائے کی شرح کرتے ہوئے بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں:
واما الذکورۃ فلیست من جواز التقلید فی الجملۃ، الا انہا لا تقضی
ود والقصاص، لانہ لا شہادۃ لہا فی ذلک، واہلیۃ القضاء تدور

مع اهلية الشهادة ۵۵

جہاں تک قاضی کے لیے مرد ہونے کا تعلق ہے تو یہ کلی طور پر قضا کے جواز کی شرط نہیں ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ عورت حدود اور قصاص کے معاملات میں قاضی نہیں بن سکتی کیوں کہ ان معاملات میں اس کی شہادت قبول نہیں۔ اور اہلیت قضا کا شہادت کی اہلیت پر انحصار ہے۔

علامہ ابن جریر طبری نے امام ابوحنیفہ کی اس نصف اہلیت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں اور فرمایا ہے کہ عورت تمام احکام میں قضا کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔ امام الماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیۃ میں علامہ ابن جریر طبری کی اس وسیع النظری کو تنقید کا ہدف بنایا ہے اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

لا اعتبار بقول يرده الاجماع مع قول الله تعالى "الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض"

یعنی اس قول کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا جسے اجماع نے رد کر دیا ہو اور خود اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ مرد عورتوں کے قوام مقرر کیے گئے ہیں۔

غالباً وہ قوامون کا معنی حاکم یا اس قسم کی کوئی چیز لیتے ہیں۔ مگر قوام کا تعلق۔ قام، قوماً، قیام وغیرہ سے ہے۔ قوم کے معنی کھڑا کرنے، قائم کرنے، بیدار کرنے، درست کرنے اور قدر و قیمت کرنے کے ہیں۔ عربی کی شہرۂ آفاق لغت کی کتاب تاج العروس میں قام علیہا کے معنی مأنها وقام بشأنها متكفلا بأمرها (اس عورت کی روزی مہیا کی اور اس کے امر کی کفالت کرتے ہوئے اس کی حالت کو قائم کیا) لکھتے ہیں۔

چوتھی شرط قوت سامعہ اور باصرہ کی سلامتی ہے تاکہ اثبات حقوق کی صحت، مدعی و مدعا علیہ میں فرق اور اقرار و انکار کرنے والوں میں امتیاز ممکن ہو اور حق و باطل میں تمیز ہو سکے۔ اس لحاظ سے اندھا قاضی نہیں بن سکتا۔ مگر امام مالک اندھے کو قاضی بننے کی اجازت دیتے ہیں۔ بہرے کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ البتہ سلامتی اعضا قاضی کے لیے ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اپاہج قاضی ہو سکتا ہے۔

---

۵۵ بدائع الصنائع، ج ۷، ص ۳

پانچویں شرط احکام شرعیہ کا علم ہے۔

چھٹی شرط آزادی و حریت ہے یعنی کوئی غلام قاضی نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ غلام تو شہادت دینے کا بھی اہل نہیں ہے وہ تنفیذ احکام اور تفویض عہدۂ قضا کا اہل کیوں کر ہو سکتا ہے۔

ساتویں شرط عدالت ہے، جس کی تعریف ماوردی نے ان الفاظ میں کی ہے۔

ان یکون صادق اللهجة، ظاهر الامانة عفيفاً عن المحارم، متوقيا المآثم، بعيداً عن الريب، مأموناً في الرضاء والغضب مستعملاً لمروءة مثله في دينه ودنياه۔

یعنی عدالت سے مراد یہ ہے کہ صادق القول، امانت دار، حرام چیزوں سے دامن پاک رکھنے والا، گناہوں سے بچنے والا، شبہات سے دور رہنے والا، خوشنودی اور غصہ میں قابلِ اطمینان اور اپنے ہم مرتبہ لوگوں کی طرح دین و دنیا کے معاملات میں مروت سے کام لینے والا ہو۔

گویا یہ تمام خوبیاں ایک قاضی میں پائی جانی چاہئیں اور ان سب کے لیے ایک لفظ عدالت ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ نے قاضی کے منصب کے لیے عدالت کی شرط نہیں لگائی۔ انھوں نے عدالت کو شرطِ کمال سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے فاسق کو بھی قضا کی اجازت دی ہے۔ لیکن امام شافعی نے فاسق کے تقرر برائے قضا کی اجازت نہیں دی، کیوں کہ فاسق کی شہادت قبول نہیں[۵]

فقہائے اسلام نے قاضی کے صحیح تقرر کے طریق کی بہت کچھ تحقیق کی ہے۔ ماوردی کہتے ہیں کہ قاضی کے عہدے کا تقرر دو طرح کے لفظوں سے ہوتا ہے، صریح اور کنایہ۔ صریح الفاظ چار ہیں۔ (۱) میں نے تم کو مقرر کیا (۲) والی بنایا (۳) خلیفہ بنایا (۴) نائب بنایا۔ کنایہ کے الفاظ ہمارے علما کے نزدیک سات ہیں (۱) میں نے تم پر اعتماد کیا (۲) بھروسہ کیا (۳) تمھاری طرف لوٹا دیا (۴) تمھاری طرف کر دیا (۵) تمھیں تفویض کیا (۶) تمھاری وکالت میں دیا (۷) تمھاری طرف منسوب کیا۔ تکمیل تقرر کے لیے اس کے علاوہ چار شرائط بھی لازمی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے والا یہ جانتا ہو کہ جس کو وہ قاضی مقرر کر رہا ہے اس میں اس عہدے کی تمام شرائط موجود ہیں ورنہ تقرر صحیح نہ ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے والے کو

---

[۵] کاسانی۔ بدائع الصنائع جلد ۷، ص ۳

علم ہو کہ قاضی نے اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے یا نہیں۔ اس شرط کا تعلق انعقاد تقرر کے ساتھ نہیں، جیسا کہ پہلی شرط کا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ جس عہدے پر تعیین کیا جائے، اس عہدے کا نام لے کر متعین کیا جائے۔ چوتھی شرط شہر کا تعین بھی ضروری ہے جہاں پر کہ اسے متعین کرنا ہے۔ امام ابوالحسن الماوردی نے احکام السلطانیہ میں قاضی کے فرائض پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل دس فرائض بیان کیے ہیں:

(۱) تنازعات کا فیصلہ کرنا (۲) صاحب حق کو اس کا حق دلانا (۳) جنون اور بچپن کی وجہ سے جن مستحقین کے تصرفات ممنوع ہوں، ان کے نگران مقرر کرنا (۴) اوقاف کی نگرانی (۵) وصیتوں کا نفاذ (۶) اگر بیوہ عورتوں کے ولی نہ ہوں تو رشتہ آنے کی صورت میں ان کا نکاح کرانا۔ امام ابوحنیفہ یہ کام قاضی کے ذمے نہیں ڈالتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ بیوہ خود اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ (۷) حدود (سزاؤں) کا جاری کرنا (۸) اپنے حلقۂ عمل میں مصالح کا خیال رکھنا اور سڑکوں پر ناجائز تجاوزات کو روکنا اور ناجائز عمارت یا مکان وغیرہ نہ بننے دینا۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قاضی یہ کام بغیر کسی مدعی کے استغاثہ کے نہیں کر سکتا۔ (۹) گواہوں اور اپنے اعتماد کے لوگوں کی چھان بین کرنا۔ نیک چلن اور اچھے منتظمین کو عہدوں پر برقرار رکھنا اور بدچلن اور نااہل کارندوں کی جگہ بہتر لوگوں کو دینا (۱۰) مقدمات کے فیصلوں میں ضعیف اور طاقتور میں امتیاز نہ کرنا۔

اگر قاضی قضا میں غلطی کرے اور غلط فیصلہ کرے اور بعد کو اس کی حقیقت کھل جائے تو قاضی سے باز پرس نہ ہوگی، کیوں کہ اس نے حقیقت کی چھان بین میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا بلکہ وہ تو حسبِ امکان مصلحت کا ہی طالب تھا۔ اگر مال کے متعلق فیصلہ دیا تھا تو اگر وہ مال بدستور موجود ہو تو حقیقی مالک کو لوٹا دے، اور اگر جس کے حق میں فیصلہ ہوا تھا اس نے مال کو تلف کر دیا ہے تو اس سے ضمانت لے۔ اگر فیصلہ مالی نہیں ہے جیسے کہ حکم طلاق تو پھر اس حکم کو منسوخ کر دے اور اگر فیصلے کا تعلق حقوق اللہ میں سے کسی ایک حق کے متعلق ہے تو پھر بیت المال پر تعویض (بدلے) کی ذمے داری ہوگی۔ کیوں کہ قاضی کا حکم مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تھا۔ اس لیے اس تعویض کا بوجھ مسلمانوں پر بذریعہ بیت المال کے پڑے گا[۵۶]

---

[۵۶] کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۷، ص ۱۶

قضا ایک امر واجب ہے اور کوئی معاشرہ اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، کیوں کہ عدلیہ کا فرض ہے کہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ حاکم کا فرض ہے کہ عادل کو منصبِ قضا پر فائز کرے اور اس عہدے کے محض طلب گار کو یہ منصب تفویض نہ کرے۔ امام ماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں طلب قضا کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں غیر مجتہد کسی صورت میں قاضی نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طالب اہل اجتہاد ہو۔ اس کی تین صورتیں ہیں، اول یہ کہ وہ ایک نا اہل یا ظالم کو منصبِ قضا سے ہٹانے کے لیے اس کی جگہ اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔ اس صورت میں وہ مستحقِ اجر ہے۔ دوسری صورت عداوتِ ذاتی ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہ ایک قابل آدمی کو ہٹا کر خود قاضی بننا چاہتا ہے تو یہ طلب ممنوع ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ خالی جگہ پڑی ہے اور بیت المال سے تنخواہ ملنے کی امید میں طلب کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر عزت و منزلت کے لیے طلب ہے تو اس کے جواز میں اتفاق ہے مگر کراہت میں اختلاف ہے۔ بعض علما کے نزدیک مکروہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مکروہ نہیں ہے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا اجعلنی علی خزائن الارض۔ اسی سلسلے میں یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ظالم کی طرف سے پیش کی گئی ولایتِ قضا قبول کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر حق پر عمل ہو سکے تو جائز ہے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی خیال سے درخواست کی تھی۔ مگر جو اسے ناجائز سمجھتے ہیں اور ظالم کی ولایتِ قضا سے منع کرتے ہیں وہ یہ دو جواب دیتے ہیں۔ اول یہ کہ حضرت یوسفؑ کا فرعون نیک تھا اور حضرت موسیٰ کا فرعون طاغی تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت یوسف مال کے نگران تھے۔ حاکم یا عامل نہ تھے۔ منصبِ قضا کے حصول کے لیے مال و دولت خرچ کرنا رشوت دینے کے برابر ہے۔

منصبِ قضا کے ترک (رفض) کے حکم کا انحصار اہل کفاءۃ (یعنی اس منصب کی اہلیت رکھنے والے) کی رسد (Supply) اور قوم کو ان کی ضرورت یا طلب (Demand) پر ہے۔ اگر صرف ایک ہی شخص کو اس منصب پر متعین کیا جاتے اور اس کے سوا اور کوئی اس عہدے کا اہل نہ مل سکے تو اس کا قبول کرنا اس شخص پر فرض ہوگا کیوں کہ امت کو اس کی ضرورت ہے[۵] اور اگر متعدد اشخاص اس

---

[۵] کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۷، ص ۴

سے اہل ہوں تو کسی کو اس کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عصور اسلامیہ میں بہت سے علمائے کرام نے منصب قضا کو ترک کیا ہے اور بعض کو تو اس ترک کی وجہ سے مارا بھی گیا ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہ کو اس منصب کو ٹھکرانے پر کوڑے لگائے گئے تھے[۵۵] مگر علمائے متاخرین کا منصب قضا کو قبول کرنے سے انکار کرنا شاید اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے فیصلے میں اپنے آپ کو آزاد محسوس نہیں کرتے تھے اور ان کو خوف تھا کہ حکومت وقت ان کے فرض منصبی میں دخل انداز ہوگی اور انھیں ایسا فیصلہ دینا ہوگا جو ان کے ضمیر کے خلاف ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمائے دین کے اس موقف نے انھیں تاریخ اسلامی میں بلند مقام عطا کیا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت بہت بڑھی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عدلیہ اسلام میں ہمیشہ حقوق انسانی کی علم بردار رہی ہے اور اس نے ایسے ذہین، عادل اور نڈر قاضی پیدا کیے ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

---

۵۵ عبارت یوں ہے : روی ان اباحنیفة رضی الله عنه عرض علیه القضا فضرب حتی ضرب علی ذلك ولم یقبل وكذا لم یقبله كثیر من صالحی الامة۔

پروفیسر طفیل دارا

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی زندگی کا ایک رُخ

اگر کسی انسان کو جانچنا اور اس کا مقام متعین کرنا مقصود ہو تو اسے اسی چوکھٹے کے اندر رکھ کر جانچنا ہوگا جس چوکھٹے کی وہ تصویر ہونے کا داعی ہو۔ کسی شخص کو پرکھنے والے کے اپنے اصول و نظریات کی کسوٹی پر کسنے سے اس کے بارے میں ہماری رائے اور نتیجہ تو سامنے آجائیں گے، مگر زیرِ نظر انسان کے اصل اصول یقیناً تاریکی میں ڈوبے رہ جائیں گے۔ اس روزِ روشن کی طرح واضح اور عدل کے سچے اصول کو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر لاگو نہیں کیا گیا۔ ان کی ہر بات اور ہر عمل اس بات کا داعی ہے کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور اسلامی اصول ان کا لائحۂ حیات۔ لیکن ان کے ساتھ یہ کھلی زیادتی ہے کہ آج تک انھیں غیر مسلموں نے اپنے اپنے اصولوں کی ترازو میں تول تول کر ان پر زمانے بھر کے الزامات تو لگا دیے ہیں مگر کسی کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ عالمگیر کو اسلامی اصولوں پر پرکھے اور اس پرکھ سے حاصل کردہ نتائج کی روشنی میں انھیں دنیا کے سامنے رکھے۔ اورنگ زیبؒ کو ان کی اصل کے مطابق جانچنے کا فریضہ مسلمانوں کے ذمے ہے، مگر ہوتا یہ رہا ہے کہ غیر مسلموں نے اپنے اصولوں کے مطابق ان کے بارے میں جو رائے قائم کر دی ہے، اکثر و بیشتر مسلمان بھی اسی رائے کو صحیح خیال کرتے ہوئے ان کے بارے میں سوچتے اور فیصلے دیتے ہیں۔

اورنگ زیب نے اپنی تمام عمر میں ہر مقام پر اپنے پکے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انسان جن اصولوں کا قائل ہوتا ہے، وہ انھیں پھیلانے اور بہتر صورت میں دیکھنے کی خواہش بھی کرتا ہے اور حتی المقدور سعی بھی۔ اس سلسلے میں اورنگ زیب کی اسلامی خدمات میں ایک عنصر یہ بھی ملتا ہے کہ وہ ایسے موقع کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، جس سے اسلامی شعائر کی خدمت ہوتی ہو۔ وہ اسلامی شعائر کے مراکز، اسلامی درس گاہوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والوں کی ہمیشہ عملاً سرپرستی کرتے تھے۔ اس سے مسلمانوں میں پہلے سے زیادہ دینی شعائر کی طرف جھکاؤ ہونے لگا اور دینی مراکز میں پہلے سے زیادہ رونق نظر آنے لگی۔ ایسا ہونا قدرتی امر تھا، کیوں کہ جس طرف حاکمِ وقت کا رجحان ہو دوسرے لوگ از خود ادھر ہی کو اپنا رخ موڑ لیتے ہیں۔

اورنگ زیب نے اسلامی شعائر کے مراکز اور ان کے متوسلین کی جس طرح ہر موقعے پر کھلے دل سے سرپرستی

کی اور اپنی دین داری کا ایک مفید اور دور رس ثبوت دیا۔ اس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

اپنی تخت نشینی کے بعد ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب نے میرابراہیم ولد میر مغاں کو چھ لاکھ تیس ہزار روپے اور مختلف سامان دے کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ روانہ کیا تاکہ وہ یہ رقم اور سامان حرمین شریف کے اہل استحقاق میں تقسیم کرے۔

اسی سال شہنشاہ کے ایما پر ان کی قیام گاہ کے قریب ایک مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ یہ منقش اور خوش قطعہ مسجد پانچ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی اور اس کی تعمیر پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے صرف ہوئے۔

اورنگ زیب نے ۱۶۶۱ء میں حاجی احمد سعید کو چھ لاکھ ساٹھ ہزار روپے حرمین شریف کی خدمت کے لیے دے کر بھیجا۔ حاجی احمد سعید جب ۱۶۶۵ء میں واپس آئے تو ان کے ساتھ شریف مکہ کا قاصد سعید یحییٰ بھی آیا اور شاہی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس نے تین گھوڑے اور کچھ تبرکات پیش کیے۔ اورنگ زیب نے اسے چھ ہزار روپے اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔

شریف مکہ کے ایک قاصد سید عثمان کو جب اورنگ زیب نے ۱۶۶۸ء میں مکہ مکرمہ کو واپس جانے کی اجازت دی تو اسے نو ہزار روپے اور ایک گھوڑا مع نقرئی ساز کے عطا کیا۔

۱۰۷۸ھ (۱۶۶۸ء) کی سترہ شعبان کو اورنگ زیب اپنے والد مرحوم شاہجہان کے مزار پر گئے۔ انھوں نے وہاں کے مجاوروں کے لیے چالیس ہزار روپے بطور نذر دیے۔

شریف مکہ کا فرستادہ قاصد شیخ علی خاں ۱۶۷۱ء (۱۰۸۱ھ) میں دو عربی گھوڑے اور شمشیر بند و باز نقرہ لے کر اورنگ زیب کے حضور حاضر ہوا۔ اورنگ زیب نے اسے دس ہزار روپے اور کچھ اشرفیاں اور ایک مرصع خنجر عطا کیا۔

اسی سال اکبر آباد سے دہلی جاتے ہوئے اورنگ زیب حضرت خواجہ قطب الدین بختیارؒ اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مزارات پر حاضر ہوئے۔ اور دونوں مزاروں کے مجاوروں کو ایک ہزار پانچ سو روپے بطور نذر پیش کیے۔

۱۶۷۵ء (۱۰۸۵ھ) میں اورنگ زیب نے شریف مکہ کے حاجب سید علی کو مکہ واپس بھیجتے وقت پانچ ہزار روپے اور ایک خلعت دیا۔

۱۶۷۵ء (۱۰۸۵ھ) کے واقعات تحریر کرتے ہوئے مصنف "مآثر عالمگیری" لکھتا ہے: "ہر سال جو رقم

(بطور) نذر حرمین شریفین کو روانہ کی جاتی تھی، وہ اس سال بھی روانہ فرمائی گئی۔ عابد خاں کو میر حجاج مقرر فرمایا گیا اور اسے خلعتِ رخصت مرحمت ہوا۔"

حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کی اولاد میں سید محمد بیجاپوری ۱۶۷۸ء (۱۰۸۸ھ) میں اورنگ زیب سے ملنے آئے۔ اورنگ زیب نے ان کے بزرگ شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی دینی خدمات کے پیش نظر ان کا آٹھ ہزار روپے کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی دینی خدمت ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ ان کے ایک فرزند سید یوسف تھے۔ اورنگ زیب نے حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز کی بزرگی کے اعزاز میں ان کے بیٹے کو ۱۶۷۳ء (۱۰۹۳ھ) میں ایک مادہ فیل بطور انعام دی۔

شریفِ مکہ کا ایلچی مسمّی احمد آغا ۱۶۸۶ء (۱۰۹۶ھ) میں اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اورنگ زیب نے اسے دو ہزار روپے عنایت کیے۔

اورنگ زیب ۱۶۸۷ء (۱۰۹۷ھ) میں حضرت سید بندہ نواز گیسو درازؒ کے مزار واقع گلبرگہ پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے اور وہاں خانقاہ کے سجادہ نشینوں، مجاوروں، زائروں اور محتاجوں میں بیس ہزار روپے تقسیم کیے۔ اگلے برس یعنی ۱۶۸۸ء (۱۰۹۸ھ) کو اورنگ زیب پھر حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز کے مزار پر حاضر ہوئے۔ "خواب گاہ شریف" کے مجاور و خدام کو انعام و عطیات سے شاد فرمایا۔"

اگرچہ کتابوں میں حرمین شریف بھیجی جانے والی صرف چند رقوم ہی کا ذکر ملتا ہے۔ مگر جیسا کہ گزشتہ سطور میں ایک مقام پر کہا گیا ہے، اورنگ زیبؒ ہر سال ایک خطیر رقم مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیجا کرتے تھے۔

انسان کو جو چیز یا بات عزیز ہو، وہ اس کا احترام بھی کرتا ہے۔ اورنگ زیبؒ کو دینِ اسلام سب باتوں سے زیادہ عزیز تھا، اس لیے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اس کے احترام کی پابندی کرتے تھے۔ اپنی عزیز چیز یا بات کو محترم قرار دینا اور مقدور بھر اس کا احترام کرنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کا احترام نہ کیا جائے تو عوام کی نگاہوں میں اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اکبر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں نے اس احترام کو کم ہی مدنظر رکھا تھا، مگر اورنگ زیب نے اس کی اہمیت پر پورا پورا زور دیا اور خود بھی اس کے جملہ پہلوؤں کے احترام کو عملاً قائم رکھا۔ دینی امور کے احترام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کسی نعمت کے عطا ہونے پر خدا کا شکر ادا کرنا احترامِ دین میں شامل ہے۔ اورنگ زیب جنگوں

میں اپنی ہر فتح پر سجدہ ریز ہوجاتے تھے، اور اس فتح کو "سرکارِ عالم پیغمبرِ اسلام کا روشن ترین معجزہ" سمجھتے تھے۔

"قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ اشرفی اور روپے پر کلمہ طیبہ نقش کیا جاتا تھا۔ یہ سکے انسانوں کے ہاتھوں میں آتے اور پاؤں کے نیچے پامال ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ یہ طریقہ بے ادبانہ ہے، اسے ترک کیا جائے، اور اس کے بجائے کچھ اور کلمات سکوں پر کندہ کیے جائیں۔"

اسلام برائی ہی سے نہیں بلکہ ان باتوں سے بھی دور رہنے کی تلقین کرتا ہے جو برائی کا باعث بن سکتی ہوں۔ موسیقی اپنی ساری خوبیوں کے باوجود برائی کے جراثیم سے پاک نہیں، اسی لیے مسلمانوں کو موسیقی سے پرہیز کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اسی امر کے پیشِ نظر اورنگ زیب نے ۱۶۶۸ء (۱۰۷۸ھ) میں یہ حکم دیا کہ "سرگروہ اربابِ نشاط حال خاں، بہرام خاں، رس بین و دیگر موسیقی دان صرف مجرائے شاہی کے لیے دربار میں حاضر ہوں، لیکن نغمہ پردازی نہ کریں، مگر آخر میں بتدریج ان کی حاضری بھی بند ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل عرصے میں ہر خرد و بزرگ کے دل سے نغمہ و سرود کی آرزو قطعاً جاتی رہی۔"

ایک دین دار حاکم یا رعایا کا فرد نہ صرف خود دین کا احترام کرتا اور اسے غیر اسلامی باتوں سے پاک رکھتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے دین کا احترام اور اس پر عمل کا سلسلہ باقی رہے۔ سو ۱۶۶۹ء (۱۰۷۹ھ) میں اورنگ زیب کو پتا چلا کہ ٹھٹھہ اور ملتان کے صوبوں میں بالعموم اور بنارس میں بالخصوص براہمنوں نے ایسے مدارس قائم کر رکھے ہیں، جہاں وہ لوگوں کو "کتبِ باطلہ" کا درس دیتے ہیں اور ہندو اور مسلمان طلبا دور دراز کے مقامات سے سفر کرکے ان علوم کی تحصیل کے لیے آتے ہیں۔ اورنگ زیب نے ان صوبوں کے حاکموں کے نام فرمان جاری کیے کہ یہ مدارس مسمار کر دیے جائیں اور ان علوم کے درس و تدریس کی ممانعت کی جائے۔

مغلیہ بادشاہوں کو سلام کرتے وقت اہلِ دربار اپنا ہاتھ سر پر رکھ لیتے تھے۔ ۱۶۷۰ء (۱۰۸۰ھ) میں اورنگ زیب نے کہا کہ یہ طریقہ سنتِ نبوی کے خلاف ہے۔ آئندہ لوگ مسنون طریقے پر سلام کریں، یعنی صرف زبان سے السلام علیکم کہا کریں، ہاتھ نہ اٹھایا کریں اور نہ ہاتھ اپنے سر پر رکھا کریں اور نہ سجدہ کرنے کے انداز میں جھکا کریں۔

اسی سال اورنگ زیب نے حکم دیا کہ شہزادوں اور امرا کی کشتیوں اور پالکیوں پر فرنگیوں سے مشابہ زنجیریں

نہ لٹکائی جائیں۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو کسی لحاظ سے بھی کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار نہیں کرنی چاہیے تاکہ ان کی اپنی انفرادیت واہمیت برقرار رہے۔

اسلام نے اسراف اور نمود و نمائش سے منع کیا ہے۔ کیوں کہ رعایا کا بادشاہ یا امرا کو نذریں پیش کرنا بھی غیر اسلامی بات ہے، سو اورنگ زیب نے اس دینی حکم کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے ۱۶۷۸ء (۱۰۸۸ھ) میں حکم دیا کہ آئندہ کوئی کسی کو نذر نہ پیش کرے اور لکھنے والے چاندی کی دواتوں کے بجائے چینی اور پتھر سے بنی ہوئی دواتیں استعمال کریں۔ طلائی و نقرئی عود سوز دربار خاص و عام میں نہ سلگائی جائیں۔ غور فرمایئے! معاشیاتی نقطۂ نظر کے مطابق یہ کیسا عمدہ انداز کفایت شعاری تھا۔

احکام شریعت کو رواج دینے کے لیے اورنگ زیب نے ۱۶۷۹ء (۱۰۸۹ھ) میں حکم جاری کیا کہ ذمیوں سے جزیہ وصول کیا جائے۔ یہ یاد رہے کہ مسلمان تو زکوٰۃ اور عشر دیتے ہیں جب کہ جزیہ غیر مسلموں پر اسلامی حکومت کا ایک ٹیکس ہے، جس کی رقم بڑی معمولی ہوتی ہے اور اس کے بدلے میں اسلامی حکومت ذمیوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں جب کہ اسلامی حکومت غیر مسلموں کے جان و مال کی حفاظت کرنے کے قابل نہ رہی تو حکومت وقت نے غیر مسلموں سے وصول کردہ جزیہ انھیں واپس دے دیا۔

۱۶۹۴ء (۱۱۰۴ھ) کا ذکر ہے کہ سادات بارہہ کا ایک سید جو سرکاری ملازم تھا، امان اللہ شاہ سرکاری ملازم کے ہاتھوں مارا گیا۔ سادات بارہہ نے قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب نے انھیں ایسا کرنے سے روکنے کی سعی کی اور اس قرآنی آیۂ کریمہ کا بھی حوالہ دیا۔

"ترجمہ: "اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔"

پہلے تو سادات بارہہ نے اس بات پر کان نہ دھرا اور آخر دو روز گزرنے پر سادات کی ایک جماعت دیوان عدالت سے باہر کی جانب آکر کھڑی ہو گئی۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ وہ قاضی القضاۃ سے رجوع کریں تاکہ قضیے کا شریعت کے مطابق فیصلہ ہو۔ اس پر اس جماعت نے کہا: "ہم کو قاضی سے کیا سروکار! ہم خود اپنے حریف سے نمٹ لیں گے۔"

اورنگ زیب قاضی القضاۃ کی اس درپردہ ہتک پر سخت ناراض ہوئے اور اس جماعت کے کئی افراد کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ بعض افراد کو ان کی ہزار التماس اور مقربان سرکار کی سفارشوں کے

بعد خدمت پر بحال کیا۔

اورنگ زیب ایک باغی راجا راما کے تعاقب میں ۱۷۰۰ء (۱۱۱۱ھ) کو قلعہ بسنت گڑھ سے آگے بڑھ کر مرتضٰی آباد عرف مرچ کے مقام پر خیمہ زن تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ نواح پرگنہ کرمیں ایک مسجد اسلاف کی تعمیر کردہ بطور یادگار کے موجود ہے، مگر ہندوؤں کے زیر اقتدار علاقے میں ہونے کی وجہ سے غیر آباد پڑی ہے۔ یہ اطلاع پاکر اورنگ زیب چار میل کا فاصلہ طے کرکے اس مسجد تک پہنچے اور وہاں دو رکعت نفل ادا کیے، آئندہ اس مسجد کو آباد رکھنے کے پورے پورے انتظامات کیے اور ایک جمعیت اس کی حفاظت کے لیے مقرر کی۔ اس پر وہاں سے ہندوؤں کے ستائے ہوئے مفرور مسلمان آکر آباد ہوگئے اور اورنگ زیب نے ان کی نئے سرے سے آبادکاری کے لیے ایک بڑی رقم دی۔

اورنگ زیب نے ۱۷۰۲ء (۱۱۱۳ھ) میں قلعہ کھیلنا فتح کیا اور خود قرآن مجید سے اس فتح کی تاریخ فال نکالی تو یہ آیت برآمد ہوئی۔ الحمد للہ الذی سخرلنا۔ (یعنی اس خدا کا شکر واجب ہے جس نے ہمارے لیے یہ مسخر کیا) اس لیے اس قلعے کا نام ہی سخرلنا تجویز کیا۔

اگرچہ اپنے آخری وقت میں اورنگ زیب پر مدہوشی اور نقاہت طاری تھی مگر آپ یادِ خدا سے غافل نہ ہوتے، حتٰی کہ عین عالمِ نزع میں کرب واضطراب کے باوجود تسبیح وتہلیل میں مشغول رہے اور اسی حالت میں جان جانِ آفریں کے حوالے کردی۔

اورنگ زیب کے اسلامی شعائر اور دینی مراکز کی سرپرستی اور احترام دینِ اسلام کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، یہ کتب تاریخ میں موجود ہیں۔ یہ لکھا گیا ہے کہ اورنگ زیب ہر سال مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو ایک خطیر رقم بھیجا کرتے تھے، مگر اس کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ صرف چند ایک ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخی کتب میں چند بار ہی رقوم بھیجنے کا ذکر ہے، حالاں کہ اورنگ زیب نے اکیاون (۵۱) برس تک حکومت کی۔ اس لحاظ سے انھوں نے کم از کم اکیاون بار تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو رقوم ضرور بھیجی ہوں گی۔

اسی طرح اورنگ زیب کے احترام دینِ اسلام کے واقعات کو بھی ہم تواتر میں پڑھا کر دیکھ سکتے ہیں۔

اورنگ زیب خیرات کرنے کی طرف بہت ہی مائل تھے اور جگہ جگہ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ وہ ہر شخص کو (بلاتمیزِ مذہب و عقیدہ) غربت یا تنگ دستی کا شکار دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ ان کی یہ عادت بھی اسلامی احکام کی پابندی کی عمدہ مثال ہے۔

اورنگ زیب اپنی جوانی کے آغاز ہی سے تقویٰ و پرہیزگاری کی ایک اعلیٰ مثال تھے اور اس تقویٰ و پرہیزگاری میں ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی گئی، حتّٰی کہ ان کی زندگی کا کوئی نجی یا معاشرتی کام ایسا نہ رہا جو ان میں سے کسی ایک کی گرفت سے باہر ہو۔ اس کی ایک مثال ان کی شہزادگی کے زمانے سے پیش کی جاتی ہے۔

شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو ۱۶۴۷ء میں بلخ کی دور دراز مہم پر بھیجا۔ وہاں ان کا مقابلہ عبدالعزیز سے ہوا۔ ایک دن عین اس وقت جب کہ میدانِ کارزار پوری طرح گرم تھا اور ہر طرف موت ہی موت نظر آتی تھی، اورنگ زیب اپنے ہاتھی سے اترے اور باجماعت نماز میں شامل ہو گئے۔ اگرچہ وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر فوجی افسروں نے سخت خطرے سے آگاہ کیا، مگر انھوں نے فرضوں کے بعد سنت اور نوافل بھی اطمینان سے ادا کیے اور پھر ہاتھی پر سوار ہو کر جنگ میں شریک ہو گئے۔ ان کے تقوے کا یہ عالم دیکھ کر ان کا مخالف عبدالعزیز پکار اٹھا،

" باچنیں کس درافتادن برافتادن است "

(ایسے شخص سے لڑنا خود کو تباہ و برباد کرنا ہے)۔

عبدالعزیز نے یہ کلمات اس لیے کہے تھے کہ اسے معلوم تھا کہ متقی ہمیشہ خدا کے سائے تلے ہوتا ہے اور جو انسان خدا کے سائے تلے ہو، اسے دنیا کی کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

تقویٰ ہر کام اور ہر سوچ میں انسان کو اللہ کی مدد پر پورا بھروسا اور ایسی عظیم طاقت بخشتا ہے، جو کہ دنیا کا بڑے سے بڑا ہتھیار بھی دینے سے قاصر ہے۔ جب مردِ مجاہد کے پاس تقوے کی طاقت اور دنیاوی تلوار ایک ہو جاتے ہیں تو فتح و نصرت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

الفہرست : محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق

اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآن مجید، نزول قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتب فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارس فکر، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعت کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیوں کر عالم وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ قیمت -/۴۵ روپے

اسلام کا نظریۂ تاریخ مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے پیش کردہ اصول تاریخ صرف گزشتہ اقوام کے لیے ہی نہیں بلکہ موجودہ قوموں کے لیے بھی بصیرت افروز ہیں۔

صفحات ۲۱۶ قیمت -/۱۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

سید سبط الحسن ضیغم

تحریک مجاہدین اور برطانوی ریکارڈ

تحریکِ مجاہدین کا قیام پنجاب کی سکھ حکومت کے خاتمے کے لیے عمل میں لایا گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ بست و کشاد بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک سے ان کے دو مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ ایک یہ کہ وادیٔ گنگ و جمن کی مسلم اشرافیہ کے ذہین نوجوان ترکِ وطن کر کے ان کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ پنجابی حکومت کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں جس سے دونوں قوتیں کمزور ہو رہی ہیں۔

"اسی بنا پر کمپنی کے زیرِ تسلط علاقوں میں سید احمد اور شاہ اسماعیل کو کئی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ انھیں نہ صرف ہر جگہ عوام سے خطاب کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ بلکہ ان کی تحریک کے لیے چندے کی فراہمی میں بھی انگریزوں نے تعاون کیا۔ یہاں تک کہ ان مقامی ساہوکاروں پر انگریزی عدالتوں میں مقدمہ چلانے کی اجازت بھی دے دی جو اس روپے کو مجاہدین تک پہنچانے میں کوتاہی برتتے تھے جو انھیں اس مقصد کے لیے دیا جاتا۔ علاوہ ازیں ریل کے کارخانوں اور دوسرے کاروباری اداروں کے مقامی مزدوروں کے جہاد میں حصہ لینے کے لیے مختلف مراعات عطا کی گئیں"[1]

مرزا حیرت دہلوی بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں :

"یہ تمام بیّن ثبوت صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکھوں سے مخصوص تھا۔ سرکارِ انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز مخاصمت نہ تھی"[2]

اردو ادب کے میاں کھوجی حافظ محمود شیرانی نے ہنٹر کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" کے ترجمے پر تنقید کرتے ہوئے ہنٹر کے نقطۂ نظر کی پُرزور اور مدلل تردید کی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں :

"یہاں لفظ باغی پر میرا اعتراض ہے۔ سید صاحب (سید احمد) کے سرحد پہنچنے کے وقت پنجاب و سرحد میں انگریز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر سید صاحب نے انگریز سے کدھر بغاوت کی۔ سید صاحب کی تحریک ہندوستان

---

[1] برصغیر پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ص ۲۶۸، ۲۶۹

[2] حیاتِ طیبہ، ص ۵۲۳۔

میں شروع ہوئی اور ہندوستان میں پروان چڑھی اور یہ سب کچھ انگریزوں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ چوں کہ تحریک سکھوں کے خلاف تھی، اس لیے کمپنی نے دانستہ اعماض کیا اور اپنے علاقے میں اس تحریک کے دبانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے سید صاحب کو ہنٹر کا باغی کہنا اس لفظ کا غلط اور جلد بازانہ استعمال ہے۔[۵۳]

تحریک مجاہدین کا پہلا باب ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو ختم ہوگیا۔ جب سید احمد اور شاہ اسماعیل کو کم وبیش ان کے چار سو ساتھیوں کے ہمراہ بالاکوٹ ضلع مانسہرہ میں شہید کر دیا گیا۔ بقیۃ السیف منتشر ہوگئے۔ ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے دس سال بعد ۱۸۴۹ء میں پنجاب کو انگریزوں نے اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔

اگرچہ مولانا عبدالحلیم چشتی نے سید احمد شہید کا فقہی مسلک حنفی قرار دیا ہے۔[۵۴] لیکن سید صاحب اور شاہ اسماعیل کی کتابوں سے مسلمانوں کے ایک طبقے میں فکری تبدیلی آئی اور اہلِ فقہ کے مقابلے میں غیر مقلد مسلک کی ترویج ہوئی۔ اس مسلک کے حاملین کو ہنٹر نے "وہابی" قرار دیا، کیوں کہ دونوں بزرگوں کی فکر محمد بن عبدالوہاب کے خیالات سے مماثلت رکھتی تھی۔ اس لیے سید احمد اور شاہ اسماعیل کے ہم خیال مسلمانوں کو وہابی، اہلِ حدیث یا غیر مقلد کا نام دیا گیا۔ معرکۂ بالاکوٹ سے منتشر ہونے والوں نے اپنی تحریک کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ ہندوستان یعنی یوپی وغیرہ میں ان کی افرادی اور مالی استعانت کے مراکز قائم تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی پر انگریز نے مسلم اشرافیہ کے خلاف جو بدترین تشدد اور ظلم روا رکھا، اس کے اثرات سوات کے علاقوں میں مقیم تحریک کے باقی حضرات پر بھی پڑے۔ جب ایک بار تلوار باہر آجائے تو پھر اسے آسانی کے ساتھ نیام میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ انگریز سکھوں کا جانشین بن کر سامنے آیا اور دونوں کے درمیان اختلافات نے شدت اختیار کر لی، جس کے باعث "مجاہدین" کا اب سکھوں کی بجائے انگریزوں کے خلاف مورچہ لگ گیا۔

ہندوستان کے بعد اس تحریک کے اثرات پنجاب میں بھی پھیلنا شروع ہوگئے اور پنجاب کے تقریباً ہر شہر میں ان کا فکری اثر پھیلنے لگا جس کی وجہ سے یوپی کی بجائے مالی امداد کے زیادہ تر مراکز

---

۵۳ مکاتیب حافظ محمود شیرانی، ص ۴۸۔

۵۴ الرحیم، ج ۲، شمارہ ۳، اگست ۱۹۶۵ء، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

باب میں قائم ہو گئے، جس سے انگریزوں کا تشویش میں مبتلا ہونا یقینی تھا۔ "وہابی" کے نام سے برٹش حکومت
ی کئی فائلیں کھول رکھی تھیں، جن میں اس مذہبی سکول کی نقل و حرکت، تبلیغ، اشاعت، افراد، مساجد
ر مدارس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اپنی فائلوں میں سے ایک فائل کو PUNJAB CIVIL SECRETARIAT CONFIDENTIAL ANNUAL FILE NO 210 کا نام دیا گیا ہے۔
ن میں اُن قابلِ ذکر وہابیوں کی تفصیل دی گئی ہے جو انیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں پنجاب میں
سرگرمِ عمل تھے۔

ہوم ڈیپارٹمنٹ پنجاب نے ایک گشتی مراسلہ ۲۸ اپریل ۱۸۶۸ء کو پنجاب کے تمام ڈپٹی کمشنروں،
ی سپرنٹنڈنٹوں، سپرنٹنڈنٹوں اور کمشنروں کو ارسال کیا۔ مراسلہ بھیجنے والے کرنل ایچ۔ ایم۔ ملیر انڈر سیکرٹری
گورنمنٹ پنجاب، ہوم (پولیس) تھے۔ مراسلے میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ ہر ضلع میں موجود قابلِ ذکر
وہابیوں کی تفصیلات فراہم کی جائیں۔

اس وقت پنجاب ۲۰ اضلاع پر مشتمل تھا۔ دیسی ریاستوں اور قبائلی علاقوں کے سوا دہلی اور
انبالہ کے علاقے بھی پنجاب میں شامل تھے۔ ہر ضلع سے جوابات موصول ہونے پر فائل نمبر ۲۱۰ ترتیب
دی گئی۔ رپورٹ میں مندرج معلومات کو نو کالموں میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) ڈویژن (۲) ضلع (۳) نمبر شمار (۴) وہابی کا نام (۵) ولدیت (۶) پیشہ یا پیشہ ورانہ عرفیت
(۷) اقامت۔ گاؤں، محلہ، تھانہ، سمت (۸) اصلی اقامت گاہ میں مقیم ہے یا غیر حاضر۔ اگر موجود نہیں
تو کہاں ہے۔ (۹) ریمارکس

فائل نمبر ۲۱۰ کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر پی ہارڈی نے ایک مضمون لکھا جو جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی
آف پاکستان، یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور کی پہلی جلد کے دوسرے شمارے میں شائع ہوا۔ یہی مضمون
پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے شعبۂ مطالعۂ تاریخ کے ریسرچ جرنل پنجاب پاسٹ اینڈ پریزنٹ کے اکتوبر
[illegible]ء کے شمارہ نمبر ۳۰ میں طبع ہوا ہے۔

فائل کے ریمارکس والے کالم میں فرد کی اہمیت، اس کی مالی حالت، جائیداد، ۱۸۵۷ء میں اس نے
کوئی کردار ادا کیا یا نہیں۔ وہ اپنے آپ کو وہابی کہلانے سے انکار تو نہیں کرتا ــــ کے بارے میں مختصر جائزہ
درج ہے۔ عسا ئنہ اور درج کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ قابلِ ذکر وہابیوں کے بارے میں ہے [illegible]

افراد شامل نہیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ رپورٹ اس وقت کے پنجاب میں بسنے والے تمام اہل حدیث حضرات کی مردم شماری نہیں ہے۔ اس میں ان افراد کی تفصیل درج ہے جو سید احمد صاحب کے افکار کے پیرو ہی نہیں ان کی تبلیغ میں بھی مصروف ہیں، صوبہ سرحد میں موجود مجاہدین کے لیے پیسے جمع کرتے ہیں یا انھیں وہاں بھیجنے میں مصروف ہیں یا حکومت انگلشیہ کے خلاف ایسا ہی کوئی عملی کام کر رہے ہیں۔

مؤرخین کے لیے یہ رپورٹ کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ (۱) کسی خاص علاقے میں ان کی تعداد کتنی ہے (۲) کس کس پیشے کے لوگ شامل ہیں اور کس پیشے کے لوگوں کی ان میں اکثریت ہے (۳) طبقاتی تقسیم اور اس کا رول۔ (۴) قابلِ ذکر کردار اجرت پیشہ حضرات کا ہے یا زمین داروں کا۔

۴۔ ضلع وار تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ دہلی ضلع

وہابی مبلغ	۱۴	چمڑے کے تاجر	۱۱	یورپ سے درآمد کنندگان	۳
جوتوں کے بڑے تاجر	۸	کتابوں کے بڑے تاجر	۴	سرکاری سکولوں میں انگلش ٹیچر	۱
عطار، پنساری وغیرہ	۱	محکمہ نہر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ	۱	شاہ دہلی کا مہر ساز	۱
ٹیچر دہلی کالج	۱	کل	۴۵		

۲۔ گوڑگاؤں ضلع

مولوی مبلغ	۳	کل	۳

۳۔ انبالہ ضلع

وہابیت کا پروپیگنڈا کرنے والے	۴	کتب فروش	۲	منشی	۴
ٹھیکہ دار	۲	نائب تحصیل دار	۱	کوئی پیشہ درج نہیں	۱
		کل	۱۴		

۴۔ لدھیانہ ضلع

کاشت کار	۵	کاشت کار اور تاجر	۴	کتب فروش	۲
جوتا فروش	۱	کل	۱۲		

٥۔ فیروزپور ضلع

وہابی مبلغ	١٤	ٹیچر	٧	طالب علم	٥
بیلے بان	٩	کاشت کار	٣٠	پنشنر	٣
کتب فروش	١	(وہابی کہلانے سے منکر) ڈاکٹر	١	انگریز	١
				کل	٧٣
پارچہ باف	٢	ترکھان	١		

٦۔ جالندھر ضلع

مزدور	٣	جلد ساز	١	کیمسٹ	٢
کاشت کار	١	افغان یا پٹھان (کوئی پیشہ درج نہیں)	٢	مولوی	٢
ٹیچر	١	ملازم	١	اپیل لکھنے والے	١
کپورتھلہ ریاست میں ملازم	١	شیخ (کوئی پیشہ درج نہیں)	١	ارائیں	١

کل ١٩

٧۔ ہوشیارپور ضلع

ٹیچر	٤	زراعت پیشہ لینڈ لارڈ	١٠	ڈپٹی انسپکٹر پولیس	٢
ڈاکٹر	٢	فارسی پڑھانے والا	١	ملاّ	١
دوکان دار	١	چیف محرر محکمہ تعلیم	١	پیشی منشی	٢
پیشہ ور فقیر	١	پارچہ باف	١	کل	٢٦

٨۔ امرتسر ضلع

ملاّ	٣	کپڑے کے تاجر	١	تاجر شال	١
پارچہ باف	١	جلد ساز	١	نائب ضلع دار	١
پٹھان (پیشہ درج نہیں)	١	کل	١٠		

٩۔ گورداسپور ضلع

مولوی/قاضی	١١	معمار	٥	کاشت کار	٥
سپاہی (جمعدار)	١	جلد ساز	٢	جوتا ساز	١
پارچہ باف	٣	چمرنگ	١	نمبردار	١

ملازمت	۱	قصاب	۱	لوہار	۱
مختار کار	۱	فقیر	۱	پیشہ درج نہیں	۳

کل ۳۷

۱۰۔ لاہور ضلع

مولوی / پیش نماز	۱۲	وکیسی میٹر	۱	سوداگر، تاجر	۴
سرکاری ملازم (ایک وہابی کہلائے جانے سے انکاری ہے)	۵	کلرک	۲	قاضی	۱
کتب فروش	۱	چمڑے کا ڈیلر	۱	پلیڈر	۱
پیغام رساں	۴	مقامی ڈاکٹر	۱	محکمہ تعلیم کا سابق ملازم نیا (کوئی پیشہ درج نہیں)	۱

کل ۳۴

۱۱۔ ملتان ضلع

مولوی	۱	پارچہ باف، اون اور دھاگے کا تاجر	۲	پاپڑ میکر	۱
پیشہ درج نہیں	۱				

کل ۶

۱۲۔ منٹگمری ضلع

ملّا	۵	کاشت کار	۹	بھکاری	۳
ٹیچر	۳	ملازمین حکومت	۵	کتب فروش	۱

کل ۲۶

۱۳۔ سیالکوٹ ضلع

ہیڈ ٹیچر	۲	زمین دار	۱	ملّا	۴	کل	۷

۱۴۔ گوجرانوالہ ضلع

مولوی	۱۲	نمبردار	۲	کتب فروش سابق ملازم سرکار	۱	کل	۱۵

۱۵۔ راولپنڈی ضلع

ملّا	۱	قصاب	۲	چوہدری	۳
کتب فروش	۲	دوکان دار	۲	حاکم شہر (شیرف میونسپل کمشنر)	۱

چرم گر	۱	خادم	۱	کل	۱۳

۱۶۔ شاہ پور ضلع

مولوی۔ علما	۶	لوہار	۲	تاجر	۱
کل	۹				

۱۷۔ ڈیرہ اسماعیل خان ضلع

مولوی	۴	پارچہ باف	۱	پٹھان (پیشہ درج نہیں)	۱
مزدور	۱	کوتوال	۱	سوداگر	۱
نمبردار	۱	کل	۱۰		

۱۸۔ پشاور ضلع

ڈاکٹر	۱۲	ملا/پیر	۳	پنشنر سرکاری ملازم	۲
کتب فروش	۱	سوداگر/ڈیلر	۵	رکن بلدیہ	۱
کل	۲۴				

۱۹۔ ہزارہ ضلع

مولوی	۱۱	جاگیردار۔ نمبردار	۱۶	گورنمنٹ پنشنر	۲
ڈپٹی پوسٹ ماسٹر	۱	مقامی ڈاکٹر	۱	وکیل	۱
پیش نماز	۱	کل	۵۴		

۲۰۔ گجرات ضلع

ٹیچر	۴	امام مسجد	۱	کلاتھ پرنٹر	۱
قانون گو	۱	کل	۷		

مسطورہ بالا اعداد و شمار کا تجزیہ کئی طریقہ سے کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے پنجاب کے ان بیس اضلاع میں مصروف وہابیوں کی تعداد کے حساب سے ضلعوں کی ترتیب درج کی جاتی ہے۔ ضلع کے آگے تعداد درج کی گئی ہے۔

۱۔ فیروز پور ضلع	۷۴	۲۔ ہزارہ ضلع	۵۴

۳۔ دہلی	۴۵	۴۔ گورداس پور	۳۷
۵۔ لاہور	۳۵	۶۔ ہوشیار پور	۲۶
۷۔ منٹگمری	۲۶	۸۔ پشاور	۲۴
۹۔ جالندھر	۱۹	۱۰۔ امرتسر	۱۵
۱۱۔ گوجرانوالہ	۱۵	۱۲۔ انبالہ	۱۴
۱۳۔ راولپنڈی	۱۳	۱۴۔ لدھیانہ	۱۲
۱۵۔ ڈیرہ اسماعیل خان	۱۰	۱۶۔ شاہ پور	۹
۱۷۔ گجرات	۷	۱۸۔ سیالکوٹ	۷
۱۹۔ ملتان	۶	۲۰ گوڑگاؤں	۳

یہ کل تعداد ۴۵۵ بنتی ہے۔ سب سے زیادہ تعداد فیروز پور میں ہے جو ۴۷ ہے۔ جب کہ دوسرے نمبر پر ضلع ہزارہ ہے۔ ہزارہ کی بات تو سمجھ آسکتی ہے کہ وہاں وہابی مجاہدین نے لڑائی لڑی، بہت سے لوگ وہ آباد ہو گئے۔ لیکن فیروز پور ضلع میں سب سے زیادہ تعداد کا سبب معلوم نہیں۔ کیا اسے "لکھوکے" میں مقیم مولانا حافظ بارک اللہ اور حافظ محمد صاحب تفسیر محمدی (پنجابی) اور احوال الآخرت (پنجابی) کی تبلیغ کا نتیجہ قرار دیا جائے گا یا اور کوئی سبب ہے۔ اگر یہی وجہ ہے تو پھر "لکھوکے" میں مقیم علما کی تبلیغ، امرتسر[15] مقیم غزنوی خاندان اور گوجرانوالہ[15] میں قلعہ میہاں سنگھ کے مولوی غلام رسول صاحب کے مقابلے میں کہیں موثر رہی ہے۔ اس کے بعد ترتیب میں دہلی (۴۵)، گورداس پور (۳۷)، لاہور (۳۵)، ہوشیار پور (۲۶) منٹگمری (۲۶) آتے ہیں۔

لاہور، ہوشیار پور، منٹگمری کے اضلاع کی سرحدیں ضلع فیروز پور کے علاقوں سے ملتی ہیں، جس وجہ سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ملحقہ علاقوں میں بھی حافظ محمد لکھوی کی تدریسی اور تحریری جدوجہد کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ مگر گورداس پور کا تعداد کی وجہ سے چوتھے نمبر پر آنے کا سبب معلوم نہیں ہو سکا۔ کیا کسی پنجابی شاعر کی شعری تخلیقات رنگ لائیں یا کسی عالم دین کی تبلیغ؟

دہلی میں سید نذیر حسین کے علاوہ کئی اور بھی علما موجود تھے۔ صرف مبلغین ہی کی تعداد ۱۴ ہے [illegible] رہتک، حصار اور کرنال کے کئی حصے بھی شامل

تعداد بہت ہی کم (۳) ہے ۔ ملتان میں اس فکر کے حاملین کی تعداد صرف چھ ہے اور اس کے بارے میں رپورٹ میں بھی تجزیہ موجود ہے کہ اس ضلع میں نہ تو یہ لوگ سرگرم ہیں اور نہ ہی ملتانی مسلمانوں میں ان کے لیے کوئی خاص جذبہ موجود ہے ۔

اس تمام گنتی کو ایک اور طرح سے بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ وہ ہے، طبقاتی تقسیم ۔ اس رپورٹ کو اس انداز میں دیکھنا ضروری تھا مگر پتا نہیں مرتب نے اپنی رپورٹ کو اس انداز سے دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کی ۔ اگر طبقات کی تقسیم سے دیکھا جائے تو وہ حسب ذیل ہوگی :

طبقہ	کل تعداد	فی صدی شرح
مذہبی طبقے	۱۰۰	۲۱٫۹
سوداگر ۔ تاجر	۵۸	۱۲٫۰۷
کاشت کار	۶۳	۱۳٫۸
سرکاری ملازم ۔ ریونیو آفیسر، سرکاری پنشنر	۳۴	۷٫۴
ہنرور ۔ کاری گر	۲۶	۷٫۵
زمین دار ۔ جاگیردار	۱۷	۳٫۷
مزدور ۔ کوچبان	۱۳	۲٫۸
پروفیشنل (منشی سمیت)	۹	۱٫۹
قانون	۲	۰٫۴۳
پیشہ درج نہیں	۴۲	۹٫۲

مسطورہ بالا اعداد اور شرح فی صدی سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس تحریک میں سب سے زیادہ لوگ وہ تھے جن کا تعلق مذہبی تبلیغ اور مساجد سے تھا، ان میں مذہبی مدارس میں پڑھانے والے علما بھی شامل تھے ۔ اگرچہ دوسرے نمبر پر کاشت کار آتے ہیں، لیکن اصل موثر قوت نمبر ۲ ہے، اور وہ جس میں دکان دار، تاجر اور سوداگر طبقہ شامل ہیں، جن سے چندہ جمع ہو کر سرحد میں موجود مجاہدین کے پاس پہنچتا تھا ۔ وکیل صرف دو تھے ۔ البتہ ڈاکٹروں کی تعداد ۱۴ ہے، جن میں سے دو مقامی ڈاکٹر ہیں، جب کہ بارہ ڈاکٹر مقامی یعنی اردو بولنے والے ہیں اور ہندوستانی ۔ سرکاری ملازم، پنشنر ہندوستانی ہیں ۔

جاگیرداروں اور زمین داروں کی تعداد صرف ۱۷ ہے، جن میں سولہ صرف ہزارہ کے ہیں۔ اس کی اگرچہ کوئی وجہ نہیں بتائی گئی، لیکن ہزارہ ڈویژن کی تاریخی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس تعداد کا بنیادی سبب مقامی دشمنیاں تھیں۔ مجاہدین کی ابھرتی ہوئی قوت سے متاثر لوگوں میں مقامی زمین دار اور جاگیردار طبقہ بھی تھا جو اس قوت کے بل بوتے پر اپنے مخالفین کو شکست دینا چاہتا تھا۔ اس غرض سے وہ ایک ابھرتی ہوئی قوت میں نہ صرف شامل ہوا بلکہ اس کے عقائد کو بھی اختیار کر لیا۔

ہارڈی کے تجزیہ کے مطابق اس تحریک نے سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور معززین کو متاثر کیا، جن کا تعلق اس نچلے متوسط طبقے سے تھا، جو ابتدائی صنعتی سماج کا حصہ تھا۔ ان میں علما، ٹیچر، دوکان دار، ہنرور کاریگر، چھوٹے ملازمین، چھوٹے اور درمیانے درجے کے کاشت کار شامل تھے۔ پنجاب میں اس تحریک نے پروفیشنل لوگوں یا وکیلوں، بڑے زمین داروں، انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کو کم متاثر کیا۔ مگر اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ۱۸۷۰ء کے پنجاب میں مسلمانوں میں یہ طبقات تھے ہی کم۔

یہ صرف ایک رپورٹ ہے جس کا تعلق پنجاب کی تاریخ کے ایسے عہد سے ہے جس میں انگریز پنجاب کو نہ صرف اپنی حکومت میں شامل کر چکے تھے بلکہ پورے ہندوستان پر بغیر شرکتِ غیرے قابض تھے۔ ۱۸۴۹ء کے بعد اٹھنے والی یہ پہلی یا آخری تحریک نہیں تھی جس کا ریکارڈ پنجاب سیکرٹریٹ کی فائلوں میں دفن ہے بلکہ ایسی ہزاروں فائیلیں موجود ہیں، جن سے پنجاب میں اُٹھنے والی اور پنجاب کو متاثر کرنے والی ان گنت تحریکوں، سلسلوں، پارٹیوں کے بارے میں انگریزی حکمرانوں کا نقطۂ نظر مدفون ہے جو بہرحال ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔

برطانوی حکمران ہر مسئلے پر تین فائیلیں تیار کرتے تھے۔ ایک صوبے کے پاس رہتی تھی، دو کاپیاں وائسرائے ہند کو ارسال کر دی جاتی تھیں۔ ایک کاپی وائسرائے کے دفتر میں محفوظ کر لی جاتی تھی اور تیسری کاپی لندن میں انڈیا آفس کو ارسال کر دی جاتی۔ برطانوی حکومت نے ریسرچ سکالروں کے لیے یہ ریکارڈ کافی عرصہ پیشتر اوپن کر دیا تھا۔ بھارت میں بھی ۱۹۴۰ء تک کا سارا ریکارڈ اوپن کر دیا گیا ہے۔ کوئی بھی سکالر ۱۹۴۰ء تک کی کوئی بھی فائیل دیکھ سکتا ہے۔ وہابی تحریک والی فائیل نمبر ۱۰۲ بھی اسی ریکارڈ کا حصہ ہے۔ اس تحریک پر اور بھی کئی فائیلیں موجود ہیں، جن میں ہم اپنے روشن ماضی کی طرف جھانک سکتے ہیں۔ تحریکِ مجاہدین، کوکا تحریک، جنگِ ۱۸۵۷ء، تحریکِ حریت گوگیرہ، ۱۹۰۷ء کی کسان تحریک، خلافت

مذہب، غدر پارٹی، ریشمی رومال تحریک، رولٹ ایکٹ کے خلاف جدوجہد، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، شدھی سنگھٹن، اکالی تحریک، گوردوارہ لہر، مجلس احرار، خاکسار تحریک، کانگریس، نوجوان بھارت سبھا، بم پارٹی، انڈین سوشلسٹ ری پبلکن پارٹی، ہوم رول لیگ، پشاور کنس پی ریسی کیس، لاہور کنس پی ریسی کیس، میرٹھ سازش کیس، تحریکِ حریتِ کشمیر اور ان گنت دوسری تحریکیں اور افراد ہیں، جن کے بارے میں سول سیکرٹریٹ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ریکارڈ موجود ہے جو انگریزی حکمرانوں نے ترتیب دیا۔ یہ سارا مواد پنجاب ہی نہیں پاکستان کی تاریخ کا حصہ بھی ہے جسے اہلِ وطن یقیناً جاننا چاہیں گے۔ یہ انتہائی بنیادی ذریعہ ہے جو قومی تاریخ کی تدوین میں کام آئے گا۔ اس لیے برطانیہ اور بھارت کی طرح یہاں بھی اہلِ علم و دانش کے لیے اس ریکارڈ کو اوپن کر دینا ضروری ہے۔

ارمغانِ حالی

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کی شہرت کا اصل باعث اگرچہ ان کی نظم کو قرار دیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو نظم و نثر دونوں اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ نظم کی طرح ان کا حصۂ نثر بھی بڑا جاندار اور بہت سے موضوعات کو محیط ہے۔ وہ سوانح نگار بھی تھے اور ناقد بھی۔ مفکر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھوں نے اصلاحی، تعمیری، اخلاقی، تعلیمی اور معاشرتی وغیرہ مسائل سے متعلق عمدہ مضامین سپردِ قلم کیے۔

یہ کتاب جو "ارمغانِ حالی" کے نام سے موسوم ہے، ان کے نظم و نثر کا قابلِ مطالعہ انتخاب ہے۔ کتاب میں حالی کے حالات و سوانح بھی مناسب تفصیل سے تحریر کیے گئے ہیں۔

صفحات ۱۲۱ قیمت -/۱۸ روپے

مقالات

مولانا محمد جعفر پھلواروی

یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں آپ کو کچھ ایسے نکات ملیں گے جو اس سے پہلے سامنے نہیں آئے۔ ضروری نہیں کہ مؤلف کے تمام افکار سے آپ کو اتفاق ہو، لیکن یہ بھی کوئی مستحسن بات نہیں کہ ہر فکرِ نو کو صرف اس لیے ناقابلِ اعتنا قرار دیا جائے کہ یہ بات پہلے نہیں سنی تھی۔ فکر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور قدرت کا منشا بھی یہی ہے کہ فکری ارتقا جاری رہے۔ جس طرح دین کے خلاف کوئی فکر ہمارے لیے جائز نہیں، اسی طرح دین پر جمود کا قفل لگا دینا بھی درست نہیں۔ اس مجموعے میں آپ کو یہی خصوصیت نظر آئے گی۔ اصول میں استحکام اور فروع میں غور و فکر کی لچک۔

صفحات ۵۰۰ قیمت -/۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

عطش درانی

اسلامی فلسفے کے متعلق چند مغالطوں کا ازالہ

عام طور پر اسلامی فلسفے کے نام سے جو کتابیں بازار میں آ رہی ہیں وہ دراصل مسلم مذہبی فکر کا احاطہ کیے ہوتے ہوتی ہیں، ان میں زیادہ تر الٰہیات اور تصوف کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ ہر وہ کام جو مسلمانوں نے کیا اسے مسلم یا مسلمانوں کا کام تو کہا جاتا ہے لیکن اسلامی فلسفے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اسلامی فلسفہ صرف وہ ہو گا جو اسلام نے دیا اور اس میں جتنی فروعات، اضافے اور انحرافات کیے گئے انھیں ہم اسلامی فلسفے کا نام نہیں دے سکتے۔ رہی مسلم فکر کی بات تو اس میں علم الکلام (عقلیت پسند) علم الکلام (اسناد پسند)، تصوف، اشراقی فلسفہ اور مشائی فلسفہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اشراقی اور مشائی فلسفے کا مطالعہ عام طور پر پیش نہیں کیا جاتا تھا جدید دور میں سید حسین نصر (ایران میں) اس موضوع کو سامنے لا رہے ہیں، لیکن اسماعیلی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے کے باعث ان کا رجحان باطنیت کی طرف زیادہ ہے اور یوں وہ دیگر مکاتبِ فکر کا احاطہ کرنے میں غیر جانب دار نہیں ہو پائے۔

برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ مسلم فلسفہ تخلیقی فکر کے طور پر اہم نہیں۔ گویا صحرا نشین عرب کسی باقاعدہ فکری روایت سے محروم تھے۔ یہ نقطۂ نظر ایک بہت بڑے مغالطے کا باعث بن رہا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام سرے سے کوئی ثقافت اور فلسفہ نہیں رکھتا، بلکہ یوں کہیے کہ اسلام ایک غیر مہذب قوم کا دین ہے۔ اب اس مغالطے کو دور ہو جانا چاہیے اور مستشرقین کے باطلانہ پراپیگنڈے کا احتساب کرنا چاہیے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام کے عہدِ زریں میں مسلمان مفکرین نے دیگر اقوام کے دانش و علم کو اسلامی فکر سے متعارف کرانے کے لیے خود ان کی اصطلاحوں میں افکار مرتب کیے، اس طرح سے مسلم فلسفہ ظہور پذیر ہوا۔ اس کے پیش کار ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ہیں۔ اس نظریے کے بارے میں ہمارے چند اہلِ علم مستشرقین اور لادینی عناصر کی تحریک کے مشتبہ نقطۂ نظر اسے پیش کرتے ہیں، وہ اسے جامد نقطۂ نظر کہتے ہیں۔ [illegible] مفکرین نے پیش کیا ہے۔ تبلیغ

اور تشریح کے لیے فلسفیانہ اصطلاحوں کا سہارا لینا کسی بھی طور پر جارحانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن حکیم میں دانش و حکمت کے موتی ملتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

بعض اہلِ نظر کے نزدیک مسلم فلسفہ بنیادی طور پر یونانی فلسفے سے ماخوذ ہے۔ ان کے نزدیک یونانی تہذیب کا بنیادی مسئلہ تجربی اور نقلی علم میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے فکری حلقوں میں اس مسئلے کو کبھی اہمیت حاصل نہیں رہی اور یہ کہ مسلمانوں کا اساسی فکری مسئلہ وحی اور عقل کے حاصلات میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا اور یہ دونوں مسائل بہ اعتبار ماہیت ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ یہ بھی اتنا ہی بڑا مغالطہ ہے جیسا کہ پہلے بیان کیے گئے شر انگیز مغالطے ہیں۔

بعض دشمنانِ اسلام نے مسلم فلسفے کے بارے میں مغالطہ آرائیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور ہمارے بعض سادہ لوح یا انتہائی پُر فریب اہلِ قلم بھی ان کی تقلیدِ محض کو اپنا وتیرہ بنائے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی پہلی صدی میں عجمیت (جس میں مجوسیت شامل تھی) مسلم فکر میں شامل ہوئی۔ تصوف بھی اسی دور میں عرب کے لیے ایران کا تحفہ بن کر وارد ہوا۔ دوسری صدی ہجری میں یہ یونانی فلسفہ نہیں تھا جو بنیادی طور پر مسلمانوں نے حاصل کیا بلکہ عیسائیت کا دیا ہوا نوفلاطونی علم الکلام اور اس کے ردِ عمل کے طور پر نسطوری علم الکلام تھا، جو جندے شاپور اور حرّان کی اکادمیوں سے عباسی سلطنت میں در آیا۔ عیسائی علما اسی کو یونانی فلسفہ کہتے تھے۔ حالانکہ یہ اسناد پسند اور عقلیت پسند علم الکلام تھا جو یونانی فلسفے کی اصطلاحوں میں بیان ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے ابتدا میں اسے یونانی فلسفہ ہی سمجھا، مگر رفتہ رفتہ ان پر یہ بات کھلی کہ یہ تو عیسائیت کو فلسفے کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ اس عیسائی الٰہیات کا توڑ کرنے کے لیے سیدھے سادے اعتقادی مذہب اسلام کے پیروکاروں کو بھی فلسفے کی اصطلاحوں میں بات کرنا پڑی۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اس عیسائی علم الکلام کا جواب فلسفے کی اصطلاحوں میں دیا، انھیں ہم معتزلہ کہتے ہیں۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات اور عقائد کو فلسفے کا روپ دیا اور بجا طور پر ہم انھیں اسلامی فلسفے کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔

معتزلہ اپنے فلسفیانہ ہتھیاروں سے عیسائی علما کے اٹھائے ہوئے سوالوں کی بھرمار کا جواب دے کر اسلام کا دفاع کرنے میں تو کامیاب رہے لیکن جب انھوں نے خلیفہ کے ذریعے اپنے عقائد کی

تبلیغ جب شروع کی اور علما پر سختیوں کے سلسلے کا آغاز ہوا تو اُن کے ردعمل کے طور پر اشاعرہ اور سلفیہ کے مکاتبِ فکر پیدا ہوئے۔ اشاعرہ کا اختتام تو امام غزالی پر ہوا لیکن سلفیہ جس کا آغاز امام احمد بن حنبل سے ہوا، آگے چلتا رہا۔ امام ابن تیمیہ اور امام محمد بن عبدالوہاب سے لے کر آج تک اس کا دور دورہ ہے۔ اشاعرہ اسناد پسند متکلمین کا گروہ تھے لیکن سلفیہ محض اعتقادی مسلک بن کر رہ گیا۔

رہی یونانی تہذیب کی بات تو اب اس مغالطے کا ازالہ ہو جانا چاہیے کہ اس کا بنیادی مسئلہ تجربی اور تعقلی علم میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ یہ بات دراصل یونانیوں کی بے جا توصیف اور ان سے مرعوبیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تجربی علم سرے سے یونانی طریق کا نتیجہ ہی نہ تھا اور نہ انھیں تجربی علم سے دلچسپی تھی۔ پوری تاریخ میں ہمیں یونانیوں کے ہاں صرف دو تجربات ملتے ہیں۔ ایک تو فیثاغورس نے تار کی تھرتھراہٹ کا اس کے طول سے تعلق معلوم کیا تھا اور دوسرے ارشمیدس نے اشیا کی کثافتِ اضافی دریافت کی تھی اور ان دونوں کا تعلق یونان کے عہدِ زریں سے نہ تھا، دراصل تجربات کرنا یونانیوں کے مزاج کے خلاف تھا، وہ صرف استدلال کی عیاشی میں مبتلا تھے۔ ارسطو جیسا عالم فاضل شخص بھی تجربات سے دور بھاگتا تھا، اس نے طبیعیات تو لکھ دی تھی لیکن تجربہ ایک بھی نہ کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ تجربی اور تعقلی علم کا جھگڑا یونانیوں نے سرے سے اٹھایا ہی نہیں۔ یونانیوں کے بعد اہلِ روما آئے۔ ارشمیدس اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اہلِ روم بنیادی طور پر افادیت پسند تھے۔ انھوں نے فلسفہ اور سائنس کو صرف ٹیکنالوجی کے لیے استعمال کیا، اس لیے یہ ان کا بھی مسئلہ نہ تھا۔

تجربی کا باقاعدہ آغاز صرف اور صرف مسلمانوں نے کیا۔ جابر بن حیان اور یعقوب الکندی اس کے بانی تھے اور سائنٹیفک طریق جسے بیکنی طریق کہا جاتا ہے، دراصل مسلمانوں نے پیش کیا تھا۔ ابوالبرکات البغدادی کا نام اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ مسلمانوں کا اساسی مسئلہ وحی اور عقل کے حاصلات میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ بلکہ مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ اسلام پر دیگر مذاہب اور فلسفیوں کی یلغار کا مقابلہ کرنا تھا۔ چنانچہ کہیں تو انھوں نے دیگر مذاہب کو سرے سے رد کر دیا، کہیں انھیں مسخ شدہ ادیان قرار دیا اور کہیں وحدتِ ادیان کے نظریے کے تحت بعض فرقوں نے ان ادیان خصوصاً مجوسیت اور

عیسائیت کی اسلام کے ساتھ تطبیق یا امتزاج کی کوشش کی۔

عقل اور وحی کی جنگ کو ہم مسلمانوں کا مسئلہ قرار دے ہی نہیں سکتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے ہی نہیں جو عقل سے متحارب ہوتا ہو بلکہ قرآن مجید میں صاف طور سے کہہ دیا گیا ہے کہ "دین کی تفصیلات ان لوگوں کو بتائی جاتی ہیں، جو علم رکھتے ہیں۔" قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تعقل کے بارے میں سات سو آیات آتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ جھگڑا موجود تھا تو پھر دوسری صدی ہجری ہی میں کیوں اٹھا؟ کیا پہلی صدی کے لوگ زیادہ عاقل نہ تھے، جب کہ عربوں کے عقل و فہم، تدبر اور تدبیر کی گواہی ہمیں تاریخ سے ملتی ہے۔ نیز جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا تو کیا محض کم عقل لوگ ایمان لائے تھے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابوہریرہؓ اور ایسے دیگر صحابہ کے عقل و فہم پر کیا کسی کو کوئی شک ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں وحی اور عقل کی کوئی جنگ نہیں اور روح و مادہ کی کوئی تفریق ہے۔ دنیا سے اس کا حصہ لینے کی ممانعت نہیں اور نہ تعقل کی کاوشوں پر پابندی ہے۔ مسلمانوں کی فلسفیانہ کاوشیں تو دراصل اس الحاد و کفر کی یلغار کے خلاف تھیں جو مختلف انداز سے اسلام کے اندر سرایت کر رہا تھا تاکہ اسے غیر عقلی اور بے دلیل مذہب ثابت کر سکے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سریانی زبان کے علما کی وساطت سے مسلمانوں نے جس یونانی فلسفے کے اثرات قبول یا رد کیے وہ سرے سے یونانی ہی نہ تھے اور یہی مسئلہ مسلم فلاسفی کا اساسی مسئلہ تھا۔

یونانیوں کے ہاں فلسفے کی جو شاخیں اہم تھیں ان میں طبیعیات، نفسیات، ریاضی، تاریخ فطرت، اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اخلاقیات کے مسئلے پر مسلمانوں کو سرے سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کے پاس منضبط اخلاقی اساس پورے استدلال اور معروف فکر کے ساتھ موجود تھی۔ یونانی مابعد الطبیعیات کے پاس کوئی بنیاد موجود نہ تھی، محض تخیلاتی دائرے تھے جن کا مقابلہ عیسائی علم الکلام سے ہوا تو یہ فلسفہ نو فلاطونی اور نسطوری مکاتب الٰہیات کے روپ میں منضم ہو گیا۔ رہا طبیعیات، نفسیات، ریاضی اور تاریخ فطرت کا تعلق، تو مسلمانوں نے انھیں کبھی بھی اسلام کے مخالف نہ جانا اور نہ ان کی تحصیل کی راہ میں کبھی رکاوٹ پیدا کی، حتیٰ کہ معتزلہ کے سخت ترین مخالف امام غزالی نے بھی علم حقائق کے بعد دوسرا درجہ ان علوم کو دیا ہے جو طبعی اور تجربی

ثیت رکھتے ہیں ۔

ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ امام غزالی نے فلسفے کی جڑیں کاٹیں اور تمام عقلی علوم کو یونانیت ملعونہ نام دے کر انھیں ملیا میٹ کرنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام غزالی نے فلسفہ کی نہیں بلکہ عیسائی الکلام بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ علم الکلام کی جڑیں کاٹیں، جن کی ضرورت مسلمانوں کو نہ تھی۔ زیادہ وضاحت ساتھ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ امام غزالی نے عقلیت پسند متکلمین کو ملیا میٹ کیا۔ لیکن یونانی تحقیقی علوم ساکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مسلمانوں نے رد نہیں کیے بلکہ ان میں خاطرخواہ اضافہ کیا بلکہ بعض نئے علوم مثلاً نیات، الجبرا، مثلثات، علم الرجال، اصولِ تحقیق اور استخراجی منطق کے عمومی استعمال وغیرہ کا آغاز ۔ اس لیے یہ کہنا کہ امام غزالی کے اثر سے دنیائے اسلام فہم و دانش سے کلی طور پر محروم ہوگئی ، رہے۔ عظیم عباسی دور کے بعد ہمیں دربارِ غزنوی میں ابنِ سینا، البیرونی اور ابن الہیثم جیسے عظیم مفکرین ہیں، اسی طرح اندلس کا عہد زریں ابنِ رشد اور ابنِ طفیل جیسے ماہرین سے مزین ملتا ہے مسلمانوں ی و فکری زوال کسی حد تک احیاء علوم الدین کی غلط تاویلات و تشریحات کے ساتھ ساتھ بنیادی طور ن کے سیاسی زوال کے باعث ہوا ۔ تاتاریوں کے حملے، فرقہ پرستی، تعصبات اور طوائف الملوکی ا وجوہ ان کے علمی زوال کا سبب بھی بنیں ۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا فلسفے کی ضرورت باقی ہے؟ اور کیا اب بھی اسلامی فلسفہ نام کی کسی شے ود برقرار ہے؟ پہلے سوال کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ فلسفہ کوئی آزادانہ حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ہبی احکام کی صداقت ثابت کرنے اور صوفیانہ واردات کی تشریح و توضیح کرنے کا وسیلہ بن کر اپنا قائم رکھتا ہے۔ اگر بات یہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسفے کی آزاد ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ قی سے الٰہیات، تصوف اور سائنس کا مطالعہ کریں۔ اگر فلسفہ بقول افلاطون عقلی طور پر تلاشِ حقیقت ہے، تو الٰہیات اور تصوف کی تشریح اس کا فریضہ نہیں۔ اگر بقول ارسطو اصول و علل پر بحث کرنے ہے، تو مذہبیت (اسناد پسند علم الکلام) نو فلاطونیت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے ات کے بخیے ادھیڑے جائیں۔ اور اگر رواقیوں کے بقول علمِ نیکی اور فضیلت کی دانش حاصل نام فلسفہ ہے تو اسلام نے بنیادی طور پر اس کی تعلیم دے دی ہے۔ ان کی عقلی تشریح کرنے منطق کا آغاز عمل ہی سے لگ گیا تھا جو معتزلی مکتبِ فکر کے ایجنڈے میں سے تھا۔

رہا یہ سوال کہ کیا اب بھی اسلامی فلسفہ نام کی کوئی شے موجود ہے؟ تو اس کا جواب تاریخ افکارِ اسلامی
عہدِ اول ہی سے دینا پڑے گا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارے ہاں اس کی تدریس بھی کی جا رہی
کہ شیعہ مسلم فکر میں پہلا اور قدیم ترین مکتبِ فکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ بنیادی طور پر ایک سیاسی
ہے، اس کے اعتقادی افکار بہت دیر بعد لیکن غیر منظم حالت میں پیش ہوئے، لیکن آج تک شیعہ
ئی منظم فلسفہ پیش نہیں کر سکے۔ ان کی اعتقادی تعلیمات کا آغاز بھی دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ یہی
ل خوارج کا ہے۔ انھوں نے شیعانِ علی اور معاویہ سے برأت کا اعلان کر کے ایک سیاسی فرقے کی ابتدا
۔ انھوں نے جمہوری حکومت کا نظریہ پیش کیا۔ علم الکلام کا آغاز معتزلہ ہی سے ہوتا ہے۔ جبریہ
ر قدریہ بنیادی طور پر اعتقادی فرقے تھے۔ یہ صرف معتزلہ ہی تھے جنھوں نے سیاسی جھگڑوں سے بالاتر
و کر علم کے دامن میں پناہ لی۔ ان کی عقلیت پسندی کے ردِ عمل کے طور پر اشاعرہ سامنے آئے لیکن انھوں
نے اسناد کے ساتھ ساتھ تجسیم کا سہارا بھی لیا۔ چنانچہ ان دونوں کے بین بین مرجیہ آئے اور مرجیہ کے ردِ عمل
کے طور پر مشائین کا مکتبِ فکر سامنے آیا، جس نے علم الکلام کو رد کر کے تجربی علم کا آغاز کیا۔ اخوان الصفا
س مکتبِ فکر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں یہ مکتبِ فکر الکندی سے شروع ہو کر ابن سینا، فارابی اور بغدادی
کے ہاتھوں پروان چڑھا۔

ایک طرف علمائے دین میں سلفیہ کا مکتبِ فکر دورِ جدید تک آیا اور دوسری طرف مشائین کا مکتبِ فکر جسے
ہم خالص عقلیت پسند اور تجربی علوم کا حامل قرار دیتے ہیں، ابن مسکویہ، ابن خلدون اور دورِ جدید میں اس
کے سب سے بڑے مفکر علامہ اقبال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ علامہ اقبال ایک ایسی شخصیت ہیں، جن کے
افکار میں بغدادی اور ابن سینا کی روایات اور سلفیہ کے حاصلات جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات
اسلامیہ" سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ امام غزالی کی "احیاء علوم الدین" کی طرح مسلم تاریخ فکر
کی دوسری سب سے بڑی اور اہم کتاب ہے۔ اگر "احیاء علوم الدین" سے عقلیت پسندی کو نقصان پہنچا تو "تشکیل
جدید" ہمیں ایک ایسے مذہب کی ابتدا کی طرف اکساتی ہے جو قیاسی اور مفروضی نہیں بلکہ سراسر تجربی اور تعقلی ہے۔

دورِ جدید میں ہم اسلامی فلسفے کے مطالعہ کا شاہ ولی اللہ اور جمال الدین افغانی کے افکار سے آغاز کر کے سرسید،
شبلی نعمانی، ابو الکلام آزاد، سید امیر علی، علامہ اقبال اور مودودی کے افکار تک پہنچتے ہیں۔ دوسری طرف مصر میں
علامہ طنطاوی، احمد امین، ابو زہرہ مصری اور سید قطب شہید وغیرہ کے افکار قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان میں علامہ اقبال
و علامہ طنطاوی جدید اسلامی فلسفے کی ہمہ جہتی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے مطالعات کو عام کیا جائے۔

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

ایک زائر بیت اللہ کے تاثرات

(دوسری اور آخری قسط)

مکتبہ مکہ مکرمہ

سرزمینِ مکہ کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ تقدیس کا حامل ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ولادت سے لے کر ہجرت تک ترپن سال اس مقدس زمین کے پہاڑوں، ریگ زاروں اور گلی کوچوں میں گزرے۔ حجازِ مقدس کے لیے رختِ سفر باندھنے سے قبل مکہ معظمہ کے جن قابلِ دید مقامات کی فہرست ہم نے تیار کی تھی اس میں پہلا نام مولد النبیؐ کا تھا۔ جب تک مدینہ منورہ رہے مسجد نبوی ہی ہمارا محور و مرکز رہا۔ مگر مکہ پہنچتے ہی یہ مقام دیکھنے کی تڑپ دل کو بے چین کرنے لگی۔ پس ممتاز صاحب کی رفاقت میں چل نکلے۔ ہمارا کتابی علم بتاتا تھا کہ آنحضرتؐ کا مکان سوق الیل نامی گلی میں ہے جو شعبِ ابی طالب میں واقع ہے، لیکن مجھے جہاں لے جایا گیا وہاں گلی تھی نہ خانہ۔

ہم نے دیکھا اور حیرت و استعجاب سے دیکھا کہ لب سڑک ایک پختہ دو منزلہ عمارت ہے جس پر "مکتبۃ مکۃ المکرمۃ" کا بورڈ آویزاں ہے۔ زائرین جوشِ عقیدت و وارفتگی کے عالم میں اگر وہاں نہ منڈلا رہے ہوتے تو شاید ہمیں اس جگہ کے بارے میں مولد النبیؐ ہونے کا یقین کبھی نہ آتا۔ مکتبے میں ایک بڑا قفل لٹک رہا تھا، معلوم ہوا کہ یہ دروازہ عموماً مقفل ہی رہتا ہے۔ ہم اس مقدس گلی کو دیکھنے کو ترستے ہی رہ گئے جہاں سے آپ گزرا کرتے تھے، جہاں ابولہب کی بیوی آپ کی راہ میں کانٹے ڈال دیا کرتی تھی۔ وہ محلہ جہاں آپ کا بچپن گزرا تمام کا تمام محکمہ شاہراہت کی نذر ہو گیا۔ ان کی عنایت ہے کہ یہ مکان چھوڑ دیا جو کہ عظیم شارع ملک السعود کے کنارے زائرین کی نظروں کو فرحت بخشتا ہے۔ جلدی جلدی اس مقام کی برکات اور مہبط انوار الٰہیہ خیال کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے دعا مانگی اور رخصت ہوئے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

چھتہ بازار

مکہ معظمہ میں قیام کے دوران عزیز سلیم اختر نے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اپنے دوست ممتاز کو چھٹی دلا دی اور ان کے سپرد ہماری میز بانی کے امور زیارات و سیاحت کی سربراہی سونپ دی۔ پہلے تو ہم سلیم میاں کی اس ناسلیم الطبعی پر دل ہی دل میں افسردہ ہوئے۔ پھر جو ممتاز ملے تو سلیم میاں کی مردم شناسی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ ممتاز صاحب انتہائی منکسر المزاج، دلچسپ اور یوں کہیے کہ مکہ شریف کے دائرۃ المعارف تھے۔ معلومات کا چلتا پھرتا دفتر، زیادہ عرصہ مکہ میں نہ گزرا تھا، اس پر بھی موٹر گاڑیوں کی اقسام، ان کی قیمتوں سے لے کر بستر کی چادروں تک کے حسب نسب سے واقف تھے۔ اِدھر بات کی اُدھر جواب مل گیا۔ بات وہ کہیں کی کرتے گھوم پھر کر چھتہ بازار پر ختم کرتے۔ ان کے اس کثیر الاستعمال لفظ سے دیکھنے کی خواہش شدت اختیار کر گئی اور بعد دیکھنے کے بے دریغ پکار اٹھے کہ جس نے چھتہ بازار نہ دیکھا اس نے مکہ معظمہ نہ دیکھا۔

حرم شریف سے باب المروہ کے راستے سے باہر نکلیں تو ایک بازار ہے جس پر ٹین کی چادروں کی چھت بنی ہے، یہ اس بازار کی وجہ تسمیہ ہے، حالاں کہ کافی کشادہ ہے مگر عملی طور پر کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اس بازار میں کیا نہیں ملتا۔ الائچی خورد و کلاں، زعفران، جائفل، جاوتری کی بوریاں بھری پڑی ہیں۔ کھلونے جاپانی، امریکی، ولایتی، چابی سے چلنے والے، سیل سے چلنے والے، ریموٹ کنٹرول سب موجود ہیں۔ جوتے، چپل، چرمی بیگ، جستی، چمکیلے، نازک سب انواع اقسام کے مگر اس صنعت پر تائیوان کی سبقت دیکھی۔ ظروف ایسے خوش نما کہ طبیعت خوش ہو جائے۔ کراکری ایسی کہ نظروں میں کھب جائے۔ جی چاہے کہ ایک جہاز بھر کر لے جاؤ۔ پھل ترکاریاں تازہ بہ تازہ جیسے ابھی توڑ کر لائی گئی ہیں۔ برازیل سے کر سری لنکا تک یہ نعمت اس بازار میں آتی ہے۔ باورچی خانوں اور غسل خانوں کے لوازمات، جی عش عش کر اٹھا۔ ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر، مووی پروجیکٹرز، ہر سائز ہر قسم، اعلیٰ سے اعلیٰ تر، حسن افزوں کے سامان تعیش کے ڈھیر۔ عطر و خوشبویات کی وہ اقسام جو ہم تا عمر رتی اور ماشوں میں حساب کرتے چلے آئے یہاں کلو اور نصف کلو کی دیدہ زیب بوتلوں میں دست یاب ہیں۔ یہیں سے صرافہ بازار اور دیگر مختلف بازاروں میں راستے جاتے ہیں۔

یہاں کے لوگ چوں کہ صرف سلا ہوا کپڑا یا تیار شدہ لباس خریدنے کے عادی ہیں لہٰذا دکانیں کی دکانیں

میں ہوش ربا گون اور شب باشی کے ملبوسات خیرہ کن روشنیوں میں دعوتِ دید دیتے ہیں۔ میں نے پاکستانی عورتوں کو بھی یہ لباس جسے پہن کر بے لباسی کا گمان ہوتا ہے خوب خریدتے دیکھا۔ اطراف و جوانب کے تمام بازار جو اس بازار میں کھلتے ہیں سیکڑوں چھابڑی فروش اپنی دکان داری جمائے رکھتے ہیں، لاہور کے رنگ محل اور ڈبی بازار کا سا سماں پیش کرتے ہیں۔ دکان داروں کو نہ بھاؤ بتانے کی فرصت نہ گاہک کو بھاؤ ٹھیرانے کی مجال۔ جو منھ سے نکل گیا فوراً ادا کر دو یا چلتے بنو۔ زیادہ اصرار کیا تو ...

بلائے جان ہے اس کی ہر بات عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

سنبوسی

روٹی ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس سے دسترخوان کی زیبائش برقرار رہتی ہے۔ یہی تو واحد نعمتِ خداوندی ہے جس کے حصول کے لیے جہانِ فانی کی تمام رونقیں برقرار ہیں۔ غمِ مرگ کی محفل ہو یا شادی کی تقریب یا کسی سیاسی لیڈر کی تقریرِ دل فریب روٹی کے بغیر نہیں برخاست ہو سکتی۔ غذائیت کے لحاظ سے کتنی بھی متوازن غذا مل جائے مگر روٹی بھی صاحبو! کیا چیز ہے، اور جناب سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ تقاضائے شکم کے آگے تقاضائے عشق بھی زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے۔ بقول سعدیؒ

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

مکہ معظمہ ہو یا مدینہ منورہ جہاں بھی زائرین پہنچتے ہیں سامان سڑکوں کے کنارے رکھا اور روٹی کا واویلا شروع ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی بساط بھر کام و دہن کی آزمائش میں نظر آتا ہے۔

یہاں کی روٹیاں خدا جھوٹ نہ بلائے تو آٹھ دس اقسام کی تو ضرور ہوتی ہوں گی۔ بڑی، چھوٹی، موٹی، پتلی، جہازی سائز، کتابی سائز اور لطف یہ کہ ہر ایک روٹی کی الگ ترکیب ساخت اور الگ نام۔ مگر جو ایک عجیب الخلقت چیز نظر آئی، وہ روٹی اور ڈبل روٹی کے بین بین شے تھی، اس کو سنبوسی کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی گول مٹول چیز ہے۔ پہلے ہم نے اس کو بغور دیکھا، پھر اس کے استعمال کو دیکھا۔ ہر نماز کے بعد سلام پھیرتے ہی فوراً روٹی کی دست یابی کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ نماز کے بعد بازاروں کی رونق بحال ہو جاتی ہے بازاروں میں روٹیوں کی کمی نہیں۔ تنوروں اور ہوٹلوں کے علاوہ جنرل اسٹوروں، بیکریوں اور سڑک کے کنارے روٹی فروخت ہوتی ہے۔ جہاں روٹیوں کا اس قدر ذخیرہ ہوتا ہے کہ حاجیوں کی تعداد دو چند کیوں ہو جاتے روٹی کی سپلائی ختم نہیں ہوتی مگر انسان اپنی جبلت سے مجبور جہاں لوگ

روٹی کے معاملے میں ادب و شائستگی کو بالائے طاق رکھ کر ان دکانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں :

ع ڈھِڈ نہ پییاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں

بازار نوردی

نظم و ضبط کی پابندی سے انسانی طبائع جلد گریزاں ہو جاتی ہیں۔ یہی حال ہمارا اور غالباً سب ہی کا تھا۔ معلمین کی سرد مہری اور سلوک کی تلخی کا احساس کسی کو شدومد سے تھا اور کسی کو کم۔ جس کا ازالہ فارغ اوقات میں بازار نوردی سے کیا جاتا تھا۔ سچ پوچھیے تو ہمارا حال یہ تھا :

ع حیراں ہوں ان دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

روزمرہ کے استعمال کی اشیا پانی، دودھ، لسی، دہی، کریم، بالائی سربمہر فروخت ہوتے ہیں۔ ایک خاص خوبی جو پاکستان کے پیور فوڈ ایکٹ میں شامل نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے خوردونوش جو بازار میں فروخت ہوتی ہیں، ان پر تاریخ ساخت اور تاریخ انتہائے استعمال ضرور درج ہوتی ہے۔ دودھ، دہی وغیرہ تو خیر سعودی عرب میں تیار ہوتے ہیں۔ مگر بسکٹ فرانس، ہالینڈ، انگلینڈ اور امریکہ سے۔ پنیر، مکھن آسٹریلیا سے۔ مربہ جات سنگاپور اور بھارت سے۔ چند مشروبات اچار، چٹنیاں پاکستان سے اور ان سب کے ڈبوں اور بوتلوں پر تاریخ انتہائے استعمال ضرور درج ہوتی ہے۔ لطف کی بات ملاحظہ ہو کہ ایک بہت مشہور شربت جو خیر سے پاکستان کی عمر سے زیادہ کا ہے اور ہمارے ملک میں کافی مقبول ہے، اس کی بوتل پر ہم نے کبھی تاریخ ساخت اور تاریخ انتہائے استعمال نہیں دیکھی، مگر یہی شربت پاکستانی شربت سے زیادہ خوش ذائقہ وہاں ملتا ہے جس پر تاریخ ساخت اور تاریخ انتہائے استعمال درج ہوتی ہے۔ پاکستانی اچار، چٹنیاں، مربے وغیرہ ہمہ اقسام وہاں ملتے ہیں جن پر تاریخ انتہائے استعمال باقاعدگی سے لکھی ہوتی ہے۔ پاکستان میں یہی اشیا کئی کئی سال دکانوں میں پڑی رہتی ہیں اور انجام کار عوام کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ مگر کیا مجال کہ وہاں کسی دوکان پر (EXPIRY) تاریخ انتہائے استعمال کے بعد کوئی خوردنی چیز فروخت ہو سکے۔

سبزی منڈی رات کے وقت کھلتی ہے مگر دن کا سماں ہوتا ہے۔ روشنیوں کا اس قدر عمدہ انتظام ہے کہ کیا مجال کہ آپ کی نظر سے سبزی یا پھل پر پڑا ہوا کوئی داغ دھبہ اوجھل رہ جائے۔ موسمی اور بے موسمی پھل اور ترکاریاں دستیاب ہیں۔ بھنڈی، توری، گاجر، مولی، مٹر بیک وقت خریدیے اور لطف اٹھائیے :

یہی حال پھلوں کا ہے ۔ کنو، مالٹا، آم، آڑو متضاد موسم کے پھل کثیر تعداد میں تازہ بہ تازہ ملتے ہیں ۔ خریدار کریٹ کے کریٹ خریدتے ہیں ۔ عوام میں قوتِ خرید بہت ہے ۔ کئی کئی سو روپے کی پھل ترکاریاں خریدنا وہاں کے عوام کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے ؛ لیکن ہم لوگوں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے ۔

ع میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

فلوس

حرمِ نبوی اور بیت اللہ کی سعادت دیدار حاصل کرنے کا منصوبہ تو عرصے سے تھا ہی، اسی لیے باقاعدگی سے ٹی وی پر "اللسان العربی" دیکھا کرتے ۔ فضائل حج، فرائض حج، حج کیسے کریں وغیرہ مسائل کی کتابیں پڑھتے یہاں تک کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے عربی کا کورس پڑھ لیا اور سند بھی حاصل کی ۔ کچھ نہ کچھ عربی کی شد بد ہو گئی اور سوچا کہ جب بھی حج کا موقع ملا تو دوسرے لوگوں کی طرح بالکل بدھو نہیں ہوں گے اور اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے قابل رہیں گے ۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ پڑھنے والی عربی اور بولنے والی عربی میں تو بہت ہی دور کا تعلق ہے ۔

عزیز میاں امجد صاحب جن کے پاس میں نے مدینہ شریف میں قیام کیا، گو وہ گزشتہ سال پاکستان سے گئے ہیں مگر فرفر عربی لہجے میں بولتے ہیں ۔ حالاں کہ مجھے یقین ہے کہ پچھلے سال وہ عربی کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے اور ان کی عربی استعداد بچپن میں صرف قرآن شریف پڑھنے تک محدود تھی اور اب فلوس فلوس کرتے پھرتے ہیں ۔ ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا اور پوچھ ہی لیا کہ عزیزم یہ فلوس کیا بلا ہے ۔ تم جس دکان والے کے پاس جاتے ہو فلوس فلوس ضرور کرتے ہو ۔ ہنس کر بولے ۔ انکل ۔ فلوس پیسوں کو کہتے ہیں ۔ جیسے اپنے ہاں کوئی چیز خریدنی ہو تو ہم پوچھتے ہیں کہ کتنے پیسوں کی ہے ۔ اسی طرح یہاں کم فلوس کہتے ہیں ۔ ہم نے بھی بات گرہ میں باندھ لی اور فلوس فلوس کرنے لگے ۔

ع سپردم بتو مایۂ خویش را

شاپنگ

مدینہ طیبہ میں قیام ہو اور مسجدِ نبوی کی بے پناہ سعادتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے، مکہ معظمہ میں مناسکِ حج کی تکمیل ہو، پاکستانی ہوں یا ایرانی، افریقی ہوں یا مصری شاپنگ کرنا بھی یہاں کے قیام کا جزوِ لاینفک ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حج کے دوران شاپنگ بھی "مستحب عمل" ہے ۔ مدینہ طیبہ میں تو

مسجد نبوی کے عظیم دروازوں کے باہر ہی بڑے بڑے شاپنگ سنٹر ہیں جبکہ مکہ معظمہ میں حرم سے چند قدم کے فاصلے پر کئی کئی منزلہ عمارتوں میں ہوش ربا زیب و آرائش و آسائش کے سامان دعوتِ دید دیتے ہیں، جہاں ہمہ وقت ہجوم رہتا ہے۔ مدینہ شریف میں تو حج کے زمانے میں تقریباً تمام رات بازار کھلے رہتے ہیں اور گہما گہمی ہوتی ہے۔

حج پر روانگی سے قبل میرے اور اہلیہ کے درمیان یہ متنازعہ فیہ مسئلہ رہا کہ فلاں فلاں چیز ضروری لانی ہے، جس سے میں نے بہ جبر یہ کہہ کر منع کر دیا کہ حج کرنے جا رہے ہیں یا شاپنگ کرنے۔ وہ بے چاری خاموش ہو رہیں۔ روانگی سے قبل میری چھوٹی ہمشیرہ نے بہنوئی کے لیے ایک گرم سوٹ کا کپڑا لانے کی فرمائش کر کے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ مشرقی تہذیب کی رو سے بہنوئی کی فرمائش رد کرنے کی تاب مجھ میں نہ تھی۔ میری اہلیہ نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا، مدینہ میں امجد صاحب سے جب ایک گرم سوٹ کا کپڑا خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ انکل، یہ کپڑا آپ کو کراچی میں سستا مل جائے گا۔ یہاں تو گرم کپڑا بہت مہنگا ہے کیوں کہ نہ یہاں سردی پڑتی ہے نہ لوگ خریدتے ہیں، دکان دار بہت کم گرم کپڑا رکھتے ہیں اور نسبتاً گراں ہوتا ہے۔ بازار کا چکر لگایا تو حقیقت واضح ہو گئی۔ گرم سوٹنگ اسی ریال سے دو سو ریال فی گز تھی یعنی تین سو روپے سے نو سو روپے پاکستانی سکہ رائج الوقت۔ بہ امر مجبوری پچاسی ریال فی گز کا ایک کپڑا لے لیا جسے بہت عمدہ نہیں کہا جا سکتا۔

ہر دو متبرک شہروں میں بعد نماز شاپنگ کے لیے لوگ جوق در جوق رواں دواں ہوتے ہیں۔ شاپنگ سنٹروں پر ہی کیا موقوف سڑک کے کنارے پھیری والوں کے ارد گرد جم غفیر ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہے بک رہا ہے۔ بس خریدلو۔ ہم لوگ دوسری فلائٹ سے پہنچے تھے، اس سے قبل صرف بحری جہاز کے مسافر وہاں آئے تھے جن کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی۔ مگر محسوس ایسا ہوتا تھا کہ زائرین جہاز سے اتر کر بازاروں میں جلوہ گر ہو گئے ہیں۔ ہم نے پہلے ہی دن پاکستانی حجاج کے ہاتھوں میں کنگ سائز کے ٹیپ ریکارڈر دیکھے، عورتیں کپڑے کی دوکانوں پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں کہ شاید آج کے بعد پھر نہیں ملے گا۔ میاں امجد مدینہ کے باشی ہیں، جب ان کو یہ بات سنائی تو بولے کہ یہ لوگ جو سامان فٹا فٹ خرید رہے ہیں تجربہ کار ہیں۔ کیوں کہ عنقریب بھاؤ بڑھ جائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا، جوں جوں حجاج آتے رہے ہر چیز کے نرخ بڑھتے رہے۔

ایک محترم دوست مدینہ میں مل گئے جو جج کے عہدے سے ریٹائر تھے۔ مجھے اصرار کر کے اپنے ہمراہ لے گئے اور ایک دکان میں جا گھسے، کہنے لگے اب کوٹ پتلون کا زمانہ تو ختم ہو گیا، دو چار شیروانیوں کا کپڑا لینے کا ارادہ

ہے۔ دو شیروانیوں کا ایک سو ریال گز کا ڈیوکونا خریدا۔ پھر ایک فاختائی رنگ کا کپڑا خریدا پھر ایک اور۔ اور آناً فاناً تین چار ہزار ریال کا کپڑا بندھوالیا۔ میں نے اتنے ریال کہاں دیکھے تھے، اللہ کی پناہ! ع

بہ بیں تفاوت کہ از کجاست تا بہ کجا

شُرطے

حرم بیت اللہ ہو یا حرم نبوی۔ شاہراہیں ہوں یا تجارتی مراکز۔ گہری خاکی وردی میں ملبوس ایک مخلوق کسی نہ کسی سے الجھتی نظر آتی ہے۔ یہ کہلاتے ہیں شُرطے، جن کو ہمارے ملک میں سپاہی کہتے ہیں۔

سپاہی ہمارے ملک میں ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ان کا کام نظم ونسق برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ہمارے سپاہی رورعایت، سفارش شخصی یا مالی سے چشم پوشی کر ڈالتے ہیں۔ کہنے کو شُرطوں کا کام بحالی نظم ونسق ہے، مگر کیا مجال جو ذرہ برابر بھی کوتاہی ہو جائے۔ لہجہ انتہائی کرخت۔ گفتگو سفاکانہ۔ صرف اپنی کہنی دوسرے کی نہ سُنی۔ معلموں کے توسط سے جو حضرات قیام پذیر ہوتے ہیں ان کی مصروفیات صرف نماز اور شاپنگ تک ہی محدود رہتی ہیں اور اس مخلوق سے واسطہ کم ہی رہتا ہے مگر چوں کہ میں ہمہ وقت کار میں آمد ورفت رکھتا تھا اس وجہ سے شُرطوں سے واسطہ ناگریز تھا۔

بات تو یہ ہے کہ جہاں احساس ذمہ داری ہو، فرائض کی بجا آوری کے لیے سختی لازمی ہے۔ مکہ میں ایک دن عزیزم جاوید اختر کے ساتھ کار میں جا رہا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ شُرطے نے کون سی غلطی پر کار روک دی ہے۔ جاوید اختر کار سے اُترے۔ انتہائی ادب سے اپنا اقامہ (شناختی کارڈ) دکھایا، پھر شُرطا میری طرف متوجہ ہوا۔ جاوید اختر نے حاجی حاجی کہا۔ شُرطے نے انتہائی تند لہجے میں ڈانٹنا شروع کر دیا۔ میرے پلّے کچھ نہ پڑا، صرف یہ دیکھا کہ جاوید صاحب بڑے ادب سے تائب تائب کر رہے ہیں۔ پھر شُرطے نے ڈانٹا، پھر جاوید نے تائب تائب کی گردان شروع کر دی۔ آخر شُرطے نے ہاتھ کے اشارے سے ایسا اشارہ کیا جیسے کہتا ہو کہ دفع ہو جاؤ، اور واقعی جاوید ڈر کر دفع ہونے کے انداز سے کار میں سوار ہو گئے۔ راستے میں مَیں نے دریافت کیا کہ معاملہ کیا تھا۔ اُس نے کہا کہ اس کو معلوم نہ تھا کہ یہ سڑک ون وے ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو میں دھر لیا گیا تھا۔ بس اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں تائب تائب کہتا رہوں۔ یہ اس کی مہربانی تھی جو حاجی (آپ کو) ساتھ دیکھ کر مجھے بخش دیا۔

سڑکوں پر کاروں اور ٹریفک کو کنٹرول کرنا بھی شُرطوں کا معجزہ ہے۔ ان کے جرمانے یا سزا کی داد نہ فریاد۔

وہ مختار کل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حج کے دوران لاکھوں حجاج کے اجتماع میں کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا۔ ٹریفک کے کنٹرول کا دنیا میں یہ واحد نظام ہے جو ان سنتریوں کے پاس بے پناہ اختیارات کی وجہ سے قائم ہے۔ میرے ایک واقف کار بولے۔ ڈاکٹر صاحب! سعودی عرب کے سپاہی چونکہ رشوت نہیں لیتے اس لیے وہ بہترین منتظم ہیں۔ مجھے رشوت نہ لینے کا راز معلوم تھا، اس وجہ سے ان کو جواب دیا کہ بھائی آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کے سنتری کو کس قدر تنخواہ ملتی ہے۔ ڈھائی ہزار ریال۔ مکان، بجلی، پانی، گیس مفت۔ یعنی پاکستان کے دس گیارہ ہزار روپے کے برابر۔ جب کہ ہمارے ملک میں سپاہی نام کی مخلوق کو تین چار سو روپے تنخواہ ملتی ہوگی۔ اس صورت میں یہ بے چارہ کیا کرے۔ کبھی اس غریب کی حالت زار بھی تو دیکھو۔

بہترین یادگاریں

ماثر و مقابر اور مقاماتِ مقدسہ کا تعین و نظام تحفظ ترکوں کے عہدِ حکومت میں قائم کر دیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ اب اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ نہ ساکنانِ شہر اس کو لائقِ التفات گردانتے ہیں، نہ کارکنانِ حکومت کو یہ خیال ہے کہ صحابہ کرام اور اپنے اسلافِ عظام کی بہترین یادگاروں کو امتدادِ زمانہ کی دست برد سے محفوظ کر لیا جائے تاکہ رہ نوردانِ کوچۂ محبوب آثارِ رفیقانِ رسول کی تلاش و جستجو سے اپنی آتشِ شوق بجھا سکیں۔

دارِ ارقم کا نام بعثتِ محمدی کے دور میں اور اس کے بعد اسی رشتے سے تاریخی شان و تجمل کا حامل رہا۔ جائے وقوع کا تو تاریخی حوالوں سے ہمیں یہی علم تھا کہ جبل بوقبیس کے سایہ میں واقع تھا۔ یہاں بہت ڈھونڈا مگر لاحاصل۔ یہ مقام بھی توسیع شاہراہ کی نذر ہوگیا اور صفا مروہ کی جانب باب دارِ ارقم باقی رہ گیا جو دارِ ارقم کی جانب ہمیشہ سے کھلتا تھا اور جس کی نسبت سے اس دروازے کا نام باب دارِ ارقم رکھا گیا تھا۔ یہ مکان صحابی رسول حضرت ارقمؓ کی ملکیت میں تھا، یہی وہ مقدس جگہ تھی جہاں بعثت کے بعد آنحضرتؐ کی اپنے صحابہ کرام کے ساتھ قریشِ مکہ کے خطرناک منصوبوں کے پیشِ نظر مجلسیں اور نشستیں ہوتی تھیں۔ یہاں آپ نے مکی معمولات کے دوران کافی وقت گزارا۔ یہی وہ مکان ہے جہاں حضرت عمر فاروقؓ ایمان کی روشنی سے سرفراز ہوئے۔ پھر بڑے بڑے متلاشیانِ حق مثلاً زید بن خطاب، مصعب بن عمیر، عبداللہ ابن ام مکتوم، صہیب بن سنان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔

کہاں کہاں تاریخ کے دفینے مکنون اور عظمتِ ایمان کے آثار و نقوش موجود ہیں۔ اس کے متعلق صحیح طور سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ قلب و ذہن ان کی تلاش و جستجو کے لیے بہرحال بے قرار رہتے ہیں

مہرباں ہیں کیسے کیسے

منشی عبدالرحمن خان ملتان کی مشہور شخصیت ہیں ۔ ماشاء اللہ ساٹھ سے ایک دہائی عمر زیادہ ہونے کو آئی ہے ۔ تصنیف و تالیف کا یہ عالم ہے کہ اپنی عمر کی گنتی کے برابر کتابیں سپرد قلم کر چکے ہیں ۔ ہم حج کو روانہ ہونے لگے تو اپنی تازہ تصنیف "کتاب زندگی" کا نسخہ اپنے ایک مہربان کے لیے لے آئے جو ہمیں مکہ مکرمہ میں لے جا کر ان کے حوالے کرنا تھا ۔ منشی صاحب کا اشارہ ہمارے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے ۔ گو کہ یہ بات اُن کو بھی معلوم تھی کہ جدہ ایر پورٹ میں کتاب کا لے جانا جان جوکھوں کا کام ہے ۔ پھر خیمہ سے وہاں ایک "ہدایت نامے" کا اعلان ہوا کہ کسی قسم کا لٹریچر آپ کے پاس ہو تو جمع کرا دیں ، بالکل اسی طرح ، جس طرح کہ کمرۂ امتحان میں عموماً سپرنٹنڈنٹ اعلان کرتے ہیں کہ آپ کے پاس کتاب یا کوئی کاغذ ہے تو یہاں جمع کرا دیں ۔ بہرحال ان مہربان دوست کا تحفہ ہم سینے سے لگائے دعائیں پڑھتے بچ بچا کر ایر پورٹ سے باہر آ گئے ۔ عرب ممالک میں ہماری طرح نہ ڈاک گھروں میں تقسیم ہوتی ہے نہ لوگ اپنے عزیز دوستوں کو گھر کا پتا بتاتے ہیں ، صرف پوسٹ بکس کا حوالہ ہوتا ہے ، اور ان مہربان کے پتے کی معلومات بھی ہمیں پوسٹ بکس تک ہی تھیں ۔ ہم نے فوراً ان کو ایک خط لکھ مارا ، اور موٹی تازی کتاب سینے سے لگائے مدینہ منورہ جا پہنچے ۔ مہربان دوست جواب کیا دیتے ! ہم نے تنگ آکر (چوں کہ کتاب کو اٹھائے ہوئے ہم پریشان ہو چکے تھے) مدینہ میں امجد صاحب کو صورت حال بتائی ۔ انھوں نے شام کو دفتر سے آکر مژدہ سنایا کہ یہ صاحب مکہ الیکٹرک کمپنی میں کام کرتے ہیں ۔ یہ فون نمبر ہے اور انتہائی خشک سالی کی پیداوار ہیں ۔ اس وقت ہم اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکے ۔ ہم نے ان صاحب سے فون پر رابطہ قائم کیا ۔ سلام و نیاز کے بعد منشی صاحب کی خیر و عافیت بتائی اور عرض کیا کہ ایک کتاب کا تحفہ ملتان سے لے کر یہاں تک پہنچا ہوں ۔ اگر میں ان مہربان کی جگہ ہوتا تو فی الفور کتاب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ۔ مگر اس مہربان نے کتاب کا نام تک دریافت نہیں فرمایا ۔ مختصراً یہ جواب دیا کہ جب آپ مکہ آئیں تو مجھے مل لیجیے گا ، میرا فون نمبر تو آپ کے پاس ہے ہی ۔ سلسلہ منقطع ۔ ۔ ۔ !

سولہ دن کے بعد جب میں مکہ پہنچا تو کتاب کی حفاظت میرے لیے وبالِ جان بن چکی تھی ۔ مکہ میں عزیز سلیم اختر سے ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ مکہ بجلی کمپنی کے ایک دوست ہمارے ہاں تقریباً روز آتے ہیں ، ان سے معلوم کریں گے ۔ جب شام کو حرم شریف سے واپس آیا تو وہ صاحب موجود تھے ۔ نام تھا قاضی یٰسین ۔

مہربان دوست کا نام لیا تو سنجیدہ صورت بنا کر بولے یہ تو میرے افسر ہیں اور میں ہی ان کا ماتحت ہوں، اور ان کے بارے میں چند معلومات بہم پہنچائیں جو میں تحریر نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ کل آپ کی آمد کی اطلاع ان صاحب کو دے دوں گا اور اگر انھوں نے ملاقات کا اظہار کیا تو ساتھ لے آؤں گا۔ کئی دن کے بعد قاضی صاحب کو پھر پکڑا کہ بھائی حال سناؤ، وہ جواب مصلحتاً نہ دے سکے، آخر اپنے افسر کا جواب ہم تک کیسے من و عن پہنچاتے۔ لاچار ہم نے خود ہی فون پر رات کو رابطہ قائم لیا اور افسوس کا اظہار کیا کہ ملتان سے ایک شخص آپ کا تحفہ لے کر آیا ہے، آپ کی رہائش تک آنا مشکل ہے۔ نو وارد ہوں آپ آسانی سے میرے پاس آ سکتے ہیں۔ آپ کے ماتحت قاضی صاحب کو میری رہائش کا پتا معلوم ہے۔ اور آپ مجھے لفٹ ہی نہیں کراتے ہیں، مجھے آپ سے ملنے کی بھی خواہش ہے۔ ایک ماہ ہو گیا آپ کو کتاب کی یاد نہ آئی! بولے ڈاکٹر صاحب میں بہت عدیم الفرصت آدمی ہوں۔ رہا کتاب کا مسئلہ تو قاضی جی کو ہی دے دیں۔ بس اس قدر مختصر بات کہہ کر پھر سلسلۂ فون منقطع ... ! کتاب تو خیر ہم نے قاضی جی کو دے ہی دی تھی مگر سوچنے لگے، پاکستان سے یہاں آکر بسنے والے کبھی اخلاق اور تہذیب سے اتنی جلدی دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔ اب میاں امجد صاحب کا جملہ یاد آیا کہ وہ تو خشک سالی کی پیداوار ہیں۔

ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلب سلیم

نعلین در بغلین

کچھ سنی سنائی باتیں ذہن میں تھیں، اسی وجہ سے میری اہلیہ نے جانب حجاز پرواز سے قبل کپڑے کے چھوٹے چھوٹے دو تھیلے سی لیے تھے کہ بوقت ضرورت اپنے جوتے ان میں رکھ کر بغل میں دبائے رکھیں گے۔ میرا تھیلا تو خیر سے ویسے ہی واپس آ گیا نہ ہم سے ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ مگر میری رفیقۂ سفر نے "نعلین در بغلین" کی اصطلاح پر سختی سے عمل کیا۔ میرے چپل حرم نبوی اور حرم مکہ کے بیرونی جوتا دانوں سے باقاعدگی سے اٹھتے رہے۔ یہاں تک کہ مسجد قبا تک میں بھی نہ چھوڑا۔ دریں وجہ مجھے ان متبرک مقامات میں عموماً برہنہ پا پھرنے کی سعادت ملتی رہی۔

جوتے اٹھنے کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہزاروں جوڑی جوتے دروازوں کے باہر جوتے دانوں میں پڑے ہوتے ہیں، لوگ بھول کر ایک دوسرے کے پہن جاتے ہیں اور یہی عام رواج ہے۔ میں نے بھی ایک دفعہ ایسا کرنے کی کوشش کی مگر رفیقۂ سفر نے سختی سے روکا اور میں نے عقل کے ناخن لیے کیونکہ میری چپل

میں نے پہنا اس کو بھی شدید کوفت ہوگی۔ پس وہیں لاکر رکھ دیئے۔ حج کی رات تھی ہم یعنی میں، اہلیہ اور عزیزم ممتاز صاحب بیت اللہ میں طوافِ زیارت کے لیے آئے۔ طوافِ زیارت ہی وہ موقع ہوتا ہے، جب حرم بیت اللہ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی اور بیک وقت سات آٹھ لاکھ آدمی طواف کرتے ہیں۔ بیگم کا اصرار تھا کہ وہ اپنا جوتا اپنی بغل میں داب لیں گی اور میری گزارش یہ تھی کہ آج بہت ہجوم ہے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہے، جوتے جوتے دان میں رکھیں۔ بہ مشکل وہ راضی ہوئیں اور ممتاز صاحب نے تینوں جوڑی جوتے تھیلی میں بند کر کے ایک مقام پر بہ حفاظت رکھ دیئے۔ تین چار گھنٹوں کے بعد جب اس مقام پر آئے اور ممتاز صاحب نے تھیلی کھولی تو ان کا منہ لٹک گیا، کیوں کہ ان کی ضد پر ہی جوتے ان کے حوالے کیے گئے تھے، جہاں ہمارے پرانے چپل موجود تھے اور تھیلی کے اندر سے بیگم کا جوتا غائب تھا جو چند دن پہلے پچاس ریال میں خریدا تھا۔ پھر کیا ہوا نہ پوچھیے وہ اللہ کی بندی پیدل چلتی رہی کیوں کہ رات کا ایک بجا تھا اور بازار بند ہو چکے تھے۔ ع

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

کاکوس

تیس بتیس سال قبل کی بات ہے کہ ہم نے کراچی میں ڈاکٹری کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ ہاسٹل میں پہنچتے ہی ایک ملازم نما شخص سے پوچھا۔ بھائی لیٹرین کدھر ہے۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا "کاکوس"۔ اس طرح جناب ہم اس لفظ سے پہلی مرتبہ آشنا ہوئے۔ کراچی میں اس مقام سے ہمیں کافی رابطہ رہا۔ وہاں سے واپس پنجاب آکر ہم پھر یہ لفظ بھول گئے۔ بعد ایک مدت کے مکہ شریف میں باب الفتح کے باہر ایک دروازے پر "کاکوس" لکھا ہوا دیکھ کر احساس ہوا کہ عربی زبان کے ایک لفظ سے پرانی راہ و رسم ہے۔ طہارت کے لیے وہاں کاکوس بہت ہیں۔ صاف ستھرے صفائی کرنے والے ہمہ وقت موجود۔ مگر استعمال کرنے والے بھی تو کم نہیں۔ قطار اندر قطار منتظرین موجود ہیں۔ رہی پانی کی بات تو پچھلے پہر رات کے بعد صبح تک پانی نارمل درجۂ حرارت کا ملتا ہے۔ جیسے جیسے سورج چمکتا ہے پانی بھی تپنے لگتا ہے اور ظہر کے بعد سے رات تک بس چائے تیار کرنے والے پانی سے واسطہ رہتا ہے۔ یہی پانی سب لوگ استعمال کرتے ہیں، ہم نے بھی کیا، اور وہ بھی جلدی جلدی کیوں کہ منتظرین دروازہ کھٹکھٹانے لگتے ہیں۔ یہ بہت کم ہوتا تھا کہ کوئی کاکوس خالی مل جائے اور قطار سے انتظار کی گھڑیاں گننی پڑیں۔ ایک دن ہمیں ایک دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔ ہم جلدی سے اندر پہنچے جب طہارت کی ضرورت پیش آئی تو ٹونٹی میں پانی غائب

اب سمجھ میں آیا کہ یہ کموڈ کیوں خالی تھا، اس کی ٹونٹی خراب تھی۔ اب کیا کروں۔ غیر جگہ، اتنی بولی آتی نہیں، پھر آتی ہو تو کون سنتا ہے۔ باہر شور و غل، دروازے اور فرش کے درمیان کافی جگہ نظر آئی۔ لوٹا کواڑ کے نیچے سے باہر نکالا اور دروازے کے باہر کے حصے سے مارنا شروع کیا تاکہ کوئی خدا ترس میری حرکت کو سمجھ کر ترس کھا جائے۔ کافی دیر تک دو دو کے بعد یہ حرکت کارگر ہوگئی اور لوٹا کسی نے پکڑ لیا۔ جب لوٹا چلا گیا تو اب اور گھبرائے کہ لوٹا واپس نہ آیا تو پھر! مگر کچھ دیر کے بعد لوٹا واپس پانی سے بھرا ہوا دروازے کے نیچے سے واپس مل گیا، اور ہم جب باہر آئے تو اتنی دیر اندر لگانے پر باز پرس ہوئی۔ ہم نے واقعہ سنایا تو بیگم صاحبہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئیں۔ کہنے لگیں یہ واقعہ ضرور ڈائری میں لکھیے گا۔ شاید کسی کے کام آئے۔ ☙

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

شوق آفرینی

مکہ شریف سے منیٰ جاتے ہوئے تمام پہاڑوں سے بلند و بالا، منفرد ایک گول چوٹی دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ یہی جبلِ نور ہے، جس میں غارِ حرا واقع ہے۔ منیٰ سے اس پر عموماً آمد و رفت رہتی تھی۔ چوں کہ نمازِ عصر و مغرب جبلِ رحمت یا مسجدِ نمرہ میں پڑھنے کا شوق تھا، ایک دن ادھر سے گزرتے ہوئے سلیم اختر سے دریافت کیا کہ سلیم میاں کسی دن ہمیں غارِ حرا تو لے چلو۔ سلیم میاں کا جواب سن کر میں دھک سے رہ گیا کہ انکل یہی تو سامنے جبلِ نور ہے۔ میں تو تڑپ اٹھا مگر انھوں نے اس وقت حامی نہ بھری اور کہا کہ یہاں صبح کے وقت جانا آسان ہے، اب شام ہوگئی ہے، اور ہم سیدھے عرفات چلے گئے اور میں تمام راستے غارِ حرا کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔

اگلے دن بعد نمازِ فجر حرم شریف سے سیدھے جبلِ نور جا پہنچے۔ اہلیہ اور سلیم صاحب تو کار ہی میں بیٹھے رہے، میں اور ممتاز صاحب بسم اللہ پڑھ کر نیچے اتر آئے۔ ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر نگاہ ڈالی جہاں خاتم النبیینؐ کو خدائے ذوالجلال نے نعمتِ فرقان سے نوازا تھا۔ درود و سلام پڑھتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتے گئے۔ اونچے نیچے پتھر، ناہموار راستہ، کہیں کہیں بالکل عمودی شکل میں، کہیں ڈھلوان، کہیں کشادہ، کہیں تنگ، ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے چڑھتے گئے۔ غرض چوٹی پر پہنچ گئے۔ سورج مشرق میں دامن افق سے جھانک کر اپنا رنگ دکھانے لگا تھا اور ابھی سے ہیں پسینے چھوٹ رہے تھے۔ چند عشاقِ رسولؐ ہم

ے بھی پہلے یہاں پہنچ کر سستا رہے تھے اور کچھ ابھی ہانپ کانپ رہے تھے، ہم بھی انہی میں شامل ہو گئے۔ معلوم ہوا ابھی دوسری جانب اترائی ہے۔ سب منزل دور نیست کا نعرہ لگا کر چل پڑے۔ اترائی قدرے مشکل تھی۔ یہ ست ایک پتلی سی سرنگ میں سے گزر کر کھلے آسمان کے نیچے آجاتا ہے، اور یہی وہ مقام مقدس ہے جہاں راج الانبیا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جبرئیل امین کے مابین سلسلۂ درس و تدریس شروع ہوا تھا۔ غار کے بالائی مریر نگاہ گئی تو علیحدہ سے ایک بلاک الگ تھی۔ سرخ رنگ کے استر پر سفید رنگ سے جلی حروف میں لکھا تھا:

ـرأ باسم ربك الذي خلق ۝ خلق الانسان من علق؛" اور اس کے نیچے لکھا تھا " محمد نرف۔ چکوال پاکستان" یہاں بھی پاکستانی مسلمانوں نے اپنی گہری عقیدت اور جذبۂ نسبت کی روایت کو ش کر دیا۔

میں حیرت و استعجاب میں غرق تھا، سب نوافل میں مصروف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوتِ گویائی لب ہو گئی ہے اور قوتِ متخیلہ پرواز کر کے چودہ سو سال پیچھے چلی گئی ہے۔ بمشکل دل کو سنبھالا۔ کچھ نت کے بعد غار کے اندر داخل ہو گئے۔ نوافل ادا کیے، دعا مانگی۔ یہاں سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا، مگر باہر ی دیر سے میں بری طرح اور دیوانے جمع ہو کر میرے منتظر تھے۔ لاچار باہر آنا پڑا۔

سُرمہ خاکِ پا عنایت ہو   آگیا ہے غبار آنکھوں میں

ب سخن نہ دارد

پاکستانی حجاج وہاں متعدد مسائل سے دو چار ہوتے ہیں۔ رہائش اور خوراک دو اہم ضرورتیں ہیں۔ لہ اب حکومتِ وقت نے بہت سی سہولتیں بہم پہنچانے کی سعی کی ہے۔ گروپ سسٹم ایک طریق کار ہے، ر بیشتر افراد کو گروپ لیڈروں کے کردار سے نالاں اور شاکی ہی پایا۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہ کہ خستہ یا ناروا لباس میں کوئی مرد یا عورت آپ کو نظر آئے تو بلا دریغ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہ۔ آداب و لباس میں سب سے قابلِ تعریف انڈونیشیا ہے بلکہ سرفہرست ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیدرل فوجی دستہ مارچ کر رہا ہے۔ ترکی کے مرد حجاج خاکی بوشرٹ پتلون میں وجیہ نظر آتے ہیں۔ نائیجیریا جنوبی افریقہ گو رنگت میں منفرد ہیں مگر لباس کی صفائی ستھرائی میں کسی سے کم نہیں۔ ہندوستان کے حجاج کو و لباس کے معاملے میں بدحال ہی تک پایا۔ مگر پاکستان کی کثیر تعداد مرد ہوں یا عورتیں ذوقِ تشخص سے بے نیاز ن کی صفائی ستھرائی سے بے پرواہ یہاں وہاں نظر آئے۔ بعض مستورات کو تو مسجد نبوی میں بھی باقاعدگی سے

سرخی لپ سٹک سے آراستہ کر کے چہل قدمی کرتے دیکھا۔ بشرے سے وہ پاکستانی نظر آتی تھیں، جن کو میں نے سختی سے تنبیہ کی جس کے نتیجے میں ان عورتوں نے فوری طور پر دوپٹے سے یہ خرافات صاف کر ڈالیں۔

یہ بات ماننی پڑے گی کہ ٹرانسپورٹ اور رہائش کا عمدہ انتظام ایران کا تھا۔ ویسے تو نائیجیریا، انڈونیشیا اور مصر کی بھی اپنی ٹرانسپورٹ تھی مگر کیا کہنے ایران کی تنظیم کے۔ حجاج ایران کے لیے پورے پورے محلے مختص کر دیے گئے تھے، جس کے ثبوت میں ان بلڈنگوں کے اوپر اور کھڑکیوں میں ایرانی جھنڈے نصب کر دیے گئے تھے۔ مکہ روڈ ٹرانسپورٹ کی نصف سے زائد بسیں انھوں نے اپنے حجاج کے لیے ریزرو کروالی تھیں جن کے ثبوت و نشان وہی میں بسوں کے سٹیشنوں پر ایرانی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ تو خیر سے ایرانی تیل کی دولت کے کرشمے تھے۔ مگر نائیجیریا اور انڈونیشیا جیسے ملکوں نے بھی اپنے ممالک کے حجاج کی تکالیف کو رفع کرنے کے لیے بسوں کی سہولتیں بہم پہنچا دی تھیں۔ پاکستانی حجاج صابر و شاکر دھکے کھاتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ جن پر پاکستان کے "خدا رسیدہ بزرگوں کی نگاہِ کیمیا اثر مائل بہ کرم تھی" وہ ضرور محترم و موقر تھے۔

جدہ ایرپورٹ پر پاکستانی حجاج اپنے ملک واپس آنے کے لیے اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ جن صعوبتوں سے دوچار تھے، اسے وہی جانتا ہے جس پر گزرتی ہو۔ ہم سوچتے رہے کہ یہ سب بے پناہ شاپنگ کا نتیجہ ہے۔ سامان کے یہ ڈھیر ان کے لیے وبال جان بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ممالک کے حجاج نے پاکستانی حجاج کے مقابلے میں زیادہ ہی ڈھیر لگا رکھے تھے مگر ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پی آئی اے کی جانب سے وزن کرانے اور چیکنگ کے مسائل درپیش تھے۔ ایرانی پرواز تیار تھی، حجاج کا سامان جمع کیا گیا اور ایک ٹرالی کے ذریعے جہاز تک لے جا کر جہاز کے پیٹ میں بھر دیا گیا اور حجاج آرام سے وقت مقررہ پر جہاز میں سوار ہو گئے۔ کیا ضرورت ہے سامان کی چیکنگ اور تولنے کی، قوم کا سامان ہے اور قوم عازم سفر ہے۔

ہوائی جہازوں میں اکثر و بیشتر سفر کرنے کی سعادت و توفیق ملتی رہی ہے۔ مگر جس حساب سے اس جہاز کے اندر حجاج کو ٹھونسا گیا وہ اپنی مثال آپ تھی۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ جہاز میں کتنے مسافر تھے مگر کرسیوں کو اس قدر قریب کر دیا گیا تھا کہ صورت حال یہ تھی کہ دو قطاروں کے درمیان بہ مشکل ایک بالشت جگہ تھی جس میں سے میں تو کسی نہ کسی طرح اڑ پھنس کر بیٹھ گیا مگر فربہ اندام قسم کے لوگوں کو چار گھنٹے کی پرواز میں جو سزا ملی وہ وہی جانتے ہیں۔ اس پر کارکنوں کی بے رخی اور بھی افسوس ناک تھی۔ کاش وہ اس تکلیف کا احساس کریں۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ۔

(صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ)۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں بہتر وہ شخص ہے جو قرآن کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور پھر لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔

قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے، جو جبریل کے ذریعے اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ افشردۂ نور اور مرکز ایمان ہے۔ دین کی تمام سچائیاں اور اسلام کی تمام صداقتیں اس میں جمع ہیں۔ دنیا و عقبیٰ کی کامیابیاں اس کی تعلیم میں موجود ہیں۔ اس کی ہر بات مبنی بر صحت اور اس کا ہر بول حق و صداقت کا مظہر ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ اس میں شک و ریب کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ آج بھی اسی صورت اور اسی شکل میں ہمارے سامنے ہے، جس طرح کہ چودہ سو سال پہلے تھا۔ یہ وہ نطق جبریل ہے جس کے کسی لفظ، کسی حرف اور کسی نقطے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ قیامت تک ہوگی۔ اللہ نے خود اس کی حفاظت کی ذمے داری قبول فرمائی ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر: ۹) یعنی ہم ہی نے اس نامۂ نصیحت کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن مجید کے بے شمار فضائل خود قرآن میں بھی اور کتب حدیث میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ جو خوش قسمت حضرات اس کی تلاوت کی سعادت حاصل کرتے ہیں، ان کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کی تلاوت کرنے والے کو اس کے ایک ایک حرف کے بدلے دس دس نیکیاں بارگاہِ خداوندی سے حاصل ہوتی ہیں۔ پھر جو لوگ اس کے مطالب و معانی پر غور کرتے اور اسے سمجھ سمجھ کر پڑھتے ہیں، انھیں اور بھی مستحقِ خیر و فضیلت قرار دیا جاتا ہے۔ جس مجلس میں قرآن مجید پڑھا جا رہا ہو، وہ بھی اللہ کے نزدیک نہایت بابرکت مجلس ہے۔

اس حدیث میں جو ابتدا میں درج کی گئی ہے، قرآن کا علم حاصل کرنے والے اور پھر آگے اس کی تعلیم کو پھیلانے والے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ تم میں سب سے بہتر اور اچھا شخص وہ ہے جو خود بھی قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہے۔ اس حدیث کے ساتھ ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ایک اور حدیث مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ اَفْضَلَكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اَوْ عَلَّمَهٗ -

کہ تم میں سے افضل ترین وہ شخص ہے، جو قرآن کی تعلیم حاصل کرتا ہے یا اس کی پاکیزہ تعلیم سے لوگوں کو بہرہ ور کرتا ہے۔

قرآن کی تعلیم کو عام کرنے اور پھیلانے میں جو کوشش بھی کی جائے گی، وہ خیر و فضیلت کا باعث ہوگی۔ اس کو پڑھنا، سننا، سمجھنا، لوگوں کو پڑھانا، پڑھنے اور پڑھانے والوں کی مالی امداد کرنا، قرآن مجید خرید کر مسجدوں میں رکھنا اور پڑھنے والوں میں تقسیم کرنا، سب نیکی ہے اور اس قسم کے لوگ خیر و فضیلت کے حامل ہیں۔

قرآن مجید نے دنیا میں جو انقلاب پیدا کیا اور اس کی تعلیم سے انسانی ذہن اور انسانی فکر میں جو تبدیلی آئی، اس کو تاریخ میں عظیم الشان حیثیت حاصل ہے، اس سے تاریخ کا دھارا بالکل بدل گیا اور ایک ایسی قوم منصۂ شہود پر آئی جس نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے اور اقوامِ عالم میں سب سے آگے نکل گئی۔ علم و عمل، اخلاق و کردار، نظم و نسق اور شجاعت و بسالت میں کوئی اس کا حریف نہ تھا۔ آج بھی اگر قرآن کو مطمحِ نظر ٹھہرایا جائے اور اس کے احکام و ہدایات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ کی روشنی میں سمجھا جائے اور اس پر عمل کی دیواریں استوار کی جائیں تو ارتقا و تقدم کی وہی فضا پیدا ہو سکتی ہے جو چودہ سو سال پہلے پیدا ہوئی تھی اور جس کے چرچوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی — جنوری ۱۹۸۳

مضمون	مصنف
سرحدی اسلام کے قرونِ اولیٰ میں (مسلسل)	مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی
عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں — محرکات، مسائل اور مقاصد (مسلسل)	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
شریف التواریخ (مسلسل)	پروفیسر محمد اسلم
وشوا بھارتی یونیورسٹی کے فارسی، عربی اور اردو مخطوطات (مسلسل)	عبدالوہاب بدر بستوی

البلاغ، کراچی — جنوری ۱۹۸۳

مضمون	مصنف
ہادیِ کامل — اردو میں سیرتِ طیبہ کی پہلی غیر منقوط کتاب	محمد علی رازی ایم اے
شیخ علی متقی گجراتی (مسلسل)	مولانا عبدالحلیم چشتی

بینات، کراچی — جنوری ۱۹۸۳

مضمون	مصنف
قربانی کی شرعی حیثیت	عبدالرؤف ظفر
سید احمد شہید بریلوی	احمد یعقوب چودھری
کینیا کے مسلمانوں کے مسائل	محمد سمیع اللہ

تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ — اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۲

مضمون	مصنف
احکامِ شریعت میں حکمت کا صحیح تصور	سید جلال الدین عمری
عہدِ نبوی کی مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کا تناسب	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
مسجدِ اقصیٰ اور اس کے ماحول کی قدیم تاریخ	عبدالباری ایم۔ اے
اسلام میں مظلوم کو دفاع کا حق ہے۔	سید جلال الدین عمری
انسانی مساوات اور مذاہبِ عالم	سلطان احمد اصلاحی
رؤیتِ ہلال کا مسئلہ	شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید، ترجمہ مولانا محمد امین آثری
[illegible]	ڈاکٹر مسعود الرحمان خان ندوی

ترجمان الحدیث، لاہور — جنوری ۱۹۸۳

نظریۂ ارتقا	عبدالرحمن کیلانی
حیاتِ خضر	عبدالستیر حماد
تذکرۃ المحدثین	عبدالرشید عراقی

تعمیرِ انسانیت، لاہور — جنوری ۱۹۸۳

زکوٰۃ	خواجہ بدرالدین بانڈے
احسن الحدیث	ملک غلام کبریا
نماز کے بعد ترجمے کی انقلابی اہمیت	ڈاکٹر الطاف جاوید
قرآن کی روشنی میں پیغمبرانہ انقلاب	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

صحیفہ، لاہور — جنوری، فروری ۱۹۸۳

نفسیاتی تنقید — ایک تعارف	ڈاکٹر سلیم اختر
کلام سنائی میں ہجو و مزاح کا عنصر	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی
جھنگ میں لوک ناچ کی روایت	سمیع اللہ قریشی
مرزا محمد کاظم برلاس افسوں مرادآبادی، ایک مورخ کی حیثیت سے	مرزا محمد محسن برلاس
ہفت کشور — ہیئت و عروض کے تجربے	محمد اسلم ضیا

نوائے ادب، بمبئی — اکتوبر ۱۹۸۲

فدا کا غیر مطبوعہ کلام	ڈاکٹر سید وحید اشرف
مرزا بیدل کا فن اور اسلوب	ڈاکٹر امانت ایم اے پی ایچ ڈی
اردو ادب کا ایک جائزہ	کے سکے کھلر
لچھمی نرائن شفیق	ڈاکٹر شیخ فرید
شہزادہ شجاع کا ایک گمنام درباری شاعر	پروفیسر سید امیر حسن عابدی

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن : مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاورات ِ عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرالیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایہء بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت ِ قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری

جلد اول — محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیات ِ غالب : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیر ِ نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب موضوع کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

ماہ نامہ المعارف لاہور ۔ فروری ۱۹۸۳ — رجسٹرڈ ایل نمبر 6033

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE

CLUB ROAD LAHORE (PAKISTAN)

مارچ ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارہ ثقافت اسلامیہ

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس لاہور

فون ۵۲۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۶ | مارچ ۱۹۸۳ | جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ | شمارہ ۳

ترتیب

تاثرات

۳۰ جنوری ۱۹۸۹ء کو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے بانی و مؤسس ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی وفات پر تیس سال گزر چکے ہیں۔ وہ ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو فوت ہوئے تھے۔ وہ مجلس یادگار خلیفہ عبدالحکیم کی طرف سے اس ادارے میں ان کی تیسویں برسی منائی گئی۔ صدارت چیف جسٹس (ریٹائرڈ) جناب شیخ انوار الحق نے کی۔ شیخ [illegible] نے فرائض خلیفہ صاحب مرحوم کی صاحب زادی ڈاکٹر رفیعہ حسن نے انجام دیئے۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ نے صدرِ جلسہ اور شرکائے جلسہ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور خلیفہ صاحب مرحوم کے وقیع کارناموں پر روشنی ڈالی۔ مولانا محمد حنیف ندوی، پروفیسر خواجہ غلام صادق اور پروفیسر شمیم راٹھور نے مقالے پڑھے۔ پروفیسر وارث میر نے زبانی تقریر کی۔ بعد میں صدرِ جلسہ شیخ انوار الحق نے صدارتی تقریر کی۔ مقالہ نگار حضرات اور مقررین کرام نے خلیفہ صاحب مرحوم کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات بیان کیے اور ان کے علمی اور تحقیقی مرتبے کی وضاحت کی۔ مولانا ندوی کا مقالہ "المعارف" کی اسی اشاعت میں درج ہے۔ باقی دو مقالے ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں شائع ہوں گے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت ذہین اور معاملہ فہم۔ عالم، ادیب اور متعدد اردو اور انگریزی کتابوں کے مصنف!! اصلاً لاہور کے رہنے والے لیکن عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) میں شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ ۱۹۴۹ء میں حیدرآباد سے لاہور آگئے۔ ان کا بہت بڑا کارنامہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی تاسیس و قیام ہے۔ اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے پروفیسر محمد سعید شیخ نے بتایا:

"جب خلیفہ صاحب عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، ملک غلام محمد (جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے) ریاست حیدرآباد کے وزیر خزانہ تھے۔ خلیفہ صاحب اور غلام محمد صاحب میں خاص بے تکلفی تھی اور دونوں کی ملاقات عام طور پر عثمانیہ یونیورسٹی کلب میں ہوتی تھی۔ ملاقات کے دوران سنجیدہ موضوعات بھی زیر بحث آتے تھے اور لطیفہ بازی کا سلسلہ بھی چلتا تھا۔ خلیفہ صاحب حیدرآباد کی حکومت ترک کر کے لاہور آگئے تو

غلام محمد صاحب کے گورنر جنرل مقرر ہونے کے بعد ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ اثنائے گفتگو میں خلیفہ صاحب نے بے تکلفی کے انداز میں پنجابی میں ان سے کہا، خود تو ملک کے گورنر جنرل بن گئے ہو، کچھ ہمارے متعلق بھی سوچا؟ انھوں نے پوچھا، آپ کیا چاہتے ہیں؟ خلیفہ صاحب نے جواب دیا، آپ کو معلوم ہے کہ میرا کام تو لکھنا پڑھنا ہے، اس کے لیے کنج عزلت اور ایسے اہل علم احباب کی ضرورت ہے جن سے علمی اور بالخصوص اسلامی موضوعات پر مبادلۂ خیالات ہو سکے۔

"خلیفہ صاحب کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہونے کے بعد غلام محمد صاحب نے کہا، آپ اپنے لیے کنج عزلت تلاش کیجیے، ہم اسے آپ کی تحویل میں دے دیں گے۔ اب خلیفہ صاحب کے حسن نظر نے "نرسنگ داس گارڈن" کا انتخاب کیا اور اس طرح "ادارۂ ثقافت اسلامیہ" کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بلڈنگ اس کا دفتر قرار پائی اور کام کے لیے غور و فکر ہونے لگا۔ ابتدا میں جن اہل علم کو خلیفہ صاحب نے اپنے گرد جمع کیا وہ تھے، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی، ڈاکٹر رفیع الدین، رشید اختر ندوی، مظہر الدین صدیقی، خواجہ عباد اللہ اور سید رئیس احمد جعفری۔ اس طرح ادارے کے لیے اصحاب علم و فکر کا ایسا عملہ وجود میں آیا جو مشرق و مغرب اور قدیم و جدید کا حسین امتزاج تھا۔ خلیفہ صاحب ان حضرات کو اپنا علمی سرمایہ اور تحقیقی اثاثہ قرار دیتے، ادارے سے متعلق ہر معاملے میں ان کو شریک مشورہ کرتے، ان کی رائے کو خاص اہمیت دیتے اور لوگوں کے سامنے ان میں سے ہر ایک کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے۔"

خلیفہ صاحب مردم شناس صاحب علم تھے، وہ اپنے رفقائے کار کی علمی قابلیت سے خوب آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ کس کے سپرد کون سا موضوع کرنا چاہیے۔ وہ ہر شخص سے اس کے ذوق اور ذہنی صلاحیت کے مطابق کام لیتے۔ انھوں نے تقریباً دس سال ادارے کی خدمت کی۔ اس عرصے میں ادارے کی طرف سے چودہ [۱۴] کتابیں شائع ہوئیں۔ بقول پروفیسر محمد سعید شیخ "دس سال کا یہ زمانہ خلیفہ صاحب کی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ اس عرصے میں یہ ادارہ ملک و قوم کے لیے ایک نظریاتی معمل یا فیکٹری کی حیثیت اختیار کر گیا، جہاں ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے مطلوبہ لٹریچر تیار ہونے لگا۔ خود خلیفہ صاحب کی اپنی پہلی کتاب "اسلامک آئیڈیالوجی" جو انگریزی زبان میں ہے، ادارے کی طرف سے شائع ہوئی۔ اسی طرح دوسری کتاب

"اسلام اینڈ کمیونزم" معرضِ اشاعت میں آئی، جس میں اسلام اور کمیونزم کے مختلف نظریوں کا نہایت بصیرت افروز تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔" انگریزی میں ان کی اور بھی متعدد کتابیں ادارے کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ اردو میں بھی انھوں نے بہترین کتابیں تصنیف کیں۔

خلیفہ صاحب ہی کے زمانے میں ادارے کی طرف سے ماہ نامہ "ثقافت" جاری ہوا، جس کا نام ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے "المعارف" رکھا۔

بہرحال ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی ایک بہت بڑی علمی اور تحقیقی یادگار ہے جو اپنے محدود وسائل کے باوجود تصنیف و تالیف کے ذریعے اسلام کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

ڈاکٹر بدرالدین بٹ

عربی ادب کا ارتقا

لفظ "ادب" کی اصل کیا ہے اور یہ موجودہ اصطلاحی معنی میں کب استعمال ہونے لگا، اس سلسلے میں محققین کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ عمدہ مفہوم رکھنے اور سہل و آسان ہونے کے باوجود یہ لفظ نہ تو قرآن میں مذکور ہے اور نہ جاہلی شعرا کے کلام میں ان اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس وقت دورِ جاہلی کی جو عبارتیں یا اشعار ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں اوّل تو یہ لفظ ان اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہی نہیں اور اگر استعمال ہوا بھی ہے تو ان عبارات اور اشعار کی حیثیت محققین کے نزدیک غیر مستند اور مشکوک ہے۔ مرحوم ڈاکٹر طٰہٰ حسین بے دھڑک کہتے ہیں کہ " مجھے جاہلی ادب کے بارے میں تردد اور شک رہا اور میں برابر اپنے شک پر اصرار کرتا رہا یا یوں کہیے کہ شک برابر میرے ساتھ رہنے پر مصر رہا۔ یہاں تک کہ میں نے تفکر اور رغبت و تلاش سے کام لینا شروع کیا، جس کے بعد میں ایسی حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جو اگر یقینی نہیں تو یقین کی حد تک ضرور پہنچی ہوئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آج تک جس کو ہم جاہلی ادب کہتے رہے ہیں، اس کے اکثر و بیشتر حصے کا جاہلی ادب سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ ظہورِ اسلام کے بعد بڑھا یا گیا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ علما کو "ادب" کی اصل کے متعلق بڑے ترددات اور تاویلات سے کام لینا پڑتا ہے۔ مشہور اطالوی پروفیسر نالینو کی ادب کے اشتقاق کے بارے میں ایک خاص رائے ہے۔ وہ "ادب" کو "دأب" بہ معنی عادت سے مشتق مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "ادب" مفرد سے نہیں بلکہ "دأب" کی جمع سے نکلا ہے۔ "دأب" کی جمع "ادآب" ہے جو تبدیل ہو کر آداب ہوگئی ہے، جس طرح "بئر" اور "ریم" کی جمع "آبار" اور "ارآم" سے بدل کر "آبار" اور "آرام" ہوگئی ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ "دأب" کی جمع "آداب" کا استعمال اس قدر عام ہوگیا ہے کہ اہلِ عرب اس جمع کی اصل کو اور جو اس میں تبدیلی ہوئی ہے اس کو بھول گئے اور ان کو یہ غلط خیال پیدا ہوگیا کہ "آداب" ایسی جمع ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے اور اسی جمع سے انھوں نے اس کا واحد بجائے "دأب" کے "ادب" سمجھا اور ادب کا عادت کے معنوں میں استعمال عام طور پر ہونے لگا۔ اس

گئے۔ بعد میں یہ لفظ اپنے خاص معنی سے دوسرے مختلف معنوں میں منتقل ہوتا رہا۔

احمد حسن الزیات کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی اور دیگر سامی زبانوں میں سریانی زبان سے داخل ہوا ہے۔ ان لوگ پرانے زمانے سے جنوبی عراق میں آباد تھے سریانیوں سے یہ سامیوں نے لیا جو ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اس لفظ کے معنی ان کے پاس انسان کے تھے۔ شاید بعد میں یعنی "ادب" سے "آدم" ہوگیا، پھر عربی زبان نے اس کو اپنی مساوی اصل ہی میں محفوظ کیا اور ان معنوں میں استعمال کیا جن سے "آدمیت" یا "انسانیت" کے معنی مراد لیے جاسکتے تھے۔ نیز آدمیت میں ان خصائل حمیدہ یا اس سے قریب تر صفات ہوں۔

مگر احمد الشائب کا خیال ہے کہ "دو ظاہری وجوہ کی بنا پر غالباً لفظ "ادب" عربی میں ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسے الفاظ جو "ادب" سے معنی کے اعتبار سے اور مادے کے اعتبار سے قریب ہیں پائے جاتے ہیں مثلاً "ہدأ أبداً"، "دأب" کو پیش کیا جاسکتا ہے اور یہ سب کسی چیز کے ساتھ تعلق کے معنی میں مشترک ہیں اور یہ بہت ہی عجیب اور نادر بات ہے کہ لفظ "ادب" اپنے ہلکے پن اور اپنے معنی کے باوجود بھی ان مشترک المعنی الفاظ کے ساتھ کتابوں نہیں ملتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسری سامی زبانوں مثلاً سریانی اور عبرانی میں کبھی یہ موجود نہیں۔ ان زبانوں کا تعلق عربی زبان سے بہن کا سا ہے، پس یہ بات مسلّم ہے کہ یہ لفظ خارجی نہیں بلکہ عربی الاصل ہے۔"

ان تاویلات اور مفروضات کو پیش کرنے کے بعد آیئے اب "ادب" کے تدریجی ارتقا کے بارے میں کچھ گفتگو کریں۔

دورِ جاہلیت

عربی ادب کی کتابوں میں ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ "ادب" کا لفظ دورِ جاہلیت میں مستعمل اور رائج تھا۔ ابن عبدربہ نے نعمان بن منذر کا ایک خط نقل کیا ہے جو اس نے کسریٰ کو ارسال کیا تھا۔ اس خط میں یہ الفاظ بھی ہیں: "وقد اوفدت ایھا الملک رھطاً من العرب لھم فضل فی احسابھم وانسابھم وعقولھم وآدابھم۔"

اسی طرح "العقد الفرید" ہی میں ذکر ہے کہ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی بیٹی کے ہونے والے شوہر ابو سفیان کا نام لیے بغیر اس کی خوبیاں شمار کرتے ہوئے کہا: "بدر ادومتہ وعز عشیرتہ یؤدب اھلہ

ولا یُؤدِّبُونَہ" (یعنی وہ اپنے خاندان کو بناتا اور عزت دیتا ہے اور انھیں ادب سکھاتا ہے، وہ ان سے ادب سیکھتے ہیں)۔ جنھوں نے جواباً کہا "إنی ساخذہ بأدب البعل" (یعنی میں اس کا ادب شوہر کا سا کروں گا)۔

علقمہ بن علاثہ کی وہ باتیں بھی قابل غور ہیں جو اس نے کسریٰ کے سامنے کہی ہیں، جن میں اس نے کہا: "فلیس منہم احد الا شہد بانا افضل فمن غرب عنک بل لو قست کل رجل منہم وعلمہم ما علمنا لوجدت لہ فی آبائہ اندادا واکفاء کلہم الی الفضل منسوب وبالشرف والسودد موصوف وبالمزایا الفاضلۃ والادب معروف" (یعنی وہ جو سب دو ہیں وہ کم تر نہیں ہیں، ان سے جو تمہارے سامنے حاضر ہوتے ہیں ..... تو تم سب کو فضل و اور سرداری کے شرف میں شریک پاؤ گے اور فاضل اسلاف اور ادب سے معروف و موصوف پاؤ گے)۔

دورِ رسالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں یہ لفظ ثقافت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اصطلاحی معنی کے بالکل قریب ہے۔ ثبوت کے طور پر تین حدیثوں کو ہم پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے آنحضرت سے پوچھا: "یا رسول اللہ ہم تو ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں، ہم آپ کو مختلف وفود عرب سے گفتگو فرماتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اس کا اکثر حصہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے" آنحضرت نے جواباً فرمایا: "ادبنی ربی فاحسن تادیبی وربیت فی بنی سعد" (یعنی میرے پروردگار نے میری تربیت (تادیب) کی اور بہت اچھی تادیب کی اور میری پرورش بنی سعد میں ہوئی ہے)۔

اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان هذا القرآن مأدبة الله فی الارض فتعلموا من مأدبته" پس "ادب" اسم مکان ہے جو حدیث میں بطور تشبیہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن وہ آداب بیان کرتا ہے جن کی طرف اللہ اپنے بندوں کو بلاتا ہے، وہ ادب کو کریمانہ اخلاق، بہترین دانائی، منفعت بخش نصائح اور ہر وہ چیز ہے جس سے نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت علی کا قول ہے: "واما اخواننا بنوامیة فقادة ادبة" یہاں "ادبة" "ادب" کی جمع ہے، جس طرح کاتب کی جمع "کتبة" ہے اور "ادب" دسترخوان کی طرف بلاتا ہے اور وہ کھانا ہے جس کو آدمی بناتا ہے اور پھر لوگوں کو اس طرف بلاتا ہے۔ بعض علما کی رائے کے مطابق اس لفظ کی یہ پہلی لغوی اصل ہے

اور ہم محققین کو اس بات پر متفق پاتے ہیں کہ یہ ایسے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ لفظ بعد میں نہیں آیا ہے۔

اموی دور

اموی دور آیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کلمہ صحیح طور پر تاریخ میں داخل ہوتا ہے اور یہ ایک کثیر الاستعمال کلمہ بن جاتا ہے۔ اس کے مشتقات بڑھ جاتے ہیں۔ بقول طٰہٰ حسین" بہر حال اس کی اصل کچھ ہی کیوں نہ ہو اور اس لفظ کا مصدر کچھ بھی ہو، اتنا تو طے شدہ ہے کہ بنو امیہ کے دور میں اس لفظ کا اطلاق اس قسم کے علم پر ہوتا تھا جس کا کوئی تعلق مذہب و دینیات سے نہ ہو یعنی شعر و شاعری (جس میں فحش اور ہاجی بھی شامل ہیں جو اس دور میں جریر، فرزدق اور اخطل کے درمیان چل رہی تھیں حالاں کہ یہ سب دین و اخلاق کی رو سے غلط، گناہ اور منکر وہ ہیں) کہانیاں اور وہ ضمنی علوم جو شعر اور کہانیوں سے متعلق ہیں۔ نیز یہ لفظ ان چیزوں پر بھی دلالت کرتا تھا جن کو آج روزمرہ کی عملی زندگی میں ہم اس لفظ سے مراد لیتے ہیں۔ یعنی نیک نفسی، شرافت، حسن اخلاق اور وہ سیدھی سادی زندگی جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ عام طور پر وہ بہتر زندگی ہے۔ لوگ کہتے تھے " ادب فلانا" اور اس سے یہ دونوں معنی مراد لیتے تھے۔ فلاں شخص کو اس نے ادب کی تعلیم دی، اس خاص قسم کی تعلیم جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ دوسرے معنی اس کو ادب اور تہذیب سکھائی، وہ طرز زندگی جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ ادب کا لفظ انہی دونوں معنوں میں تاریخ عربی کے ہر دور میں دلالت کرتا رہا ہے۔ خود ان معنوں نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ کبھی اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور کبھی یہ انتہائی محدود رہا مگر "ادب" کا لفظ دونوں حالتوں میں انہی دو معنوں کے ساتھ چلتا رہا۔" اسی طرح طٰہٰ حسین ایک اور جگہ رقم طراز ہیں "اگر آپ وہ عبارتیں پڑھیں گے جن میں اس مادے کا استعمال دور بنی امیہ میں ہوا ہے تو آپ قطعی طور سے محسوس کریں گے کہ سب سے پہلے جس مفہوم میں اس کا استعمال ہوا ہے وہ تعلیم ہے۔ تعلیم کا وہی مفہوم جو بنی امیہ کے زمانے میں اس لفظ سے سمجھا جاتا تھا، یعنی روایت کے ذریعے پڑھانا۔ شعر کی روایت، حدیثوں کی روایات، پہلے لوگوں کے واقعات اور ان کے کارناموں کی اور ہر اس چیز کی روایت جس کا تعلق دور جاہلیت سے ہے۔ نئے اور پرانے لوگوں کی بہادری کی داستانوں کی اور ہر اس چیز کی روایت جو اس ثقافت کی تشکیل میں معاون ہے، جس کا ہر روشن خیال عرب متمنی تھا، یعنی وہ لوگ جن کے ہاتھ میں طاقت تھی یا

وہ علامت جس کا خلفائے وقت احترام کرتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مادہ شروع شروع میں فعل یا اسم فاعل کی صورت میں استعمال ہوتا تھا۔ اہل عرب اَدَبَ کا صیغہ استعمال کرتے تھے یا ایک خاص مفہوم میں "مؤدب" کا لفظ ہر قسم کی روایت کرنے والوں کے لیے نہیں بولا جاتا تھا۔ حدیث کے راویوں یا مذہبی علوم کے پڑھانے والوں کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اشعار کے راویوں پر، تاریخی واقعات بیان کرنے والوں پر اور ان لوگوں پر جو امرائے وقت کے بچوں کو اشعار و اخبار کی تعلیم دینے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے، ان پر اسی لفظ کا اطلاق ہوتا تھا، جیسا کہ ابومعبد الجہنی اور عامر الشعبی تھے: یہ دونوں عبدالملک بن مروان کی اولاد کو تعلیم دیتے تھے اور صالح بن کیسان، عمر بن عبدالعزیز کے بیٹے کے مؤدب تھے اور آخری اموی حکمران مروان بن محمد کا مؤدب جعد بن درہم تھا۔

اوپر کی باتوں کا ثبوت ان تحریروں سے ملتا ہے جو اس دور کی طرف منسوب ہیں۔ ہم زیاد کے "خطبہ البتیرا" کا اقتباس نقل کرتے ہیں: " فادعوا الله بالصلاح لائمتکم فانهم ساستکم المؤدبون لکم ...... اما والله لأؤدبنکم غیر هذا الادب او لتستقیمن " (یعنی خدا کو اپنے اماموں کی اصلاح کے لیے پکارو کیوں کہ وہ تمہارے سردار ہیں جو آپ کے مؤدب ہیں، نہیں تو بخدا! میں اس ادب کے بدلے دوسرا ادب سکھاؤں گا جب تک نہ سدھر جاؤ گے)۔

یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ مادہ اس کے تہذیبی معنوں میں مستعمل ہے جو اخلاق فاضلہ اور نیک سلوک کے قریب ہے۔ اسی طرح عمر بن عبدالعزیز نے اپنے مؤدب سے پوچھا: کیف کانت طاعتی ایاک وانت تؤدبنی " تو مودب نے جواب دیا، "اچھی اطاعت" تو عمر نے فرمایا: فأطعنی الان کما کنت اطیعک (یعنی میری پیروی کرو جس طرح میں آپ کی اطاعت کرتا تھا)۔

پہلی صدی ہجری کے وسط سے مادہ " ادب " کے تہذیبی معنی کی تحدید ہوئی اور یہ دو ممتاز معنی ادا کرنے لگا۔ ایک اخلاقی اور تہذیبی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو مشق کے ذریعے اجتماعی فضائل اور خصائل کریمانہ مثلاً بردباری، کرم، شجاعت اور سچائی پر ابھارا اور آمادہ کیا جائے اور پھر اس مشق کے ذریعے لوگوں میں بھی اخلاقِ فاضلہ اور سیرتِ حمیدہ کا تاثر پیدا کیا جائے اور اسی وجہ سے ابن المقفع نے اپنی کتابوں کا نام "الادب الصغیر" اور "الادب الکبیر" رکھا۔ (اگرچہ قبل الذکر کی صحت نسبت بہت مشتبہ ہے) کیوں ان میں ایسے قوانین اور اصول تھے کہ جو ان کا پابند ہو گیا

ادیب، فاضل یا مودب بن گیا اور جس کی سیرت محمودہ اور اخلاق کریمانہ ہو وہ کہی۔

دوسرے معنی تعلیمی ہیں جو شعر و نثر کی روایت اور انساب و اخبار اور امثال اور ایسے علوم پر عام ہے جن سے عقل منور، ذوق پاکیزہ، نفس مہذب اور عرفان سے سرشار ہو جاتے۔ لہذا جن علوم سے ادبی ثقافت کی ... دوسرے سے ممتاز ہوگئے۔ مذکورہ بالا معانی کی طرف انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ ادب میں الیف جبرائیلی نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ جبرائیلی رقم طراز ہیں:

"However from the first Century of the Hidjra, adab in addition to its ethical and social meaning acquired an intellectual meaning, which was at first connected with first meaning, but then became increasingly differentiated from it. Adab came to employ the sum of knowledge which makes a man courteous and "Urbane" profane, Culture (as distinct from "olm" or other religious learning "Karan", hadith and Fikh) based in first place on poetry, the art of oratory, the historical and tribal traditions of the ancient Arabs and also of corresponding sciences rhetoric, grammar, lexicography metrics."

یہی وجہ ہے کہ ادب کا یہ انسانی تصور ابتداً غالصتاً قومی تھا۔ چنانچہ بنو امیہ کے دور میں مکمل ادیب وہ شخص تھا جو شعرائے قدیم، ایام العرب اور عرب ثقافت کے شاعرانہ، تاریخی اور ... کے پہلوؤں سے بہترین واقفیت رکھتا ہو۔ لیکن غیر ملکی ثقافتوں کے ساتھ رابطہ پیدا ہو جانے پر لفظ "ادب" کا مفہوم وسیع تر ہوگیا اور عرب ادبیات کی جگہ اب مطلق و بلا قید ادبیات نے لے لی۔ اب اس کے مفہوم میں غیر عربی ادب (ہندی، ایرانی اور یونانی اقوال و امثال سا گیا۔

فنی ادب) کے ان عناصر کا علم بھی شامل ہوگیا جن سے عربی اسلامی ثقافت ابتدا ہی سے دو چار تھی۔ اس کے بعد واقف ہوئی۔ اسی عہد سے ادیب یا مؤدب، شاعر و کاتب سے ممتاز ہوگیا۔ جس آدمی پر ادبی تعلیم کا غلبہ ہو وہ ادیب ہوگیا اور جب اس پر جذبۂ شاعری غالب ہو تو شاعر بن گیا اور جب نثر نویسی کا غلبہ ہو تو کاتب کہلانے لگا۔

مادہ "ادب" پہلی صدی ہجری کے ان ہی دو معنوں پر دلالت کرتا رہا، اس میں رد و بدل بھی ہوا۔ اس کے معنی میں کبھی تنگی اور وسعت آتی گئی لیکن یہ دو معنی سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ مراد لیے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا "ادب دو ہیں، ایک ادب النفس، دوسرا ادب الدرس۔

عباسی دور

جب دوسری صدی ہجری کا نصف زمانہ گزر گیا اور عربی علوم یعنی لغت، صرف و نحو پروان چڑھے تو ادب کے تعلیمی معنی میں اضافہ ہوگیا اور اس میں کچھ وسعت پیدا ہوگئی اور یہ کلمہ منقول نثر و نظم اور انساب و اخبار، صرف و نحو اور لغت و تنقید پر دلالت کرنے لگا لیکن ایسی صورت حال زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔

بے شک عصر عباسی ایک انقلابی دور تھا۔ اس میں علوم عربیہ نے ٹھوس شکل اختیار کی، سماجی حالات میں تبدیلی ہوئی، تہذیبی زاویوں کی رنگارنگی نے وہ صورت حال پیدا کی جس سے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں "ادب" مندرجہ ذیل معنی ادا کرنے لگا۔

ا۔ ادب اپنے صحیح یا خاص معنی کے اعتبار سے نام ہوگیا ان چیزوں کا جو از قسم نثر و نظم روایت کی جاتی ہیں اور ان علوم کا جو نثر و نظم کے ساتھ تشریح و تفسیر اور فنی خوبیوں کی طرف رہنمائی کرتے اور تعلق رکھتے تھے۔ یہ علوم جو اس قسم کا اتصال اور تعلق نظم و نثر کے ساتھ رکھتے ہیں لغت، نحو، انساب، اخبار اور کبھی کبھی تنقید کے ناموں سے یاد کیے جاتے تھے اور یہ معنی قریب ہیں اس معنی کے جو ادب پہلی صدی ہجری میں ادا کر رہا تھا، بلاشبہ اس میں فنی نثر اور تنقید کا اضافہ ہوگیا۔

تیسری صدی ہجری میں، جو ادبی تالیفات معرض وجود میں آئی ہیں وہ اس معنی کی تصدیق بھی کر رہی ہیں اور تفسیر بھی۔ مثال کے طور پر ہم جاحظ کی "البیان والتبیین"، ابن قتیبہ کی "الشعر والشعرا"، المبرد کی "الکامل"، محمد بن سلام کی "طبقات الشعرا" کو پیش کر سکتے ہیں، گو بقول

طہ اس میں یہ کتابیں کسی نظام اور اصول کے تحت نہیں لکھی گئی ہیں، مگر ہم لغوی مسائل، نحوی آرا، تنقیدی خیالات اور قصصی علوم کے ساتھ ساتھ ان میں خالص ادب بھی پا سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرے معنی عام ہیں، اس میں وہ تمام علوم انسانی، علمی آثار اور فنون جمیلہ اور ریاضی شامل ہیں جن سے ثقافتِ انسانی میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور آدمی ایک اعلیٰ معیار اور مہارتِ تامہ حاصل کرتا ہے۔ حسن بن سہل نے کہا ہے کہ آداب دس ہیں۔ تین شہرجانی، تین نوشیروانی اور تین عربی، اور ایک سب کا نچوڑ ہے۔ اب جہاں تک سارنگی، شطرنج اور لاٹھی کے کھیل کا تعلق ہے سب شہرجانی ہیں اور طب، انجنیئرنگ اور شہ سواری نوشیروانیہ ہیں اور عربی آداب میں شعر و نثر انساب و احب شامل ہیں جہاں تک ایک کا سوال ہے تو اس میں منتخب باتیں اور کہانیاں اور وہ چیزیں شامل ہیں جو مجالس میں لوگ ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ اس سے ان معاشرتی اور تہذیبی اثرات کی مقدار واضح ہوتی ہے جنھیں ایرانیوں نے نئی اسلامی زندگی میں سرایت کر دیا۔

ایف جبرائیلی کا کہنا ہے کہ تیسری صدی کا ادیب جس کی مکمل ترین مثال الجاحظ تھا، نہ صرف عربی نثر اور شعرعرب، امثال عرب، ایام العرب، جاہلیت اور عربوں کے اس زمانے کے انساب اور روایات کا ماہر تھا جب تمدنِ اسلامی ان میں راسخ نہ ہوا تھا بلکہ اس کی علمی دلچسپی کے دائرے میں پورا عالمِ ایران مع اپنی رزمیہ اخلاقی و قصصی روایات کے سما گیا تھا، اسی طرح ساری دنیائے ہند اپنی اساطیر داستانوں سمیت اور سارا جہان یونان اپنے علمی فلسفے خصوصاً اخلاقیات و اقتصادیات کے ساتھ۔ اس طرح تیسری صدی ہجری میں جو ادبی تصانیف وجود میں آئیں جن کا تبحر علمی گوناگوں بھی تھا اور دل خوش کن بھی، ان سب تصانیف کو خالصتاً علمی بھی نہیں کہا جا سکتا، اگرچہ بعض اوقات وہ علمی منتہیٰ کے قریب پہنچ جاتی ہیں اور انھیں استعمال بھی کرتی ہیں، بلکہ ان کا مرکز اوّلین انسان، اس کی صفات و جذبات، وہ ماحول جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے اور وہ مادی و روحانی ثقافت ہے جو اس نے تخلیق کی۔ اسی دائرے میں رہ کر الجاحظ اور اس کے متبعین (التوحیدی۔ التنوخی) نے اس ورثے سے جو ایرانی الاصل عبقری ابن المقفع نے گزشتہ صدی میں دنیائے اسلام کے لیے چھوڑا تھا، نہ صرف پورا فائدہ اٹھایا، اسے وسعت بھی دی۔ حقیقت میں المقفع ہی کو ادب کے اس وسیع تر تصور کا اوّلین پیش کرنے والا کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس نے غیرملکی تاریخی اور ادبی ذخائر (خدائے نامک اور کلیلہ و دمنہ

کو عربی سانچے میں ڈھالا اور اخلاقی پند و نصیحت کے لیے رسائل " الادب الکبیر" اور " الادب الصغیر" لکھے (اگرچہ موخر الذکر رسالے کی صحتِ نسبت مشکوک ہے) ان ادبی تخلیقات کو عباسی عہد کی ثقافتی بلندی کی حقیقی بنیادی قوت سمجھنا چاہیے۔"

تیسرے معنی یہ ہیں کہ اس میں وہ ادبی علوم بھی شامل ہیں جو مستقل بالذات ہوگئے اور خالص ادب سے علیحدہ ہو گئے۔ گویہ ایک ادیب کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان علوم سے اپنی ثقافت کی تکمیل کرے اور انشائے ادب کے لیے ان علوم سے استمداد کرے اور اپنی فہم اور قوتِ نقد کو بڑھانے میں ان سے مدد لے۔ یہ علوم لغت، نحو، انساب و اخبار اور تنقید تھے اور یہی وہ علوم تھے جو ثقافتِ عربی کے ستون تھے۔ اسی ثقافتِ عربی کے ساتھ ساتھ ثقافتِ دینی بھی ابھر کر سامنے آئی اور تفسیرِ قرآن، علومِ حدیث، فقہ اور اس کے اصول، علمِ کلام مثلاً توحید اور اس کے دیگر مذاہب کی بحثیں بڑھ گئیں اور ان علوم میں ثقافت کا وہ فلسفہ بھی تھا جو اصل میں ہندوستان، ایران اور یونان سے منتقل ہو گیا تھا۔

چوتھے معنی ادب النفس کے تھے اور ادب کے یہ مفہوم و معانی وسیع ہو گئے، اس میں مستحسن اسلوب، علم و عمل میں اخلاقِ فاضلہ اور سیرتِ محمودہ کی جلوہ گری اور وہ قوانین جو ہر منصب دار یا حرفت والے کے لیے ضروری تھے، شامل تھے۔ مثلاً ایک "ادب الکاتب" کہلانے لگا یعنی وہ ادب جو کاتب کے عہدے پر مامور ہونے کے لیے درکار ہو یا اسی طرح " ادب یا آداب الوزرا" یعنی مخصوص علم و تجربہ کا وہ مجموعہ جو فرائض وزارت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے، اس طرح کی کتابوں کے لیے امام ابو یوسف کی "ادب القاضی"، ابن قتیبہ کی " ادب القراۃ " وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ادب کے لغوی علوم مستقل طور پر جدا ہو گئے اور تنقید باقی رہی۔ اس صدی میں تنقید میں ترقی ہوئی اور ایک بلند درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ مستقل بالذات ہو جائے۔ اس زمانے میں جو کتابیں اس مقصد کے لیے تالیف کی گئیں ان میں ابو ہلال عسکری، ابو الحسن جرجانی اور آمدی کی تصانیف سب سے واضح مثالیں ہیں۔

چوتھی صدی ہجری ہی میں بحتری کے طرف داروں اور ابو تمام کے طرف داروں کے درمیان سخت قسم کا اختلاف ہوا اور اسی صدی میں آگے بڑھ کر متنبی کے حامیوں اور اس کے مخالفوں کے درمیان شدید اختلافات کی وجہ سے ٹھن گئی تھی۔ اس اختلاف نے فنِ تنقید کو فائدہ پہنچایا۔ آمدی نے ایک

ب "الموازنة بين الطائيين" لکھی اور جرجانی نے "الوساطة بين المتنبی وخصومه" تالیف کی۔ پانچویں صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ عبد القاہر جرجانی جیسے زبردست استاذ "دلائل الاعجاز" "اسرار البلاغة" لے کر نمودار ہوتے۔ ان کے معنی یہ ہیں کہ ادب نے اپنے خاص معنی میں بلاغت کو بھی چھوڑ دیا اور صرف شعر و نثر میں محدود ہو گیا۔ اسی طرح جب بھی کوئی علم پختہ ہوتا یا فنِ ادب کو چھوڑتے ہوئے مستقل ہوتا گیا اور ادب "قول ماثور" کے گرد گھومتا رہا۔ دوسرے الفاظ میں "ادب کا وہ وسیع انسانی مفہوم جو اسے خلافت کے ابتدائی زمانہ میں حاصل رہا تھا ختم ہو گیا اور ادبِ لطیف (Belles Letters) کے تنگ تر اور زیادہ بلیغانہ حلقے میں محدود و مقید ہو گیا۔ پس ادب کا اطلاق محض شعر و سخن، نثرِ مرصع (Parenegraphy) اور حکایات و نوادر نگاری پر ہونے لگا۔ ادب کی یہی وہ قسم تھی جس میں الحریری نے اپنی لفظی صنعت گری اور حد درجہ متکلف اندازِ بیان اور کلمات کے صحیح استعمال کے شوق کی بدولت مہارت تامہ حاصل کر لی تھی۔ ادب انسانی (Literature of Humanities) سے ادب اب صرف ادب فرہنگی یا دبستانی (Academy) بن کر رہ گیا" یہ تو ادب کے خاص معنی کی بات تھی، اب جہاں تک عام معنی کا تعلق ہے تو وہ اپنی وسعت کے مطابق عقلی آثار، شرع، فلسفہ وغیرہ کے امور پر حاوی رہا۔

عصرِ حاضر

عصرِ حاضر میں ادب اور اس سے بھی زیادہ اس کی جمع آداب، اس لفظ کے مخصوص ترین مفہوم میں لٹریچر کے مترادف ہے۔ چنانچہ "تاریخ الادب العربیه" سے مراد عربی ادبیات کی تاریخ اور "کلیة الآداب" ان یونیورسٹیوں میں جن کی تنظیم یورپی طرز پر ہوئی ہے، فیکلٹی آف آرٹس یا لیٹرز کے مترادف ہے لیکن اس اصطلاحی نام کی حدود سے باہر بعض ادیبوں کے بالارادہ استعمال سے اس لفظ کے مفہوم کو اس کی پہلی سی وسعت اور لچک دینے کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں مرحوم طہٰ حسین کے خیالات قابلِ غور ہیں۔ چنانچہ الادب الجاہلی میں وہ لکھتے ہیں کہ "ادب اس کے جدید اور اپنی اصل کے اعتبار سے کلامِ منقول کے آگے نہیں جاتا۔ یہاں ایک اہم اور متضادی اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ آپ کسی شاعر یا ادیب کے ادبیات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ نے صرف انہی علوم کا سہارا لیا ہے جن سے سہارا لینے کے ہم لوگ عادی ہیں، یعنی علم لغت، علم الانساب،

علم الاعتبار، علم النقد۔ اس سے قبل ہم آپ کو چند ایسے علوم کا سہارا ابھی دکھا چکے ہیں جن کا بظاہر ادب سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عربی شاعر متنبی یا معری کو ہم پیش کرتے ہیں۔ آپ نحو، لغت، انساب اور تاریخ سے ہی واقف کیوں نہ ہوں۔ آپ علوم معانی، بیان و بدائع پر دنیا بھر سے زیادہ قدرت اور مہارت کیوں نہ رکھتے ہوں۔ یہ چیزیں آپ کے لیے متنبی یا معری کے اشعار سمجھنے میں کافی نہ ہوں گی۔ نفسیات انسانی کا مطالعہ ضروری ہوگا تاکہ آپ متنبی کے اشعار سمجھ سکیں۔ طبیعیات، مابعد الطبیعیات، ہیئت، نجوم بلکہ ریاضی تک سے واقفیت ضروری ہوگی تاکہ آپ معری کا کلام سمجھ سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ہم ادب کی تعریف کلام منقول اور علوم متعلقہ سے کرتے ہیں تو یا تو کچھ کہتے نہیں یا سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ جب علوم متعلقہ سے ہم صرف علوم لغات مراد لیتے ہیں تو گویا ہم سب کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے کہ آپ کو بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ شعر کے یا نثر کے سمجھنے میں اور اس سے لطف اندوز ہونے میں صرف انہی علوم سے واقفیت کافی نہیں ہے تو اہل منطق کی اصطلاح میں تعریف جامع نہیں ہے۔

اگر علوم متعلقہ سے ہم ہر وہ علم مراد لیتے ہیں جس کی ضرورت پڑ سکتی ہے تو گویا ہم سب کچھ کہہ لیتے ہیں۔ اسی لیے متنبی اور معری کے اشعار سمجھنے میں فلسفے اور اس کی مختلف قسموں سے واقفیت کا ابھی ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس بارے میں تو اکیلے معری کے مطالعے میں آپ کے لیے نہ صرف تمام علوم اسلامیہ سے واقفیت ضروری ہوگی بلکہ نصرانیت، یہودیت اور برصغیر پاک و ہند کے تمام ادیان و مذاہب کا علم بھی لازمی ہوگا، اس طرح تمام علوم و فنون ادب میں داخل ہو جائیں گے اور اصطلاح منطق میں تعریف مانع نہیں رہے گی۔ لیکن یہاں آپ کو دوبارہ اس حقیقت کو یاد کرنا چاہیے جو شروع میں قلم بند کی جا چکی ہے یعنی ادب بھی دیگر علوم کی طرح مفید طور پر وجود نہیں پا سکتا، جب تک ان علوم کا سہارا نہ لیا جائے جو ایک طرف اس کے معین و مددگار ہیں اور دوسری طرف پائیداری، ہمہ گیری اور گہری ثقافت کا آئینہ دار بھی۔

"تاریخ ادب، محض ادب کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ ادب کے ضمن میں ہر چیز کی تاریخ آپ کو اس میں مل جاتی ہے۔ مورخ ادبی تاریخ، سیاسیات و اقتصادیات سے اسی طرح بحث کرتا ہے جس طرح مورخ سیاسیات و اقتصادیات ادب کی تاریخ سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیاسیات کا

مؤرخ اصل بحث سیاسیات سے کرتاہے اور سیاسیات کا سرسری تذکرہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ ادبی بحث کا تتمہ کرسکے۔ اس بحث کو ہم مختصر آیوں بیان کرسکتے ہیں کہ ادب اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہی ہے جس کو ہم کلام منقول سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن اس کلام منقول کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ادیب اس وقت تک متحمل نہیں ہو سکتا جب تک پائیدار اور ہمہ گیر ثقافت اور کچھ خاص خاص ضروری علوم کا سہارا نہ لے۔ تاریخ ادب ابتدًا اسی کلام منقول اور کلام متعلقہ کی طرف توجہ کرتی ہے مگر فوراً مجبور ہو کر اسے اپنی بحث کا میدان وسیع کرنا پڑتا ہے اور ان چیزوں کو بھی اپنے دائرہ بحث میں شامل کرنا پڑتا ہے۔"

اساسیاتِ اسلام

مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں اور کس حد تک ان سے فرد و معاشرے کے تقاضے پورے ہوتے ہیں، موجودہ دور کے غلط علمی رجحانات نے کن غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کا کیا جواب ہے؟ اسلام علوم و فنون کے ارتقا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور عقیدہ و عمل کے وہ کون سے خطوط ہیں جو انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں؟

اساسیاتِ اسلام میں ان سوالات سے متعلق بڑے یقین پرور اور پُر اثر اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں ان تمام مشکلات کا تسلی بخش حل پایا جاتا ہے، جن سے کہ آج نوعِ انسانی دوچار ہے۔

صفحات ۱۶ + ۲۸۴ قیمت -/۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

جناب ضیاء الدین لاہوری

فورٹ ولیم کالج کا ترجمۂ قرآنِ مجید

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اردو کے پروفیسر ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی زیرِ ہدایت و نگرانی اردو تراجم کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا گیا اس میں انجیل اور قرآن مجید کے تراجم بھی شامل تھے۔ اردو کو اس زمانے میں ریختہ، ہندی یا ہندوستانی پکارا جاتا تھا، لہٰذا ان تراجم کے دیباچوں میں اردو کو ان ہی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ انجیل کا ترجمہ مرزا محمد فطرت لکھنوی نے کیا اور اس کی اشاعت بھی عمل میں آگئی۔ لیکن قرآن مجید کا ترجمہ مکمل ہو جانے کے باوجود صرف ۲۶ صفحات کی طباعت تک محدود رہا۔ یہ حصہ ۱۸۰۴ء میں طبع ہوا مگر ۱۸۰۷ء میں گورنر جنرل باجلاس کونسل کے احکام کے تحت بقیہ ترجمے کی اشاعت روک دی گئی اور تمام مطبوعہ نسخے حکومت کے حوالے کر دیے گئے جنھیں غالباً تلف کر دیا گیا۔

قرآن مجید کے ترجمے کا کام ۱۸۰۴ء میں شروع کیا گیا۔ سید محمد مؤلف ارباب نثر اردو لکھتے ہیں :

" ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس خیال سے کہ اردو لٹریچر کے مطالعہ میں اکثر قرآن شریف کی تلمیحات نظر سے گزرتی ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے قرآن شریف سے واقف ہونا ضروری ہے، کالج کی جانب سے اس کے بھی اردو ترجمہ کا اہتمام کیا۔"[1]

شروع میں میر بہادر علی حسینی، مولوی امانت اللہ اور مرزا کاظم علی جوان کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ بعد میں مولوی فضل اللہ بھی ان میں شامل کر دیے گئے۔ میر بہادر علی، سید عبد اللہ کاظم کے فرزند تھے جن کی حسن سعی و اہتمام سے حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کا اردو ترجمہ قرآن مجید (موضح القرآن) پہلی بار شائع ہوا تھا۔[2] مولوی امانت علی عربی و فارسی کے عالم تھے۔ اسلامی معتقدات پر ان کی ایک کتاب ہدایت الاسلام کالج کی جانب سے شائع ہوئی اور ڈاکٹر گل کرسٹ نے خود اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔[3]

---

[1] ارباب نثر اردو مؤلفہ مولوی سید محمد، مطبوعہ ۱۹۵۰ء مکتبہ معین الادب لاہور، ص ۲۶۔

[2] ایضاً، ص ۱۱۱ [3] ایضاً، ص ۱۵۵

ترجمۂ قرآن کے ۷۵ صفحات پہلے ہی سال میں طبع ہو گئے۔ ترجمے کا کام جاری تھا کہ ڈاکٹر گل کرسٹ کو اس سے اگلے سال خرابیٔ صحت کی بنا پر اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔ ترجمے کی تکمیل پر مرزا کاظم علی جوان نے جو دیباچہ تحریر کیا ہے (اور جس کے اہم اقتباسات تفصیلاً آگے درج ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں مولوی امانت اللہ اور مولوی فضل اللہ کے درمیان کچھ تنازع چلا جس کے باعث اول الذکر کی جگہ حافظ غوث علی مقرر کیے گئے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد ان کے جانشین کیپٹن جیمز مونٹ نے بھی اس کام کو جاری رکھا، مگر اکیسویں پارے کے بعد ان کی ہدایت پر ترجمے کے لیے صرف مولوی فضل اللہ باقی رکھے گئے اور زبان کے محاورات کی درستی مرزا کاظم علی جوان کے سپرد کی گئی۔ با ترجمہ اختتام کو پہنچا لیکن کالج کونسل نے اس کی طباعت پر اعتراض کیا بلکہ مطبوعہ نسخے سے بھی لاتعلقی کا اظہ کر دیا۔ محمد عتیق صدیقی مؤلف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی میں "ایسٹ انڈیا کمپنی ریکارڈز کی تاریخی دستاویزات متعلقہ فورٹ ولیم کالج کے حوالوں سے یہ تمام کارروائی منظر پر لائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"گل کرسٹ نے ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت ہندوستانی پریس کا اور اپنے تمام معاملات کا مختار ڈاکٹر ہنٹر کو مقرر کیا تھا۔ انھوں نے مارچ ۱۸۰۷ء کے اوائل میں ایک خط کے ساتھ ان کتابوں کی تفصیلی فہرست کالج کونسل کے سامنے پیش کی جو ۱۸۰۴ء میں گل کرسٹ کی روانگی کے وقت زیر طبع تھیں۔ اس فہرست میں قرآن کے ترجمے کا حسب ذیل ذکر بھی موجود ہے:

"قرآن، حجم ۵۰۰ صفحات، ۳۰ پارے، ۷۵ صفحات چھپ چکے ہیں"[۲]

ڈاکٹر ہنٹر کا یہ خط گورنر جنرل باجلاس کونسل کے ملاحظہ اور فیصلے کے لیے بھیجا گیا تو کالج کونسل نے ترجمۂ قرآن کی بابت یہ نوٹ اضافہ کیا کہ:

"کالج کونسل نے قرآن کے ترجمے کے لیے نہ تو کوئی تجویز ہی منظور کی تھی اور نہ اس کام کی ہمت افزائی کی اور نہ گل کرسٹ کو دلائی تھی، اس لیے کالج کونسل کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں مسٹر گل کرسٹ کسی معاوضہ کے مستحق نہیں ہیں، لیکن گورنر جنرل اس ترجمے کی اشاعت کو قابل اعتراض سمجھ کر اس کی طباعت کی مخالفت اگر

---

[۲] گل کرسٹ اور اس کا عہد مؤلفہ محمد عتیق صدیقی مطبوعہ ۱۹۶۰ء انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ص

سمجھیں تو اس حالت میں یہ قرینِ انصاف ہوگا کہ اس چھوٹے سے حصے کی طباعت پر جو رقم گل کرسٹ نے صرف کی ہے وہ ان کو ادا کی جائے۔"[۵۵]

گورنر جنرل نے اپنے محررہ ۱۹ مارچ ۱۸۰۷ء میں لکھا کہ:

"گورنر جنرل باجلاس کونسل قرآن کے ترجمے کی اشاعت کو، جسے گل کرسٹ نے تیار کرایا تھا، قابلِ اعتراض سمجھتے تھے، لیکن یہ تجویز گورنر جنرل باجلاس کونسل کو منظور ہے کہ اس کام کے سلسلے میں گل کرسٹ کو جو زیر باری ہوئی ہے اس کا معاوضہ ادا کر دیا جائے۔"[۵۶]

بالآخر ڈاکٹر ہنٹر کو کالج کونسل کی طرف سے یہ ہدایت کی گئی کہ ترجمۂ قرآن کے جو صفحات چھپ چکے ہیں ان کے تمام مطبوعہ نسخے سیکرٹری گورنمنٹ کے حوالے کر دیجیے اور ساتھ ہی یہ اقرار نامہ بھی داخل کیجیے کہ آپ نے یا ناشر نے اس کا کوئی نسخہ پاس نہیں رکھا ہے۔"[۵۷]

محمد عتیق صدیقی نے اپنی تالیف کے آخر میں ضمیمے کے طور پر متذکرہ ترجمۂ قرآن کے مخطوطے سے مرزا کاظم علی جوان کے لکھے ہوئے دیباچے کے اہم اقتباسات تفصیلاً درج کیے ہیں جو بہت معلومات افزا ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

احوال ترجمہ قرآن شریف! "رمضان کی نویں تاریخ سن بارہ سے انیس ہجری[۵۸] ... قرآن شریف کا ترجمہ زبان ریختہ میں تمام ہوا۔ شروع اس کی حسب الحکم صاحب عالی شان جان گل کرسٹ صاحب دام اقبالہٗ کے ذی الحج میں کہ سن بارہ سے سترہ تھے[۵۹] ہوئی تھی۔ مولوی امانت اللہ صاحب اور حیدری بہادر علی صاحب میر منشی اور احقر ترجمے اور

---

۵۵ ایضاً ۵۶ ایضاً

۵۷ ایضاً، ص ۱۸۰

۵۸ ۹ رمضان ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۰۴ء۔ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلفؔ گل کرسٹ اور اس کا عہد" کو یہاں پر مخطوطے سے نقل میں کچھ سہو ہوئی ہے۔ دیباچے میں اس سے آگے مذکور ہے کہ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ کو، جب ڈاکٹر گل کرسٹ عازمِ ولایت ہوئے، ترجمے کا کام جاری تھا اور ان کے بعد بھی کافی عرصہ جاری رہا؛ لہٰذا اس تاریخ سے پہلے اختتام کیوں کر ہو سکتا ہے، غالباً یہ سن اکیس ہوگا جو انیس نقل ہو گیا۔ اس حساب سے یہ تاریخ ۹ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۸۰۶ء بنتی ہے جو قرینِ قیاس بھی ہے کہ ترجمے کی طباعت روکنے کی کارروائی اس سے تین چار ماہ بعد ہوئی۔

۵۹ ذی الحج ۱۲۱۷ھ مطابق اپریل ۱۸۰۳ء

محاورے کے لیے مقرر تھے۔ بعد چندے مولوی فضل اللہ صاحب کو بھی ارشاد ہوا، تم بھی شریک ہو کہ بدون ان دو مولویوں کے یہ امرِ عظیم ترجمے کا بخوبی سرانجام نہ ہو سکے گا۔ چناں چہ نام ان کا شروع میں مندرج ہے۔ پانچ چھ سیپارے جب ترجمہ ہوئے، ایسی کچھ نزاع لفظی ان دونوں صاحبوں کے درمیان آئی کہ ان میں سے مولوی فضل اللہ رہے اور دوسرے صاحب کے عوض حافظ غوث علی صاحب مقرر ہوئے۔ یہ دونوں صاحب بدستور ترجمہ کرتے تھے۔ جب صاحبِ ممدوح ذی قعدہ کی دسویں تاریخ سن بارہ سے انیس[۱۰] میں ولایت کو تشریف لے گئے اور اصالتاً مدرسی کپتان ماوٹ صاحب دام حشمتہ کو حضور پُر نور سے[۱۱] مقرر ہوئی، اسی طور سے موافق ان کے ارشاد کے کام ترجمے کا جاری رہا، چنانچہ اس عرصے میں اکیس سیپارے ہوئے کہ صاحب عالی شان نے بندے کو فرمایا، مولویوں میں سے ایک مولوی ترجمہ کرے اور تو ہی محاورے کی درستی میں رہ۔ قبول کر کے مولوی فضل اللہ صاحب ترجمہ کرتے رہے، میں محاورہ کرتا رہا۔ اب حق سبحانہٗ تعالیٰ کے تفضلات سے وہ کام اختتام کو پہنچا، مگر نظرِ ثانی باقی ہے جس طرح ارشاد ہوگا عمل میں آوے گا۔ لیکن وے لوگ جو ہمیشہ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرتے ہیں، ان کی خدمت میں التماس ہے کہ مہربانی سے نگاہ کریں۔ قرآن شریف کہ کلامِ الٰہی ہے اور فصاحت و بلاغت ایسی کہ چشم و گوش فلک نے بھی نہ دیکھی نہ سنی اور جس عصر میں کہ اس کا نزول ہوا ہے کیسے کیسے اہلِ فصاحت عربستان میں تھے، اس کی عبارت جو سراسر صفتوں سے بھری ہے اور تمام مسجع و مقفیٰ ہے، نگاہ کر کے حیران تھے۔ الحق کہ کہاں کلام خالق کا اور کہاں زبان مخلوق کی۔ پس جو جو صنائع و بدائع اس میں ہیں من و عن اس کا ترجمہ کس سے ہو سکتا، مگر فارسی کے ترجمے اور تفسیروں سے جس لفظ کے جو معنی مترجموں اور مفسروں نے لکھے ہیں زبانِ ریختہ میں ان کے موافق لکھنے میں آیا ہے۔ تفسیر بیضاوی اور مدارک و جلالین یہ تین عربی تفسیریں، بحرِ مواج اور تفسیر حسینی کہ یہ دو فارسی ہیں، ان سے ترجمہ کیا ہے۔ جہاں کہیں جو کچھ اختلاف سمجھے ان پانچوں تفسیروں کو دیکھ لے، ایک نہ ایک میں موافق پائی جاوے گی اور کہیں کہیں جو الفاظ ماضی و حال و استقبال کے ہیں اور مفسروں نے ماضی کو حال اور حال کو استقبال کیا ہے، یہاں بھی اسی طریق کی پیروی ہوئی ہے، مگر جہاں کہیں زمانے کی مطابقت سے ہندی عبارت کے مطلب میں خلاف نظر آیا چار و ناچار بطور محاورے کے رہنے دیا۔ اور اگرچہ لفظ کے ترجمے کی رعایت سراسر رکھی ہے پر کہیں کہیں اصل مطلب

۱۰۔ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۸۰۵ء

۱۱۔ لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہندوستان

لیا ہے کیوں کہ لفظ کی مطابقت سے معنوں کا فوت ہونا قباحتِ عظیم ہے، اس لیے اسی بات کو ترجیح دی۔ بہر نوع مطلب نہیں چھوڑا، اسی لیے محاورے کو چنداں دخل نہیں دیا کیوں کہ عبارت کا ڈھب روزمرے کی بول چال سے اور ہے۔ حروف مقطعات کا ترجمہ جو بالاتفاق نہ پایا نہ کیا اور مفعول مطلق ہندی میں شاذ و نادر ہی کہیں رہ سکا تو رکھا ورنہ یا یا چھوڑ دیا، یا لفظِ تاکید زیادہ کیا کہ اسی سے تاکید فرض ہے۔ اور عربی میں التفات بہت سا ہے اور ہندی میں کم لیکن وہ قاعدہ ہندی کا کہ بہت تکرار ہے۔ واؤ عاطفہ اور حرف "ف" اور وہ الفاظ کہ معنی میں تحقیق کے آتے ہیں قرآن شریف میں بہت ہیں اور زبان عربی میں بہت فصاحت رکھتے ہیں۔ ہندی میں گو کہ ان کی کثرتِ محاورے کی رو سے اس قدر نہیں لیکن ترک کرنا ان کا جائز نہ دیکھا۔ اس سبب سے جس طرح پہلے میں [illegible] آئے ترجمہ کیا اور کلام اللہ قلیل العبارت اور کثیر المعنی ہے۔ جتنے اہلِ اسلام کے فرقے ہیں سب کے دین و ایمان کی بنا اسی سے ہے۔ استشہاد کر کے ہر ایک اپنا اصلِ اصول یہیں سے درست کرتا ہے اور شانِ نزول ہر آیت کی ہے، اگر لکھنے میں آتی تو بہت طویل ہو جاتی، اگرچہ بعض جگہ چاہا تھا کہ کچھ بیان کیجیے۔ پہلے جس صاحبِ ممدوح کی فرمائش تھی انھوں نے ارشاد کیا تھا کہ ترجمہ کلام اللہ کا اگرچہ ہندی زبان میں ہے، ہند کے لوگ بخوبی سمجھیں گے، تاہم جب تک معلومات بہ وجوہ احسن نہ ہوگی کیوں کر مطلب کو پہنچیں گے۔ ہر ایک غبی کو کب یہ استعداد ہے کہ کتاب کی عبارت کا بیان، گو کہ اسی کی زبان میں ہو، کر سکے۔ یہ اہلِ فہم و ذکا کے لیے ہے کہ اگر آپ کماحقہٗ نہ سمجھ سکے کسی صاحبِ استعداد سے دریافت کر لے۔ یقین ہے کہ سہج سہج کتابیں کہ اس عصر میں عربی و فارسی سے ہندی میں ہوئی ہیں اور ان کے مطلب جس طرح چاہیے ہر ایک بیان نہیں کر سکتا، یہ تو کلام اللہ کا ترجمہ ہے، اس کو ہر ایک اس طرح سے کیوں کر سمجھے کہ محتاج کسی استاد کے پوچھنے کا نہ ہوگا۔ جہاں کہیں کہ عالم فاضل جس عبارت کو بہ خوبی سمجھتے ہیں اور جنھوں کو استعداد کم ہے، وے اس کی دریافت سے عاجز ہیں، ان کی آسانی کے لیے بہ طور حاشیہ کے ایک خط عرضی کر کے مطلب کو بڑھا دیا ہے تا اس نشان سے معلوم ہو کہ یہ ترجمے سے جو زیادہ ہے ہندی زبان کے ربط کے لیے بڑھا دیا ہے۔ پر یہ اپنی طرف سے تصرف نہیں کیا، تفسیروں کی رو سے ہے اور شروع ترجمے میں خلقت نے اس بات میں بہت سی شورش کی تھی کہ بنا اس ترجمے کی جو ہوتی ہے نہایت دین و آئین سے برخلاف ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ ہندی زبان میں ہوتا ہے۔ آخر ش جو اہلِ فہم و فراست تھے انھوں نے جواب دیا کہ اگر فارسی ترجمہ ہوا ہے تو ہندی میں کیا کفر ہے۔ غرض فضلِ الٰہی سے وہ آغاز انجام کو پہنچا۔ پہلے اس طرح مشورت بات سی ہوئی کہ ایک صفحے پر کلام اللہ لکھا جائے اور اس کے

قابل دو مرے صفحے پر یہ ترجمہ ثبت ہو گیا۔ صحت اعراب کے لیے یہ امر موقوف رکھا کہ ہر گاہ کتابت میں باوجود زاروار مقابلوں کے غلطی اعراب کی رہتی ہے ، اس کا تو منظور چھاپا ہے کیوں کر غلطی نہ رہے گی۔
کاظم علی جوان نے یہ خاتمہ موافق ارشاد صاحب ممدوح کے لکھا ہے اور جو کچھ آغاز سے انجام تلک حقیقت گزری ہوئے سب اس میں مندرج ہے۔"[۹۲]

محمد عتیق صدیقی نے یہ نہیں بتایا کہ مخطوطے کی یہ نقل کہاں سے حاصل کی گئی ، البتہ اس کے حصول سے پیشتر جب کہ وہ اپنی تالیف مکمل کر چکے تھے ، انھوں نے لکھا تھا کہ :

"نصیر الدین ہاشمی کی روایت کے مطابق جو انھوں نے مجھ سے بیان کی تھی ، اس ترجمے کا ایک مخطوطہ سالار جنگ میوزیم (حیدر آباد) میں محفوظ ہے۔"[۹۳]

اس سے خیال کیا جا سکتا ہے کہ اسے مذکورہ میوزیم سے حاصل کیا گیا ہے۔

جیسا کہ "احوال ترجمۂ قرآن شریف" سے پتا چلتا ہے کہ مولوی فضل اللہ سے کسی تنازعے کے باعث مولوی امانت علی ایک مرحلے پر اس کام سے سبک دوش ہو گئے تھے ، معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے طور پر قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ مؤلف ارباب نثر اردو نے بمبئی کے کسی قدیم کتب خانے سے مولوی امانت علی کا ایک مطبوعہ ترجمہ دست یاب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس نسخے کے کوائف تو درج نہیں کیے ، البتہ اس کے متن کا ایک نمونہ اپنی تالیف میں شامل کیا ہے۔ یہ سورہ ہود کی آیت ۶ تا آیت ۱۱ کا ترجمہ ہے جو ہو بہو نقل کیا جاتا ہے۔

"اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں ، مگر خدا ہی پر ہے اس کی روزی اور جانتا ہے وہ اس کے ٹھہراؤ کو اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو۔ سب کچھ روشن کتاب میں ہے ، اور وہی تو وہ خدا ہے جس نے بنا ڈالا آسمان کو اور زمین کو چھ دن میں ، اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ آزمائے ہیں کہ کون ہے تم میں سے بہتر چال چلن کی راہ سے اور اگر کہتا ہے تو کہ ضرور تم اٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد تو کہنے لگتے ہیں وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ اور اگر دیر لگا دیں ہم ان سے عذاب میں گنتی کے زمانے تک ، کہنے لگے ہیں کہ کس نے روک رکھا اسے۔ آگاہ ہو کہ

---

۹۲ ؎ گل کرسٹ اور اس کا عہد ، ص ۳۱۰ تا ۳۱۲

۹۳ ؎ ایضاً ، ص ۱۹۵

جس دن آپڑے گا وہ ان پر تو نہ ہٹایا جائے گا ان سے اور گھیر لے گا انھیں وہی عذاب کہ جس پر ہمیشہ وہ ٹھٹھے لگایا کئے۔ اور جو کہ چکھا دیتے ہیں ہم آدمی کو اپنی رحمت کا، پھر چھین لیتے ہیں اس سے تو ضرور وہ بڑا ناشکر ہو جاتا اور اگر چکھا دیتے ہیں ہم ان سے نعمتیں ضرروں کے بعد، وہ ضرر کہ پہنچ جاتے ہیں اسے تو کہنے لگتا ہے کہ گئیں گزر ہوئیں سب برائیاں مجھ سے اور ضرور وہ بہت مگن اور بڑا ہوتا ہے مگر یہی لوگ کہ جو جھیل جاتے ہیں اور کرتے ہیں جو کیے کام تو انھیں کے لیے تو بخشش اور بہت کھری مزدوری ہے[کلہ]

فورٹ ولیم کالج کا ۵۷ صفحات کا مطبوعہ نسخہ ترجمۂ قرآن انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے کا نمبر 4 F . 10 . 4 . 506 ہے۔ میں نے اس سے چند اقتباسات نقل کیے، جنھیں پیش قارئین کر رہا ہوں صفحۂ اول کا آغاز یوں ہوتا ہے:

الله المستعان

صراط مستقیم

اس کے شروع کی تاریخ موافق سنہ ہجری کے تمام اس مصرع سے نکلتی ہے۔

صراط المستقیم الحق هي بالسکل

۱۲۱۸

ترجمہ قرآن مجید کا ہند کے اہل اسلام کی خاطر

سلطنت میں ظل سبحانی شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ اور حکومت میں زبدۂ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام ظلہ کی حسب الحکم صاحب والا عالی شان مدرس تعریق ہندوستانی جان گل کرسٹ صاحب دام حشمتہ کے، کیا ہوا میر بہادر علی حسینی اور مولوی امانت اللہ اور مولوی فضل اللہ اور مرزا کاظم علی جوان کا جو متعلق مدرسۂ جدید سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہ کے ہیں۔

قرآن مجید فی لوح محفوظ

قرآن شریف (لکھا ہوا) ہے لوح محفوظ میں

[کلہ] ارباب نثر اردو، ص ۱۵۶، ۱۵۷

۱۲۱۸ ہجری مطابق ۱۸۰۳ عیسوی ہندوستانی چھاپے خانے میں چھاپا کیا ہوا منشی متاب دین کا۔

جو عبارت خطِ نستعلیق سے درمیان ان دونوں نشانوں کے ہے [ ] سو حاشیہ، اور آیت وغیرہ کی علامت یہ گول حرفِ میم آیت ٥، اور جس میں لٹک ہے وہ آیت کا ۃ، اور عین آیتِ مطلق ع، اور مطلق فقط طوئے ط: جائز ایک تیم ہے ج۔

اس کے بعد سورہ فاتحہ کا تذکرہ کر کے اگلے صفحے سے باقاعدہ ترجمہ شروع کر دیا گیا ہے۔

سورہ فاتحہ مکے مدینے[شلہ] میں نازل ہوا سات آیت کا ہے۔

خدا کے نام سے جو بڑا بخشنے والا نہایت دینے والا ہے۔

ہر ایک حمد خدا کے لیے ہے کہ (وہ) مالک سب کا ہے بخشنے والا نہایت دینے والا ٥ خاوند روزِ قیامت کا ہے ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ع دکھا ہم کو سیدھی راہ ٥ ان کی راہ کہ جن کو تو نے نعمت دی ٥ سوائے ان کی جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ گمراہوں کی ٥

صفحہ ۴۳ سے سورہ آل عمران کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ پہلے ایک رکوع کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

خدا [ہی معبود ہے] نہیں کوئی معبود ہم مگر وہ کہ زندہ [ہے اور] ہمیشہ ہے ٥ تجھ پہ سچی کتاب بھیجی۔ سچ کرنے والی اس کی جو اس سے پیشتر ہے اور بھیجی توریت و انجیل ٥ اس سے آگے آدمیوں کے لیے ہدایت ہے اور نازل کیا ٹھہرانے والا [حق و باطل کا پتہ] تحقیق جنھوں نے نہ مانا خدا کی آیتوں کو ان کے لیے سخت عذاب کرنے والا ہے ٥ بے شبہ خدا سے کوئی چیز زمین میں چھپی نہیں اور نہ آسمان میں ع وہ ایسا ہے کہ تمھاری صورتیں رحموں میں بناتا ہے جیسے چاہتا ہے کوئی معبود نہیں ہے کوئی خدا مگر وہ غالب دانا ٥ وہ وہ ہے کہ بھیجی ہے تجھے کتاب، بعضی اس میں سے محکم آیتیں ہیں [یعنی جن کے معنے ظاہر ہوں] وے کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہ ہیں [یعنی جن کے معنی چھپے ہوں] لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے تو فتنہ جوئی سے اور معنے بنانے کے لیے پیروی کرتے ہیں اس چیز کی جو اس میں سے متشابہ ہے جب بیان اس کا کوئی نہیں جانتا مگر خدا، اور جو علم میں پورے ہیں کہتے ہیں کہ اس پر ہم ایمان لائے۔ سبھی ہمارے پروردگار کے یہاں سے ہے جب نصیحت نہیں مانتے مگر عقل مند ٥ پروردگار ہمارے، اس کے بعد کہ تو نے ہمیں راہ دکھائی ہمارے دلوں کو مت پھیر اور ہم کو اپنے یہاں سے توفیق دے ج بے شک تو ہی بڑا بخشش کرنے والا ہے ٥

شلہ جائے نزول اسی طرح "مکے مدینے" درج ہے۔ درست مکہ ہے۔

رب ہمارے، تحقیق تو آدمیوں کا جمع کرنے والا ہے ایک دن [حساب] کے لیے کہ اس میں کچھ شک نہیں ط بے شبہ خدا وعدوں کو خلاف نہیں کرتا ہ

صفحہ ۵۳ سے چوتھے پارے کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے پہلے رکوع کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ہرگز نیکی نہ پاؤگے جب تک اس چیز سے کہ جسے چاہتے ہو خیرات (نہ) کروگے ہ اور کسی چیز سے جو خرچ کرو تو بے شبہ خدا اس کا جاننے والا ہے ہ بنی اسرائیل کے لیے تمام کھانے حلال تھے مگر اسرائیل نے اپنی ذات پر حرام کیا توریت کے نازل کیے جانے کے آگے ط کہہ بس لاؤ توریت کو، پھر اسے پڑھو اگر تم سچے ہو ہ پھر جو اس کے پیچھے خدا پر جھوٹ افترا کریں تو وے ہی گنہ گار ہیں ہ کہہ خدا نے سچ کہا۔ پس ملتِ ابراہیم کی پیروی کرو کہ راہ راست ہے ط اور وہ مشرکوں سے نہ تھا ہ تحقیق پہلا گھر جو بنایا گیا ہے آدمیوں کے لیے وہ جو بکے میں ہے (یعنی مکے میں) برکت دیا گیا اور راہ دکھانے والا تمام عالم کا ہے ہ اس میں ظاہر دلیلیں ہیں (اُن میں سے ایک) مقام ابراہیم کا ہے ہ اور جو کہ اس میں داخل ہوا امن پانے والا ہو ط اور خدا کے لیے آدمیوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو کہ اس کی راہ میں قدرت رکھے ط اور جو انکار کرے پس تحقیق خدا تمام عالم سے بے نیاز ہے ہ کہہ تو اے اہلِ کتاب خدا کی آیتوں سے کیوں منکر ہوتے ہو اور خدا گواہ اس چیز پہ ہے جو تم کرتے ہو ہ کہہ کہ اے صاحب کتاب، خدا کی راہ سے اسے کیوں باز رکھتے ہو جو ایمان لایا تم اس کے لیے کجی چاہتے ہو اور تم گواہ ہو (کہ یہ سیدھی راہ ہے) ط اور جو تم کرتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہ اے مومنو، اگر اطاعت کرو ایک فریق کی ان میں سے جنھیں کتاب دی گئی تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں کافر کر پھیریں اور کیوں کر کافر ہوتے ہو حالاں کہ تم [دے] ہو کہ خدا کی آیتیں تمھارے آگے پڑھی جاتی ہیں اور اس کا رسول تم میں ہے ط اور جو کہ خدا کے [دین کو] مضبوط پکڑے تو بے شبہ سیدھی راہ کی طرف ہدایت کیا جائے۔

آخری صفحہ ۵۶ کی آخری سطریں، جو سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۱۹ کا نامکمل ترجمہ ہیں، درج ذیل ہیں:

اور جب تمھیں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں خلوت کرتے ہیں تم پر غصے سے انگلیاں چباتے ہیں ط کہہ۔۔۔تقریباً تین پاروں اور ایک پاؤ کا یہ ترجمہ عربی متن کے بغیر خط نسخ میں لکھا ہوا ہے البتہ حواشی متن کے درمیان خطوط وحدانی کے اندر خط نستعلیق میں کتابت کیے گئے ہیں۔ اردو حرف "گ" کو "ک" کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ نسخے پر الیسٹ انڈیا لائبریری کی مہر لگی ہوئی ہے باقی قابلِ ذکر باتیں صفحہ اوّل پر درج ہیں جس کی نقل آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے شاید اس خدشے کے تحت کہ ترجمے کا کام مکمل ہونے کے بعد اس کی اشاعت کو قابلِ اعتراض سمجھا

نامنظور کر دیا جائے، ترجمہ اور طباعت کا ساتھ ساتھ انتظام کیا جائے کہ جس قدر ترجمہ ہو چھاپ دیا جائے۔
اگر وہ کالج میں موجود رہتے تو شاید اس کے کچھ اور حصے طبع ہو جاتے۔

مطالعۂ قرآن

مولانا محمد حنیف ندوی

اس کتاب میں مولانا ندوی نے قرآن سے متعلق ان تمام مباحث و مسائل پر محققانہ اظہارِ خیال کیا ہے، جن سے نہ صرف قرآن فہمی میں خصوصیت سے مدد ملتی ہے، بلکہ اس کتابِ ہدیٰ کی عظمت بھی نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ مزید برآں اس سے قرآن کے علوم و معارف اور دعوت و اسلوب کی معجزانہ اداؤں پر بھی تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے زرکشی کی البرہان اور سیوطی کی الاتقان کے ان تمام جواہر ریزوں کو اپنے مخصوص شگفتہ اور حکیمانہ انداز میں جمع کر دیا ہے اور مستشرقین کے اٹھائے ہوئے ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب بھی دیا ہے، جو قلب و ذہن میں شکوک و شبہات ابھارنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ غرض اسے قرآنی فکر و تصور کے بارے میں ایسا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے جس میں وہ ساری بحثیں اور مضامین سمٹ آئے ہیں جن کی دورِ حاضر کو ضرورت ہے۔

صفحات ۳۱۰+۸ قیمت ــ ۲۵ روپے

مقامِ سنت : مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

وحی کیا ہے؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ حدیث کا کیا مقام ہے؟ حدیث اور سنت میں کیا فرق ہے؟ اتباع حدیث کا ضروری ہے یا سنت کا؟ مسائل حدیث میں کہاں تک رد و بدل کیا جا سکتا ہے؟ اور اطاعتِ رسول کا کیا مطلب ہے؟ یہ تمام اہم مسائل اس کتاب میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

صفحات ۱۴۶ قیمت ــ ۴ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

مولانا محمد حنیف ندوی

خلیفہ عبدالحکیم کی یاد میں

"مجلس یادگار خلیفہ عبدالحکیم" کی طرف سے ۔ ۳ جنوری ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی یاد میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ایک تقریب منعقد ہوئی ۔ اس موقع پر مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مقالہ پڑھا جو یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

۱۹۵۱ء کی ایک سہ پہر کو خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی، بہت تپاک سے پیش آئے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ اسلام میں اجتہاد کو کیا اہمیت حاصل ہے اور خود بھی اس مسئلے پر اظہار خیال کرنے لگے۔ ان کی گفتگو کا آغاز کچھ یوں تھا جیسے علم و ادب کا دریا امڈا آ رہا ہے مسلسل اور پُرجوش ۔ ہر بات کہتے اس میں فکر کی گہرائی، عقیدے کی استواری اور معلومات کی فراوانی صاف جھلکتی ہوئی نظر آئی ۔ اثنائے گفتگو میں اشعار، لطائف اور چٹکلے برابر اپنی بہار دکھاتے رہے ۔ خلیفہ صاحب سے متعلق میرا اوّلین تاثر یہ تھا کہ یہ شخص بلا کا ذہین اور دانش ور ہونے کے ساتھ ذوقِ سلیم سے بھی بہرہ ور ہے اور اسلام کے لیے اپنے دل میں بے پناہ درد اور کسک بھی رکھتا ہے ۔ خلیفہ صاحب کی پوری تقریر تو اس وقت مستحضر نہیں البتہ کچھ جملے اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں ۔

ان کا کہنا تھا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں امتیازی فرق یہ ہے کہ اس کی تعلیمات صرف ان تصریحات و نصوص ہی پر حاوی نہیں جو وحی و تنزیل کا کرشمہ ہیں بلکہ اس میں انسانی فہم و استدلال کو بھی درخور اعتنا سمجھا جاتا ہے جو قرآن و سنت کی روشنی میں ترتیب پائے ۔ اسلام کا تعلق جس طرح ہمارے تابناک ماضی سے ہے اسی طرح اس کا تعلق حال و مستقبل کی درخشانیوں سے بھی ہے یعنی اسلام میں اجتہاد کے ذریعے اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ تاریخ کی گردشوں سے مختلف احوال ظروف میں جو نئے نئے مسائل ابھریں ان کا حل تلاش کیا جائے ۔

اجتہاد کے نیچر کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اس کو نسبتاً آزاد اور تخلیقی ہونا چاہیے ۔ کیوں کہ الفاظ و حروف کی مختلف النوع دلالتوں پر مبنی اجتہاد مسائل کو پوری طرح حل کرنے میں قاصر رہتا

ہے۔ مجھے یاد ہے انھوں نے ذرا زور دے کر کہا تھا کہ فقہا کے روایتی اجتہاد سے ہٹ کر ہمیں حضرت عمر فاروق کے طریق استنباط کی پیروی کرنا چاہیے اور الفاظ و حروف سے زیادہ اس حقیقت کا سراغ لگانا چاہیے کہ زیرِ تحقیق مسئلے میں اسلام کی اصل روح کیا ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔ تیس چالیس منٹ کی اس تقریر کے دوران میں صرف ان کا منہ تکتا رہا۔ میرے لیے ان کی باتیں نئی بھی تھیں اور کہیں کہیں اختلاف کا موجب بھی۔ مجھے اس شے نے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا کہ سوٹ بوٹ میں ملبوس یہ شخص اسلامیات پر کس درجہ گہری نظر رکھتا ہے۔ میں ان کی تقریر سے کس درجہ متاثر ہوا، اس کے جواب میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ میری پہلی کتاب "مسئلۂ اجتہاد" اسی تقریر کا نتیجہ تھی جس میں اپنی صواب دید کے مطابق میں نے قدرے وسیع تر تناظر میں اس موضوع سے متعلق تحلیل و تجزیہ سے کام لیا اور یہ کہ اس مسئلے کی فقہی و تہذیبی اہمیت اس تقریر کے بعد ہی ابھر کر میرے سامنے آئی اور میں مجبور ہو گیا کہ سب سے پہلے اسی موضوع کو اپنے غور و فکر کا محور ٹھہراؤں۔

اس ملاقات کے دوسرے دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اگر کوئی علمی کام کرنا ہے تو خلیفہ صاحب کے حلقۂ فکر و دانش میں بلامحابا شریک ہو جانا چاہیے۔ خلیفہ صاحب نے مجھے باقاعدہ دعوتِ شرکت دی اور میں مان گیا، اور آج تک بحمد اللہ اس حلقے میں رہ کر اپنی بساط کے مطابق علم و فکر کی خدمت میں مصروف ہوں۔

یوں تو خلیفہ صاحب کی پہچان کے کئی پہلو ہیں، لیکن نمایاں اور ابھرے ہوئے خد و خال یہ تین ہیں:

۱۔ مطالعہ کی ہمہ گیری

۲۔ مجلس آرائی اور مکالمہ طرازی

۳۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی

کتابوں سے انھیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا، لیکن اس عشق میں فرزانگی کا یہ پہلو نمایاں تھا کہ یہ صرف انھی کتابوں کو منہ لگاتے جو چیدہ اور مستند ہوں۔ مطالعہ کے لیے وقت کی کوئی قید نہ تھی، جب بھی فارغ ہوتے کتاب کی ورق گردانی شروع کر دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ علم ایسی غذا ہے جس کے کھانے سے سیر ہونے کے بجائے بھوک اور بڑھتی ہے، اس لیے بھر پیٹ پڑھنا چاہیے اور

خوب پڑھنا چاہیے۔ پڑھنے کی لت اور خواہش وطلب کے داعیے ان کے نزدیک اس درجہ عزیز تھے کہ اکثر اوقات یہ بڑی اہم تقریبات میں اس لیے شریک نہ ہو پاتے کہ اس سے ان کے ذوقِ مطالعہ میں حرج واقع ہوتا ہے۔

انور اقبال قریشی نے لکھا ہے کہ "خلیفہ صاحب سے ملاقات کے بعد میرا یہ زعم غلط ثابت ہوا کہ میں بہت پڑھتا ہوں۔ خلیفہ صاحب کے ذوقِ مطالعہ نے مجھے حیران کر دیا۔ وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ان کی رفتارِ مطالعہ بھی حیران کن تھی۔" مجھے ذاتی طور پر ان کی رفتارِ مطالعہ کا علم اس سے ہوا کہ ایک دن ایک نشست میں جو روزانہ ادارے کے لان میں التزام سے منعقد ہوتی تھی، تشبیہات کا ذکر چھڑا، میں نے کہا، تشبیہ بھی ایک طرح کا اندازِ استدلال ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بعض عسیر الفہم مسائل کو سلجھانے کے لیے سادہ اور دل نشین تشبیہات سے کام لیا ہے اور حضرت مسیحؑ کی دعوت وارشاد کا تو یہ مخصوص اور جانا بوجھا اسلوب تھا کہ تشبیہات کے پردے میں، مذہب و دین کے حقائق عالیہ بیان کیے جائیں، اس لیے کہ تشبیہات بسا اوقات منطقی استدلال سے کہیں زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ خلیفہ صاحب نے اس مصرع طرح پر یہ گرہ لگائی کہ تصوف ودین کے رموز و اسرار کو بہترین تشبیہات کے بل پر جس خوبی وعمدگی سے رومی نے آشکارا کیا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ اس پر میں نے کہا، کیوں نہ "تشبیہاتِ رومی" کے نام سے ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ خلیفہ صاحب کو یہ تجویز پسند آئی اور چند ہی روز بعد دیکھتا ہوں کہ خلیفہ صاحب نے پوری مثنوی معنوی کو اس غرض سے کھنگال ڈالا ہے کہ اس میں منتشر حسین تشبیہات کو ایک لڑی میں سلیقے سے پرو دیا جائے۔

خلیفہ صاحب کے مطالعہ میں تنوع، وسعت اور بوقلمونی اس بنا پر ابھر آئی کہ ان کو انگریزی، جرمن، فرنچ، فارسی اور ادب اردو میں یکساں دسترس حاصل تھی۔ مزید برآں فلسفہ، تصوف اور اسلامیات کی بہترین کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہتیں۔ شبلی ان کا چہیتا ممدوح تھا۔ حالی کی سوانح نگاری اور بابائے اردو عبدالحق کے تحقیقی مقالات ان کو دل پسند تھے، فلسفہ وتصوف میں افلاطون سے لے کر کانٹ تک اور تصوف میں بایزید اور ابوالہاشم سے لے کر ابن عربی تک ہر بڑے مفکر کے شاہکار ان کے نہاں خانۂ دل میں محفوظ تھے۔ ان کے مطالعے کے دائرے کتنے

وسیع اور پھیلے ہوئے تھے، اس کا اندازہ ان کی تصنیفات سے کم اور گفتگو سے زیادہ ہوتا تھا۔ جن لوگوں کو ان کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ بات مذہب و دین کی ہو یا فلسفہ و ادب کی، جب بھی انھوں نے کسی مسئلے پر لب کشائی کی حکمت و معرفت کے رنگا رنگ دبستان سجا دیے۔ مجلس آرائی کا رکھ رکھاؤ اور ٹھاٹھ جو ہم نے ان کے ہاں دیکھا وہ اور کہیں نظر نہ آیا۔ مکالمہ طرازی میں ان کا خاص اور اپنا رنگ تھا۔ ہم روزانہ حلقہ بنا کر گیارہ بجے کے قریب کرسیاں ڈال کر ادارے کے صحن میں بیٹھ جاتے، خلیفہ صاحب ہلکے پھلکے لطیفوں کے تبادلے کے بعد چہکنا شروع کرتے اور ہم محسوس کرتے کہ ہم ان کے ساتھ ساتھ فکر و ذوق کی مختلف وادیوں میں گشت کر رہے ہیں۔ کبھی شبہ ہوتا کہ شاید ہم افلاطون کی اکاڈمی میں بیٹھے ہیں، کبھی احساس ہوتا کہ مسند درس پر قشیری اور ابن عربی تشریف فرما ہیں اور تصوف کے مقامات و احوال کی تشریح کر رہے ہیں اور کبھی کبھی ایسا لگتا کہ لکھنؤ اور دہلی کی قدیم ادبی محفلیں کانوں میں حلاوت ٹپکا رہی ہیں اور تذکیر و تانیث اور بدیع و بیان کے وہی چرچے دوبارہ بپا ہیں، جو کبھی ان محفلوں کی زینت تھے۔ یعنی اس ایک مجلس نے گویا زمان و مکان کے فاصلوں کو پھلانگ کر ماضی و حال کی علمی و ادبی یادوں کو از سرِ نو تازہ کر دیا ہے۔

اس نشست میں شومئ قسمت سے اگر کوئی خشک اور جامد قسم کا مولوی آ نکلتا تو خلیفہ صاحب کی حسِ طنز و مزاح پھڑک اٹھتی اور اس کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیتے کہ اس کے لیے سنبھلنا دشوار ہو جاتا، اور اگر کسی مغربی سکالر کو تقدیر گھیر کر ان کے ہاں لے آتی تو نہ پوچھیے کس کس انداز سے خلیفہ صاحب اس پر حملہ آور ہوتے۔ مغرب کا فلسفہ، کلیسا، کلچر، تاریخ اور اہلِ مغرب کا موجودہ اندازِ حیات، ہر چیز ان کی شدید تنقید کا ہدف بنتی۔ اس وقت خلیفہ صاحب اسلام کے ایک پرجوش مبلغ کی حیثیت سے دفاع کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے۔ شکل و صورت اور وضع قطع اور اس کے اندر پنہاں روح و باطن کا یہ تضاد اجنبی کے لیے اچھے خاصے اچنبھے کا باعث ہوتا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس یہ شخص کس درجہ اسلام کی محبت میں سرشار ہے۔

خلیفہ صاحب کی مجلس آرائی اور سخن طرازی کا یہ ڈھب ایسا پیارا اور جاذبِ توجہ ہوتا کہ خود خلیفہ صاحب پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ ایک مرتبہ ایک نہایت معزز اور پڑھے لکھے ایک امریکی کو ادارے میں آنا تھا۔ خلیفہ صاحب نے ملازمین کو آدابِ مہمان نوازی جلتے ہوئے

کہہ رکھا تھا کہ پہلے ٹھنڈے اور میٹھے مشروب سے ان کی تواضع کی جائے گی اور اس کے بعد گرم گرم چائے کا دور چلے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ خلیفہ صاحب نے حسبِ معمول جب گفتگو کا آغاز کیا اور اس سلسلے کو طولِ شبِ فراق کی شکل میں ڈھالا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ٹھنڈا مشروب تو گرم ہو گیا اور گرم گرم چائے ٹھنڈی اور یخ بستہ آہیں بھرنے لگی۔

اقلیم لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کے خلیفہ صاحب بلا شرکتِ غیرے واحد فرماں روا تھے۔ انگلش مفکر و فلسفی لاک کی طرح ان کی یہ رائے تھی کہ لطائف اور لوک کہانیوں میں بھی حکمت و دانش کے ایسے ایسے جواہر یک دانہ پائے جاتے ہیں جو بسا اوقات ٹھوس علمی مقالوں پر بھاری ثابت ہوتے ہیں۔

ان کی لطیفہ گوئی کی ایک دلچسپ جھلک دیکھیے اور داد دیجیے۔ ایک مرتبہ ایک مغربی خاتون اپنے مقالے کی ترتیب کے سلسلے میں خلیفہ صاحب کے ہاں ادارے میں آئیں۔ آپ نے بہ کمال شفقت اس کی رہنمائی فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے اس کے معمولی مقالے کو چار چاند لگا دیے۔ وہ بہت ممنون ہوئیں۔ چلتے چلتے کہنے لگیں، خلیفہ صاحب اور تو اور آپ کا یہ ادارہ بہت خوب صورت ہے، اس کے وسیع لان، مہکتے ہوئے سبزہ زار اور پھول دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ جنتِ ارضی ہو۔ خلیفہ صاحب اس کی اس تحسین پر مسکرائے اور کہا، اس کے جنت ہونے میں کیا شبہ ہے، کسر صرف اس بات کی ہے کہ اس میں آپ جیسی کوئی حور جلوہ گناں نہیں۔

دوسرا لطیفہ سنیے۔ ایک دفعہ لندن میں کھانے پر مرزا بشیر الدین محمود اور خلیفہ صاحب میں مسئلۂ ختمِ نبوت پر بحث چھڑ گئی، مرزا صاحب نے کہا کیا آپ بھی بایں روشن خیالی اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ دور وحی و تنزیل کی ارزانیوں سے یکسر محروم رہے گا۔ خلیفہ صاحب نے فوراً جواب دیا، جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ کوئی اللہ کا فرستادہ آئے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کردار و عمل اور پیغام و دعوت سے منصبِ نبوت کو اتنی بلندیوں تک اچھال دیا ہے کہ اب چھوٹے قد کا کوئی مدعیِ نبوت آنکھوں میں جچتا ہی نہیں۔

لطیفہ گوئی اور طنز و مزاح میں خلیفہ صاحب پروفیسر وحید الدین سلیم سے بہت متاثر تھے۔ جن لوگوں نے ان دونوں حضرات کو حیدرآباد کی علمی و ادبی مجلسوں میں یکجا دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جب یہ لطیفہ گوئی اور طنز و مزاح کے پھول بکھیرنا شروع کرتے تو پوری محفل دیوارِ قہقہہ بن جاتی۔

خلیفہ صاحب کی شخصیت اتنی جاذب، پیاری اور علوم و معارف سے آراستہ پیراستہ تھی کہ جو شخص ایک مرتبہ ان کو دیکھ لیتا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ڈاکٹر شاخت کا کہنا ہے "میں خلیفہ صاحب سے صرف ایک مرتبہ ملا، میرے دل میں ان کی یاد اور قدر و منزلت ہمیشہ قائم رہے گی"

شیخ علی کاشف الغطا لکھتے ہیں۔ "خلیفہ صاحب کی شخصیت سے حیات و توانائی کے شعلے بھڑکتے تھے، انھیں ادب و کمال کا ایک پیکر کہہ سکتے ہیں، ان کی حکمت کے نور سے زندگی کی راہیں چمک اٹھتی تھیں"۔

خلیفہ صاحب نے نہ صرف مشرق و مغرب کے فکری سوتوں سے ذہن کی حد تک استفادہ کیا بلکہ ان کے امتزاج سے خیالات و افکار اور عمل و کردار کے ایسے حسین سانچے کی صورت اختیار کی جس میں مغرب کی جدت طرازیوں کے پہلو بہ پہلو اعتدال و توازن اور اسلامیات کی جھلک صاف نمایاں ہے۔

کائنات، انسان، مادہ اور مذاہب عالم کے بارے میں ان کے اپنے نظریات تھے۔ اس عالم رنگ و بو کو وہ ساکن و راکد نہیں سمجھتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ ہر آن یہ انقلاب و تغیر کے اٹل قانون کے تابع ہے۔ وہ ہیراکلیٹس کے اس مقولے کے پُرزور حامی تھے کہ کوئی بھی شخص ایک ہی ندی میں دوبارہ نہیں اتر سکتا" کائنات کی مکینیکل توجیہ کے برعکس وہ یہ راسخ عقیدہ رکھتے تھے کہ برگسان کا نظریہ جوشش جہات کی مکمل تشریح حی و قیوم خدا کو مانے بغیر نہیں ہو سکتی۔

وہ حضرتِ انسان کو روح و جسم کے دو خانوں میں تقسیم پذیر نہیں مانتے تھے، بلکہ تصوریت و تصوف کے حامیوں کی طرح جسم و قالب اور روح و ذہن کو خدائے لم یزل کی ایک ہی تجلی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ مادے کو متحرک اور اتساع پذیر ماننے کے باوجود اس لائق نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کائنات میں نظم و ترتیب اور غایت و مقصد کی آفرینش کا باعث ہو سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ رب کائنات کی ربوبیت کا کرشمہ ہے کہ اس عالم تغیر و ارتقا کو ایک خاص ڈگر پر چلا رکھا ہے۔ مذاہب عالم کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ان سب میں حق و صداقت کے بنیادی عناصر کا پتا چلتا ہے، لیکن مکمل اور واضح صداقت کا حامل صرف اسلام ہے۔

خلیفہ صاحب اپنی حکیمانہ کاوشوں اور منفرد اسلوب اظہار کی وجہ سے فکر و دانش کے حلقوں میں زندہ رہیں گے، لیکن تاریخ کے صفحات میں ان کو دوام اس وجہ سے حاصل ہوگا کہ انھوں نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی بروقت تاسیس کی اور اس میں ایسے لوگوں کے لیے خدمت کے مواقع مہیا

کیے جو اپنے قلم اور نگارشات سے اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور اس حقیقت سے خوب آگاہ ہیں کہ قدیم وجدید علوم و معارف سے ربط پیدا کیے بغیر ہم صحت مند ذہنوں کی پرورش نہیں کر سکتے۔

خدا کا شکر ہے کہ ان کا قائم کردہ ادارہ اپنے محدود وسائل کے باوجود ملت کی عظیم خدمت انجام دے رہا ہے۔ آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ اب تک اردو اور انگریزی میں ڈیڑھ صد سے زیادہ کتابیں طبع ہو کر قارئین کے فکری تغذیہ کا سامان فراہم کر رہی ہیں، جن میں قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ اور تاریخ اسلامی، ایسے اہم مضامین شامل ہیں۔ دعا ہے کہ خلیفہ صاحب مرحوم کی یہ یادگار اور پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔

مولانا رومی —— حیات و افکار

بشیر محمود اختر

مولانا جلال الدین رومی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے دور میں فلسفہ و حکمت کے ماہر، تصوف و طریقت کے شناور، دعوت و ارشاد میں یکتا اور انسانی نفسیات کے فہم و ادراک میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے جس انداز میں مختلف مسائل کی گرہ کشائی کی ہے اور جس اسلوب سے فرد اور معاشرے کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے اس میں ان کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔ اس کتاب میں ان کی اس نوع کی تمام خوبیوں کو ان کے کلام کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

موجودہ کتاب پاکستان کے ممتاز و معروف مصنف ڈاکٹر افضل اقبال کی انگریزی کتاب Life and work of Rumi کا ایک نہایت کامیاب اردو ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال کی کتاب کی منفرد اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اس کے چار ایڈیشن شائع کر چکا ہے۔

صفحات ۱۶+ ۲۰۴ قیمت — ۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

الفہرست

تصنیف : محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق

اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآن مجید، نزول قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتب فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارس فکر، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعت کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیوں کر عالم وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ قیمت ــــ ۸۵ روپے

الفخری

از ابن طقطقی اردو ترجمہ : مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ ساتویں صدی ہجری کے نامور مورخ ابن طقطقی کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا شمار معتبر ماخذِ تاریخ میں ہوتا ہے اور بے لاگ تبصرہ اور تنقید کی بنا پر اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

صفحات ۹۶ قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

پروفیسر محمد جہاں گیر عالم

تحریکِ پاکستان میں بلوچستان کا حصہ

بلوچستان میں تحریکِ آزادی کا آغاز ۱۹۲۷ء سے ہوا، جب "تجاویزِ دہلی" اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان میں بھی دیگر صوبوں کی طرح سیاسی اور آئینی اصطلاحات نافذ کی جائیں۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں جب مسلم مطالبات کو ایک مرتب اور معین شکل میں "جناح کے چودہ نکات" کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا گیا تو ان میں بھی یہ بات شامل تھی کہ ملک کے دوسرے صوبوں کی طرح بلوچستان میں سیاسی اور آئینی اصلاحات جاری کی جائیں۔ اسی زمانے سے بلوچستان کے لوگوں میں آزادی کی تڑپ اور سیاسی شعور اجاگر ہونے لگا۔

بلوچستان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں نواب یوسف عزیز (۱۹۰۸ - ۱۹۳۵ء) کی خدمات بڑی نمایاں ہیں۔ ان کو بجا طور پر بلوچستان میں تحریکِ آزادی کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ ان کے علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں سے اچھے روابط تھے اور ان کے خیالات و افکار سے متاثر بھی تھے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح سے بھی ان کا رابطہ رہا۔ انھوں نے بلوچستان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے مختلف طریقِ کار اختیار کیے۔ بلوچستان کے عوام کو منظم کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۳۲ء کو جیکب آباد میں کل ہند بلوچ کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ کراچی سے مختلف اخبارات مثلاً "البلوچ"، "بلوچستان"، "بلوچستان جدید"، "ینگ بلوچستان"، وغیرہ جاری کرائے جو یکے بعد دیگرے ضبط ہوتے رہے۔ بلوچستان کے مسائل پر متعدد مضامین اور پمفلٹ بھی لکھے۔ ان میں سے "بلوچستان کی آواز" ایک قابلِ ذکر پمفلٹ ہے[1]۔

نواب یوسف عزیز ایک اچھے شاعر بھی تھے اور شاعری کے ذریعے بھی انھوں نے عوام میں سیاسی بیداری اور آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ ان کی ایک مشہور نظم کے چند شعر یہ ہیں:

قسم ہے غزوۂ بدر و اُحد میں مرنے والوں کی ‏ ‏ قسم ہے کربلا کو خون سے تر کرنے والوں کی

---

[1] تحریکِ پاکستان میں بلوچستان کا حصہ از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، اسلام آباد ۱۹۷۵ء، ص ۲۰

کہ اپنے ملک سے داغِ غلامی دھو کے چھوڑوں گا بلوچستان کو آزادی کی مے پلوا کے چھوڑوں گا
لٹا کر چند سر اور گردنیں اپنے رفیقوں کی زکوٰۃِ فرض اپنی قوم سے دلوا کے چھوڑوں گا
سبق دے کر اخوت کا شجاعت کا محبت کا ہیں پھر بگڑی بلوچستان کی بنوا کے چھوڑوں گا[2]

بلوچستان اگرچہ آبادی کے اعتبار سے واضح مسلم اکثریت کا علاقہ تھا لیکن یہاں مسلم لیگ کی تنظیم سب سے بعد میں قائم ہوئی۔ قاضی محمد عیسیٰ کی کوششوں سے ۱۹۳۹ء میں بلوچستان میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ جون ۱۹۳۹ء میں بلوچستان مسلم لیگ کی پہلی کانفرنس کوئٹہ میں قاضی محمد عیسیٰ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"حضرات! تجارت اور صنعت و حرفت میں کمال پیدا کرنا ہمارا آبائی ورثہ تھا لیکن افسوس کہ ہم نے اس کی قدر نہ کی اور اس پر نظرِ التفات نہ ڈالی۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبہ کی قیمتی پیداوار اور قابلِ قدر معدنیات ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ ان پر دوسری قوموں کا قبضہ ہے اور صوبے کے باشندے نانِ شبینہ کے محتاج ہیں اور غربت کی زندگی پر مجبور ہیں اور صوبے کے اقتصادی اور معاشی وسائل کا کوئی قریبی حل نظر نہیں آتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ صوبے کے ماہرینِ سیاست ایک ہی مسلم جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو کر دینی، تعلیمی، تجارتی اور صنعتی فقدان کا حل سوچیں ..... ہندوستان کی کامل آزادی اور اس پر بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کے لیے بلاتمیز مذہب و ملت و عقائد و خیالات ہم ہندوؤں کے ساتھ اتحادِ عمل پر آمادہ ہیں اور ہندوستان کی قابلِ ذکر سیاسی جماعت کانگریس کے ساتھ بھی اشتراکِ عمل کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اشتراکِ عمل کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ جیسے ایک آزاد اور خود دار جماعت اپنی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے کسی مشترکہ نصب العین کے ماتحت ایک دوسری جماعت کے ساتھ مساویانہ شکل میں اتحادِ عمل کا اعلان کرتی ہے۔ پس اگر کانگریس مسلمانوں کے دینی جذبات، مذہبی مطالبات، اجتماعی ضروریات، رسم الخط، تمدن، تہذیب و معاشرت اور علوم و ادب کی مستقل و دوامی صورت کی متمنی ہو اور انھیں قطعی طور پر ہندوستان کے آئین نافذہ میں شامل کرنے کو عملاً تسلیم کرے اور مسلم لیگ کو ہندوستان کی واحد سیاسی نمائندہ جماعت قرار دے کر مناسب اور جائز شرائط کے ماتحت ایک باعزت سمجھوتہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو مسلمانانِ ہند کا یہ نہ

۲؎ بلوچستان میں اردو۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۲

اجتماع کانگرس کو اپنی جائز ہمدردیوں کا یقین دلانے کا اولوالعزمانہ اعلان کرتا ہے[53]

بلوچستان میں مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے اور عوام میں اسے متعارف کرا کے لیے ملک کے دوسرے حصوں سے مختلف رہنما وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہتے۔ اگست ۱۹۳۹ء میں مولانا ظفر علی خاں بلوچستان میں آئے اور انھوں نے مختلف مقامات پر عوام سے خطاب کیا او مسلم لیگ سے لوگوں کو متعارف کرایا۔ کوئٹہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فر

"مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس کا نصب العین مکمل آزادی ہے۔ وہ ہندو کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے اور مسلمانوں کے حقوق کی محافظ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مسلم لیگ میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل ہوں"[54]

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس منعقدہ لاہور میں اے کے فضل الحق نے قرارداد پاکستان پیش کی جس کی تائید میں مختلف صوبوں کے رہنماؤں نے تقریریں کیں۔ بلوچستان کی طرف سے قاضی محمد عیسیٰ نے قرارداد پاکستان کی تائید کی تھی۔ آپ نے قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کا شکر ہے کہ آج ۲۷ سال کے بعد مسلمان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انھیں آزاد اسلامی مملکت میں زندگی بسر کرنی چاہیے۔ ہمارے قائداعظم گزشتہ تین سال سے یہ سوچ رہے تھے کہ مسلمانوں کی آئندہ پوزیشن کیا ہونی چاہیے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کم از کم ان صوبوں میں مسلمانوں کو آزادی ملنی چاہیے جہاں ان کی اکثریت ہے۔ اس طرح کم از کم ۶ کروڑ مسلمان تو آزاد ہو جائیں گے۔ کل سردار اورنگ زیب خاں نے کہا تھا کہ وہ درۂ خیبر کی دربانی کریں گے۔ میں یہ اعلان کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہم اس سے ایک چھوٹے دروازے یعنی درۂ بولان کی دربانی کریں گے"[55]

جولائی ۱۹۴۰ء کو بلوچستان مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کوئٹہ میں نوابزادہ لیاقت علی خاں کی صدارت

---

[53] پاسبان کوئٹہ ۱۸ جون ۱۹۳۹ء بحوالہ تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، ص ۳۱-۳۳

[54] ایضاً، ص ۳۵

[55] انقلاب لاہور ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء

میں منعقد ہوا۔ قاضی محمد عیسیٰ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا:

"پاکستانی سکیم کی تشکیل سے قبل ہمارا مطالبہ صوبائی اصلاحات کے متعلق پُر زور طور پر تھا لیکن چونکہ اب پاکستانی سکیم کے مرتب ہو جانے پر ہمارا صوبہ اسلامستان یا پاکستان میں آچکا ہے، لہٰذا ہمارا مطالبہ اب صوبائی اصلاحات کے علاوہ پاکستان کا بھی ہے۔ پاکستان کے لیے تمام مسلمانانِ بلوچستان اپنے ہندوستان کے باقی مسلمان بھائیوں سے کلی طور پر متفق ہیں اور ہر ممکن قربانی دینے اور ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں"[۵۶]

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اپنے خطبۂ صدارت میں بلوچستان کے مسائل اور پاکستان کو موضوعِ بحث بنایا۔ آپ نے مسلمانوں سے پُر زور اپیل کی کہ وہ اپنے نصب العین (پاکستان) کے حصول میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو بلوچستان مسلم لیگ نے یوم پاکستان منانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں میکموہن پارک کوئٹہ میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا، جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا اور قرار دادِ پاکستان کی پُر زور حمایت کی گئی۔ اگلے سال بھی ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو بلوچستان مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام یوم پاکستان منایا گیا[۵۷] جس میں ایک قرار داد کے ذریعے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر بھرپور اعتماد کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کی خواہشات کے خلاف کوئی سکیم مرتب نہ کرے[۵۸]

۱۹۴۳ء کے وسط تک بلوچستان مسلم لیگ کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں اور اس صوبے کے مسلمان تحریکِ پاکستان کی سرگرمیوں میں پوری طرح حصہ لینے لگے تھے۔ جون ۱۹۴۳ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح بلوچستان کے دورے پر تشریف لائے تو اس صوبے کے مسلمانوں نے ہر مقام پر انھیں والہانہ انداز میں خوش آمدید کہا۔ ۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو قاضی محمد عیسیٰ کی زیرِ صدارت کوئٹہ میں بلوچستان مسلم لیگ کا تیسرا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح موجود تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

---

۵۶ پاسبان کوئٹہ، ۴ اگست ۱۹۴۰ء

۵۷ تحریکِ پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، ص ۵۸

۵۸ انقلاب لاہور، ۲۶ مارچ ۱۹۴۲ء

"اب وقت آگیا ہے کہ مسلمانانِ بلوچستان بھی اپنی گراں خوابی سے چونکیں اور امت مسلمہ کی صفوں میں شامل ہو جائیں ۔ آپ کے صوبے میں بھی مسلم لیگ کا نظام روز بروز وسیع تر ہوتا جارہا ہے ۔ آپ کی یہی بیداری قومی تعمیر کی خشتِ اوّل ہوگی ۔ کسی قوم کو بیدار کرنا ایک عظمت ہے ۔ اس کو منظم کرنا اس سے بھی بڑی عظمت ہے ۔ بس اب اٹھو اور دوسرے صوبوں کے شانہ بشانہ صف آرا ہو جاؤ ۔"[۵۹]

بلوچستان مسلم لیگ کے اسی اجلاس کی دوسری نشست میں مسلمانان بلوچستان کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح کی خدمت میں ایک تاریخی تلوار پیش کی گئی ، جس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ متعدد اسلامی محاربات میں اس سے کام لیا گیا ہے ۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس تحفے کو قبول کرتے ہوئے بلوچستان کے مسلمانوں کی بیداری پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے فرمایا :

"یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے ، صرف حفاظت کے لیے اُٹھے گی ، لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے ۔ علم تلوار سے بھی زیادہ طاقت ور ہے ۔ جایئے اور علم حاصل کیجیے ۔ میں جانتا ہوں کہ اگر وقت آجائے تو ہم اپنی جان اور سب کچھ قربان کر دیں گے ۔"[۶۰]

جب ۱۹۴۵ء میں قائداعظم محمد علی جناح دوبارہ بلوچستان تشریف لائے تو عوام سے رابطہ قائم کرنے کے علاوہ بلوچستانی مسلم طلبا سے بھی رابطہ پیدا کیا ۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس سے خطاب کیا ۔ آپ نے اپنی تقریر میں کہا :

"مسلم طلبا کو ہدایت کروں گا کہ وہ سیاست کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کریں ۔ سیاست تمھاری تعلیم کا ایک حصہ ہے ۔ میں تمھیں متنبہ کروں گا کہ تمھاری سیاسی بیداری اور جد وجہد کے راستے میں چند شخصیتوں اور حکومت کی طرف سے رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری متحدہ اور ان تھک کوشش ملک کے اندر ایک انقلاب برپا کر سکتی ہے ۔ آپ اپنی جد وجہد جاری رکھیں ۔ آپ کو مخالفتوں اور رکاوٹوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے ۔ مجاہدوں کی طرح اپنے عزم و استقلال کے ہتھوڑے سے راستوں کے پتھروں کو ریزہ ریزہ کر دو ۔ تمھاری پیش قدمی جاری رہنی چاہیے ۔ آگے بڑھو ۔ فتح و نصرت تمھارے قدم چومنے کے لیے بے قرار ہے ...... میں دیکھ رہا ہوں کہ بلوچستان کروٹ لے رہا ہے ۔ بلوچستان کی نیم سیاسی اور قومی حکومت کے نظم و نسق کو بدلنے کے

---

۵۹ خطباتِ قائداعظم ، مرتبہ رئیس احمد جعفری ، ص ۲۹۱

۶۰ ایضاً ، ص ۲۹۲ ، ۲۹۳

لیے عوام میں بیداری کی لہر اور جدوجہد کی تڑپ پیدا ہو چکی ہے اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی بیداری آپ کی جدوجہد، آپ کی یکجہتی اور عزم و استقلال سے اس صوبے کے نظام میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی جدوجہد آزادی میں صبر و استقلال کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں، خواہ حالات کتنے ہی اشتعال انگیز کیوں نہ ہوں۔"[11]

قاضی محمد عیسٰی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح نے حصول پاکستان کے لیے اپنا یہ تاریخی اعلان کیا کہ "تم مجھے چاندی کی گولیاں دو، میں آزادی کی جنگ لڑ کر تمھیں پاکستان دوں گا" تو ایک بار پھر صوبہ بلوچستان کے لوگوں نے آبادی کے تناسب کے لحاظ سے برصغیر کے تمام صوبوں سے زیادہ عطیہ دیا۔ پھر جب قائداعظم دوسری مرتبہ (۱۹۴۵ء) بلوچستان تشریف لائے تو بلوچستان مسلم لیگ کے جواں مردوں نے قائداعظم محمد علی جناح کو بے انتہا دولت دی اور یہ سب کچھ ملی تحریک کے لیے کیا اور کہا آپ نے ہم سے چاندی کی گولیوں کی درخواست کی تھی، آپ ہم سے توپ کے گولے لیں اور خدا کے لیے برصغیر میں جلد پاکستان کا وجود قائم کریں۔"[12]

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بلوچستان مسلم لیگ کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا:

"مسلم لیگ اب ایک طاقت ہے اور حکومت اس کے مطالبات کو نظرانداز نہیں کر سکتی . . . . . مسلمانوں کے تمام طبقوں میں اتحاد کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بلوچستان کے مسلمان کل ہند مسائل میں اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اب کسی مسلمان صوبے کی آواز کی غلط نمائندگی ناممکن ہے کیوں کہ اسلامی مفاد کی نمائندگی اب مسلم لیگ کا واحد فریضہ بن چکا ہے۔ ہندو انجمنوں میں اب مسلمان قلیل تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان کی تعداد میں سرعت سے کمی واقع ہو رہی ہے، کیوں کہ مسلمان ہندو راج گوارا نہیں کر سکتے۔ میں تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ صرف مسلم لیگ ہی کو ووٹ دیں، کیوں کہ ہم اسی مسئلے پر انتخابی جنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔ ذاتی رقابتیں اور عناد بالائے طاق رکھ دیے جانے چاہئیں اور مسلمانوں کو مشترکہ مفاد کے لیے ہر ممکن قربانی کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔"[13]

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں بلوچستان میں کانگرسی امیدوار کو ناکامی ہوئی اور نواب محمد خان جوگیزئی

---

[11] ارشادات جناح۔ مرتبہ مفتی غلام جعفر۔ لاہور، ص ۲۲۱ - ۲۲۲

[12] تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ۔ ص ۸۷ [13] ایضاً، ص ۸۵

بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ان کی یہ کامیابی بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کی کامیابی کا سنگِ بنیاد تھی۔ بقول نسیم حجازی آئین ساز اسمبلی کے لیے نواب محمد خان جوگیزئی کا انتخاب بلوچستان کا پاکستان کی طرف پہلا اہم قدم تھا[۱۴]۔ اس سے پاکستان کے حامی عناصر کے حوصلے بلند ہوئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ مسلم لیگ تمام مخالفتوں، سازشوں اور دشواریوں کا منہ توڑ جواب دے کر مکمل فتح حاصل کرے گی۔ نواب محمد خان جوگیزئی نے دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی کے فوری بعد اپنے ایک بیان میں کہا :

"بلوچستان کے سرداروں کے حکم کے مطابق وہ قائد اعظم کی اجازت کے بغیر اسمبلی میں شرکت نہیں کر سکتے۔ بلوچستان کے سرداروں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کوئی ایسا آئین جس کی بنا شریعتِ مطہرہ پر نہ ہو گی بلوچستان کے عوام کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ مسلم لیگ کی شمولیت کے بغیر کوئی آئین تیار کرنا جائز نہیں ہوگا۔ یہ اشد ضروری ہے کہ دونوں جماعتیں باہمی تعاون سے کام لیں۔ بلوچستان کے عوام کی پوری ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ بہار کے زہرہ گداز واقعات نے ہمیں بے حد متاثر کیا ہے اور ہم مظلوموں کے لیے امدادی رقوم جمع کرا رہے ہیں۔ بلوچستان کے عوام پر کانگرس کا کوئی اثر نہیں۔ وہاں تین چار تنخواہ دار کارکنوں کے سوا کوئی بھی کانگرسی نظر نہیں آتا۔ پاکستان کی آزاد مسلمان مملکت کے قیام کے لیے بلوچستان ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی پوری حمایت کرتا ہے[۱۵]۔"

۱۹۴۶ء کے وسط میں مسلم لیگ کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں یہ طے کیا کہ بطور احتجاج مسلم لیگی خطاب یافتگان اپنے اپنے خطابات واپس کر دیں۔ چنانچہ اس فیصلے پر بلوچستان میں بھی عمل ہوا۔ کوئٹہ میں عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد عوام کے سامنے خطاب یافتگان نے یکے بعد دیگرے مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ جب ہماری زندگیاں اپنی ملی و سیاسی جماعت مسلم لیگ کے لیے وقف ہو چکی ہیں تو ہم اپنی جماعت کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے خطابات حکومت کو واپس کرتے ہیں اور اپنی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اگر جماعت ہم کو آگ میں کود نے کا بھی حکم دے گی تو ہم فوراً صدائے لبیک بلند کرتے ہوئے اس میں کود پڑیں گے[۱۶]۔

۱۴؎ تحریکِ پاکستان اور بلوچستان از سید نعمان فاروقی کراچی ۱۹۷۶، ص ۷

۱۵؎ نوائے وقت لاہور ۱۰ دسمبر ۱۹۴۶ء

۱۶؎ تحریکِ پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، ص ۹۹-۱۰۰

۲۷ - ۲۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو کوئٹہ میں پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی - اس کی صدارت چوہدری خلیق الزمان نے کی - اس کانفرنس میں واضح طور پر کہا گیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی منزلِ مقصود پاکستان ہے جو سامنے دکھائی دے رہی ہے - ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان میں بلاتاخیر جمہوری حکومت قائم کی جائے جو جون ۱۹۴۸ء میں حکومتِ برطانیہ سے بلوچستان کے متعلق تمام اختیارات حاصل کر سکے ۔[۱]

قائداعظم محمد علی جناح قومی تحریکات کی کامیابی کے لیے اتحاد کو نہایت اہم سمجھتے تھے - مئی ۱۹۴۷ء میں بلوچستان مسلم لیگ میں دو دھڑے ہو گئے تھے - جب ان واقعات کی خبر قائداعظم کو ملی تو بلوچستان کے عوام کے نام حسبِ ذیل پیغام بھیجا -

" پاکستان کی منزل اب ہمارے بہت نزدیک آ گئی ہے اور بلوچستان اس میں شامل ہوگا - وقت کا تقاضا ہے کہ چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق جھگڑے فسادات بالکل ختم کر دیے جائیں، کیوں کہ مسلمانوں کے سامنے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہے - میں مسلمانانِ بلوچستان سے اپیل کروں گا کہ وہ متحد و متفق ہو کر لیگ کی قیادت میں اعتماد رکھیں - جب ہمیں اپنا مقصود حاصل ہو جائے گا تو قوم کے چھوٹے بڑے معاملوں کا نہایت انصاف اور غیر جانب داری کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا، لہذا اس وقت تک ہمیں ہر حال میں صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے "[۲]

۳ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک اعلان کے ذریعے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو منظور کرتے ہوئے برصغیر کی تقسیم کا اعلان کیا - بلوچستان کے بارے میں اعلان میں کہا گیا کہ شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے ارکان اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ آیا بلوچستان پاکستان یا بھارت میں شریک ہو. رائے شماری کے لیے ۲۹ جون کی تاریخ مقرر کی گئی - اس اعلان کے ساتھ ہی کوئٹہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا - شاہی جرگہ کے ارکان کو ہندوستان میں شمولیت کی ترغیب دی جانے لگی کہ ہندوستان ہی بلوچستان کے اخراجات کا متحمل ہو سکتا ہے اور اگر بلوچستان نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو بلوچوں اور پٹھانوں کے حقوق پامال ہو جائیں گے اور دوسری طرف انگریز بھی مسلمانوں کی یک جہتی اور اتحاد کو ختم کرنے کے درپے تھے - پاکستان کے فدائی ایسے وقت میں دن رات مصروف ہو گئے - ان دنوں میر جعفر خاں جمالی

---

[۱] تحریکِ پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، ص ۱۰۵

[۲] ہفت روزہ بولان، ۳۰ مئی ۱۹۴۷ء بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد، جلد ۱۴، شمارہ ۷، ۶

اور نواب محمد خاں جوگیزئی نے جس گرم جوشی سے پاکستان کے لیے کام کیا یہ ان ہی کا حصہ تھا۔ ۲۱ جون ۱۹۴۷ء کو نواب محمد خاں جوگیزئی اور میر جعفر خاں جمالی نے اپنے مشترکہ بیان میں اعلان کیا:

"بلوچستان کے سرداروں نے پورے غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلوچستان کے حقوق کا بہترین تحفظ پاکستان کے اندر رہنے سے ہوگا۔۔۔ پاکستان کی اسلامی ریاست کے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو کر بلوچستان نہ صرف اپنی آزادی اور خود مختاری کی حفاظت کر سکے گا بلکہ اپنے ہمسایہ مسلم صوبوں کے دوش بدوش اپنی اقتصادی اور سیاسی حالت کو بدرجہا بہتر بنا سکے گا۔

بلوچوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ قائداعظم کی کوششوں سے ہم ہندو اکثریت کے سیاسی غلبے سے آزاد ہو کر پاکستان کی اسلامی حکومت میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم سب سردار مع اپنے قبائل کے پاکستان کی اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں اور قائداعظم پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری صحیح رہنمائی کریں گے"[۱۹]

اس بیان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ بلوچستان کے لوگ تشکیلِ پاکستان کی راہ میں دیوانہ وار آگے بڑھے اور ریفرنڈم سے کچھ روز پہلے کوئٹہ میں پاکستان کی حمایت میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا جس میں پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں میں اعلان کیا گیا کہ "ہم دیکھیں گے ہمارے راستے میں اب کون حائل ہوتا ہے۔ بلوچستان پاکستان اور صرف پاکستان کا حصہ بنے گا۔"[۲۰]

۲۵ جون ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے بلوچستان کے لوگوں کے نام ایک پیغام جاری کیا کہ ریفرنڈم میں ہر مسلمان سے اپیل کروں گا کہ وہ پاکستان کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کرے۔ انھوں نے اپنے پیغام میں واضح طور پر کہا کہ بلوچستان جغرافیائی اور معاشی طور پر صرف پاکستان میں رہ سکتا ہے۔ یہ اہلِ بلوچستان کے مفاد میں ہے کہ وہ پاکستان میں شامل ہوں کیوں کہ صرف پاکستان اکیلا ہی تعلیمی، معاشی اور سیاسی ترقی و بہبود میں ان کی مدد کر سکتا ہے[۲۱] قائداعظم کی اس اپیل نے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے ارکان پر بھرپور اثر کیا۔

---

[۱۹] تحریکِ پاکستان اور بلوچستان از سید محمد فاروق کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۵۰

[۲۰] تحریکِ پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، ص ۱۲۵

[۲۱] منتخب تقاریر قائداعظم مرتبہ رفیق افضل (انگریزی) لاہور ۱۹۷۳ء ص ۲۱۷

آخری وقت میں اعلان کیا گیا کہ ۲۹ جون کو ریفرنڈم نہیں ہوگا۔ اس دن صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اعلان پڑھ کر سنایا جائے گا اور اگلے دن رائے شماری ہوگی۔ یہ بڑی گہری سازش تھی۔ ایک دن میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ ہندو اور انگریز کی اس ملی بھگت کے خلاف تحریکِ پاکستان کے دیوانے ڈٹ گئے۔ چنانچہ جب ۲۹ جون کو ٹاؤن ہال کوئٹہ میں پروگرام کے مطابق ایجنٹ برائے گورنر جنرل نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اعلان پڑھنا شروع کیا اور وہ ابھی یہ اعلان ختم نہ کر پائے تھے کہ نواب محمد خاں جوگیزئی بڑے اعتماد سے اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ "ہم یہ بیان پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ہمیں فیصلہ کرنے کے لیے مزید وقت نہیں چاہیے کیوں کہ شاہی جرگہ کے سردار پاکستان کی حمایت میں فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا نمائندہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بیٹھے گا۔" ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا اور ہال سے باہر کی فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے معمور ہو گئی۔[۲۲]

---

۲۲ تحریکِ پاکستان میں بلوچستان کا حصہ ص ۲۷-۱۲۵

علامہ میر سید محمد شاعر بلگرامی

علامہ میر سید محمد شاعر بلگرامی خلف الصدق علامہ بے عدیل میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی کی ولادت بعد نم ظہر شنبہ کے روز ۱۳ ربیع الاول ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء کو بلگرام کے محلہ میدان پورہ میں ہوئی۔ ان کا سلسلۂ نسب سید علی عراقی سے ہو کر زید شہید بن امام زین العابدین بن حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے کتب درسی استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی[1] (وفات ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) سے پڑھیں اور دوسرے تمام علوم اپنے والد ماجد سے حاصل کیے اور ان کے کمالات علمی کے آئینہ دار ہوئے۔ علامہ شاعر بلگرامی کے نانا سید مرتضیٰ بن سید فیروز بن میر عبدالواحد[2] شاہدی بلگرامی متقی اور صاحب مرتاض تھے اور علمی حیثیت سے بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ علم ان کے گھرانے کی میراث تھا۔ سید مرتضیٰ کے جد میر عبدالواحد بلگرامی بہت ذی علم اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں "شرح الکافیہ[3] فی التصوف"، "شرح نزہۃ الارواح[4]" اور

[1] میر طفیل محمد بلگرامی بن سید شکر اللہ الحسینی اترولوی، ۷ ذی الحجہ ۱۰۷۳ھ کو اترولی میں پیدا ہوئے۔ اترولی نواح آگرہ میں ایک قصبہ ہے۔ ۱۰۸۸ھ میں تحصیل علم کی خاطر بلگرام آئے اور یہیں متوطن ہو گئے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ کو بلگرام میں وفات پائی اور پائین قبر علامہ میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی دفن ہوئے۔

[2] میر عبدالواحد شاہدی بلگرامی، بقول صاحب "تبصرۃ الناظرین" درویش کامل وصاحب حال وفضیلت تھے۔ ستر سال سے زیادہ عمر پائی اور جمعہ ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ کو بلگرام میں وفات پائی۔ مفتی محمد میاں قنوجی نے تاریخ وفات کہی ہے

چو رفت واحد صوری و معنوی گفتم   ہزار و ہفدہ و شب جمعہ ماہ صوم سوم

[3] عربی نحو کی کتاب "الکافیہ" مؤلفہ علامہ جمال الدین ابوعمرو عثمان بن عمر المعروف بہ ابن الحاجب المالکی (وفات ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۹ء) کی شرح حقائق وتصوف کے بیان میں ہے۔ میر بلگرامی نے یہ شرح ۹۷۰ھ/ ۱۵۶۲ء میں لکھی۔

[4] "نزہۃ الارواح" مؤلفہ فخر السادات سید حسین بن محمد المعروف بہ امیر حسینی غزنوی (وفات ۷۱۷ھ/ ۱۳۱۷ء) کی تصوف و سلوک میں نہایت مبسوط شرح ہے جو ۹۸۵ھ میں تالیف ہوئی۔ اس شرح کے متعلق پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں کہ "میر بلگرامی نے اپنے تبحر علمی سے ان رموز واشارات کی (جو متن کتاب میں امیر حسینی غزنوی نے بیان کیے ہیں) توضیح اور حقائق و معارف کی تشریح میں خوب داد دی ہے۔"

"سبع سنابل" نہایت وقیع اور مشہور ہیں۔ گویا شاعر بلگرامی کا ننہال اور دادیہال دونوں گھرانے معادن علم وفضل تھے، اس لیے فضائلِ علوم میں ان کو دوسرا حصہ ملا اور انھوں نے خود کو فضائل وکمالاتِ علمی خصوصاً عربیت، لغت و محاضرات میں اس منزل پر پہنچایا کہ ہم عصروں میں کوئی سبقت نہ لے جا سکا۔

شاعر بلگرامی کی شادی ۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء میں ہوئی جب کہ ان کی عمر تقریباً ۱۷ سال تھی۔ گھسیٹے بھاٹ بلگرامی نے اس شادی سے متعلق ایک قطعہ ہندی میں نظم کیا تھا جس کا آخری مصرع صنعت صوری و معنوی میں ہے اور سنہ کدخدائی برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ یہ ہے ؎[56]

میر جلیل کے نند کو بیاہ ۔۔۔ سب کے ہردے بھیو اُماہ

بے تاریخ کے برن سال ۔۔۔ سن گیارہ سے سترہ ہال

علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی جو سرکار بھکر اور سرکار سیوستان (سندھ) کی بخشی گری، وقائع نویسی اور سوانح نگاری کی خدمات پر ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۴ء (عہد سلطان اورنگ زیب عالم گیر) سے مامور تھے، ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۷ء میں جب کہ محمد فرخ سیر بادشاہ کا عہد حکومت تھا مستعفی ہو گئے اور ان خدمات پر اپنے فرزند سید محمد شاعر بلگرامی کی تقرری کا فرمان بادشاہ سے حاصل کیا۔ علامہ عبدالجلیل بلگرامی ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۱۴ء سے دہلی میں مقیم تھے اور ان کی جگہ سید نوح بن سید عبدالعزیز بلگرامی نیابتاً فرائض خدمات بجا لاتے رہے۔ سید محمد شاعر بلگرامی ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء میں اپنے مستقر بھکر پہنچے اور مفوضہ خدمات کو تدین اور حسنِ معاملت کے ساتھ آخر وقت تک بجا لائے۔ ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) میں انھوں نے اپنے بھانجے علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کو بلگرام سے بلوایا۔ چنانچہ وہ ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ کو بلگرام سے روانہ ہوئے اور دہلی، لاہور اور ملتان ہوتے ہوئے ربیع الاول ۱۱۴۳ھ میں سیوستان پہنچے۔ علامہ شاعر بلگرامی، میر غلام علی آزاد بلگرامی کو اپنا قائم مقام بنا کر بلگرام تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ وطن میں گزارنے کے بعد بعض معاملاتِ سرکاری کو طے کرنے کی غرض سے دہلی گئے اور وہاں سے ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں سیوستان واپس ہوئے اور آزاد بلگرامی کو وسط ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں بلگرام جانے کی اجازت دی۔

---

[55] "سبع سنابل" میں تصوف وسلوک کے اہم اور بنیادی نکات نیز شریعت و طریقت کے تعلق کو بیان کیا ہے اور واضح طور پر بتایا ہے کہ طریقت میں شریعت کی پابندی لازمی ہے۔ یہ کتاب سات سنبلوں (ابواب) پر مشتمل ہے اور ۹۶۹ھ کی تالیف ہے۔

[56] کشکول قلمی میر سید محمد شاعر بلگرامی ص ۳ مملوکہ سید مجتبیٰ احسن نوگانوی مقیم کراچی۔

علامہ میر سید محمد شاعر بلگرامی

ذی قعدہ ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء میں جب نادر شاہ (اصلی نام نذر قلی فرخلو بن امام قلی افشار) نے سندھ پر حملہ کیا اور اس ملک پر قابض ہوگیا اور ملک کی حالت قدیم نظم و نسق پر باقی نہیں رہی تو آپ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ سندھ میں مزید قیام ممکن نہ ہو سکا اگرچہ خدا یار خاں[57] اور دوسرے امرائے سندھ نے اعزاز و اکرام کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا اور انھیں روکنے کی تمام کوششیں کیں لیکن شاعر بلگرامی نے کسی نہ کسی طرح ان کو راضی کر لیا اور ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء کو سیوستان سے روانہ ہو کر ۲۷ محرم ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء یعنی چار ماہ اور دو یوم کے بعد بلگرام پہنچے اور اس طرح اس بلگرامی خانوادے کا تعلق سندھ سے جو ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) میں شروع ہوا تھا، وہ ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں منقرض ہوگیا۔ علامہ آزاد بلگرامی سے اس کی تفصیل سنیے۔ وہ لکھتے ہیں:

" مخفی نماند کہ در سن ستہ و عشر و مأتہ و الف سال تولد راقم الحروف خدمات بھکر و سیوستان از درگاہ خلد مکان (اورنگ زیب عالم گیر) بہ علامہ مرحوم تعلق گرفت۔ چند کس از خاندان ما اصالتاً و نیابتاً برین خدمات قیام نمودند۔ ابتداً علامہ مرحوم خود در بھکر نشستند و سید محمد اشرف بن سید عبدالعزیز بلگرامی را کہ بہ شرف مصاہرت بالاختصاص داشت در سیوستان نائب کردند۔ بعد چندے میر محمد اشرف رارخصت وطن فرمودند و میر کرم اللہ بن سید معین الدین، عم زادۂ خود را نیابت سیوستان تفویض نمودند تا آنکہ عزل خدمات پیش آمد۔ علامہ مرحوم خود را بحضور خلافت رسانیدند و خدمات مابدستور سابق بحال ساختند و شیخ محمد رضا بھکری را نوشتند کہ خدمات را سرانجام دہد و عقب آں سید محمد نوح والد مؤلف اوراق را روانہ نمودند۔ والد فقیر قریب ہفت سال بہ نیابت بھکر و سیوستان پرداختند و چوں خدمات بنام سید محمد مقرر شد، ایشاں در آں جا تشریف فرمودند و حضرت والد بہ وطن معاودت نمودند و چند سال کاتب الحروف نیابت خاں صاحب اقبال خود بجا آورد و نوعے کہ گزارش یافت۔ بعد چہل سال نیرنگیٔ روزگار آخور دودمان ما از ملک سندھ برگرفت و علاقہ بالکل منقطع گردید۔ ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔"[58]

علامہ میر سید محمد شاعر بلگرامی ظاہری و باطنی فضائل اور اچھے خصائل و شمائل سے ممتاز تھے ظاہر و

---

۵۷ یار محمد بن نصیر محمد بن الیاس بن داؤد بن آدم کلہوڑا۔ لقب خدا یار خاں۔ وفات ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء

۵۸ مآثر الکرام، ص ۲۴۲، ۲۴۳

باطن کی یک رنگی اور صدق وصفا کی پاکیزگی نیز سخاوت و عالی ہمتی کی عمدہ صفات اُن میں بدرجہ اُتم موجود تھیں۔ آپ سید العارفین سید لطف اللہ عرف شاہ لدھا بلگرامی قدس سرہٗ (وفات ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) بن سید کرم اللہ (وفات ۱۲ رجب ۱۱۰۳ھ) کے مرید تھے۔ آپ اپنا زیادہ تر وقت عبادتِ الٰہی اور مطالعۂ کتب میں صرف فرماتے تھے۔ خصوصاً کتب حقائق مثل فتوحاتِ مکیہ[۹] اکثر آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ شاعر بلگرامی کو عربی، فارسی اور ہندی زبانوں پر عبور حاصل تھا اور ان زبانوں کے اشعار کثرت سے حافظے میں موجود رکھتے اور ان تینوں زبانوں میں شعر کہنے کی قدرت بھی حاصل تھی۔ آپ کا دیوان مرتب ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

دل در خم گیسوئے نگار است بہ بیند | در دامِ محبت چہ شکار است بہ بیند
شب کہ در بزم وصالش صحبت مستانہ بود | دستِ من در زلف مشکینش بجائے شانہ بود
محتسب سرشار و زاہد بے خبر | کس بہ دَورِ چشم تو ہشیار نیست
کے نماید سرو موزوں در نظر | قامتے داد دلے رفتار نیست
طفل راہ حقیقتم شاعر | گرچہ ہشتاد و دو است سال جہاں

شاعر بلگرامی کی دو رباعیاں جو صنف مستزاد میں ہیں ان کی کشکول[۱۰] (قلمی) سے ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ اے ذات تو در کشور می گوئی طاق | آرے بخدا
ہستیم بدیدار شریفت مشتاق | چوں تشنہ بمار
تا کے زغم فراق محزوں باشند | یارانِ شما
زیں پس مپسند دوستاں را بفراق | برخیز و بیا

۲۔ مائیم و دو سہ حریف میخوارہ و مست | باصدق وصفا
داریم شراب لالہ گوں برکف دست | موقوف شما
اسباب طرب جملہ مہیا داریم | از دولت تو
دیدار تو می باید باقی ہمہ ہست | برخیز و بیا

۹۔ مؤلفہ قطب الدین دمشقی

۱۰۔ کشکول قلمی شاعر بلگرامی ص ۴۳ مملوکہ سید مجتبیٰ حسن بن حکیم سید مظفر حسین مرحوم

شاعر بلگرامی اپنے وطن (بلگرام) کی تعریف میں اس طرح رطب اللساں ہیں[۱۱] :

سیر باید کرد نو بہار بلگرام ۔۔۔ برزمرد ناز دارد سبزہ زار بلگرام
ہر نفس عطر گلستان یمن بو می دہد ۔۔۔ خوش دماغاں از نسیم مشک بار بلگرام
اہل معنیٰ کسب انوار سعادت می کنند ۔۔۔ از سواد اعظم دولت مدار بلگرام
عطف از فردوس می سازد عنان دیدہ را ۔۔۔ چشم بینائی کہ می گردد دوچار بلگرام
شش جہت تنگ است بر جولان رخش ہمتش ۔۔۔ برفراز عرش نازد شہسوار بلگرام
خواجۂ کامل عماد الدین قطب الاولیا ۔۔۔ حلقۂ باب حریم او حصار بلگرام
از ورود موکب این خسرو عالی جناب ۔۔۔ سرمۂ چشم ملک باشد غبار بلگرام
آستان اشرف او بوسہ گاہ آسماں ۔۔۔ بارگاہ اقدس او افتخار بلگرام
یاد ہندوستاں کجا از خاطر طوطی رود ۔۔۔ می کند شاعر بجا وصف دیار بلگرام

علامہ شاعر بلگرامی نے ۱۱۵۵ھ میں کتاب "مستطرف" پر جو آداب و مواعظ میں مولانا شہاب الدین محمد (وفات ۸۵۰ھ/ ۱۴۴۶ء) بن احمد ابوالفتح کی بے نظیر تالیف ہے، حمد و صلوٰۃ دیباچہ بزبان عربی مخصوص انداز میں تحریر فرمایا۔ علاوہ ازیں آپ کی تصنیف "تبصرۃ الناظرین" عمدہ یادگار ہے، اس کتاب میں شاعر بلگرامی نے بعض بزرگان بلگرام خصوصاً ان اشخاص کا جو ۱۱۰۰ھ سے قبل گزرے ہیں، ترجمہ لکھا ہے اور ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء سے ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء تک سلاطین اور ہندوستان کے امرا نیز دوسری اہم شخصیتوں کے حالات بالتزام لکھے ہیں۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ خاص شاعر بلگرامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا سید علی اصغر صاحب بلگرامی کمشنر اورنگ آباد (دکن) کے کتاب خانے میں موجود ہے[۱۲]۔

علامہ شاعر بلگرامی کا انتقال ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں شب شنبہ ۸ شعبان کو بلگرام میں ہوا اور اپنے والد ماجد و جد امجد کے قریب اپنے آبائی باغ موسومہ "باغ محمود" میں آسودہ تراب ہیں۔ علامہ آزاد بلگرامی نے تاریخ وفات کہی[۱۳] : ؎ رفت قدسی جہاں سید محمد از جہاں ؟
۱۱۸۵ھ

۱۱؎ ماثر الکرام، ص ۱۱
۱۲؎ فارسی بلگرام، ص ۲۵
۱۳؎ خزانہ عامرہ ص ۲۴۷ آزاد بلگرامی

طب العرب : ایڈورڈ جی براؤن

ترجمہ : حکیم سید علی احمد نیر واسطی

فاضل مستشرق ایڈورڈ جی براؤن نے لندن کے رائل کالج آف فزیشنز میں ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء میں طب عربی پر فاضلانہ خطبات دیے جو بعد میں عریبین میڈیسن کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو پروفیسر براؤن نے اپنے ان چار خطبات کے ذریعے طبی ادب، عربی علم طب اور تاریخ علم پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ خطبات علمی دنیا میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور یورپ کی کئی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔ حکیم سید علی احمد نیر واسطی نے اس مجموعہ خطبات کا انگریزی سے سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کیا اور جا بجا اپنی جانب سے مفید تشریحات اور علمی، فنی و تاریخی تنقیدات کا اضافہ کیا۔ اپنی تشریحات و تنقیدات میں فاضل مترجم نے نہایت قابلیت کے ساتھ جا بجا پروفیسر براؤن کے بیانات کی محققانہ تشریح و توضیح کی ہے۔

صفحات ۵۵۲ قیمت ۳۰ روپے

ارمغانِ حالی

پروفیسر حمید احمد خاں

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کی شہرت کا اصل باعث اگرچہ ان کی نظم کو قرار دیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو نظم و نثر دونوں اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ نظم کی طرح ان کا حصۂ نثر بھی بڑا جان دار اور بہت سے موضوعات کو محیط ہے۔ وہ سوانح نگار بھی تھے اور ناقد بھی، مفکر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھوں نے اصلاحی، تعمیری، اخلاقی، تعلیمی اور معاشرتی وغیرہ مسائل سے متعلق بہت سے مضامین سپردِ قلم کیے۔ یہ کتاب جو "ارمغانِ حالی" کے نام سے موسوم ہے، ان کے نظم و نثر کا قابلِ مطالعہ انتخاب ہے۔ کتاب میں حالی کے حالات و سوانح بھی مناسب تفصیل سے تحریر کیے گئے ہیں۔

صفحات ۲۶۱ قیمت ۱۸ روپے

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنْفِقْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْکَ۔ (صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقۃ علی الاہل)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابنِ آدم خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا۔

یہ حدیث ایک چھوٹے سے جملے پر مشتمل ہے اور حدیث قدسی ہے۔ قدسی حدیث اس حدیث کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہو۔ یہ حدیث بھی دیگر احادیث کی طرح باقاعدہ ایک سند کے ساتھ مروی ہوتی ہے۔

اس حدیث میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بخل اور کنجوسی سے روکا گیا ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ پیسے پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ روپے پیسے کو جمع کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ نہ ماں باپ کی مالی خدمت کرتے ہیں نہ بیوی بچوں کو کچھ دیتے ہیں، نہ رشتے داروں کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں، نہ اللہ کی راہ میں دیگر مقامات پر پیسہ جیب سے نکالتے ہیں اور نہ کسی کو ادھار دیتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس درجہ بخیل ہوتے ہیں کہ اپنے آپ پر بھی خرچ نہیں کرتے۔ حدیث میں اس قسم کے لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے اور خرچ کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بنی نوع انسان کو صاف الفاظ میں حکم ہے کہ تم لوگوں پر مال و دولت خرچ کرو، میں تم پر خرچ کروں گا۔ یعنی ضرورت مندوں، محتاجوں، بیواؤں، یتیموں اور مستحق لوگوں کا خیال رکھو، ان کی مدد کرو اور جہاں تک ہو سکے، ان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاؤ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہاری جائز اور صحیح ضرورتیں پورا کرنے کی بہتر صورتیں پیدا ہوتی رہیں گی۔

کتنے ہی ایسے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی ذات پر تو بہت خرچ کرتے ہیں اور اپنے بال بچوں کو

بھی خوب عیش کرتے ہیں، لیکن مستحق لوگوں کی پروا نہیں کرتے، ہمسائے میں بے شک کوئی شخص بھوکا پڑا ہو، اس کو ایک پیسہ نہیں دیتے۔ یہ انتہائی غلط طرزِ عمل ہے۔ اگر اللہ نے کسی کو مال و دولت سے نوازا ہے تو اس سے غریبوں اور ناداروں کو بھی حصہ ملنا چاہیے۔ جو لوگ غریبوں کی مدد کرتے ہیں، اللہ ان کی آمدنی کے مزید وسائل پیدا کر دیتا ہے اور ان کی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

بعض لوگ اس لیے کچھ خرچ نہیں کرتے کہ جو دولت انھوں نے جمع کر رکھی ہے، خرچ کرنے سے اس میں کمی آ جائے گی۔ یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ جائز کاموں پر خرچ کرنے اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے سے آمدنی کے ذرائع بڑھتے ہیں اور اللہ کی مہربانی اور غریبوں کی دعائیں ان لوگوں کے شاملِ حال ہو جاتی ہیں جو کسی کے کام آتے ہیں۔

بہرحال سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے روپے پیسے کو صحیح جگہ پر خرچ کرتا اور مستحق لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ ایسے شخص پر اللہ بے حد مہربانی فرماتا اور اس قسم کے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی آمدنی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لوگوں کی دعائیں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس جو شخص بخل سے کام لیتا ہے اور مال دار ہونے کے باوجود کسی کے کام نہیں آتا، مستحق اور غریب پر کوئی پیسہ خرچ نہیں کرتا، وہ اللہ کے نزدیک بھی قابلِ نفرت ہے اور لوگ بھی اس کا اچھے الفاظ میں ذکر نہیں کرتے۔ ہر شخص اس کو بُرا سمجھتا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے اس کے لیے دنیا میں بہت بڑی سزا ہے۔

نقد و نظر

جستجو

از : تحسین فراقی

ناشر : مکتبہ بکس - ۵ بخشی سٹریٹ ، بیرون موری دروازہ - لاہور

صفحات ۲۳۲ - کاغذ، کتابت، طباعت، جلد سرورق عمدہ - قیمت ۳۶ روپے

جناب تحسین فراقی ادبی تنقید کے لحاظ سے نوجوان ادیبوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے نقطۂ نظر کو بہت اہمیت حاصل ہے - وہ اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان میں ایک صفت یہ ہے کہ اپنے افکار و خیالات اور نظریے کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے ، جو بات ان کے نزدیک صحیح ہے وہ برملا کہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے آٹھ مقالات پر مشتمل ہے ، جن کے عنوانات یہ ہیں: (۱) اردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیش کش کا مسئلہ (۲) اردو تنقید کے دس سال ۱۹۷۰ تا ۱۹۷۹ء (۳) بھٹائی اور اس کی شاعری (۴) علامہ اقبال اور ثنائے خواجہ (۵) علامہ اقبال اور ابوالعلا المعری ـــ چند مماثل پہلو (۶) اکبر الٰہ آبادی (۷) محمد حسن عسکری اور جدیدیت (۸) بشنو از نے چوں حکایت می کند

ان مقالات میں انھوں نے جو ادبی جائزہ پیش کیا ہے اور جس پس منظر میں کیا ہے اور اس ضمن میں جس اسلوب سے وہ بات کو آگے بڑھاتے ہیں ، اس سے پتا چلتا ہے کہ اردو ادب سے متعلق ان کے مطالعے کا دامن دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ ان کے افکار کے بعض حصوں سے اختلاف کی گنجائش ہے اور ادب کی تقسیم "کو "غیر ادبی تقسیم" قرار دیا جا سکتا ہے ، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تحسین فراقی کی تحریر میں بڑی جان ہے اور نقد و جرح کے فن سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ یہ نہایت نازک مسئلہ ہے اور اس میں احتیاط و توازن کی سرحدوں کو ملحوظ خاطر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

اردو ادب اور تنقید سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں ان کی معنویت

از : ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ناشر : اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، جامعہ نگر، نئی دہلی

کاغذ، کتابت، طباعت بہترین۔ قیمت ۹ روپے پچاس پیسے

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (ریڈر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی (دہلی) کا شمار ہندوستان کے نامور اصحابِ علم میں وتا ہے اور وہ اپنے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں خاص عزت و احترام کے مالک ہیں۔ تصوف کی یا میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی اولاد ہیں اور چشتیہ صابریہ سلسلے کے مشہور بزرگ شاہ سلیمان احمد امروہوی کے نواسے اور ان سے فیض یافتہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چشتی تعلیمات کے مختلف گوشوں پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور اس سلسلے کے تمام پہلوؤں کو خوب سمجھتے ہیں۔

زیرِ نظر رسالہ "چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں ان کی معنویت" دراصل ایک مقالہ تھا جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی درگاہ میں، ایک آل انڈیا سمینار میں پڑھا گیا تھا جو اجمیر میں منعقد ہوا۔ بعد میں یہ ایک رسالے "اسلام اور عصرِ جدید" میں شائع ہوا۔ ہندوستان کے علم و تصوف کے حلقوں میں اس مقالے کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، جامعہ نگر، دہلی نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کی بنیادی تعلیمات کو سمجھنے اور ان کے اصل مقاصد کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے موٹی موٹی پانچ چیزوں کی وضاحت کی ہے۔ (۱) چشتی تعلیمات کا مقصد (۲) خانقاہی تربیت کا نصاب (۳) خانقاہی تربیت کا ماحصل (۴) عہدِ حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت اور (۵) صوفیا کا تصورِ عشق۔

بظاہر یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے، لیکن اس اختصار میں بہت جامعیت ہے اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے اسے بڑی محنت اور تحقیق سے مرتب کیا ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی - فروری ۱۹۸۴

سرجری اسلام کے قرونِ اولیٰ میں (مسلسل)	مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی
سیرت بوعلی سینا کے بعض پہلو "القانون فی الطب" کی روشنی میں (مسلسل)	حکیم محمد زمان حسینی
عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں، محرکات، مسائل اور مقاصد (مسلسل)	ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی
شرایف التواریخ (مسلسل)	پروفیسر محمد اسلم
وشوا بھارتی یونیورسٹی کے فارسی، عربی اور اردو مخطوطات (مسلسل)	عبدالوہاب بدر بستوی

بینات، کراچی — فروری ۱۹۸۴

عربی زبان کی وسعت	جناب حبیب الرحمٰن
فوائد فیروز شاہی	پروفیسر محمد اسلم

بینات، کراچی — مارچ ۱۹۸۴

امام احمد بن حنبل کا مقام دعوت و عزیمت	ملک عبدالرشید عراقی
اسلامی فلسفہ تصوف	شفقت حسین ناظم
مولانا حاجی محمد اسماعیل پشاوری	ڈاکٹر محمد حنیف

تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ — جنوری تا مارچ ۱۹۸۴

تصوف اور غیر مسنون عبادات	ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی
المسجد الاقصیٰ اور اس کے ماحول کی قدیم تاریخ	عبدالباری ایم۔ اے
اسلام اور جاہلیت کی کشمکش	مولانا صدر الدین اصلاحی
اسلام میں مظلوم کے حقوق	سید جلال الدین عمری
رویتِ ہلال کا مسئلہ (مسلسل)	شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید ترجمہ: مولانا محمد امین اثری

ترجمان القرآن، لاہور۔ فروری ۱۹۸۳

قیاس، بحیثیت ماخذ فقہ اسلامی (مسلسل)	شفقت حسین خادم
قرآن کریم کی ترتیب	ڈاکٹر سعید اللہ قاضی
تحریک مجاہدین اور انگریز	سید میر بادشاہ بخاری

تعمیر انسانیت، لاہور۔ فروری ۱۹۸۳ء

عبودیت	خواجہ بدرالدین بانڈے
قرآن میں جنت کا تصور	نفیس الدین احمد
اسلام کی اولین جنگ بدر کا پس منظر	پروفیسر غلام نبی ناگرے

الفرقان، لکھنؤ۔ فروری ۱۹۸۳ء

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی
تبلیغی کام کے کچھ اہم اصول	خلیل الرحمن سجاد ندوی

معارف، اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۸۳

قرآن اور مستشرقین	سید اطہر حسین
براؤن اور اسلام	ڈاکٹر امیر حسن عابدی
کردی اور کرد بیان کے بارے میں تحقیق	ڈاکٹر محمد سلیم
معرکۂ مکین و سودا	ڈاکٹر خالد آفاق قریشی
تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین	قاضی اطہر مبارکپوری

میثاق، لاہور۔ فروری ۱۹۸۳

اصلاح معاشرہ کا قرآنی تصور	ڈاکٹر اسرار احمد

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن :
مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایۂ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری
جلد اول
محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیاتِ غالب :
ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

ماہ نامہ المعارف لاہور - مارچ ۱۹۸۳ رجسٹرڈ ایل نمبر 6033

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

اپریل ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

مجلسِ ادارت

صدر

پروفیسر محمد سعید شیخ

مدیر مسئول

محمد اسحاق بھٹی

ارکان

مولانا محمد حنیف ندوی   محمد اشرف ڈار ، معتمد مجلس

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

طابع و مطبع	مقامِ اشاعت	ناشر
ملک محمد عارف	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	محمد اشرف ڈار
دین محمدی پریس لاہور	کلب روڈ ، لاہور	اعزازی معتمد

فون ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۶ | اپریل ۱۹۸۳ جمادی الاخری ۱۴۰۳ | شمارہ ۴

ترتیب

تاثرات

نہایت افسوس ہے کہ ۱۳ مارچ ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید ستر سال کی عمر پاکر انتقال کر گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم اگرچہ عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے، لیکن انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں اور جس ذوق و شوق کے ساتھ علمی کاموں میں حصہ لیتے رہے، اس کے پیشِ نظر ان کی موت کو بہت بڑا سانحہ قرار دیا جائے گا۔

وہ لاہور کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پوری زندگی خدمتِ علم میں صرف کر دی۔ پاکستانی فوج میں وہ کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ کچھ عرصہ ایران میں پاکستان کے سفارت خانے میں اتاشی کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ ان کی علمی خدمات کی وجہ سے حکومتِ ایران نے انھیں اعزازات بھی عطا کیے۔ وہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے چیئرمین، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور لاہور عجائب گھر کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن تھے۔ میو ہسپتال لاہور اور جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سنٹر کراچی کے سپرنٹنڈنٹ بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے معالج، منتظم، مصنف اور عالم و محقق کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔ قلمی کتابیں اور نوادر جمع کرنے کا انھیں بہت شوق تھا۔ ان کا ذخیرۂ کتب تعداد و وسعت کے لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بہت سی قلمی اور مطبوعہ کتابیں کچھ عرصہ قبل انھوں نے لاہور کے عجائب گھر کو دے دی تھیں، تاہم اب بھی اس کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔

مرحوم، اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور اپنی دلچسپیوں کا مرکز کتابوں ہی کو قرار دیتے تھے۔ وہ نامور مصنف بھی تھے اور ملک و بیرونِ ملک کے علمی رسائل و جرائد میں ان کے تحقیقی مقالات بھی شائع ہوتے تھے۔ کتابی صورت میں "تذکرہ شعرائے پنجاب" ان کا ایک علمی شاہکار ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور حروفِ تہجی کی ترتیب سے پنجاب کے فارسی شعرا کے مختصر حالات اور کلام پر مشتمل ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ایم۔ ذوالفقار علی رانا

تنقید کا مفہوم
اور
زمانۂ جاہلیت میں عربی تنقید کی اہمیت

النقد اور انتقاد کے معنی دراصل سکوں میں تمیز کرنا اور ان میں سے کھوٹے سکوں کو الگ کرنا ہے[1]۔ لیکن پھر یہ لفظ ایک وسیع مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ بعض وقت اس کے معنی نکتہ چینی اور عیب جوئی کے ہوتے ہیں۔ علم ادب کے سلسلے میں نقد یا تنقید کا لفظ قدیم عربوں کے ہاں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اس لفظ کا ادب کے سلسلے میں استعمال غالباً تیسری صدی ہجری میں ہونے لگا حتی کہ قدامہ بن جعفر نے جس کی وفات ۳۲۰ھ کے قریب ہوئی، فنِ بلاغت پر اپنی کتاب کا نام "نقد الشعر" رکھا۔ اس کے مفہوم میں کسی کلام (نثر یا نظم) کے محاسن اور معائب کا بیان کرنا پایا جاتا ہے۔ اب یہ لفظ عام طور پر عربی ادب میں استعمال ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو والوں نے بھی اپنے اپنے ادب میں اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ ادب کے سلسلے میں اس سے صرف عیب چینی یا معائب بیان کرنا نہیں بلکہ معائب کے علاوہ کسی کلام کی خوبیاں بھی اس میں شامل ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے Criticism کا لفظ مستعمل ہے اور یہ اپنے اندر ایک مفہوم رکھتا ہے۔

اصولِ تنقید

دراصل تنقید ایک نہایت مشکل فن ہے اور نقادین میں دو قسم کی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، جن میں سے بعض نفسی یا داخلی ہیں اور دواقعی یا خارجی ہیں۔ نفسی یا داخلی خصوصیات میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تنقید کرنے والے کی نظر اور معلومات میں وسعت ہونی چاہیے اور ضروری ہے کہ زمانۂ

---

[1] ابن منظور: لسان العرب ۳: ۴۲۵

جاہلیت اور اسلامی زمانے کے مشہور شعرا کا کلام اس نے مطالعہ کیا ہو۔

۲ - عربی صرف و نحو کے مختلف قاعدوں اور کوفہ اور بصرہ کے نحویوں کے اختلافات سے پوری طرح واقف ہو۔

۳ — علم بلاغت کی مختلف شاخوں یعنی علم بیان، علم معانی اور علم بدیع میں پوری مہارت ہو اور یہ خصوصیت، تنقید کی اصل جڑ ہے۔

۴۔ ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ بے جا تعصب سے کام نہ لے اور کسی کی عام شہرت یا گم نامی کی بنا پر کوئی رائے زنی نہ کرے۔ چنانچہ ابنِ قتیبہ نے اپنی کتاب "الشعر والشعراء" کے مقدمے میں اس اصول کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ ایک ردی شعر کو اعلیٰ شعر کہہ دیتے ہیں کیوں کہ اس شعر کو کہنے والا قدیم زمانے کا شخص تھا اور بعض ایک نہایت عمدہ شعر کو حقیر خیال کرتے ہیں اور وہ صرف اس لیے کہ اس شعر کا کہنے والا قریب زمانے میں ہوا ہے یا تنقید کرنے والے کا ہم عصر ہے، اس لیے متقدم یا متاخر کی برتری یا رذالت کا خیال دماغ سے بالکل نکال دینا چاہیے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے عقل، ذہانت، علم اور فصاحت و بلاغت کو کسی زمانے یا کسی قوم یا جگہ کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ اسی لیے عربی میں کہا جاتا ہے: "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔"

۵ — ناقد کو چاہیے کہ تنقید کرتے وقت مندرجہ بالا تمام امور کو مدنظر رکھے ورنہ اس کی تنقید صحیح نہیں ہوگی۔

واقعی یا خارجی خصوصیات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

ا— ناقد کے لیے ضروری ہے کہ جس شاعر یا کاتب کے کلام پر تنقید کرنی مقصود ہو، اس کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرے اور کوشش کرے کہ وہ اسی ادیب یا شاعر کی نظر سے مختلف اشیا کو دیکھے۔ اگر کوئی خیال ناقد کے نظریے یا عقیدے کے خلاف ہو تو اس پر ناک بھوں نہ چڑھائے، مثلاً بعض لوگوں نے کعب بن زہیر کے اس مطلع کو پسند نہیں کیا۔

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول　　　متیم لم ترها لم یفد مکبول

(سعاد چلی گئی آج میرا دل غم گین اور شیفتہ ہے، اس کے بعد اور وہ قیدی ہے جس کا فدیہ نہیں دیا گیا)

اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ قصیدہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پڑھا گیا تھا، اس لیے

ادب کا تقاضا یہ تھا کہ اسے نسیب سے شروع نہ کیا جاتا، لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں کیوں کہ قصیدے کو غزل کے اشعار سے شروع کرنا عرب معاشرے میں پسندیدہ فعل تھا اور اس وقت اس چیز کو کوئی بھی بُرا نہیں مانتا تھا۔ اسی طرح ابن دمینہ کے اس شعر کو پسند نہیں کیا جاتا۔

ولو أنّني استغفر الله كلّما ذكرتك لم تكتب عليّ ذنوب

(اگر میں اتنی اللہ سے گناہ کی معافی مانگتا جتنا کہ میں تجھے یاد کرتا ہوں تو میرے نام کوئی گناہ نہ لکھے جاتے)

اس شعر کو اچھا نہ سمجھنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس پر دینی رنگ کا غلبہ ہے لیکن اس شعر میں نہایت اچھا خیال ظاہر کیا گیا ہے اور ناقد کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اس زمانے کا ہے جب دینی علما تنگ خیال اور متعصب نہیں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ناقد کے لیے شاعر کے ماحول اور اس زمانے کی روایات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۲۔ اگر کسی شاعر کے کلام میں بعض بدوی اور غیر تمدنی امور کا ذکر ہو اور دوسرے شاعر کے کلام میں عنصری یا تمدنی زندگی کے اوصاف بیان کیے گئے ہوں تو ناقد کو نہیں چاہیے کہ وہ حضری خصوصیات والے عصر کو صرف اس لیے فضیلت دے کہ اس میں متمدن اور مہذب معاشرے کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

۳۔ شعر کے الفاظ، معنی، وزن اور قافیہ وغیرہ امور پر بھی اچھی طرح نظر رکھنی ضروری ہے۔ الفاظ کے یہ ضروری ہے کہ وہ فصاحت کے درجے سے گرے ہوئے نہ ہوں۔ کلام کی ترکیب میں باہم مناسب الفاظ استعمال قابلِ تعریف ہوگا۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ شعر کے موضوع سے صرف مناسبت رکھنے والے الفاظ استعمال کیے جائیں مثلاً مدح، ہجو، مرثیہ، غزل، جنگلی واقعات کا بیان اور حماسہ وغیرہ کے موضوعات کے لیے الگ الگ الفاظ کا استعمال ضروری ہے۔ الفاظ کا خیالات کے ساتھ مطابقت رکھنا نہایت ضروری ہے۔ علم معانی اور بیان کی خوبیوں سے شعر کی شان بڑھ جاتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے میں جدت ہونی چاہیے۔ لفظی صنعتوں کا خیال رکھنا، خواہ خیال کچھ کا کچھ ہو جائے قابلِ تعریف نہیں ہے۔ زیادہ مشکل اور غریب الفاظ کا استعمال شعر کو بلاغت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔

معنی کے لحاظ سے شعر کے اندر تعقید نہیں ہونی چاہیے بلکہ شعر میں ایسا خیال باندھنا چاہیے جو تھوڑی فکر کے بعد ذہن میں آجائے۔ نہ یہ کہ شعر ایک چیستان یا معمّا بن جائے۔ خیالات کا اچھوتا پن یا پرانے خیال کو نئے انداز میں پیش کرنا بہرصورت قابلِ تعریف ہے۔

شعر کے وزن کے متعلق یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ بعض بحریں بعض خاص قسم کے مضامین کے لیے موزوں ہوتی ہیں۔ اس لیے شعر کے موضوع کے مطابق مناسب بحر کا انتخاب نہایت ضروری ہے بعض بحروں کی نسبت روانی اور ترنم زیادہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً بحرِ منسرح، مقتضب اور مجتث وغیرہ چنداں مانوس بحریں نہیں۔ ان میں جو شعر کہا جائے اس کی دل کشی میں فرق آجائے گا۔

قافیہ کے سلسلے میں عیوبِ قوافی بالخصوص ان عیوب سے جو عیبِ فاحش کہلاتے ہیں، پرہیز ضروری ہے۔ اگر قافیہ کے ساتھ ردیف کا بھی اضافہ ہوسکے تو شعر زیادہ دل کش ہو جاتا ہے۔ ابنِ قدامہ نے لفظ وزن، قافیہ اور معنی کو باہم ترکیب دے کر شعر کے لیے چار قسمیں معین کی ہیں، جو یہ ہیں: (۱) لفظ اور معنی میں مناسبت (۲) لفظ اور وزن میں مناسبت (۳) معنی اور وزن میں مناسبت (۴) معنی اور قافیہ میں مناسبت۔

ان قسموں کے بیان کے بعد ابن قدامہ نے ان کی مثالیں دے کر متعلقہ اشعار پر رائے زنی کی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عربی تنقید کی اہمیت

یہ بات انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے کہ وہ اچھے بُرے اور کھوٹے کھرے کی تمیز کرنے کی طرف مائل ہو۔ علم ادب میں خواہ نثر ہو یا نظم یہی اصول کار فرما ہے۔ ایک ہی بات کو کہنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ ان مختلف طریقوں کے اچھا یا بُرا ہونے کے مدارج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ دو کلاموں کے درمیان موازنہ کرنے سے ایک کا دوسرے پر افضل ہونا معلوم ہوسکتا ہے۔ اسی کا نام ادب میں النقد یا التنقید ہے۔ اہلِ یونان قدیم ترین لوگ ہیں، جنھوں نے تنقید کے اصول اور قواعد وضع کیے شروع میں ان کی تنقید بالکل سادہ ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں تبدیلیاں آتی گئیں، حتیٰ کہ ارسطو کے زمانے میں تنقید باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کر گئی۔ یونانیوں کے ہاں تنقید کا آغاز سلبی انداز سے ہوا اور ایجابی انداز آہستہ آہستہ وجود میں آیا —— عربی ادب میں بھی تنقید کے ارتقا کا یہی حال ہے۔ شعر و شاعری عربوں میں قدیم زمانے سے رائج تھی۔ اس لیے تنقید بھی اس کے ساتھ ساتھ رائج رہی۔ چناں چہ زمانۂ جاہلیت میں نابغہ ذبیانی کے متعلق روایت ہے کہ لوگ اپنے اشعار اس کے سامنے پیش کرتے اور وہ ان کے اچھا یا بُرا ہونے فیصلہ کیا کرتا تھا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں نابغہ شعر کے وزن کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ عربوں کے ہاں تنقید کے لیے کوئی معین اور متفق علیہ اصول نہیں تھا بلکہ کسی شعر کے اچھا

یا بڑا ہونے کا معیار یہی تھا کہ وہ سننے والے پر کس حد تک اثر کرتا ہے اور اس میں لفظ اور معنی دونوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ جاہلیت میں قبائلی تعصب، عربوں کے میلے اور بادشاہوں اور امرا کے درباروں میں شعر خوانی چند ایسے امور تھے جن کی وجہ سے شاعر معاشرے میں ایک بلند مقام حاصل کر لیتا تھا۔ شعرا میں باہمی مقابلے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دُھن کا وجود بھی پایا جاتا تھا اور شاعروں کے موافق یا مخالف مختلف رائیں دی جاتی تھیں۔ اس طرح شاعر کے ذہن میں اپنے ہم چشم شعرا سے آگے بڑھنے کا جذبہ موجود رہتا تھا۔ اہلِ عرب کا شعر کے ساتھ ذوق فطری چیز تھی اور وہ کوئی شعر سُن کر قیاس کر لیتے تھے کہ یہ کس کا شعر ہے۔ عربوں میں قوتِ حافظہ، ذہانت اور فراست کے اوصاف بھی پائے جاتے تھے لیکن چوں کہ ان کے ہاں لکھنے پڑھنے کا رواج کم تھا، اس لیے ان کے اشعار یا ان پر لوگوں کی آرا تحریر میں نہ لائی جا سکیں۔ البتہ بعض فصیح و بلیغ خطیبوں کے اچھے اچھے جملے اور عمدہ اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ ابو عمرو بن العلا کا قول ہے کہ عربوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا اکثر حصہ ہم تک نہیں پہنچا بلکہ بہت تھوڑی مقدار ہمارے سامنے موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی تنقیدی آرا ہم تک محفوظ طریقے سے نہیں پہنچ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شعرا کے قصائد میں کمی بیشی کے علاوہ بعض قصیدے غلط شاعروں کی طرف منسوب ہو گئے ہیں۔

صدرِ اسلام میں عربی تنقید

اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی تنقیدِ شعر رائج تھی۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں حضرت سکینہ بنت حسین کے ہاں شعر و شاعری کی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور ان میں شاعروں کے کلام پر ادبی تنقید کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں بھی ادیب لوگ جمع ہوتے مختلف شاعروں کے اشعار پر رائے زنی کرتے۔ بنو امیہ کے زمانے میں بھی ایک شاعر کی دوسرے پر فضیلت ہونے کے بارے میں رائے زنی کی جاتی تھی۔ کتبِ ادب میں بتایا گیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے شعرا میں امرؤ القیس، نابغہ، زہیر اور اعشیٰ کے بارے بں اختلاف تھا کہ ان میں سے بہترین شاعر کون ہے۔ اسی طرح بنو امیہ کے زمانے میں جریر، فرزدق ور اخطل کے بارے میں بھی اختلاف تھا۔ پھر عباسی دور میں ابو نواس، ابو العتاہیہ، ابن المعتز، ن الرومی، مسلم بن ولید، ابو تمام اور البحتری وغیرہ کے متعلق بھی اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ می نے اپنی کتاب کے مقدمے میں اموی شاعری کے متعلق بعض تنقیدی جملے لکھے ہیں۔ اس کے ر عباسی دور میں ابن قتیبہ تنقید کے لیے بالخصوص قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں جاحظ اور ابن عبد ربہ

کی کتابوں میں بھی کچھ نہ کچھ تنقیدی مواد موجود ہے۔ ان کے بعد قدامہ بن جعفر نے تنقید کے فن پر نقد الشعر کے نام سے ایک خاص کتاب لکھی جو شروع سے آخر تک تنقید ہی پر مشتمل ہے۔ یہ اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ قدامہ کے بعد آمدی نے ابو تمام اور بحتری کا موازنہ لکھا جو اگرچہ دو خاص شاعروں کے درمیان مقابلے پر مشتمل ہے لیکن اس میں تنقید کے بعض عام اصول بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح علی بن عبدالعزیز جرجانی نے ایک کتاب لکھی جس میں متنبی کی حمایت کی۔ اس کتاب میں بھی تنقید کے متعلق عام بحثیں پائی جاتی ہیں۔ ابو العلا المعری کے رسالہ الغفران میں بھی تنقیدی مواد مل سکتا ہے۔

تاریخِ تنقید

عربی تنقید کی تاریخ لکھنے والوں نے محمد بن سلاّم الجمحی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اس سلسلے میں قدم اٹھایا۔ اس نے شعرا کو زمان اور مکان کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں تقسیم کیا اور ان کے کلام پر تنقید کی۔ اس کی کتاب طبقات فحول الشعرا اب بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس سے پہلے عربی تنقید صرف زبانی نقل و روایت تک محدود تھی۔ اسی لیے تنقید کی تاریخ لکھنے والوں نے ان زبانی روایات کو نظر انداز کر کے الجمحی کو تاریخ تنقید کا بانی قرار دیا ہے۔ تاہم سبع معلقات کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ تنقید کے جراثیم زمانۂ جاہلیت میں بھی پلئے جاتے تھے، لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے وہ ایک سلبی انداز اور اختصار کا پہلو مدِ نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنے اشعار بلند آواز سے گا کر پڑھا کرتے تھے، جس سے شعر کی سُر اور وزن کے درست یا غلط ہونے کا اندازہ ہو سکتا تھا۔

مندرجہ بالا تنقیدی مواد میں قدامہ بن جعفر کی کتاب فن کے لحاظ سے نہایت ممتاز ہے لیکن اس کو تنقید پر حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ عباسی دور کے آخر میں ابن رشیق نے کتاب العمدہ لکھ کر ایک نہایت اچھا ذخیرہ اس فن پر مہیا کیا۔ اس کتاب میں اس نے اپنے سے پہلے تمام تنقیدی مواد کو چھان پھٹک کر جمع کر دیا اور اپنی طرف سے بھی کئی ایک اصول کا اضافہ کیا۔ ابنِ رشیق کے ایک ہم عصر ادیب اور شاعر محمد بن ابی سعید ابن شرف القیروانی نے العمدہ کے مقابلے میں رسائل الانتقاد لکھے، جس میں نہ صرف زمانۂ جاہلیت بلکہ بعد کے شعرا پر بھی تنقید کی۔

تاہم العمدہ کے مقابلے میں اس کتاب کا درجہ کم ہے۔

یہ تو تھیں خاص فنی کتابیں، ان کے علاوہ موجودہ دور میں بھی بعض اچھی اچھی کتابیں فنِ تنقید پر شائع ہوئیں۔

چناں چہ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ میں جا بجا تنقیدی مواد ملتا ہے۔ ابن المعتز کے طبقات الشعرا میں بھی بعض مقامات پر تنقیدی آرا پائی جاتی ہیں۔ محمد بن احمد بن طباطبا العلوی کی کتاب عیار الشعر بھی خاص اس فن پر لکھی گئی ہے۔ اسی طرح اسامہ بن منقذ کی کتاب البدیع فی نقد الشعر بھی اس فن پر اہم کتاب ہے۔ متأخرین میں شوقی ضیف کی کتاب الفن ومذاھبہ فی الشعر العربی اور دوسری کتاب فی النقد العربی، سید قطب کی کتاب النقد الادبی اور الدکتور محمد مندور کی کتاب النقد المنہجی عند العرب، عبد العظیم قناوی کی کتاب الوصف فی الشعر العربی، ڈاکٹر زکی مبارک کی کتاب الموازنہ بین الشعراء وغیرہ نہایت اہم کتابیں ہیں۔

اسلام اور عدل و احسان

مولانا رئیس احمد جعفری

اسلام کے دشمنوں نے بھی باور کرایا اور ناواقف احوال مسلمانوں نے بھی سمجھا ہے کہ اسلام تشدد کا مذہب ہے، اسلام کا خدا جبار و قہار ہے۔ اسلام کے عبادات، معتقدات اور معمولات یکسر "عسر" یعنی سختی پر مبنی ہیں۔ اس تاریخی غلط بیانی کی تردید تاریخی شواہد اور قرآن و حدیث کی روشنی میں بڑے عمدہ پیرایہ میں کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام رحم، عدل، احسان اور محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کا خدا رحمان و رحیم بھی ہے، غفار و تواب بھی ہے۔ ان حقائق کا ایک مرتبہ مطالعہ کر لینے کے بعد وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں جو اسلام کے دشمنوں یا دوست نما دشمنوں نے اس کے بارے میں پھیلائی ہیں۔ کتاب میں کوئی دعویٰ بھی بغیر سند اور حوالے کے نہیں کیا گیا۔ صفحات ۳۹۱ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

ترجمہ : ڈاکٹر محمد طاہر ملک

فتنۂ عظمیٰ کی تاریخ

("THE DATE OF THE GREAT FITNA" by Prof. G.H.A. JUYNBOLL)

جب پروفیسر شاخت (Schacht) کی کتاب "قانونِ محمدی کا سرچشمہ" (The Origins of Muhammadan Jurisprudence) ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تو بہت جلد اسے عام مقبولیت حاصل ہوگئی، لیکن کسی اسکالر نے اس کتاب میں مہیا کردہ تمام مواد کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا، اس لیے کہ کتاب مجموعی طور پر اتنے حوالوں پر مشتمل ہے کہ ان سب کا تنقیدی جائزہ لینا کسی ایک اسکالر کے لیے دشوار ہے، اور نتیجتاً صرف چند حضرات نے کچھ سطحی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، مثلاً N.J. Coulson؛ J.W. Fuck اور A. Guillami چند نکات کو زیرِ بحث لائے ہیں۔

نظریات میں سے ایک نظریہ جسے شاخت نے قائم کیا ہے، اس کا تعلق ایک سیاسی واقعہ (شہادت) سے ہے، جسے اصطلاح میں "الفتنہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ شاخت کے اس نظریے کو مقبولیت حاصل نہ ہوئی مگر اس کی بھرپور تردید بھی نہ کی گئی۔ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اس نظریے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ زیرِ بحث مقالے کا موضوع اسی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔

عام طور پر محققین اب تک اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی ۳۵ھ (۶۵۶ء) میں شہادت کے بعد عالمِ اسلام ایک ایسے دور میں داخل ہوا جس پر فتنے کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی بیان کردہ روایت ہے جس کو مغربی علماء نے بلا کسی تردد کے قبول کیا ہے۔ مثلاً ولہوزن (Wellhausen) نے اپنی کتاب "عرب حکومت اور اس کا زوال" (Das arabische Reich und sein Sturz) میں دنیا کو "لفظ فتنہ" سے متعارف کروایا تو اس نے کوئی عربی ماخذ نہیں بیان کیا۔ میں نے بھی اس کے بعد کی کتابوں میں کوئی ایسا سراغ نہیں پایا جو بتا سکتا ہو کہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف ہے۔ ہاں، البتہ شاخت نے ایک نظریہ پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ اموی خلیفہ ولید بن یزید کے ۱۲۶ھ (۷۴۴ء) میں قتل ہونے کے بعد اسلام فتنے کے دور میں داخل ہوا، بالفاظِ دیگر اس تاریخ (۳۵ھ ۶۵۶ء) کے ۸۸ سال بعد جو عموماً مغربی اور مشرقی علماء کی جانب سے دورِ فتنہ کی بنیادی

تاریخ مانی جاتی رہی ہے۔

"اسناد" کے استعمال کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے شاخت (اپنی کتاب کے ص ۳۶ پر) رقم طراز ہے:

(۱) ابن سیرین تابعی کا بیان ہے کہ اسناد کا مطالبہ اور اس کا اہتمام "فتنہ" خانہ جنگی کے وقت سے شروع ہوا۔ [یہ وہ دور تھا] جب لوگوں کا اعتبار جاتا رہا تھا، تاآں کہ ان کو پرکھ نہ لیا جائے۔"

(۲) "... اموی حکومت کے آخری دور میں خانہ جنگی خلیفہ ولید بن یزید کے ۱۲۶ھ میں قتل سے شروع ہوئی، اس واقعہ تک وہ زمانہ ہے جس کو اصطلاحاً بہتر دور کہا جاتا ہے، اس لیے کہ اب تک سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جاتی رہی تھی۔"

(۳) "ابن سیرین کی وفات ۱۱۰ھ میں مانی جاتی ہے۔"

(۴) "اس لیے ابن سیرین کی طرف جو بیان منسوب ہے وہ غلط ہے، بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اسناد" کا استعمال دوسری صدی ہجری کی ابتدا کی بات ہے۔"

شاخت نے Horovitz کی اس رائے کی بھی تردید کی ہے کہ اسناد کا استعمال پہلی صدی ہجری کی آخری تہائی میں شروع ہو چکا تھا۔

مندرجہ بالا صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاخت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں پہلا اہم تغیر جسے "فتنہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ ولید بن یزید کے قتل کا نتیجہ تھا۔ شہادتِ عثمانؓ کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی یا اس کے بعد جو اہم واقعات ہوئے اسے اس عہد میں "فتنہ" کا نام نہیں دیا گیا۔ شاخت کی کتاب مذکور کا ایک اور حوالہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ولید کے قتل سے جو بحرانی کیفیت پیدا ہوئی تھی اسی کو شاخت عظیم فتنہ قرار دیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۷۱)

اوزاعی [...] اس بات کے قائل ہیں کہ عمرؓ اور عثمانؓ (اور اس سے آگے یعنی خانہ جنگی اور ولید بن یزید کے ۱۲۶ھ میں قتل ہونے ۔ یہ الفاظ مقالہ نگار کے ہیں) تک مسلمان بغیر رکاوٹ کے اپنے اعمال بجالاتے رہے۔ شاخت نے اوزاعی کے جو اقوال نقل کیے ہیں، وہ یہ ہیں: (۱) "... اس فتنے تک جو ولید بن یزید کے قتل کے بعد پیدا ہوا، مسلمانوں نے کبھی یہ (طریقہ) ترک نہیں کیا..."

(۲) "گزشتہ زمانوں میں اس فتنے تک جو ولید بن یزید کے قتل کے بعد پیدا ہوا، مسلم علما [ایک

خاص طریقہ، اتباع] کے عادی تھے۔"

اوزاعی کے بیانات کا ابنِ سیرین سے منسوب بالا روایت کا مقابلہ کرنے سے پہلے جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ اس کی تاریخی صداقت کا پتا چل سکے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاخت نے اوزاعی کے بیان کو صحیح تسلیم کیا ہے اور ابن سیرین سے منسوب روایت کو اوزاعی کے بیان کی روشنی میں جعلی قرار دیا ہے اور رد کر دیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اوزاعی ہی کا بیان جعلی قرار دیا جا سکتا ہے جس کو کسی شخص نے بعد میں رواج دے دیا ہے، اس لیے کہ تاریخ کا تعین یا تو صحیح ہے اور اسی بنا پر تاریخی اعتبار سے اس کا تعین ۱۲۶ھ (۴۴-۷۴۳ء) کے طور پر بیان کیا گیا ہے، یا غلط ہے، اور غلط ہونے کی صورت میں بعد کے اذہان کی پیداوار ہے۔

بہرحال، چوں کہ زیرِ بحث جو موضوع ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی پہلی خانہ جنگی جس کو "فتنہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ۱۲۶ھ میں شروع ہوئی یا اس سے پہلے، اس لیے اس بات کے پیشِ نظر اوزاعی کا بیان خارج از بحث ہے۔

شاخت کے اس مفروضے کو کہ ابن سیرین کی طرف جو روایت منسوب ہے وہ جعلی ہے، صحیح مان لینے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص کا کیا مقصد تھا جس نے ابنِ سیرین کی روایت کی تشہیر کی؟ کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ ابن سیرین کے حوالے سے اس بات کی شہادت مل جائے کہ اسناد کا خصوصی استعمال "فتنہ" (عثمانؓ کی شہادت کے) وقوع کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا، (اور اس کے علاوہ کیا مقصد ہو سکتا ہے؟)

شاخت نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فنِ تنقیدِ حدیث کے ارتقا میں ایک خاص ذہنیت جو کام کرتی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ روایت (سند) کو آہستہ آہستہ پیچھے (اوپر کے راوی تک) پہنچایا جائے۔

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان "تاریخوں" کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے، جن پر تنقیدِ حدیث کے معیار کی بنیاد مانی جاتی ہے۔ اسناد کا استعمال تنقیدِ حدیث کا ایک معیار ہے ـــ مسلم علما اس بات پر متفق ہیں کہ اسناد کی چھان بین کا (جو تنقیدِ حدیث کا ایک معیار ہے) استعمال ۳۵ھ میں ہونے والے واقعے کے

بعد ہی شروع ہوگیا تھا، لیکن اس تنقید سے صحابۂ کرام مستثنیٰ تھے، اس لیے کہ وہ سب کے سب عدول اور شک و شبہ سے بالاتر تھے۔ لیکن دوسری طرف یہ ثبوت بھی ہے کہ ابن قتیبہ (۲۷۶ھ/۸۸۴ء) جیسا عالم اس اصول سے ناواقف تھا کہ تمام صحابہ کی صداقت و عدالت مسلم الثبوت ہے، اسی طرح امام مسلم نے بھی اس اصول کو اپنی کتاب کے طویل مقدمے میں بیان نہیں کیا ہے۔ سب سے پہلا ماخذ جس میں اس اصول کا ذکر ملتا ہے وہ ہے کتاب الجرح والتعدیل مصنفہ ابن ابی حاتم الرازی جن کا انتقال ۳۲۷ھ (۹۳۸ء) میں ولید بن یزید کے قتل کے ۱۹۴ سال اور عثمانؓ کی شہادت کے ۲۸۲ سال بعد ہوا۔ بالفاظ دیگر تنقیدِ حدیث کا ایک خاص اصول سیکڑوں سال بعد وجود میں آیا جو تنقیدِ حدیث پر سب سے اوّل کتاب میں مذکور ہے —— اس موقع پر مندرجہ ذیل سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں:

۱۔ کیا دونوں یعنی اوزاعی اور ابن سیرین کی رپورٹ میں جو لفظ "فتنہ" استعمال ہوا ہے، اس سے مراد "خانہ جنگی" ہے یا "اضطراب و ہیجان"؟

۲۔ کیا لفظ "فتنہ" ہمیشہ انہی دونوں معنوں کو ظاہر کرتا ہے، اور

۳۔ ابن سیرین کے بیان میں لفظ "فتنہ" سے کون سی "خانہ جنگی" مراد ہے۔

قرآن میں ۳۴ بار لفظ "فتنہ" آیا ہے جو صرف مصیبت و پریشانی، برائی کی طرف مائل (کرنے والا) یا آزمائش کے معنوں میں مختلف طریقوں سے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً کفر، امارت و دولت، اولاد، تعذیب، سزا اور قتل۔

میرا نکتۂ نظر یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں لفظ "فتنہ" اس "خانہ جنگی" کے لیے استعمال نہیں ہوا تھا جو ابتدائے اسلام میں واقع ہوا تھا، بلکہ خانہ جنگی کے معنی میں بعد میں مستعمل ہوا، اور تعجب کی بات ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں مرتب کردہ لغت "لسان العرب" میں عثمانؓ کی شہادت کے بعد پیدا ہونے والے ہنگامی حالت کو لفظ "فتنہ" کی بحث میں صراحتاً ذکر نہیں کیا گیا ہے "فتنے" کی جو تعریف اس کتاب میں ہے وہ یہ ہے:

"ما يقع بين الناس من القتال" یا "القتل والحرب والاختلاف على الذى يكون بين الفرق المسلمين اذا تحزبوا"

اس طرح زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعریفیں "خانہ جنگی" کے معنی کے قریب ہیں۔

بہرحال ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ "فتنے" کا استعمال عثمانؓ کے زمانے میں ہونے والے ہنگامی حالات کے لیے کس طرح ہونے لگا، اور اس بات کی نشان دہی کی کوشش کی جائے گی کہ سب سے پہلے کس نے استعمال کیا، اس لیے ہم مصنفین کا ذکر ان کی موت کے اعتبار سے ترتیب وار کریں گے تاکہ صحتِ بیان کا اندازہ لگایا جا سکے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جس میں اس کا تعین ناممکن ہے کہ یہ بات کس زمانے میں کہی گئی۔ بہرحال اس سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ یہ بیان مصنف کی موت کے بعد کا نہیں ہو سکتا۔

سب سے پرانی کتاب جو طبع ہو چکی ہے وہ ابنِ سعد (۲۳۰ھ / ۸۴۵ء) کی "الطبقات الکبریٰ" ہے۔ ابن سعد نے عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں دو دفعہ لفظ "فتنہ" استعمال کیا ہے۔

۱۔ "... وکان اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الذین خذلوہ کرھوا الفتنۃ وظنوا ان الامر لا یبلغ قتلہ ..."

عبارت سے ظاہر ہے کہ "فتنہ" عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہونے والی "خانہ جنگی" کو نہیں بتاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سلسلۂ کلام یہ بتاتا ہے کہ جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ شہادتِ عثمان سے پہلے کا ہے۔ مختلف توجیہات تو اس عبارت کی ہو سکتی ہیں، لیکن یہ بات کہنی مشکل ہے کہ موزوں ترین کون سے معنی ہیں۔ اس کے علاوہ اس بیان کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشین گوئی ہے جو ابو داؤد میں مذکور ہے۔

ابنِ سعد کا دوسرا بیان جس میں "فتنہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ ہے:

۲۔ اللھم احصھم عددا واقتلھم بددا، ولا تبق منھم احدا، قال مجاھد فقتل اللہ منھم من قتل فی الفتنۃ۔

اس جملے میں "فتنے" سے مراد عثمانؓ کے قتل کے بعد ہونے والی "خانہ جنگی" ہے۔ یہ بیان الواقدی (۲۰۷ / ۸۲۳ء) کے متبائن بیان کا خلاصہ ہے جیسا کہ الطبری نے دیا ہے، جس میں محاصرین اپنی کارروائی کو مبنی برانصاف قرار دیتے ہوئے عثمانؓ سے دست برداری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس بیان میں "فتنے" کا لفظ استعمال ہوا ہے، تفصیل آگے ۱۵ نمبر میں ملاحظہ ہو۔

یہ دونوں بیانات عباسی دور کے معلوم ہوتے ہیں، اس لیے کہ یہ ناممکن ہے کہ اموی دور میں کوئی کتاب لکھی جائے اور اس میں عثمانؓ کے قاتلین کا مطالبہ صحیح ہونے کا ذکر ہو۔ الطبری کے مختلف بیانات

اس کا اظہار کرتے ہیں) اگرچہ یہاں فتنے سے مراد خانہ جنگی ہے، لیکن اغلب امید یہ ہے کہ اس کا استعمال زوال بنی امیہ یعنی ۱۳۲ھ کے بعد ہوا۔ ایک نکتہ یہ وضاحت طلب ہے کہ ابن سعد کی روایت کے اسناد میں عمر بن عاصم الکلابی، حفص بن ابی بکر، ہیاج بن سری اور مجاہد ہیں۔ حفص بن ابی بکر اور ہیاج بن سری کا رجال کی کسی کتاب میں ذکر نہیں ہے۔ مصعب بن عبداللہ بن مصعب الزبیری (۲۳۶ھ / ۸۵۱ء) کی کتاب "نسب القریش" میں فتنے کی جمع "فتن" کا ذکر ملتا ہے۔

۳ ــــ قام ابوھریرۃ فقال اشھد لسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول تکون بعدی فتن واحداث او امور واحداث ... قلنا فاین المنجا منھا یا رسول اللہ قال الی الامین وحزبہ واشار الی عثمان۔

اس حدیث کے متن میں اختلاف ہے، لفظ "فتن" کا متبادل "امور" کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ اس سے مقصد "پریشان کن حالات" ہیں۔ مزید یہ کہ پیشین گوئی سے متعلق احادیثِ موضوعہ میں سے یہ بھی ایک ہے ــــ دوسرا ماخذ خلیفہ ابن خیاط (۲۴۰ھ / ۸۵۴ء) کی تاریخ ہے، لیکن شہادتِ عثمان کے بیان کے سلسلے میں مصنف نے "فتنے" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے ــــ مسندِ احمد بن حنبل (۲۴۱ھ / ۸۵۵ء) میں شہادتِ عثمانؓ کے سلسلے میں متعدد بار لفظ فتنہ کا استعمال پایا جاتا ہے، مثلاً

۴ ــ قتل عثمانؓ سنۃ خمس وثلاثین، فکانت الفتنۃ خمس سنین منھا اربعۃ اشھر للحسن۔

کتاب مذکور کو ایڈٹ کرنے والے احمد۔ ایم شاکر نے اس حدیث کے اسناد کو منقطع قرار دیا ہے، اس لیے کہ سب سے اوّل سند عبداللہ بن محمد بن عقیل ہے جن کی وفات ۱۴۰ھ میں یا اس کے بعد ہوئی، تو یہ شہادتِ عثمانؓ کے عینی شاہد کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کی بحث کوئی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسناد صحیح ہے یا جعلی؟ اگر پہلی صورت ہے تو پھر بقول ابن حجر راوی کمزور ہے، اور دوسری صورت میں تو حدیث بہرحال مشکوک ہو ہی جاتی ہے۔ احمد شاکر نے مزید کہا ہے کہ "چار" کی جگہ "چھ" ہونا چاہیے۔

۵ ــ قال سعد بن ابی وقاص عند فتنۃ عثمان بن عفان اشھد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انھا ستکون فتنۃ القاعد فیھا خیر من القائم والقائم خیر من

الماشی ...."

یہ حدیث بھی موضوع ہے جس کو سیاسی وجوہ کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بعد کی تاریخ میں شامل کر دیا گیا۔

جاحظ (۲۵۵ھ / ۸۶۸ء) نے اپنی کتاب "العثمانیہ" میں "فتنے" کا استعمال متعدد جملوں میں کیا ہے:

۶ ـ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ستکون فتنۃ، ھذا فیھا یومئذ علی الحق واومأ الی رجل مقنع، فکشف عن رأسہ فاذا ھو عثمان۔

حدیثِ سابق کی طرح یہ بھی ایک پیشین گوئی ہے اور ظن غالب ہے کہ یہ بھی موضوع حدیث ہے۔

۷ ـ قال سعید بن زید بن عمرو بن نفیل فتنۃ عمیاء یخبط اھلھا۔

یہ روایت اتنی مختصر ہے کہ اس میں لفظ "فتنۃ" کا صحیح مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث کا یہ متن Concordance میں مذکور نہیں ہے، اس بات کے پیشِ نظر کہ یہ صرف جاحظ ہی ہے جو اس کو بیان کرتا ہے، اس کو مشکوک بنا دیتا ہے، اس لیے کہ جاحظ نے کوئی سند بیان نہیں کی ہے۔ ہاں "فتنۂ عمیاء" کے لفظ کے ساتھ ابوداؤد اور مسند احمد بن حنبل میں روایت ضرور ہے جو پیشین گوئی کی قسم سے معلوم ہوتی ہے۔

۸ ـ وزعم ابن سیرین والشعبی انھما قالا وقعت الفتنۃ بالمدینۃ ... فسمیا حرب علی وطلحۃ والزبیر وصفین فتنۃ۔

جاحظ جب یہ کہتا ہے کہ "راویوں نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے کہا ..." تو گویا جاحظ خود اس کے متعلق مطمئن نہیں، اور اس نے اسناد کو حذف کر دیا، اگرچہ ابن سیرین اور الشعبی (۱۰۵ھ / ۷۲۳ء کے قریب فوت ہوئے) معتبر راوی ہیں، لیکن ان کا یہ بیان مذکورہ بالا اس روایت کے جز کا "الحاقی" حصہ معلوم ہوتا ہے جس میں ابنِ سیرین نے استعمال اسناد سے گفتگو کی ہے۔ "الحاقی" سے مراد ہے کہ بیانات کے وہ حصے جو کسی خاص حدیث یا بیان کو مضبوط بنانے کے لیے مستعمل ہوتے ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایک معجزے کو بیان کرنے والی حدیث میں الحاقی حصہ اس طرح پایا جاتا ہے کہ اس کو بیان کرنے کے لیے مختلف قسم کے حالات و کیفیات کو بیان کیا جاتا ہے، جیسے یہ کہ کون کون اس وقت موجود تھا، سامعین کا کیا تاثر تھا، بعض اہم صحابہ کی کیا کیفیت تھی، اس سے مقصد

صرف یہ ہوتا ہے کہ خاص واقعہ کی اہمیت ظاہر کی جائے۔

ابن اعثم (۲۵۲ / ۸۶۶ء کے بعد) نے ایک جملہ بیان کیا ہے جس میں علیؓ اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

۹- وان الفتنة كالنار كلما اسعرت ازدادت۔

اس کے مقابلے میں الطبری میں بھی ایک جملہ ہے جس میں "فتنہ" بغیر حرف تعریف استعمال ہوا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ "فتنہ" فلسفیانہ انداز میں استعمال ہوا ہے۔

۱۰- اذا نحن بايعنا عليا فحسبنا ابوحسن مما نخاف من الفتن

لفظ "فتنہ" کا استعمال یقینی طور پر شاعرانہ تخیل ہے یعنی بلیات، سختیاں۔

احمد بن حنبل کے بعد ایک بڑی جامع حدیث کا ذکر کیا جائے گا یعنی البخاری جن کا انتقال ۲۵۶ھ/ ۸۷۰ء میں ہوا۔ صحیح البخاری میں ہم مختلف مقامات پر عثمانؓ کے سلسلے میں لفظ "فتنہ" کا استعمال پاتے ہیں۔

۱۱- قال الليث عن يحيى [بن سعيد] عن سعيد بن المسيب وقعت الفتنة الاولى يعني مقتل عثمان، فلم يبق من اصحاب بدر احداً ثم وقعت الفتنة الثانية يعني الحرة ... ثم وقعت الثالثة .....؟

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس حدیث میں "فتنے" سے مراد "خانہ جنگی" ہے، لیکن یہ حدیث سعید بن المسیب کا ایک تشریحی بیان ہے جس کو انھوں نے بطور خود اس حدیث کے ساتھ منسلک کر دیا ہے جس میں جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اور اس طرح واضح طور پر موضوع ہے، مزید برآں نہ صرف یہ کہ سعید بن المسیب (جن کا انتقال ۹۳ - ۱۰۰ھ/ ۷۱۲ - ۷۱۸ء کے درمیان ہوا) مختلف حدیثوں میں جعلی سند کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، بلکہ یہ کہ متنِ حدیث بذاتِ خود بے بنیاد ہے، اس لیے کہ عثمانؓ کی شہادت کے وقت مختلف صحابہ کرام زندہ تھے جنھوں نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا تھا، مثلاً علیؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور زبیرؓ۔ اس لیے اس بیان کو بھی من گھڑت احادیث کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے، اور ان تشریحات کو بھی جن میں یہ بیان کیا جائے کہ ایک خاص شخص فلاں موقعے یا وقت تک زندہ تھے یا مر گئے تھے۔

باقی ماندہ دوسرے قدیم مراجع جن سے استفادہ کیا گیا ہے وہ زیادہ تر کتب تاریخ کے متون ہیں۔

ابن قتیبہ (۲۷۰ھ/ ۸۸۴ء) نے "کتاب المعارف" میں عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں "فتنہ" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، اسی طرح نہ تو "عیون الاخبار" میں اور نہ "تاویل مختلف الاحادیث" میں۔

بلاذری (۲۷۹ھ/ ۸۹۲ء) میں ایک بیان ہے جس میں لفظ "فتنہ" استعمال ہوا ہے۔

۱۲- لما قتل عثمان، قال ابوموسی هذه مصیبة من مصیبات الفتن

یہاں لفظ "فتنہ" کا استعمال شاعرانہ انداز میں ہوا ہے، اس سے خانہ جنگی مراد لی جاسکتی ہے، لیکن بطور جمع استعمال کرنا "آزمائش و مصائب" کے لیے زیادہ موزوں نظر آتا ہے بہ نسبت خانہ جنگی کے۔

دینوری (۲۸۲ھ/ ۸۹۵ء) ایک بار لفظ "فتنہ" علیؓ کے سلسلے میں ذکر کرتا ہے۔

۱۳- قال معاویة انه مالأعلی قتل عثمان واظهر الفتنة۔

کتبِ تواریخ کے کسی اور مصنف کے مقابلے میں دینوری کے بیان کردہ واقعات کو تاریخی حیثیت سے قبول کرنا بڑا ہی مشکل ہے، اس لیے کہ مصادر کو بیان کرنے میں آزادانہ رویہ اور ترک اسناد (اگر ایسا کرنا کوئی اہمیت رکھتا ہے) کی بنا پر کتاب مذکور ایک تاریخی ماخذ کی حیثیت سے زیادہ ادبی کتاب ہو کر رہ گئی ہے۔ بہرحال معاویہؓ کا علیؓ کے سلسلے میں کہنا مشکل ہی سے قابلِ یقین ہوسکتا ہے۔

یعقوبی (۲۸۴ھ/ ۸۹۷ء) نے اپنی کتاب میں شہادتِ عثمان کے سلسلے میں لفظ "فتنہ" استعمال نہیں کیا ہے۔

طبری (۲۸۴ھ/ ۸۹۷ء) نے دو موقعوں پر لفظ "فتنہ" استعمال کیا ہے۔

۱۴- وخوّتهم بالفتنة واعلمتهم ان فی قتله اختلافا — اس میں لفظ "فتنہ" سے مراد خانہ جنگی نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ عثمانؓ کی شہادت نہیں ہوئی تھی۔ اگر "خانہ جنگی" ہی مراد لی جائے تو پھر یہ بھی ایک قسم کی پیشین گوئی ہونے کی بنا پر غیر مستند ہوجاتی ہے۔

۱۵- انا نحن قتلناك من البلاء فانه لا ینبغی ترك اقامة الحق علیك مخالفة الفتنة عاما قابلا۔

یہاں بھی لفظ "فتنہ" کا استعمال شہادتِ عثمانؓ سے پہلے کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اس بیان کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے نمبر ۲ بالا ملاحظہ ہو — اور آخر میں دو عیسائی مورخین کا قول نقل کرتے ہیں یعنی Bitriq Said Eutichius (۳۲۸ھ/ ۹۳۹ء) اور

Agapius Mahbub al-Manbiji (۳۵۰ھ/۹۶۱ء) ان دونوں کی کتابوں میں لفظ "فتنہ" کا استعمال عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں نہیں ہوا ہے۔ مسلم مورخ المسعودی بھی لفظ فتنہ کا استعمال نہیں کرتا ہے۔

بعد کی کتابوں میں "فتنہ" کا لفظ "عثمانؓ کی شہادت کے بعد خانہ جنگی" کے لیے بہ کثرت استعمال ہوتا نظر آتا ہے، لیکن بعد کے عیسائی مؤرخین مثلاً المکین (۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) اور Butrus b. al-Rahib (۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء) کی کتابوں میں "فتنہ" بہ معنی "خانہ جنگی بعد از قتل عثمان" استعمال نہیں ہوا ہے۔

مذکورہ بالا تمام اقتباسات جن میں لفظ "فتنہ" استعمال ہوا ہے ان کے متعلق میں پرزور طریقہ پہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے ایک میں بھی اس وقت تک وجود میں نہیں آیا تھا جیسا کہ ان مصادر نے بیان کیا ہے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا استعمال ان مصنفین کی تاریخ وفات کے قریب ہوا جب کہ دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ عیسائی مصادر اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے، اس لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ لفظ "فتنہ" بہ معنی "خانہ جنگی بعد از قتل عثمان" کا استعمال کسی صورت میں بھی دوسری صدی ہجری کے آخری نصف سے پہلے نہیں ہوا، اور یہ کہ تمام بیانات اس وقت تک وجود میں نہیں آئے جب تک عباسیوں کا دور شروع نہ ہوا۔

یہ بات یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اگر لفظ "فتنہ" بمعنی "خانہ جنگی بعد از شہادتِ عثمان" کے استعمال کا مقابلہ اسی لفظ "فتنہ" سے کریں جو ابتدائی مصادر میں دوسرے معنوں میں مستعمل ہوتے رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں اس لفظ سے اکثر طور پر اموی خلیفہ کے خلاف عبداللہ بن الزبیر کی بغاوت مراد ہے، اگرچہ اس کے علاوہ بھی اس سے قبل اور بعد کے ہنگاموں کو فتنہ کہا گیا ہے۔ ان کا بیان حسبِ ذیل ہے:

سب سے اوّلین مآخذ عبدالحمید الکاتب (۱۳۲ھ) کا "الرسالۃ" ہے، مصنف نے لفظ فتنہ کا جو استعمال کیا ہے سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کی دو تعبیر ممکن ہے، یا تو ضحاک بن قیس (۱۲۷ھ/۷۴۵ء) کا علم بغاوت مراد ہے اور اسی طرح ولید بن یزید کے زمانہ کا واقعہ بھی یا دوسری صورت یہ ہے کہ عام طوائف الملوکی کو بتلاتا ہے، یہ تحریر ۱۲۹ھ کی ہے۔

ابن المقفع (۱۳۹ھ/۷۵۶ء) نے "فتنہ" کی جمع "فتن" استعمال کیا ہے، جس کے معنی مصائب و

بلیات ہیں، لیکن نہ تو کسی خاص بغاوت اور نہ کسی اضطرابی حالت کو بیان کرتا ہے، جس کو فتنہ سمجھا جائے۔ اسی طرح ابوداؤد الطیالسی (۲۰۳ھ/۸۱۸ء) نے بھی اپنی مسند میں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

ابن سعد نے دو دفعہ صراحتاً بہ الفاظ "فتنہ ولید بن یزید" تو لکھا ہے لیکن کسی دوسری بغاوت یا ہنگامی حالت کو فتنہ نہیں کہا ہے، بلکہ ابن الزبیر پر تو ایک پیراگراف بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابن سعد نے ابن الزبیر کے معاملے میں معاندانہ رویہ اختیار کیا ہو، اس لیے کہ عبداللہ بن الزبیر کے دوسرے بھائیوں کا ذکر خصوصی طور پر ابن سعد نے کیا ہے۔ عبداللہ بن الزبیر کے واقعات کو وہ فتنہ سے یاد نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے "ایام" یا "زمن" استعمال کرتا ہے۔ مصعب الزبیری کا ایک شعر ہے:

الیٰ اریٰ فتنۃ تغلی مراجلها فالملک بعد ابی لیلی لمن غلبا

"ابی لیلی" سے مراد معاویہ ثانی (۶۴ھ/۶۸۳ء) ہے — اس شعر میں لفظ "فتنہ" غالباً ابن الزبیر کی بغاوت کے دوسرے مرحلے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ابن سعد کی طرح مصعب نے بھی "فتنہ یزید بن ولید" کا استعمال صرف اظہار زمانہ کے لیے کیا ہے۔

خلیفہ بن خیاط نے عثمانؓ کے واقعات کے سلسلے میں لفظ "فتنہ" کا استعمال تو نہیں کیا ہے لیکن جب ولید بن یزید کے آخری ایام کا ذکر کرتا ہے تو ۱۲۷ھ کے واقعات میں لکھتا ہے: فیھا وقعت الفتنۃ" اور یہی ابن خیاط اس سے پہلے کے ایک واقعہ کے متعلق بھی لفظ "فتنہ" استعمال کرتا اور لکھتا ہے کہ "ایک شخص عبدالرحمٰن بن ادینہ العبدی یزید اوّل کے تحت بصرہ کا قاضی تھا۔ یہاں تک کہ "فتنہ" اٹھ کھڑا ہوا"۔ بعد کی ایک روایت کے مطابق اس قاضی کا انتقال ۸۹ھ/۷۰۸ء میں ہوا، لیکن بقول ابن حجر ۷۵ھ/۶۹۴ء یا ۹۵ھ/۷۱۴ء سے کچھ پہلے، اور یہ کہ اپنی حیات تک عہدۂ قضا پر فائز رہا، بہر حال یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ اس عبارت میں فتنہ سے کون سا واقعہ مراد ہے۔ ابن الزبیر کی بغاوت بھی ہو سکتی ہے، یا ایک بعید خیال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد عبدالرحمٰن بن محمد اشعث ۸۵ھ/۷۰۴ء) کی بغاوت بھی ہو سکتی ہے۔

جاحظ نے لفظ "فتنہ" ایک خاص واقعہ کے تعلق سے استعمال کیا ہے:

وکان مُرّۃ یقول لما قتل عثمان حمدت اللہ الا اکون دخلت فی شیٔ من قتلہ

فصلیت مائة رکعة ، فلما وقع الجمل وصفین حمدت الله الا اکون دخلت فی شئ
من تلك الحروب وزدت مائة رکعة فلما کانت النهروان حمدت الله اذ لم اشهده
وزدت مائة رکعة فلما کانت فتنه ابن الزبیر حمدت الله ...“

اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ بیان صحیح ہے ، لیکن جو چیز عیاں ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ” فتنة “ ان حالات کے لیے استعمال ہوا ہے جو عبداللہ بن الزبیر کی وجہ سے ۶۴ھ/۸۳-۶۸۲ء) میں پیدا ہوئے تھے یعنی عثمانؓ کی شہادت کے ۲۷ سال بعد - اس طرح جاحظ نے عبداللہ بن الزبیر کی بغاوت کو ”فتنہ“ کا نام دیا ہے -

محدثین بھی کبھی کبھی ابن الزبیر کے پیدا کردہ حالات کو فتنہ کہتے ہیں ، مالک بن انس (۱۹۷ھ/۷۹۵ء) عثمانؓ کی شہادت کو فتنہ نہیں کہا ہے ، بلکہ جیسا کہ الزرقانی کی شرح موطا میں ہے کہ وہ عبداللہ بن الزبیر کے سلسلے میں فتنہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں - اسی طرح بخاری میں بھی ایک حوالہ عبداللہ بن الزبیر کے سلسلے میں ملتا ہے - ایک دوسرا بیان جس میں ” فتنہ عبداللہ بن الزبیر“ مذکور ہے الزبیر بن بکار (۲۵۶ھ/۸۷۰ء) کے بیان کا خلاصہ ہے -

ابن قتیبہ (۲۷۰ھ/۸۸۴ء) کی کتاب المعارف میں لفظ فتنہ کا استعمال ایک عمومی کہاوت کے طور پر ہوا ہے جس میں یزید جانشین ولید کو مخاطب کیا گیا ہے - ” کانت ولایتك رحمة ووفاتك فتنة “ اگرچہ ” فتنہ عبداللہ بن الزبیر“ کے الفاظ کے ساتھ بہت سے بیانات ہیں لیکن کبھی کبھی اس لفظ کا استعمال ” عبدالرحمٰن بن اشعث“ کے لیے بھی ہوا ہے -

الدینوری کی کتاب ” الاخبار الطوال “ میں ولید کی موت کے سلسلے میں لفظ ” فتنہ “ استعمال نہیں ہوا ہے - البلاذری کی ” انساب الاشراف “ کا وہ حصہ ایڈٹ نہیں ہوا ہے جس میں اس زمانے کا ذکر ہے - بہرحال الدینوری نے عمرو بن العاص کے سلسلے میں ” فتنہ “ کا لفظ استعمال کیا ہے - قد اعتزل عن الفتنة “ اس سے مراد ہیجانی کیفیت بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ Wellhausen کا خیال ہے ، اور رخانہ جنگی - مزید برآں الدینوری نے مختار الثقفی (۶۶ھ/۶۸۵ء) اور ابن اشعث کے سلسلے میں بھی ” فتنہ “ کا لفظ استعمال کیا ہے ، ایک بار یہ لفظ ایسے سلسلے میں استعمال کیا گیا ہے کہ جس سے غلط مراد ” اضطرابی کیفیت “ ہو سکتی ہے -

ایک اور مناسب جملہ میں الدینوری نے "فتنہ" کا استعمال کیا ہے۔ اپنی کتاب کے مقدمے میں اس نے تمام تاریخی حوادث کا خلاصہ پیش کیا ہے جس کا وہ حال بیان کرنے والا ہے۔ الدینوری کی عبارت یہ ہے: "... وذکر الائمة والخلفاء والحروب التی کانت مثل یوم القادسیة وفتوح العراق وانصرام دولة العجم وحرب الجمل وصفین ویوم النهروان ومقتل الحسین بن علی علیهما السلام وفتنة ابن الزبیر وخروج الازارقه ..." تمام اہم سیاسی واقعوں میں جن کا ذکر اس عبارت میں ہے یہ صرف عبداللہ بن الزبیر کی بغاوت ہے جس کے لیے لفظ "فتنہ" استعمال کیا گیا ہے۔

البلاذری نے "فتنہ عبداللہ بن الزبیر" لکھ کر عبداللہ بن عمر کے حوالے سے المدائنی (۲۳۵ھ/ ۸۵۰ء) کا جو قول نقل کیا ہے وہ یہ ہے۔ "... حجاز کے لوگ فتنہ کی طرف بہت زیادہ مائل ہیں۔" یہ ریمارکس اس بیان کا حصہ ہے جس میں رذائل کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں جتنے پرانے بیانات ہیں، اکثر دشتر موضوع ہیں۔

تاریخ یعقوبی میں ایک بیان ملتا ہے جس میں ولید کے جانشین کی حکومت کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے، "وکانت ولایته خمسة اشهر والفتنة فی جمیع الدنیا عامة" یہی یعقوبی مذکورہ عبارت سے پہلے بھی فتنوں کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً علیؓ کی موت کے فوراً بعد کا فتنہ، فتنہ ابن الزبیر، فتنہ عمرو بن سعید ۶۹ھ/ ۶۸۹ء) اور قتیبہ بن مسلم (۹۶ھ/ ۷۱۵ء)، اسی طرح یعقوبی نے دوبار اس لفظ کا استعمال بغیر حرفِ تعریف کیا ہے، جس سے مبہم طور پر اضطرابی کیفیت کا اشارہ ملتا ہے۔

الطبری نے یزید ثالث (جو ولید کے بعد خلیفہ ہوا) کے ذکر کے سلسلے میں درمیانِ متن اپنا ریمارکس بھی شامل کر دیا ہے، "وفی هذه السنة ... هاجت الفتنة۔ اس کے بعد ہی دوسری سطر میں الطبری نے فتنہ کی جمع "فتن" کا جو استعمال کیا ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے کہ اس سے مراد "خانہ جنگی" ہے، وہ عبارت یہ ہے" ذکر الخبر عما حدث فیها من الفتن"، ابن الزبیر اور ابن اشعث کے سلسلے میں بھی الطبری نے لفظ "فتنہ" استعمال کیا ہے، ایک اور جملہ میں الطبری کہتا ہے۔"... نفر اخلفوا للفتنه"

المسعودی نے لفظ "فتنہ" کسی خاص سیاق وسباق میں استعمال کیا ہے۔ "فلما اکثروا من ذلك وخافوا الفتنة وهیجها اصعد روح بن زنباع الجذامی علی منبر رسول الله ..."

ترجمہ: جب ان لوگوں [متبعین عبداللہ بن الزبیر] نے [مخالفانہ انداز میں] سختی اختیار کی اور وہ سب [ان کے

خلاف شامی فوج کی روانگی کی وجہ سے] فتنہ اور اس کی ہیجانیت سے خوف زدہ ہوگئے تو روح بن زنباع [عبدالملک کا ایک چچا جو شامی فوج میں تھا] منبرِ رسولؐ پر چڑھا . . .") یہ ایک فتنہ (شاید بغاوت، جنگ) عبداللہ بن الزبیر کے فتنوں میں شامل تھا۔ المسعودی نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ایک جعلی پیشین گوئی بھی بیان کی ہے "کہ ایک فتنہ رونما ہوگا۔"

اخیرا، دو عیسائی مورخ Agapius اور Eutychius نے فتنہ کا لفظ ان واقعات کے متعلق استعمال کرتے ہیں جو عثمانؓ کی شہادت کے بہت بعد رونما ہوئے۔ اوّل الذکر، عبداللہ بن الزبیر کی بغاوت کو "فتنہ" کی ابتدا کہتا ہے، اس نے لفظ فتنہ کو بغاوت، مصیبت و تکلیف کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ وصیر خراج مصر دفعات فی کل جمعۃ خوفا من فتنۃ۔

ولید کی موت کے موقعے پر Eutychius کہتا ہے کہ "فتنہ رونما ہوا، اور شام میں اضطراب تھا۔ Agapius، مختار ثقفی کے سیاسی مطلع پر نمودار ہونے کو بیان کرتا ہے کہ "فتنہ واقع ہوا اور اسی طرح جب ولید قتل ہوا تو کہتا ہے کہ" . . . فتنے اور بلیات رونما ہوئے"۔

مذکورہ بالا مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ لفظ "فتنہ" مختلف اور وسیع بشمول قرآنی مفہوم آزمائش برائی کی طرف مائل کرنے والا سے لے کر طوائف الملوکی اور انارکی پر محیط ہے، تدریجاً بغاوت اور سرکشی کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا، اور عبداللہ بن الزبیر کی بغاوت کو وقوع کے اعتبار سے اول ہونے کی بنا پر سب سے پہلے "فتنہ" کے نام سے یاد کیا گیا —— اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابن سیرین کے قول کا جائزہ لیں جس کے متعلق شاخت کا خیال ہے کہ ابن سیرین کی طرف غلط منسوب ہے۔ ابن سیرین کے قول کا متن یہ ہے:

"لم یکونوا یسألون عن الاسناد فلما وقعت الفتنۃ قالوا سمّوا لنا رجالکم فینظر الی اھل السنۃ فیوخذ حدیثھم وینظر الی اھل البدع فلا یوخذ حدیثھم"۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ "فتنہ" پر حرف تعریف ہے اور اس سے مراد "خانہ جنگی" ہے یا کم از کم بڑا سانحہ۔ اگر برائے بحث ہی ہم یہ فرض کرلیں کہ ابن سیرین کا انتقال ۱۱۰ھ/۷۲۸ء میں ہوا اور یہ کہ اس کا متن بھی صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لفظ "فتنہ" سے ابن سیرین کی مراد عبداللہ بن الزبیر کی بغاوت ہے نہ کہ عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہونے والی "خانہ جنگی"، جیسا کہ مسلم اسکالرس

سمجھتے ہیں۔ ان تمام حقائق کے پیشِ نظر جن کی تصریح اس مقالے میں کی گئی ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ یہ مفروضہ صحیح ہے کہ لفظ "فتنہ" بہ معنی "خانہ جنگی بعد از شہادت عثمان" کا استعمال نسبتاً بعد میں ہوا۔ اغلب یہ ہے کہ ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء کے بعد، جب کہ ابن سیرین کا انتقال ہوا، بہ الفاظِ دیگر ابن سیرین نے شہادتِ عثمانؓ کو فتنہ سے تعبیر نہیں کیا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ابن سیرین کے الفاظ تاریخی اعتبار سے درست ہیں تو پھر اس سلسلے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ اس بات کی طرف اشارے کو خارج از بحث نہیں سمجھنا ہوگا کہ اصولِ تنقیدِ حدیث کے ارتقا میں اسناد کو پیچھے کی طرف لے جانے کی ذہنیت کارفرما رہی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اور یہ ذہنیت ابن سیرین کے بیان میں لفظ "فتنہ" کی غلط تعبیر کا سبب بنے گا۔ یہ بجائے خود کوئی حیرت کی بات نہیں کہ زمانۂ ماضی میں اور اب بھی مسلم علما نے اس بات کا دعویٰ کر کے کہ اسناد کا استعمال کسی تاریخی بیان (مثلاً ابن سیرین) سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، فن حدیث کی اہمیت کو مضبوط بنا دیا ہے۔

۲۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، J. Robson نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اسلام میں اسناد کا استعمال پہلی صدی ہجری کے آخری تہائی میں شروع ہوا اور اسی نظریے کو دیگر لوگوں کے علاوہ Nabia Abbott اور فواد سیزگن نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ابنِ سیرین کے بیان میں لفظ "فتنہ" اسی نظریے سے مطابقت رکھتا ہے جس میں عبداللہ بن الزبیر کی بغاوت کو "فتنہ" سے یاد کیا جاتا ہے۔

۳۔ اگر ابن الزبیر کے متن کو لفظی اعتبار سے دیکھیں تو اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کس طرح ابتدا میں اسناد کا سلسلہ شروع ہوا۔ معتبر رواۃ صرف وہی تھے جن کا شمار اہل السنۃ میں تھا، اور یہ لوگ بدعت کی اشاعت و ترویج میں ملوث نہیں تھے، چوں کہ یہی کل معیار تھا، اس لیے ہم فرض کریں گے کہ چھان بین کا صرف یہی طریقہ تھا جس کے ذریعے راویانِ حدیث کو جانچا جاتا تھا۔ یہ طریقہ کہ مثلاً "الف" نے "ب" سے ملاقات کی، گویا بعد میں ایجاد کیا گیا۔

شاخت اپنی اس رائے میں کہ ابنِ سیرین کی طرف منسوب روایت جعلی ہے، صحیح ہو سکتا ہے لیکن مذکورہ بالا بیانات کے پیشِ نظر شاخت کے دلائل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

پروفیسر محمد اسلم

خوانِ پُر نعمت

مخدوم شرف الدین بن شیخ یحییٰ منیریؒ کا شمار امتِ مرحومہ کے ان مصلحین اور مجددین میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ و ثقافت میں اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

مخدوم کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے متعدد مجموعے مرتب کیے ہیں۔ اس وقت ان کے ملفوظات کا مجموعہ "خوانِ پُر نعمت" مرتبہ زین بدر عربی میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ کتاب مطبع احمدی پٹنہ سے ۱۳۲۱ھ میں طبع ہو چکی ہے، لیکن اب اس کے مطبوعے نسخے بھی کم یاب ہو گئے ہیں۔

سینٹ زیویر سکول پٹنہ کے ایک آسٹریلین نژاد اُستاد فادر پال جیکسن "خوانِ پُر نعمت" کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس سے قبل وہ مخدوم صاحب کے مکتوباتِ صدی کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ فادر پال جیکسن کے توجہ دلانے پر ہی میں نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اب میں اس کتاب کا حاصلِ مطالعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

صاحبِ ملفوظات

صاحبِ ملفوظات کا اصل نام احمد تھا، لیکن علمی و دینی حلقوں میں ان کی شہرت اپنے لقب مخدوم شرف الدین سے ہے۔ ان کے والد بزرگوار شیخ یحییٰ منیر کے رہنے والے تھے۔ مخدوم صاحب کا شجرۂ نسب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تایا اور کفیل زبیر بن عبد المطلب سے جا ملتا ہے[1] ان کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہ موضع الخلیل[2] (فلسطین) سے ترکِ سکونت کر کے منیر میں آ بسے۔ ان کی ہمت اور کاوش سے اس علاقے میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی۔ کچھ عرصے بعد مولانا محمد تاج فقیہ

---

[1] ابو الحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳، ج ۳، ص ۱۷۷

[2] الخلیل کو حبرون بھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ قصبہ اردن میں شامل تھا۔ ۱۹۶۷ میں اس پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا۔ الخلیل میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے مزارات ہیں۔

اپنے اہلِ خانہ کو منیر میں چھوڑ کر اپنے آبائی وطن کی طرف لوٹ گئے۔

مخدوم صاحب کے نانا حضرت شہاب الدین جگجوتؒ کاشغر کی سکونت ترک کرکے بہار چلے آئے اور پٹنہ کے قریب جھٹلی میں مقیم ہوگئے۔ ان کے دو نواسوں، مخدوم شرف الدینؒ اور شیخ احمد چرم پوشؒ نے دینی اور روحانی حلقوں میں بڑا نام پایا ہے۔ مخدوم شرف الدین ۶۶۰ھ (۱۲۶۳ء) میں ماہ شعبان کے آخری جمعہ کو منیر میں پیدا ہوئے[۵۳] ان کی ابتدائی تعلیم منیر میں ہوئی اور یہیں انھوں نے متوسطات تک نصابی کتب کا مطالعہ کیا۔ ایک بار برِعظیم پاک وہند کے نامور عالم دین مولانا شرف الدین ابو توامہؒ دہلی سے سنار گاؤں جاتے ہوئے منیر سے گزرے۔ مخدوم صاحب ان کی شخصیت اور علمیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے والد سے اجازت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر ان کے ساتھ سنار گاؤں چلے گئے۔[۵۴] مولانا شرف الدین ابو توامہ کی نگرانی میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ استاد نے ان کی استعداد اور خاندانی شرافت دیکھ کر اپنی بیٹی سے ان کا نکاح کر دیا۔ سنار گاؤں میں قیام کے دوران میں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ذکی الدین تجویز ہوا۔

مخدوم صاحب اپنے والد کی علالت کے پیشِ نظر منیر واپس آئے اور ۱۱ شعبان ۶۹۰ھ (۱۲۹۱ء) کو شیخ یحییٰ فوت ہوئے۔ والد بزرگوار کی وفات کے بعد انھوں نے اپنا بیٹا اپنی والدہ ماجدہ کے سپرد کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ اسے ان کا بدل سمجھیں اور یہ سمجھ لیں کہ آج سے شرف الدین فوت ہو گیا ہے۔ والدہ صاحبہ سے اجازت اور دعائیں لے کر مخدوم صاحب دہلی روانہ ہوئے۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ اور پانی پت میں شرف الدین بوعلی قلندرؒ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں، لیکن جیسا مرشد وہ چاہتے تھے، ویسا نہ ملا۔ ایک دن مخدوم صاحب اپنے بھائی کے اصرار پر حضرت نجیب الدین فردوسیؒ کی زیارت کو گئے۔[۵۵] ان کی قیام گاہ کے قریب جاتے ہی ان کے پسینے چھوٹ گئے اور انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ انھیں جس مرشد کی مدت سے تلاش تھی، وہ مل گیا ہے۔ مخدوم

۵۳۔ شیخ محمد اکرام نے آبِ کوثر میں ان کی تاریخ ولادت ۵ جولائی ۱۲۶۳ء لکھی ہے۔

۵۴۔ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۴۹۹

۵۵۔ حضرت نجیب الدین فردوسیؒ مہرولی میں فردوسیہ پہاڑی پر دفن ہیں۔

صاحب نے حضرت نجیب الدین فردوسیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی اور مرشد نے انھیں اجازت نامہ دے کر بہار کی طرف رخصت کیا۔ حضرت نے چلتے وقت انھیں وصیت کی کہ اگر وہ راستے میں کوئی خبر سنیں تو واپس نہ لوٹیں۔ مخدوم صاحب ابھی دو منزل ہی گئے تھے کہ انھیں اپنے شیخ کی وفات کی اطلاع ملی۔ انھوں نے حسبِ ارشاد اپنا سفر جاری رکھا۔ مخدوم صاحب جب بہیا[۵٦] (ضلع آرہ) کے جنگل سے گزر رہے تھے تو ایک مور کی آواز سن کر ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انھوں نے اپنا اجازت نامہ اور سامان اپنے بھائی کے سپرد کیا اور خود جنگل میں غائب ہو گئے۔ بارہ سال بہیا اور راج گیر کے جنگلوں میں جنگلی پھل اور درختوں کے پتے کھا کر گزارے۔ ایک بار چند لوگوں نے راج گیر کے جنگل میں ان کے مسکن کا کھوج لگا لیا اور وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان دنوں جنگل کا راستہ پُر خطر تھا، اس لیے مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ وہ ان کے پاس آنے کا خطرہ مول نہ لیا کریں، وہ خود جمعہ کے روز شہر چلے آیا کریں گے[۵۷] پھر وہ ہر جمعے کو راج گیر جانے لگے۔ ان کے معتقدین نے ان کے آرام کے لیے ایک جگہ چھپر ڈال دیا۔ موصوف نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر وہاں آرام فرماتے اور لوگوں سے ملتے۔ کبھی کبھی وہاں دو تین روز کے لیے رک بھی جاتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے وہاں خانقاہ بنالی اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مریدوں نے انھیں زبردستی مسند پر بٹھا دیا[۵۸] یہ ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) کا واقعہ ہے۔ خانقاہ میں قیام کے بعد انھوں نے عوام کی رشد و ہدایت اور تصوف کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور چھپن برس تک یہ ہنگامہ جاری رکھا۔ مخدوم صاحب ٦ شوال ۷۸۲ھ (۵ جنوری ۱۳۸۱ء) کو ۱۰۸ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ اگلے روز مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانیؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

مخدوم صاحب کے مریدوں اور خلفا کی تعداد کافی ہے۔ ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کے کئی مجموعے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیے ہیں، جن سے اس دَور کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن، خانقاہی زندگی اور عوام کے رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ ملفوظات، جو ''خوانِ پرِنعمت''

---

۵٦ بہیا (BIHIYA) آرہ سے بکسر کی طرف جاتے ہوئے آرہ سے اکیس کلو میٹر کے فاصلے پر ای آئی ریلوے کا اسٹیشن ہے۔

۵۷ ابو الحسن علی ندوی۔ تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۳، ص ۱۹۹   ۵۸ ایضاً

کے نام سے مشہور ہے حضرت کے ایک مرید زین بدر عربی نے مرتب کیا ہے - فاضل مرتب یمن کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زندگی اپنے مرشد کے آستانے پر ہی گزر گئی -

ما نقد عمر صرف رہ یار کردہ ایم کارے کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

"خوان پُر نعمت" کے علاوہ زین بدر عربی نے "معدن المعانی" کے عنوان سے بھی مخدوم صاحب کے ملفوظات جمع کیے تھے، جو مطبع اشرف الاخبار بہار شریف سے ۱۸۸۴ء میں طبع ہو چکے ہیں، لیکن اب اس کے مطبوعہ نسخے بھی کم یاب ہو گئے ہیں - اس کے علاوہ انھوں نے اپنے مرشد کے مکاتیب بھی جمع کیے تھے - مخدوم صاحب اپنے وقت کے مجدد تھے - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا تمام تر کارنامہ یہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے باشندوں کو خدا کا راستہ دکھایا، معرفتِ الٰہی اور تعلق مع اللہ کی ضرورت و اہمیت دل نشین کی، ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں عشقِ الٰہی اور خدا طلبی کی حرارت پیدا کر دی اور سلوک و معرفت کے اسرار و نکات اور لطیف و بلند علوم کا اظہار فرمایا بلکہ بعض دوسرے مصلحینِ امت اور محققین کی طرح ان کا یہ بھی عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے بر وقت دین کی حفاظت کا فرض انجام دیا، مسلمانوں کے دین و ایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالی، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت و زندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھا اور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا جو با اعتقاد صوفیوں، جاہل مشائخ اور فلسفہ و باطنیت سے متاثر اشراقیین کی دعوت سے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں، جہاں اسلام بہت چکر کاٹ کر پہنچا تھا، اور جہاں کتاب و سنت سے براہ راست واقفیت پیدا کرنے کے وسائل شروع سے کمزور اور محدود رہے، سحر کا اثر رکھتے تھے - انھوں نے اپنے مکتوبات میں ان سب عقاید و خیالات پر ضرب کاری لگائی، جس کے پردے میں یہاں الحاد و زندقہ پھیل رہا تھا اور اسلامی عقاید متزلزل ہو رہے تھے اور اسلام کے عقاید صحیحہ اور اہل سنت کے مسلک کی نہایت مؤثر و طاقت ور وکالت اور تبلیغ کی۔"[۵۹]

---

۵۹ سید ابوالحسن علی ندوی - تاریخ دعوت و عزیمت، جلد ۳، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص ۹-۲۹۸

ملفوظات

"خوانِ پُر نعمت" کے آغاز میں زین بدر عربی نے "معدن المعانی" مرتب کرنے کا ذکر کیا ہے[۱۰]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "معدن المعانی" "خوانِ پُر نعمت" سے پہلے مرتب ہوئی۔ خوانِ پُر نعمت میں ۱۵ شعبان ۷۴۹ھ سے لے کر شوال ۷۵۱ھ تک کے ملفوظات درج ہیں۔ اس مجموعے میں کل ۷۰ مجالس کے ملفوظات ہیں۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی ولی بے علم نہیں ہوتا، اگر کسی بے علم کو ولی بنایا گیا تو پہلے اسے علم دیا گیا، پھر اسے ولایت ملی[۱۱]۔

جامع ملفوظات نے ایک موقع پر نمازِ معکوس کا ذکر کیا ہے[۱۲]۔ اخبار الاخیار میں مرقوم ہے کہ بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ نے اُچ کی مسجد حاج کے کنوئیں میں چالیس راتیں الٹے لٹک کر چلہ کاٹا تھا۔ مسجد کا خادم نمازِ عشا کے بعد بابا صاحب کو کنوئیں میں لٹکا دیتا تھا اور فجر کی نماز سے پہلے باہر نکال لیتا تھا[۱۳]۔ مخدوم صاحب نے خدا جانے بغیر سند کے یہ کیسے کہہ دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی (معاذاللہ) کئی بار نمازِ معکوس ادا کی تھی[۱۴]۔ معدن المعانی میں مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ بعض صوفی سر کے بل کھڑے ہو کر قرآن مجید ختم کرتے ہیں۔ اس طریقے کو "کاچک" کہتے ہیں اور صوفیوں نے یہ طریقہ جوگیوں سے اخذ کیا ہے[۱۵]۔ کاش موصوف یہی بات نمازِ معکوس کے بارے میں بھی لکھ دیتے۔

مخدوم صاحب جس زمانے میں سنارگاؤں میں مقیم تھے، ان دنوں لوگوں نے چونا بکثرت کھانا شروع کر دیا۔ مذہبی طبقوں میں اس کے خلاف ایک شور مچ گیا۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چونا صدف کے اجزا سے بنتا ہے اور صدف حشراتِ بحر میں سے ہے اور حشراتِ بحر کی شریعت میں حرمت آئی ہے، اس لیے اس کا استعمال حرام ہے۔ چند سمجھ دار لوگوں نے مفتیوں کی طرف رجوع کیا تو انھوں نے کہا کہ

۱۰؎ خوانِ پُر نعمت، مطبوعہ پٹنہ ۱۳۲۱ھ، ص ۲

۱۱؎ ایضاً، ص ۶ ۱۲؎ ایضاً، ص ۷

۱۳؎ شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۵۳

۱۴؎ خوانِ پُر نعمت، ص ۷

۱۵؎ زین بدر عربی، معدن المعانی، مطبوعہ مطبع شرف الاخبار، بہار ۱۸۸۴ء، ص ۱۱۸

ہزاروں لوگ چونا کھا رہے ہیں، اس لیے اگر وہ اسے حرام کہیں تو ہزاروں لوگوں کو حرام خور کہنا پڑے گا اور لوگ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے کسی مفتی نے بھی اس کی حرمت کا فتویٰ نہ دیا۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ لوگوں کو دشواری میں نہ ڈالا جائے،[۱۶] اس لیے فقہا نے فتویٰ دینے سے احتراز کیا۔

کسی شخص نے مخدوم صاحب سے سوال کیا کہ نماز میں خشوع و خضوع کی حد کیا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ خضوع اور خشوع کے ایک ہی معنی ہیں۔ جہاں تک حد کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ بہ ظاہر ہر عضو کو شریعت کے حکم کے مطابق اپنی جگہ پر رکھے اور اپنے دل میں یہ خیال رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کے ظاہری اور باطنی احوال و افعال سے واقف ہے۔[۱۷]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ ایک درویش ملتان میں ایک مدت تک حضرت صدر الدین عارف کی خانقاہ میں مقیم رہا۔ ایک روز اس نے حضرت عارف سے کہا کہ وہ دہلی کے مشائخ کی زیارت کرنا چاہتا ہے اس لیے اُسے وہاں جانے کی اجازت دیں۔ حضرت نے اسے بہ خوشی رخصت کیا۔ اس درویش نے ایک رات بمشکل دہلی میں گزاری اور ملتان لوٹ آیا۔ حضرت عارف نے اتنی جلدی واپس آنے کا سبب پوچھا تو اس نے وہاں کے مشائخ کے بارے میں کہا:

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى[۱۸]

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک روز ممّن ملتانی مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ کسی نے مخدوم صاحب سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے بڑے کام کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا، بہت اچھا۔ بہت ہی خوب۔ سو نمازوں اور سو روزوں کا اتنا اجر نہیں ملتا جتنا اجر ایک مومن کا کام کرنے سے ملتا ہے۔ مسلمانوں کے کام انجام دینا اور مخلوقِ خدا کی خدمت کرنی سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ پیغمبروں کا شیوہ ہے، وہ لوگوں کے کام آتے تھے اور ان کی بلائیں اپنے سر لیا کرتے تھے۔[۱۹]

---

[۱۶] خوانِ پُر نعمت، ص ۱۴ [۱۷] ایضاً، ص ۲۶

[۱۸] سورۂ حشر، آیت نمبر ۱۴۔ ترجمہ "تو جانے کہ وہ اکٹھے ہیں اور ان کے دل پھوٹ رہے ہیں۔"

[۱۹] خوانِ پُر نعمت، ص ۳۹-۴۰

ایک زمانے میں لوگ مخدوم صاحب سے سفارشی خط لکھوا کر حکام کے پاس لے جایا کرتے تھے۔ آپ ان کے لیے سفارشی خط لکھتے لکھتے تنگ آ گئے۔ ایک روز شیخ زادہ چشتی ان کے پاس بیٹھے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ مخدوم صاحب نے ان سے کہا کہ اب وہ اس کام سے تنگ آ گئے ہیں۔ شیخ زادہ نے کہا تنگ آئیں یا تھک جائیں، لوگوں کی بلائیں اپنے سر لیا کریں[۲۰]

بعض سلاسلِ تصوف کے مشائخ بادشاہوں کے ہاں جانا بڑا معیوب سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ مشائخ بلا طلب کسی بادشاہ کے ہاں نہیں جاتے لیکن وہ کسی مسلمان بھائی کا کام کرنا اہم ترین کام سمجھتے ہیں[۲۱]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ کسی چیز پر عقیدہ رکھنے کے لیے قطعی دلیل کی ضرورت ہے، محض شک و شبہ یا قیاس پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اسی طرح خبرِ واحد پر بھی عقیدہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر خبرِ واحد تواتر کی حد تک ہو تو پھر اس پر یقین کرنا چاہیے۔ عذاب و راحتِ قبر کے بارے میں کسی کے استفسار پر انھوں نے فرمایا کہ یہ خبرِ واحد سے ثابت ہے[۲۲] مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو سانپ ڈس لے تو یہ آیت پڑھ کر تین بار پانی پر دم کریں اور مار گزیدہ کو پلا دیں۔

قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ۝ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ۝ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ وقفہ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ۝[۲۳]

مخدوم صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ سے تین اہم مسئلے حل ہوئے: (۱) اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو مالِ غنیمت کے احکام کیا ہوں گے؟ (۲) بغاوت کے احکام (۳) طرفین کے مقتولین کے احکام۔

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ اسی طرح نماز جمعہ اور خطبے کے احکام بھی اسی جنگ سے واضح ہوئے

---

[۲۰] خوانِ پُر نعمت، ص ۴۰

[۲۱] ایضاً، ص ۴۱

[۲۲] ایضاً، ص ۵۰

[۲۳] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۹ تا ۲۱

ہیں ۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ جنگِ صفین کا ایک راز یہ بھی تھا کہ مسائل سامنے آئیں اور صحابہ کرام ان کا حل تلاش کریں ۔ مخدوم صاحب ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کا برابر احترام کرتے تھے[۲۴]

مخدوم صاحب نے ایک بار امیر فاضل بلخی کو قرآن حکیم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے سنا تھا۔ اسی روز سے موصوف علمائے بلخ کی علمیت کے قائل ہو گئے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ علمائے بلخ تفسیر و حدیث خوب بیان کرتے ہیں اور وہ بڑے ثقہ محدث اور مفسر ہوتے ہیں[۲۵]

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ مشائخ نے تصوف کے موضوع پر جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں قوۃ القلوب سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ تمام مشائخ اس کتاب پر اعتماد کرتے ہیں اور یہ کتاب بڑی مقبول ہے ۔ قوۃ القلوب کا مصنف ابوطالب مکیؒ بڑا بزرگ اور عقل مند شخص تھا۔ اس کے زمانے میں اور عہدِ رسالت میں زیادہ بُعد نہیں تھا ، اس لیے سبھی مشائخ اس پر اعتماد کرتے ہیں[۲۶]

مخدوم صاحب کے زمانے میں مشائخ چشت کے ملفوظات کے بعض جعلی مجموعے عوام میں متداول تھے ۔ انھوں نے خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات کا ذکر کیا ہے جن کی تدوین خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی طرف منسوب ہے۔ اس کا ایک فقرہ مخدوم صاحب کو بڑا پسند آیا تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس مجموعہ ملفوظات میں مرقوم ہے کہ حضرت عثمان ہارونی نے خواجہ اجمیریؒ سے پہلے ہی دن یہ کہا : من ترا بخدای تعالیٰ رسانیدم"[۲۷]

ایک مجلس میں مخدوم صاحب نے فقہ کا ایک دلچسپ مسئلہ بیان فرمایا۔ چوری کی رقم کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی چور قصاب سے دس جیتل کا گوشت لے اور پھر رقم ادا کرے تو اس صورت میں گوشت حرام نہ ہوگا۔ اگر پہلے قصاب کو رقم دے اور پھر اس سے گوشت طلب کرے تو اس صورت میں گوشت حرام ہوگا۔ حاضرینِ مجلس میں سے حسام الدین کو یہ مسئلہ سمجھ نہ آیا تو اس نے حضرت سے مزید وضاحت چاہی ۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ مال لے کر اس کی قیمت دینی واجب ہے ۔ چور چونکہ پہلے گوشت لیتا ہے اس لیے اس کی قیمت دینی اس پر لازم ہو جاتی ہے ۔ اگر وہ پہلے رقم دے ، پھر گوشت لے تو اس صورت میں مسئلے کی نوعیت بدل جائے گی[۲۸]

۲۴ھ خوان پر نعمت ، ص ۶۵

۲۵ھ ایضاً ، ص ۷۶

۲۶ھ ایضاً ، ص ۸۵

۲۷ھ ایضاً ، ص ۸۸

۲۸ھ ایضاً ، ص ۹۶

خوان پُر نعمت کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ لوگ نیا چاند دیکھ کر حضرت کو مبارک باد
دینے آیا کرتے تھے۔

ایک روز مخدوم صاحب نے قاضی سراج الدین سے تفسیر کبیر مطالعہ کے لیے مستعار لی۔ اس کی
پہلی جلد پڑھ کر ہی ان کی طبیعت اچاٹ ہو گئی اور انھوں نے تفسیر واپس لوٹا دی۔ کسی کے استفسار پر
حضرت نے فرمایا کہ اس میں دلائل بہت ہیں۔ امام رازی پہلے خود اعتراض کرتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا
جواب دیتے ہیں۔ انھیں ایسی بحثیں ناگوار گزرتی ہیں اسی لیے اس تفسیر کا مطالعہ ترک کر دیا۔[29] اس موقع پر
مخدوم صاحب نے تفسیر زاہدی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں دین کے ضروری مسائل مل جاتے
ہیں۔ امام زاہد نے دورانِ تصنیف کوئی مسئلہ بیان کرنے میں نہ ہی اختصار سے کام لیا ہے اور نہ ہی غیر ضروری
تفصیل دینا مناسب سمجھی ہے، جسے پڑھ کر ملال ہو۔ تمام ضروری مسائل اس تفسیر میں موجود ہیں۔ حضرت
فرماتے ہیں کہ مولانا شمس الدین یحییٰ کو جب کسی آیت کی شرح دیکھنی ہوتی تھی تو وہ تفسیر زاہدی کی طرف رجوع
کیا کرتے تھے، حالاں کہ ان کے پاس قرآن حکیم کی کئی تفسیریں موجود تھیں۔ تفسیر زاہدی کی ایک خوبی یہ بھی
ہے کہ فارسی زبان میں ہے۔ حضرت مخدوم نے ایک بار مولانا شمس الدین یحییٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ اس
تفسیر پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا :

"در تفسیر ہای عربی فصاحت بسیار است و بلاغت بیحد و معانی بےشمار۔ اما این لذت و شیرینی کہ
دین تفسیر پارسی است در ہیچ تفسیرے نیافتم۔"[30]

راقم السطور نے سلاطینِ دہلی کے عہد میں مرتب ہونے والے بہت سے ملفوظات کا مطالعہ کیا ہے۔
شاید ہی ملفوظات کا کوئی مجموعہ ہوگا جس میں تفسیر زاہدی کا ذکر نہ آیا ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرونِ
وسطیٰ میں صوفیوں کے حلقوں میں یہ تفسیر بڑی مقبول تھی۔

دہلی میں مولانا علاء الدین جون پوری نام کے ایک صحیح النسب سید رہتے تھے۔ وہ بڑے عالم و
فاضل تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا۔ وہ ہفتے کے مختلف دنوں میں تفسیر،
حدیث، فقہ، نحو، منطق اور اصول وغیرہ کا درس دیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ دہلی میں رہتے تھے،

---

[29] خوانِ پُر نعمت، ص ۹۷ [30] ایضاً، ص ۹۸

ا زمانے میں شہر میں منادی ہوا کرتی تھی کہ تمام علما و مشائخ شاہی محل میں حاضر ہوں۔ منادی سن کر
ھی علما و مشائخ محل کی جانب چل پڑتے تھے، لیکن مولانا علاء الدین نہ جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ
ہو سو ہو، وہ ہرگز شاہی محل میں نہ جائیں گے[31] یہ بزرگ شیخ نجیب الدین فردوسی کے بہنوئی تھے اور
ع موصوف نے ان سے تفسیر و حدیث کا درس لیا تھا۔ مزید برآں حضرت نظام الدین اولیاؒ اور سید علاء الدینؒ
ے ایک ہی استاد سید شرف الدین سے حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار پڑھی تھی[32]

مخدوم صاحب سے روایت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا کا یہ معمول تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے استاد
ے پاس خالی ہاتھ نہ جاتے، خواہ دن میں پانچ بار جانے کا اتفاق ہوتا۔ سید شرف الدین نے ان کے
ق میں دعائے خیر کی تھی[33]

ایک روز حاضرین مجلس میں سے کسی نے سوال کیا کہ "اشراق" کسے کہتے ہیں۔ مخدوم صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا: "اطلاع بر غمایر یعنی آنچہ در ضمیر کسی گزرد ایشاں را بدان اطلاع یافتند"[34]

ایک بار حضرت مخدوم صاحب کی محفل میں شیخ نجیب الدین فردوسیؒ کے بھانجے سید وحد الدین نے اذان میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی سن کر انگوٹھے چومنے کے بارے میں سوال کیا، تو حضرت نے فرمایا کہ اس علاقے میں حدیث کی جتنی کتابیں دست یاب ہیں، انھوں نے سب دیکھ ڈالی ہیں لیکن ان میں ایسی کوئی حدیث نہیں ملی جس سے انگوٹھے چومنے کا جواز ملتا[35] معدن المعانی میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے۔ اس وقت بھی مخدوم صاحب نے یہی جواب دیا تھا کہ حدیث کی کسی مستند کتاب سے اس فعل کا جواز نہیں ملتا۔ شیخ ضیاء الدین سنامیؒ انگوٹھے چومنے کے قائل تھے لیکن وہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ حدیث اس بارے میں خاموش ہے[36]

---

[31] خوانِ پُر نعمت، ص ۱۰۳

[32] ایضاً، ص ۱۰۴ — [33] ایضاً، ص ۱۰۶

[34] ایضاً، ص ۱۱۱ — [35] ایضاً، ص ۸۰

[36] زین بدر عربی، معدن المعانی، ص ۱۱۷

نا سید بدیع الدین شاہ راشدی

ایک غلطی کا ازالہ

ماہنامہ "المعارف" (لاہور) مجریہ اگست ۱۹۸۲ء مطابق شوال ۱۴۰۲ھ (جلد ۱۵ شمارہ ۸)
برادرم ڈاکٹر سید وفا راشدی صاحب حفظہ اللہ کا مضمون بعنوان "پیر رشد اللہ شاہ" نظر سے
ا۔ موصوف نے جدِ امجد مرحوم کے تعارف کے لیے جو مواد جمع کیا ہے، آپ کی یہ سعی لائقِ تحسین
، مگر ایک بات خلافِ واقعہ نظر آئی جس کی بابت صحیح حقیقت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔
وف نے جدِ امجد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کتابوں کے ساتھ ان کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:
"ایک مرتبہ آپ نے جدہ کے ایک کتب خانے میں علامہ خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کا
قلمی نسخہ دیکھا، اس وقت تک یہ کتاب اشاعت پذیر نہ ہوئی تھی، آپ نے اس دور میں
رصرف کرکے اس کتاب کی فوٹو کاپی نکلوائی اور اس کو اپنے کتب خانے میں رکھوایا۔ جب مصر
ں کو اس کا علم ہوا کہ اس کتاب کے ایسے بھی شائق ہیں تو انھوں نے اس کو چھاپنا شروع کیا اور
چھپنے کے بعد جدہ والوں سے پیر صاحب کا صحیح پتا معلوم کرکے ان کی طرف تاریخ بغداد کا نسخہ بطور
ور تحفہ بھجوایا۔ اس کتاب کی فوٹو کاپی پیر جھنڈو لائبریری میں اب بھی موجود ہے۔"
حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا فوٹو ہمارے جدِ امجد نے نہیں بلکہ ہمارے والدِ محترم سید احسان اللہ
مرحوم نے جدہ سے نہیں بلکہ مصر سے کروایا تھا، سب سے بڑا ثبوت اس کا یہ ہے کہ جدِ امجد کی
ت ۶ شعبان ۱۳۴۰ھ ۲۳ اپریل ۱۹۲۲ء میں ہوئی ہے جیسا کہ برادرم وفا صاحب نے اپنے مضمون
میں لکھا ہے، لیکن تاریخ بغداد کا فوٹو کیا ہوا نسخہ نو جلدوں میں میرے سامنے ہے، اس کی جلد اول
سرورق پر یوں لکھا ہوا ہے: "قسم التصویر بمطبعۃ دارالکتب المصریۃ ۱۹۲۸ء" جس
صاف ظاہر ہے کہ اس کتاب کا فوٹو جدِ امجد کی وفات سے چند سال بعد مصر سے لیا گیا اور اس کا
اس گاؤں کے کتب خانے میں نہیں ہے جو کہ پیر جھنڈو کے نام سے معروف ہے، بلکہ ہمارے والد
کے کتب خانے میں ہے جو کہ اس وقت ہمارے بھائی علامہ سید محب اللہ شاہ صاحب حفظہ اللہ

کے گاؤں میں ہے۔ نیز تاریخ بغداد سب سے پہلے ۱۹۳۱ء میں طبع ہوئی یعنی جدامجد کی وفات سے تقریباً آٹھ سال بعد۔ پھر مصر والوں نے کیسے ان کو یہ تحفے کے طور بھیجا بلکہ انھوں نے والد صاحب مرحوم کو قیمتاً بھیجا تھا جیساکہ کسی زمانے میں خود میں نے ان کے رجسٹر میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔

پھر برادرم موصوف نے لکھا ہے کہ :

"اسی طرح مولانا پیر سید رشد اللہ نے اپنے خاص معتبرین سندھی علما کو "حیدرآباد دکھن بھجوا کر دائرۃ المعارف کے علمی کتب خانے سے چند نادر کتابوں کی نقلیں کروائیں، ان میں علامہ شبلی نعمانی کی نادرۂ روزگار کتاب "الاحکام الکبری" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب بھی جدامجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے تقریباً پانچ سال بعد والد صاحب مرحوم نے حیدرآباد دکن سے نقل کروائی جس کو قاضی لعل محمد قیصرانی نے نقل کیا۔ یہ نسخہ بھی والد صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے جوکہ میرے بڑے بھائی صاحب ممدوح کے گاؤں میں ہے۔ اس کا فوٹو میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے آخر میں کاتب نے یوں لکھا ہے :

اما بعد یقول العبد الضعیف النحیف الکاتب لعل محمد بن القاضی شیر محمد القیصرانی السندی و کان الفراغ من کتابتہ فی یوم الاثنین من شھر جمادی الاولی سنۃ خمس واربعین وثلاث مائۃ بعد الالف علی صاحبھا افضل التحیۃ والسلام وکان المنقول عنہ فی المکتبۃ الآصفیہ فی البلدۃ حیدرآباد دکن فلھذا سفرنا سفرا طویلا من السند الی البلدۃ المذکورۃ وکتبت الکتاب الاحکام الکبری بتمامھا من اولہ الی آخرہ فی مدۃ ثمانیۃ عشر یومًا وکان الاصل قد کتب فی سنۃ تسعۃ وخمسین وتسع مائۃ من ھجرۃ من لہ العز وکمال الشرف صلی اللہ علیہ وسلم کتبت ھذا الکتاب العجیب والغریب لمرشد الاعظم وسید الافخم محدث زمانہ فخر الھند والسند السید الحافظ ابی محب اللہ احسان اللہ شاہ ادام اللہ تعالی فیوضہ علی رؤس المسترشدین مادام اللیل والنھار۔

یہ عبارت صاف بتلاتی ہے کہ کاتب نے یہ کتاب ۱۳۴۵ھ میں مکتبہ آصفیہ حیدرآباد دکن سے والد صاحب مرحوم کے لیے نقل کی ہے۔ یہاں ایک بات قابلِ تنبیہ ہے کہ اس کتاب الاحکام الکبری

کے مصنف علامہ شبلی نعمانی المتوفی ۱۳۳۲ھ نہیں بلکہ مشہور محدث عبدالحق بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن حسین بن سعید الحافظ العلامۃ الحجۃ ابومحمد الازدی الاشبیلی المتوفی ۵۸۱ھ ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۳، ص ۳۵۰ - ۳۵۱ - شذرات الذہب لابن العمادی، ج ۴، ص ۲۵۱ وکشف الظنون لحاجی خلیفہ ج ۱ ص ۲۰ وغیرہ)

امید ہے کہ یہ چند الفاظ برادرم وفا صاحب کے لیے باعثِ استفادہ ہوں گے۔

الفہرست

از : محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق

اردو ترجمہ : مومحمد اسحاق کھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآن مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علمِ نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علماء و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیوں کر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ قیمت ۴۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

مسلمانوں کے عقائد و افکار :
(مقالات الاسلامیین)

علامہ ابوالحسن اشعری
ترجمہ
مولانا محمد حنیف ندوی

علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کی وہ جلیل القدر شخصیت ہیں جنھوں نے مسلسل چالیس برس تک اعتزال و جہمیت کی فتنہ سامانیوں کا شکار رہنے کے باوجود اپنے لیے فکر و تعمق اور اجتہاد و کلام کا ایک علیحدہ اور منفرد دبستان سجایا۔

"مقالات الاسلامیین" ان کا وہ علمی شاہکار ہے جسے افکار و نظریات کا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے ان تمام عقائد اور افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں ہمارے ہاں کے فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی ہے وہاں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آئے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کن معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور برقرار رکھا ہے۔

حصہ اول: صفحات ۳۸۰ قیمت ۲۰ روپے حصہ دوم: صفحات ۴۴۲ قیمت ۲۰ روپے

مآثر لاہور

سید ہاشمی فرید آبادی

سید ہاشمی فرید آبادی بحیثیت ایک مورخ کے محتاج تعارف نہیں۔ ان کی یہ کتاب غزنوی دور تک کے لاہور کی تاریخ ہے۔ لاہور پاکستان کا مشہور ثقافتی و علمی مرکز ہے اور ہمیشہ سے علم و سیاست کا گہوارہ رہا ہے اس سرزمین سے بلند پایہ شاعر، ادیب، اصحاب علم اور ارباب سیف پیدا ہوتے رہے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں ارباب سیف و سیاست اور قدیم لاہور کے والیوں کا تذکرہ ہے اور دوسرا حصہ صاحبان علم و قلم لاہور کے مشائخ علما اور مصنفین و شعرا سے متعلق ہے۔

صفحات ۸+۲۰۷ قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

اے آبِ رودِ گنگا

ایک جائزہ

رفیق ڈوگر ملک کے معروف صحافیوں اور اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ سیاسی اور معاشرتی مسائل پر دھڑلے سے لکھتے ہیں۔ ۱۹۸۱ میں انھیں زائرینِ درگاہِ حضرت نظام الدین اولیا کے ہمراہ بھارت جانے کا اتفاق ہوا۔ اس چند روزہ قیام میں انھوں نے وہاں جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا اور جو کچھ انھیں درپیش آیا، اسے انھوں نے "اے آبِ رودِ گنگا" کے عنوان سے کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب بظاہر ایک سفرنامہ ہے، لیکن اس میں ایک سچے محب وطن کے پُرخلوص جذبات، ایک مزاح نگار کا بھرپور طنز و مزاح اور اس کی اپنی تاریخ پر نظر اور اس تاریخ سے شیفتگی کا اظہار بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فاضل مصنف نے انداز ایسا اختیار کیا ہے کہ قاری کو کسی قسم کے روکھے پن یا مشکل پسندی کا احساس نہیں ہوتا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے یہاں سے جب کوئی خاص فن کار، ادیب یا شاعر باہر جاتا ہے تو وہاں اپنی آؤ بھگت سے متاثر ہو کر اپنے نظریات اور اپنی نظریاتی مملکت وغیرہ کے بارے میں ایسی باتیں کہنے سے بھی گریز نہیں کرتا، جسے ہم وطن دوستی کے سلسلے میں منافقت کا نام دے سکتے ہیں۔ "اے آبِ رودِ گنگا" میں کہیں بھی ایسی منافقت نظر نہیں آتی۔ مصنف کو جب بھی اپنے وطن کی بات یا وطن کی وکالت کرنے کا موقع ملتا ہے وہ برملا اور کھل کر بات کرتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جسے حق سمجھتا ہے۔ بھارت کے ایک سٹیشن پر جب گاڑی کی کھڑکی کے قریب ایک بھارتی شہری ایک پاکستانی زائر سے پرانے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ "یہ تو جی سیاست کی دیواریں ہیں ورنہ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد صدیوں اکٹھے رہے۔ یہ دیواریں زیادہ عرصے تک ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں رکھ سکتیں" تو مصنف زائر کی زبان سے اس کا منہ توڑ جواب دیتا ہے: "بالکل نہیں جی۔ میں اس شہر میں اپنے عزیز

کی جو پندرہ لاشیں چھوڑ گیا تھا انھیں واپس لینے کے لیے مجھے یہ دیواریں پھلانگنا پڑیں گی۔ (ص ۵۸-۵۹)

دلی کے ایک بازار میں مصنف کی ملاقات ایک "شکست خوردہ" برہمن سے ہوتی ہے۔ یہ برہمن مصنف کو ایک برہمن زادہ قرار دیتا اور اپنے اس قول پر مصر رہتا ہے۔ مصنف کھل کر اُسے بتاتا ہے کہ "میں مسلمان ہوں، آپ بھی یہ جانتے اور پہچانتے ہیں۔" برہمن اپنی اس رَٹ اور ہٹ سے ہٹنے کی بجائے نئے پہلو سے وار کرتا ہے۔ "آپ ہندی نژاد ہیں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ کا رنگ، لباس اور زبان اس کا ثبوت ہیں۔" مصنف بغیر کسی معذرت کے اس وار کا توڑ الفاظ کے ان تیز اور چمکیلے ہتھیاروں سے کرتا ہے۔ "آپ کو رنگ، لباس اور زبان سے غلط فہمی ہوئی ہے، میں صرف مسلمان ہوں۔ ہم انسانوں کو ان کے لبادوں، رنگوں اور بولیوں کے حوالے سے نہیں، ان کے مقصدِ حیات کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔" (۶۱)

مصنف کی حب الوطنی، ملت پرستی اور اپنے تابناک ماضی سے لگاؤ کی عکاسی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے شان دار ماضی کا ذکر فخر اور درد و غم کے ملے جلے جذبات سے کرتا ہے۔ وہ اسی برصغیر کی پیداوار ہونے کے سبب اس کی تاریخ سے گہری واقفیت رکھتا ہے اور ہر ہر موقع پر اس کا اظہار کرتا ہے۔ بھارت سے زائرین کا واپسی سفر شروع ہو چکا اور مصنف گاڑی میں بیٹھ چکا ہے۔ گاڑی روانہ ہوتی ہے تو وہ اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ اس کا ذہن اسے بہت دور لے جاتا ہے۔

"گاڑی آہستہ ہو تو دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی ہیں۔ گاڑی کی رفتار میں زیادتی کے ساتھ ساتھ یہ دھڑکنیں مدھم پڑنے لگتی ہیں۔ گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز تیز تھیں۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے پیارے ہم سے جدا ہو رہے تھے۔ ہنستے بستے دلی پلیٹ فارم پر ہمارا کوئی بھی نہیں تھا، ہمارے اپنے ماضی کے سوا، جو ایک طرف کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ کچھ دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا اور پھر پیچھے رہ گیا۔ برق رفتار ٹرین ہمیں اپنے ساتھ شان دار ماضی سے دُور اور دُور لیے جا رہی تھی۔ افراد اور اقوام کا ماضی ان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ غیروں کے قبضے میں ہو تو جدائی کا صدمہ اور بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ (ص ۲۹۱)

مسجد قوت الاسلام کے پاس ہندو خاتون گائیڈ یورپی سیاحوں کو مسلمانوں کے مظالم کی داستانیں سنانے اور یہ باور کرانے میں مصروف ہے کہ یہ مسجد اب بھی ایک مندر ہی ہے، مسجد نہیں۔ مصنف اس کی اس حرکت پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کے پاس وقت نہیں کہ وہ اس عورت کی اس کذب بیانی کا توڑ کر سکے،

کہ وہاں اس کی کیفیت "مردہ بدست زندہ" کی سی ہے، تاہم اپنے دل کا درد وہ صفحۂ قرطاس پر یوں بکھیر دیتا ہے:

اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اس کے بعد سیاحوں کو در و دیوار اور محرابوں پر کندہ آیاتِ قرآنی بھی دکھاتا، انھیں سمجھاتا کہ قرآن دراصل دتی میں نازل ہوا تھا کہ ان کے مندروں کے در و دیوار پہ اس کی آیات بھی تو کندہ ہیں۔ (ص ۲۶۹)

جیسا کہ پہلے عرض ہوا، مصنف کسی موقع پر اپنے تاریخی شعور کے اظہار سے غفلت نہیں برتتا۔ چناں چہ پاکستان سے روانگی کے وقت ہی وہ اس طرف آجاتا اور اس باب کا عنوان "تاریخ کے نقشِ قدم" پر رکھتا ہے۔ ابھی وہ اپنے ہی شہر سے بس میں گزر رہا ہے کہ شاہی مسجد کے قریب رنجیت سنگھ کی مڑھی دیکھ کر مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی داستانوں میں کھو جاتا ہے۔ ان داستانوں کو وہ رمز و ایمائیت کے پیرائے اور بڑے ہی مختصر انداز میں کہہ جاتا ہے۔

ہمارے قومی سفر میں قلعوں، مسجدوں، میناروں کے درمیان میں کہیں نہ کہیں رنجیت سنگھ اور ان کی مڑھیاں ضرور آتی ہیں۔ رنجیت سنگھ ہماری تاریخ کا حصہ ہیں، تاریخی حقیقت ہیں۔ جو مسافر راستے کے اتنے بڑے اور اہم حقائق سے بھی بے پروا ہوں، ان کا منزل آشنا ہو جانا تاریخ کے معجزوں میں شمار ہوتا ہے۔ (ص ۱۲-۱۳)

جہاں گیر نے نور جہاں کو حاصل کرنے کے لیے اس کے شوہر شیر افگن کو مروا ڈالا۔ بعد میں نور جہاں اس پر پوری طرح چھائی رہی، لیکن اس کے باوصف جہاں گیر عدل کے معاملے میں اس کے اثر سے باہر رہا۔ مصنف جب قلعۂ لاہور کے قریب سے گزرتا ہے تو تاریخ کے یہ اوراق اس کے سامنے کھلنے لگتے ہیں، اور وہ نور جہاں اور جہاں گیر کے اس واقعے کو یوں بیان کرتا ہے:

شہنشاہِ ہند جس کے ہاتھ میں میزانِ عدل اور کندھے پر ملکۂ ہند کا دستِ مبارک دھرے رہتے تھے، کہتے ہیں ملکۂ معظمہ کے ہاتھ کا وزن کبھی بھی میزانِ عدل میں محسوس نہیں کیا گیا۔ شہنشاہِ معظم یہ سارا وزن اپنے شاہی کندھوں پر برداشت کرتے تھے۔ (ص ۱۳)

مصنف کا قافلہ دلی کے قریب پہنچنے والا ہے۔ اس موقع پر اسے برصغیر پر نادر شاہ کے حملے کے وقت مغلیہ بادشاہ کا یہ تاریخی جملہ ذہن میں آجاتا ہے "ہنوز دلی دور است"، اور پھر وہ موقع کے

مطابق منظر کشی کرتا ہوا اپنی تاریخ کے دھاروں میں بہہ جاتا ہے :

دِلّی ! میرے خوابوں کا شہر، واقعی دلی قریب آرہا ہے؟ خواب حقیقت بن جائیں تو بھی یقین نہیں آیا کرتا - کیا قافلہ ہائے شوق انہی راستوں سے گزرے تھے ! یہ راہیں، یہ درخت، یہ مٹی اور یہ ٹیلے کتنے رازوں کے امین ہیں ؟ کتنے معرکوں، حادثوں اور المیوں کے عینی شاہد ہیں - (ص ۶۰)

مقبرہ ہمایوں پر جب کوئی واقفِ حال اسے احتیاط سے اس جگہ پاؤں رکھنے کو کہتا ہے کہ وہاں ہزاروں مسلمانوں کے جسم و روح مقیم ہیں، کیوں کہ ۱۹۴۷ء میں ہزاروں مسلمان جانیں بچانے کے لیے وہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے، لیکن جانیں پھر بھی نہ بچا سکے، تو اس کا تاریخی شعور بیدار ہو جاتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے :

ہم نے کیا کہا انھیں معلوم نہ تھا کہ اس مقبرے نے تو بہادر شاہ ظفر کو بھی پناہ نہیں دی تھی، انھیں کیا پناہ دے گا - کسی قوم کی تاریخ کے کھنڈر اسے پناہ دے سکیں یا نہ دے سکیں، قومیں مصیبت کے وقت رُخ انہی کھنڈروں کا کرتی ہیں - (ص ۶۷)

اسی طرح حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر پہنچ کر جب وہ مختلف شاہان برصغیر پاک و ہند کے مزار اور ان کے کتبوں کو دیکھتا ہے تو مغلیہ دور کے بہت سے شہزادوں اور شہزادیوں کا ایک ایک کتبہ اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے، پھر وہ کتبِ تاریخ کے حوالے سے اورنگ زیب عالم گیر، جہاں آرا، محمد اکبر شاہ ثانی کے فرزند میرزا جہاں گیر وغیرہ کے دو ایک واقعات مختصراً بیان کر جاتا ہے۔ " دھوپ اور سائے " کا سارا باب ایسے ہی تاریخی واقعات و حوالہ جات سے پُر ہے - باب " قلعۂ معلی پر حملہ " میں بھی مصنف مغلیہ دور کے بعض شان دار اور بعض عبرت ناک واقعات میں کھویا ہوا نظر آتا ہے۔ غرض جہاں بھی اسے موقع ملا ہے اس نے سیاق و سباق کے مطابق اپنی تاریخ سے اپنی وابستگی و آگاہی کا اظہار کیا ہے۔

ذکر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے مریدِ خاص حضرت امیر خسرو کا ہو رہا ہے ۔ مصنف خسرو کے شاہی دربار اور اپنے مرشد سے تعلقات کے بارے میں پوری طرح باخبر ہے - چنانچہ وہ ان تعلقات کا ذکر کر کے ایک جگہ کہتا ہے :

خسرو دربارِ شاہی میں اونچی مسند پر بیٹھتا اور دربارِ اولیا میں نیچی زمین پر - نیچی زمین نے اسے ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا - (ص ۸۳)

میرزا جہاں گیر نے ایک انگریز ریذیڈنٹ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ مصنف اس کے لیے بڑی عزت و تعظیم کا اظہار کرتا ہے، پھر یہ کہتے ہوئے کہ " تیموری خاندان میں پھر کوئی اتنا باغیرت شہزادہ کبھی پیدا نہ ہوسکا" اس کا سبب یہ بتاتا ہے :

"سنہری ایوانوں اور روپہلی دیوانوں میں غیرت زنگ آلود ہوجاتی ہے۔ (ص ۸۶)

انگریزوں کے دور میں جامع مسجد دلّی کے ساتھ جو سلوک ہوا، مصنف نے بڑے کرب کے ساتھ اس کی کسی قدر تفصیل دی ہے، لیکن پھر صرف ایک جملے میں پوری تاریخ بیان کردی ہے۔ اس جملے سے مصنف کی مذہب سے وابستگی کا بھی پتا چلتا ہے :

" قلعہ والے مِٹ گئے مسجد والے آج بھی زندہ ہیں " (ص ۱۰۷)

قلعۂ معلّٰی کی سیر کرتے ہوئے مصنف کو عرب طلبا اور طالبات کا ایک گروہ نظر آتا ہے۔ ان طلبا کے سر پر پیسے اور فیشن کا بھوت بُری طرح سوار ہے۔ اس کا نقشہ ملاحظہ ہو :

" ہمارے پڑوس میں عرب طلبا اور طالبات کا ایک گروہ اپنے مالی اور جانی خزینوں اور دفینوں کا مظاہرہ کرنے میں بُری طرح مصروف تھا۔ وہ سب اپنے اپنے کاغذی پیرہن کے جملہ بٹن کھول کھول کر بھارت کی ثقافتی بالادستی کا وِرد کر رہے تھے۔ اکثر مال دار لوگ احساسِ زیاں سے تہی دست ہوتے ہیں، وہ مال دار ہی نہیں سیاح بھی تھے اور ایک مکتبِ فکر کے مطابق سیاح کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ قوم۔ (ص ۱۴۷)

قلعہ کے دیوانِ عام کی بات ہو رہی ہے جہاں کبھی شہنشاہوں کے وکیل بھی سر جھکا کر پاؤں رکھا کرتے تھے۔ مصنف سر جھکائے بغیر اس کی تمام سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ اگر آج بھی کوئی شہنشاہ اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا اور امرا و وزرا دست بستہ کھڑے ہوتے تو وہ شاید ایک بھی سیڑھی اس طرح نہیں چڑھ سکتا تھا، اور پھر یہی خیال اس سے یہ بات کہلواتا ہے:

جو بندۂ خدا اپنے جیسے بندوں کے سر اپنے سامنے جھکے ہوئے دیکھنا پسند کرے، اس کا نہیں تو اس کی نسل کا سر لازماً کسی دوسرے کے آگے جھک جاتا ہے۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی عالمی تاریخ کے ہر صفحے پر یہ بات لکھی ہے، معلوم نہیں بادشاہوں اور شہنشاہوں کو یہ تحریر نظر اور سمجھ کیوں نہ آسکی۔ (ص ۱۴۸، ۱۴۹)

مغل بادشاہ اپنے قلعوں اور مقبروں کے ساتھ ساتھ ایک ایک کارواں سرائے بھی بنایا کرتے تھے،

جس میں مسافروں اور غربا و مساکین کے لیے قیام و طعام کا بندوبست ہوتا تھا۔ مصنف تاج محل کے ساتھ بنائی گئی ایک ایسی ہی سرائے دیکھ کر سوچنے لگتا ہے:

"سرائے سے ہو کر مقبرے میں جانا، اس بات کی یاد دہانی کے لیے تو نہیں کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے جو کوئی اپنا مال، تجارت کے لیے لے کر آتا ہے، اس میں چند روز قیام کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے دوسرے دروازے سے اگلی منزل کے لیے روانہ ہونا ہوتا ہے، اس دنیا کی طرف جس میں وہی کام آئے گا جو غربا و مساکین پر خرچ کیا ہوگا۔ (ص ۲۲۷)

وطن واپس ہوتے ہوئے راستے میں مصنف اپنے شان دار اور تاب ناک ماضی کی یاد میں کھو جاتا ہے اور ایسے میں حضرتِ علامہ کا یہ شعر

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اس کے احساسات و جذبات کو اس طرح متاثر کرتا ہے:

اقبال کا یہ شعر مجھے اس روز سمجھ میں آیا۔ گاڑی اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میں جتنی بار یہ شعر پڑھتا آسمان کے چاند کی روشنی زمین پر اتنی ہی شدید ہو جاتی۔ یہ شعر لکھ کر اقبال نے زمین سے رشتہ توڑ کر چاند اور اس کی روشنی سے قائم کر لیا تھا۔ (ص ۲۹۴)

مصنف زائرین کے ہمراہ لاہور سے روانہ ہو رہا ہے۔ راستے میں شاہی مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے یاد آتا ہے کہ کبھی یہ جگہ دریائے راوی کی گزرگاہ تھی، اور یہی یاد اسے ایک اور یاد میں محو کر دیتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب پاکستان بنا تو دلی کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے۔ اس کے ہونٹوں کی سرخی شدتِ غم میں زرد پڑ گئی۔ اس نے پاکستان کے حامیوں کے خون سے ہونٹ سُرخ کیے تو خون آشام دلی کے منہ کو خون لگ گیا۔ جب لاکھوں انسانوں کے خون سے بھی اس کی پیاس نہ بجھی تو وہ پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں کا پانی بھی پی گئی۔ (ص ۱۳، ۱۴)

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارتی افواج نے بغیر اعلانِ جنگ کے پاکستان پر حملہ کر دیا اور لاہور کے قریب واہگہ چیک پوسٹ اور چند ایک گاؤں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنگ بندی کے اعلان کے بعد جب بھارتی افواج ان علاقوں سے واپس گئی تو یہ علاقے اس کی بربریت کا کھلا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ رفیق ڈوگر کا قافلہ

جب واگہہ کی طرف بڑھتا ہے تو اسے یہ واقعات یاد آجاتے ہیں اور وہ اس کی تصویرکشی شروع کر دیتا ہے:

ان سڑکوں، راستوں اور کھیتوں میں ہمارے عظیم دوست بھارت کے ٹینک اور توپیں پیام دوستی گھر گھر پہنچانے کے لیے دوڑتے اور دھاڑتے پھر رہے تھے ۔ پھر جب کئی ماہ تک ہمارے مہمان رہ کر وہ اپنے گھروں کو واپس گئے تو اس زمین کی ہر چیز اپنے ساتھ لے گئے، مکانوں کی چھتیں، کھڑکیاں، دروازے، اینٹیں، سڑکوں کے کنارے سے درخت اور کھیتوں سے ہریالی ۔ وہ اس خطۂ زمین پر لوہے اور بارود کی توانا فصل چھوڑ گئے، جس کو کاٹتے ہوئے سینکڑوں بچے، جوان اور بوڑھے بھارت کے جذبۂ دوستی کی نذر ہو گئے تھے ۔ (ص ۱۶)

ڈوگر کی طبیعت میں شگفتگی و مزاح بھی ہے اور طنز کی کاٹ بھی ۔ واگہہ پر کرنسی کا کاروبار کرنے والے ہندو، پاکستانی زائرین سے روپیہ خریدنا چاہتے ہیں لیکن یہ اعلان بھی کرتے جاتے ہیں کہ پاکستانی روپیہ یہاں کون لیتا ہے اور روپیہ سمیٹتے بھی جاتے ہیں۔ مصنف ان کا یہ اعلان کئی مرتبہ سنتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر کہتا ہے:

پاکستانی روپیہ کوئی نہیں لیتا تو آپ نے کیا داج میں دینا ہے؟ (ص ۲۵)

ایک موقع پر ایک ذمہ دار سکھ افسر سے پاک پنجاب اور بھارتی پنجاب میں پنجابی زبان کی اشاعت و ترقی سے متعلق بات چیت ہوتی ہے ۔ اس ضمن میں مصنف بھارتی پنجاب میں بھی گورمکھی رسم الخط کی بجائے نستعلیق کی ترویج کی تجویز پیش کرتا ہے، جس پر مذکورہ سکھ گورمکھی کا مطلب "گوروؤں کے منہ سے نکلی ہوئی" بتاتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ مصنف فوراً اس کا توڑ اس شگفتہ جملے سے کرتا ہے:

"گورو کے منہ سے رسم الخط تو نہیں نکلا ہوگا" (ص ۵۱)

ایک بوڑھا ہندو بھارتی قلی، جس کا کبھی لاہور سے تعلق تھا، جب مصنف سے لاہور کے بارے میں کچھ پوچھتا اور یہ کہتا ہے کہ "میں بھی لاہور کا رہنے والا ہوں" تو مصنف اسی لمحے اس کے اس تعلق پر اپنا شگفتہ ردِعمل ظاہر کرتا ہے:

"یہاں پاسپورٹ پر مزدوری کرنے آئے ہو؟" (ص ۲۳)

طنز و مزاح کے چٹکلے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے موجودہ گدی نشین کی تصویر بھی ملاحظہ ہو:

امام ضامن سیدھے سادے سجادہ نشین ہیں ۔ ان میں خواجہ حسن نظامی کی سی بزرگی ہے نہ خواجگی۔ انھیں

زائرین کو حضرت نظام الدین اولیا ہی کی کرامات سے نوازنا پڑتا ہے۔ کس بادشاہ نے کیا گستاخی کی اور اس کا کیا انجام ہوا - ان گستاخیوں اور عبرت ناک انجاموں کا علمی ذخیرہ کافی وسیع رکھتے ہیں، لیکن انھیں استعمال کرنے کی مہارت نہیں رکھتے۔ بات الٹنا بھی چاہیں تو زیادہ گہری الٹنی نہیں لگا سکتے۔ (ص ۸۹)

رفیق ڈوگر ایک صحافی ہے اور نثر نویس ہے، لیکن "اسے آب رود گنگا" میں اس کے بعض خوب صورت جملے شاعرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ پھر جگہ جگہ اس نے فارسی اور اردو اشعار اور مصرعے کھپا کر جہاں عبارت میں زور پیدا کیا ہے وہاں اپنی شعر دوستی اور شعری ذوق کا بھی مظاہرہ کیا ہے - خاص طور پر جن بعض جملوں میں اس نے کسی مشہور شعر کا کوئی ٹکڑا چسپاں کیا ہے ان میں ایک خاص دلکشی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے - چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

"اس کے طالع بیدار نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا" (ص ۵۷)

(یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا — رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا)

"ہم نے شیو کا سامان نکالا اور مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ..." الخ (ص ۸۵)

حضرت اقبال کے اس شعر سے ماخوذ ہے :

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ — مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

"اپنی جبینِ نیاز میں سجدے کی تڑپ کا احساس نہ ہوا" (ص ۱۱۳)

حضرت علامہ فرماتے ہیں :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

"دلی وہ چمن ہے جس میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری" (ص ۱۹۳)

حضرت علامہ کا شعر ہے :

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے — چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

"وہ بنگالی بھی گالی سن کر بدمزہ نہیں ہوتے۔" (ص ۲۱۰)

غالب کہتا ہے :

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ ۔ (مشکوٰۃ کتاب البیوع، فصل اوّل، باب الکسب وطلب الحلال)

حضرت مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بہترین رزق جو کوئی شخص کھاتا ہے، وہ ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتا ہے۔ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔

یہ ایک چھوٹی سی حدیث ہے جو صرف ایک جملے پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کے ایک بنیادی مسئلے کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کسبِ حلال، طلبِ حلال اور رزقِ حلال نہایت ضروری اور اساسی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر اور عمدہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتا ہے، اس سے اچھا اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ ہاتھ سے کمانا اور طلبِ معاش کے لیے محنت اور جدوجہد کرنا، کوئی طعن کی بات نہیں ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں پائی جاتی، بلکہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے اور پیٹ پالنے کے لیے خود انبیائے کرام بھی ہاتھوں کو حرکت دیتے اور محنت و مشقت کرتے رہے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے اور ان پر اللہ کی طرف سے کتاب بھی نازل ہوئی تھی، جس کا نام زبور تھا۔ ان میں بے شمار اوصاف پائے جاتے تھے، لیکن اس عظمت اور رفعتِ شان کے باوجود اپنے ہاتھ سے رزق حاصل کرتے تھے۔ وہ لوہے کی زرہیں بناتے تھے اور اس سے جو آمدنی ہوتی تھی، اس سے اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ لوہے کو کاٹنا، پگھلانا اور پھر اس کی کڑیوں کو خاص طریقے سے موڑ کر ایک انسانی لباس تیار کرنا، کوئی معمولی بات نہیں، بہت ہی محنت اور مشقت کا کام ہے، جو حضرت داؤد علیہ السلام کرتے تھے۔

وہ دور آج کل کی طرح کوئی مشینی دور نہ تھا، انسان سب کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ اندازہ کیجیے

اللہ کے پیغمبر حضرت داؤدؑ کس طرح یہ مشکل ترین کام کرتے ہوں گے۔

ہاتھ سے کام کرنے کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ ہاتھ کے ساتھ ذہن اور دماغ بھی برابر کام کرتے ہیں۔ اِدھر انسان کا ہاتھ کسی کام کے لیے حرکت میں آیا، ادھر پورا انسانی ڈھانچہ مصروفِ کار ہو گیا۔ بڑھئی کوئی چیز تیار کرنے لگتا ہے تو ذہن و دماغ بھی اس کی مدد کرتے ہیں۔ کسان ہل چلاتا ہے کھیتی باڑی کرتا ہے، فصل کاٹتا ہے، معمار مکان تعمیر کرتا ہے، ان تمام امور میں پورا جسمِ انسانی، ان کا ساتھ دیتا ہے۔

ہاتھ سے کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی کام میں عار اور شرم محسوس نہ کرے۔ جو کام کر سکتا ہو، کرنا چاہیے۔ سب سے غلط بات بے کار رہنا ہے۔ جو شخص بے کار بیٹھا رہتا ہے اور کسی کام کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھاتا، وہ نہایت ناکام آدمی ہے۔ زندگی حرکت کا نام ہے، جو شخص عمل و حرکت سے عاری ہے، وہ زندگی کی دوڑ میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ کامیابی اسی کے حصے میں آتی ہے، جو مشکل سے مشکل منزلیں طے کرنے کا عادی ہو اور کٹھن سے کٹھن حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہو۔

جو شخص کسی کا محتاج بن کر نہیں رہتا، خود کام کر کے روٹی کماتا ہے، ملازم ہے تو دیانت داری سے دفتر کے امور سرانجام دیتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے تو کسی قسم کی بددیانتی نہیں کرتا، ایمان داری سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے، وہ شخص اللہ کے نزدیک بلند مرتبے کا مالک ہے۔ رزقِ حلال حاصل کر کے اپنا گزارا کرتا ہے اور نہایت اچھے کردار کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

جس طرح رزقِ حلال حاصل کرنے والا شخص بارگاہِ خداوندی میں محبوب ہے اور اس کے اعمال مقبول و مبرور ہیں، اسی طرح رزقِ حرام حاصل کرنے والا شخص دربارِ الٰہی میں مستحق سزا و عقوبت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ ایک شخص اللہ کے حضور انتہائی خشوع و خضوع سے دعا کرتا ہے، مگر اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ مالِ حرام سے کھاتا پیتا ہے، مالِ حرام سے خرید کر کپڑا پہنتا ہے اور اپنی تمام ضرورتیں حرام کے مال سے پوری کرتا ہے۔ اس کی دعا قبول ہو، تو کیوں ہو۔؟ قبولیتِ دعا اور قبولیتِ عبادت کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ اپنی تمام ضرورتیں حلال کے مال سے پوری کی جائیں۔ ناجائز اور غلط ذرائع سے حاصل کی ہوئی، نہ کوئی چیز حلق سے نیچے

اتاری جائے۔ نہ ناجائز کپڑا پہنا جائے اور نہ کسی اور جگہ پر کوئی غلط چیز استعمال میں لائی جائے۔

رزقِ حلال کو اسلام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کو نظر انداز کر دیا جائے، تو پورے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور لوگ غلط اور مشکوک و مشتبہ ذرائع سے مال جمع کرنا شروع کر دیں گے، جسے مالِ حرام یا رزقِ حرام کہا جاتا ہے۔

ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارے حصولِ رزق کے ذرائع کیا ہیں۔ کیا ہم دھوکے اور فریب سے تو رزق حاصل نہیں کرتے؟ دفتری کام میں کوتاہی تو نہیں کرتے؟ چور بازاری تو نہیں کرتے؟ سمگلنگ تو نہیں کرتے؟ یتیموں، غریبوں، بیواؤں اور کمزور لوگوں کی حق تلفی تو نہیں کرتے؟ رشتے داروں اور قریبیوں پر ظلم تو نہیں ڈھاتے؟ یہ تمام ذرائعِ رزق حرام کے ہیں۔

نقد و نظر

المبین

مصنف : سید سلیمان اشرف

ناشر : مکتبہ قادریہ رضویہ ، اندرون لوہاری دروازہ - لاہور

قیمت : پندرہ روپے

اس کا تعارف مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے تحریر کیا ہے ، دیباچہ سید نور محمد قادری نے لکھا ہے جو ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے -

" المبین " مولانا سلیمان اشرف مرحوم، سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ علی گڑھ کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے - اس کا موضوع ، ان تلبیہات و شکوک کا ازالہ ہے جن کو فلسفۃ اللغۃ العربیہ کے مصنف جرجی زیدان نے عربی زبان کی اہمیت و وقار کو گزند پہنچانے کے لیے وضع کیا - اس کی حیثیت ایسے ادبی اور تحقیقی شاہ کار کی ہے جس میں ایک طرف اگر زبان اور اسلوب کا اچھا خاصا چٹخارہ پایا جاتا ہے تو دوسری طرف تحقیق و تفحص کی ایسی نادرہ کاری بھی جلوہ کناں ہے جو علمی حلقوں سے خصوصی داد پانے کی مستحق ہے -

عربی زبان وسعت اور اظہار و تبیین کی معجزانہ خوبیوں سے اس درجہ مالا مال ہے کہ دنیا کی کوئی زبان اس بارے میں اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی - اس کے الفاظ میں جو معنویت اور آہنگ و صوت کی مناسبتیں پائی جاتی ہیں، وہ بھی صرف اسی کا مقدر ہے - اس میں مرصع اور جامع الفاظ سے لے کر اسلوب تک ہر شے منفرد اور ممیز ہے - یہی وجہ ہے کہ وحی و تنزیل کی تکمیل و اتمام کا جب وقت آیا تو مشیتِ ایزدی نے اس زبان کو یہ فخر بخشا کہ اس کے ذریعے اسلام کے پیغام ہدایت التیام کو عام کیا جائے لیکن اس کا کیا کیجیے کہ عربی زبان کی یہی خوبی نگاہِ استشراق میں بُری طرح کھٹکی ، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نام نہاد عربی دانوں میں اس پر انگلیاں اٹھنے لگیں - کسی نے کہا کہ یہ اہل بادیہ کی زبان ہے ، اس

میں بھلا یہ استعداد کہاں کہ جدید لسانی تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ کسی نے یہ کہہ کر اس کی کم مائیگی پر اعتراض کیا کہ اس میں سوا مترادفات کی کثرت کے اور رکھا ہی کیا ہے، اور جرجی زیدان نے یہ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی کہ عربی زبان صرف دو حرفوں سے ترکیب پذیر ہے اور یہ کہ اس میں بہت سے الفاظ دوسری زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔

مولانا سلیمان اشرف نے عربی زبان کے فضائل اور خوبیوں کو جس بلند لسانی سطح پر پیش کیا ہے اور تحقیق و تفحص کے جن موتیوں کو رولا اور ترتیب دیا ہے، اس سے اس حسین و مکمل زبان کے بارے میں دو ہی منطقی نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یا تو اس کی زلف و کاکل کو سنوارنے اور چمکانے میں بڑی حد تک مشاطۂ قدرت کے دستِ ہنرپرور کا براہِ راست کرشمہ کارفرما ہے اور یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ماہرِ لسانیات نے سوچ سمجھ کر اس کے مزاج و نہج کو ترتیب دیا ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں وضع الفاظ سے تعرض کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آلۂ صوت کو جس جامعیت اور قوت و بلاغت کے ساتھ عربی زبان میں استعمال کیا گیا ہے اس کی مثال کسی عجمی زبان میں پائی نہیں جاتی۔ یہ باب اپنے دامن میں نہایت قیمتی مواد کو لیے ہوئے ہے۔

دوسرا باب مخارج و صفات و اعراب حروف سے متعلق ہے۔ اس میں اعراب و حرکات کا فلسفہ نہایت تحقیق و کاوش سے پیش کیا گیا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ اس کے حروفِ ترکیبی کا معنی و مفہوم سے گہرا تعلق ہے۔

تیسرے باب میں عربی الفاظ کی اس خصوصیت کو امثلہ و نظائر کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ ان کی ترکیب و امتزاج کی صورت میں جو معنویت ابھرتی ہے وہ کیا ہے اور کیوں کر دو حرف مل کر ایک مخصوص مفہوم کو جنم دیتے ہیں۔

چوتھے باب میں حروف کی خصوصیات کی تفصیلی بحث ہے اس میں جرجی زیدان کے علمی بھرم کا پول کھولا گیا ہے، اور ثابت کیا گیا ہے کہ لفظ "قط" ثنائی نہیں، ثلاثی ہے اور اس بارے میں اس نام نہاد مستشرق نے ایسی ٹھوکر کھائی ہے جس کو اہلِ علم کبھی معاف نہیں کر سکتے۔

پانچواں باب کن نوادرِ علمی کا احاطہ کیے ہوئے ہے، ان کو مختصراً بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کا تعلق زبان کے ارتقائی مراحل سے ہے۔

چھٹے باب میں اشتقاق صغیر و کبیر کی لطیف فنی بحث ہے ۔ اس میں اس معجزانہ زبان کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ اس میں الفاظ کی ترکیب و ساخت کچھ اس انداز کی ہے کہ اس کو جتنی ممکنہ صورتوں میں ڈھالا جائے ، معنی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ مثلاً لفظ " قمر " کو لیجیے ، جس کے معنی چاند کے ہیں ، الٹ پھیر سے ممکنہ صورتیں یہ ہوں گی۔(۱) رقم ، اس کے معنی لکھنے کے ہیں۔ (۲) مقر ، زہر کو کہتے ہیں ۔ (۳) رمق ، اس سے مراد تھوڑی سی جان ہے جو باقی رہ گئی ہو۔(۴) قرم ، سردار کے معنوں میں ہے ۔ (۵) مرق ، شوربے کو کہتے ہیں ۔

اشتقاقِ صغیر و کبیر پر متقدمین نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے لیکن جس تفصیل اور تحقیق سے مولانا مرحوم نے اس موضوع پر لکھا ہے ، اس کی نظیر نہیں پائی جاتی ۔

ساتویں باب میں عربی زبان کے اس کمال و اعجاز کا ذکر ہے کہ اس کے الفاظ صرف یہی نہیں کہ اپنے معنی و مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ ان میں مفہوم و معنی کی حقیقت و فلسفہ پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ اس دعوے کے ثبوت میں مولانا نے جو دلائل پیش کیے ہیں ، جن نظائر و امثال کا سہارا لیا ہے اور جس محنت و کاوش اور اجتہاد و استنباط سے کام لیا ہے ، اس سے ان کی عبقریت و عظمتِ علمی کا پتا چلتا ہے ۔

ہماری رائے میں یہ کتاب اپنے موضوع کی اہمیت ، محتویات کی وسعت و تحقیق اور بلیغ تر ادبی اسلوب کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ عربی زبان سے لگاؤ رکھنے والا ہر شخص اس کا مطالعہ کرے۔

(محمد حنیف ندوی)

علمی رسائل کے مضامین

تعمیرِ انسانیت، لاہور — مارچ ۱۹۸۳

مصطلحاتِ قرآن (مسلسل)	قاضی محمد کفایت اللہ
تفسیر کلمۂ شہادت	خواجہ بدرالدین بانڈے
توحید کے تقاضے	نفیس الدین احمد
قرآن کی روشنی میں پیغمبرانہ انقلاب (مسلسل)	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
اسلامی تجارت کی روح — دیانت	قاضی محمد کفایت اللہ
اسلام کی اوّلین جنگ بدر — پس منظر	پروفیسر غلام نبی ماگرے

الحق، اکوڑہ خٹک — فروری ۱۹۸۳

ماثر طورو — علمی حیثیت سے سرحد کا بخارا	قاضی عبدالحلیم آثر
حقیقی ترقی کے اسباب اور اسلام	ڈاکٹر سید مسعود احمد
علامہ انور شاہ کشمیری اور حفظِ حدیث	مولانا حامد الانصاری غازی
ملا احمد جیون اور تفسیراتِ احمدیہ	مولانا ابوالبیان
علی گڑھ میں چند روز (مسلسل)	پروفیسر محمد اسلم

الرشید، لاہور — مارچ ۱۹۸۳

مولانا عبیداللہ سندھی کا آخری سفرِ دیوبند	مولانا عبیداللہ انور
مولانا سندھی اور ان کی تفسیر	مولانا سعید الرحمٰن علوی

زندگی، رام پور — جنوری ۱۹۸۳ء

"تدبر قرآن" پر ایک نظر (مسلسل)	مولانا جلیل احسن ندوی
اردو تعلیم کے ساتھ ستم ظریفی	پروفیسر عمر حیات خاں غوری
معاشرے کی اصلاح کیسے ہو؟	جناب مبارک علی خاں

محترمہ مریم جمیلہ — ایک تعارف	وصی اقبال خاں
ایک فیصلۂ نبوی کا پس منظر	ڈاکٹر حمید اللہ
مسلمان کی زندگی اور موت سنت کے مطابق ہونی چاہیے	ڈاکٹر عبدالحی عارفی
علامہ اقبال اور افغانستان	پروفیسر عبدالمغنی
شارقہ	محمد رابع حسنی ندوی
طلوعِ اسلام، لاہور — مارچ ۱۹۸۳	
اسلام کا سیاسی نظام عہدِ فاروقی میں	——
اسلام — دورِ ملوکیت میں	——
فکر و نظر، اسلام آباد — فروری ۱۹۸۳	
عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ میں تقسیمِ دولت کا نظام	ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ
اسلامی شریعت کا رومی قانون سے تعلق	ڈاکٹر عبدالکریم زیدان - ترجمہ: ساجد الرحمٰن
محدث، لاہور — فروری، مارچ ۱۹۸۳	
معراج النبی سے متعلق اعتراضات کا علمی جائزہ	پروفیسر عبدالرؤف ظفر
برصغیر پاک و ہند میں علمِ حدیث	عبدالرشید عراقی
میثاق، لاہور — مارچ ۱۹۸۳	
اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور	ڈاکٹر اسرار احمد
اتحادِ ملت کے لیے چار نکاتی فارمولا	مولانا عبدالستار نیازی

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن : مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاوراتِ عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایۂ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اُٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمتِ قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری

جلد اول

محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیاتِ غالب : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE

CLUB ROAD LAHORE (PAKISTAN)

مئی ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

طابع و مطبع	مقام اشاعت	ناشر
ملک محمد عارف	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	محمد اشرف ڈار
دین محمدی پریس لاہور	کلب روڈ ، لاہور	اعزازی معتمد

فون ۵۳۹۰۸

المعار[ف] لاہور

شمارہ ۵ | رجب ۱۴۰۳ء | مئی ۱۹۸۳ | [جلد] ۱۶

ترتیب

تاثرات

تمام جرائد و رسائل مضمون نگار حضرات کے محتاج ہوتے ہیں اور ان ہی کے رشحاتِ قلم سے یہ گاڑی چلتی اور آگے بڑھتی ہے۔ ہم نہایت شکر گزار ہیں کہ ہمارے کرم فرما ہمیں یاد رکھنے اور اپنی قیمتی نگارشات "المعارف" کے لیے ارسال فرماتے ہیں۔ مضمون لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک تحقیقی مقالے کے لیے جان جوکھوں میں ڈالنا پڑتی اور بہت سی کتابوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جب ایک محقق قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتا اور اپنے افکار کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے تو ذہن کی توانائیاں اور فکر کی تمام قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ کوئی شخص اس کا احسان ادا نہیں کر سکتا۔ مواد کی جستجو، پھر اس کو خاص انداز سے ترتیب دینے کی سعی اور بیان و اظہار کے لیے الفاظ اور جملوں کا انتخاب انتہائی مشکل مرحلہ ہے۔ بعض موضوع اس قدر اہم اور نازک ہوتے ہیں کہ ان کو تحریر و کتابت کے سانچے میں ڈھالنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ "المعارف" کو اہلِ قلم نے ہمیشہ یاد رکھا اور کبھی قلتِ مضامین کی نوبت نہیں آنے دی۔ اس پر ہم ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ بعض دفعہ قابلِ احترام اصحابِ علم کے افکارِ عالیہ کی اشاعت میں تاخیر ہو جاتی ہے اور انھیں شکایت کا موقع ملتا ہے۔ ہم امکانی حد تک کوشش کرتے ہیں کہ مضمون کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو اور ہمارے معزز احباب کی فکری کاوشیں جلد جلد قارئین کرام کے مطالعے میں آتی رہیں، تاہم بعض مرتبہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور کسی نہ کسی وجہ سے اشاعتِ مضمون میں تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ ہم اپنے لائقِ احترام مضمون نگار حضرات کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ اس تاخیر کو زیادہ محسوس نہ فرمائیں۔ ان کے افکارِ عالیہ کو ہمارے نزدیک بہت بڑے قیمتی سرمایہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان شاء اللہ وہ "المعارف" میں ضرور شائع ہوں گے۔

غلام ناصر مروت

وحدت نوعِ انسانی میں اسلام کا کردار

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا (اقبال)

اس وسیع و عریض کائنات کے پورے نظام میں "وحدت" کا اصول کار فرما ہے۔ کائنات کی ہر چیز اپنا اپنا فریضہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ باقی اشیا کے ساتھ تعلق کے ایک رشتے میں منسلک ہے۔ زمین، چاند اور ستارے جہاں اپنے اپنے محور پر گھومتے ہیں، وہاں اپنے مرکزِ وحدت سورج کے گرد چکر کاٹ کر پورے نظامِ شمسی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ خود انسان کی اپنی ہستی اسی اصول کی پابند ہے۔ انسانی بدن کے تمام اعضا اپنے اپنے کام میں مشغول رہنے کے باوجود دوسرے اعضا کے ساتھ اپنی وحدت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسان کا اعصابی نظام اسی اصول کا مظہر ہے۔ ایسے ہی تمام انسان اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ فطری طور پر متعلق رہتے ہیں۔ ہر ایک انسان کا تعلق شوہر کی حیثیت سے بیوی کے ساتھ اور بیوی کی حیثیت سے خاوند کے ساتھ، بیٹے کی حیثیت سے والدین کے ساتھ اور ماں باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد کے ساتھ، بھائی کی حیثیت سے بھائی کے ساتھ، حاکم کی حیثیت سے محکوم کے ساتھ اور محکوم کی حیثیت سے حاکم کے ساتھ برقرار ہے۔ گویا تمام افراد ایک کنبے کے افراد کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں:

بنی آدم اعضای یکدیگر اند کہ در آفرینش زیک گوہر اند (سعدی)

اس عالم گیر وحدت کے نظام کو قائم رکھنے والی وہی حی و قیوم ذات ہے، جس نے "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" کی صفات سے متصف ہو کر شفقت و ربوبیت کے لحاظ سے تمام انسانوں کو اپنے عیال سے تعبیر فرمایا ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے: "اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ عِیَالُ اللّٰہِ" تمام انسان (اللہ تعالیٰ کی) عیال ہیں۔ (مسلم شریف۔ عنق ۱۶) ۔اور جس طرح انسانی معاشرے کے ہر کنبے کے سربراہ کے علاوہ دیگر

افراد فطری طور پر اس کے خواہاں ہوتے ہیں کہ اس کنبے کے افراد میں نظم وضبط، اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی و یگانگت پائی جائے، کیوں کہ اس خاندان کی راحت وسکون، وقار و عظمت اور ترقی و کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی طرح خدائے بزرگ و برتر نے انسانی کنبے کے تمام افراد مختلف نسلوں، مختلف زبانوں اور مختلف جغرافیائی خطوں میں تقسیم کرنے کے باوجود اقوام عالم کے تمام انسانوں کے دلوں میں یہ خواہش ودیعت فرمائی ہے کہ انسانی کنبے کے تمام افراد کے درمیان الفت و محبت اور باہمی تعاون و خیرخواہی کا رشتہ استوار ہو۔ اسی اصول کے پیش نظر اتحاد و تنظیم کا نظریہ ہر زمانے میں ہر خطۂ زمین پر بسنے والے ہر رنگ و نسل کے انسانوں نے پسند کیا ہے۔

اس عالم گیر خواہش کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا تعاون کی بجائے تصادم، محبت کی بجائے نفرت، اتحاد کے بجائے افتراق اور نظم وضبط کے بجائے انتشار و پراگندگی کا شکار ہے۔ تاریخ اقوام عالم اور زمانۂ حال کے حالات کا مطالعہ کرنے سے ہر فطرت سلیم میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب پوری انسانیت فطری لحاظ سے اتحاد و تنظیم کے اصول کی تصدیق کرتی ہے تو پھر عملی طور پر بنی نوع انسان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر کیوں نہیں ہوتا؟ آخر خدا کے اس کنبے کو یہ پریشانی کیوں لاحق ہوئی اور خدا کی نیابت کا دم بھرنے والا مسلمان انفرادی طور پر یا بہ حیثیت امت کے افتراق و انتشار کے سمندر میں انسانیت کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگا سکتا ہے یا نہیں؟

تاریخ انسانیت کی یہ ایک عالم گیر صداقت ہے کہ تمام انسان بہ حیثیت انسانیت کے برابر ہیں۔ رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی تقسیم کسی امتیاز یا درجہ بندی کا معیار نہیں بن سکتے۔ تمام آسمانی مذاہب مثلاً یہودیت، نصرانیت اور اسلام کے علاوہ کرۂ ارضی پر موجود یا مردہ دیگر مذاہب میں کم از کم یہی ایک چیز مشترک طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ یہ چیزیں انسانیت کو کسی ایک مرکز پر نہ تو جمع کر سکتی ہیں اور نہ ان بنیادوں پر مبنی درجہ بندی دیرپا اور مستقل ثابت ہو سکتی ہے۔

لیکن مقام حیرت ہے کہ ماضی کے علاوہ موجودہ زمانے میں بھی اسلامی معاشرے کے سوا باقی تمام نام نہاد مہذب انسانی معاشروں کے افراد نے اپنے اپنے دائرے تک وحدت و مرکزیت اور اتحاد و تنظیم کی بنیادیں انہی چیزوں یعنی رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی تقسیم پر استوار کی ہوئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زبان پر کچھ لوگ اس حد تک آپس میں متحد ہو گئے کہ دوسری زبان بولنے والوں کے

خلاف تصادم کی راہ اختیار کرلی۔

اسلام نے دوسری معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اس غلط تصور کو ختم کرنے کی طرف خاص توجہ دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ حق وصداقت کا پیغام اقوامِ عالم تک پہنچانے کے لیے دیگر اقوام کی زبان پر عبور حاصل کرنا کوئی جرم نہیں بلکہ اپنے مشن کی تکمیل کا اہم ذریعہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے ایک مشہور صحابی اور کاتبِ وحی حضرت زیدؓ بن ثابت نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی[1] اور ایک دوسری روایت کی رو سے پندرہ روز میں عبرانی زبان سیکھ لی تھی[2] بقول المسعودی حضرت زید بن ثابت فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں سے بھی واقف تھے[3]

دوسری چیز جس کو انسانوں نے وحدت ومرکزیت کی بنیاد قرار دیا وہ نسل کا بت تھا، اور آج تک یہ فتنہ چلا آرہا ہے، لیکن یہ بنیاد بھی پہلی کی طرح ایک نسل کو دوسری نسل کے خلاف ابھارنے کا ذریعہ بنی۔ بنی اسرائیل کے دل میں نسلی غرور پیدا ہوا، جس کی وجہ سے وہ راہِ راست سے بھٹک گئے۔ انھوں نے دعویٰ کیا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط (المائدہ : ۱۸) (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، یعنی ہمیں اس کے نزدیک دوسروں پر فوقیت حاصل ہے)۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ اکثر انبیا علیہم السلام انہی میں سے مبعوث ہوئے ہیں، اس لیے وہ ایک قریشی نبی کی نبوت مان کر ان کی عالم گیر تحریک میں شامل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔ بنی اسرائیل کے علاوہ باقی عربوں کا بھی یہی خیال تھا۔ امویوں اور ہاشمیوں کا جھگڑا بہت پرانا تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں باقی عربوں کے لیے قریش کی ہٹ دھرمی ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ خود اسلامی تاریخ میں خلافتِ راشدہ کے زریں دور کے بعد یہی فتنہ اسلام دشمن عناصر نے مسلمانوں

---

[1] عن زید بن ثابتؓ قال قال لی النبی صلی اللہ علیہ وسلم انی اکتب الی قوم فاخاف ان یزیدوا علی او ینقصوا فتعلم السریانیۃ فتعلمتھا فی سبعۃ عشر یوما۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ج ۳، ص ۲۲، ۵۴۳)

[2] حکایات صحابہ، باب ۱۱، حکایت ۱۸

[3] دائرۃ المعارف ج ۱۰، ص ۵۴۴

کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا۔

ہندوستان میں نسل پرستی ہی نے ذات پات کی لعنت کو جنم دیا اور وہاں کا معاشرہ برہمن، کھشتری اور شودر کی حد بندیوں کا شکار ہو گیا۔ پاکستان میں پٹھان، بلوچی، سندھی اور پنجابی یعنی چار قومیتوں کا نعرہ اسی مرض کے موجبات میں سے ہے۔ مغرب میں جرمنی کے گوئٹے نے جرمن نسل کو "The superman" قرار دے کر جرمن قوم کو نسلی غرور کا نشہ پلایا اور اسی نشے سے سرشار ہو کر ہٹلر نے نازی نسل کو باقی جرمن قوم میں امتیاز کا علم بردار قرار دیا۔

تیسری چیز رنگ ہے جسے انسانوں نے مرکزیت اور اتحاد کی بنیاد قرار دے کر ٹھوکر کھائی لیکن یہاں بھی وہی کھیل کھیلا گیا۔ کالے اگرچہ ایک حد تک ایک مرکز کے گرد جمع ہو گئے لیکن گوروں کے متحدہ غیظ و غضب کا نشانہ بن گئے۔ امریکہ، برطانیہ، نیوزی لینڈ اور سب سے بڑھ کر جنوبی افریقہ میں رنگ کے فسادات ہمارے دعوے کا بیّن ثبوت ہیں۔ وہاں آج بھی کالے اور گوروں کے سکول، ہسپتال اور سفر کے لیے ریل گاڑی کے ڈبے وغیرہ بالکل علیحدہ ہیں، وہاں کے چارپائے تو ایک گھاٹ پر پانی پی سکتے ہیں لیکن انسانی کنبے کے یہ دو مختلف اللون افراد اکٹھے کھا پی نہیں سکتے۔

چوتھی چیز کرۂ ارضی کا کوئی مخصوص خطہ وہاں کے انسانوں کے درمیان اتحاد کا ذریعہ سمجھا گیا ہے اور اس تصور نے وطن پرستی کے نام پر خدا کے اس کنبے میں نفرت و عداوت کے بیج بو دیے۔

بات چلتے چلتے یہاں پر آ کر رک جاتی ہے کہ انسان کے دل و دماغ نے آج تک اس عالم گیر صداقت کو کہ " تمام انسان بہ حیثیت انسان کے برابر ہیں " اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ مندرجہ بالا غلط تصورات کی بنیاد پر رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حد بندی کے بتوں کی پوجا کرنے والا ہر گروہ اپنے نظریات و اصول دوسرے گروہ پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہا، حالانکہ فضائے کائنات میں گونجتے ہوئے اس نغمے کی صدا اس کے کانوں میں برابر آتی رہی کہ بہ حیثیت انسان کے تمہیں اپنے وضع کردہ اصول دوسرے انسان پر ٹھونسنے کا ہرگز حق حاصل نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے جن اصولوں کو تم اتحاد و مرکزیت کی بنیاد قرار دے رہے ہو، اسے دوسرے انسان کا دل و دماغ قبول نہ کرے۔ سو تمام انسانوں کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہ رہا کہ ایک ایسی ہستی کے اصولوں کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنا لیں جو رنگ کے لحاظ سے کسی ایک گروہ کا ہم رنگ نہ ہو۔ نسل کے رشتے

میں کسی ایک جماعت سے منسلک نہ ہو۔ زبان کے لحاظ سے کسی ایک گروہ کی لغوی بندھنوں کا پابند نہ ہو اور جغرافیائی حد بندی کے لحاظ سے کسی ایک خطے کا باشندہ نہ ہو بلکہ تمام کالے اور گوروں کا خالق، تمام اہلِ عرب و عجم کا پروردگار اور پورے کرۂ ارضی کا مالک و حکمران ہو۔ جسے کسی گورے کی محبت کسی کالے سے نفرت پر ابھار نہ سکے اور کسی اچھی نسل کی قرابت داری کسی کی مخالفت پر مجبور نہ کر سکے۔ تمام انسانوں پر ایک کنبے کے افراد کی طرح ایک جیسا مہربان ہو تو لامحالہ ایک یسی ہستی کے وضع کردہ اصول تمام انسانوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پاک و بے عیب اور ہر قسم کی بندھنوں سے آزاد ہستی کا نظام کیا اور کون سا ہے؟ یہودی نظامِ تورات کو اور نصاریٰ نظامِ انجیل کو خدا کا بھیجا ہوا واجب التعمیل لام بتلاتے ہیں یہاں تک کہ مشرکین کی مختلف جماعتیں بھی اپنی اپنی مذہبی رسوم کو خدا تعالیٰ ہی کی لرف منسوب کرتی ہیں۔ لیکن اس اشکال کو خود تورات و انجیل کی مشترکہ تعلیمات نے دور کیا ہے لہ قرآنِ پاک کے آخری اور مکمل پیام اور حاملِ قرآن محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی پیش گوئی کی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر خود حاملین قرآن کے علاوہ باقی انسانوں کے لیے بی اس روشن ہدایت کی طرف رجوع کرنے کے سوا چارہ نہیں جس میں ارشاد ربانی ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىٕلَ لِتَعَارَفُوْاؕ
نَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْؕ (الحجرات، ۱۳)

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت (آدمؑ و حوّاؑ) سے بنایا اور تمھارے خاندان، اور قبیلے ئے تاکہ آپس کی پہچان ہو۔ بلاشبہ اللہ کے ہاں معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے [۴]

---

[۴] یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اس وقت نازل ہوئی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشیؓ اذان کا حکم دیا تو قریش مکہ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان میں سے ایک نے کہا "اللہ کا شکر ہے کہ میرے د پہلے ہی وفات پا گئے اور ان کو یہ روز بد دیکھنا نہیں پڑا۔" حارث بن ہشام نے کہا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم ن کالے کلوٹے (نعوذ باللہ) کے سوا کوئی آدمی نہیں ملا جو مسجد حرام میں اذان دے۔" ابوسفیان بولا "میں کچھ ، کہتا کیوں کہ مجھے خطرہ ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمان کا مالک ان کو خبر کر دے گا۔" چنانچہ جبرئیل امین تشریف

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے فرمایا "کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں - تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔" گویا تمام انسانیت کو مخاطب کر کے اعلان کیا جاتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔

صد جائی اگر گرہ زنی رشتہ یکی است (غالب)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاطرِ فطرت نے انسان کے تراشے ہوئے ان بتوں کو پاش پاش کر کے ان مصنوعی امتیازات و درجہ بندی کے تصور ہی کو ختم کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ آفاقی اتحاد کے اس فطری اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تمام انسانوں نے مل کر آگے بڑھنا ہوگا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ج (المائدہ، ۱۰۳)

اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی اور پھوٹ نہ ڈالو[۵]

اور یہ اتحاد اجسام سے قائم نہیں ہو سکتا بلکہ افکار کی ہم آہنگی سے وجود میں آ سکتا ہے۔

اس نظام کی بنیاد جو دلوں کو جوڑتا اور افکار کو ہم آہنگ کرتا ہے، عقیدۂ توحید پر ہے، یعنی تمام انسان اس ایک اور پاک و بے عیب ہستی کو اپنا خالق، پروردگار اور حکمرانِ اعلیٰ تسلیم کر لیں جو قدرت میں سب پر غالب اور کسی کے خوف یا محبت سے متاثر ہونے والا نہیں۔ جو زمان و مکان کی قید سے

لائے اور آں حضرت کو اس تمام گفتگو کی اطلاع دی۔ آپ نے ان تمام لوگوں کو بلا کر پوچھا "تم نے کیا کہا تھا؟" انھوں نے اقرار کر لیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلایا کہ فخر و مباہات کی چیز درحقیقت ایمان و تقویٰ ہے جس سے تم لوگ خالی اور حضرت بلال آراستہ ہیں، اس لیے وہ تم سے افضل ہیں۔ (مظہری عن البغوی ـــ معارف القرآن - ج ۸، ص ۱۲۵)

۵ اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کتاب اللہ ھو حبل (اللہ الممدود من السماء الی الارض" یعنی کتاب اللہ اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے۔ (ابن کثیر) - حضرت زید بن ارقم کی روایت میں "حبل اللہ ھو القرآن" کے الفاظ آئے ہیں۔ (ابن) قرآن کو یا دین کو رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بنا دیتا ہے۔ (معارف القرآن)

آزاد ہے، جو رشتہ و پیوند کی بندھنوں سے بے نیاز ہے، جو تمام مخلوق کا حاجت روا اور مشکل کشا ہے، اور جس طرح وہ کائنات کو وجود میں لانے اور اسے جان دار و بے جان مخلوقات سے زینت بخشنے میں کسی کا محتاج نہیں، اسی طرح اس کائنات کا نظام چلانے اور مخلوقات کی ضروریات پوری کرنے میں بھی کسی غیر کے مشورے یا تعاون کا محتاج نہیں۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ ذات وصفات میں اس کا کوئی ہم سر و ہمتا نہیں۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس پر اسلام انسانوں کو جمع کرنا چاہتا ہے۔

خالقِ کائنات نے سب سے پہلے انسان اور تمام نوعِ انسانی کے جدِ اعلیٰ حضرت آدم کے دل میں توحید کی حقیقت پیدا کی۔ ان کے بعد ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا علیہم السلام کے ذریعے اس پیغام کو دہرایا جاتا رہا جس کی تکمیل خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ یہ وہی پیغام ہے جس کے ذریعے چودہ سو سال قبل ایک بہت بڑی امت کو متحد کر دیا گیا تھا۔ اس عقیدے نے رنگ ونسل کے تمام امتیازات مٹا دیے تھے۔ صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے شیر و شکر ہوگئے۔ اس آفاقی اتحاد کے رشتے کی وجہ سے روم و فارس اور عرب کا ہزاروں میل کا فاصلہ ختم ہو کر رہ گیا۔ فارسی اور عربی زبانیں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ کالے گوروں کے شیدائی اور گورے کالوں کے فدائی بن گئے۔ یہ رشتہ خونی رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ثابت ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ اور مصعب بن عمیر اپنے والدین کی رفاقت چھوڑ کر اس آفاقی اتحاد کے رشتے میں منسلک ہوگئے اور یہاں کوئی اجنبیت محسوس نہ کی، اور یہ کوئی حادثاتی یا اتفاقی بات نہ تھی، جیسا کہ اہلِ مغرب کا دعویٰ ہے۔ بلکہ یہ اس عظیم ترین مشن کی تکمیل تھی جس کے لیے تمام انبیا علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں کوشاں رہے۔ اس کا چشمہ عرب کی سرزمین سے پھوٹا اور آن کی آن میں ایک بحرِ بے کراں کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ ایک جاں فزا نغمہ تھا جو تمام دلوں کی دھڑکن بن گیا۔

اس بنیادی عقیدے سے گزر کر جب اسلامی نظامِ زندگی کے باقی شعائر پر غور کرتے ہیں تو ان تمام شعائر سے وہی آفاقیت کی خوشبو ٹپک رہی ہے۔

سب سے پہلے نماز کو لیجیے، اس کے شرائط، ارکان اور الفاظ تک میں آفاقی رنگ پایا جاتا ہے مثلاً اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک اکیلا نمازی تنہائی کے باوجود جب نماز میں جمع کے کلمات استعمال کرتا ہے تو عقلِ سلیم کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ نمازی اپنی

انفرادی اہمیت کے باوجود اسلامی زندگی کی اجتماعیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چوبیس گھنٹے کے شب و روز میں کم از کم پانچ دفعہ عقیدۂ توحید کے علم برداروں کو رنگ، نسل، زبان اور علاقائی امتیازات کو پسِ پشت ڈال کر ایک ہی صف میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ افریقہ کے حبشیوں کی صف میں کھڑا ہونے والا امریکہ اور انگلستان کا کوئی گورا اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ میدانِ عرفات میں حجازیوں کے ساتھ سرحد کے پشتون، اصفہان و تبریز کے فارسی بولنے والے اور پیرس و لندن کے فرانسیسی و انگریزی زبان بولنے والے سارے فرزندانِ توحید مل کر ایک ہی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سربسجود ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں میل کے جغرافیائی فاصلے کے باوجود سب لوگ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں۔

آگے چل کر جب نظامِ زکوٰۃ پر غور کرتے ہیں تو یہاں بھی وہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے کہ تمام انسانوں کے دل آپس میں جڑ جائیں۔ یہ حقیقت مصارفِ زکوٰۃ والی آیت سے عیاں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ" (التوبہ : ۶۰)

صدقات (زکوٰۃ) تو صرف حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن زکوٰۃ کے کام پر متعین ہوں اور جن کی دل جوئی کرنی ہے اور (غلاموں کی) گردنوں کے چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کے راستے (جہاد) میں اور راہ کے مسافر کو۔ ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا، اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

گویا اسلام کے نظامِ زکوٰۃ و صدقات میں اس مصلحت کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ کوئی مسافر اپنے آپ کو بے بس پا کر رسوا ہونے پر مجبور نہ ہو۔ بلکہ اہلِ ثروت خود بہ خود ایسے مسافر (ابن السبیل) کی مدد کرنے پر آمادہ ہوں۔ کوئی تنگ دست (فقیر و مسکین) کسی کے آگے دستِ سوال دراز کر کے ننگ و عار کا شکار نہ ہو، بلکہ صاحبِ استطاعت بندے از خود ایسے ضرورت مندوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ کوئی قرض کی لعنت یا غلامی سے تنگ آ کر حدود اللہ سے گزرنے کا ارتکاب کرنے پر (مثلاً فرار یا چوری) مجبور نہ ہو۔ بلکہ فارغ البال افراد ایسے بے بس انسانوں کی حوصلہ افزائی کر کے انھیں آزادی کی دولت سے ہم کنار کرنے میں مدد دیں، اور اگر ہو سکے تو

اس آفاقی اتحاد کے علم بردار اپنے مال کے ذریعے دوسرے انسانوں کی تالیفِ قلب کر کے اس اتحاد کا دائرہ وسیع کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اور ان تمام مراحل پر اس بات کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے کہ اس تعاون کے سب سے زیادہ مستحق وہ محتاج ہیں جو رشتے داروں میں سے ہوں۔

آگے جب اسلام کے ایک اور تکمیلی رکنِ حج پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا یہ شعار تو اس مطلوبہ آفاقی اتحاد کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جس طرح بیت الحرام کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا پورے کرۂ ارضی کا مرکز ہے، اسی طرح اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے انسانوں کی جماعت نوعِ انسانی کے لیے امتِ وسطیٰ ہے۔ یہی زمین کا وہ مقدس ٹکڑا ہے جہاں سے پہلی بار ہدایت کا سرچشمہ پھوٹا اور تمام عالم کی سیرابی کا باعث بنا، اور یہیں سے اس عقیدۂ توحید کی آواز بلند ہو کر چار دانگِ عالم میں پھیلی۔

حج کے موقع پر اس آفاقی اتحاد کا مظاہرہ کرنے کے لیے مختلف علاقوں، مختلف زبانوں اور مختلف رنگ و نسل کے افراد یہ تمام امتیازات بیت الحرام میں داخلے سے پہلے کچھ فاصلے پر چھوڑ کر اور اپنی اپنی زبانیں بھلا کر "صاحبِ خانہ" کی زبان میں مصروفِ مناجات ہو جاتے ہیں۔ تمام مقامی لباسوں کو اتار کر دو سفید چادریں زیبِ تن کر لیتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس لباس میں یہ لوگ نہ صرف زمین کے اوپر اپنے اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ جب ہمیشہ کے لیے زمین کے نیچے چلے جاتے ہیں تو ایسے ہی لباس یعنی کفن میں ملبوس ہوتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اتفاق و اتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود و مطلوب ہونے پر تمام انسان خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں اور کسی مذہب و مشرب سے تعلق رکھتے ہوں، سب کا اتفاق ہے اور اسلام کی بھی یہی دعوت ہے۔

مطالعہ حدیث

مولانا محمد حنیف ندوی

استشراق زدہ حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث و سنت کی تدوین و تسوید تیسری صدی ہجری میں محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرض ظہور میں آئی۔ مولانا ندوی نے اس کتاب میں اس اعتراض کا محققانہ جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ حدیث نبوی کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ایک خاص قسم کا تسلسل لیے ہوئے ہے، جس میں شک و ارتیاب کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے حدیث کے علوم و معارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ایک مکمل سائنس ہے، جس میں رجال و رواۃ کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور ان اصولوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جن سے محدثین نے متن کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے۔ اسلام میں حدیث و سنت کا جو درجہ ہے، اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

صفحات ۱۲ + ۲۱۵ قیمت ۲۵ روپے

پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج

شاہد حسین رزاقی

پاکستانی معاشرے کو نئے سانچے میں ڈھالنے اور قومی ترقی کی راہ ہموار کرنے کے لیے رسوم و رواج کی اصلاح بہت ضروری ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے رسوم و رواج بڑی تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں اور ان رسموں کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی گئی ہے جو اخلاقی اور اقتصادی لحاظ سے بہت بری اور نقصان رساں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ رسوم میں ضروری ترمیم و اصلاح کرنے اور معیوب و مضر رسم و رواج کو بالکل ختم کر دینے کے لیے مفید اور قابل عمل تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب پر مصنف کو یونیسکو کا انعام ملا ہے۔

صفحات ۲۸۶ قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

عبداللہ دیاہ
مترجم: رحمت فرخ آبادی ایم اے

سندھ میں سمہ دور کے سکّے
اور
ان کی تاریخی اہمیت

ازمنۂ قدیم میں سندھ کا رقبہ کافی وسیع اراضی پر مشتمل تھا۔ اس کی حدود شمال میں کشمیر، جنوب میں بحیرۂ عرب، مشرق میں راجپوتانہ اور جیسلمیر کے صحرا تک اور مغرب میں مکران تک تھیں۔ اس قدیم دور میں بھی سندھ اپنی تہذیب و ثقافت اور خوش حالی اور فارغ البالی کی وجہ سے اہلِ دنیا کی نظروں کا مرکز تھا۔

تاریخ سندھ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے پر ۴۸۰ ق م میں ایرانیوں نے حکومت کی اور ۳۲۷ ق م میں سکندرِ اعظم مقدونی نے فتح کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ ۳۲۳ ق م میں یہاں موریہ خاندان کی حکومت کی بنیاد پڑی۔ ۱۹۰ ق م میں یونانیوں کا اقتدار رہا۔ پہلی صدی قبل مسیح میں بارتھی اور سنتھی قوموں نے یہاں اپنے پائے اقتدار گاڑے اور پھر پہلی صدی عیسوی میں یہاں کشن خاندان کے بادشاہوں نے حکومت کی۔ ۳۲۰ء میں خاندانِ گپت کے حکمرانوں نے یہاں اپنا سکّہ جاری کیا اور پھر مغربی اقوام نے سندھ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ ۴۵۰ء میں سندھ میں رائے خاندان کی حکومت و اقتدار کی بنیاد رکھی گئی، جن سے برہمن خاندان نے اقتدار حاصل کیا۔ اس خاندان کی حکومت کو محمد بن قاسمؒ نے ختم کیا اور اس طرح سندھ میں عرب اقتدار و حکومت کی بنیاد پڑی۔ عربوں کے زوال کے بعد سندھ کی حکومت یہاں کے مقامی باشندوں یعنی سومرہ خاندان کے قبضۂ اقتدار میں آئی۔ اس دور کے حکمرانوں میں "دودو چینسر" قابلِ ذکر ہے۔ سومرہ خاندان کے زوال کے بعد سندھ پر سمہ خاندان کا اقتدار قائم ہوا، سمہ سومرہ خاندان کے دوست تھے۔ یہ دراصل چندر ونسی راجپوت تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، ان کا لقب "جام" تھا۔ سندھ پر سمہ خاندان نے تقریباً پونے دوسو سال یعنی ۷۵۱ھ (۱۳۵۰ء) سے ۹۲۳ھ (۱۵۱۹ء)

تک حکومت کی۔ سندھ کے سمہ حکمران کبھی خود مختار رہے اور کبھی سلاطینِ دہلی کے زیرِ سایہ۔

ہر حکومت کے دور میں لین دین اور تجارت کے لیے کوئی نہ کوئی سکّہ ہوتا ہے۔ سکّے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ قدیم زمانے میں جب سکّے کا رواج نہ تھا تو تجارت اور لین دین کے لیے اشیا کے بدلے اشیا کا رواج تھا، لیکن بعد میں جب دھاتوں کے استعمال کا دور شروع ہوا اور لوگوں نے سونا چاندی، تانبے اور پیتل کے استعمال سے آگاہی حاصل کی تو تجارت اور لین دین کے لیے یہی دھاتیں استعمال ہونے لگیں۔ اب ان دھاتوں کے گول، مستطیل اور چوکور ٹکڑوں پر ان کے خالص اور وزن کے صحیح ہونے کی ضمانت کے طور پر بطور نشان ملک کے حاکم کا نام، خاص نشان، لقب کندہ کیا جانے لگا، اس طرح یہ سکّے تجارت کی ترقی اور لین دین میں آسانی کا باعث بنے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان سکوں میں اصلاحات کی جاتی رہیں اور آخر کار یہ سکّے وقت کی ایک اہم ضرورت بن گئے۔ سکّے نہ صرف یہ کہ ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان سے کسی بھی ملک کے کسی بھی دور کے تاریخی حالات و واقعات معلوم کرنے میں کافی مدد ملتی ہے، اور یہ کہ ان کے ذریعے ہمیں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ دیگر معلومات کے مقابلے میں کافی معقول، یقینی اور سائنٹیفک ہوتی ہیں۔ سکّے تاریخ کی ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی افادیت سے کسی طور پر بھی مجالِ انکار نہیں۔

سندھ کی تاریخ کے قدیم حالات کے بارے میں سوائے چند کتابوں کے کوئی اور خاص تاریخی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس وقت جو کتابیں موجود ہیں، ان میں واقعات اور سن میں اختلافات ہیں، چنانچہ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے اور سندھ کی ایک صحیح تاریخ مرتب کرنے کے لیے ہمیں سندھ کے سکوں سے بھی مدد لینی پڑے گی اور ان پر کندہ عبارتوں کی باقاعدہ تحقیق کر کے ہم تاریخ سندھ کے گم شدہ اوراق کو دوبارہ تلاش کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ سکوں پر جو کچھ کندہ ہوتا ہے، اس میں بادشاہ وقت کے ذاتی خیالات، ذہنی رجحانات اور ملک کی سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور مذہبی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

درحقیقت سکوں کے ذریعے ہمیں تاریخ کا اتنا حقیقی اور صحیح مواد ملتا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے ملنا محال ہے۔ ہم اس تاریخی مواد کے ذریعے ایک دور کی حقیقی حالت اور کیفیت کو صحیح

لور پر سمجھ سکتے ہیں۔ درحقیقت سکوں کا صرف جمع کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کا مطالعہ کرنا اور ان پر تحقیق کرنا لازم ہے، کیوں کہ اس طرح ہم ان سے صحیح فائدہ حاصل کرسکتے ہیں اور پھر تاریخ کی کئی ایک لم شدہ کڑیاں ظاہر ہوسکتی ہیں۔

کسی بھی حکومت کا اپنی ریاست میں سکہ جاری کرنا، اس کی خود مختاری کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن سندھ کے سمہ حکمرانوں نے سکے جاری کرنے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ اگرچہ ان میں سے ئ حکمراں خود مختار تھے، تاہم انھوں نے اپنی سلطنت میں اپنے نام اور مہر کا سکہ جاری کرنے کی نرورت محسوس نہ کی اور ہمسایہ ریاستوں کے سکے یہاں جاری رہے۔ سمہ حکمرانوں کے دور کے بارے ں ابھی تک واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان میں سے کن حکمرانوں نے سکے جاری کیے تھے۔ بعض اریخی کتابوں میں اس دور کے سکوں کے بارے میں جو کچھ درج ہے وہ نامکمل اور بہت ہی مختصر ہے، ان کے مطالعہ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سمہ حکمرانوں کے دور میں ان کے اپنے جاری کردہ لکے بھی رائج تھے۔ لیکن کن حکمرانوں نے سکے جاری کیے تھے، اس کے بارے میں نہ تو آج تک تحقیق ی گئی ہے اور نہ کچھ لکھا گیا ہے، جب کہ اس قسم کی تحقیق سے ہمیں سندھ کی تاریخ و ثقافت کے تعلق وافر تعداد میں اہم معلومات حاصل ہوسکتی ہیں، ایسی اہم معلومات جن کے بارے میں کسی شک و بہ کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی ہے۔

سندھ کے سمہ عہد کے ہر ایک حکمران کے دور میں ان کے اپنے کون کون سے سکے رائج تھے ر کون سے سکے دوسرے حکمرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن سندھ میں رائج تھے، آیئے ہم اس بات جائزہ لیں۔

جام انڑ ۷۳۷ھ تا ۷۵۳ھ

سمہ دورِ حکومت کا بانی اور پہلا حکمران جام انڑ تھا۔ یہ ہمیر سومرو کے قتل کے بعد ۷۵۱ھ مطابق ۱۳ء میں سندھ کا حاکم بنا اور اپنے کو "فیروزالدین شاہ جام انڑ" کے لقب سے مشہور کیا۔ اس کے دور رسِ حکومت کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔ محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ تعلیقات تاریخ ہری صفحہ ۳۰۷ پر لکھتے ہیں کہ جام انڑ کا دورِ حکومت ۷۴۹ھ سے ۷۵۳ھ تک ہے، جب کہ ید حسام الدین راشدی مرحوم نے مکلی نامہ کے صفحہ ۲۸۸ پر "شجرہ ب" "نسب نامہ سلاطین سمہ" میں

فیروز الدین شاہ جام انڑ اوّل کا دورِ حکومت ۷۴۳ھ سے ۷۵۳ھ تک بتایا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے دورانِ سفر سندھ (۷۳۴ھ) میں جام انڑ کے ہاتھوں سیوہن کے حاکم ملک رتن کے مارے جانے کا ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ کے اس بیان کو بھی ہم کسی طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے، کیوں کہ اس کی بنیاد پر ہی ہم سید حسام الدین راشدی مرحوم کے دیے ہوئے سن کو تسلیم کرتے ہیں۔

جام انڑ کے دور میں ہندوستان پر محمد بن تغلق نے ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) سے ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) تک کی حکومت تھی، اور سندھ کے اس کے دائرۂ اقتدار میں شامل ہونے سے پہلے ملتان، اُچ، سیوستان، بکھر اور دوسرے علاقے اس کی حدودِ سلطنت میں شامل تھے۔ سندھ میں سمہ خاندان کے خود مختاری حاصل کرنے کے بعد محمد بن تغلق نے سندھ پر حملہ کیا، لیکن ٹھٹھہ سے اکیس کوس کے فاصلے پر ۲۱ محرم الحرام ۷۵۲ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔ محمد بن تغلق کے انتقال کے بعد یہیں فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا، اور پھر دہلی واپس چلا گیا۔ جام انڑ کو، بہرام پور کے قلعے میں حملہ کر کے نماچی کے لڑکے نے قتل کر دیا تھا۔

جام انڑ کے نام کا کوئی بھی سکّہ اب تک نہیں ملا ہے، شاید اس نے اپنا کوئی سکہ جاری نہ کیا ہو۔ اس کے دور میں سندھ میں ہندوستان کے سلطان محمد بن تغلق کے سکّے دینار، تنکہ، عدلی، ششگانی، دوکانی اور جیتل رائج تھے۔ دینار سونے کا سکّہ تھا اور اس کا وزن ۱۹۹ گرین تھا۔ اس کے ایک طرف گول دائرے میں "الواثق بتائید الرحمان محمد شاہ سلطان" اور چاروں اطراف میں "ھذا الدینار بحضرۃ دھلی سنہ سبع وعشرین وسبع مأۃ" لکھا تھا اور دوسری طرف "اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہٗ ورسولہٗ" لکھا تھا۔ یہ سکہ ۷۲۵ھ سے ۷۲۷ھ تک ضرب کیا گیا تھا لیکن یہ سکہ بعد میں بھی ہندوستان اور سندھ میں رائج رہا۔ اس کے علاوہ ایک سونے کا سکا اور تھا جس کا وزن ۱۷۰ گرین ہے۔ اس کے ایک دائرے میں "فی عھد محمد بن تغلق" اور چاروں طرف "ضرب ھذا الدینار بحضرۃ دھلی سنہ ست وثلثین وسبع مأئہ" لکھا تھا اور دوسری طرف "واللہ الغنی وانتم الفقراء" لکھا ہوا ہے۔ یہ سکہ ۷۲۷ھ تا ۷۳۲ھ اور ۷۳۶ھ میں جاری ہوا۔ تنکہ چاندی کا سکہ ہوتا تھا۔ ۷۳۰ھ میں جاری کردہ تنکہ کے سکے کے ایک طرف کلمہ تحریر ہے اور چاروں طرف سن اور ٹکسال کا نام لکھا ہوا ہے اور دوسری طرف چاروں خلفائے راشدین

کے اسمائے مبارک اور درمیان میں "المجاھد فی سبیل اللّٰہ محمد بن تغلق شاہ" لکھا ہوا ہے۔ ۷۳۰ھ میں محمد بن تغلق نے پیتل اور تانبے کے تنکے بھی چاندی کے بدلے چلائے۔ یہ سکے سندھ میں بھی پہنچے اور یہاں کافی عرصہ تک گردش میں رہے۔ تانبے کا ایک تنکہ جس کے ایک طرف "من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن" اور اس کے چاروں طرف "در اقلیم تغلق پور تربہت سال بر ہفت صد سہ" اور دوسری طرف "مہر شد تنکہ رائج در روزگار بندہ امیدوار محمد بن تغلق" لکھا ہوا ہے۔ پیتل کا ایک تنکہ جس کا وزن ۱۱۲ گرین ہے، اس کے ایک طرف "لا یولا السلطان کل الناس بعضھم بعضا تغلق" اور دوسری طرف "اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم محمد" لکھا ہوا ہے۔

اسی طرح سونے، چاندی اور تانبے کے کچھ سکے مصری خلفا کے نام پر بھی جاری کیے گئے۔ ۷۴۸ھ میں جاری شدہ تانبے کے ایک سکے پر جس کا وزن ۵۵ گرین ہے، ایک طرف "الحاکم بامر اللّٰہ ۷۴۸" اور دوسری طرف "ابو العباس احمد" لکھا ہوا ہے۔ محمد بن تغلق کے دور کے چند چھوٹے چاندی کے سکے بھی ملے ہیں جن کے ایک طرف "محمد بن تغلق شاہ" اور دوسری طرف "السلطان العادل" کندہ ہے۔ اور کسی پر "المجاھد فی سبیل اللّٰہ" تحریر ہے۔

جیتل تانبے کا سکہ تھا اور چاندی کے سکے تنکہ میں ۶۴ جیتل ہوتے تھے، اور ایک جیتل میں چار فلوس یعنی تانبے کے چھوٹے سکے۔ یہ سکے بھی سندھ میں ٹھٹھہ، بدین، سیوہن اور اروڑ سے دست یاب ہوئے ہیں، اس سے یہ امر یقینی ہے کہ یہ سکے سندھ میں بھی رائج تھے۔

۲- جام صدر الدین اور علاء الدین جام جونا (۷۵۳ھ تا ۷۶۸ھ)

جام انڑ فیروز شاہ کے قتل ہونے کے بعد جام صدر الدین اور علاء الدین جام جونا ۷۵۳ھ (۱۳۵۲ء) میں سندھ کے والی بنے اور مشترکہ طور پر حکومت چلانے لگے۔ انھوں نے پورے سندھ کو اپنے دائرہ اقتدار میں لانے کا خیال کیا اور اس طرح ایک بڑے لشکر سے حملہ کر کے بکھر کو ترکوں سے آزاد کرایا اور اس طرح مکمل طور پر خود مختار ہو کر حکمرانی کرنے لگے۔ یہ بات فیروز شاہ تغلق کو پسند نہ آئی اور وہ ۷۶۶ھ میں نوے ہزار سوار اور چار سو اسی ہاتھیوں سمیت ٹھٹھہ پر حملے کی نیت سے آیا، لیکن سندھ کے لشکر نے اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا، اس طرح ٹھٹھہ فتح نہ ہو سکا اور فیروز شاہ تغلق اپنی فوج

سمیت گجرات کے راستے واپس چلا گیا۔ لیکن اپنی اس ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے مکمل تیاریوں کے ساتھ ۷۶۷ھ میں دوبارہ ٹھٹھہ پر حملہ آور ہوا، اہلِ سندھ نے اس کا سخت مقابلہ کیا، چنانچہ فیروز شاہ تغلق نے صلح کی غرض سے سید جلال الدین سرخ بخاری کو درمیان میں ڈالا اور اس طرح سمہ حکمرانوں اور فیروز شاہ تغلق کے درمیان انھوں نے صلح کرائی۔ فیروز شاہ تغلق دہلی کو واپسی کے وقت علاء الدین جام جونا اور جام بھانن کو اپنے ساتھ لے گیا اور ۷۶۸ھ (۱۳۶۷ء) میں دہلی واپس پہنچا اور انھیں شاہی محل کے متصل رہائش دی اور دو لاکھ تنکہ ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ جام جونا اور جام صدر الدین کے دور کا جاری کردہ کوئی سکّہ اب تک دست یاب نہیں ہوا ہے، جب کہ یہ ان کی خود مختاری کا دور تھا لیکن اس کے باوجود اس دور میں سندھ میں محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے دور کے سکے جاری رہے جو سونے، چاندی اور تانبے کے تھے۔ ان میں سے کچھ سکے ان بادشاہوں کے نام کے اور کچھ مصری خلفا کے نام کے ڈھلے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تجارتی تعلقات کی وجہ سے سندھ میں ایرانی اور عربی سکے بھی رائج تھے۔

۳- رکن الدین شاہ جام تماچی اور خیر الدین جام توگاچی (۷۶۸ھ تا ۷۷۲ھ)

علاء الدین جام جونا اور جام صدر الدین کے بعد ۷۶۸ھ (۱۳۶۷ء) میں جام انڑ کا لڑکا جام تماچی اور جام جونا کا لڑکا جام توگاچی مشترکہ طور پر حکومت کرنے لگے۔ یہ حکمران بھی بیرونی بالادستی کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس وجہ سے کچھ عرصے بعد انھوں نے فیروز شاہ تغلق کی اطاعت ترک کر دی اور خود مختاری اختیار کر لی۔ چنانچہ فیروز شاہ تغلق نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین سرخ بخاری کے ہمراہ جام جونا کو روانہ کیا، چنانچہ علاء الدین جام جونا نے ٹھٹھہ پہنچ کر ۷۷۲ھ (۱۳۷۱ء) میں جام تماچی کو فیروز شاہ تغلق کی خدمت میں دہلی روانہ کیا۔

سندھ کے ان حکمرانوں کا بھی جاری کردہ کوئی سکہ اب تک ہم دست نہیں ہوا ہے، البتہ اس دور سے متعلق فیروز شاہ تغلق کے دور کے کچھ سکے دست یاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک سکہ چاندی کا ہے جس کا وزن ۱۶۰ گرین ہے جس کے ایک طرف "فیروز شاہ سلطانی ضرب بحضرت دہلی" اور دوسری طرف "الخلیفہ امیر المومنین خلد خلافتہ ۷۸۱" درج ہے۔ دوسرا سکہ تانبے کا ہے اس کا وزن ۶۸ گرین ہے۔ اس کے ایک طرف "فیروز شاہ ثانی" اور دوسری طرف "دار الملک دہلی" درج

ہے۔ ایک اور سکہ جو تانبے کا ہے ہم دست ہوا ہے، اس کا وزن ۳۶ گرین ہے۔ اس کے ایک طرف "سلطان فیروز" اور دوسری طرف "بحضرت دہلی" درج ہے۔

فیروز شاہ کے دور کا چھوٹے سے چھوٹا سکہ ۱۸ گرین کا اور تانبے کا ہے جس کے ایک طرف "فیروز شاہ" اور دوسری طرف صرف "دہلی" کندہ ہے۔ یہ تمام سکے ۷۶۸ھ سے ۷۷۰ھ کے دوران جاری کیے گئے تھے۔ فیروز شاہ کے دور میں اگرچہ سونے کے نئے سکے بھی جاری کیے گئے، لیکن یہ سکے سندھ میں دست یاب نہیں ہیں۔

۴۔ علاء الدین جام جونا (دوسری دفعہ — ۷۷۲ھ تا ۷۹۱ھ)

جام تماچی کے ۷۷۲ھ (۱۳۷۱ء) میں دہلی روانہ ہونے کے بعد علاء الدین جام جونا نے دوبارہ سندھ کی حکومت سنبھالی۔ اس نے اپنے رہنے کے لیے جو جگہ تعمیر کرائی تھی، اس سے ملحق شیخ ترابیؒ کا مزار اب تک موجود ہے۔ اس پر علاء الدین جام جونا کا نام اور سال تعمیر ۷۸۲ھ کندہ ہے۔ اس سے اس بات کا یقینی ثبوت ملتا ہے کہ ۷۸۲ھ میں سندھ پر جام جونا حکمران تھا۔ جام تماچی اور اس کا لڑکا صلاح الدین جام انڑ ثانی ان دنوں دہلی میں رہائش پذیر تھے۔ جام جونا دہلی کے سلطان فیروز شاہ تغلق کا وفادار تھا، کیوں کہ سندھ کے تمام حکمران حضرت جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کے عقیدت مند تھے اور وہ ہمیشہ دہلی کے حکمرانوں اور سندھ کے سمہ سلاطین کے درمیان ثالث بن کر صلح کرا دیتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کا انتقال ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں ہوا، اور اب اس کی جگہ غیاث الدین تغلق گدی نشین ہوا، اس طرح جام تماچی دہلی سے سندھ واپس آیا، اور جام جونا کا دور حکومت ختم ہوا۔

جام جونا کے دور میں جن سکوں کا رواج تھا، ان میں سے کوئی سکہ بھی اس کے دور سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ اس دور میں چوں کہ سندھ پر سلاطینِ دہلی کا اثر تھا، اس لیے فیروز شاہ تغلق کے دور کے سکے عام طور پر ملتے ہیں۔ اس دور میں فیروز شاہ تغلق نے اپنے نام کے علاوہ اپنے لڑکے فتح خان بن فیروز شاہ کے نام سے بھی سکے جاری کیے تھے جو تانبے چاندی کے ہیں اور اس کا وزن ۱۴۰ گرین ہے۔ اس کے ایک طرف "فتح خان فیروز شاہ جل اللہ ظلالہٗ و جلالہٗ" اور دوسری طرف اس وقت کے مصری خلیفہ کا نام "فی زمن الامام امیر المومنین المعتضد باللہ

خلدت خلافتہ" کندہ ہے اور بعض سکوں پر دوسری طرف " فی زمن الامام امیر المومنین ابو عبداللہ خلدت خلافتہ" کندہ ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے آخری دور کے سکوں میں ایک طرف" فیروز شاہ سلطانی ضربت بحضرۃ دہلی" اور دوسری طرف " خلیفہ ابو عبداللہ خلد خلافتہ ۷۹۲ھ" کندہ ہے۔ یہ سکے تانبے اور چاندی کے ہیں، ان سکوں سے مشابہت رکھتا ہوا سونے کا سکہ اب تک سندھ میں دست یاب نہیں ہوا۔ فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد بھی یہ سکے کئی سال جاری و ساری رہے۔

۵۔ رکن الدین شاہ جام تماچی (۷۹۱ھ تا ۷۹۵ھ)

فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد غیاث الدین تغلق تخت دہلی پر بیٹھا، اس نے تخت نشین ہوتے ہی جام تماچی کو سندھ روانہ کر دیا۔ اس طرح رکن الدین جام تماچی ۷۹۱ھ (۱۳۷۹ء) میں سندھ آیا اور اس نے یہاں کا اقتدار سنبھالا۔

جام تماچی ٹھٹھہ کے بزرگ شیخ حماد جمالی کا بہت عقیدت مند تھا، اور اس نے شیخ حماد جمالی کو مکلی میں مسجد کی تعمیر کے لیے کثیر رقم دی تھی، اسی جام تماچی کا معاشقہ نوری کے ساتھ چلا تھا اور اس طرح نوری نہ صرف سندھ کی ملکہ بنی بلکہ اس کے قبیلے موہانوں سے ٹیکس بھی معاف کر دیا گیا۔ رکن الدین شاہ جام تماچی کا انتقال ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں ہوا۔ اس کے نام کا کوئی سکہ اب تک ہم دست نہیں ہوا۔ درحقیقت فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد سلاطین دہلی کا اثر سندھ سے کافی کم ہو گیا تھا، کیونکہ اس کے جانشین کافی کمزور تھے اور حکمرانوں کی پے در پے تبدیلی کی وجہ سے ملک کا استحکام ختم ہو گیا تھا، لیکن اس کے باوجود دہلی کے سکے سندھ میں زیر گردش تھے۔ ان سکوں میں سے ایک سکہ محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق کا ہے جو چاندی کا ہے اور اس کا وزن ۱۶۰ گرین ہے۔ اس سکے کے ایک طرف " محمد شاہ فیروز شاہ سلطانی" اور دوسری طرف" خلیفہ امیر المومنین خلد خلافتہ ۷۹۲ھ" لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ غیاث الدین تغلق ثانی اور ابو بکر بن ظفر خاں کے سکے بھی سندھ میں رائج تھے۔

سلاطین دہلی کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے سندھ میں بھی خود مختاری اور پڑوسی ملکوں سے اپنے تعلقات بہتر بنانے کا رجحان بڑھا۔ سندھ کا ہمسایہ اور طاقت ور علاقہ گجرات تھا جو اب خود مختاری حاصل کر چکا تھا۔ سندھ کے سمہ حکمرانوں کے سلاطین گجرات سے خوش گوار تعلقات پیدا ہو گئے اور

تجارت نے بھی ترقی کی ۔ سندھ میں گجراتی سکے بھی رائج ہوئے ۔ اس زمانے میں گجرات کا حاکم مظفر شاہ (۷۹۳ھ / ۱۳۹۰ء) تھا۔

۶۔ جام صلاح الدین ۷۹۵ھ تا ۸۰۶ھ

جام تماچی کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا جام صلاح الدین جو دہلی سے اس کے ساتھ واپس آیا تھا، ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں سندھ کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے سندھ میں امن و امان قائم کیا اور اپنی فوجی طاقت کو مضبوط بنایا اور عوام الناس کی بھلائی کے بہت سے کام کیے ۔ اس کا دور عدل و انصاف کی وجہ سے بہت مشہور ہے ۔ جام صلاح الدین کا انتقال ۸۰۶ھ (۱۴۰۴ء) میں ہوا۔ اس دور میں سندھ سے دہلی کے تعلقات کافی حد تک ختم ہو گئے تھے ، کیوں کہ تغلق خاندان کے آخری حکمران اتنے اہل نہ تھے کہ ہمسایہ صوبوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکیں ۔ دوسری طرف سندھ کے گجرات سے گہرے تعلقات پیدا ہونے کی وجہ سے اب سندھ کے گجرات کے سکے وافر تعداد میں چلنے لگے تھے ۔ اس دور میں بھی ہمیں یہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ سمہ حکمرانوں نے اپنا کوئی سکہ جاری کیا تھا یا نہیں۔

۷۔ جام نظام الدین بن جام صلاح الدین ۔ ۸۰۷ تا ۸۰۹ھ

جام صلاح الدین کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا جام نظام الدین ۸۰۷ھ (۱۴۰۴ء) میں امرا کے مشورے سے تخت پر بیٹھا ۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے چار چچاؤں یعنی جام سکندر، جام کرن، جام بہار الدین اور جام عامر کو جو قید تھے آزاد کر کے اپنی حکومت میں اہم عہدوں پر فائز کیا اور خود عیش و عشرت میں اپنا وقت گزارنے لگا ۔ اس سے اس کے چچاؤں کو موقع ملا اور وہ اس کے خلاف سازش کرنے لگے ۔ چنانچہ جام نظام الدین گجرات کی طرف بھاگ گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا ۔ ہمیں اب تک جام نظام الدین کے دور کا کوئی سکہ نہیں ملا ہے ، لیکن ہمسایہ ریاستوں اور دہلی کے سکے اس دور میں رائج تھے ۔

۸۔ جام علی شیر (۸۰۹ تا ۸۱۶ھ)

جام نظام الدین کے گجرات کی طرف بھاگ جانے کے بعد سرداروں نے اتفاق رائے سے جام تماچی کے لڑکے علی شیر کو ۸۰۹ھ (۱۴۰۷ء) میں تخت پر بٹھایا ۔ اس نے ملکی معاملات کو سدھارا

اور سندھ سے انتشار کو ختم کیا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ چاندنی رات میں کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتا تھا، ایک دفعہ ایسے ہی موقع پر اس کے چچا جام سکندر، جام کرن اور فتح خاں نے حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ جام علی شیر کے دور کا جاری کردہ کوئی سکہ سندھ میں یا باہر نہیں ملا۔ اس کے دور میں بھی ہندوستان اور ہمسایہ ریاستوں کے سکے یہاں زیرِ گردش تھے۔

۹- جام کرن بن خیر الدین جام تو گاچی (۸۱۶ھ)

جام علی شیر کے قتل کے بعد ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) میں جام کرن بن خیر الدین جام تو گاچی بن علاء الدین جام جونا تخت پر بیٹھا لیکن عوام اس سے نفرت کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جام کرن ہی جام علی شیر کا قاتل ہے، اس لیے لوگوں نے اس پر حملہ کر کے طہارت خانے میں قتل کر دیا۔ اس کے دور کا بھی کوئی سکہ نہیں ملا۔

۱۰- جام فتح خاں صدر الدین سکندر شاہ (۸۱۶ھ تا ۸۳۱ھ)

جام کرن کے قتل ہونے کے بعد جام فتح خان بن صدر الدین سکندر شاہ تخت نشین ہوا۔ لیکن توضیحات تاریخ معصومی میں جام صدر الدین سکندر شاہ کی حکومت کا تذکرہ ۸۱۶ھ میں کیا گیا ہے۔ ذکرِ کرام کے مؤلف مولوی حفظ الرحمٰن بہاول پوری نے تحریر کیا ہے کہ جام صدر الدین سکندر شاہ کے دور کا ایک کتبہ جو سرائیکی زبان اور فارسی رسم الخط میں ہے، سنجر پور ضلع رحیم یار خاں (پنجاب) کے قریب ایک غار سے دست یاب ہوا ہے۔ یہ ایک پکی اینٹ ہے جس پر درج ذیل شعر لکھے ہوئے ہیں۔

سلاں سل بند تھیپاں بھگیا نام نصیر — کھوہ کھوٹا یا پتر گامن دے انتر نام ہمیر
وقت سکندر بادشاہ ملک دھنی بھلوان — رعیت راضی ایہہ جیئی جو بڈھا نت جوان
اک لکھ سلاں لگ چکیاں تھیا کھوہ تمام — ترے سو بوٹے باغ دے دادھے انتر جام

جام صدر الدین سکندر شاہ کا سوائے اس کتبے کے کوئی دوسرا ثبوت یا سکہ اب تک نہیں ملا جس سے اس کے دورِ حکومت کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکیں۔

جام فتح خاں بن صدر الدین سکندر شاہ ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) میں تخت نشین ہوا، اس نے حکومت کے پرانے اور فرسودہ نظام کو بدلا اور اس میں کئی اصلاحات کیں اور اس طرح اپنی حکومت

کو مستحکم کیا۔ اسی کے دور میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اس کے بعد دہلی سے تغلق خاندان کی حکومت کے خاتمے کے بعد سید گھرانے کو اقتدار ملا۔ اس اقتدار میں تبدیلی کی وجہ سے کئی صوبے خود مختار ہوگئے اور سندھ کا تعلق بھی ہندوستان کے حکمرانوں سے ٹوٹ گیا۔ جام فتح خاں نے سندھ پر تقریباً پندرہ سال حکومت کی اور اس کا انتقال ۸۳۱ھ (۱۴۲۷ء) میں ہوا۔

جام فتح خان کے دور میں بھی سندھ کے تعلقات ہمسایہ علاقہ گجرات سے کافی گہرے رہے۔ جس کی وجہ سے وہاں کے حکمران احمد شاہ (۸۱۴ھ - ۸۴۶ھ) کے چاندی اور تانبے کے سکے بھی سندھ میں رائج تھے۔ احمد شاہ گجراتی کا چاندی کا ایک سکہ جس کا وزن تقریباً ۲۷ گرین ہوگا، اس کے ایک طرف "احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ خلد خلافتہ ۸۲۸ھ" کندہ ہے اور دوسری طرف "السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ابوالفتح" لکھا ہوا ہے۔ اس کا ایک تانبے کا سکہ جس کے ایک طرف ایک سمت میں "السلطان احمد شاہ" اور دوسرے کناروں پر بھی کچھ کندہ ہے جو کٹ جانے کی وجہ سے نہیں پڑھا جا سکا۔ لیکن اس کے دوسری طرف "السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین" کندہ ہے۔ اس کا دوسرا سکہ تانبے کا ہے جس کا وزن مندرج بالا سکے سے کچھ کم ہے، اس کے ایک طرف "السلطان احمد شاہ" اور دوسری طرف "ناصر الدنیا والدین" لکھا ہوا ہے۔ گجراتی سکوں کے علاوہ سندھ میں جون پور کے حاکم ابراہیم شاہ کے تانبے کے سکے بھی دست یاب ہوئے ہیں جن میں ایک طرف "ابراہیم شاہ سلطانی خلدت مملکتہ" اور دوسری طرف "الخلیفہ امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۱۰ھ" کندہ ہے۔ یہ سکے سندھ کے کئی حصوں سے دست یاب ہوئے ہیں، لیکن ان میں جام فتح خان کا اپنا جاری کردہ کوئی سکہ نہیں ہے۔

۱۱۔ جام تغلق عرف جونا بن صدر الدین سکندر شاہ (۸۳۱ھ تا ۸۵۷ھ)

جام فتح خان کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا چھوٹا بھائی جام تغلق عرف جام جونا ثانی بن صدر الدین سکندر شاہ ۸۳۱ھ (۱۴۲۷ء) میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے اقتدار میں اپنے بھائیوں کو بھی شامل کیا اور انھیں بکھر اور سیوستان کے قلعوں کا حاکم مقرر کیا۔ جام جونا ثانی کو سیر و شکار کا بہت شوق تھا اور اپنا بیشتر وقت اسی میں صرف کرتا تھا۔ اس کے دور میں سندھ کے سمہ خاندان کی گجرات کے حکمرانوں سے رشتے داری بھی قائم ہوئی۔ اس کی ایک بیٹی

بیٹی مغلی کا نکاح گجرات کے حاکم سلطان محمد بن احمد شاہ (۸۴۶ھ تا ۸۵۵ھ) سے ہوا، اور دوسری بیٹی کا نکاح قطب عالم (۷۹۰ھ تا ۸۵۸ھ) کے صاحب زادے شاہ عالم سے ۸۴۸ھ میں ہوا۔ ان ازدواجی تعلقات کے قائم ہونے کے بعد گجرات کے حکمرانوں کے سندھ کے حکمرانوں سے گہرے تجارتی اور سیاسی روابط قائم ہوئے۔ جام تغلق کا انتقال ۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) میں ہوا۔ اس دور میں سمہ سلطان کا جاری کردہ کوئی سکہ نہیں ملا ہے۔ ہندوستان کے حکمران محمد شاہ (۸۳۷ تا ۸۴۷ھ۔ ۱۴۳۳ تا ۱۴۴۳ء) کے چاندی اور تانبے کی دھات کے ملاوٹ کے سکے جن کا وزن غالباً ۱۴۲ گرین ہوگا، ملے ہیں، جن کے ایک طرف "سلطان محمد شاہ بن فرید شاہ بحضرۃ دہلی" اور دوسری طرف "الخلیفہ امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۴۲ھ" کندہ ہے۔ اس کے علاوہ تانبے کا ایک چھوٹا سکہ جس کا وزن غالباً ۳۰ گرین ہوگا، اس کے ایک طرف "محمد شاہ" اور دوسری طرف "بحضرت دہلی" کندہ ہے۔ اس کے علاوہ گجرات کے حاکم محمد شاہ (۸۴۶ تا ۸۵۵ھ) کے بھی تانبے کے سکے سندھ کے کئی حصوں سے دستیاب ہوئے ہیں، جن کے ایک طرف "السلطان محمد شاہ" اور دوسری طرف "قطب الدنیا والدین ابوالفتح" [۹] کندہ ہے۔ اس دور میں جون پور کے حکمرانوں کے سکے بھی سندھ میں رائج تھے۔ تانبے کے سکے کے ایک طرف "محمود شاہ بن ابراہیم شاہ سلطان خلدت مملکتہ" اور دوسری طرف "الخلیفہ امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۴۵ھ" کندہ ہے۔

محمود شاہ کے دور کے تانبے کے دوسرے نمونے کے سکے بھی سندھ میں ملے ہیں جن کے درمیان دائرے میں "محمود شاہ" اور اس کے چاروں طرف "بن ابراہیم شاہ سلطان" کندہ ہے، اور دوسری طرف "نائب امیر المومنین ۸۴۴ھ" کندہ ہے۔ گجرات کے ایک دوسرے حکمران غیاث الدین محمد شاہ کے دور کے تانبے کے جو سکے ملے ہیں، ان کے ایک طرف "ابوالحامد محمد شاہ السلطان" اور دوسری طرف "السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین" کندہ ہے۔

۱۲۔ جام سکندر ثانی جام محمد عرف انٹر۔ ۸۵۷ تا ۸۵۸ھ

جام تغلق کے انتقال کے بعد ۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) میں اس کا کمسن لڑکا جام سکندر ثانی تخت پر بیٹھا۔ حکومت کی تبدیلی سے سندھ میں کئی جگہ گڑبڑ پیدا ہوئی اور سیوہن اور بکھر میں بغاوت بھی

ہوئی، چنانچہ جام سکندر ٹھٹھہ سے بکھر روانہ ہوا۔ وہ ابھی نصرپور تک پہنچا تھا کہ ٹھٹھے میں اس کے ایک دربان نے جام مبارک کا خطاب اختیار کرکے تخت پر قبضہ کرلیا، لیکن امرا نے تیسرے دن اسے تخت سے اتار دیا اور جام سکندر کو واپس بلاکر اقتدار اس کے حوالے کیا۔

مولانا علاء الدین منگلوری نے جس نے اپنی کتاب "الزبدہ" کا انتساب جام سکندر کے نام کیا تھا، مقدمہ کتاب میں جام سکندر کا لقب اور نام " الملک المعظم محمد المعروف انڑ بن فتح خان بن صدر الدین بن تماچی بن جام" لکھا ہے۔ جام سکندر ثانی کے دور کا بھی جاری شدہ کوئی سکہ اب تک نہیں ملا۔ اس کے دور میں دہلی کے حکمرانوں کے سکے، اور گجرات کے سلاطین اور جون پور کے حکمرانوں کے سکے سندھ میں زیرِ گردش تھے۔

۱۳- جام سنجر عرف جام رائڈنو (۸۵۸ھ تا ۸۶۶ھ)

جام سکندر ثانی کے انتقال کے بعد جام سنجر عرف جام رائڈنو جو علاقہ کچھ کا حاکم تھا ایک فوج کے ساتھ ٹھٹھے آیا، یہاں کے امرا نے اسے اپنا سردار منتخب کرلیا اور وہ صدر الدین کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنی ریاست کی حدود کو وسعت دی اور فوجی طاقت میں اضافہ کیا، اسے ربیع الاول ۸۶۶ھ میں زہر دے کر مار ڈالا گیا۔ اس کے نام پر جاری کوئی بھی سکہ اب تک دست یاب نہیں ہوا، البتہ اسی زمانے میں دہلی کے سلطان بہلول لودھی کے سکے سندھ میں ملے ہیں۔ چاندی اور تانبے کی ملاوٹ کا ایک سکہ جس کا وزن ۱۴۵ گرین ہے، اس کے ایک طرف "المتوکل علی الرحمٰن بہلول شاہ سلطان بحضرت دہلی" اور دوسری طرف "فی زمن امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۵۸" کندہ ہے۔

اسی طرح جون پور کے حکمران حسین شاہ اور محمد شاہ کے سکے بھی سندھ کے کئی علاقوں سے ملے ہیں۔ تانبے کے ایک سکے پر ایک طرف گول دائرے میں "محمد شاہ" اور اس دائرے کے چاروں طرف "بن محمود شاہ بن ابراہیم شاہ سلطان" اور دوسری طرف "نائب امیر المومنین ۸۶۱" کندہ ہے۔ محمد شاہ کے بھائی حسین شاہ کا ایک سکہ بھی اسی نمونے کا دست یاب ہوا ہے۔ اس سکے میں دائرے کے اندر "حسین شاہ" اور اس دائرے کے چاروں طرف "بن محمود شاہ بن ابراہیم شاہ سلطان" اور دوسری طرف "نائب امیر المومنین ۸۶۵" کندہ ہے۔ اس کے دور میں جون پور

اور دہلی کے سکوں کے علاوہ گجرات کے سکے بھی سندھ میں عام طور پر رائج تھے۔

جام نظام الدین عرف جام نندا (۸۶۶ھ تا ۹۱۴ھ)

جام نظام الدین ثانی عرف جام نندا، اپنے باپ صدر الدین جام سنجر کی وفات کے بعد ۲۵ ربیع الاول ۸۶۶ھ (۱۴۶۱ء) میں تخت پر بیٹھا۔ یہ اعلیٰ اخلاق کا حامل اور علم کا قدر دان تھا۔ اس کے دور میں عوام الناس خوش حال تھے۔ جام نندا مدرسوں اور خانقاہوں کی خوب نگہداشت کرتا ہے۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد جام نندا ایک فوج کے ساتھ ٹھٹھہ سے بکھر پہنچا اور وہاں تقریباً ایک سال قیام کیا اور امن و امان قائم کرنے کے بعد دل شاد نامی ایک غلام کو بکھر کا حاکم مقرر کیا اور پھر ٹھٹھہ واپس چلا گیا۔ جام نظام الدین نندا اتنا پاک باز اور متقی حکمران تھا کہ کوئی مؤرخ اس کی شخصیت کو نظر انداز نہ کر سکا اور سب نے اس کے دور کو تاریخ سندھ کا عہدِ زریں قرار دیا ہے۔ جام نظام الدین نندا نے ٹھٹھہ کو ایک نئے انداز سے رونق بخشی اور اس کی خوب صورتی اور کشادگی میں معتدبہ اضافہ کیا۔ ۸۹۰ھ میں قندھار کے حاکم شاہ بیگ ارغون نے سیوی کے قلعے پر حملہ کیا اور جام نظام الدین کے مقرر کردہ قلعے دار امیر بہادر خاں سے یہ قلعہ چھین لیا اور اپنے بھائی سلطان محمد کو اس کا حاکم مقرر کر کے قندھار واپس چلا گیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع جام نظام الدین نندا کو ملی تو اس نے اپنے بہادر سپہ سالار دریا خان کو فوج کے ہمراہ سیوی روانہ کیا جس نے سلطان محمد کو شکست دے کر قتل کر دیا اور سیوی کا قلعہ دوبارہ واپس لے کر جام نظام الدین نندا کے دائرۂ اقتدار میں شامل کر دیا۔ اس شکست کے بعد جام نظام الدین نندا کے دورِ حیات میں دوبارہ شاہ بیگ ارغون کو سندھ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جام نظام الدین نندا نے تقریباً پچاس سال سندھ پر حکومت کی اور اپنے علم اور قابلیت سے ملکی انتظام اور فوجی طاقت کو بہتر بنایا۔ اس کا انتقال ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) میں ہوا۔ اس کا مرقد ٹھٹھہ کے قریب مکلی کی پہاڑی پر موجود ہے جو سنگ تراشی کا بہترین نمونہ ہے۔

جام نظام الدین، سمہ سلاطین میں پہلا حکمران ہے جس کے نام کے سکے سندھ میں دست یاب ہوئے ہیں، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حکومت مکمل طور پر خود مختار تھی اور اس کی ریاست اقتصادی طور پر خوش حال تھی اور بیرونِ ملک سے تجارت زوروں پر تھی۔ جام نظام الدین نندا کے دور کے سکے تین قسم کے ہیں۔ ان میں صرف وزن اور قیمت کا فرق ہے۔ یہ تینوں سکے تانبے

کے ہیں اور ان پر ایک ہی انداز میں عبارت ہے اور رسم الخط بھی ایک ہے - ان سکوں کے ایک طرف گول دائرے میں " سلطان جام نظام الدین " اور دوسری طرف ایک گول دائرے میں اپنے باپ کا نام " جام صدر الدین " کندہ کرایا ہے - ان سکوں پر نہ سن وغیرہ کا التزام ہے کہ یہ معلوم ہوسکے کہ یہ کس سن میں جاری ہوئے اور نہ ضرب خانے کا تذکرہ ہے ، لیکن یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ٹھٹھہ چوں کہ سمہ سلاطین کا پایہ تخت تھا، اس لیے یہ سکے ٹھٹھہ کی ٹکسال ہی میں ڈھالے گئے ہوں گے - سکوں کی عبارت کا رسم الخط عربی ہے - اس سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں عربی زبان لکھنے اور پڑھنے میں عام طور پر استعمال ہوتی تھی - جام نظام الدین نندا کے دور کا چاندی اور سونے کا کوئی بھی سکہ اب تک دست یاب نہیں ہوا ، بلکہ دہلی کے سلطان بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے سکے سندھ میں رائج تھے - سکندر لودھی کے ایک تانبے کے سکے پر جس کا وزن ۱۴۰ گرین ہے ، اس کے ایک طرف " المتوکل علی الرحمان سکندر شاہ بہلول شاہ سلطان بحضرت دہلی " اور دوسری طرف " فی زمن امیر المومنین خلدت خلافتہ ۹۰۲ " کندہ ہے -

گجرات کے حاکم محمود بیگرہ کے ڈھالے ہوئے سکے بھی سندھ میں عام طور پر رائج تھے - یہ مختلف اقسام کے اور تانبے ، چاندی اور سونے کے ہیں - تانبے کے سکے کے ایک طرف " محمود بن محمد شاہ السلطان " اور دوسری طرف " السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ۸۶۲" کندہ ہے -

دوسرا سکہ تانبے کا ہے جس کے ایک طرف " ابو الفتح محمود شاہ السلطان ۸۶۹ " اور دوسری طرف " السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین " کندہ ہے -

اس کے علاوہ تانبے کا ایک اور سکہ سندھ میں رائج تھا جو سلطان احمد شاہ کے سکے کی نقل تھا - اس کے ایک طرف چوکھنڈی میں " السلطان محمود شاہ " اور چاروں اطراف میں بھی کچھ کندہ ہے اور دوسری طرف " السلطان ناصر الدنیا والدین ۸۸۷ کندہ ہے - اسی طرح چاندی کے ایک سکے کے ایک طرف چوکھنڈی میں " السلطان محمود شاہ " اور اس کے نیچے سن ۸۹۷ " کندہ ہے اور دوسری طرف " السلطان الاعظم ابو الفتح ناصر الدنیا والدین " کندہ ہے علاوہ ازیں

گجرات کی سونے کی اشرفیاں بھی سندھ میں رائج تھیں۔

جون پور کے حاکم سلطان حسین شاہ کے دور کے سکے بھی سندھ میں دستیاب ہوئے ہیں جو اس زمانے میں سندھ میں رائج تھے۔ ان تانبے کے سکوں کے ایک طرف ''حسین شاہ بن ابراہیم شاہ سلطان خلد مملکتہ'' اور دوسری طرف ''الخلیفہ ابوعبداللہ امیرالمومنین خلدت خلافتہ ۸۹۷'' کندہ ہے۔ اسی طرح گول کنڈہ اور بیجا پور کی اشرفیاں بھی جنھیں سندھ میں ''پگوڈا'' کہتے تھے، تجارتی لین دین کے لیے سندھ میں استعمال ہوتی تھیں۔

۱۵۔ جام فیروز شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۲۶ھ

جام نظام الدین کی وفات کے بعد اس کا کمسن لڑکا فیروز شاہ، ناصرالدین الفتح سلطان جام فیروز شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے دریاخان اور سارنگ خان کو اپنا مشیر مقرر کیا اور پھر حکومت کا تمام انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ اسی کے دور میں جام صلاح الدین کے پوتے جام صلاح الدین نے تخت پر اپنا دعویٰ کیا، لیکن امرائے مملکت نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ سلطان مظفر گجراتی کے گھر میں اس کی چچازاد بہن تھی، اس رشتے کی بنا پر وہ مدد حاصل کرنے کی غرض سے گجرات بھاگ گیا۔ اسی دوران جام فیروز شاہ نے اپنی غلط حرکتوں سے دریاخان کو ناراض کر دیا تھا جو اپنی کاہان والی جاگیر پر واپس چلا گیا، اسی اثنا میں جام صلاح الدین نے سلطان مظفر کی مدد سے ٹھٹھے پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات کے پیش نظر جام فیروز کی ماں مدینہ ماچھانی دریاخاں کے پاس گئی اور اسے مدد کے لیے تیار کیا، جس نے دوبارہ واپس آکر جام صلاح الدین کو شکست دے کر ٹھٹھے سے بھگا یا اور دوبارہ جام فیروز شاہ کو ٹھٹھہ کے تخت پر بٹھایا، لیکن اس کے باوجود جام فیروز نے دریاخان سے اپنا رویہ نہ بدلا بلکہ اس کے برعکس وہ مغل امرا کے چنگل میں پھنس گیا، جو دریاخان کے خلاف تھے۔ درحقیقت مغلیہ سردار، جام فیروز کی ماں اور دریاخان کی طاقت اور اثر و رسوخ سے ڈرتے تھے، لیکن حالات موافق نہ تھے۔ چنانچہ جام فیروز کی ماں نے ۹۲۴ھ میں شاہ بیگ ارغون کو سندھ پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ شاہ بیگ ارغون پہلے سے ہی موقع کی تلاش میں تھا، اس سنے ۹۲۶ھ میں ٹھٹھہ پر حملہ کر دیا۔ دریاخاں فوج لے کر شاہ بیگ ارغون کے مقابلے کے لیے نکلا۔ ٹھٹھہ شہر کے باہر نہر ''خاں واہ'' کے قریب دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دریاخان نے شاہ بیگ کی فوج کا

بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن بالآخر مارا گیا۔ جام فیروز فرار ہو گیا اور شاہ بیگ ارغون ۱۱ محرم ۹۲۷ کو ٹھٹھہ شہر میں داخل ہوا، دس دن تک اس کے لشکر نے ٹھٹھہ کو بُری طرح لوٹا اور خوب قتل و غارت گری کی۔ ایک دفعہ پھر جام فیروز کچھ سے پچاس ہزار فوج لے کر شاہ بیگ ارغون کے مقابلے کے لیے آیا، لیکن شکست کھا کر گجرات چلا گیا۔ یہ واقعہ ۹۲۵ھ میں پیش آیا۔ گجرات میں سلطان بہادر نے اس کا بارہ لاکھ تنکا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۹۳۹ھ میں جام فیروز نے اپنی لڑکی سلطان بہادر والیٔ گجرات کے عقد میں دے دی۔ ایک دفعہ پھر جام فیروز سندھ پر حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہمایوں اور سلطان بہادر میں ۹۴۲ھ میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں سلطان بہادر کو شکست ہوئی اور جام فیروز شاہ ہمایوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا، جس نے اسے قتل کرا دیا اور اس طرح سندھ کے سمہ حکمرانوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔

جام فیروز کے دور میں سندھ میں سمہ حکمرانوں کے اپنے سکے بھی زیرِ گردش تھے لیکن یہ تمام سکے تانبے کے تھے۔ کئی ایسے سکے بھی ملے ہیں جن میں چاندی کے ساتھ تانبے کی بھی ملاوٹ ہے۔ یہ سکے وزن میں دیگر سکوں کے مقابلے میں بڑے اور بھاری ہیں۔ اس دور کے تین مختلف پیمائش کے تانبے کے سکے ملے ہیں۔ لیکن ان تینوں کی عبارت یکساں ہے۔ ایک سکہ تانبے کا ایسا بھی ملا ہے جس پر الٹے حروف کندہ ہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سکے ڈھالنے کا سانچہ غلط بن گیا تھا، لیکن یہ سکے بھی زیرِ گردش رہے۔ سکے کے ایک طرف گول دائرے میں "جام فیروز شاہ" اور دوسری طرف اپنے باپ کا نام "سلطان نظام الدین" کندہ کرایا ہے۔ ان سکوں پر سن درج نہیں ہے اور عبارت کا رسم الخط عربی ہے۔ ان سکوں کے علاوہ دہلی کے حکمران سکندر لودھی کے دور کے سکے بھی سندھ میں رائج رہے، لیکن ابراہیم لودھی کے دور کا کوئی ایسا سکہ سندھ سے دستیاب نہیں ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سندھ کا تعلق سلطنتِ دہلی سے مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔ البتہ گجرات کے حکمرانوں سے قریبی تعلقات اور رشتے داری کی وجہ سے سلطان مظفر شاہ بن محمود شاہ اور سلطان بہادر شاہ بن مظفر شاہ کے سکے سندھ میں جاری تھے۔ تانبے کے سکوں کے علاوہ ان کے چاندی کے سکے اور سونے کی اشرفیاں بھی اس دور میں رائج تھیں۔

ہندوستان پر تیمور کے حملے کے بعد اس کی اشرفیاں اور چاندی کے سکے بھی سندھ میں

بہ سلسلۂ تجارت استعمال ہوتے تھے اور تجارتی تعلقات ہی کی وجہ سے عرب سکے بھی سندھ میں رائج تھے اور انھیں قانونی حیثیت حاصل تھی۔ اسی طرح سندھ میں مغلوں کے عمل و دخل کی وجہ سے افغانی اور تورانی سکے بھی دوسرے سکوں کے ساتھ گردش میں رہے۔ سمہ خاندان کا دور سندھ کی تاریخ کا ایک اہم ترین دور ہے۔ ان حکمرانوں نے اپنے دور میں فوجی طاقت کو مضبوط بنایا اور ملکی انتظام کو درست کیا۔ اس زمانے میں سندھ کی بیرونی تجارت عروج پر تھی اور ہمسایہ حکمرانوں سے سندھ کے سمہ خاندان کے گہرے تعلقات تھے، لیکن سمہ حکمرانوں نے اپنے سکے جاری کرنے کی طرف بہت ہی کم توجہ دی تھی، یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ گردش زمانہ کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہم ان سے ناواقف ہیں۔ البتہ سمہ خاندان کے آخری حکمرانوں کے صرف تانبے کے سکے دستیاب ہوئے ہیں، جن کو اب تک ماہرین آثارِ قدیمہ نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ سمہ دور کے جو سکے ملے ہیں ان پر سن وغیرہ نہیں ہے لیکن ان سکوں کے مطالعہ اور اس دور کی تاریخ کے بہ نظرِ غائر جائزے سے ہم یہ اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں کہ یہ سکے بھی ٹھٹھے کی ٹکسال میں کسی امیر کی زیرِ نگرانی ڈھالے گئے ہوں گے، لیکن کسی نے اس بنیادی ضرورت پر دھیان نہیں دیا۔

سمہ دور میں سندھ ایک علمی اور ادبی مرکز بن گیا تھا۔ یہاں بہت سے علمائے کرام نے مدرسے اور دارالعلوم قائم کر رکھے تھے جن کی سمہ حکمرانوں نے کافی امداد بھی کی۔ سمہ حکمران شریعت کے پابند تھے۔ شراب کی فروخت پر ان کے دور میں مکمل پابندی تھی۔ ان کے دور میں کئی جید علما گزرے ہیں، جن میں حضرت مخدوم بلاول، شیخ حماد جمالی، مخدوم اسحاق بھٹی، سخی جام ڈاتار، سخی داد داہی، خلیفو میون ونہیوں، درویش سینھڑو معارفانی اور شیخ طاہر قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات نے یہاں اسلام، اخوت اور حب الوطنی کی تبلیغ کی اور عوام کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت دی۔

پروفیسر محمد حنیف

لسانی نظریات

جدید علم لسانیات (LINGUISTICS) کا سائنسی اسلوب پر مطالعہ گزشتہ تین صدیوں سے شروع ہوا ہے لیکن اسے جدید علمی دریافت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا بلکہ زمانۂ قدیم میں بھی علم لسانیات یونانی علما کے ہاں فلسفیانہ بحث و نظر کا موضوع رہا ہے۔ مفکرین یونان نے زبان کے موضوع کو بہت اہمیت دی ہے اور افلاطون و ارسطو جیسے فلسفیوں نے اسے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ان کا بنیادی مقصد زبان کو بیرونی عناصر سے محفوظ رکھنا اور لغوی مداخلت کی راہیں بند کر کے زبان کی اصلیت کو برقرار رکھنا تھا تاکہ مذہبی تحریروں میں عدم اشتباہ زبان کی حفاظت کی ضمانت مہیا کر سکے۔

یہی نقطۂ نظر تقریباً اس زمانے میں ہندوؤں کے ہاں بھی کارفرما تھا۔ ہندوؤں کے عہدِ قدیم کے سب سے بڑے ماہرِ لسانیات پانینی نے اس زمانے میں فروغ پایا۔ پانینی کی تصنیف اشٹا ادھیائے (ASHTADHAYI) دنیا کی مختلف زبانوں میں قواعدِ لغت کی دست یاب کتابوں میں سے قدیم ترین ہونے کے علاوہ اس علم کی بہترین تصنیف سمجھی گئی ہے۔ اس کا مصنف برہمی رسم الخط کا قائل ہے۔ ہندی ادب و لسانیات میں لسانی تحقیق و مطالعہ کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا اور اس کا محرک بھی یہی امر تھا کہ ویدوں کی زبان کو بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے لسانیات کو فلسفیانہ بحث کا موضوع بنایا اور سنسکرت کے قواعد و قوانین کو فلسفیانہ انداز سے مدون کیا۔ ہندو دھرم کے لسانی تعصب کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ زمانۂ حال میں انھوں نے اردو اور ہندی زبانوں سے عربی مفردات کو خارج کر کے ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ داخل کرنے کی مہم چلائی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ظاہر ہے کہ اس تمام لسانی تحریک کے پس منظر میں مذہبی نقطۂ نظر کارفرما ہے، اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ مذہبی رجحانات لسانیات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق و واقعات اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ زبان کے قوانین و قواعد کی فلسفیانہ

بحث اور اس پر سختی سے پابندی کے عمل کی اصل بنیاد مذہبی عقیدہ ہے اور نظریۂ زبان دراصل نظریۂ تقدسِ زبان ہے جس کا محور دینی کتب ہیں۔

اس طرح عربی زبان کی تدوین کے اوائل عہد میں مسلمان ماہرین لسانیات نے بھی اس کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ حضرت عمر کا ارشاد ہے:

تعلموا اللحن (اللغة) والفرائض فانه من دینکم [1]

عربی زبان اور لغت کا علم حاصل کرو کیوں کہ اس کا تمھارے دین سے گہرا تعلق ہے۔

عربوں نے بھی عربی زبان کے قواعد و قوانین کو ضبط کرنے میں فلسفیانہ انداز اختیار کیا تاکہ کتب دینیہ میں استعمال ہونے والی زبان اپنی اصل حالت کو اس طرح برقرار رکھ سکے کہ زبان کی موشگافیوں یا قواعد کی کم علمی کے باعث احکامِ دین کی تشریح یا تفہیم میں کسی اشتباہ کا خطرہ نہ رہے۔ علمِ نحو کی ابتدائی تدوین کا جو ابوالاسود الدؤلی نے حضرت علی کے ارشاد کے مطابق کی، محرک یہی جذبہ تھا کہ ایک شخص تلاوتِ قرآن میں اعرابی غلطیاں کر رہا تھا، آپ نے اس کی اصلاح کے لیے نحو کے چند ابتدائی قواعد بیان فرمائے [2] قلقشندی لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین عربی کی تعلیم و تعلم پر مسلسل زور دیتے رہے کیوں کہ یہ دین کی زبان ہے [3]

الغرض اہلِ دین ہمیشہ اس امر پر حریص رہے ہیں کہ دینی کتب کسی تحریف یا تبدیلی کے شائبہ سے پاک اپنی اصلی حالت میں باقی رہیں، اور اس کی ضمانت صرف اسی طرح فراہم کی جا سکتی ہے کہ جس زبان میں یہ دینی کتب تحریر ہیں اس کو واضح، ستھری، شستہ اور الفاظِ دخیلہ سے پاک رکھا جائے، جیسے وہ زبان گویا ایک دینی تاریخی وثیقہ ہے جسے کوئی سے بھی حالات ہوں، چھونے کا کوئی جواز نہیں۔

چنانچہ اسلامی ادب کے اللقایں علمائے لسانیات نے زبان کے مصادر کی تحقیق اور ان کی صحت و روایت کے ثبوت کے سلسلے میں جدت پیدا کی اور اس غرض سے ایک باقاعدہ علم ایجاد

---

[1] قلقشندی، صبح الاعشی، خطبہ الامیر القاہرہ ۱۹۱۳ء ۱۴۸

[2] ملاحظہ ہو ایضاح المطالب علی الکافیہ بن الحاجب، دیوبند، مقدمہ، ص ۱

[3] قلقشندی، صبح الاعشی، القاہرہ ۱۹۱۳ء ۱ : ۱۶۸

کیا جس کے قواعد و اساس اس نقطے پر مرکوز ہیں کہ روایات میں سے ثقہ روایت اور رواۃ میں سے ثقہ راوی کی تمیز ہو سکے۔ اس کے بعد استشہاد و استدلال کے لحاظ سے کلام عرب کی تقسیم کی گئی جس کا مرکزی نقطہ بے معنی روایات، اختلاف تعبیر اور کلماتِ دخیلہ یا مشکوک کلمات سے عربی زبان کو محفوظ اور صاف رکھنا تھا۔ اس میں علمائے زبان میں سے کچھ تو زیادہ متشدد تھے اور کچھ ذرا کم[۲۲] در اصل اس کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ حرمتِ زبان اور تقدیسِ زبان کے ضمن میں کون کتنا زیادہ اعتقاد رکھتا ہے۔ مگر اس فرق کے باوجود ماہرینِ علمِ زبان کا اس پر اجماع نظر آتا ہے کہ زبان کے قواعد و استعمال کا معاملہ دین کے اوامر و نواہی کی طرح ہے جس طرح دین کے اوامر و نواہی میں کسی خلاف ورزی کی گنجائش نہیں اسی طرح زبان کے قواعد و احکام سے پہلو تہی کی بھی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، حتیٰ کہ ان میں تبدیلی یا لچک کا خیال کرنا بھی غلط ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ احکامِ قرآن، اس کی تفسیر اور معانی کی تشریح کے سلسلے میں مسلمانوں کی احتیاط اور توجہ میں شدت کا عربی زبان کی ترقی میں بہت بڑا حصہ ہے۔

علوم ادب کی تقسیم میں عربوں نے چھ اصطلاحات قائم کی ہیں۔

(۱) اللغۃ (۲) الصرف (۳) النحو (۴) المعانی (۵) البیان (۶) البدیع

پہلے تین علوم کے ضمن میں عربوں کے فصیح کلام کے علاوہ اور کہیں سے شہادت قبول نہیں کی جاتی، جب کہ باقی تین کے ضمن میں کلام عرب یا غیر عرب کے کلام سے بھی استشہاد جائز ہے۔ اس میں عرب اور غیر عرب کی تمیز نہیں کی جاتی، کیوں کہ اس کا معاملہ عقل کی طرف راجح سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس میں بحتری، ابوتمام، متنبی اور اس قبیل کے دوسرے شعرا کے کلام سے شہادت کو قبول کیا گیا ہے جو کہ شعرائے مولدین کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی وہ شعر جن کا عجمیوں یا اجنبی لوگوں سے میل جول رہا اور اس وجہ سے ان کی زبان میں اجنبی الفاظ داخل ہونے کے اندیشے کے پیشِ نظر معروف کلام عرب سے ان کو بغرضِ احتیاط خارج سمجھا گیا، اور اس بنا پر علوم ادب کی

---

[۲۲] عبدالرحمٰن السید، مدرسۃ البقرہ النحویہ، منشاتہا و تطورہا، دار المعارف، مصر، ص ۳۔ ۱۱ ملخصاً
اسی نقطۂ نظر سے جلال الدین السیوطی نے "المزہر فی علوم اللغہ و انواعہا" اور جوالیقی نے "المعرب من الکلام الاعجمی علی الحروف المعجم" تصنیف کیں۔

پہلی تین اقساط میں ان کے کلام سے شہادت کو صحیح نہیں سمجھا گیا۔ یعنی لغت، صرف اور نحو کے ضمن میں اس گروہ سے متعلق بڑے بڑے شعرا مثلاً بحتری، بشار بن برد، ابو تمام، ابو نواس اور متنبی کے کلام سے بھی استشہاد کو جائز قرار نہیں دیا گیا۔ اس میں ایک اور اہم عنصر کا بھی دخل ہے اور وہ یہ کہ ان عظیم شعرا کے زمانے اور زمانۂ جاہلیت کے درمیان طویل دور حائل ہے، اور خالص معتبر اور ستھری زبان کے لیے زمانۂ جاہلیت ہی کو متفقہ طور پر سند قرار دیا گیا، اور جتنا جتنا وقت اس دور سے دُور ہے اتنا ہی اس دَور کی زبان کے خالص ہونے میں شبہے کی گنجائش پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ حالانکہ شاعری اور زبان و ادب میں ان شعرا کی عظمت اور قدر و منزلت مسلمہ ہے۔ یہ امر اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ زبان کے اوامر و نواہی کی پابندی دین کے اوامر و نواہی کی طرح کی گئی ہے[۵]۔

شعرا کے کلام سے استشہاد کے ضمن میں شعرا کو چار طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ جاہلی شعرا : جو زمانۂ جاہلیت یعنی قبل از اسلام میں ہو گزرے ہیں اور جن کی شاعری کو آج تک بلاغتِ کلام میں مثالی حیثیت حاصل ہے۔ یوں کہ اس وقت تک عربی زبان میں عجمی اثرات کی دراندازی کے امکانات نہیں تھے۔ نیز بالعموم عرب بادیہ نشین تھے اور شہری زندگی سے دور رہتے تھے، جب کہ زبانیں شہروں میں مختلف علاقوں کے رہنے والے لوگوں کے باہمی امتزاج سے متاثر ہوتی ہیں، اس لیے جاہلیت کی زبان کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ البتہ کہیں کہیں ہم ان کے کلام کو نامعلوم اور عسیر الفہم محسوس کرتے ہیں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اس معاشرے اور اس دور کی معاشرتی روایات سے کما حقہٗ آگاہ نہیں ہیں۔ اس دور کے نمائندہ شعرا میں امراء القیس، طرفہ، زہیر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

۲۔ مخضرمون : وہ شعرا جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے پائے ہیں جیسے حضرت حسان بن ثابت اور خنسا وغیرہ۔ ایسے شعرا جنھوں نے اسلامی عہد تو پایا ہے لیکن ان کی شاعری دورِ جاہلیت سے تعلق رکھتی ہے، انھیں بھی بعض محققین نے پہلی قسم میں شمار کیا ہے مثلاً

---

۵ قلقشندی، صبح الاعشیٰ، القاہرہ ۱۹۱۳ ۱ : ۱۶۷ - ۱۸۰ و عبد الرحمٰن طاہر سورتی تاریخ ادب عربی (ترجمہ) فٹ نوٹ ص ۴۰۶

لبید اور امیہ بن ابی الصلت وغیرہ۔

۳۔ اسلامیون : وہ شعرا جو صدرِ اسلام میں ہو گزرے ہیں جیسے جریر، فرزدق وغیرہ۔

۴۔ مولدون یا محدثون : یہ وہ شعرا ہیں جو صدرِ اسلام کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں لسانی ملکہ اور اسنادی حیثیت کمزور تھی، البتہ انھوں نے اضافی صنعتوں سے شعر کو حسن و خوبی عطا کی، اس گروہ میں شعرائے بنی عباس کو شمار کیا جاتا ہے۔

پہلے دو طبقوں کے شعرا کے کلام سے استشہاد کسی نزاع یا اختلاف رائے کے بغیر قبول کی جاتی ہے، مگر صحتِ استشہاد کے لحاظ سے تیسرے طبقے کے شعرا کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ متشدد علمائے زبان مثلاً ابوعمر بن العلا اسلامی طبقے کے کسی شاعر کے شعر کی صحت کو نہیں مانتے سوائے اس استثنا کے کہ وہ متقدمین میں سے کسی شاعر کا شعر ہو۔ مگر جہاں تک چوتھے طبقے کے شعرا کا تعلق ہے ان کے شعر سے استشہاد کی عدمِ صحت پر اتفاق ہے[۵۶]

بعض علمائے ادبیات نے مولدین اور محدثین شعرا کے درمیان تفریق کی ہے۔ انھوں نے مولدین کو چوتھا طبقہ قرار دیا ہے، اور یہ وہ حضرات ہیں جو جاہلی، مخضرمی اور اسلامی شعرا کے زمانی اعتبار سے قریب ہیں، اور محدثین کو پانچواں طبقہ قرار دیا ہے جس میں بحتری اور ابوتمام وغیرہ کو رکھا گیا ہے جب کہ ایک چھٹا طبقہ متاخرین کے نام سے قرار دیا ہے جس میں متنبی کو شامل کیا گیا ہے مگر اس تقسیم در تقسیم کے عمل کے باوجود متاخر الذکر طبقوں کے شعر سے عدمِ استشہاد کی رائے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

شعر و شاعری کے علاوہ دیگر لغوی مصادر میں قرآنِ حکیم، احادیثِ نبویہ، خطب اور ضرب الامثال ہیں۔ قرآن حکیم ایک ایسا مرجع ہے جو فصاحتِ لسانی کے معیارِ کمال کی انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بابِ استشہاد میں جو مقام قرآنِ حکیم کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے مرجع کو حاصل نہیں۔ قرآنِ حکیم لغتِ قریش میں نازل ہوا جو دیگر تمام عربی لہجات میں افصح تھی۔ اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامی تقاضوں کے تحت دیگر لہجات میں بھی قرآن حکیم کی تلاوت کی اجازت دے دی تھی، لیکن قرآن کی تدوین

---

۵۶ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو السباعی، السباعی، تاریخ الادب العربی فی صدر الاسلام و العصر الاموی۔

قریش کے لہجے کے مطابق ہی ہوئی [7]

قرآن حکیم کے الفاظ اور تعبیرات کے ضمن میں یہ ایک بحث پیدا ہوئی ہے کہ قرآنِ حکیم میں عجمی الفاظ کا وجود ہے یا نہیں۔ بعض علمائے لغت کی رائے یہ ہے کہ قرآن کی زبان عجمی تداخل سے پاک ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے خود اپنے بارے میں " قرآناً عربیاً " اور " لسانٌ عربیٌ مبینٌ " کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ قرآن کی زبان عجمی الفاظ کے وجود سے پاک ہے۔ لیکن ابنِ عباس، عکرمہ، مجاہد، ابن جبیر، عطار اور دیگر اہلِ علم فقہا کئی الفاظ کو عجمی الاصل بتاتے ہیں۔ مثلاً طٰہٰ، الیم، الربانیون، الطور سریانی الاصل ہیں۔ الصراط، القسطاس، الفردوس رومی الاصل ہیں، مشکوٰۃ اور کفلین حبشی الاصل ہیں اور ہیت لک حورانی زبان کا لفظ ہے۔ ابو عبیدہ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ نزاع لفظی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اصلاً یہ الفاظ عجمی ہیں لیکن اہلِ عرب ان سے متعارف ہوئے تو انھوں نے انھیں عربی قوالب میں ڈھال کر عربی بنا لیا اور قرآن نے انھیں عربی الفاظ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے [8] امام فخر الدین رازی اور جوالیقی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے [9] زیات کے خیال میں ایک سو سے زاید کلمات ایسے ہیں جو عجمی الاصل ہیں، لیکن عربوں نے انھیں صیقل کر کے اپنے اوزان پر ڈھال لیا ہے اور قرآن نے انھیں عربی الفاظ کے طور پر استعمال کیا [10]

اس تمام بحث کے باوجود تمام علما کا قرآن حکیم کے ان الفاظ سے استشہاد پر اتفاق ہے۔ اسلامی عہد میں قرآن حکیم کے بعد جو چیز سب سے زیادہ عربی زبان پر اثر انداز ہوئی وہ احادیثِ نبویہ ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی لغت پر قدرت تامہ، اسالیب کی مہارتِ کاملہ، زبان و بیان کی بلاغت، پاکیزگیٔ فکر و احساس کے ساتھ ساتھ الہامی فصاحت کی تائید کی وجہ سے ایسی

---

[7] نظام الدین القمی، تفسیر مراتب الفرقان، بولاق ۱۳۲۳، ص ۲۴

[8] ایضاً

[9] جلال الدین سیوطی، المزہر فی علوم اللغۃ و انواعہا، القاہرہ، ۱ : ۲۶۸ - ۹

[10] جوالیقی، ابو منصور، المعرب من الکلام الاعجمی علی الحروف المعجم، القاہرہ ۱۳۶۱ — ص ۵

صلاحیتوں سے مالامال تھی جو آپ کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ آپؐ قریش میں پیدا ہوئے اور بنو سعد بن بکر کے ہاں پرورش پائی، لہذا قدرتی طور پر آپ تمام عربوں سے زیادہ فصیح تھے۔ آپؐ نے خود فرمایا:

أنا اعربکم، أنا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر[۱۱]

میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد بن بکر کی زبان ہے۔

ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اعطیت جوامع الکلم[۱۲]

مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے۔

جہاں آپؐ نے عربی زبان کو جامع اصطلاحی الفاظ عطا فرمائے وہاں آپ کے کئی ایک اقوال ضرب الامثال بن گئے۔ مثلاً

مات حتف انفہ

وہ اپنی ناک سے دم توڑ کر مر گیا۔ یعنی طبعی موت مر گیا۔

الآن حمی الوطیس

اب بھٹی تیز ہو گئی۔ یعنی جنگ بھڑک اٹھی۔

قرآن و حدیث کے علاوہ عربی زبان میں گراں قدر مستند ذخیرہ ضرب الامثال اور خطبات کا ہے۔ اگرچہ جاہلی دور کے عربوں نے نثر کو جمع کرنے میں چنداں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ صبح الاعشی کا مصنف لکھتا ہے کہ:

عرب شہریوں اور بدوؤں کی عمدہ نثر اور بلیغ خطبات کی مقدار ان کی شاعری سے کسی طرح کم نہیں؛ لیکن فرق یہ ہے کہ نثر کا دسواں حصہ بھی محفوظ نہیں رہا، جب کہ شاعری کا دسواں حصہ بھی ضائع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ خطیب عام طور پر بادشاہوں کے سامنے یا لڑائیوں کے وقت یا متحارب گروہوں

---

۱۱ ابو داؤد، سنن، کتاب الصلوٰۃ، ابواب الجمعۃ والخطبۃ

۱۲ غزالی، احیاء علوم الدین، ۲: ۲۶۴، قاضی عیاض، الشفا، القاہرہ، ۱: ۴۷

میں صلح کرانے کے لیے یا مجلسِ نکاح وغیرہ کے موقعے پر خطبہ دیا کرتے اور جب وہ موقع گزر جاتا تو کچھ لوگ اسے یاد رکھتے اور کچھ بھول جاتے، اس کے برعکس اشعار میں سے ایک بیت بھی ضائع نہ ہوتا۔[۱۳]

بہرحال علمائے لغت نے ضرب الامثال اور خطبات کو جمع کر کے ان کی شرحیں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں ضرب الامثال پر سب سے پہلے کامیاب کوشش المیدانی (م ۵۱۸ھ) کی ہے جس نے اپنی تمثیل مجمع الامثال تقریباً پچاس مجموعوں کی مدد سے تیار کی، اس میں امثال حروف ہجا کی ترتیب سے جمع کی گئی ہیں۔[۱۴]

خطبات کے نمونے تاریخِ ادب کی متعدد کتابوں میں ملتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت کے خطبا میں قس بن ساعدہ الایادی، عمرو بن کلثوم التغلبی، اکثم بن صیفی التمیمی، حارث بن عباد البکری، قیس بن زہیر العبسی، عمرو بن معدیکرب الزبیدی مشہور ہیں۔ اسلامی عہد کی خطابت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبا کو نئے اسالیب اور جدید آہنگ سے روشناس کرایا۔ آپ کے بعد حضرت عمر بن الخطاب، حضرت علی بن ابی طالب، زیاد بن ابی سفیان اور حجاج بن یوسف نامور خطبا کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔[۱۵]

الغرض مسلمان علمائے لسانیات نے عربی زبان کی پاکیزگی، اس کی اصل صورت اور فصاحت کو قائم و دائم رکھنے کے لیے جو قواعد و ضوابط وضع کیے اور جس محنت سے مختلف علومِ زبان ایجاد کیے اور جس شدت سے ان پر عمل پیرا رہے، دیگر ادیان کی دینی و الہامی کتب کی زبانوں کی حفاظت کے سلسلے میں کیے گئے اقدامات ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

۱۳ھ قلقشندی، صبح الاعشیٰ، ج ۱، ص ۲۱۰

۱۴ھ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، المعارف استانبول، ص ۱۵۹۷

۱۵ھ حضرت علیؓ کے خطبات کا مجموعہ نہج البلاغہ کے نام سے معروف ہے۔ مصر کے نامور سکالر شیخ محمد عبدہٗ نے اس کی شرح لکھی ہے۔

محمد اسحاق بھٹی

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی کے چند مکتوبات

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی کا انتقال ۳۱ مارچ اور یکم اپریل ۱۹۸۲ء کی درمیانی شب کو کراچی میں ہوا تھا۔ مئی اور جون ۱۹۸۲ء کے "المعارف" (دو شماروں) میں ان کے حالات و واقعات بیان کیے گئے تھے۔ میری ان سے خط و کتابت تھی۔ میرے نام ان کے چند مکتوبات جو محفوظ رہ گئے ہیں، "المعارف" میں درج کیے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ دلچسپ مکتوبات ہیں، جن کا ایک خاص اسلوبِ تحریر ہے۔ (محمد اسحاق بھٹی)

(۱)

مخلص محبِ محترم![1] سلام و دعاہائے وافرہ

لفافہ شرفِ صدور لایا۔ پڑھا اور سینے سے لگایا۔ ادارے کی پرانی یادوں نے رُلایا۔ آرزوئے ملاقات نے تڑپایا۔ ماضی کے گہرے تصوّر نے کراچی سے لاہور پہنچایا۔ جیتا جاگتا منظر سامنے آیا۔ زندہ دلی کا بادل چھایا۔ خوشیوں کا مینہ برسایا۔ تصور ہی تصور میں چائے پی بسکٹ کھایا۔ پھر کوئی لطیفہ سنایا۔ خود ہنسے دوسروں کو ہنسایا۔ محفل برخاست ہوئی تو اپنی سیٹ پر آیا۔ کچھ پڑھا پڑھایا۔ کچھ لکھا لکھایا۔ کچھ یاد کیا کچھ بُھلایا۔ کسی کو روکا کسی کو بھگایا۔ احباب نے فرمائش کی تو گانا گایا، یا گیت سنایا۔ صواب پر خوشی ہوا تو خطا پر شرمایا۔ گھر آیا۔ سبھوں کو بخیریت پایا۔ تو سجدۂ شکر بجالایا۔ رات نے سلایا۔ اذان نے جگایا۔ وقت پر پھر دفتر آیا۔ وہاں پھر وہی زخموں کا پھایا۔ وہی رحمت و مسرت کا سایہ۔ آب و دانہ بدلا تو قسمت نے لاہور چھڑایا۔ شہر کراچی دکھایا۔ لاہور کا خواب کس نے دکھایا؟ کراچی میں کون لایا؟ یہ گردش ایام ہے۔ زمانہ اسی کا نام ہے۔ صبر و شکر ہمارا کام ہے۔ مولا کے قبضے میں سب کا انجام ہے۔ لاہور بھی اس کی نعمت تھی، کراچی بھی اس کا انعام ہے۔

---

[1] اس مکتوب پر تاریخ درج نہیں۔ یہ اواخر دسمبر ۱۹۸۰ میں آیا تھا۔

وہاں سرسوں کا تیل تھا یہاں روغنِ بادام ہے۔ وہاں کام تھا یہاں آرام ہے۔ نہ صبحِ زندگی تھی یہ زندگی کی شام ہے۔ وہاں تیز بخار تھا تو یہاں سرسام ہے۔ وہاں مالٹا اور کینو تھا یہاں کیلا اور آم ہے؎ دلربا پہلو میں ہے محفل میں دورِ جام ہے٭ جس طرف دیکھو یہاں اسلام ہی اسلام ہے۔ اب نہ کہیں جناح ہے نہ ابو الکلام ہے۔ ہر متنفس کلیم بے کلام ہے۔ مگر بکنے میں بے لگام ہے۔ کوئی مدہوشِ مے گلفام ہے۔ کوئی مستِ خرام ہے۔ کسی کا لقمہ ہی حرام ہے۔ کسی کا مطلوب شاہدِ نازک اندام ہے۔ ہر سوال کے جواب میں ایک ہی شاعرانہ کلام ہے ؎

مے کو تو نے کہہ دیا زاہد حرام ہے   مے خانہ کو بھی کہہ دے کہ بیت الحرام ہے

یہ خط بحفاظت رکھ لیجیے۔ یہ وعظ ہے نہ پیغام ہے۔ بس ایک انوکھا اندازِ نامہ و پیام ہے۔ ہر پرسانِ حال کے لیے میری طرف سے یہی دعا سلام ہے۔ بندۂ عاجز محمد جعفر جو زمانے میں بدنام ہے۔ رسوا ہے ناکام ہے۔ زبان پر اللہ اللہ دل میں سیتا رام ہے۔ اس کے سامنے نہ بحثِ مولود ہے نہ مسئلۂ قیام ہے۔ یہ نہ مقتدی ہے نہ امام ہے۔ سراپا معصیت ہے مگر فدائے خیر الانام ہے جو حق دارِ صلوٰۃ و سلام ہے۔

(۲)

باسمہٖ تعالیٰ

۲۰۴ شرف آباد - کراچی ۵

کل لفافہ کھولا تو معلوم ہوا کہ یہ تو مولانا محمد اسحاق ہیں۔ جو دوستی میں مخلص اور خالی از نفاق ہیں۔ نہ خود ساختہ لیڈروں کی طرح صاحبِ طمطراق ہیں۔ نہ گھڑے دہابیوں کی طرح بدمذاق ہیں۔ اپنے کاموں کے ماہر و مشّاق ہیں۔ ادائے فرائض میں چوبند و چاق ہیں۔ خود ہی انفس اور خود ہی آفاق ہیں۔ نہ باتونی نہ لپاق ہیں۔ بلکہ پابندِ مواعید و میثاق ہیں۔ مسلکاً دہابی اور مزاجاً درویشوں کی طرح صاحبِ انفاق ہیں۔ نہ حریصِ زر ہیں نہ نشانۂ املاق ہیں۔ حساب کتاب میں بھی بے باق ہیں۔ ہر زہر کے تریاق ہیں، مگر بے نیاز از عراق ہیں۔ متوجہ الی الخلاق ہیں۔ متوکل علی الرزاق ہیں۔ نیکوں پر جیسے رحیم ہیں بدوں پر ویسے ہی شاق ہیں۔ حق نوازوں کے لیے صاحبِ اخلاق ہیں، اور باطل پرستوں کے لیے مکمل قزاق ہیں۔ تحصیلِ حق کے مشتاق ہیں۔ اور حق کے حق میں صاحب احقاق ہیں۔ مختصر یہ کہ مخلص علی الاطلاق ہیں۔

———•———

اب کچھ میری سنیے ۔ ایک دن بلڈ پریشر صاحب تشریف لائے ۔ جن کی برکت سے سر میں کئی بار چکر آئے۔ لوگ شعبۂ دل (جناح ہسپتال) میں داخل کرا آئے ۔ فوری طبی امداد سے جان بھی لاکھوں پائے ۔ پرہیزی ناشتہ چائے ۔ وہاں قسم کا کھانا، نہ مرچ نہ پائے ۔ بے بس مریض جائے تو کدھر جائے ۔ گیارہ دن پڑے پڑے جب گھبرائے، تو ڈاکٹر کی اجازت سے گھر آئے ۔ شرط یہ کہ کئی ہفتے مکمل آرام کیا جائے۔ بس ذرا لکھنے پڑھنے کی اجازت ملی ہے تاکہ محبت ناموں کا جواب دیا جائے ۔ اور اپنا کیا عرض کیا جائے؟

جتنی زیادہ بے کاری ہے اتنی ہی زیادہ خوش حالی ۔ یہ ہے قدرت کا کرشمہ اور شانِ ذی الجلالی ۔ بدن اوپر سے آراستہ اور روح اندر سے خالی ۔ کردار یہ کہ زبان پر دعا اور دل میں گالی ۔ اندر سے کڑھن اور ہاتھوں سے تالی ۔ بظاہر غنی، بباطن سوالی ۔ نیتوں میں فتور، صورت بھولی بھالی ۔ عمل خلافِ سنت اور زبان پر من سلک طریقی فھو الی ۔ اندر مکھیوں کی بھرمار اور اوپر دکھاوے کی جالی۔ بالوں میں سفیدی اور من کی دنیا سیاہ کالی ۔ ہم سے اچھے باغ کے مالی ۔ اِدھر پانی دیا، اُدھر پودوں کی دعا لی۔

آپ نے وہ شعر تو سنا ہی ہوگا:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال   کہ آگ لانے کو جائیں پیمبری مل جائے

ہمارے[۲] موسیٰ صاحب تھے تو بڑے ہی پاجی ۔ اب ہو گئے ہیں حاجی ۔ ریاض میں پرنس ناصر کا محل بن رہا ہے جس کے سینیٹری ڈیپارٹمنٹ کی نگرانی موسیٰ کے سپرد ہے ۔ دس بارہ پلمبر ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں ۔ چنانچہ میں نے انھیں یہ شعر لکھ بھیجا ہے:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال   کہ اینٹ ڈھونے کو جائیں پلمبری مل جائے

اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس شعر کو ترجیح دے کر اپنی "وہابیت یا چشتیت" کا ثبوت دیتے ہیں۔

بہتیرے اخباروں اور رسالوں میں بعض مطبوعہ مضامین بشکریہ ․․․․ بھی شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر "المعارف" کی پالیسی کے خلاف نہ ہو تو ایک مطبوعہ مضمون ارسال کر دوں ۔ اس میں اپنی مسیح اردو کے آغاز کی داستان ہے اور ایک مسیح خط بھی ہے جو اردو زبان میں ایک نئے انداز کا اضافہ

۲؎ شاہ موسیٰ، شاہ صاحب مرحوم کے اکلوتے بیٹے ہیں ۔ میں نے اپنے خط میں شاہ صاحب سے دریافت کیا تھا کہ موسیٰ صاحب کس حال میں ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ یہ اس کا جواب ہے۔

ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کی مجلسِ ادارت میں ایک فرد بھی اسے ناپسند کرے تو اسے فوراً رجسٹری سے مجھے واپس کر دیا جائے کیوں کہ اس کی کوئی مثنیٰ میرے پاس نہیں [۳۱]۔

دو کتابچے بھی ارسال ہیں لیکن یہ عام اشاعت کے لیے یا تبصرے کے لیے نہیں۔ بس علم سینہ بسینہ کی طرح سُنّیوں اور پڑھے لکھے صوفیوں میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچ جائے۔" درود تاج پر ایک نظر" پر ایک اور صاحب نے لمبا اعتراض کیا ہے۔ اس کا جواب بھی آنے والا ہے۔ وہ سب یک جا کر کے پھر اسے عام کیا جائے گا۔ ابھی اس میں بعض قانونی سقم ہیں اس لیے عام نہیں کرنا ہے۔

سب احباب اور پرسانِ حال کو سلام۔ والسلام

محمد جعفر پھلواروی ۸۱/۱/۲۶

(۳)

باسمہٖ تعالیٰ

محب مخلص و محترم ! سلام و دعا!

اخلاص نامہ مکتوبہ $\frac{۲}{۸۱}$/۱۲ ملا جس میں آپ نے میرے سابق مکتوب کو " مقاماتِ حریری" سے تشبیہ دی ہے تو سنیے :

میرا مکتوب نہ معلقاتِ سبع ہے نہ مقاماتِ حریری ہے۔ نہ یہاں علم وادب ہے نہ کسی کاروانِ سخن کی میری ہے۔ نہ غالبؔ کا شاگرد ہوں نہ میرا استاد نظیریؔ ہے۔ بس کچھ اپنا ذوق ہے اور کچھ غیبی دستگیری ہے۔ نہ رندی ہے نہ پارسائی، نہ درویشی ہے نہ فقیری ہے۔ تحریر صرف بیانِ تحریری ہے۔ نہ اس میں دلربائی ہے نہ دلگیری ہے۔ جسم میں ضعف ہے کیونکہ زمانۂ پیری ہے۔ اور روح میں بے یقینی ہے بے ضمیری ہے۔ افکار میں بے ربطی اور عمل میں بے تدبیری ہے۔ زبان پر چاہے ادعائے ہمہ دانی ہو لیکن اندر جہالت کی فراوانی و ہمہ گیری ہے۔ معاشی زندگی میں نہ غریبی ہے نہ امیری ہے۔ مگر شیطانی ہوس کا جال، دامِ اسیری ہے۔ روزی کا سارا معاملہ ہی تقدیری ہے۔ کوئی مرغ پلاؤ کھاتا ہے اور کسی کی قسمت میں نانِ خمیری ہے۔ مگر تقدیر کا گلہ شکوہ بے شمار

---

[۳۱] یہ مضمون اپریل ۱۹۸۱ء کے " المعارف" میں شائع ہوا۔

نعمتوں کی بے توقیری ہے۔ نہ یہ اسوۂ معاویہؓ ہے نہ دأبِ شبیریؓ ہے۔ یہ اندازِ فکر تعظیمی نہیں، تحقیری ہے۔ اس سے زیادہ بولنا چمڑ تقریری ہے۔

گھر کی ہر شخصیت کو دعا سلام کہیے خواہ وہ سگی ہے کہ خلیری ہے۔ ممیری ہے کہ چچیری ہے۔

لیجیے مضمون حاضر ہے۔ بندۂ ناچیز اس کی مدح اور ذم دونوں سے قاصر ہے۔ بس اللہ مددگار و ناصر ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔ دیکھنے میں مضمون خالی لفافہ ہے مگر ایک لحاظ سے اردو ادب میں نیا اضافہ ہے۔ اس میں میرے دینی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی افکار جھلکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس سے بدکتے ہیں۔ اور کچھ خوشی سے پھڑکتے ہیں۔ بعض سن کر چپکے سے سرکتے ہیں اور بعض غصے سے بھڑکتے ہیں۔ اور پھر برستے ہیں کڑکتے ہیں۔

۱۴ فروری کو مولانا کوثر نیازی عیادت کے لیے آئے تھے اور ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھے رہے۔

۱۹ر کے جنگ (کراچی) ص۳ کے آخری کالم پر میرا اور مولانا حنیف ندوی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

یہ فوٹو[۴۲] اس شرط پر ارسال کر رہا ہوں کہ دیکھ کر فوراً واپس کر دیجیے، کیوں کہ اس کی کوئی کاپی میرے پاس نہیں۔ والسلام۔ ارسال کردہ مضمون کا بھی کوئی مثنیٰ میرے پاس نہیں۔ ذرا حفاظت سے رکھ کر واپس کیجیے گا۔ محمد جعفر پھلواروی ۲۳/۲/۸۱

(۴)

باسمہٖ تعالیٰ

مخلص محترم! سلام و دعا

خط مع تصویر مل گیا تھا۔ شکریہ۔ مضمون کی فرمائش پوری کرنے میں کچھ دیر لگے گی۔ کیونکہ پہلے سے کئی عربی اور اردو مضامین کی فرمائشیں موجود ہیں۔ وقت تنگ است و کار ہا بسیار۔ "الدراسات الاسلامیہ" (اسلام آباد) میں میرے دس عربی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ گیارھواں ہے جو بھیج رہا ہوں اور بارھویں کی زوردار فرمائش ہے۔ "الیقین" (کراچی) کو ایک عربی مضمون

---

[۴۲] یہ شاہ صاحب کا تازہ فوٹو تھا جو انھوں نے مجھے ارسال کیا تھا، اور میں نے دیکھ کر ان کے حکم کے مطابق بذریعہ رجسٹری واپس بھیج دیا تھا۔

دے چکا ہوں اور اب ہر ہفتے ایک عربی مضمون کی فرمائش ہے۔" فاران" کی فرمائش تو مستقل جاری رہتی ہے۔ علاوہ ازیں چار مضامین اور بھی لکھ کر دے چکا ہوں جو مطبوعہ شکل میں آپ کو ملے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ وہ تجویزوں کی شکل میں ہیں۔

۱۔ قرآنی قانونِ طلاق۔

۲۔ ہر مسلمان کو مسلح رہنا چاہیے۔ لائسنس برطانوی یادگار ہے۔

۳۔ تقسیمِ وراثت کے بعد جو بچ جائے وہ اسلامی حکومت کا حق ہے۔

۴۔ شیعوں کو اذان والا اضافہ بند کر دینا چاہیے کیونکہ یہ خود ان کے مذہب میں بھی جائز نہیں۔

اسی قسم کے مضامین کو ہضم کرنا شاید "المعارف" کے لیے مشکل ہو۔ درود تاج والا مضمون "فیض الاسلام" نہیں ہضم کر سکا۔ "فاران" میں گیا تو بڑا حصہ نذرِ سنسر ہو گیا۔ اس پر بھی بریلوی حلقہ بھڑک گیا۔

اپریل کے "المعارف" کا انتظار ہے۔

آپ کو ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ میاں امیر الدین صاحب گلبرگ کا پتا لکھ بھیجیے۔ والسلام

محمد جعفر پھلواروی ۱۸/۴/۸۱

(۵)

باسمہٖ تعالیٰ

مخلص محترم! سلام و رحمت

اس وقت ذرا عجلت میں خط لکھ رہا ہوں اور شاید پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔

مضمون نگار کو کم از کم پانچ نسخے دیے جاتے ہیں اور الدراسات الاسلامیہ والے تو ۲۵ عدد آف پرنٹ بھی بھیج دیتے ہیں۔ آپ کی طرف سے ابھی صرف ایک ہی عدد "المعارف" (اپریل) ملا ہے۔

دوسری تکلیف یہ دینی ہے کہ جناب امیر الدین صاحب گلبرگ کا پتا لکھ بھیجیے۔ ایک لفافہ ارسال کر چکا ہوں۔ اس کی رسید کا انتظار ہے۔ ایک مختصر سا ادبی مضمون عن قریب ارسال کروں گا۔

والسلام

محمد جعفر پھلواروی۔ ۴۔۲۰ شرف آباد۔ کراچی ۵
۲۱/۴/۸۱

(۶)

باسمہ تعالیٰ

مخلص محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ

سلام و دعا!

رپورٹر کی رپورٹ لمبی تھی اور بدخط۔ اس لیے میں نے انہی کے الفاظ کو باقی رکھتے ہوئے مختصر کر دیا ہے۔ صرف آخری فقرہ ہمارا ہے جو آپ کی طرف سے لکھ دیا ہے۔ اگر اس منقبتی[۵۵] مثنوی کو شائع کرنے میں ذرا بھی تامل ہو تو فوراً واپس کر دیجیے گا۔

نئے "فیض الاسلام" میں بھی کسی صاحب کی ایک اردو منقبت سیدنا معاویہؓ شائع ہوئی ہے۔ والسلام

محمد جعفر پھلواروی ۳-۶-۸۱

(۷)

باسمہ تعالیٰ

مخلص محب! سلام و دعا!

ایک لفافہ ارسال کر چکا ہوں۔ سیدنا معاویہؓ کی منقبت میں جو مثنوی بھیجی ہے اس میں دو اصلاحیں کر لیجیے۔ ۲۷واں شعر یوں ہے ؎

بود فرزندے ورا بعدش وصی جانشیں شد چون حسنؓ بن علیؓ

اس کے دوسرے مصرعے میں "حسن بن علی" کو "حسنؓ بعد از علیؓ" کر دیجیے۔ دوسرے فٹ نوٹ (۵) میں حضرت جعفر کو حضرت زبیر بنا دیجیے اور "یا حضرت عمرو بن العاص" کو قلم زد کر دیجیے۔

والسلام

محمد جعفر پھلواروی۔ ۲۰۔۴ شرف آباد کراچی ۵
۴/۶/۸۱

---

۵۵ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں نے "الاعتصام" میں شائع کرا دی تھی۔

(۸)

مخلص محترم ! سلام و دعا ہائے وافرہ

اللہ کرے آپ بالکل خیریت سے ہوں، آمین ۔ تشویش اس لیے ہوئی کہ عرصۂ دراز سے کوئی خیریت نامہ نہیں آیا ہے ۔ ڈیڑھ ماہ ہوئے ایک لفافہ بھیجا تھا جس میں "المعارف" کے لیے ایک مثنوی درمنقبت سیدنا معاویہؓ تھی پھر ایک کارڈ بھی ارسال کیا تھا ۔ یہ بھی لکھا تھا کہ اگر "المعارف" کی پالیسی یا معیار کے مطابق نہ ہو تو واپس کر دیجیے گا ۔ لیکن نفی یا اثبات میں کوئی جواب نہ آنے سے یہی گمان ہوا کہ اسے شائع کر دیا جائے گا ۔ مگر اس کے بعد سے "المعارف" کا کوئی پرچہ نہیں ملا ۔ ایسی صورت میں اگر تشویش ہو تو بجا ہے ۔ یہ تشویش آپ کے جواب سے ہی دور ہو سکتی ہے ۔

ایک تکلیف اور دے رہا ہوں ۔ میاں امیرالدین صاحب کا جو پتا آپ نے لکھ بھیجا تھا اس پتے پر خط نہیں پہنچا ۔ اس لیے آپ بذریعہ فون ان سے رابطہ قائم کر کے انھیں میرا پتا دے دیجیے اور کہیے کہ THE HOLY QURAN AT A GLANCE کی جتنی جلدیں مجھے ارسال کر سکتے ہوں فوراً کر دیں ۔ معلوم نہیں اس کا دوسرا ایڈیشن ہوا یا کاغذ سستا ہونے کے انتظار میں ہنوز تشنۂ طبع ہے ۔ بہرحال یہ کام آپ کے ذمے کر رہا ہوں اور یقین ہے کہ ان شاء اللہ لا تالو ۔

میرے ساتھ یہ عجیب معجزہ ہوا کہ پورے رمضان کے روزے اللہ کریم نے رکھوا دیے ۔ ہلال رمضان سے پہلے تک روزہ رکھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ سخت گرمی پڑ رہی تھی ۔ تجربے کے طور پر ایک روزہ رکھا تو رکھتا ہی چلا گیا ۔ "آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی ۔" یہاں تک کہ ۲۹ ویں روزے میں مَیں نے پیش گوئی کر دی کہ آج ضرور چاند ہوگا ، کیونکہ رمضان کا چاند تو نکلتا ہے اور عید کا نکالا جاتا ہے ۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب ہوتے ہی عید کا سائرن بجنے لگا ، یعنی چاند نکال لیا گیا ۔

لیجیے ساری کتھا ختم ہو گئی اور عید مبارک کہنا یاد نہ رہا ۔ آپ سب حضرات میری طرف سے باسی ہی سہی مگر عید مبارک قبول کیجیے ۔

حرم شریف کے روز و شب کے دونوں مناظر اس عید کارڈ میں ہیں ۔ یہ میری طرف سے گھر جا کر میری بیٹی کو دے دیجیے گا[لہ] ۔ اللہ کرے آپ سبھوں کو بر أی العین دیکھنے کی سعادت حاصل ہو ۔ آمین ۔ والسلام

محمد جعفر پھلواروی ۱۲ شوال ۸۱

لہ اس سے میری بیٹی سمیہ زیرک مراد ہے ۔ اس کے لیے انھوں نے عید کارڈ بھیجا تھا

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیَنْتَهِیَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ رَفْعِهِمْ اَبْصَارَهُمْ عِنْدَ الدُّعَاءِ فِی الصَّلٰوۃِ اِلَی السَّمَاءِ اَوْ لَتُخْطَفَنَّ اَبْصَارُهُمْ

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب نہی عن رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لوگ نماز میں آسمان کی طرف نظریں اٹھانے سے رُک جائیں، ورنہ ان کی نظریں اچک لی جائیں۔

نماز اسلام کا ایک بنیادی اور اساسی رکن ہے جو کسی صورت میں معاف نہیں۔ اس کو ادا کرنا بہرحال ضروری ہے۔ قرآن اور حدیث میں بار بار اس کی تاکید فرمائی گئی ہے اور لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ نماز پڑھیں، اس سے ہرگز روگردانی نہ کریں۔ تندرست ہوں تو کھڑے ہو کر پڑھیں، بیمار ہوں تو بیٹھ کر پڑھیں، بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھیں، اس سے بھی معذور ہوں تو اشارے کنائے سے یہ فریضہ انجام دیں۔

پھر نماز کے کچھ آداب ہیں، کچھ ارکان ہیں، کچھ طریقے ہیں، جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔
ان میں سے ایک یہ ہے کہ نماز کامل طور سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر پڑھنی چاہیے۔ اپنے اوپر عجز اور انکساری کی کیفیت طاری کر کے پڑھنی چاہیے۔ نماز میں اس طرح استغراق ہونا چاہیے کہ کسی چیز کی طرف کسی حالت میں بھی کوئی دھیان نہ ہو، فقط اللہ کی طرف دھیان ہو۔

مختلف سیاق و سباق میں، قرآن مجید میں بار بار نماز کا ذکر آیا ہے۔ کہیں اس بات کا تذکرہ ہے کہ نماز کا متعین اوقات میں ادا کرنا ضروری ہے، کہیں اوقات کی صراحت ہے، کہیں اس امر کی وضاحت ہے کہ پانچ نمازوں میں، کن نمازوں کو روحانی برکات کے اعتبار سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ کہیں نماز کے ظاہری آداب و شرائط کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور کہیں اس نقطۂ اخلاص پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ عبادت کی تمام صورتوں اور نماز کا اصل مقصد، اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور خوشنودی

ئل کرنا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ (الانعام : ۱۶۲)

(اے پیغبر) کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری قربانیاں، میری زندگی اور میری موت، سب اللہ کے لیے ہے۔

قرآن نے انداز و اسلوب کو بدل بدل کر، اس بات پر بار بار روشنی ڈالی ہے کہ بندگی اور عبودیت ے اس رشتے کو، جسے نماز کہا جاتا ہے، مسلمانوں کی عملی زندگی میں نکھرنا اور آشکارا ہونا چاہیے، ر ان تمام پاکیزہ مراحل کو طے کرنا چاہیے جو انسان کی زندگی کو لطیف تر روحانی و اخلاقی سانچوں میں ھالنے کا سبب بنتے ہیں۔

نماز کے بارے میں اس حقیقت کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اس فریضے کی حیثیت صرف ایک کم اور اس کی رسمی بجاآوری کی نہیں، بلکہ اس کا تعلق انسانی فطرت اور اس کے عمق و باطن سے ہے۔ یہ ایک وقتی اور اتفاقی حکم نہیں، بلکہ یہ ابدی اظہارِ نیازمندی ہے، جس پر نظامِ عالم کا پورا کارخانہ قائم ہے۔ قیام، رکوع اور سجدہ، نماز کے لازمی ارکان ہیں، اور کائنات میں فطرتی طور پر، عبودیت، اطاعت اور نیازمندی کا جو ہمہ گیر وصف پایا جاتا ہے، ان سے اس کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔

پھر نماز کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ عبادت کی ایک جامع ترین شکل ہے، اس میں صرف غور و فکر اور استغراقِ باطنی ہی نہیں پایا جاتا، نہ محض زبانی اظہارِ تشکر کو کافی سمجھا جاتا ہے، بلکہ عبادت کی یہ ایک ایسی صورت ہے، جس میں قلب و ذہن بھی فکر و تعمق کا فریضہ ادا کرتے ہیں، زبان بھی ذکرِ خداوندی سے آراستہ ہے اور اعضا و جوارح بھی رکوع، سجدہ اور قیام کی شکل میں اللہ کی اطاعت و عبودیت میں مصروف ہیں، یعنی ہر حصۂ جسم عبادتِ الٰہی میں مشغول ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہو، اور انسان اپنے آپ کو یادِ خدا اور ذکرِ الٰہی میں پوری طرح مستغرق و منہمک کر دے تو ظاہر ہے دنیا کے تمام معاملات سے الگ ہو جائے گا اور اپنے آپ کو کلی طور پر اللہ کے حوالے کر دے گا ـــ صحیح مسلم کی اس حدیث میں یہی کچھ بیان کیا گیا ہے۔

یعنی نماز اس اہتمام اور توجہ کے ساتھ پڑھو کہ اِدھر اُدھر نہ دیکھو، دل میں اللہ کا خوف رکھو، اس کی رضامندی کو مرکزِ التفات ٹھہراؤ، جو الفاظ زبان سے ادا کر رہے ہو، ان کے معنی و مطلب

کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھتے رہتے ہیں، ہاتھ بھی ہلاتے رہتے ہیں اور ٹانگوں کو بھی حرکت دیتے رہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ناجائز ہیں، آدابِ نماز کے خلاف ہیں اور ان سے نماز میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ نماز ٹوٹنے کا خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لوگ نماز میں آسمان کی طرف بھی نظریں اٹھا کر نہ دیکھیں، اس حرکت سے باز رہیں، یہ اتنی غلط بات ہے کہ اس کی یہ سزا ہو سکتی ہے کہ ان کی آنکھیں اچک لی جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ نماز اس قدر لطیف اور نازک عبادت ہے کہ اس میں دوسری کسی چیز کا تصوّر تو کجا، یہ بھی جائز نہیں کہ انسان، حالتِ نماز میں آسمان کی طرف ہی نظر اٹھا سکے۔

بعض دفعہ نماز میں دعائیہ کلمات ادا کرتے وقت انسان پر ایسی بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو اسے عجز و زاری کے اونچے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے، اور وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دعائیہ کلمات ادا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حدیث میں نماز میں اوپر نظر اٹھانے سے منع کیا گیا ہے اور ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں ایسی حرکت کرنے والے شخص کی آنکھیں چندھیائی جا سکتی ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عبادات میں نماز کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ نماز میں قلب و ذہن کو حاضر رکھنا چاہیے، اپنے آپ پر یہ احساس طاری رہنا چاہیے کہ اللہ کے دربار میں کھڑا ہے، نظر، سجدے کے مقام پر رہنی چاہیے۔ نظریں گھما کر دوسری طرف بالکل نہیں دیکھنا چاہیے، جو الفاظ زبان سے ادا ہو رہے ہیں، ان کے معانی پر غور ہونا چاہیے اور خالصتاً متوجہ الی اللہ ہو کر یہ بنیادی فریضہ ادا کرنا چاہیے۔

نقد و نظر

ترجمان القرآن ۔ جلد سوم

از : مولانا ابوالکلام آزاد

ناشر : اسلامی اکادمی ۔ اردو بازار ، لاہور

کاغذ ، کتابت ، طباعت ، جلد بہترین ۔

صفحات ۹۰+۶۶۵ (۷۵۵) قیمت ۸۰ روپے

مولانا ابوالکلام آزاد کو میدانِ علم و فضل میں نابغۂ روزگار کی حیثیت حاصل ہے ۔ ان کی تصنیفات میں تفسیر " ترجمان القرآن " نہایت بلند مرتبے کی تفسیر ہے ۔ اس کی صرف دو جلدیں شائقینِ تفسیر کے مطالعہ میں آسکیں ۔ دوسری جلد سورۂ " مومنون " پر ختم ہوئی ۔ افسوس ہے ، اس سے آگے (سورۂ نور سے سورۂ والناس تک) یہ تفسیر یا تو مولانا اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر لکھ نہ سکے یا مسودہ کسی وجہ سے کتابت و طباعت کے مرحلے سے گزر نہ سکا ۔ لیکن اب اس کا کچھ حصہ اسلامی اکادمی لاہور نے شائع کر دیا ہے ۔ یہ وہ حصہ ہے جو سورۂ نور سے آگے کی ان آیات اور ان کے تراجم و تشریح پر مشتمل ہے ، جو الہلال ، البلاغ اور ترجمان القرآن کے مختلف مضامین و مقالات میں درج ہیں ۔ نامور عالم مولانا محمد عبدہٗ نے اس کو مربوط و مرتب کر دیا ہے اور جن آیات کے ترجمہ و تفسیر کے سلسلے میں مولانا آزاد کی کوئی تحریر فراہم نہیں ہو سکی ، وہاں مولانا محمد عبدہٗ نے تسلسل کو قائم رکھنے کی غرض سے توضیحی نوٹ لکھ دیے ہیں ۔

مولانا آزاد ، ان کی علمی خدمات اور قرآن کے سلسلے میں ان کی بے مثال کاوشوں کا تعارف مشہور محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے کرایا ہے جو اس کتاب کے آغاز میں چالیس صفحات پر محیط ہے اور قابلِ مطالعہ ہے ۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو تفسیر اور فنِ تفسیر سے متعلق ہے

اور نہایت عمدہ ہے ۔ مولانا آزاد کی تفسیر کے بارے میں مولانا ندوی لکھتے ہیں :

" مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کی دو ضخیم جلدیں اہلِ علم اور اصحابِ فکر سے مدت ہوئی داد حاصل کر چکی ہیں ۔ ان کے اسلوبِ فہم و ادراک کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی شخصیت کے بارے میں اس تجزیے پر غور کر لیا جائے کہ گو وہ اس دور میں پلے بڑھے اور آفتابِ علم بن کر چمکے، لیکن ان کے قلم پر صدیوں کی علمی و تہذیبی روایات مچل رہی ہیں ۔ ان کا علمی رابطہ جہاں اسلاف کی عظیم شخصیتوں سے استوار ہے ، وہاں دورِ حاضر کے رجحانات ، علوم اور تحریکوں سے بھی ان کی شناسائی مسلّم ہے ۔ ان کے مطالعہ و تحقیق کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ قرآن ، حدیث ، فقہ ، کلام ، تاریخ ، ادب اور فلسفے کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کی نظروں سے اوجھل ہو ۔ وہ جب بھی کسی فن یا موضوع پر بات کرتے ہیں تو ایسی جچی تُلی اور مجتہدانہ کہ اس پر کسی بھی اضافے کا امکان باقی نہیں رہتا ۔"

ہمیں اُمید ہے ہمارے قارئین اس تفسیر سے استفادہ کریں گے ۔

ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ

مصنف : طالب ہاشمی

ناشر : قومی کتب خانہ ، لاہور

کتابت ، طباعت ، جلد ، سرورق دیدہ زیب ۔ صفحات ۳۶۰ ۔ قیمت ۲۵ روپے

جناب طالب ہاشمی صاحب نامور مصنف اور معروف صاحبِ قلم ہیں ۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے ۔ ان کی یہ ہمت قابلِ داد ہے کہ اپنے دفتری فرائض کے ساتھ ساتھ بہترین علمی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ تاریخ ان کا خاص موضوع ہے اور اس سلسلے میں ان کی متعدد کتابیں طباعت و اشاعت کی منزل سے گزر چکی ہیں ، جن میں سیرت حضرت سعد بن ابی وقاص ، سیرت عبداللہ بن زبیر ، سیرت ابو ایوب انصاری ، تیس پروانے شمع رسالت کے ، خیر البشر کے چالیس جاں نثار ، تذکارِ صحابیات ، سلطان ملک شاہ سلجوقی ، سلطان نورالدین محمود زنگی اور الملک الظاہر بیبرس شامل ہیں ۔

طالب ہاشمی صاحب کی تمام تصنیفات میں یہ وصف نمایاں ہے کہ زبان صاف ستھری اور اسلوبِ تحریر دل آویز ہے جو قاری کے لیے بہرحال جاذبیت اور کشش کا باعث بنتا ہے ۔ زیرِ تبصرہ کتاب

ـــــ ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ ـــــ بھی ان ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔

یہ کتاب یوں تو بہت سی پُر از معلومات تفصیلات کا احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن اس کا اصل موضوع ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ ہے جس نے شمالی افریقہ کی سلطنتِ موحدین کو مستحکم کیا اور انتہائی عروج پر پہنچایا۔ موحدین سے پہلے اس نواح میں مرابطین کی حکومت تھی جو ۵۴۱ھ میں ختم ہو گئی اور ان کی مسند موحدین نے سنبھالی۔ سلطنتِ موحدین کا بانی محمد بن تومرت تھا، اس کی وفات کے بعد عبدالمومن بن علی ان کا جانشین ہوا، جو نہایت جرأت مند اور صاحبِ عزم حکمران تھا۔ ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ، جس کے حالات پر یہ کتاب مشتمل ہے، اسی عبدالمومن کا پوتا ہے۔ اس کا نام یعقوب، ابو یوسف کنیت اور المنصور باللہ لقب تھا۔ ۵۴۸ھ (۱۱۵۳ء) میں مراکش میں پیدا ہوا۔ ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں تختِ حکومت پر بیٹھا اور ۵۹۵ھ (۱۱۹۹ء) میں وفات پائی۔

بہادری، عالی ظرفی، شرافتِ نفس، غیرت دینی، عزم و ارادے کی پختگی، تبلیغ اسلام میں سعی و کوشش، سادگی، قرآن و حدیث سے وابستگی، اہلِ علم سے تعلقات و روابط، شوقِ جہاد، دشمن سے معرکہ آرائی کا جذبہ، رعایا سے محبت، تدبر و فراست، عسکری صلاحیت، عقیدے کی استواری اور احکامِ شرع کی پابندی اس کے وہ اوصاف ہیں جو اس کو بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے "نامور فرماں روایانِ اسلام" کے حالات و سوانح ضبطِ تحریر میں لانے کے جن دس فرماں رواؤں کا انتخاب کیا تھا، ان میں ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ کا نام بھی شامل تھا لیکن افسوس ہے ان کو زندگی نے مہلت نہ دی اور حضرت عمر فاروق اور مامون الرشید کے سوا کسی اور مسلم فرماں روا کے سوانح معرضِ تصنیف میں نہ لا سکے۔ یہ سعادت طالب ہاشمی کے مقدر میں تھی۔ اللہ نے ان کو توفیق بخشی اور نہایت تحقیق و کاوش سے انھوں نے اسلام کے اس عظیم ہیرو کے حالات قلم بند کیے جو آج ہمارے زیرِ مطالعہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ لائق مصنف نے شبلی کا قرض ادا کر دیا ہے اور اگر آج شبلی زندہ ہوتے تو اس قرض کی ادائیگی پر طالب ہاشمی کا شکریہ ادا کرتے۔

جناب طالب ہاشمی نے اس کتاب میں معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے، اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی ترتیب و تصنیف میں ان کو کتنی محنت اور جد و جہد کرنا پڑی ہے۔ جن لوگوں کا تحریر و کتابت سے کسی نہ کسی شکل میں تعلق رہتا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ مصنف کو

حصولِ معلومات کے لیے کیا تگ و تاز کرنا پڑتی ہے اور کتنی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد مطلب کی کوئی شے ہاتھ آتی ہے۔

اپنی تاریخ کے نقوش کو اجاگر کرنا بلاشبہ ضروری ہے لیکن مختلف مقامات میں ان بکھرے ہوئے جواہر پاروں کو جمع کر کے ایک لڑی میں پرونا بھی دل گردے کا کام ہے۔ اس کے لیے کوئی مردِ قلندر ہی میدانِ عمل میں اتر سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی قدر کریں، مصنف کا حوصلہ بڑھائیں اور کتاب خرید کر اسے مزید خدمت کا موقع دیں۔

تاریخ کیا ہے ؟

مصنف : ڈاکٹر مبارک علی

ناشر : آگہی پبلیکیشنز، بلاک ای، لطیف آباد۔ حیدرآباد (سندھ)

صفحات : ۶۲ - قیمت درج نہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کا نام ہمارے قارئین کرام کے لیے اجنبی نہیں "المعارف" کے صفحات میں ان کے افکار گاہے بہ گاہے شائع ہوتے رہتے ہیں اور وہ ان کی علمیت اور شخصیت سے آگاہ ہیں ڈاکٹر صاحب سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں تاریخ کے استاد ہیں اور اس حیثیت سے تاریخ ان کا خاص موضوع ہے۔ زیرِ نظر کتاب "تاریخ کیا ہے ؟" ایک تحقیقی مقالہ ہے اور بہت اچھا ہے۔ شان دار ٹائپ میں شائع ہوا ہے اور لائق مصنف نے جس نہج سے اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

تاریخ ماضی کے واقعات سے بحث کرتی اور قاری کا رخ حال کی جانب موڑتی ہے اور پھر اسے یہ تلقین کرتی ہے کہ اگر ماضی میں کچھ نقائص رہ گئے ہیں تو حال اور مستقبل کو اس سے محفوظ رکھا جائے۔ جب تک انسان ماضی سے روشناس نہیں ہوگا اور گزشتہ حالات اس کے سامنے نہیں آئیں گے، وہ نہ حال کو سنوار سکتا ہے اور نہ مستقبل کو تابناک بنا سکتا ہے۔ تاریخ ماضی کے رشتے کو حال اور مستقبل سے جوڑنے کا بنیادی ذریعہ ہے اور ایسا شفاف آئینہ ہے جس سے کسی معاشرے کی تہذیب، تمدن، ثقافت اور نظریات کو صاف طور سے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

فاضل مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ محض تاریخی واقعات بیان کرنا کافی نہیں بلکہ ان واقعات کے پس منظر میں جو عوامل کارفرما ہیں ان کا جائزہ لینا چاہیے تاکہ گزشتہ معاشروں کے ذہنی و فکری رجحانات کا اندازہ ہو سکے۔ کیوں کہ تاریخ کا اصل مقصد قاری کے ذہن میں احساسِ عبرت کو اجاگر کرنا اور اس کو تصورِ ارتقا بخشنا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان ماضی سے سبق لے کر مستقبل کو روشن کرنے کی سعی کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ لائق مصنف نے اپنے موضوع کو بڑی وضاحت اور صفائی سے بیان کیا ہے۔

۱۔ نظامِ عشر کی برکات۔ (صفحات ۶۴)
۲۔ دو قومی نظریہ۔ (صفحات ۵۴)
۳۔ اسلامی نظامِ عدل کا نفاذ، مشکلات، ان کا حل۔ (صفحات ۴۰)

تالیف : مولانا سید محمد متین ہاشمی

ملنے کا پتا : مرکزِ تحقیق، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، نسبت روڈ، لاہور

مولانا سید محمد متین ہاشمی پاکستان کے ممتاز محقق اور متعدد علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ تین رسالے ان کی تازہ تصنیفات ہیں۔ کتابت، کاغذ، طباعت اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ مفت تقسیم کیے جا رہے ہیں۔

"نظامِ عشر کی برکات" میں اس کے شرعی احکام شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اور ملکی معیشت پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اپنے موضوع میں یہ قابلِ قدر رسالہ ہے۔

"دو قومی نظریہ" ایک اہم مسئلہ ہے اور پاکستان کے قیام و بقا میں اس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ فاضل مصنف نے اس کو نکھار کر بیان کیا ہے۔

"اسلامی نظامِ عدل کا نفاذ، مشکلات، ان کا حل" اس میں اسلامی نظامِ عدل کی خصوصیات سے تعرض کیا گیا ہے اور اس میں جو امتیازی اوصاف پائے جاتے ہیں، ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پھر اس کے نفاذ میں جو مشکلات حائل ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں —— ہمارے قارئینِ کرام کو ان سے استفادہ کرنا

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی — اپریل ۱۹۸۳

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں اور محرکات (مسلسل)	ڈاکٹر محمد لیسین مظہر صدیقی
سیرت شیخ بو علی سینا کے بعض پہلو (مسلسل)	حکیم محمد زماں حسینی
بینک سے تعاون اور اس کے انٹرسٹ کا شرعی حکم	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
شیخ محمد عاشق پھلتی	جناب مسعود انور علوی

ترجمان الحدیث، لاہور — اپریل ۱۹۸۳

قرآنی نظامِ ربوبیت	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی
اسلام میں محتسب اعلیٰ کا منصب و مقام	جلیل الرحمٰن
متبع کاملِ رسول ۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ	سید اعظم رضوی
مولانا عبدالقادر حصاری مرحوم	عبداللہ سلیم

تعلیم القرآن، راولپنڈی — مارچ ۱۹۸۳

شرک و بدعت	مولانا حکیم نور احمد یزدانی
حکایت مہر و وفا (مسلسل)	سید انور حسین نفیس الحسینی

زندگی، رام پور — فروری، مارچ ۱۹۸۳

مراسلات، مابین مولانا سید حسین احمد مدنی و مولانا ابو اللیث اصلاحی

سلسبیل، لاہور — اپریل ۱۹۸۳

خواجہ شمس العارفین کا زمانہ اور حضور کا کارنامہ	ڈاکٹر عبدالغنی

صحیفہ، لاہور — مارچ تا جون ۱۹۸۳

"ادبی دنیا" کی سرگزشت	محمد عبداللہ قریشی

دنیائے اسلام میں وطنی قومیت کا مسئلہ اور اقبال	ڈاکٹر معین الدین عقیل
ماہنامہ ندیم ڈھاکا — ایک جائزہ	شعیب عظیم

عرفات، لاہور — مارچ ۱۹۸۳

اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	پروفیسر منظور احمد

محدث، لاہور — اپریل ۱۹۸۳

آئینۂ توحید	امیر محمد بن اسماعیل صنعانی۔ ترجمہ: مولانا سیف الرحمن الفلاح
معراج النبی سے متعلق اعتراضات کا جائزہ (مسلسل)	عبدالرؤف ظفر

میثاق، لاہور — اپریل ۱۹۸۳

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور (مسلسل)	ڈاکٹر اسرار احمد
فرمانِ نبوی اُمرتُکُم بخمسٍ کی تشریح	ملا علی قاری۔ ترجمہ: مولانا الطاف الرحمن بنوی

جاری —

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن : مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاوراتِ عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایہ ٔ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمتِ قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری

جلد اول — محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیاتِ غالب : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گھوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis, It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

جون ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

A-87
۲۰.۶.۸۳

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس لاہور

فون : ۵۳۹۰۸

المعار لاہور

۱۶ | جون ۱۹۸۳ | شعبان المعظم ۱۴۰۳ | شمارہ ۶

ترتیب

تاثرات

شب و روز کی مسلسل گردش کے بعد رمضان کا مبارک مہینہ ہم پر پھر سایہ فگن ہوگیا ہے۔ اس میں اللہ کے نیک بندے روزہ رکھیں گے، قرآن کی تلاوت کریں گے، رات کو قیام کریں گے، تراویح پڑھیں گے اور یادِ خدا میں مشغول رہیں گے۔

گزشتہ قوموں کی دینی تاریخ کے جو اوراق ہم تک پہنچے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام قدیم قوموں نے جو کسی نہ کسی صورت میں روحانی اقدار سے آشنا رہی ہیں، ہمیشہ روزے کی برتری اور اہمیت کو مانا اور اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہودی اپنے مذہب کے مطابق روزہ رکھتے تھے۔ عیسائیوں نے شروع شروع میں روزے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا، اس لیے کہ حضرت مسیح کا قول ہے کہ جب دولہا موجود ہو، بارات بھوکی نہیں رہے گی۔ عیسائیوں کے نزدیک اس قول کا مطلب یہ تھا کہ جب تک میں تم میں موجود ہوں اور تمہارا روحانی تزکیہ اور قلبی تطہیر کر رہا ہوں، اس وقت تک تمہیں مزید تزکیہ و تطہیر کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب حضرت مسیح اس دنیا میں نہ رہے اور عیسائی ان کی براہِ راست نگاہِ التفات سے محروم ہوگئے تو روزے کے التزام کو ضروری ٹھہرایا اور ایک خاص طریقے کے مطابق روزہ رکھنے لگے۔

اسی طرح بدھ مذہب میں بھی کسی نہ کسی نہج سے روزہ بنیادی جزوِ عبادت رہا ہے۔ ہندو مت بھی اس کی افادیت کا معترف ہے اور اپنے خاص نقطۂ نظر کے مطابق اس کو قربِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یعنی جب اسلام نے روزے کی فرضیت کا اعلان کیا، دنیا کے مختلف مذاہب کے لوگ اس سے آشنا تھے اور اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ چنانچہ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (البقرہ: ۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے، جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کیے گئے جو تم سے قبل ہوئے تھے۔

قرآن نے اس آیت میں واضح کر دیا ہے کہ روزے کی فرضیت صرف مسلمانوں ہی کے لیے خاص نہیں، اسلام سے پہلی قوموں پر بھی ان کی شرائع میں روزہ فرض تھا۔ مسلمانوں سے قرآن نے صراحتہً فرمایا کہ تم پر روزے کی فرضیت حصولِ تقویٰ کے لیے ہے۔ یعنی ایک شخص طلوعِ سحر سے لے کر غروبِ آفتاب تک محض خوشنودیٔ خدا کی غرض سے بھوک پیاس کی کلفتیں برداشت کرتا ہے، جب اللہ حکم دیتا ہے، وہ کھانا پینا شروع کر دیتا ہے، اور جب روکتا ہے، وہ اکل و شرب سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، یقیناً اس سے روحانیت بیدار ہوتی ہے، قلب کی دنیا بدلتی ہے اور ذہن و فکر کے عالم میں تغیر رونما ہوتا ہے۔ عبادات میں، معاملات میں اور عمل و اخلاق میں ایسا انقلاب بپا ہو جاتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ اور روزے کی فرضیت کا بنیادی مقصد یہی ہے۔

پروفیسر اختر راہی

علمائے برصغیر کی فارسی تفاسیر و تراجمِ قرآن

اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد کا ایمان و یقین ہے کہ قرآن مجید فلاحِ انسانیت کا پیغام ہے اور انسانیت کا مستقبل اسی کتابِ ہدایت کی پیروی سے وابستہ ہے۔ اس ایمان و یقین کے پیش نظر ہر دور میں مسلمان اہلِ علم قرآن مجید کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے ہیں۔ قرآنِ مجید کی تعلیم و تدریس کے لیے جگہ جگہ مکاتب قائم ہوئے، وعظ و ارشاد کی مجلسوں کا اہتمام ہوتا رہا اور اہلِ قلم نے علومِ قرآن پر مختلف زبانوں میں ان گنت کتابیں لکھیں۔ تبلیغ و اشاعت کے اس سلسلے کا ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا کی اکثر زبانوں میں قرآنِ مجید کے ترجمے ہوئے اور کلامِ الٰہی کی تشریح و تفہیم کے لیے تفاسیر لکھی گئیں۔

عہدِ نبوت میں عالمِ عرب سے باہر جن سلیم الفطرت افراد نے اسلام قبول کیا، انھوں نے حسبِ موقع اپنی اپنی زبانوں میں اپنے ہم وطنوں کو حق کی تلقین کی اور قرآن مجید کا مفہوم و ترجمہ پیش کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ نبوت ہی میں قرآنِ مجید کا ترجمہ اور ترجمانی شروع ہو گئی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن شاہانِ وقت کو اسلام کی دعوت دی تھی، ان میں شاہِ فارس کسریٰ پرویز بھی شامل تھا۔ گو بدبخت کسریٰ نے حق سے آنکھیں بند کرتے ہوئے نامۂ نبوی چاک کر دیا، مگر ایران کی سرزمین دعوتِ حق سے ناآشنا نہ رہی۔ سلطنتِ ایران اپنے سارے جلال و جبروت اور ساز و سامان کے ساتھ عظمتِ اسلام کے سامنے سرنگوں ہو گئی اور عہدِ فاروقی (۲۱ھ / ۶۴۲ء) میں خطۂ ایران اسلامی خلافت کا جزو بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی فارسی زبان کے ذریعے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع ہو گیا۔ تاہم فارسی زبان میں قدیم ترین تفسیر ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کی عربی تفسیر کا ترجمہ ہے جو منصور بن نوح سامانی کے عہد (۳۵۰ھ - ۳۶۵ھ) میں سات علما کے ایک بورڈ نے کیا تھا۔

ایران کے ساتھ برصغیر پاک و ہند میں فارسی کا چلن ان اہلِ علم اور فاتحین کے ذریعے ہوا جو درۂ خیبر کے راستے وارد ہوئے۔ کئی ایک مقامی زبانوں کے ساتھ فارسی زبان مسلمانوں کی ثقافتی زبان

بن گئی اور اس میں دوسرے علوم کے ساتھ قرآنِ مجید کے علوم پر بھی لکھا جانے لگا۔ علما نے قرآن کے فارسی ترجمے کیے اور تفاسیر لکھیں۔ زیرِ نظر مضمون میں اُن فارسی تراجم و تفاسیرِ قرآن کا تعارف مقصود ہے جو برصغیر کے اہلِ علم کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

مختلف کتب خانوں کی فہارس میں ایسے تراجمِ قرآن اور تفاسیر کے اندراجات ملتے ہیں جن کے مؤلفین، سالِ تالیف اور مضامین پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ یہ مستقل بالذات ترجمہ ہے یا کسی معروف ترجمہ و تفسیر کا حصہ ہے، بہت مشکل ہے، اس لیے ایسے ناشناختہ تراجم و تفاسیرِ قرآن شمار نہیں کیے گئے۔ جو تراجم و تفاسیر مطبوعہ ہیں اُن کے خطی نسخوں کی نشان دہی نہیں کی گئی، البتہ غیر مطبوعہ تراجم و تفاسیر کے معلوم نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے جن فہارس سے استفادہ کیا گیا ہے، بار بار ان کے مکمل نام لکھنے کے بجائے حسبِ ذیل اختصارات درج کیے گئے ہیں۔

آصفیہ : فہرست کتبِ عربی، فارسی و اردو مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکارِ عالی جلد اوّل [حیدرآباد ۱۳۳۲ھ]

انجمن : مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی (عربی، فارسی) [کراچی - ۱۹۶۷ء]

شیرانی : فہرست مخطوطاتِ شیرانی جلد اوّل [لاہور - ۱۹۶۸ء]

لباب : لباب المعارف العلمیہ فی مکتبۃ دار العلوم الاسلامیہ جلد اوّل [آگرہ - ۱۹۱۸ء]

منزوی : فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی جلد اوّل [تہران - ۱۳۴۸ ش]

گنج بخش : فہرست نسخہ ہائے خطی کتاب خانہ گنج بخش اسلام آباد جلد اوّل [اسلام آباد - ۱۳۹۸ھ]

ترجمہ نظام نیشاپوری ، آٹھویں صدی ہجری میں حسن بن محمد علقمی المشتہر بہ نظام نیشاپوری ثم دولت آبادی نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ غالباً برصغیر میں قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ ہے جو ۷۳۰ھ میں ہوا۔ یہ ترجمہ مترجم کی تفسیر "غرائب القرآن" کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

ترجمۂ قرآن منسوب بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت : یہ ترجمۂ قرآن مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م ۷۸۵ھ) کی جانب منسوب ہے۔ ترجمے کے ساتھ کہیں کہیں مجمل تفسیری حواشی بھی ہیں۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ البتہ خطی نسخے معلوم ہیں[۱]۔ [کتب خانہ احسان الحق مرادآبادی، کراچی]

---

[۱] محمد ایوب قادری۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت [کراچی، ایچ۔ ایم سعید کمپنی (۱۹۷۵ء)] ص ۲۰۹

مصباح العاشقین: تفسیر سورہ والضحیٰ : بہاء الدین محمود بن ابراہیم، نبیرۂ بندگی مخدوم قاضی حمید الدین ناگوری (م ۱۲۴۱ھ) کی تالیف ہے۔ عرفان و تصوف کے نقطۂ نظر سے تشریح و تفسیر لکھی گئی ہے۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے مؤلف کے لیے کتب تفسیر و حدیث سے "سورۂ والضحیٰ" پر جو مطالب بیان کیے ہیں، انھیں سلیقے سے مرتب کر دیا گیا ہے۔ چند بار طبع ہوئی ہے۔

البحر المواج والسراج الوہاج : ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م ۸۴۹ھ) نے یہ تفسیر سلطان ابراہیم شرقی کے عہد (۸۰۴ھ - ۸۴۴ھ) میں لکھی۔ تفسیر عام فہم نہیں ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) نے اُن کے احوال میں لکھا ہے :

"بحر مواج تفسیر قرآن مجید کردہ بعبارت فارسی۔ در وی بیان ترکیب و معنی فصل و وصل کردہ است و دریں جا نیز از برای سجع تکلفی کردہ است، قابل اختصار و تنقیح و تہذیب است۔"[۵۲]

۱۹۲۷ء میں پہلی چار سورتوں کی تفسیر طبع ہوئی ہے۔ خطی نسخے اکثر مل جاتے ہیں۔

[شیرانی ص ۱۔ لباب جلد ا ص ۸، منزوی ص ۸، کتاب خانہ فاضلیہ گڑھی افغاناں (ضلع راولپنڈی) بحوالہ ماہنامہ "المعارف" (لاہور) بابت اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۵۱]

تفسیر نور النبی : خواجہ حسین ناگوری (م ۹۰۱ھ) کی تالیف ہے۔ موصوف سلطان التارکین مولانا حمید الدین ناگوری کے اخلاف میں سے تھے۔ "تذکرہ علمائے ہند" کی روایت کے مطابق پورے قرآن کی تفسیر ہے اور ہر پارے کی تفسیر ایک جلد پر محیط ہے[۵۳] متداول اور مروجہ تفسیروں کے مطالب سادہ اور رواں زبان میں بیان کیے ہیں۔

تفسیر اکبری : شیخ مبارک ناگوری (م ۱۰۰۱ھ) کے فرزند علامی ابو الفضل (م ۱۰۱۱ھ) نے آیت الکرسی کی تفسیر لکھ کر اکبر کے حضور پیش کی۔ "تفسیر اکبری" تاریخی نام ہے جس سے ۹۸۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ تفسیر میں ان عقاید و نظریات کی کوئی جھلک نہیں جو اکبر کے "دین الٰہی" سے مخصوص ہیں کیوں کہ "دین الٰہی" کا آغاز اس کے دو سال بعد ۹۸۵ھ میں ہوا تھا۔

---

۵۲ عبد الحق محدث دہلوی ــ اخبار الاخیار [دہلی: مطبع مجتبائی (۱۳۳۲ھ)]۔ ص ۱۷۵

۵۳ رحمان علی ــ تذکرہ علمائے ہند (ترجمہ: محمد ایوب قادری) [کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (۱۹۶۱ء)]۔ ص ۵۰

ترجمہ فوح ہالائی سندھی : مولانا نوح ہالائی سندھی (م ۹۹۸ھ) سے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ یادگار ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (حیدرآباد۔ سندھ) کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ پہلا پارہ شائع ہوا ہے۔

تفسیر شیخ یعقوب صرفی : مطالب المومنین : شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۰۰۳ھ) وادی کشمیر کے ممتاز عالم تھے۔ ان سے "روائح" اور فارسی مثنویوں کے علاوہ قرآن مجید سورۂ فاتحہ کی تفسیر بھی یادگار ہے[۵۴] یہ تفسیر تصوف کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔

تفسیر سورِ مختلفہ : خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ) نقشبندی سلسلے کے بزرگ تھے۔ ان سے حسبِ ذیل سورتوں کی تفسیر یادگار ہے۔

(۱) الفاتحہ (۲) والشمس (۳) الاخلاص (۴) العلق (۵) الناس

تفسیر نظامی : شیخ نظام الدین تھانیسری (م ۱۰۲۴ھ) سے سورہ الفاتحہ کی تفسیر یادگار ہے۔ وہ مولانا جلال الدین تھانیسری کے خلیفہ تھے۔ [گنج بخش ۷، ص ۳۱]

تحفۃ المومنین ، تفسیر عم یتساءلون (منظوم) : تیسویں پارے کی منظوم تفسیر ہے۔ شاعر نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا، البتہ ۱۰۶۸ھ میں ترتیب سے فارغ ہوا۔ قطعۂ تاریخ ہے۔

ہم بسالی کہ گردمش انشاء — بود بر الف شصت و ہشت زیاد
در تاریخ او خرد سُفت — کہ گل روضہ ابد گفتست

۱۳۲۲ھ میں مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

تفسیر سورہ واقعہ : مؤلف نے اپنا نام (: تخلص) خاکی لکھا ہے۔ سورۂ واقعہ کی صوفیانہ رنگ کی تفسیر ہے۔ کتب خانہ گنج بخش اسلام آباد کا نسخہ ذوالقعدہ ۱۰۴۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ [گنج بخش ۷، ص ۳۲]

تفسیر پارہ عم : شیخ شروان حسین معروف بہ شیروان خان قادری مرید شیخ اسمٰعیل چشتی اکبرآبادی کی تالیف ہے۔ ترجمہ اور مختصر تفسیر ہے۔ ۱۰۷۰ھ تا ۱۰۷۷ھ کے درمیان لکھی گئی ہے۔ [گنج بخش ۷، ص ۳۵]

شرح القرآن : مولانا معین الدین (م ۱۰۸۵ھ) فرزند خواجہ خاوند محمود نقشبندی بلند پایہ عالمِ دین تھے۔ انھیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ان کی تالیفات

---

۵۴ محمد عبداللہ قریشی — شیخ یعقوب صرفی (مقالہ) مشمولہ ماہنامہ ادبی دنیا (لاہور) کشمیر نمبر۔ بابت مارچ۔ اپریل ۱۹۶۶ء

ہیں فتاویٰ نقشبندیہ، کنز السعادت، کتابِ رضوانی اور زبدة التفاسیر (عربی) شامل ہیں۔ انھوں نے چھ ماہ میں فارسی زبان میں "شرح القرآن" کے نام سے تفسیر بھی لکھی جو ۱۰۷۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اِس سے پہلے ۱۰۶۹ھ میں عربی میں "زبدة التفاسیر" لکھ چکے تھے۔ شرح القرآن متداول تفسیروں کا نچوڑ ہے۔ مؤلف نے لکھا ہے: "تفسیر خیر الکثیر کہ مستنبط است از کتب صحیحہ کہ تفسیر معالم التنزیل است و تفسیر زاہدی و جامع البیان و قاضی بیضاوی وغیرہ"۔ "شرح القرآن" کے خطی نسخے دستیاب ہیں۔ [گنج بخش ص ۵۰۔۵۱، کتب خانہ قاضی زاہد الحسینی (اٹک)۔ بحوالہ ماہنامہ "فکر و نظر" (اسلام آباد) بابت اگست ۱۹۷۶ء، سعیدیہ لائبریری ٹونک۔ بحوالہ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) بابت مارچ ۱۹۶۷ء]

زیب التفاسیر: اورنگ زیب عالم گیر (م ۱۱۱۸ھ) کی صاحب زادی زیب النساء (م ۱۱۱۲ھ) علم پرور، عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ اسے علم و ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کی ایک تالیف "زیب المنشات" ملتی ہے۔ اگرچہ اس کی طرف منسوب "دیوانِ مخفی" اہلِ تحقیق کی نظر میں مخفی رشتی کا ہے۔

مولانا صفی الدین اردبیلی ثم کشمیری نے امام رازی کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ کیا اور زیب النسا کی علم دوستی کے پیشِ نظر اس کے نام منسوب کر دیا۔ یہ تفسیر ایک مقدمہ، چار کتابوں اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ ہر کتاب مزید ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ۱۰۸۱ھ کا مکتوبہ نسخہ موجود ہے۔ غالباً مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے[۵] [گنج بخش ص ۴۶۔۴۷]

تفسیر ابو المجد محبوب عالم: سید ابو المجد محبوب عالم (م ۱۱۱۱ھ) احمد آباد کے نامور مشائخ میں سے تھے۔ انھوں نے عربی میں جلالین کے انداز پر تفسیر لکھی تھی۔ ان سے فارسی میں بھی ایک تفسیر یادگار ہے۔

تفسیر شاہیہ: یہ تفسیر سید مقبول عالم (م ۱۱۱۱ھ) بن سید جلال الدین ابو محمد شاہ عالم الشاہی کی تالیف ہے۔ تین جلدوں میں اہلِ بیت کی روایات و احادیث کی روشنی میں تشریح و تفسیر ہے۔

تفسیر امینی: محمد امین الدین صدیقی نے اورنگ زیب عالم گیر (۱۰۴۹ھ — ۱۱۱۸ھ) کی فرمائش پر یہ تفسیر لکھی۔ جلالین کا انداز برتا گیا ہے۔ مؤلف نے دوسری تفسیروں کے علاوہ بطورِ خاص "تفسیر حسینی"

---

۵ صباح الدین عبدالرحمٰن — بزمِ تیموریہ [اعظم گڑھ: مطبع معارف (۱۹۴۸ء)]

(تالیف - ملا کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی) سے استفادہ کیا ہے - [آصفیہ ص ۴۰۴]

تفسیر سورہ والضحیٰ : روح الارواح : قاضی محمد علی قادری احمد آبادی نے ۱۳۰۰ھ میں سورہ والضحیٰ کی یہ تفسیر لکھی - کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد - دکن) کے نسخے پر مؤلف کی مہر "سلطان الواعظین محمد علی بن قطب الدین محمد - ۱۳۱۱ھ" ثبت ہے - [آصفیہ ص ۴۰۷]

تفسیر سورہ الاخلاص: روح الارواح : محمد حیات دہلوی نے ۱۳۱۱ھ میں یہ مختصر تفسیر سورہ اخلاص لکھی - [انجمن ص]

تفسیر الکلام : حافظ عبد الغفور نامی عالم دین کی کاوش ہے - ان کے بارے میں معروف تذکرہ نگاروں نے کچھ نہیں لکھا ہے - مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈانوالہ ماموں کانجن (فیصل آباد) کے کتب خانے میں ۱۳۲۳ھ کا مکتوبہ نسخہ ہے[۵۶]

ترجمۂ قرآن : قرآن مجید کے اس ترجمے کے ساتھ تعلیقات و حواشی بھی شامل ہیں - کاتب جو غالباً مؤلف بھی ہے، ۳۰ محرم ۱۳۲۵ھ کو کتابت سے فارغ ہوا، تاہم تعلیقات کا اندراج ۱۸ رجب ۱۳۲۶ھ تک جاری رہا - ان حواشی میں ناسخ و منسوخ، شان نزول، اوقاف و رسم الخط سے متعلق مباحث ہیں - کہیں کہیں وعظ و تذکیر کا رنگ بھی آگیا ہے - حواشی میں پچاس سے زائد مستند کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں جن میں سے بعض نایاب ہیں - ترجمۂ قرآن کا یہ نسخہ جامعہ پنجاب (لاہور) کے کتب خانہ میں محفوظ ہے[۵۷]

فتح الرحمٰن : شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) برصغیر پاک و ہند کے بلند پایہ مفکر تھے - انھوں نے تجدید و احیائے اسلام کے لیے قرآن و حدیث کے مطالعہ پر بہت زور دیا ہے - ان کا ترجمہ قرآن "فتح الرحمٰن" کئی بار شائع ہو چکا ہے، برصغیر میں مقبول ترین فارسی ترجمۂ قرآن رہا ہے - اسی سے اردو تراجم قرآن کا سلسلہ شروع ہوا - شاہ عبد القادر (م ۱۲۳۰ھ) نے "موضح قرآن" میں لکھا ہے:

"اس بندۂ عاجز عبد القادر کے خیال میں کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بہت بڑے حضرت، شاہ ولی اللہ، عبد الرحیم کے بیٹے، سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں

---

۵۶ حافظ نذر احمد - جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان [لاہور: مسلم اکادمی (۱۹۶۲ء)]

۵۷ مفصل تعارف کے لیے ملاحظہ ہو - ماہنامہ "ترجمان الحدیث" (لاہور) بابت نومبر ۱۹۷۰ء - ص ۴۶-۵۳

قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے ہیں، اس طرح عاجز نے ہندی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے [۵۸]

معدن الاسرار : شیخ سعدالدین احمد البرکی الانصاری بن مولانا عبدالغفار بن مولانا عبدالعزیز نے ۱۱۷۳ھ میں تعوذ، فاتحہ، یٰسٓ، اخلاص اور موذتین کا ترجمہ و تفسیر لکھی۔ ان کے انداز تشریح و تفسیر پر صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ [گنج بخش بحوالہ فہرست نسخہ ہای خطی کتاب خانہ گنج بخش جلد سوم (محمد حسین تسبیحی)۔ اسلام آباد (۱۹۷۶ء)]

ترجمۂ قرآن : شاہ محمد غوث لاہوری قادری (م ۱۱۷۷ھ) سے فارسی ترجمہ و حواشیِ قرآن یادگار ہیں۔ پیام شاہ جہان پوری لکھتے ہیں :

"آپ نے قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا اور اس پر نہایت مفید اور دلنشین حواشی بھی تحریر فرمائے تھے، مگر افسوس کہ کسی نے ابھی تک اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں کی۔ آپ کے ترجمہ کردہ قرآن حکیم کا قلمی نسخہ مولوی نور محمد صاحب سرودی کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔"[۵۹]

فتح العزیز: تفسیر عزیزی : شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کے نامور فرزند شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تیرھویں صدی کے نصف اوّل میں قرآن مجید کی تفسیر کا آغاز کیا جو سورہ البقرہ کی آیت ۱۸۴ تک اور آخری دو پاروں پر مشتمل ہے۔ اہل علم میں اس امر پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا یہ تفسیر پورے قرآن کی تھی یا اسی قدر لکھی گئی جو آج کل مطبوعہ شکل میں ملتی ہے۔ ایک رائے تو یہی ہے کہ یہ تفسیر مکمل نہیں ہو سکی۔ شاہ صاحب کے شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی (م ۱۲۹۹ھ) صاحبِ منتہی الکلام نے نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال کی خواہش پر ۱۲۸۷ھ میں اسے مکمل کیا۔ تاہم حسبِ ذیل قرائن بھی رد نہیں کیے جا سکتے۔

۱۔ شاہ صاحب نے "فتاویٰ عزیزی" میں تفسیر کے ان حصوں کے حوالے دیے ہیں جو آج دست یاب نہیں ہیں، مثلاً سورہ آل عمران، سورہ قصص، سورہ الحدید، سورہ النسا اور صٰفٰت کا حوالہ ملتا ہے۔

---

۵۸ شاہ عبدالقادر دہلوی۔ موضح قرآن [لاہور۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز (س۔ن)]۔ ص ۲

۵۹ پیام شاہ جہان پوری۔ تذکرہ شاہ محمد غوث [لاہور: ملک دین محمد اینڈ سنز (۱۹۶۵ء)]، ص ۴۴

۲۔ مولانا رفیع الدین مرادآبادی مؤلف "افادات عزیزیہ" نے اسے پورے قرآن کی تفسیر ذکر کیا ہے۔

۳۔ مولانا عبدالحی رائے بریلوی نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے بڑھاپے اور بیماری کے زمانے میں تفسیر املا کرائی تھی۔

شاہ صاحب کے شاگردوں میں سے ابونصر امام الدین کے لکھے ہوئے نوٹس "تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی" ملتے ہیں جو سورہ مومنون سے سورہ یٰسین تک ہیں۔

۴۔ تفسیر عزیزی کے مقدمے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقدمہ تفسیر سورۃ البقرہ کی تکمیل پر لکھا گیا تھا، لیکن مطبوعہ تفسیر کی صورت یہ ہے کہ آیت ۲۸۴ پر پوری گفتگو نہیں کی گئی اور آخری جملے تک نامکمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر شاہ صاحب نے متعلقہ رکوع یا کم از کم اس آیت کی تفسیر کیوں نہ پوری کی۔ مقدمہ تفسیر کی رُو سے یہ ۱۲۰۸ھ میں لکھی گئی ہے اور ان کا انتقال کتیس برس بعد ۱۲۳۹ھ میں ہوا۔

مذکورہ بالا قرائن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کرائی اور نظر ثانی کے ارادے سے عام نہ کی۔ شاہ صاحب کی رحلت کے بعد شاہ محمد اسحاق (م ۱۲۶۲ھ) ورشاہ محمد یعقوب (م ۱۲۸۲ھ) ہجرت کرکے مکہ مکرمہ چلے گئے اور مسودے کی حفاظت نہ ہو سکی۔ جس قدر مسودہ دست برد زمانہ سے بچ گیا وہی شائع ہو سکا۔[۱۰]

نظم الجواہر : یہ تفسیر مولوی ولی اللہ (م ۱۲۴۹ھ) بن سعید احمد فرخ آبادی کی تالیف ہے۔ "نظم الجواہر" تاریخی نام ہے جس سے سال آغاز ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتا ہے اور ۱۲۴۲ھ (= اکمال نظر) سال تکمیل ہے۔ اس تفسیر کو "دیدنی و بدیدہ و دل سپردنی" اور "علوم اسلامی کا انسائیکلوپیڈیا" قرار دیا گیا ہے۔[۱۱]

---

۱۰ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: معین بن محمود کشمیری اور ان کی تصانیف (مقالہ از قاضی محمد عمران خان) مشمولہ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ)، بابت مارچ ۱۹۶۷ء ۔ص ۲۲۳ - ۲۳۴

۱۱ محمد ایوب قادری — عہد بنگش کی سیاسی و علمی تاریخ [کراچی؛ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس]

ترجمہ قرآن شاہ محمد اجمل : شاہ محمد اجمل الہ آبادی (م ۱۲۳۶ھ) سے ترجمہ قرآن یادگار ہے۔ تقریباً پچاس سال پہلے دائرۂ شاہ اجمل کے سجادہ نشین نے اس ترجمے کے بارے میں لکھا تھا کہ :

"یہ ترجمہ حامل المتن ہے اور حاشیہ پر تفسیری اشارات بھی ہیں۔ ابتدا میں ایک مبسوط محققانہ و فاضلانہ مقدمہ ہے، جس کے آخر میں آپ نے قرآن کریم کے قرأت حفص کی روایت جن رواۃ کے ذریعے آپ تک پہنچی ہے، اس کا سلسلۂ روایت درج فرمایا ہے ... الحمد للہ کہ فقیر کے پاس یہ قرآن جو نہایت ہی خوش خط ہے، موجود ہے۔"[۱۲]

تفسیر سورہ یوسف و سورۃ والضحیٰ : مولانا حافظ دراز خوشابی ثم پشاوری (م ۱۲۶۳ھ) اپنے دور کے سرآمد روزگار عالم تھے۔ ان سے سورۃ یوسف اور سورۃ والضحیٰ کی تفسیر یادگار ہے۔

تقریب الافہام فی تفسیر آیات الاحکام : آیات احکام کی تفسیر کئی اہل علم نے لکھی ہے۔ سید محمد قلی بن محمد کنتوری (م ۱۲۶۰ھ) نے فارسی میں شیعہ نقطۂ نظر سے "تقریب الافہام" تالیف کی ہے۔

کشف الغطا فی تفسیر سورۃ ہل اتی — اور سر اکبر فی تفسیر سورۃ الفجر : سید رجب علی (م ۸۶ ...) شیعہ عالم تھے۔ انھوں نے سورہ ہل اتی (سورہ دہر) کی تفسیر ۱۲۶۶ھ اور سورۃ الفجر کی تفسیر ۱۲۶۷ھ میں لکھی۔ دونوں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہوئیں۔

تفسیر بسم اللہ : بحر العلوم عبد العلی محمد فرنگی محلی (م ۱۲۲۵ھ) کے پوتے مولوی عبد الحکیم فر... (م ۱۲۸۷ھ) کی تالیف ہے۔ طبع نہیں ہو سکی۔

تفسیر ستار اللہ : خواجہ ستار اللہ خراباتی (م ۱۲۹۷ھ) جلال پور (گجرات) کے کثیر التصانیف عالم اور شاعر تھے۔ اُن سے قرآن مجید کی تفسیر یادگار ہے۔ اس کی دوسری جلد کا خطی نسخہ ان کے ذ... کتب میں موجود ہے۔ [فہرست نسخہ ہای خطی خواجہ ستار اللہ خراباتی ص ۳۱-۳۲]

تفسیر حضرت شاہی؛ معاملات الاسرار فی مکاشفات الاخیار : حکیم سید محمد حسن امروہوی (م ...) مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔ عرصے تک گورنمنٹ کالج اجمیر میں عربی و فارسی کے استاد رہے ... سے چند دوسری کتابوں کے ساتھ یہ تفسیر بھی یادگار ہے۔ ۱۲۹۵ھ میں مطبع میر حسن دہلی سے شائع ہوا ... میں "غایت البرہان فی تاویل الفرقان" کے نام سے اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

---

[۱۲] حافظ شاہ سید احمد۔ حضرت مولانا شاہ محمد اجمل قدس سرہٗ (مقالہ) مشمولہ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ)

تفسیر سورہ یوسف : مولانا قطب الدین اور مولانا غلام علی لکھنوی کی تالیف ہے۔ امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی تالیفات سے بطورِ خاص استفادہ کیا گیا ہے۔ ۱۲۸۹ھ میں لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر غریب : مولانا نجف علی جھجروی (م ۱۲۹۹ھ) نواب محمد علی خان والئ ٹونک کے ہاں ملازم تھے۔ اپنے معاصر علما میں بلند مقام کے حامل تھے۔ اُن سے یہ تفسیر یادگار ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔

تنجیل التنزیل : مولانا سید ناصر الدین محمد ابو المنصور (م ۱۳۲۰ھ) بن سید محمد علی بن سید فاروق علی سے تردیدِ مسیحیت میں چند کتابیں یادگار ہیں۔ سر سید احمد خان کے معاصر اور ان کے متجددانہ خیالات کے ناقد تھے۔ اس تفسیر میں بھی مسیحیت اور سر سید احمد خان کے افکار کی تردید موجود ہے۔ دیباچے میں رقم طراز ہیں: "مضامین این تفسیر را ہیچ تفسیر قدیم وجدید استنباط نشدہ و روایاتِ وضعی وقیاسی را دخلی نبودہ است۔"

تفسیر حکیم محمد شریف : حکیم محمد شریف خان دربارِ مغلیہ سے وابستہ تھے۔ ان سے چند دوسری کتابوں کے ساتھ ترجمۂ قرآن اور تفسیر بھی یادگار ہے۔[۱۳]

ترجمہ وتفسیر شیخ الہند : شیخ الہند مولانا محمود حسن (م ۱۳۳۹ھ) کا ترجمۂ قرآن اور اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) کے فوائد بارہا شائع ہو چکے ہیں۔ افغانستان سے اس کا فارسی ترجمہ پہلی بار ۱۳۲۳ھ اور دوسری بار ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوا ہے۔

انوارِ یوسفیہ (تفسیر سورہ یوسف) : سید مفتی میر محمد عباس موسوی تستری لکھنوی (م ۱۳۰۶ھ) کی تالیف ہے۔ اُن سے اس کے علاوہ سورہ رحمان، سورہ ق اور آیت ۱۷ (سورہ والیل) کی تفسیر وتشریح بھی یادگار ہے۔

لوامع التنزیل وسواطع التاویل : مولانا سید ابو القاسم لاہوری (م ۱۳۲۴ھ) پنجاب کے بلند پایہ عالم تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کی تیس جلدوں میں ایک مبسوط تفسیر لکھنا شروع کی۔ ابھی بارھویں جلد کی آیت یٰبَنِیَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ (یوسف، ۸۷) کی تفسیر لکھ رہے تھے کہ پیغامِ اجل آگیا۔ ان کی رحلت کے بعد ان کے صاحبِ علم صاحب زادے مولانا سید علی الحائری (م ۱۳۶۰ھ) نے مزید پندرہ جلدیں لکھیں۔ مولف کے مسودے میں سے چند پارے کتب خانہ آیت اللہ العظمیٰ نجفی مرعشی۔ قم (ایران) میں محفوظ ہیں۔[۱۴]

---

[۱۳] کوثر چاند پوری — اطبائے عہدِ مغلیہ [کراچی: ہمدرد اکیڈمی (۱۹۶۰ء)]۔ ص ۱۰۹

[۱۴] سید احمد حسینی — فہرست نسخہ ہای خطی کتاب خانۂ عمومی حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ نجفی مرعشی۔ قم (ایران) جلد ہفتم [قم۔ چاپ خیام (۱۳۵۸ھ ش)]۔ ص ۲۹۵۔ ۳۰۱

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

حضرت مجدد کی تحریک کا تاریخی پس منظر

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ۹۷۱ھ (۶۴-۱۵۶۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ۶۳ سال کی عمر میں ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ (۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء) کو ان کا انتقال ہوا۔ برصغیر کی تاریخ میں سیاسی اعتبار سے یہ ساٹھ ستر سال یعنی سولھویں صدی کا ثلث آخر اور سترھویں صدی کا ربع اوّل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمارے سامنے ایک دلچسپ تصویر آتی ہے۔ مسلمانوں کو یہاں آئے ہوئے کم و بیش سات سو سال سے زیادہ گزر چکے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی جو چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں اپنے انتہائی کمال کو پہنچ چکی تھی اور اس کا اقتدار سارے برصغیر کو محیط تھا۔ اس سلطنت کا صدر مقام دہلی تھا، جو اپنی وسعت، شان و شوکت اور دل ربائی میں سمرقند و بخارا کا ہم سر تھا اور اسلامی تہذیب کے اعلیٰ مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔

سلطنتِ دہلی کا عروج کم و بیش دو سو سال رہا اور پھر انحطاط شروع ہوا۔ اس نے بھی کافی وقت لیا اور برصغیر کے مختلف حصوں میں علاقائی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اقتدار و مرکزیت دورِ انحطاط سے خاصی متاثر ہوئی، لیکن مسلمانوں کی معاشرتی و ثقافتی زندگی کا شیرازہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور اخوت و مساوات کے اصولوں کی بدولت قائم رہا۔ اس شیرازہ بندی کے قیام و استحکام میں ہمارے دینی رہنماؤں خصوصاً مشائخ و صوفیہ نے نمایاں کردار ادا کیا۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ سولھویں صدی کے شروع میں برصغیر کے سیاسی نقشے میں مختلف ہلکے اور گہرے رنگ تھے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالیے، سلطنتِ دہلی اس وقت بھی سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ دہلی کے شمال و مغرب میں سندھ کو چھوڑ کر وہ سارا علاقہ جو آج پاکستان میں شامل ہے، نیز بھارت کا صوبہ مشرقی پنجاب اسی سلطنت میں نظر آتا ہے۔ مشرق میں روہیل کھنڈ

اور اودھ کے علاقے تھے ۔ گویا کہ موجودہ صوبہ اترپردیش بھی سلطنتِ دہلی ہی کے زیرِ نگیں تھا۔ اس سلطنت کے علاوہ جن دوسری حکومتوں پر ہماری نظر پڑتی ہے، ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔ شمال میں کشمیر کی پہاڑی ریاست نمایاں طور پر نظر آرہی ہے۔ برصغیر کے مشرقی علاقے میں بنگال و بہار کی علیحدہ علیحدہ ریاستیں موجود ہیں۔ مغرب کی طرف دیکھو تو سندھ، گجرات اور مالوہ کی حکومتیں نظر آئیں گی۔ جنوب میں ایک وسیع اور شان دار سلطنت قائم تھی جو اپنے بانی کے نام پر بہمنی سلطنت کہلاتی تھی۔

اس وقت ہم کو اس کی تاریخ اور تمدنی حالت کی طرف توجہ کرنی مقصود نہیں، لیکن یہ یاد رکھیے کہ سلطنتِ دہلی پر لودی پٹھانوں کا ایک خاندان حکمرانی کر رہا ہے۔ اس خاندان کا آخری سلطان ابراہیم لودی، اپنی تہی مغزی، خود رائی اور غرور و پندار کی وجہ سے خود اپنے اراکین سلطنت میں نامقبول تھا۔ چنانچہ خود اس کے سربرآوردہ امیر نے قاصد بھیج کر کابل سے بابر بادشاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

بابر چغتائی ترکوں کے مشہور فاتح امیر تیمور گورگانی کی اولاد میں چھٹی پشت میں تھا۔ وہ اپنے باپ عمر شیخ مرزا کے مرنے کے بعد دس بارہ سال تک غیر معمولی مصائب کا مقابلہ کرتا رہا اور آخرکار کابل کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ ہندی امرا کی دعوت ملنے پر اس کے شوقِ فتوحات میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودی کے درمیان پانی پت کے میدان میں ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں بابر فتح یاب ہوا اور مغلیہ سلطنت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد بابر صرف چار سال زندہ رہا لیکن اس عرصے میں اس کو دو لڑائیاں اور لڑنی پڑیں۔

اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو دس سال تک مغلیہ سلطنت کے مخالفین سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ۱۵۴۰ء میں اس نے شیر شاہ سے شکست کھائی اور وہ جان بچا کر ایران چلا گیا۔ اگرچہ شاہِ ایران کی مدد سے اس کو اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی مگر ایرانیوں کے عمل دخل اور افکار و خیالات سے نئے شگوفے پھوٹے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

ہمایوں ۱۵۵۵ء میں شمال مغربی علاقوں کو فتح کر کے دہلی آگیا، لیکن اس کو آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ وہ زینے سے گر کر فوت ہو گیا۔

ہمایوں کا جانشین جلال الدین محمد اکبر اس وقت تیرہ سال کا لڑکا تھا۔ اس کے اتالیق بیرم خاں نے بغیر وقت ضائع کیے ہوئے، اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ اکبر نے پچاس سال یعنی ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک حکومت کی۔ جنگی فتوحات، توسیع سلطنت اور نظم حکومت کی اصلاح کے سلسلے میں اس کے کارنامے نمایاں ہیں اور اسی وجہ سے اس کو اکبر اعظم کہا گیا ہے۔ اس کی فتوحات اور انتظامی اصلاحات کا یہاں ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی اکبر کو اپنی ابتدائی دور کی سب سے اہم جنگ لڑنی پڑی۔ عادل شاہ سوری چنار میں بیٹھا ہوا تھا، اس کا ایک ہندو سردار ہیمو بقال ایک بڑی فوج لے کر آیا۔ دہلی کو فتح کر کے وہ آگے بڑھا اور پانی پت کے میدان میں مغلوں اور پٹھانوں کی دوسری فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں ہیمو کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ چار سال بعد مالوہ فتح ہوا اور شاملِ سلطنت ہوگیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی فتوحات کا ذکر ممکن نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ اب اکبر نے توسیع سلطنت کا تہیہ کر لیا تھا۔ چنانچہ راجپوتانہ کی کئی ریاستوں نے مغلوں کا اقتدار تسلیم کر لیا، لیکن چتوڑ کے خلاف اکبر کو باقاعدہ جنگ کرنی پڑی۔ چتوڑ فتح ہوا، ہزارہا راجپوت تہ تیغ ہوئے اور کثیر التعداد نے آگ میں جل کر جوہر کی رسم ادا کی۔

چتوڑ فتح ہونے کے پانچ سال بعد اکبر نے گجرات پر حملہ کیا اور ۱۵۷۳ء میں اس کو بھی سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا گیا۔ دو سال بعد بنگال فتح ہوا۔ آئندہ دس سال میں اکبر نے بعض ایسے اقدامات کیے جن کے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ فتوحات کے سلسلے میں کشمیر کا ذکر ضروری ہے، جو ۱۵۸۶ء میں فتح ہوا۔ اب شمالی ہندوستان مکمل طور پر فتح ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اکبر نے دکن کی طرف توجہ کی۔ آٹھ دس سال کی کوششوں کے نتیجے میں برار، خاندیش اور احمد نگر کے علاقے فتح ہو کر مغلیہ سلطنت کے صوبے بن گئے۔ قندھار کے ایرانی گورنر نے ۱۵۹۵ء میں اپنا علاقہ خود ہی مغلوں کو دے دیا۔

فتوحات کا یہ ایسا ریکارڈ ہے کہ اس پر ہر حکمران فخر کر سکتا ہے۔ اکبر نے انتظامِ حکومت کے سلسلے میں بھی بہت سی اصلاحات نافذ کیں، سلطنت کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کر کے گورنر یا صوبے دار مقرر کیے۔ شیر شاہ کا قائم کیا ہوا سرکاروں یا ضلعوں کا طریقہ باقی رکھا۔ فوج میں منصب داری

کا ضابطہ جاری کیا۔ زمین کی پیمائش کرائی اور باقاعدہ لگان مقرر کیا۔ ان اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ مغلیہ سلطنت نہایت مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ ان قابلِ تعریف کارناموں کے ساتھ ساتھ اکبر کی مذہبی پالیسی اور بے راہ روی نے ملّتِ اسلامیہ کو سخت نقصان پہنچایا۔

دورِ اکبری سے پہلے اگر ہم ہندوستان کی مذہبی حالت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمان حکمرانوں، امرا، علما، خصوصاً مشائخ وصوفیہ نے اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں رہ کر اصلاح وتبلیغ کے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اس وقت برصغیر میں مذہب اہل سنت کا عمل دخل اور حنفی فقہ کا رواج تھا۔ کہیں کہیں باطنیوں اور قرامطہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی حتی الوسع بیخ کنی کی گئی، چوں کہ ان کا نظام غضب بنیادوں پر تھا، لہٰذا کہیں کہیں ڈھکے چھپے باقی رہ گئے۔ اثنا عشری تقیہ کی ردا میں پوشیدہ رہے، البتہ بہمنی دور میں وہ ابھرے۔

ہندو معاشرے پر مسلمانوں اور اسلام کا اثر خاصا پڑنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندو معاشرہ ذات پات کی پابندیوں، برہمنوں کے استبداد اور ظاہری رسم ورواج کے جوئے تلے کراہ رہا تھا۔ بہت سے لوگوں کا میلان اسلام کی طرف ہوا۔ یہ بات دیکھ کر ہندوؤں کے بعض ذہین اور ہوشیار مذہبی رہنماؤں نے ذات پات کے بندھنوں کو ڈھیلا کر دیا، ظاہری رسم ورواج کو نظر انداز کرنے کا ڈول ڈالا، خدا کی وحدانیت کا ذکر کیا، رام اور رحیم کے نعرے لگانے لگے اور "بھگتی تحریک" کا آغاز کر دیا، جو ایک متحدہ مذہب یا معاشرے کا نعرہ تھا۔ رلانند، رلانج وغیرہ اس کے پرچارک تھے۔ بھگتی تحریک ہی سے کرشن بھگتی اور رام بھگتی کے سوتے پھوٹے کبیر پنتھی، دودا پنتھی اور گرونانک جیسے صلح کل اور ان کے مذہبی فرقے وجود میں آئے۔ ان فرقوں میں وحدت الوجود کے نظریات کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔

۹۰۷ھ میں سنبھل میں سکندر لودی بادشاہ کی موجودگی میں بھگتی تحریک کے ایک برہمن بودھن نامی سے علمائے اسلام کا ایک مناظرہ ہوا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"علمائے نامی از اطراف طلبیدہ مجلس بحث ترتیب داد، تفصیل اسامی آنہا ایں است کہ میاں قادر بن شیخ خواجو و میاں عبداللہ بن الہ داد از تلنبہ، سید محمد بن سعید خاں از دہلی و ملا قطب الدین و ملا الہ داد صالح از سرہند و سید امان و سید برہان و سید حسن از قنوج آمدند و جمعے از امرا کہ بمیشہ

ہمراہ بادشاہ می بودند، مثل صدرالدین قنوجی و میاں عبدالرحمان ساکن سیکری و میاں عزیزاللہ سنبھلی ایشاں نیز درآں معرکہ حاضر شدند اتفاق علما برآں شد کہ او را محبوس ساختہ عرض اسلام باید نمود اگر ابا کند باید گشت، بود حسن ابا نمودہ کشتہ شد"[1]

اسی زمانے میں سید محمد جون پوری نے "انا المہدی" کا نعرہ بلند کیا اور مہدویت کا علم لہرایا۔ اس میں بھی مسلم معاشرے میں دراڑیں پڑیں۔ اس کا اثر گجرات و دکن تک پہنچا۔ بعض حکمران اور امرا بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ آخر ۹۱۱ھ میں فرہ (افغانستان) میں جاکر سید محمد جون پوری کا انتقال ہوا۔

اکبری عہد میں پیر روشنائی کا ہنگامہ برپا ہوا۔ ایک شخص بایزید انصاری جو جالندھر میں پیدا ہوا تھا، افغانوں کا مقتدا بن بیٹھا، اس نے بہت سے پٹھان مرید کرلیے، اپنی بے دینی اور بدمذہبی کو رونق دی۔ ایک کتاب خیرالبیان لکھی جس میں اپنے عقائد فاسدہ کو ترتیب دیا۔ اس مذہبی تحریک نے آخر میں سیاسی صورت اختیار کرلی اور مغل حکومت سے ٹکر کرلی۔ روشنیہ تحریک پر بھی وحدت الوجود کے اثرات نمایاں تھے۔

اکبر کے ذکر سے پہلے ہم دورِ ہمایوں کے سلسلے میں دو ایک باتیں عرض کرنی ضروری سمجھتے ہیں۔

ہمایوں جب ایران پہنچا تو شاہ ایران طہماسپ اس شرط پر مدد دینے کے لیے تیار ہوا کہ وہ شیعہ مذہب اختیار کرلے۔ چنانچہ ہمایوں نے شیعہ مذہب اختیار کرلیا۔ ہمایوں بادشاہ کے ملازم خاص جوہر آفتابچی نے یہ واقعہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"(ہمایوں) بادشاہ نے فرمایا کہ ہم دل و جان سے ائمہ معصومین علیہم السلام کے تابع و پیرو ہیں۔ اس پر قاضی جہاں نے شاہ عالم پناہ شاہ طہماسپ کے لکھے ہوئے تین خط نکالے اور دو خط بادشاہ ہمایوں کے پاس چھوڑ دیے۔ بادشاہ ان کو پڑھ کر کھڑے ہوگئے اور خیموں کے باہر دروازے پر آکر بلند آواز سے دشمنانِ رسالت و ولایت و امامت پر لعنت کرنے لگے۔ اس وقت تیسرے کاغذ کو شاہ عالم پناہ نے نسخہ لے کر حضرت (ہمایوں) کو دیا۔ انھوں نے شاہ عالم پناہ کی موجودگی میں اس کو پڑھا اور مذہب برحق امام

---

[1] تاریخ فرشتہ، ص ۱۸۲

اثنا عشریہ اختیار کیا۔"[۵۲]

اسی زمانے میں ہمایوں نے مندرجہ ذیل رباعی کہی :

ما ایم زجاں بندۂ اولادِ علی ہستیم ہمیشہ شاد بایادِ علی
چوں سرِ ولایت از علی ظاہر شد کردیم ہمیشہ ورد خود نادِ علی [۵۳]

۔ بیرم خانِ خاناں، ہمایوں بادشاہ کا معتمد علیہ وزیر اور کارگزار تھا، وہ بھی ان ہی افکار کا حامل تھا۔ اس کے دو شعر پڑھیے :

شہے کہ بگزرد زِ سپہر افرِ او گر غلامِ علی نیست، خاک بر سرِ او
محبت شہِ مرداں، مجوز بے پدرے کہ دستِ غیر گرفتست پائے مادرِ او [۵۴]

یہاں شاید ایک واقعہ نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو۔ شیخ حمید سنبھلی، اس دور کے ایک ممتاز عالم اور مفسر قرآن تھے۔ ہمایوں ان کا بہت معتقد تھا۔ انھوں نے ایک دن نہایت صفائی سے بادشاہ سے کہا :

شیخ حمید : بادشاہم تمام لشکر شمارا رافضی دیدم

ہمایوں : شیخ چرا ہم چنیں می گوئید ؟ وچہ قصہ است ؟

شیخ حمید : در ہر جا نام لشکریاں شما دریں مرتبہ ہمہ یار علی، مہر علی، کفش علی وحیدر علی یافتم وہیچ کس را ندیدم کہ بنام یارانِ دیگر (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) باشد۔

ہمایوں یہ سن کر ناراض ہوگیا اور محل میں چلا گیا، مگر پھر آکر ملائمت سے شیخ کو سمجھا دیا[۵۵]

شمس العلما محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

"شیخ موصوف نے بھی سچ کہا تھا، ہمایوں کے اکثر ہمراہیوں کے نام ایسے ہی تھے، بلکہ گدا علی،

---

۵۲ تذکرۃ الواقعات (اردو)، ص ۱۰۰

۵۳ ایضاً، ص ۱۰۵

۵۴ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ)، ص ۲۱۴

۵۵ دربارِ اکبری، ص ۸۰۸

مسکین علی، زلف علی، پنجہ علی، درویش علی، محب علی وغیرہ نام جو جا بجا تاریخوں میں آتے ہیں، وہ انھوں نے نہیں لیے۔ یہ لوگ بابر کے ساتھ ایران سے آئے ہوں گے یا ہمایوں کے ہمراہ ہوں گے۔ ہزارہ جات، کابل کے لوگ بھی تمام شیعہ ہیں[56]

اب ہم اکبر بادشاہ کی بے راہ روی اور الحاد کا ذکر کرتے ہیں۔ شروع میں اکبر ایک خوش عقیدہ اور باعمل مسلمان تھا، وہ اگرچہ پڑھا لکھا نہ تھا، لیکن اس کو علمی و ادبی معاملات سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کی خوش عقیدگی کے سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ وہ ایسے کپڑے پہن کر مجلس میں آیا جو شرعی نقطۂ نظر سے اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے۔ عبدالنبی صدر الصدور نے اس کے دامن کو چھڑی سے جھٹک کر اعتراض کیا۔ ظاہر ہے ایک حکمران کی حیثیت سے یہ بات توہین آمیز تھی، لیکن اکبر نے وہاں کچھ نہ کہا مگر اس کو احساس ہوا، اور اس نے اپنی ماں سے شکایت کی۔ اس واقعہ کو ذہن میں رکھ کر اب پندرہ بیس برس کے مابعد حالات پر غور کیجیے۔ شاہی دربار میں شیخ مبارک اور اس کے نہایت قابل بیٹوں شیخ فیضی اور شیخ ابوالفضل کا دور دورہ ہے۔ بادشاہ کے حضور میں مخصوص مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مجالس میں غیر مسلم مذہبی رہنما بھی شرکت کرتے ہیں۔ کھلے عام اظہار خیال ہوتا ہے۔ اسلام کے استہزا اور تخفیف تک نوبت پہنچتی ہے۔ شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ شیخ مبارک اور شیخ ابوالفضل ایک سازش کی بنیادیں رکھتے ہیں اور اس کو روبہ عمل لانے کے لیے بادشاہ کو جال میں پھانسا جاتا ہے۔ خوشامد اور تملق کا کامیاب نسخہ استعمال کیا جاتا ہے اور ایک مطلق العنان حکمراں کے لیے یہ نسخہ نہایت کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اکبر کو بات ذہن نشین کرادی گئی کہ وہ صرف شہنشاہ ہی نہیں بلکہ ہادی دین اور امام عادل بھی ہے اس منصوبے پر نہایت ہوشیاری سے عمل کیا گیا، اسلام کی مخالفت کی گئی لیکن اس طور پر کہ راز جلد افشا نہ ہو اور عوام الناس آسانی سے شکار ہو جائیں۔ اسلام مجازی کی ایک نئی اصطلاح تراشی گئی۔ رسالت کو نظر انداز کر کے توحید پسند قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ ہر مذہب

[56] دربار اکبری، ص ۸۰۹

میں کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں، ان سب کو جمع کر کے ایک نیا دین قائم کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ تھا کہ شرعی فیصلوں کے معاملے میں بادشاہ اکبر کی حیثیت کو مجتہد سے بھی بڑھا دیا گیا۔ رفتہ رفتہ شعائر اسلام پر حملے ہونے لگے۔ بادشاہ کی ہمت خود کو پیغمبر کہنے کی تو نہ ہوئی اور شاید اس اصطلاح سے اس لیے گریز کیا گیا کہ ہندو اس سے بھڑکیں گے لیکن اکبر بادشاہ کے حاشیہ برداروں نے اس کو پیغمبر سے کچھ زیادہ ہی بڑھا دیا۔ مثلاً اس کے ناموں کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے "السلام علیکم" کی بجائے "اللہ اکبر" کہا جانے لگا اور جواب میں "جل جلالہ" کہا جاتا تھا، داڑھیاں منڈوانے کی ہمت افزائی کی گئی۔ محل کے احاطے میں اذان ممنوع قرار دے دی گئی۔ شراب خوری کو مستحسن اور گوشت خوری کو مذموم سمجھا جانے لگا۔ سورج کی پرستش اعلانیہ کی جاتی تھی۔ اکبر خود بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ آتش پرستی کے احترام میں یہ حکم دے دیا تھا کہ محل میں ہر وقت آگ جلتی رہے۔ اس کا اثر بادشاہ پر کس حد تک تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ دن کے وقت وہ اس کمرے میں پہنچا جہاں ایک شخص کو متعین کیا گیا تھا کہ ہر وقت شمع روشن رکھے۔ اتفاق سے وہ سو رہا تھا اور شمع گل تھی۔ اکبر نے اس قصور پر اس کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔ اسلامی تعلیمات کے وقار پر سب سے کاری ضرب یہ لگائی گئی کہ بادشاہ کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس نئے دین میں سورج، چاند، ستاروں اور آگ تک کا احترام تھا مگر رسالت کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ ابوالفضل کی یہ ہمت تو نہ ہوئی کہ اکبر کو نبوت پر فائز کر دیتا لیکن اس کے روحانی کمالات اور مافوق الفطرت خوارق و کرامات کے ذکر سے اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے متعدد صفحات رنگ دیے ہیں۔ مسلمان اپنے ایمان کا کمال یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی جان سے زیادہ محبت کریں۔ ابوالفضل کا جوابی فارمولا سنیے کہ دینِ الٰہی میں داخل ہونے والوں کے چار درجے مقرر کیے گئے۔

۱۔ وہ جو بادشاہ پر مال قربان کر سکتے ہیں۔

۲۔ وہ جو جان قربان کر سکتے ہیں۔

۳۔ وہ جو عزت قربان کر سکتے ہیں۔

۴۔ اعلیٰ درجہ یہ تھا کہ اپنا دین قربان کر دے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ ان کے علاوہ ایسے طریقے بھی استعمال کیے گئے تھے جن سے مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ پہنچے، مثلاً بادشاہ کا ماتھے پر تلک لگانا، بسنت منانا اور اس موقع پر رنگے ہوئے کپڑے پہن کر دربار میں آنا۔ ہندو تیوہاروں کو دھوم دھام سے منانا وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سارے اقدامات سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے کیے گئے تھے اور ہندوؤں کو سلطنت سے قریب لانے کی یہ تدابیر تھیں۔ اس نظریے پر مورخین میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے کہ دینِ الٰہی کا مقصد کس حد تک سیاسی تھا، لیکن اس میں ذرا برابر شک کی گنجائش نہیں کہ اکبر کی اس پالیسی اور ابوالفضل کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ شریعت کے اقتدار کو سخت صدمہ پہنچا، لوگ شرعی قوانین کی طرف سے غافل ہو گئے اور اس دور میں اسلام کی خوب مضحکہ خیزی ہوئی۔

اکبر کا جب آخری وقت آیا تو بعض دردمند امرا و زعما کو تشویش ہوئی، کیوں کہ اکبر اپنے بیٹے جہاں گیر سے ناراض تھا اور اس کا رجحان اپنے پوتے خسرو کی طرف تھا جو راجا مان سنگھ کا بھانجا اور آصف خاں کا داماد تھا، لہٰذا مسلمانوں کو فکر ہوئی کہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ مگر امرا کی کوششیں بارآور ہوئیں اور جہاں گیر تخت نشین ہو گیا۔ جہاں گیر کا بھی اپنا انداز تھا۔ اکبری الحاد کو تو قدغن لگ گئی مگر اب ایک نئے فتنے نے سر اٹھایا اور وہ ایرانی اثر و رسوخ کا فتنہ تھا۔ نور جہاں، ملکۂ جہاں گیر بنی اور اس خاتون نے دیکھتے ہی دیکھتے فرماں روائی اور فرمان دہی کے اختیارات سنبھال لیے۔ مرآۃ العالم کا بیان ہے:

من سلطنت را بنور جہاں دادم۔ بجز یک سیر شراب و نیم سیر گوشت، مرا ہیچ نمی باید

نور جہاں کا باپ غیاث الدین تہرانی وکیل السلطنت بنا اور اس کا بھائی آصف خاں وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔ نور جہاں شاہی محلات کے اندر بڑے اختیارات کی مالک ٹھہری، اسی طرح نور جہاں کے اکثر رشتے دار بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ نور جہاں کے افکار و نظریات کی خوب ترویج و اشاعت ہونے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہر سامانہ میں عید قربان کی نماز کے موقع پر خطبے میں خلفائے راشدین کے نام نہیں پڑھے گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی

لکھتے ہیں :

در شنیدہ شد کہ خطیب آن مقام در خطبۂ عید قربان ذکر خلفائے راشدین را ترک کردہ واسامی متبرکہ ایشاں را نخواندہ، ونیز شنیدہ شد کہ چون جمعے باو معترض نمودند بسہو ونسیان خود اعتذار ناکردہ متمرد نشدہ ونیز شنیدہ کہ اکابر واہالی آن مقام دریں باب مساہلہ ورزیدند ولبشت و غلظت بآں خطیب بے انصاف پیش نیامدند۔"

اس خط میں مجدد صاحب نے کچھ ایسا اشارہ کیا ہے کہ یہ بدعت کشمیر میں بھی تھی۔ لکھتے ہیں :

" آں (خطیب) بے حقیقت کہ بہ کشمیریت منسوب است ، این خبث را از مبتدعانِ کشمیر اخذ کردہ باشد "

ان حالات میں حضرت مجدد الف ثانی نے اصلاح و تبلیغ کے کارنامے انجام دیے اور ایک تحریک برپا کر دی۔

سید جمال الدین افغانی ـــــــــ حیات و افکار

شاہد حسین رزاقی

سید جمال الدین افغانی کا شمار ان چند نادرۂ روزگار افراد میں ہوتا ہے جو مشرق و مغرب کے ذہنی افکار کے رمز شناس تھے اور جنھوں نے دنیائے اسلام کے مسلمانوں میں ملی بیداری ، سیاسی شعور اور قومی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ازحد جدوجہد کی۔ افغانی کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنی مسلسل مساعی کی بنا پر عالمِ اسلام کی نشاۃِ جدیدہ کے صحیح معنوں میں معمار تھے۔ ان کا زمانہ مغربی استعمار کے عروج اور اسلامی دنیا کے زوال کا زمانہ تھا اور اس کا انھیں انتہائی قلق تھا جو انھیں کہیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔

اس کتاب میں ان کی سعی و کوشش اور تگ و تاز کی تفصیلات ترتیب اور عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

صفحات ۲۰۸+۴۸ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

پروفیسر جعفر بلوچ

مولانا عبدالعزیز پرہیاروی (۱۲۰۶-۱۲۳۹ھ)

حضرت مولانا عبدالعزیز پرہیارویؒ یگانۂ روزگار شخصیت تھے۔ آپ نے اپنی قلیل مدتِ حیات میں تفسیر، حدیث، طب، ریاضی، فلسفہ، طبیعات، لسانیات وغیرہ میں مجتہدانہ کارنامے سرانجام دیے۔ شاعر بھی تھے اور ان کی تصانیف میں ان کی متعدد فارسی اور عربی نظمیں بکھری پڑی ہیں۔ "ایمانِ کامل" ان کا منظوم رسالہ ہے۔ آپ کے والد کا نام محمد اور دادا کا حامد تھا۔ کوٹ ادو (ضلع مظفر گڑھ) کے نواحی قصبہ پرہاراں میں آپ کی سکونت تھی اور وہیں آپ کا غیر پختہ مزارِ مبارک ہے جو روز افزوں شکست و ریخت سے دوچار ہے۔ آپ کے مولد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے کوٹ ادو کو آپ کا مولد بتایا ہے، ایک روایت ہے کہ آپ غزنی کے محلہ حکیم سنائی میں پیدا ہوئے۔ واللہ اعلم

آپ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے خلیفہ حضرت حافظ جمال ملتانی کے مرید تھے۔ حافظ صاحب کی وفات پر آپ نے ان کے بارے میں فضائلِ رضیہ اور اسرارِ جمالیہ کے نام سے دو رسائل لکھے جن میں سے اول الذکر نایاب ہے۔ ملتان کے حاکم نواب مظفر خان نے انہیں اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا تھا۔

آپ کی ہمہ دانی ایک حقیقت ہے، لیکن مختلف علوم میں آپ کے اکتساب کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ان کا علم اکتسابی نہیں اشراقی اور وہبی ہے:

احمقانے چند بے عقل و خرد — عیب می گیرند برمن از حسد
این نمی دانند این قومِ حسود — کایں حسد برفضل ربانی چہ سود
علم ایشاں نظری و کسبی بود — علمِ ما اشراقی و وہبی بود
نسبتے با من ندارند ایں خساں — بر زمین اند و منم بر آسماں[1]

اس اشراقی اور وہبی علم کی تائید میں اور حضرت پرہیاروی صاحب کے کمالاتِ باطنی کے سلسلے میں عوام میں کئی حکایات مشہور ہیں، لیکن یہ افسانہ وافسوں خانقہ صوفی کی متاع ہے اور اس مضمونچے میں اس سے تعرض کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔

آپ کے اخلاق وعادات کے بارے میں نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے

"حضرت عبدالعزیزؒ کے ہاں زہد زیادہ نہ تھا اور آپ ہمیشہ مطالعۂ کتب میں معروف رہتے تھے۔ اغنیا سے پرہیز کرتے تھے اور ان کی نذر ونیاز قبول نہیں فرماتے تھے۔ اتباعِ سنتِ نبوی اور ترکِ تقلید کی طرف میلان قوی تھا۔"[۲۲]

ان کی شریعت دوستی ان کی تصانیف سے بھی جھلکتی ہے۔ چنانچہ مترجم الاکسیر جناب شمس الدین صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی صاحب نے اپنی کتب میں ایک ایسا غریب طریق ملحوظ فرمایا ہے جو کسی کو میسر نہیں ہوا، یعنی ہر ایک علم میں لحاظِ مسائلِ شرعیہ اس حد تک ملحوظ رکھا ہے کہ یہ مسئلہ مخالف اور یہ موافق اور یہ سکوت عنہ شرع کا ہے"[۲۳]

ان کی کتاب "الیاقوت" کا ایک اقتباس ان کے اس میلان پر مزید روشنی ڈالتا ہے:

قصہ کوتاہ کسی مسلمان کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور اتباعِ رسول سے سرتابی کی گنجائش نہیں۔ یقین کو چھوڑ کر شک کے درپے نہیں ہونا چاہیے اور اس پر کوئی ہمیں ملازمت کرتا ہے تو کرتا رہے۔[۲۴]

بے باکی اور صاف گوئی آپ کی فطرت تھی۔ حضرت حافظ جمال ملتانی آپ کی نسبت کہا کرتے تھے کہ یہ نوجوان کس قدر ذہین اور فصیح اللسان ہے، میں اپنے زمانے میں کسی کو اس کا مثل نہیں پاتا۔ لیکن اس کی جرأت وبے باکی سے مجھے یہ خوف ہے کہ یہ چیزیں اس کی ہلاکت کا سبب نہ بن جائیں۔[۲۵]

۲۲۔ نزہۃ الخواطر جلد ۷۔ از عبدالحی بن فخرالدین الحسینی [ص ۲۷۶ - ۲۷۷]

۲۳۔ الاکسیر دفتر ثالث ترجمہ شمس الدین ص ۲۲۳ ۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ماہنامہ اسرارِ حکمت، لاہور۔ اگست ۱۹۶۴ء مضمون جناب محمد حسین۔

متنوع موضوعات پر حضرت عبدالعزیز کی ضخیم تصانیف ان کی معجزانہ ذہانت و ذکاوت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تاہم ان کی نکتہ رسی کا اظہار اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے خود اسرارِ جمالیہ میں لکھا ہے: فرماتے ہیں ایک بار میں اور حضرت حافظ جمال ملتانی اکٹھے کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ ملاح نے گہرائی معلوم کرنے کے لیے اپنا لمبا بانس دریا میں ڈالا۔ دریا بہت گہرا تھا۔ ملاح کے منہ سے حیرت میں لفظ "اللہ" نکلا۔ حافظ صاحب نے مجھے دیکھ کر فرمایا، اس کا مطلب سمجھے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، اللہ تعالیٰ کی گہرائی کی پیمائش عقل کا کوئی پیمانہ نہیں کرسکتا۔ فرمایا ہاں ٹھیک ہے[۵۶]

حضرت پرہیاروی فرماتے ہیں کہ وہ حضرت حافظ جمال ملتانی کے خطوط لکھا کرتے تھے لیکن ان کا خط پیچیدہ اور شکستہ تھا۔ حافظ صاحب انھیں صاف اور واضح لکھنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ "کاتب کو صرف یہی گناہ ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے کہ پڑھنے والا اس کے مشکل مکتوب کے پڑھنے کی دردناک تکلیف سے دوچار ہو[۵۷]۔ یعنی اس کی بدخطی کی وجہ سے پڑھنے والے کو تکلیف ہو۔ حضرت عبدالعزیز پرہیاروی کثیر التصانیف عالم تھے۔ انھوں نے متعدد موضوعات پر کتابیں لکھیں۔

دینیات میں یہ کتابیں تصنیف کیں: لوحِ محفوظ، کوثر النبی، نبراس، صراط المستقیم، مستجاب، وحیِ مقدس، ستر المعاد، تکمیل العرفان، صلوٰۃ المسافر، ایمانِ کامل، الصمصام، البحر المحیط، السلسبیل، رسالہ فی اثبات رفع السبابۃ التشہد، سدرۃ المنتہیٰ، مرام الکلام، منتہی الکمال، رسالہ فی الرد علی الروافض والناصبیۃ عن ذم المعاویۃ، مخزن العوارف، حاشیہ مسلم الثبوت، الیاقوتہ، مسائل السماع وغیرہ۔

طب میں زمردِ اخضر، یاقوت احمر، العنبر، الاکسیر [تین جلدوں میں]، تریاق، فرہنگ مصطلحات طبیہ وغیرہ لکھیں۔

---

۵۶ مناقب المحبوبین

۵۷ گلزارِ جمالیہ مطبوعہ مطبع ابوالعلائی، ص ۲۹

عملیات میں سرِ مکتوم، نہایت الاعمال، رسالہ فی الجفر الجامع، الدر المکنون، زیچ وغیرہ یادگار چھوڑیں۔
طبیعات میں رسائل کسوف، خسوف، الیواقیت فی علم المواقیت وغیرہ تالیف فرمائیں۔
منطق میں الحاشیۃ العزیزیہ [ایساغوجی کے متن پر] لکھا۔
متفرق کتابوں میں حاشیہ شرحِ جامی، نعم الوجیز، فضائل رضیہ، اسرارِ جمالیہ، مزناب، العقیق، المرفوعات، معجون الجواہر، النبطاسیا، سر السماء وغیرہ سپردِ قلم کیں۔

ان میں سے بہت سی کتابیں مرورِ زمانہ سے نایاب ہوگئی ہیں۔ ان میں سے کچھ مطبوعہ ہیں اور بہت سی غیر مطبوعہ، اور یہ ذخیرہ بھی کسی ایک جگہ مجتمع نہیں بلکہ منتشر صورت میں مختلف اداروں اور افراد کے پاس موجود ہے۔ اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا، وہ درج ذیل ہے۔

۱۔ کوثر النبی :- مطبوعہ مکتبہ قاسمیہ چوک فوارہ ملتان

۲۔ نبراس :- مطبوعہ حاجی دین محمد اینڈ سنز۔ ۱۲۳۹ھ میں لکھی گئی۔

۳۔ وحیِ مقدس :- (تفسیر) جناب شمس الدین مترجم "الاکسیر" فرماتے ہیں کہ کتاب میرے مطالعہ سے گزری ہے۔

۴۔ ایمانِ کامل :- مطبوعہ فاروقی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان۔

۵۔ الصمصام :- مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان۔

۶۔ مرام الکلام :- " (نیز دیال سنگھ لائبریری)

۷۔ رسالہ فی الرد علی الروافض والناہیۃ عن ذم المعاویہ :- مطبوعہ ملکیہ جناب اسد نظامی (جہانیاں منڈی)

۸۔ حاشیہ مسلم الثبوت :- قلمی نسخہ ملکیہ اسد نظامی

۹۔ مسائل السماع :- "

۱۰۔ زمردِ اخضر
۱۱۔ یاقوتِ احمر
۱۲۔ العنبر الاشہب
مطبوعہ شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔

۱۳۔ الاکسیر :- (تین جلدوں میں) ۔ ایک جلد (سوم) جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کے ہاں دیکھی تھی۔

۱۴۔ تریاق :۔ تونسہ کی لائبریری میں موجود ہے۔
۱۵۔ زیچ :۔ جناب شمس الدین مترجم الاکسیر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب میرے مطالعہ سے گذری ہے۔
۱۶۔ الحاشیۃ العزیزیہ :۔ [الیاغوجی کے متن پر] قلمی ملکیہ اسد نظامی
۱۷۔ چند اوراق علامہ موصوف کے دستخطی :۔ ملکیہ جناب محمد شفیع صاحب ڈیرہ غازی خان
۱۸۔ حاشیہ شرح جامی :۔ قلمی۔ مملوکہ اسد نظامی
۱۹۔ سر السماء :۔ جناب شمس الدین صاحب مترجم الاکسیر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب میرے مطالعہ سے گزری ہے۔
۲۰۔ جامع العلوم الناموسیہ والعقلیہ :
۲۱۔ انوار جمالیہ :۔ اس کا ترجمہ گلزار جمالیہ کے نام سے کیا۔ (پنجاب یونیورسٹی لائبریری)
۲۲۔ منتہی الکمال :۔ قلمی نسخہ مملوکہ جناب اسد نظامی

الفہرست : محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق

اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآنِ مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علمِ نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیوں کر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۳۶ مع اشاریہ　　قیمت ۴۵ روپے

اسلام اور فطرت

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن فطرت کیا ہے اور اسلام کیوں کر فطرت کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں اسی اہم موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

صفحات ۸ + ۱۲۴　　قیمت ۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

پروفیسر ریاض حسین

علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے علامہ اقبال کی مالی امداد

اسلامی فلسفہ، شاعری اور سیاسیات کے شعبوں میں علامہ اقبال نے جو نظریاتی اور عملی کارہائے نمایاں سرانجام دیے، ان پر بہت سا تحریری مواد سامنے آچکا ہے، لیکن ہندوستان میں اسلامی تحریکوں کے فروغ کے لیے علامہ نے جو مالی ایثار کیا اُن کے بارے ابھی تک تحقیق و جستجو کا میدان خالی ہے۔ جہاں تک علامہ اقبال کے ملی تحریکوں کے لیے مالی ایثار کے ٹھوس علمی ثبوت کا تعلق ہے، مجھے حال ہی میں مولانا محمد علی جوہر کے مشہور ہفتہ وار انگریزی اخبار "کامریڈ" کی ایک جلد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۱۱ کے اس شمارے کے آخر میں پورے صفحے پر گراموفون کمپنی آف انڈیا کا مندرجہ ذیل اشتہار چھپا ہے۔ اس اشتہار کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو ٹائپ میں چھپا ہے۔

304 The Comrade 7th october

(ترجمہ)

امداد برائے مسلم یونیورسٹی فنڈ

دلآویز نظم + دلکش آواز + قومی امداد + ہم خرما و ہم ثواب

ڈاکٹر محمد اقبال کا قومی ترانہ

مغنی

علی گڑھ کے ایک (محمڈن) صاحب

(اس کے بعد ترانہ ہندی نقل کیا گیا ہے)۔

(نیچے کی عبارت)

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا نے اپنے ہم وطنوں کے حبِ وطن کا اظہار ایک بے مثل نظم میں کیا تھا جو ہندوستان میں مقبول خاص و عام ہو چکی ہے۔ اب اپنی تازہ ترین نظم میں انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کے حبِ اسلام کا اظہار کیا ہے اور یقیناً اس کی مقبولیت

عالم گیر ہو گی - وطن اور مذہب کے تعلق کی بابت شاعر ایک شعر میں وہ مطلب ادا کر گیا ہے جو فلسفی کئی صفحوں میں ادا کرتے اور شاید پھر بھی ادا نہ کر سکتے -

اسلاف کے کارنامے اور شعرا بھی بیان کر چکے ہیں ـــــ قوم کے اقبال کا ماتم بہت کچھ ہوا اور ہو گا ـــــ مگر اقبال نے صاف بتایا ہے کہ جس قوم کو مسبب الاسباب کی طرف سے ایک ضروری پیغام بطور ودیعت کے سونپا گیا ہو جب تک سارے عالم کو وہ پیغام نہ پہنچا یا جا چکے اس وقت تک اس قوم کو تباہ و برباد کرنا آسان نہیں - اسلامی دنیا کے دیرینہ تنزل کے بعد اب پھر ہر طرف سے ترقی کی صدائیں پیغام امید بن کر آ رہی ہیں - کاروان سالار اب بھی وہی ہادی قوم ہے جس کی آواز نے بجلی کے کڑکے کی طرح اب سے تیرہ سو برس پہلے ایک عالم کو سوتے سے جگا یا تھا، اور اقبال کا ترانہ دراصل بانگِ درا ہے جس سے آواز آ رہی ہے - چلو - بڑھو - جلدی کرو - عجب نہیں کہ یہ دل کش نظم اقبال کی نجات کے لیے کافی ہو اور ہندوستان کے مسلمان بھی پکار اٹھیں - لبیک - لبیک - لبیک یا رسول اللہ - ایک خوش الحان مسلمان کے ذریعے سے یہ ترانہ اب ہر شخص کے کان تک پہنچ سکتا ہے - خاص اہتمام سے یہ ریکارڈ تیار ہوئے ہیں - حسب قرار دادِ قانونی ریکارڈوں کے فروخت ہونے پر ایک خاصی رقم فی ریکارڈ مسلم یونیورسٹی فنڈ میں پانچ سال تک جمع ہوتے رہے گی -

دس انچ ڈبل سائیڈڈ گراموفون ریکارڈ

نمبر ۱۲۵۲۴ - ۹
۱۲۵۲۵ - ۹

قیمت فی ریکارڈ تین روپیہ

اشتہار کے مضمون سے مندرجہ ذیل اہم نکات واضح ہوتے ہیں :

۱- ۱۹۱۱ء ہی میں "ترانۂ ہندی" نے مسلمانانِ ہند میں ایک علیحدہ نظریاتی قوم ہونے کا احساس بیدار کر دیا تھا جس کا اصل وطن چین و عرب و ہندوستان نہیں بلکہ "سارا جہان" ہے - اس طرح اقبال نے محدود علاقائی نیشنلزم اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ قومیت کے نظریات پر غالباً پہلی بار کاری ضرب لگا دی تھی -

۲۔ اقبال نے مسلمانانِ ہند کی نہ صرف فکری رہنمائی فرمائی بلکہ ان کے لیے ملی مفاد کے لیے مالی امداد بھی فراہم کی۔

زیرِ نظر اشتہار کے مطابق اقبالؒ نے ترانہ ہندی کے گرامو فون ریکارڈ کی فروخت پر پانچ سال تک کی رائیلٹی علی گڑھ یونیورسٹی فنڈ کے لیے وقف کر دی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں مسلمانانِ ہند کی تمام تر توجہ علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلوانے پر مرکوز تھی۔ برطانوی حکومتِ ہند نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر مسلمان اپنے ذرائع سے پچاس لاکھ روپے کا فنڈ قائم کر لیں تو ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار کے موقع پر جارج پنجم کی طرف سے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا چارٹر دے دیا جائے گا۔ چنانچہ ہندوستان کے چوٹی کے مسلمان زعما کا ایک وفد سر سلطان محمد خاں آغا خان سوم کی قیادت میں فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے ہندوستان کا طوفانی دورہ کر رہا تھا۔ وفد کی لاہور میں آمد کے موقع پر علامہ اقبالؒ نے ایک نہایت مدلل خطبہ مسلم یونیورسٹی کی ضرورت اور اہمیت کے موضوع پر ارشاد فرمایا تھا جس میں مسلم قومیت کی سائنٹفک توضیح پہلی بار فرمائی اور اعلان کیا کہ مسلم قوم کا علیحدہ وجود بغیر مسلم یونیورسٹی کے ہندوستان میں قائم رہنا محال ہے۔

لاہور میں مسلم یونیورسٹی فنڈ کے لیے جو بڑے بڑے عطیات دیے گئے، اُن میں سے چند ایک کی تفصیل یہ ہے:

نواب حاجی فتح علی خاں قزلباش مبلغ پانچ ہزار روپے۔

راجہ صاحب محمود آباد (غریب مسلمانانِ پنجاب کی طرف سے) مبلغ پانچ ہزار روپے۔

لاہور سٹیزن کمیٹی (لاہور کے گلی کوچوں سے اکٹھا کر کے) مبلغ دس ہزار روپے[۵]

کامریڈ میں شائع شدہ اشتہار کے مطابق علامہ اقبالؒ کا مالی عطیہ مندرجہ بالا تمام عطیات سے کہیں زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

اگر ہم پانچ سال کے عرصے میں تمام ہندوستان میں ریکارڈوں کی فروخت کی کم از کم تعداد ایک لاکھ فرض کریں تو ان کی قیمتِ فروخت تین لاکھ روپیہ بنتی ہے۔ اب اگر رائلٹی کی شرح

۵۔ ملاحظہ ہو "پیسہ اخبار" ۱۱ فروری ۱۹۱۱ء

کم از کم پانچ فی صدی لگائی جائے تو علامہ کی رائلٹی ان پانچ برسوں کے دوران مبلغ پندرہ ہزار روپے نکلتی ہے جو انھوں نے کلی طور پر علی گڑھ یونیورسٹی فنڈ کے لیے وقف کر دی تھی اور اس کے لیے باقاعدہ قانونی دستاویز بھی تیار کر کے دے دی تھی۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء کے معاشی حالات میں جب کہ پندرہ ہزار روپے ایک بہت بڑی رقم تھی اور جب کہ بڑے بڑے رئیسوں اور والیانِ ریاست کا عطیہ پانچ ہزار یا دس ہزار سے بڑھنے نہ پایا تھا، علامہ کا یہ گراں قدر ایثار ان کی سیرت کے ایک گم نام گوشے کو منکشف کرتا ہے۔

ارمغانِ حالی

پروفیسر حمید احمد خاں

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کی شہرت کا اصل باعث اگرچہ ان کی نظم کو قرار دیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو نظم و نثر دونوں اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ نظم کی طرح ان کا حصۂ نثر بھی بڑا جان دار اور بہت سے موضوعات کو محیط ہے۔ وہ سوانح نگار بھی تھے اور ناقد بھی۔ مفکر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھوں نے اصلاحی، تعمیری، اخلاقی، تعلیمی اور معاشرتی وغیرہ مسائل سے متعلق عمدہ مضامین سپردِ قلم کیے۔

یہ کتاب جو "ارمغانِ حالی" کے نام سے موسوم ہے، ان کے نظم و نثر کا قابلِ مطالعہ انتخاب ہے۔ کتاب میں حالی کے حالات و سوانح بھی مناسب تفصیل سے تحریر کیے گئے ہیں۔

صفحات ۲۶۱ قیمت ۱۸ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

پروفیسر سعید نفیسی مرحوم
ترجمہ: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

حافظ کا مذہب

(پروفیسر سعید نفیسی مرحوم ایران کے چند گنے چنے بڑے ادیبوں اور مورخینِ ادب و محققین میں سے تھے۔ وہ کئی مرتبہ پاکستان آچکے ہیں۔ علامہ اقبال کے عشاق میں سے تھے۔ اپنے اس مختصر سے مقالے میں انھوں نے دادِ تحقیق دی اور ایک مشہور مفروضے کو تاریخی حقایق سے غلط ثابت کیا ہے۔ دراصل اکبری دور کے ایک تذکرہ نگار نور اللہ شوستری نے ایران کے تقریباً تمام نوابغِ شعر و ادب کو کسی نہ کسی طرح اپنے خاص مسلک سے وابستہ قرار دیا تھا۔ انہی نوابغ میں حافظ شیرازی بھی تھے۔ شوستری کے دیکھا دیکھی بعد کے بعض متعصب مورخینِ ادب نے بھی وہی ڈھنگ اختیار کیا، تاہم بعض حقیقت پسند ایرانی محققین اس روش کے خلاف تھے۔ انھوں نے اس روش کا توڑ کیا جس کی ایک جھلک "مذہبِ حافظ" میں نظر آتی ہے۔ انہی محققین نے شوستری کو "شیعہ گر" کا خطاب بھی دیا۔ ملاحظہ ہو مرحوم سعید نفیسی کے مضمون "مذہبِ حافظ" کا اردو ترجمہ۔ ان کا یہ مضمون پنجاب یونیورسٹی کے مجلہ اورینٹل کالج میگزین کے ضمیمہ اگست۔ نومبر ۱۹۵۲ میں شائع ہوا تھا۔ راقم نے ہجری سنین کے ساتھ عیسوی سنین کا اضافہ کر دیا ہے)۔

ایران میں صفوی[۱] دور سے قبل تمام اسلامی ادوار میں لوگوں کی اکثریت حنفی مسلک پر تھی۔ صرف تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے آغاز میں فرقہ زیدیہ کے مبلغین نے اپنی تبلیغ سے شمالی ایران ــــ رویان، طبرستان، گیلان، دیلمستان اور گرگان ــــ کے کچھ لوگوں کو زیدی مسلک میں شامل کر لیا اور یہ تحریک آخر ۲۵۰ / ۸۶۴ء میں طبرستان کے علاقے پر علویوں کی حکومت پر منتج ہوئی۔ اس کے بعد زیدیہ رے (آج کل تہران سے ملحق آبادی) اور اس کے اطراف میں پھیل گئے۔ تیسری صدی

---

[۱] برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ دور اور ایران میں صفوی دور تقریباً ایک ہی زمانے (دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی) میں شروع ہوئے۔ (م)

(نویں صدی) کے وسط میں اسماعیلیوں نے ماوراء النہر میں تبلیغ شروع کر دی، جس کے نتیجے میں سمرقند و بخارا کے کچھ لوگ ان سے مل گئے، لیکن نصر بن احمد سامانی کے دربار میں ان لوگوں کو کچھ زیادہ ہی رسوخ حاصل ہو گیا، یہاں تک کہ خود بادشاہ (نصر) اس فرقے کا پیرو ہو گیا۔ اس بات کے بہت قرائن ملتے ہیں کہ نصر کے دربار کے مشہور وزرا مثلاً ابوالفضل محمد بن عبداللہ[۵] بلعمی، جیہانی خاندان کے وزرا، مصعبی اور چند دوسرے بعض بڑے بڑے دانش ور جیسے ابو عبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقندی، حتیٰ کہ ابن سینا کا والد عبداللہ بن حسن بن علی بن سینا اور مشہور شاعر مجد الدین کسائی مروزی بھی اسماعیلی اور غالباً ماوراء النہر کے مشہور اسماعیلی پیشوا ابو یعقوب سگزی کے دست پروردہ لوگوں میں سے تھے۔ نصر بن احمد کی سلطنت کے آخر میں، جیسا کہ نظام الملک نے سیاست نامہ میں بیان کیا ہے، اس کے درباریوں نے (غالباً خلفائے بغداد کی تحریک پر) اس کے خلاف سرکشی کی، جس کے نتیجے میں اسے مجبوراً اس فرقے سے تعلق توڑنا پڑا۔ تاہم سامانیوں کی قلمرو کے دیگر نواح میں یہ فرقہ باقی رہا اور نہ صرف اس دور کے چند مشہور امرا — مثلاً امرائے چغانیاں، امرائے سیمجوریان، اور ابو منصور محمد بن عبدالرزاق طوسی — اس فرقے کی طرف مائل تھے بلکہ نواحی ایران کے بھی کچھ لوگ اس طرف تھوڑا بہت جھکاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ (مشہور شاعر اور شاہنامہ کے مصنف) فردوسی اور ابوریحان بیرونی کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے طوس اور خوارزم کے علاوہ قہستان اور طبسین کے علاقے میں بھی اسماعیلی تھے اور آج جو اسماعیلی ان علاقوں میں ہیں اسی زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کے اواخر میں (مشہور شاعر) ناصر خسرو مروزی مصر کے فاطمی خلفا کی جانب سے خراسان کا "حجت" مقرر ہوا۔ وہاں سے وہ اس دور کے مشرقی ایران کے آخر یعنی بدخشاں تک گیا اور وہاں کے لوگوں میں اس نے اس طریقے کی تبلیغ کی۔ اس علاقے کے آج کے اسماعیلی بھی اسی دور سے چلے آرہے ہیں۔ انہی ادوار میں حسن بن صباح نے بھی مرکزی ایران اور الموت، قزوین، رودبار اور طارم میں اسماعیلیت کی اشاعت کی، اور ۴۸۳ھ سے ۶۵۴ھ تک مشہور سلطنت جسے بعد میں ہلاکو خان نے مٹا ڈالا، کی داغ بیل ڈالی۔ اب وہاں فرقہ اسماعیلیہ کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔

---

۵ مقالات منتخبہ میں غلطی سے عبید اللہ چھپ گیا ہے۔ ص ۲۰۷ (۴۹)

زیدیہ جو شمالی اور مرکزی ایران میں تھے آہستہ آہستہ فرقۂ جعفریہ اثنا عشری کی طرف مائل ہو گئے۔ انھیں اس طرف لانے والے آل بویہ کے بادشاہ تھے جنھوں نے ۳۲۰ھ (۹۳۲ء) سے سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ان لوگوں کی تبلیغ کے نتیجے میں فرقۂ جعفریہ مرکزی ایران کے مختلف علاقوں میں رواج پذیر ہوا، اور صفوی دور سے قبل ان کے زیادہ تر گڑھ قم، ساوہ، قزوین، رے، سبزوار اور بیہق میں تھے۔

شافعی فرقے کو پانچویں صدی تک ایران میں کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ تھی۔ ۴۳۱ھ (۱۰۴۰ء) میں جب سلجوقی ترکوں نے مسعود غزنوی کو شکست دی اور وہ خراسان میں پھیل گئے تو خراسان کے شافعیوں نے، جن کا اس وقت اہم مرکز شہر نیشاپور تھا، ان ترکوں کا ساتھ دیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنوی ہمیشہ حنفیوں کے طرف دار رہے۔ اس دن سے (جب ترک قابض ہوئے) خراسان میں مسلک شافعی رائج ہوا اور ایران کے دیگر علاقوں میں بھی وہ تھوڑا بہت پھیلا، لیکن اصفہان کے زیریں حصّوں تک نہ پہنچا۔ آخری شہر جس میں حنفی اور شافعی مل کر زندگی بسر کرتے رہے یہی شہر اصفہان تھا۔ یہاں سلجوقیوں اور خوارزم شاہیوں کے ادوار میں یہ دونوں فرقے بارہا باہم دست و گریباں اور قتل و غارت گری کا شکار ہوئے۔

بہر حال جنوبی اصفہان کے نواح کے لوگ سبھی حنفی مسلک تھے۔ چنانچہ آج بھی ایران میں جو حنفی ہیں ان کا تعلق فارس کے مختلف علاقوں اور خلیج فارس کے ساحلوں سے ہے۔

دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کے آغاز میں جب شاہ اسماعیل نے فرقۂ جعفریہ کی ترویج کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں ہر قسم کی قتل و غارت گری کو جائز جانا تو اس وقت بھی جنوبی ایران کے علاقوں کے لوگ حنفی مشرب تھے۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب کے دیوان کے مشہور شارح قاضی میر حسین بن معین الدین حسینی یزدی میبذی متخلص بہ منطقی، جنھیں اسی گیرودار میں شاہ اسماعیل کے حکم پر ۹۰۹ھ (۴-۱۵۰۳ء) میں قتل کر دیا گیا، اوقاف یزد کے متولی اور اس علاقے کے حنفیوں کے قاضی تھے۔

پوری آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں، حافظ کے زمانے میں، فارس کے لوگ یقینی طور پر سبھی حنفی تھے۔ اس عہد کی معتبر تالیفات سے، جن کے بیشتر مؤلفین حافظ کے ہمعصر ا شیراز اور فارس کے دیگر علاقوں سے متعلق تھے — مثلاً ابن حجر عسقلانی کی "درر الکامنہ فی اعیان المائۃ

"الثامنہ"، ابو القاسم جنید شیرازی کی "شدالازار" اور ابن ابی الوفا کی "جواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ" سے یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی ہے کہ یہ سب لوگ حنفی تھے اور حافظ بھی اسی حنفی مسلک کا پیرو تھا۔ ابواسحاق اینجو اور خاندانِ مظفریہ کے دوسرے بادشاہ بھی، جن سے حافظ کا رابطہ تھا، سبھی حنفی تھے۔

حافظ نے اپنے اشعار میں صرف دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ "کشف کشاف" یعنی سراج الدین عمر قزوینی (م ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۴ء) کی "الکشف عن مشکلات الکشاف" اور دوسری کتاب "مواقف" تالیف عضد الدین عبدالرحمان ایجی (م ۷۵۶ھ/ ۱۳۵۵ء)۔ اور یہ دونوں کتابیں حنفی علما کی مشہور کتابیں ہیں، اور یہ بات کہ حافظ کو حنفیوں کی تالیفات سے انس تھا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حنفی مسلک کا پیروکار تھا۔

حافظ کے اشعار میں بھی اس امر کے اشارے ملتے ہیں۔ جیسے اس شعر میں کہتا ہے :

من ہمان دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق　　چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

(میں نے جب چشمۂ عشق سے وضو کیا اسی وقت دنیا کی ہر چیز پر چار تکبیریں پڑھ ڈالیں۔ یعنی ہر چیز سے قطع تعلق کر لیا)۔

نمازِ جنازہ میں مُردے پر "چار تکبیریں پڑھنا" اہل سنت کا عقیدہ و طریقہ ہے جب کہ شیعہ لوگ پانچ تکبیریں پڑھتے ہیں۔ بظاہر اہل سنت کی چار تکبیریں خلفائے راشدین کی تعداد اور شیعوں کی پانچ تکبیریں خمسہ آلِ عباس یا "پنج تن" کے عدد کی مناسبت سے ہیں۔

ایک اور شعر میں وہ بہار الدین کے بارے میں کہتا ہے :

بہار الحق والدین طاب مثواہ　　امام سنت و شیخ جماعت

(بہار الحق والدین کی قرارگاہ کو اللہ تعالیٰ پاکیزہ رکھے، وہ امام سنت اور جماعت کے شیخ ہیں)۔

اس شعر میں سنت و جماعت کی طرف اشارہ خود ایک اور دلیل ہے۔ لیکن یہ بات کہ حافظ کے کلام میں بعض ایسے اشعار ہیں جو اس کے تشیع پر دلالت کرتے ہیں، درست نہیں۔ میرے نظریے کے مطابق ایسے تمام اشعار الحاقی ہیں جنھیں کسی طرح اس کے دیوان میں شامل کر لیا گیا۔

محمد اسحاق بھٹی

مولانا غلام رسول مہر کے چند مکاتیب

مولانا غلام رسول مہر مرحوم کامیاب صحافی، ممتاز محقق، نامور مورخ اور صاحبِ طرز ادیب تھے۔ مطالعہ بڑا وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ جو کچھ لکھتے نہایت تحقیق سے لکھتے اور موضوع میں ڈوب کر لکھتے۔ ۱۴ اپریل ۱۸۹۵ء کو مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر سے چار میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے اور ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال کیا۔ مجھے وہ اکثر یاد فرماتے اور خطوط لکھتے۔ میرے "الاعتصام" کے زمانۂ ادارت میں انھوں نے مجھے متعدد خطوط ارسال کیے۔ پچھلے دنوں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ بعض مشاہیر کے مکتوبات ملے۔ ان میں بارہ خطوط مہر صاحب کے دستیاب ہوئے۔ افسوس ہے مہر صاحب مرحوم کے کئی اہم خطوط ضائع ہو گئے ہیں، جو بچ گئے وہ نذرِ قارئینِ کرام ہیں۔ یہ پرانی یادوں کی ایک جھلک ہے —— (محمد اسحاق بھٹی)

(۱)

باسمہٖ سبحانہٗ

مسلم ٹاؤن - لاہور

۲۵ جون ۱۹۵۴

مکرمی[۱] کل ایک عریضہ خدمتِ والا میں بھیج چکا ہوں۔ آج "الاعتصام" کے پرانے پرچے

---

[۱] "فاران" (کراچی) کے مدیر ماہر القادری مرحوم کو بلاوجہ مولانا ابوالکلام آزاد سے عداوت تھی۔ وہ ان کے خلاف عام طور پر "فاران" میں اظہارِ خیال کرتے رہتے تھے۔ "الاعتصام" اس کا جواب دیتا تھا۔ "چراغِ راہ" (کراچی) میں بھی ایک یا دو مرتبہ مولانا کی مخالفت کی گئی۔ مولانا مہر صاحب نے مجھ سے وہ دونوں رسالے منگوائے تھے۔ خدا اسی سلسلہ میں ہے۔

ملے لیکن چار کے بجائے تین۔ ۱۴ مئی کا پرچہ (یعنی ۲) ان میں نہ تھا۔ ممکن ہے اتفاقیہ رہ گیا ہو یا دفتر میں اس کا کوئی فالتو نسخہ موجود نہ ہو۔ اگر میرا آخری اندازہ درست ہے تو مہربانی فرما کر یہ پرچہ دو ایک روز کے لیے مستعار مرحمت فرمایے۔ میں یہ دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ نیز "چراغ راہ" اور "فاران" کے پرچے محض بہ غرض مطالعہ عنایت فرمائیں۔

عجیب بات ہے کہ انجمن ترقی اردو کے اربابِ اقتدار اس بنا پر مولانا کے مخالف ہوئے کہ مولانا شبلی پارٹی سے وابستہ تھے اور حضرات فضلائے ندوہ نے اس بنا پر مخالفت کا بیڑا اٹھایا کہ مولانا سید سلیمان مرحوم کی یگانگی ہر موہوم خطرے سے بھی محفوظ ہو جائے۔ گویا جو لوگ کبھی ہم رائے نہ تھے وہ مولانا کی مخالفت میں ہم رائے ہو گئے۔ سچ ہے معاصرت کا فتنہ بڑا ہی سخت ہے۔ خدا ہر فرد کو اس سے بچائے۔ مولانا کے نہاں خانۂ قلب کا حال خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں لیکن حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ خلوت کی گفتگوؤں میں بھی انھوں نے کسی صاحبِ علم یا رکنِ سیاست کے متعلق کبھی ایسا کلمہ نہیں کہا جس میں تحقیر کا شائبہ پایا جائے۔ سخت مخالفوں بلکہ شاتموں کا ذکر بھی ہمیشہ بڑے ہی اچھے انداز میں کیا۔ ان کے سامنے اکثر اپنے خیالات و افکارِ مخالفانہ پر ندامت ہوتی رہی۔ اگر آپ کی عنایت سے میں یہ مضامین دیکھ سکوں تو شکر گزار رہوں گا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

نیاز مند

مہر

(۲)

باسمہٖ سبحانہٗ

۲۷ ستمبر ۱۹۵۷ء

مکرمی۔ شاید مولانا محمد اسحاق حنیف[؎۵] صاحب نے سمجھا ہو کہ میں ۱۵ ستمبر کی چائے میں دانستہ

؎۵ حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم نے ایک مرتبہ بعض اہم شخصیتوں کو چائے پر بلایا تھا۔ مہر صاحب مرحوم کو بھی دعوت دی تھی، لیکن دعوت نامہ بروقت نہ پہنچنے کی وجہ سے وہ تشریف نہیں لا سکے تھے۔

شامل نہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا دعوت نامہ مجھے ۱۶ کو ملا۔ یہ اظہارِ واقعہ بھی ہے اور معذرت بھی۔ مہربانی ہوگی، ان تک پہنچا دیں۔

مجھے رنگون سے "استقلال" کے پرچے ملے جو یقیناً آپ کی سعی کا نتیجہ ہیں لیکن جس پرچے کا میں منتظر تھا یعنی ۱۸۵۷ء والا نمبر، وہ مجھے نہیں ملا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے پاس جو خاص نمبر آئے ہوں خصوصاً استقلال کا نمبر، وہ آپ دو چار روز کے لیے مجھے مستعار بغرض مطالعہ دے سکیں؟

امید ہے آپ بہ خیر ہوں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کی خدمت میں میرا اسلام پہنچایئے۔

نیازمند

مہر

(۳)

باسمہٖ سبحانہٗ

مسلم ٹاؤن، لاہور

۲۱۔ اکتوبر ۱۹۵۷

مکرمی، آپ کا رسالہ میں نے دیکھ لیا۔ اب فرمائیں، اس کی واپسی کی کیا صورت ہو۔ میں ہفتے کے روز اپنے ساتھ لا سکتا ہوں، بشرطیکہ آپ پبلشرز یونائٹڈ تک چند منٹ کے لیے تکلیف فرما سکیں[۵۳]۔ نیز "ماہِ نو" کا خاص نمبر دیکھنے کی آرزو باقی ہے۔ غالباً آپ کو فرصت نہ مل سکی۔

مولانا عطاء اللہ صاحب کی خدمت میں سلام مسنون پہنچایئے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

نیازمند

مہر

---

۵۳ مہر صاحب کا معمول تھا کہ وہ ہفتے کے روز پبلشرز یونائیٹڈ (انارکلی) آتے تھے۔

(۴)

باسمہ سبحانہٗ

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۷ء

مکرمی۔ تکلیف فرمائی کا شکریہ۔ "ماہ نو" واپس بھیجتا ہوں۔ آپ نے "مدینہ" بھیج دیا اور "الجمعیۃ" نہیں بھیجا۔ والسلام علیکم۔

نیازمند

مہر

(۵)

باسمہ سبحانہٗ

مسلم ٹاؤن۔ لاہور

۴ نومبر ۱۹۵۷ء

بھائی۔ کتابیں مَیں نے دیکھ لیں۔ ان میں کوئی چیز کام کی نہیں۔ انشاء اللہ اب کے لیتا آؤں گا۔ پرچے میں نے ابھی تک بالاستیعاب نہیں دیکھے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو آرزو ہے کہ آپ کا کوئی آدمی آئے، یہ کتابیں لے جائے اور مولانا محمد قاسم کے سوانح چند روز کے لیے دے جائے۔ اگر زحمت ہو تو مضائقہ نہیں۔ میں ہفتے کو انتظار کروں گا۔

امید ہے، آپ بہ خیر ہوں گے۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ مولانا داؤد غزنوی، مولانا اسمٰعیل اور مولانا عطاء اللہ کو سلام مسنون پہنچا دیجیے۔ والسلام۔

آپ کا

مہر

(۶)

باسمہ سبحانہٗ

۱۶ مارچ ۱۹۶۰

برادر مکرم۔ گرامی نامہ اور رسالہ دونوں مجھے مل گئے اور میں نے مضمون دیکھ بھی لیا۔ دل

بڑا مضطرب ہے، لیکن تین باتیں موجب تشویش ہیں۔ اوّل، زیادہ تو نہیں تو کم از کم چند چیزیں خود ہمارے ساتھیوں کی پیدا کردہ ہیں۔ دوم جو کچھ لکھنا چاہیے آیا وہ ایسی بحثیں تو پیدا نہ کر دے گا کہ آپ اس کی اشاعت میں متامل ہو جائیں یا فریقِ مخالف بن جائیں؟ سوم میرے ذہن میں جو کچھ ہے، اسے اگر تفصیل سے لکھوں گا تو خود آپ کے ماحول کو بھی شاید گوارا نہ ہو۔ ایک شے ہے لکھنا، ایک شے ہے آپ کے لیے لکھنا۔ دونوں میں فرق ہے۔ محض لکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ کے لیے جو کچھ لکھا جائے، اس میں خاص حدود کو ملحوظ رکھنا لازم ہوگا۔ مجھے سوچنے دیجیے۔ آپ کے التفاتِ گرامی کے لیے شکر گزار ہوں۔ "تبرکات آزاد" ابھی تک جلد بندی کے مرحلے سے نہیں نکلی۔ نکلے تو آپ کو اور مولانا عطاء اللہ کو بھیجوں۔ مولانا کی خدمت میں میرا اسلام پہنچائیں۔ والسلام۔

آپ کا

مہر

(۷)

باسمہ سبحانہ،

۲۸ اپریل ۱۹۶۰

بھائی۔ میں شرمندہ ہوں۔ بعض وقتی کام اس طرح مجھ پر آپڑے جس طرح اتفاقیہ حوادث نازل ہو جاتے ہیں۔ اس اثنا میں "معارف" بھی اچھل پڑا اور معاملہ زیادہ وسیع ہو گیا۔ اب مجھے اطمینان سے فرصت نکال کر لکھنے دیجیے۔ خفا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ضرورت واہمیتِ معاملہ پیشِ نظر ہے اور جو کچھ لازم ہے، ہو ہی جانا چاہیے۔ آپ کا بھیجا ہوا مکتوب میرے پاس محفوظ ہے، کاش یہ مجھے پہلے مل جاتا تو "تبرکاتِ آزاد" میں شامل کر دیتا۔[۵۴] مولانا عطاء اللہ صاحب

---

[۵۴] میں نے مئی ۱۹۵۳ء میں مولانا ابو الکلام آزاد کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا، جس میں عرض کیا تھا کہ "تفسیر ترجمان القرآن" کی تیسری جلد کب شائع ہو رہی ہے۔ انھوں نے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ جلد عن قریب شائع ہو جائے گی۔ یہ خط میرے پاس محفوظ تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد مولانا غلام رسول مہر نے مولانا کے مکتوبات کا مجموعہ "نقشِ آزاد" کے نام شائع کیا تھا۔ اس کے بعد "تبرکاتِ آزاد" کے نام سے

(باقی اگلے صفحے پر)

کو میرا اسلام پہنچا ہے۔ والسلام علیکم۔

آپ کا

مہر

(۸)

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۲ جون ۱۹۶۰

برادر مکرم ـــ دو روایتوں کے متعلق میں کئی روز سے مضطرب ہوں۔

۱۔ لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل ولا ملک مقرب

۲۔ لا تسبوا الدھر فان اللّٰہ ھو الدھر یا الفاظ میں کچھ ادل بدل ہے۔

مہربانی فرما کر مولانا عطاء اللہ کی خدمت میں سلام عرض کیجیے اور پوچھیے ان کے باب میں کیا ارشاد ہے؟ یہ کیسی ہیں؟ کس کتاب میں ملیں گی؟ مثلاً مشکوٰۃ کے کس کس باب میں؟ ان کا مفہوم کیا ہے؟ خصوصاً پہلی روایت کا۔

جواب مجھے جلد از جلد مرحمت فرمائیں۔ مجھے ضرورت ہے اور عجلت میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ والسلام۔

آپ کا

مہر

وہ مجموعہ مرتب کیا جو ان مکتوبات پر مشتمل تھا جو مولانا نے مولانا محی الدین احمد قصوری کو تحریر فرمائے تھے، اس مجموعے میں دیگر حضرات کے نام بھی مولانا کے مکتوب درج ہیں۔ جو خط مولانا نے مجھے لکھا تھا، وہ میں نے مہر صاحب کو دے دیا تھا تاکہ اس مجموعے میں چھپ جائے اور محفوظ ہو جائے، لیکن یہ خط انھیں اس وقت ملا جب "تبرکات آزاد" شائع ہو گئی۔ یہ خط مہر صاحب کے پاس ہی رہا، بعد میں مجھے نہیں ملا ـــ مہر صاحب نے یہاں اسی خط کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۹)

باسمہ سبحانہٗ

مسلم ٹاؤن، لاہور

۵ اگست ۱۹۶۱

۴ اگست کے افتتاحیے کا شعر پڑھ کر تعجب ہوا۔ ظاہر ہے کہ پہلے مصرعے کا وزن اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک "جو"[۵۵] اولِ مصرع میں نہ آئے۔ میں پندرہ دن سے بیمار اور پابندِ بستر ہوں۔ انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ اب بخار نہیں کمزوری خاصی ہے۔ یہ سطریں لکھوا رہا ہوں۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

آپ کا

مہر

(۱۰)

باسمہ سبحانہٗ

مسلم ٹاؤن۔ لاہور

۴ دسمبر ۱۹۶۱

برادر مکرم۔ آپ نہ "ملفوظات"[۵۶] لینے کے لیے آئے اور نہ مکاتیب سید کے متعلق کوئی اطلاع بھیجی آپ یہ سن کر غالباً حیران ہوں گے کہ ملفوظات پڑھنے شروع کیے تو معلوم ہوا کہ مطالب متعارف ہیں۔ میں نے مولوی غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کا مقالہ، سوانح مولانا سید عبداللہ غزنوی سے نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اصل مقالہ فارسی میں تھا۔ سوانح میں اس کا اردو ترجمہ چھاپا گیا ہے۔ بہرحال ان میں کوئی چیز کام کی نہیں۔ وہ محفوظ ہیں۔ جب چاہیں لے جائیں۔

۵۵۔ "الاعتصام" میں ایک شعر کا پہلا مصرع یوں لکھا گیا تھا: "بادہ کش تھے جو پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں" مہر صاحب نے فوراً خط لکھا کہ "جو" پہلے ہے، "جو بادہ کش تھے پرانے ــــ

۵۶۔ "ملفوظات ملا حبیب اللہ قندھاری" مراد ہیں، جو مہر صاحب نے مجھ سے مطالعے کے لیے منگوائے تھے

نیز آپ نے مولانا محی الدین احمد[۵۷] کے مقالے پر جو کچھ تحریر فرمایا، اس سے یکایک ایک مقالے کی تحریک ہوئی - چنانچہ کل صبح بعد نماز پنسل کاغذ لے کر بیٹھا تو سات سلپیں لکھی گئیں - آج صبح وہ مقالہ مکمل کر دیا - لمبا ہے اور آپ کی رائے سے اختلاف کیا گیا ہے - میں اس قسم کے مباحث میں شرکت پسند نہیں کرتا مگر چند خیالات تھے، جنھیں ظاہر کرنا ضروری سمجھتا تھا - وہ اس وقت دوں گا کہ آپ میرے سامنے ایک مرتبہ اسے پڑھ لیں - زحمت دینا قطعاً گوارا نہیں مگر مجبوری ہے - والسلام علیکم -

نیازمند

مہر

(۱۱)

باسمہ سبحانہ

مسلم ٹاؤن، لاہور

۲۱ جولائی ۱۹۶۲

برادر مکرم - آپ کو یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ آپ نے علما کی طرف سے ایک "متفقہ دستور" شائع کیا تھا - یعنی "الاعتصام" میں، نیز اس سلسلے میں بعض مضامین بھی چھاپے تھے - میرے پاس الاعتصام کا وہ نمبر محفوظ ہے، مگر تلاش پر ملا نہیں - کیا یہ ممکن ہے کہ وہ نمبر مجھے دوبارہ مل جائے، مستقل طور پر نہ سہی عاریتہً ہی سہی - مجھے اس کی ضرورت ہے - اگر آپ کے پاس کوئی فالتو کاپی نہ ہو تو اپنی کاپی ایک دو روز کے لیے دکھا دیں -

مولانا داؤد غزنوی صاحب اور مولانا عطاء اللہ صاحب کی خدمت میں میرا اسلام پہنچائیں - نیز مولانا حنیف ندوی صاحب کی خدمت میں -

مولانا ثناء اللہ مرحوم کے پوتوں[۵۸] کی شہادت کا دردناک واقعہ پڑھ کر سخت صدمہ ہوا - اللہ تعالیٰ

---

۵۷ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے فرزند گرامی مولانا محی الدین احمد قصوری مراد ہیں، جن کا مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تصنیف "تذکرہ" میں ذکر فرمایا ہے - مولانا محی الدین احمد قصوری نے "الاعتصام" کے لیے ایک مضمون لکھا تھا جو میں نے اختلافی نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا - اس کے بعد مہر صاحب کا وہ مضمون شائع ہوا، جس کا انھوں نے ذکر کیا ہے -

۵۸ مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے دو پوتوں ذکاء اللہ ثنائی اور بہاء اللہ ثنائی کو (باقی اگلے صفحے پر)

انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ دیکھیے مولانا کے صاحب زادے بھی مظلوم شہید ہوئے اور دو پوتے بھی۔ میرے نزدیک خود مولانا کی موت بھی شہادت ہی کی موت تھی۔ دراصل وہ امرت سر چھوڑتے ہی ختم ہو چکے تھے۔ بعد میں جتنی مدت روئے زمین پر گزاری محض ایک مفروضہ زندگی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ والسلام۔

آپ کا

مہر

(۱۲)

باسمہٖ سبحانہٗ

۸ اگست ۱۹۶۲

برادرِ عزیز۔ مضمون خدمتِ والا میں حاضر ہے۔ اپنے کاتب کو ہدایت فرمایئے کہ میں جو لفظ جس طرح لکھتا ہوں، اسی طرح لکھا جائے۔ مثلاً میں نے کئی مرتبہ لفظ سیکڑوں (س، ی، ک، ڑ، و، ں) لکھا، کاتب نے اسے زبردستی سینکڑوں (س، ی، ن، ک، ڑ، و، ن) بنا دیا۔ حالاں کہ میرے محدود علم کے مطابق سینکڑوں (ک اور ی کے درمیان ن) کوئی لفظ اردو زبان میں موجود نہیں۔ آپ لغت اٹھا کر اطمینان فرمالیں۔ صحیح لفظ سیکڑوں (ن کے بغیر) ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے الفاظ۔

امید ہے آپ بہ خیر ہوں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا

مہر

ایک سب انسپکٹر پولیس احسان اللہ پرویز نے ۱۴ جولائی ۱۹۶۲ء کو سرگودھا میں قتل کر دیا تھا۔ قاتل شام کے وقت ان کے دفتر شائی پریس آیا اور سرکاری پستول سے دونوں بھائیوں کو یکے بعد دیگرے گولی کا نشانہ بنادیا۔

مکتوبِ مدنی

مولانا محمد حنیف ندوی

الٰہیات میں یہ بحث بڑی علمی اہمیت کی حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور کائنات میں ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ ابنِ عربی نے "وحدتِ وجود" کا نظریہ پیش کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بحرِ وجود ایک ہے اور تمام کائنات اسی بحرِ بیکراں کی موجیں ہیں۔ مجدد الف ثانی نے اس کے مقابلے میں نظریۂ شہود کی تائید کی جس میں وجود دو ہیں۔ ایک مادی دنیا کا اور دوسرا حقیقت ورار الورا کا۔

اس مکتوب میں شاہ ولی اللہ نے دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ رسالہ اس مکتوب کا شگفتہ اور سلیس اردو ترجمہ ہے۔

صفحات ۳۶ قیمت ۵ روپے

اقبال اور سوشلزم

ایس۔ اے رحمان

زمانۂ حال کے سماجی فلسفوں میں سوشلزم کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ پاکستان کے نظریاتی خالق علامہ اقبال نے بھی اپنی تصنیفات میں اس فلسفۂ حیات سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس کتاب میں سوشلزم کے اساسی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے اور علامہ اقبال کی شعری اور نثری تخلیقات کی روشنی میں سوشلزم سے متعلق ان کے موقف کی وضاحت کر کے، اس میں ان کی دلچسپی کے حدود کا تعین کیا گیا ہے۔

صفحات ۸۰ قیمت ۱۰ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

(عن سلمان قال خطب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم . . .) وَھُوَ شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَّاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ)

(حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا . . .) رمضان وہ مہینہ ہے، جس کے پہلے دس دن اللہ کی رحمتوں کے حامل ہیں، درمیان کے دس دن اللہ کی بخشش کے دن ہیں اور آخر کے دس دن دوزخ کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامور صحابی تھے۔ ان سے حدیث کی مختلف کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ مروی ہے، جو آپ نے شعبان کی آخری تاریخ کو یعنی رمضان سے صرف ایک دن پیشتر مدینہ منورہ میں صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ نہایت شان دار ہے اور چوں کہ حضرت سلمان کی روایت کے ذریعے سے پہنچا ہے، اس لیے خطبۂ سلمان فارسی کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبے میں آں حضرتؐ کے وہ الفاظ بھی مروی ہیں جو اوپر درج کیے گئے ہیں۔ یہ خطبہ مشکوٰۃ کے کتاب الصوم کی فصل ثالث میں بیان ہوا ہے۔ بعض اور کتابوں میں بھی منقول ہے، کسی میں کچھ لفظ کم ہیں اور کسی میں زیادہ — !

اس خطبے کے جو الفاظ اوپر درج کیے گئے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کا مبارک و مقدس مہینہ، تین عشروں میں منقسم ہے اور ہر عشرہ خاص امتیازات و خصائص کا حامل ہے، جن میں ایک سچے اور پاک باز مسلمان کے لیے ہر ہر قدم پر بے شمار برکتیں اور فضیلتیں پنہاں ہیں۔

عشرۂ اوّل میں یعنی یکم رمضان سے دس رمضان تک، اللہ کی رحمتوں، نوازشوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اللہ کے بندے اگر اپنا طرزِ حیات بدل لیں اور اپنے آپ کو احکامِ خداوندی کے تابع کر دیں تو رحمتوں سے بھرپور ان دنوں میں زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے جس شخص کو اللہ اپنی رحمتوں کے لیے خاص کر لے اور اس پر اپنے کرم کا نزول شروع کر دے، اس سے

بہتر اور خوش قسمت کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی ہر لحاظ سے قابلِ رشک ہے اور وہ دنیا و عقبیٰ میں کامیاب و کامران ہے۔ جب وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہو گیا تو لازماً تمام ذہنی اذیتوں، روحانی تکلیفوں اور فکری الجھنوں سے نجات پا گیا۔

عشرۂ ثانی کا آغاز گیارہ رمضان سے ہوتا ہے اور ۲۰ رمضان کو یہ عشرہ ختم ہوتا ہے۔ ماہِ رمضان کے دس دن کی اس مدت کو اللہ کی مغفرت اور بخشش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے یعنی جو لوگ خالص اللہ کے لیے روزہ رکھتے اور طلبِ اجر و ثواب کے لیے بھوک پیاس کی شدتیں برداشت کرتے ہیں، ان کے گناہوں پر خطِ تنسیخ کھنچ جاتا ہے اور وہ ان دس دنوں میں اللہ کی مغفرت کے حق دار ہو جاتے ہیں۔

عشرۂ ثالث یعنی اکیس رمضان سے آخری تاریخ تک کے دس روز دوزخ کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔ یہ دس دن اپنے اندر بے حد فضائل رکھتے ہیں۔ ان میں اللہ کے نیک بندے اعتکاف کرتے ہیں اور اعتکاف کرنے والے بارگاہِ الٰہی سے بے شمار درجات پاتے ہیں۔ پھر اسی عشرے میں لیلۃ القدر آتی ہے، جس میں عبادت کرنا، قرآن کی رو سے ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے بھی افضل ہے۔ پھر ان ہی دنوں میں عید سے پہلے صدقۃ الفطر ادا کیا جاتا ہے، جس سے بے شمار مستحق اور غریب آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے، یہ تمام باتیں بدرجۂ غایت قابلِ ستائش ہیں۔ اگر ان میں نیت خالص ہو اور واحد مقصد حصولِ رضائے الٰہی ہو تو ان عبادات کا نتیجہ یقیناً دوزخ کی آگ سے حفاظت ثابت ہوگا۔

بہرکیف جس بلند بخت شخص نے رمضان میں محض اللہ کی رضامندی اور حصولِ اجر و حساب کے لیے روزے رکھے، وہ تین چیزوں کا مستحق ٹھہرا۔ (۱) اللہ کی رحمت کا (۲) اس کی مغفرت کا اور (۳) دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنے کا ــــ یہ انسانی کامیابی کی آخری حد تک ہے۔ جس شخص نے نیکی کے میدان میں اس قدر تگ و تاز کی اور رمضان المبارک میں اتنی عبادت کی کہ اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت اسے حاصل ہو گئی اور دوزخ سے حفاظت کی اس کو ضمانت مل گئی، وہ یقیناً دنیا کا عظیم انسان ہے اور اس نے فوز و فلاح کے آخری فرازوں تک رسائی حاصل کر لی۔

نقد و نظر

اسلام اور موسیقی

تالیف : مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم

شرح و تحقیق : مولانا محمد عبد المعز

ناشر : مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

کاغذ، کتابت، طباعت، جلد شاندار۔ صفحات ۴۴۸، قیمت ۴۵ روپے۔

مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ جلیل القدر عالم، نامور مصنف اور بہت بڑے مفتی تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ عربیہ میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ ان کی تصنیفات میں زیرِ نظر کتاب ـــ اسلام اور موسیقی ـــ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ دراصل ان کی ایک مبسوط عربی تصنیف "احکام القرآن" کا جز ہے، جو سورۂ لقمان کی ابتدائی آیات کی تفسیر سے متعلق ہے اور "کشف العناعن وصف الغنا" کے نام سے موسوم ہے۔ ظاہر ہے اس سے وہی حضرات استفادہ کر سکتے تھے جو عربی سے واقف ہوتے اور احکام القرآن کا مطالعہ کرتے، اردو دان طبقہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ مولانا عبد المعز (رکن دار التصنیف کراچی) نے اس کو اردو میں منتقل کیا اور اردو دان حضرات کے لیے اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ کتاب کے ترجمے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک قابلِ قدر یہ خدمت انجام دی کہ متعدد مقامات پر تشریحی حواشی سپردِ قلم کیے، نامکمل حوالوں کی تکمیل کی، احادیث کی تخریج کی اور جرح و تعدیل کے نقطۂ نظر سے ان پر بحث کی۔ پھر کتاب کے موضوع سے متعلق بہت سے نئے دلائل کا اضافہ کیا اور موسیقی کی اباحت کے بارے میں جو دلائل دیے جاتے ہیں یا اس کے عدمِ جواز کے سلسلے میں جو اعتراض کیے جاتے ہیں، تقریباً ان سب کو پیشِ نظر رکھا اور تحقیق نے اس کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے۔

حرمتِ موسیقی پر فاضل مصنف نے سب سے پہلے قرآن سے دلائل دیے ہیں، پھر احادیث

نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیش کیا ہے۔ پھر اقوالِ صحابہ اور سلفِ صالحین سے استدلال کیا ہے، بعدازاں مذاہبِ اربعہ اور صوفیا کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں اس موضوع سے متعلق اور بھی بہت سے مباحث سے تعرض کیا ہے۔ ساڑھے چار سو صفحات میں پھیلے ہوئے یہ مباحث اس مسئلے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔

ترجمہ شستہ اور رواں ہے۔ ہمارے لائقِ احترام قارئین کو اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے۔

قرآنِ مجید کے فنی محاسن

تصنیف : سید قطب شہید

ترجمہ : پروفیسر غلام احمد حریری

ناشر : فیصل ریسرچ سینٹر، جھنگ بازار، فیصل آباد

کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، سرورق، دیدہ زیب۔ صفحات ۳۸۲، قیمت ۳۶ روپے

قرآنِ مجید وہ افشردۂ نور اور منبع ہدایت ہے، جس کی بے شمار تفسیریں لکھی گئیں اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں لکھی گئیں۔ پھر قرآن کے عالموں نے اس کی مختلف سورتوں کی الگ الگ تشریح کی، اس کے اسلوبِ بیان اور اندازِ خطاب کی صراحت کی، اس کے ادبی پہلوؤں کو منقح کیا اور اس کی فصاحت و بلاغت پر کتابیں تصنیف کیں، اس کے قصص و واقعات کو نکھارا، اس کے مضامین وضاحت سے بیان کیے، اس کے علوم کو ہدفِ موضوع ٹھہرایا، اس کے اعجاز و ایجاز پر اظہارِ خیال کیا، اس کے فضائل پر کتابیں لکھیں اور اس کے فنی گوشوں کو اجاگر کیا، یعنی قرآن سے متعلق کوئی گوشہ ایسا نہیں، جس پر علما نے دادِ تحقیق نہ دی ہو۔ اس کے الفاظ، حروف، آیات، حتیٰ کہ اعراب تک کی وضاحت کر دی۔ جس درجہ اعتنا اس کتابِ ہدیٰ سے کیا گیا ہے، اور کسی کتاب سے نہیں کیا گیا۔

زیرِ نظر کتاب "قرآنِ مجید کے فنی محاسن" اسی سلسلۂ زریں کی ایک خوب صورت کڑی ہے۔ دراصل یہ عالمِ عرب کے نامور عالم و مفسر سید قطب شہید کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ انھوں نے "التصویر الفنی فی القرآن" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جو اپنے موضوع کی لائقِ تحسین کتاب ہے۔ پروفیسر غلام احمد حریری نے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔

پروفیسر غلام احمد حریری ہمارے ملک کے ممتاز عالم اور معروف صاحبِ قلم ہیں۔ بہت مخلص،

دیمیے اور مرنجاں مرنج عالم ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور متعدد عربی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں انھیں عبور حاصل ہے اور جس مترجم اور مصنف میں یہ خوبی پائی جائے، وہ اظہارِ مدعا میں کامیاب ہے، اور حریری صاحب اس صفت سے متصف ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع میں نہایت اچھی کتاب ہے، اس میں قرآنِ مجید کے تمام محاسن جامعیت اور عمدگی کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں، اس کا اسلوبِ بیان، فصاحت و بلاغت، لسانی خوبیاں، امم سابقہ کے واقعات، تنذیر و تبشیر، سرکش و متبرک لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ، فرماں برداروں کا تذکرہ اور نہج کلام، پیغمبرانہ طریقِ دعوت، مال و متاعِ دنیا اور عقبیٰ و آخرت کے مناظر، غرض قرآن کا ہر پہلو اس کتاب کی زینت ہے۔

ترجمہ شگفتہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ شستگی، روانی، ادبیت، سب خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں ـــــ آغازِ کتاب میں فاضل مترجم نے اپنے مختصر حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔! ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کن کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے، اس مقام پر پہنچے ہیں جو اللہ نے انھیں عطا فرمایا ہے۔ ہم اپنے کرم فرماؤں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے، یہ کتاب قرآنِ مجید سے متعلق ان کے معلومات میں یقیناً اضافے کا موجب ہوگی۔

مثنوی جمالِ محمدؐ

از : سید شمس الحق بخاری شمس

ناشر : ادارۂ اشاعت تفسیر صدیقی ـــ ۲ یو، بی، ایل اپارٹمنٹس، کلفٹن، کراچی

بہترین کاغذ، شان دار کتابت، عمدہ طباعت، خوب صورت جلد

صفحات ۱۸۲ - قیمت درج نہیں -

حضورؐ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جائے ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ حضرات جنھوں نے آپ کی سیرتِ طیبہ کو موضوعِ نگارش بنایا، آپ کے احوال و سوانح ضبطِ تحریر میں لائے اور اس مقدس ترین ہستی کے واقعات کو قلم بند کرنے کا عزم، نعتیں کہیں اور نظم و نثر میں آپ کے فضائل و مناقب بیان کیے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی بلند تر

موضوع سے متعلق ہے، اور "مثنوی جمالِ محمدؐ" صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مثنوی جن خوب صورت عنوانات پر محیط ہے، ان میں سے چند یہ ہیں: حضورؐ کا سراپا، لباس، صلوٰۃ و تسلیم، میثاق النبیین، خبرِ نبوت، احسان، رحمت، عطا و تقسیم، حکمت، نبوت، معجزہ، قرآن وغیرہ ـــ بلند بخت شاعر نے یہ اور اس قسم کے دیگر عنوانات کے تحت جو باتیں شعر کے قالب میں ڈھالی ہیں، وہ قرآنِ مجید، احادیثِ نبوی، شمائل ترمذی اور اقوالِ صحابہ و تابعین سے ماخوذ ہیں۔ آں حضرتؐ کے "سراپا" کے بارے میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

جمالِ محمدؐ بیاں ہو کہاں
کہاں اس پہ قادر ہماری زباں
احادیث سے لے کے کچھ جھلکیاں
بعجز و ادب پیش کی ہیں یہاں
میانہ تھا قد قدرے مائل بہ طول
کتابی وہ چہرہ کھلا جیسے پھول
خوشی سے دمکتا جو رُخ آپؐ کا
تو کھلتے تھے یوں معنیِ والضحٰے

"مثنوی جمالِ محمدؐ" کی کتابت، طباعت اور کاغذ وغیرہ میں جو اہتمام کیا گیا ہے، وہ موضوعِ کتاب کی شان کے مطابق ہے۔ ہم نکتہ ور شاعر جناب شمس صاحب اور ادارۂ اشاعت تفسیر صدیقی، کراچی کے معزز ارکان کو اس مثنوی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

علمی رسائل کے مضامین

اردو نامہ، لاہور۔ مارچ ۱۹۸۴ (سال نامہ)

اردو کی دستوری اہمیت	الطاف رسول
اردو اصطلاحات سازی ۔ ایک مطالعہ	سید غلام شبیر بخاری
اردو میں عربی، فارسی و دیگر زبانوں کے الفاظ کا امتزاج	محمد نصیب
اردو زبان کی ہیئت اور مزاج	پروفیسر احمد سعید
فن ترجمہ کے اصول و مبادیات	سید محمد غفران الجیلی
سابق ریاست بہاولپور میں مستعمل اردو کی اصطلاحات	محمد رمضان انور
اردو لغات کی تدوین اور اہلِ یورپ	عطش درانی
اردو ہمارے تہذیبی تشخص کا آئینہ	پروفیسر غلام رسول عدیم
اردو اصطلاح سازی کی تاریخ	سید باقر حسین نقوی
بلوچستان میں اردو کے دفتری مسودات	ڈاکٹر انعام الحق کوثر
الفاظ کا صحیح استعمال	ماجد الباقری
اردو اور تقلیدِ زبان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
اردو کا نفاذ اور تکمیلی مراحل	ڈاکٹر خیال امروہوی
اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
اردو زبان اور ہمارا قومی تشخص	پروفیسر محمد مشتاق شوکت
اردو زبان کی ترقی میں اردو ٹائپ کاری کا کردار۔	لیفٹننٹ کمانڈر محمد اظہار
نئے الفاظ	برجموہن دتاتریہ کیفی
اردو کی اہلیت بطور دفتری زبان	محمد عطاء اللہ
اردو کا عادِ اعظم مشترک	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

اصولِ اصطلاح سازی	وحید الدین سلیم پانی پتی
قدیم اردو دستاویزات کی حفاظت	محمد رمضان انور
حیدر آباد دکن میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کا دفتری اردو میں استعمال	سید داؤد الحسن گیلانی
اردو ٹائپ مشین کا کلیدی تختہ	سید عارف حسین شاہ
اردو زبان کی تدریس ــ جوانب و مناہج	ڈاکٹر سلیم فارانی
معلمِ اردو	سید سعدی سنگروری
مسل اور مسل داری	"دفتری اردو" سے اقتباس
قومی زبان کی اہمیت	غلام ربانی عزیز
جدید عربی میں انگریزی زبان کی تقریب	بیگم راشدہ تلمیذ
قومی زبان اور قومی کلچر	ڈاکٹر وزیر آغا
اردو زبان کا مستقبل	یوسف جمال انصاری
اردو کا مقابلہ علاقائی زبانوں سے	حکیم رشید اشرف ندوی
اردو لغات کی ایک سرسری فہرست	سید حسیب پاشا

بینات، کراچی ــــ اپریل ۱۹۸۳

وفاقی شرعی عدالت کے اجتہادات	ظفر علی راجا
کیا امام ابوحنیفہ کے نزدیک عقیقہ مکروہ ہے ؟ (مسلسل)	خالد محمود

بینات، کراچی ــــ مئی ۱۹۸۳

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علمی تبحر	ملک عبدالرشید عراقی
کیا امام ابوحنیفہ کے نزدیک عقیقہ مکروہ ہے ؟ (مسلسل)	خالد محمود

تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ ــ اپریل-جون ۱۹۸۳

اسلام کے عائلی نظام میں عورت کی حیثیت	سید جلال الدین عمری
کیا مہاجرین خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے ؟	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ نام آپ سے پہلے رائج تھا ؟	محمد صلاح الدین عمری

اقبالی نظریۂ اجتہاد — پاکستانی عمل میں۔	پروفیسر مشیر الحق
اسلام میں مظلوم کے حقوق (قسط ۲)	سید جلال الدین عمری
محدود تصور مذہب کا پس منظر	سلطان احمد اصلاحی
مفتی محمد عیوض	ڈاکٹر اقبال حسین
رویتِ ہلال کا مسئلہ (مسلسل)	شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید۔ ترجمہ: مولانا محمد امین اثری

ترجمان الحدیث، لاہور — مئی ۱۹۸۳

قرآنی نظامِ ربوبیت	مولانا عبدالرحمن کیلانی
تذکرۃ المحدثین	عبدالرشید عراقی
متبع کامل رسول — صدیق اکبر رضی اللہ عنہ	سید اعظم رضوی

تعمیرِ انسانیت، لاہور — مئی ۱۹۸۳

خطباتِ سیرت	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
ہمارا قدیم نظامِ تعلیم اور جدید تقاضے (مسلسل)	ڈاکٹر الطاف جاوید
اسلامی قانونِ شہادت	ڈاکٹر منصور الحمید
اقبال اور فقہِ جدید کی تدوین	مولانا سید محمد جعفر پھلواروی (مرحوم)
اختلافاتِ امت سے نجات کا راستہ (مسلسل)	مولانا تمنا عمادی مرحوم
اسلام اور دیگر مذاہبِ فکر	پروفیسر محمد مبارک

سب رس، کراچی — اپریل ۱۹۸۳

قطب شاہی تہذیب	جمیل نقوی
نیاز فتح پوری کے تنقیدی نظریات	کرنل غلام سرور
جگن ناتھ آزاد کی رباعیاں	ڈاکٹر آدم شیخ
مجروح کی شاعری	محمد حفیظ الکبیر قریشی

العلم، کراچی — جنوری — مارچ ۱۹۸۳

زکوٰۃ کا شرعی نظام	مولانا ابوالسلام آزاد

اسلام میں طرزِ حکومت اور طریقِ انتخاب	چیف جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین احمد
سرخاب	پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم خلیل
مدینۃ العلم علی گڑھ ۔ گزشتہ ایک صدی	حکیم نثار احمد علوی (علیگ)
مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں	پروفیسر محمد اسلم
نعمت اللہ قادری مرحوم	پروفیسر رحمت فرخ آبادی
مولوی سمیع اللہ خاں	سید مصطفیٰ علی بریلوی
سعید الزماں عباسی کی شاعری پر ایک نظر	ڈاکٹر محمد ایوب قادری

فاران، کراچی ــــ اپریل ۱۹۸۳

اقبال کے بعض نظریات عہدِ حاضر کی روشنی میں	ڈاکٹر احمد رفاعی
اقبال کے حضور	علامہ عرشی
اسلامی نظام کی بنیادیں	مولانا محمد ابراہیم خلیل فرید پوری
ایمان ویقین	متین ہاشمی

قرآن الہدیٰ، کراچی ــــ مئی ۱۹۸۳

رحمۃ للعالمین، نجران کے عیسائیوں سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ	ــــ
شعبان المعظم کی پندرھویں شب	مولانا ارشاد الحق تھانوی
خواتین اور اسلامی قانون شہادت	ن ۔ س ۔ حیات
اسلام اور سائنس	سید مظفر احمد ضیا

میثاق، لاہور ــــ مئی ۱۹۸۳

معراج النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام	ڈاکٹر اسرار احمد
اصلاح معاشرہ کا قرآنی تصوّر	ڈاکٹر اسرار احمد
حجازِ مقدس میں پندرہ دن	ڈاکٹر عارف رشید

ــــ

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن :
مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف لکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایہ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری
محمد اسحاق بھٹی

جلد اول

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیات غالب :
ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب "حکیم فرزانہ" ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ "حکیم فرزانہ" کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

جولائی ۱۹۸۲

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس لاہور

المعارف لاہور

جلد ۱۶ | جولائی ۱۹۸۳ | رمضان المبارک ۱۴۰۳ | شمارہ ۷

ترتیب

تاثرات

جن لوگوں پر اللہ نے حج فرض کیا ہے، وہ اس کی تیاریوں میں مصروف ہیں، وہ جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں گھروں سے روانہ ہوں گے اور مکہ مکرمہ جاکر سعادتِ حج حاصل کریں گے۔

حج کے لفظی معنی ہیں "قصد اور ارادہ کرنا"۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں ایک خاص طریقے کے ساتھ مکہ مکرمہ اور اس کے بعض مقامات میں حاضر ہونا اور وہاں ایک خاص انداز کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ اس عبادت کے لیے ماہ ذی الحجہ کی بعض تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں۔ ان اوقات اور تاریخوں میں اس کو انجام دینے کا نام مناسکِ حج ادا کرنا ہے۔

اسلام نے عبادت کے لیے جو ارکان مقرر کیے ہیں، ان میں ایک رکن نماز ہے۔ یہ دن اور رات میں پانچ وقت محلے کی مسجد میں جاکر ادا کی جاتی ہے۔ یہ مسلمانوں کا روزانہ پانچ وقت کا ایک اجتماع ہے، جس میں وہ ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ اس سے بڑا اجتماع آٹھ دن کے بعد ہوتا ہے، جسے نمازِ جمعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑا سال میں دو مرتبہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ تینوں اجتماع مقامی نوعیت کے ہیں۔ بلاشبہ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے میں حاضری کا تناسب بڑھتا جاتا ہے، لیکن ان میں مقامیت بہرحال پائی جاتی ہے۔ اس عبادت میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان اکٹھے ہو کر اپنے مسائل پر غور کریں اور ان کو جو مشکلات درپیش ہیں، اجتماعی طور پر ان کو رفع کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔

مسلمانوں کا ایک سب سے بڑا اور عالم گیر اجتماع سال بھر کے بعد مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے۔ اس اجتماع میں دنیا کے کونے کونے سے دور دراز کا سفر کرکے لوگ آتے اور ایک دوسرے سے ملتے اور متعارف ہوتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی اموی اور عباسی دور میں یہ دستور رہا کہ مسلمانوں کے تمام علاقوں اور صوبوں کے والی اور سرکردہ لوگ حج بیت اللہ کے لیے آتے تھے، تاکہ سب ذمہ دارانِ مملکت ایک دوسرے سے ملیں، ان کے مسائل سے آگاہ ہوں اور پھر انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔

یہ مسلمانوں کا ایک عالم گیر اجتماع ہے، اب بھی اسلامی ملکوں کے تمام حاکموں اور سربراہوں کو حج کے موقع پر اکٹھا ہونا چاہیے اور جن مسائل و مشکلات میں وہ دوچار ہیں، ان پر اجتماعی طور سے غور کرکے ان کو حل کرنے کی [illegible] سعی ہونا چاہیے۔

سید سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی صوبہ بہار ضلع پٹنہ (عظیم آباد) موضع دسنہ کے ایک علمی خاندان میں جمعہ کے روز ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد جناب حکیم محمدی صاحب نے ان کا نام ابو نجیب انیس الحسن رکھا اور بچپن میں آپ اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔ لیکن ان کے دادا ہی نے اسے بدل کر سید سلیمان رکھ دیا۔ ان کا خاندان شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آیا۔ پھر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہوتا ہوا مظفر نگر پہنچا اور یہاں سے آخری دور مغلیہ میں صوبہ بہار آیا۔ اس صوبے میں جو آپ کے مورث اعلیٰ آئے وہ چاند تھے[1] سید صاحب ننہال کی طرف سے زیدی اور ددھیال کی طرف سے حسینی سید تھے۔ مرتب قاموس المشاہیر نظامی بدایونی مرحوم فرماتے ہیں کہ آپ نسباً رضوی سادات ہیں[2] مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے اپنے مقالہ "بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات" مطبوعہ معارف ماہ مئی ۱۹۵۵ء میں لکھا ہے کہ سید صاحب کا پدری سلسلہ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے اور مادری امام زید تک۔

دسنہ ایک مردم خیز خطہ اور علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے۔ اس میں بڑے بڑے علماء و فضلا اور صوفیا نے جنم لیا۔ سید صاحب کے گھرانے کو طبابت اور تصوف سے گہرا شغف تھا۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا حکیم سید ابو الحسن صاحب ریاست اسلام پورہ کے طبیب خاص تھے۔ مولانا غلام محمد صاحب اپنے مقالہ "سیرت سلیمانی کا عرفانی پہلو" میں فرماتے ہیں کہ آپ کے والد ماجد ایک عالم اور طبیب حاذق، نقشبندی ابو العلائی سلسلے کے شیخ اور صاحب نسبت بزرگ

---

[1] تذکرہ شعرائے بہار جلد ۲ ص ۱۳۹

[2] قاموس المشاہیر جلد ۱ ص ۳۱۷

تھے۔ مولانا سید سلیمان کے بڑے بھائی حکیم ابو حبیب صاحب عمر میں آپ سے بائیس[۲۲] سال بڑے تھے، اور آپ کو پیار سے "سلو" کہا کرتے تھے[۳] مولانا غلام محمد صاحب نے مقالہ محولہ بالا میں انھیں بارہ سال بڑا لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ (حکیم ابو حبیب صاحب) دسنہ کے مشہور طبیب جید عالم اور حضرت شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی مجددی کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ (سید صاحب) کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب ایک صاحب حال بزرگ اور شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے اور صاحب دل صوفی بھی۔ ان کی ایک کتاب "نور محمدیہ"[۴] معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی ہے، جس میں سہروردیہ اور قادریہ سلسلے کے بزرگوں کے حالات ہیں۔ فن طب پر بھی انھوں نے دو کتابیں "قرابادین محمدی" اور "مخزن الحکمۃ العلیا"[۵] لکھی ہیں۔ غلام محمد صاحب مزید فرماتے ہیں کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کی اخلاقی تعلیم کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا۔ پھر آپ (سید صاحب) کے بڑے بھائی ابو حبیب صاحب نے پوری توجہ فرمائی۔ خود سید صاحب فرماتے تھے کہ لڑکپن میں مَیں نے اپنے بڑے بھائی کے حسبِ ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کیے، اور ان کے حلقۂ توجہ میں بیٹھا کرتا تھا، اور ان کے فیض سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا[۶]

مکتبی تعلیم اپنے گاؤں کے معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی سے پائی۔ اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں میزان ومنشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب صاحب سے پڑھی۔ مزید تعلیم کے لیے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور آگئے۔ وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف (پٹنہ) آئے۔ یہاں ایک سال مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین سجادہ نشین پھلواری شریف سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق پڑھے۔ پھلواری شریف سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ تشریف آگئے۔ یہاں چند ماہ رہے[۷]

---

[۳] حفیظ الحق دسنوی: جنگ کراچی مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۸۳

[۴] سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ معارف سلیمان نمبر اعظم گڑھ، ص ۱ [۵] ایضاً

[۶] غلام محمد صاحب۔ معارف مئی ۱۹۵۵، اعظم گڑھ، ص ۲۸۵

[۷] "معارف" اعظم گڑھ سلیمان نمبر، ص ۲

۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں ندوہ کے صدر مدرس مولانا فاروق چڑیا کوٹی تھے جو ادب اور معقولات کے امام تھے۔ صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ادب و عروض کے بے مثل استاد تھے۔ سید صاحب مولانا فاروق چڑیا کوٹی کی طرزِ تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ موصوف کے طرزِ تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آئے تھے وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے[۸] وہ جو پڑھاتے عملی طور پر پڑھاتے اور اس کی مشق کراتے۔ وہ کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ فن کے مسائل پڑھاتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے طرزِ تعلیم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درس گاہ سے پیدا ہوا[۹]۔ ابتدائی چند سال سید صاحب کو موصوف سے تلمذّ رہا۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نعمانی طویل عرصہ سرسید کی صحبت میں گزار کر ندوہ آ گئے۔ اب سونا کسوٹی چڑھا، سید صاحب کو اپنی علمی زندگی میں اصلی راہ نمائی علامہ شبلی نعمانی ہی سے حاصل ہوئی۔ اس دوران علمِ حدیث کا درس مولانا حفیظ اللہ صاحب سے لیا[۱۰]۔ اور فقہ کا درس مفتی عبداللطیف صاحب سے لیا[۱۱]۔ ۱۹۰۷ء میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔

ندوہ سے فراغت کے بعد سید صاحب کو بڑے کرب سے گزرنا پڑا۔ علامہ شبلی کے والد بزرگ وار کی طرح سید صاحب کے والد محترم بھی موصوف کی مزید علمی و ادبی سرگرمیوں کے خلاف تھے۔ سید صاحب کے والد گرامی، برادرِ بزرگ وار اور خسر محترم سید ابو یوسف صاحب کی خواہش تھی کہ سید صاحب خاندانی پیشہ طب کی تعلیم حاصل کریں۔ لیکن سید صاحب کا ادھر بالکل رجحان نہ تھا۔ علامہ شبلی اپنے شاگردِ خاص کے زبردست موید تھے۔ علامہ شبلی نے ابو یوسف صاحب کو خط لکھا، اور جب پٹنہ تشریف لے گئے تو ان سے کہا کہ سید صاحب کے والد سے کہہ دو کہ سید سلیمان کو ہمیں دے دیں۔ استاد کی بے پایاں شفقت دیکھ کر سید صاحب کے والد محترم خاموش ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو اس کا بہت قلق تھا کہ خاندانی پیشہ طبابت کے ساتھ تصوف کی خاندانی روایت بھی گئی۔

---

۸ مولانا سید سلیمان ندوی۔ نقوش آپ بیتی نمبر — ۹ ایضاً

۱۰ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۵۵۔ ص ۵ — ۱۱ ایضاً۔ ص ۶

جب سید صاحب کے والد صاحب آمادہ ہو گئے تو ۱۹۰۸ء میں سید صاحب ندوہ میں علم الکلام اور جدید عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی ترتیب و تدوین کا شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے اور سیرت کی ترتیب و تدوین میں جس جگر کاوی، جان فشانی اور دماغ سوزی کا علامہ شبلی کی راہ نمائی میں مظاہرہ کیا اس کی سند استاد نے بستر مرگ سے اس طرح دی کہ سیرت کا کام جاری رکھنے کی نہ صرف وصیت کی بلکہ اتنے بڑے ندوۃ العلما سے صرف سید صاحب کو منتخب کیا۔

اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک الندوہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور اخبار الہلال کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوئے۔ جنوری ۱۹۱۴ میں دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ نومبر ۱۹۱۴ میں علامہ شبلی کی وفات پر کالج سے قطع تعلق کر کے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی اور بائیس سال دارالمصنفین کی خدمت کی۔ سید صاحب نے دارالمصنفین کا ترجمان ۱۹۱۶ء میں معارف جاری کیا اور چالیس سال ندوہ کے معتمد اعزازی رہے۔

یکم فروری ۱۹۲۰ء سے اواخر ستمبر ۱۹۲۰ء تک علمائے ہند کے نمائندے کی حیثیت سے یورپ میں وفد خلافت کے رکن کے طور پر مقیم رہے۔ وفد نے انگلینڈ، سوئٹزرلینڈ، فرانس، اٹلی اور تقریباً تمام اہم اتحادی ممالک کے دورے کیے، اتحادی ملکوں کی رائے عامہ کو مسلمانوں کے حق میں ہموار کیا اور اپنے مطالبات حکومت برطانیہ اور دیگر اتحادی وزرا کو پیش کیے۔ سید صاحب برید فرنگ میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ "میرے متعلق ان مطالبات کے مذہبی نقطۂ نظر کی وضاحت تھی۔ میرے ذمے یہ کام تھا کہ مذہبی اور تاریخی حیثیت سے انگریزی اخباروں میں ہمارے خلاف جو مضامین نکلیں ان کا جواب لکھنا اور اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ان کو تحریک سے آگاہ کرنا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا۔ ان کے علاوہ دو اور کام بھی میں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ ایک یہ کہ روزانہ انگریزی اخباروں کو پڑھ کر قابل لحاظ مضامین پر سرخ نشان لگا دینا کہ وفد کے دیگر ارکان بھی پڑھ لیں۔ دوسرے یہ کہ ہفتہ ہفتہ بھر کی رفتار کار اور کاموں کی روئداد لکھ کر ہندوستان بھیجنا خصوصیت کے ساتھ شوکت علی صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب کو وفد کے کاموں سے باخبر رکھنا" یہ دورہ اس درجہ دور رس سیاسی فوائد کا حامل قرار دیا گیا کہ عظیم سیاست دان راجندر پرشاد (جو بعد میں

پہلے صدر جمہوریہ ہند بنے) نیز ڈاکٹر اقبال نے اس کا اعتراف کیا۔

۱۹۲۴ میں شریفِ مکہ اور سلطان ابنِ سعود میں تصادم ہوا۔ مسلمانانِ ہند نے مجلسِ خلافت کی تجویز پیش کی اور سید صاحب کی قیادت میں ایک وفد حجاز بھیجا۔ وہ دو ماہ جدہ رہا۔ سید صاحب نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے رائے عامہ کو ہموار کیا۔ علما اور اکابر سے خط و کتابت اور ملاقاتیں کیں، شیخ ازہر سے گفتگو کی اور انھیں اپناہم نوا بنا لیا۔ یہ وفد کی بڑی کامیابی تھی اور عالمی اخبارات اور جرائد نے اس کامیابی کو شہ سرخیوں سے شائع کیا۔

۱۹۲۶ء میں ابن سعود نے ایک مؤتمر عالم اسلامی مکہ معظمہ میں طلب کی، جس میں ٹرکی، مصر، افغانستان یمن اور دوسرے اسلامی ممالک کے مندوب شریک تھے۔ مسلمانانِ ہند نے سید صاحب کی سربراہی میں ایک وفد بھیجا، جس کے ارکان محمد علی، شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔ عالم اسلام کے نمائندوں نے سید صاحب کو نائب صدر بنایا اور صدر کی عدم موجودگی میں سید صاحب نے صدارت کی۔ یہ اعزاز آج تک کسی ہندی کو نہیں ملا۔

۱۹۳۰ء میں نادر شاہ امیر افغانستان نے سر راس مسعود، ڈاکٹر اقبال اور سید صاحب کو کابل یونیورسٹی میں عربی اور مذہبی تعلیم کے نصاب میں اصلاح اور تراجم و تالیف کا دائرہ وسیع کرنے کا طریق کار منضبط کرنے کے لیے مدعو کیا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک چودہ سال مسلسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے ممبر رہے۔ نومبر ۱۹۴۰ میں علی گڑھ یونیورسٹی نے انھیں ایل ایل ڈی (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی ڈگری دی۔ اپریل ۱۹۴۲ میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب سے بیعت ہوئے اور جلد ہی خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوگئے۔ اس طرح سید صاحب کے والد بزرگ وار کی وہ خواہش بھی پوری ہوگئی جس کی بنا پر وہ علمی سرگرمیوں سے مانع ہو رہے تھے۔ یوں خاندانی سررشتۂ تصوف بھی منقطع نہ ہوا۔ جون ۱۹۴۶ سے ۱۹۴۹ تک ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے ساتھ ہی دارالعلوم احمدیہ بھوپال کے صدر بھی رہے۔

جون ۱۹۵۰ میں وزیر اعظم پاکستان شہید ملت لیاقت علی خان کی دعوت پر ہندوستان سے ترکِ سکونت کرکے پاکستان تشریف لے آئے۔ اس ترکِ سکونت، سفر اور نقل مکانی کا مقصد خالصتاً ہجرت اور اس اسلامی مملکت میں فکری انقلاب، مذہبی اصلاحات میں حکومت کی راہ نمائی

اور دینی اور دنیاوی تعلیم میں انقلاب برپا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں :

تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدر نشینی جس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار تھی پیش ہوئی، اس کو بھی قبول نہ کیا۔ ... ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کے لیے اصرار کیا گیا تو فرمایا کہ پھر دار المصنفین کو کیا کروں گا۔ بعض ذمہ دار اشخاص نے تجویز کیا کہ یہ ادارہ بھی وہاں منتقل کر دیا جائے تو سید صاحب نے جواب دیا پھر استاد مرحوم کا مزار کس کے حوالے کروں گا

(معارف ص ۷۵)

لیکن جب ہجرت اور پاکستان میں اسلامی دستور بنانے میں حکومت کی راہ نمائی کا معاملہ درپیش ہوا تو یہ موانع سد راہ نہ ہو سکے۔ کوئی مالی منفعت بھی حاصل نہیں کی۔ حتیٰ کہ باوجود اصرار کے اپنی متروکہ املاک کا معاوضہ بھی قبول نہ کیا۔

سید صاحب پاکستان تشریف لائے تو انھیں جمعیۃ العلمائے پاکستان کا صدر بنایا گیا۔ ان کا قابلِ قدر کارنامہ اکتیس[۳۱] علما سے جو مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً بریلوی، اہلِ حدیث، دیوبندی، شیعہ وغیرہ کے اجتماع منعقدہ کراچی میں تین دن کی مسلسل بحث و تمحیص اور افہام و تفہیم کے بعد ایک متفقہ دستوری خاکہ تیار کرا لینا، اس پر دستخط لینا اور اسے حکومت کو پیش کرنا تھا۔

سید صاحب کا ایک کارنامہ مختلف اسلامی ممالک کے درمیان ربط و ضبط اور اتحاد کی فضا قائم کرنا تھا۔ چناں چہ ۱۹۵۲ میں انھوں نے اسلامی ممالک کے مشاہیر علما، فضلا، زعما اور مفکرین کا ایک جلسہ کراچی میں منعقد کیا۔ جو تین دن (۱۴، ۱۵ اور ۱۶ فروری) تک جاری رہا۔ اس میں مفتیِ اعظم فلسطین، عراق و ایران اور دیگر اسلامی ملکوں کے علما و فضلا نے شرکت کی۔ پہلے دن جلسے کی صدارت سید صاحب نے اور دوسرے دن مفتیِ اعظم فلسطین نے کی۔

۱۹۵۰ء کے اواخر میں لیاقت علی خان مرحوم نے لا کمیشن کے قیام کا اعلان کیا، اس کے تین ارکان جسٹس عبدالرشید، جسٹس معین اور سید صاحب مقرر ہوئے۔ اس کمیشن کا کام پاکستان کے دستور کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے بارے میں سفارشات پیش کرنا تھا۔

مارچ ۱۹۵۳ میں آخری بار ہندوستان گئے۔ اسی ماہ ڈھاکہ میں ہسٹری کانفرنس کی صدارت کی۔ خطبہ صدارت میں بنگالی مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ہندو فرنگی گٹھ جوڑ نے بنگالی مسلمانوں کو اسلامی ثقافت اور تہذیب سے دور کرنے کی گھناؤنی سازش کے تحت بنگالی کو فارسی رسم الخط سے بدل کر دیوناگری، ہندی اور سنسکرت رسم الخط میں لکھنے کی بنا ڈالی اور مسلمانوں کو اپنی سابقہ روش سے رجوع کر لینا چاہیے لیکن بنگالیوں نے اس پر جس ردِ عمل کا مظاہرہ کیا وہ نہایت افسوس ناک تھا۔ جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب اس ذیل میں فرماتے ہیں "لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ سید صاحب مستقل علی گڑھ آ گئے ہوتے تو بحیثیت مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا"[۱۲] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سید صاحب کو ہجرت سے قبل قیامِ علی گڑھ کی پیش کش ہو چکی تھی۔ ہمارے خیال میں مسئلے کا جائزہ سید صاحب کی افتادِ طبع کو پیشِ نظر رکھ کر نا چاہیے۔ ہم اس سلسلے میں سید ابو عاصم صاحب ایڈووکیٹ کے مقالے "علالت سے وفات تک" سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"یوں تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کر چکے تھے لیکن ان کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ دونوں سفر سیاسی تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء میں وفدِ حجاز میں ہندی مسلمانوں کے نمائندے بن کر تشریف لے گئے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لیے نہ تھے۔ لیکن اللہ کے بندے اور عاشقِ رسولؐ نے ان کے دربار میں صرف انہی کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔"[۱۳]

مذکورہ بالا اقتباس ہی ان کی افتادِ طبع کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہم ایک واقعہ کی جانب اور اشارہ کریں گے۔ اس میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے مقالے "اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے" سے حسبِ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے

"پاکستان ہجرت کی تو آبائی مکانات، شان دار بنگلہ، باغ، جائداد، گھر کا سامان، حضور نظام کا وظیفہ اور بھوپال کی پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سب سے منہ موڑ لیا اور مہاجرت کی صعوبتوں کو برداشت کرتے رہے۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں راقم کو لکھا کہ مہاجرت کی شان بہت بلند ہے۔ مہاجر صحابہ کی قدر اب معلوم ہوئی ہے۔ نہرو لیاقت پیکٹ سے بہار کے مہاجروں کو بہت کچھ سہولتیں دی گئیں، ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے بار بار ان کی خدمت میں گزارش کی گئی۔

۱۲ھ رشید احمد صدیقی، گنج ہائے گراں مایہ۔ معارف مئی ۱۹۵۵ اعظم گڑھ ص ۱۳۲

۱۳ھ سید ابو عاصم ایڈووکیٹ، کراچی، علالت سے وفات تک۔ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۵۵، ص ۳۶۳

لیکن غایت استغنا میں ۱۸ اگست کو تحریر فرمایا: " ہندوستان چھوٹنے پر جائداد اور مکان کی محبت دل سے نکل گئی اور بقول شاعر :

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے برسوں میں طے ہوگی اس مہاجرت سے دم کے دم میں طے ہوگئی"[14]

۱۹۲۰ء میں یورپ کے سفر کے دوران قولنج اور درد گردہ میں مبتلا ہوئے۔ انگریز ڈاکٹروں کی تجویز تھی کہ آپریشن کیا جائے۔ جیسا برید فرنگ میں مطبوعہ کئی خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ فرانسیسی ڈاکٹروں نے فرنگی ڈاکٹروں کو قصائی قرار دیا اور آپریشن کی مخالفت کی۔ سفرِ حجاز میں مختلف امراض و عوارض میں مبتلا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ذات الجنب کا حملہ ہوا ، افاقہ ہوا۔ لیکن کثرت کار، مسلسل بے آرامی، پیہم سفر اور ہر سفر کے بعد بیمار ہونے کا معمول، غرضیکہ ان باتوں نے کمزور کر دیا تھا، اور چند دن صاحب فراش رہ کر بحساب شمسی ۶۹ سال اور بحساب قمری ۷۱ سال کی عمر میں ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ کراچی میں انتقال کیا، اور اسلامیہ کالج کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

پہلی شادی ۱۹۰۴ء میں اپنے چچا ابو یوسف صاحب کی لڑکی سے ہوئی، ان سے دو بچے ہوئے۔ (۱) سیدہ مرحومہ (۲) ابوسہیل۔ دوسری شادی ۱۹۲۰ء میں ہوئی، اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تیسری شادی ۱۹۳۲ء میں ہوئی، اس سے چار لڑکیاں اور ایک لڑکا سلمان ہوئے۔

اب ان کی تصنیفات پر نظر ڈالیے جس سے ان کے فضل و کمال کا پتا چلتا ہے۔

(۱) دروس الادب دو جلدیں ۱۹۰۸ء	(۴) رسالہ اہل سنت والجماعت ۱۹۱۷ء
(۲) لغات جدیدہ ۱۹۱۰ء	(۵) حیاتِ مالک ۱۹۱۷ء
(۳) ارض القرآن جلد اول ۱۹۱۵ء	(۶) سیرالنبیؐ جلد اول[15] ۱۹۱۸ء

---

[14] سید صباح الدین عبدالرحمٰن : اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے۔ معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۵۵ - ص ۶۷

[15] سیرت النبی کی پہلی جلد تو کمال و تمام علامہ شبلی نعمانی نے لکھی اور شبلی کے انتقال کے وقت طباعت کے لیے تیار تھی۔ دوسری جلد بھی گو شبلی ہی نے لکھی ہے۔ لیکن کے آخری مراحل میں تھی۔ چنانچہ اس کے مرتب نے پر (از شبلی نعمانی تکملہ و اضافہ علامہ ندوی لکھا ہے۔ تیسری جلد کا کچھ حصہ مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے۔ اور آخری یعنی جلد ہفتم کے چند ابواب ہی علامہ سلیمان ندوی لکھ چکے تھے کہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

(۷) ارض القرآن جلد دوم ۱۹۱۸ء
(۸) سیرۃ النبیؐ جلد دوم ۱۹۲۰ء
(۹) سیرۃ عائشہؓ ۱۹۲۰ء
(۱۰) خلافتِ عثمانیہ اور دنیائے اسلام ۱۹۲۱ء
(۱۱) خلافت اور ہندوستان ۱۹۲۱ء
(۱۲) سیرۃ النبی جلد سوم ۱۹۲۴ء
(۱۳) ؍؍ ؍؍ جلد چہارم ۱۹۲۸ء
(۱۴) عرب و ہند کے تعلقات ۱۹۲۹ء
(۱۵) خیام ۱۹۳۰ء
(۱۶) رسولِ وحدت ۱۹۳۲ء
(۱۷) سیرۃ النبی جلد پنجم ۱۹۳۵ء
(۱۸) عربوں کی جہازرانی ۱۹۳۵ء
(۱۹) خطباتِ مدراس ۱۹۳۹ء
(۲۰) سیرہ النبی جلد ششم ۱۹۳۹ء
(۲۱) نقوشِ سلیمانی ۱۹۳۹ء
(۲۲) رحمتِ عالم ۱۹۴۰ء
(۲۳) حیاتِ شبلی ۱۹۴۱ء
(۲۴) خواتین اسلام کی بہادری ۱۹۴۵ء
(۲۵) سیر افغانستان ۱۹۴۹ء
(۲۶) انتخاباتِ شبلی ۱۹۵۰ء
(۲۷) بریدِ فرنگ ۱۹۵۳ء
(۲۸) ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں ۱۹۵۴ء
(۲۹) یادِ رفتگاں ۱۹۵۵ء
(۳۰) مقالاتِ سلیمان جلد اوّل ۱۹۶۶ء
(۳۱) ؍؍ ؍؍ جلد دوم ۱۹۶۸ء
(۳۲) سیرۃ النبی جلد ہفتم ۱۹۸۲ء
(۳۳) شبلی کے مضامین اور مکتوبات گیارہ جلد
(۳۴) ارمغانِ سلیمان - مرتبہ غلام محمد صاحب

مطالعۂ حدیث

مولانا محمد حنیف ندوی

استشراق زدہ حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث وسنت کی تدوین و تسوید تیسری صدی ہجری میں محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرض ظہور میں آئی ۔ مولانا ندوی نے اس کتاب میں اس اعتراض کا محققانہ جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ حدیث نبوی کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ایک خاص قسم کا تسلسل لیے ہوئے ہے ، جس میں شک وارتیاب کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی ۔ انھوں نے حدیث کے علوم و معارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ایک مکمل سائنس ہے ، جس میں رجال و رواۃ کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور ان اصولوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جس سے محدثین نے متن کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے ۔ اسلام میں حدیث وسنت کا جو درجہ ہے ، اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے ۔

صفحات ۱۲ + ۲۱۵ قیمت ۲۵ روپے

مسئلۂ اجتہاد

مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ۔ یہ جہاں یہ بتاتا ہے کہ توحید کیا ہے ، دلوں میں ایمان کے داعیے کیسے پیدا ہوتے ہیں ، تقویٰ کیسے ابھرتا ہے اور کردار اور سیرت کی تشکیل کیوں کر ممکن ہے ، وہاں اس میں اس بات کا پورا پورا اہتمام بھی پایا جاتا ہے کہ بدلتے ہوئے اجتماعی حالات میں احکام و مسائل کی کیا شکل ہو ۔ یعنی وہ کون اصول اور پیمانے ہیں جن پر قیاس اور اجتہاد کا قصر رفیع تعمیر ہوتا ہے ۔ یہ "مسئلۂ اجتہاد" میں ان فقہی بنیادوں اور پیمانوں کی تشریح کی گئی ہے جن کی روشنی میں فقہ جدید کی تدوین کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے ۔

صفحات ۱۹۲ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتا ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ لاہور

پروفیسر محمد اسلم

حضرت بابا فریدؒ کا آبائی وطن

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے آبائی وطن کے بارے میں تذکرہ نویسوں اور مؤرخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مؤرخوں نے (باختلافِ املاء) "کھوتوال" کو ان کی جائے ولادت بتایا ہے اور بعض نے "چاولی مشائخ" (ضلع وہاڑی) کو ان کا مولد ہونے کا شرف بخشا ہے۔[1] تاہم تذکرہ نویسوں اور مؤرخوں کی اکثریت نے "کھوتوال" کو باباصاحب کی جائے ولادت تسلیم کیا ہے، اور یہ صحیح ہے۔

گاؤں کا صحیح نام

اب تک جن تذکرہ نویسوں نے باباصاحب کے احوال و آثار پر قلم اٹھایا ہے، ان میں سے ہمارے فاضل دوست محمد آصف خان کے سوا کسی نے بھی اس موضع کا نام صحیح نہیں لکھا۔[2] مفتی غلام سرور لاہوری صاحبِ خزینۃ الاصفیا نے اس موضع کا نام کھوتوال تحریر کیا ہے، اور محمد غوثی شطاری منڈوی صاحبِ گلزارِ ابرار نے اسے کوتوال پڑھا ہے۔ حیاتِ طیبہ حضرت محبوبِ الٰہی کے فاضل مصنف علامہ اخلاق حسین دہلوی اسے کوٹوال لکھتے ہیں اور صاحبِ سیر العارفین مولانا جمالی اسے کھولوال اور کھولوال سمجھتے ہیں۔ مولوی محمد دین نے باغِ اولیائے ہند میں اس کی املا کھلی وال کی ہے اور علی اصغر چشتی نے جواہرِ فریدی میں اسے کھوٹیوال، کوتیوال، کھتی وال اور کھوٹیوال لکھا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اسی اشتباہ کی بنا پر اخبار الاخیار میں اس کا ذکر نہیں کیا۔

---

[1] چاولی مشائخ بورے والا سے ۱۱ میل کے فاصلے پر ہے اور بورے والا سے پاکپتن کا فاصلہ ۴۵ میل ہے۔

[2] محمد آصف خان نے بابا فریدؒ کے پنجابی کلام پر پنجابی زبان میں "آکھیا بابا فرید" کے عنوان سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔ اس مضمون کی تصنیف کے دوران میں راقم الحروف نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

مؤرخ شہیر فرشتہ اسے کوٹھی پڑھتا اور لکھتا رہا اور تذکرہ خاصانِ خدا کی مصنفہ مصطفائی بیگم اسے کھوتیوال سمجھتی رہیں۔ استادِ گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی نے فارسی تذکروں پر اعتماد کرتے ہوئے اسے کہتوال لکھا ہے۔ وحید احمد مسعود سوانح مسعود الدین فریدؒ میں یونہی الکل پچو سے اسے کھوٹوال۔ کھوٹو وال اور کوٹھوال لکھ گئے ہیں۔ تذکرہ بابا فرید میں طالب ہاشمی نے بابا صاحب کی جائے ولادت کھوتوال لکھی ہے اور عبد اللہ خویشگی نے معارج الولایت میں اس گاؤں کا نام کہتیوالہ تحریر کیا۔ مرآۃ الاسرار کے مصنف عبد الرحمٰن اُسے کھتوالہ سمجھتے رہے اور العدیہ چشتی صاحبِ سیر الاقطاب اسے کہنی وال لکھتے رہے۔ "پنجابی ساہت دا تاں تمک اتہاس" کے مصنف ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل نے اس موضع کا نام کھوتوال بتایا ہے اور ایک اور سکھ فاضل پروفیسر پریتم سنگھ نے اسے کھونی وال سمجھا ہے۔ "بابا شیخ فرید الدین گنج شکر، حالاتِ زندگی اور تعلیمات" کے مصنف گوربخش سنگھ طالب نے اسے کھوتوال اور کہتوال پڑھا اور لکھا ہے۔ "پنجابی شاعراں دا تذکرہ" کے مصنف مولا بخش کشتہ نے بھی اسے کھوتوال لکھا ہے۔ مولانا نور احمد فریدی، جو ملتان اور اس کے نواح کی تاریخ پر سند مانے جاتے ہیں اور پیر سید حسام الدین راشدی مرحوم اور راقم الحروف کی معیت میں اس موضع کی سیر بھی کر چکے ہیں؛ اس کا نام کھن والا تحریر کر گئے ہیں۔ شیخ محمد اکرام صاحبِ آبِ کوثر نے اسے کھوتوال بتایا ہے، اور مفتاح العارفین کے مصنف عبد الفتاح نے اس کی املا کھوں وال کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی جیسے فاضل نے اسے کھتوال لکھا ہے۔ پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کے مقالات کا مجموعہ نگارشات کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ انھوں نے اس موضع کا نام کسووال اور کسوتروال لکھ دیا ہے۔[۵۳] تاریخ الاولیا کے مصنف حیدر علی سہسوانی اسے کہوتوال پڑھتے رہے اور مرآۃ السالکین کے مصنف مولوی امام الدین اسے کہتی وال لکھتے رہے۔ شہزادہ دارا شکوہ اسے کہووال لکھتا ہے اور

---

۵۳ لاہور ملتان ریلوے لائن پر ساہی وال (سابق منٹگمری) سے ساتواں اور ہڑپہ سے پانچواں اسٹیشن کسووال ہے۔ اس نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں بھی برلب سڑک موجود ہے۔ ملتان سے کسووال کا فاصلہ ۱۱۱ کیلومیٹر ہے۔ اس لیے یہ گاؤں "من مضافات ملتان" نہیں ہو سکتا، جب کہ "کہوتوال" کا ملتان سے فاصلہ صرف [illegible] کیلومیٹر

سیر الاولیا کے مصنف میر خورد کرمانی اسے کھتوال یا کھتوالہ لکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر مسز شمیم محمود زیدی نے خلاصۃ العارفین پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے ۔ موصوفہ نے بھی اسے کھوتوال ہی سمجھا ہے ۔ مسلم نظامی صاحب انوار الفرید اسے کھتوال سمجھتے ہیں ۔ ڈاکٹر مریندر سنگھ کوہلی نے " پنجابی ساہت دا اتہاس " میں اسے کوٹھی والا لکھا ہے ، جو اقرب الی الصحت ہے ۔

جناب آصف خان نے اس گاؤں کا صحیح نام کوٹھے وال تحریر کیا ہے ۔ ان کے علاوہ کسی بھی تذکرہ نویس نے اس گاؤں کے نام کی تحقیق نہیں کی ۔ ان کا یہ گلہ بجا ہے کہ یہ موضع ملتان کے مضافات میں تھا ، ہونولولو یا ٹمبکٹو کے پاس تو نہیں تھا ۔ اس کے باوجود کسی نے وہاں جانے اور صحیح نام معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ۔

دراصل یہ سارا اشتباہ کوٹھے وال یا کوٹھے والا کو فارسی کے قالب میں ڈھالنے سے پیدا ہوا ہے ۔ فارسی میں چوں کہ ٹھ نہیں ہوتی ، اس لیے بعض تذکرہ نویسوں نے اسے تھ میں تبدیل کر دیا اور بعض نے تھ کو بھی ہندی لفظ سمجھ کر ت میں بدل دیا ۔ اس لیے کوٹھے وال ، کوتھیوال یا کوتوال لکھا جانے لگا ۔

راقم الحروف کو دو بار وہاں جانے کی سعادت ملی ہے ۔ اب اس گاؤں کا نام کوٹھے والا لکھا اور بولا جاتا ہے ۔ بس اسٹاپ کے قریب محکمۂ زراعت کا ایک بورڈ نصب ہے ، اس پر بھی موضع کا نام کوٹھے والا درج ہے ۔ راشن ڈپو پر بھی اسی نام کا بورڈ آویزاں ہے ۔

محلِ وقوع

ملتان سے جو ریلوے لائن خانیوال ہو کر لاہور جاتی ہے ، اس لائن پر ملتان چھاؤنی کے بعد ملتان شہر کا اسٹیشن آتا ہے ۔ اس کے بعد ممتاز آباد اور پھر پیران غائب نام کے دو ریلوے اسٹیشن آتے ہیں ۔ ملتان کا صنعتی علاقہ پیران غائب تک پھیل چکا ہے ۔ پیران غائب کے بعد ٹاٹے پور نام کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن آتا ہے جہاں صرف پسنجر گاڑیاں رکتی ہیں ۔ ٹاٹے پور سے کوٹھے وال کا فاصلہ صرف چار میل ہے ۔ پہلے ایک کچی سڑک ٹاٹے پور کو کوٹھے والا سے ملاتی تھی اور اس پر تانگے چلتے تھے ۔ اب اس سڑک کو پختہ کر رہے ہیں ۔

ملتان سے سڑک کے راستے کوٹھے والا کا فاصلہ دس میل ہے اور وہاں تک پختہ سڑک

جاتی ہے۔ ملتان سے بورلہ جانے والی بس کوٹھے والا سے گزرتی ہے اور وہاں جانے کے لیے ہر نصف گھنٹے بعد بس ملتی ہے۔ ملتان سے کوٹھے والا تک تمام علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ اس علاقے میں اعلیٰ قسم کی کپاس، گندم، مکئی اور گنے کی کاشت ہوتی ہے، بدیں وجہ کسان مرفہ الحال ہیں۔

گاؤں کی موجودہ کیفیت

کوٹھے والا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں ۱۱۵ گھر ہیں اور وہاں اندازاً ساڑھے پانچ صد نفوس بستے ہیں۔ گاؤں میں میواتی مہاجروں کی اکثریت ہے۔ یہ لوگ ۱۹۴۷ء میں میوات سے ترکِ وطن کرکے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ گاؤں کی بیشتر زرعی اراضی بھی انہی کی ملک ہے۔

بس اسٹاپ کے قریب چند دکانیں اور چائے کے ہوٹل ہیں۔ اسٹاپ سے پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر ایک پختہ مسجد ہے جس کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک بورڈ آویزاں ہے اور اس پر یہ عبارت درج ہے۔

مدرسہ عربیہ دارالعلوم جامعہ سلیمانیہ
دربار حضرت خواجہ الشیخ جمال الدین سلیمان
کوٹھے وال ملتان

صحن مسجد کے شمال مشرقی کونے میں بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے والد ماجد خواجہ جمال الدین سلیمانؒ کا مزار ہے۔ جن لوگوں نے محض الکل پچو سے چاولی مشائخ کو بابا صاحب کا آبائی وطن اور جائے ولادت لکھ دیا ہے، کوٹھے والا میں اس مزار کی موجودگی سے ان کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔

خواجہ جمال الدین سلیمانؒ کی قبر کے اوپر ایک پختہ چھتری بنی ہوئی ہے جسے چھ ستون تھامے ہوئے ہیں۔ لوحِ مزار پر آیت الکرسی کے علاوہ یہ عبارت درج ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
شجرۂ نسب والد صاحب
حضرت بابا فرید الدین گنج شکر بن خواجہ جمال الدین سلیمان بن حضرت خواجہ شعیب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت جمال الدین سلیمان کی وفات ۵۱۷ھ میں بروز جمعۃ المبارک گیارہ شوال المکرم (ہوئی)۔

ابیات

پیر کامل صورت ظل خدا — یعنی دیدے پیر دیدے[۴۷] کبریا
اولیا را نیست مشکل این چنیں — میروند اندرتے[۴۸] بملک چنین
ہر کہ بیند روئے نیکاں صبح و شام — آتش دوزخ شود بروے حرام
مردہ را زندہ کند او را رواست — نائب است دست او[۴۹] خدا است
ہر کہ خواہی یابی این نشان — سربنہ خاک پائے کاملان
ہر کہ خواہد ہمنشینی با خدا — گو نشین اندر حضور اولیا
گر شدی دور از حضور اولیا — درحقیقت گشتہ دور از خدا
لوح محفوظ است پیشانی یار — راز تو نیئش نیا زد[۵۰] آشکار
اگر گیتی سراسر باد گیرد — چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

حافظ غلام نبی نام کے ایک صاحب اس مزار کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ انھوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ اس نے اپنے بڑے بزرگوں سے سنا ہے کہ پہلے یہاں بہت سی قبریں تھیں لیکن گزشتہ صدی میں ایک قریبی گاؤں کے سکھ زمیندار رام سنگھ نے ان کا صفایا کر دیا۔

حافظ غلام نبی نے راقم الحروف کو باباصاحب کے آبائی مکان کی جگہ دکھائی۔ اب وہ مکان ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور اس پر اللہ ڈیوایا نامی ایک کمہار قابض ہے۔

ملتان سے کوٹھے والا تک جانے میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا ہے۔ اگر ایک گھنٹہ وہاں صرف کریں اور اتنا ہی وقت واپسی کے لیے مختص کر لیں تو تین گھنٹوں میں ملتان سے کوٹھے والا جا کر واپس آسکتے ہیں۔

۴۷ھ یہ ابیات کسی کم علم کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے دیدِ کو دیدے بنادیا ہے۔

۴۸ھ کذا — ۴۹ھ کذا — ۵۰ھ کذا

برصغیر پاک وہند میں علم فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالم گیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علم فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دور حکومت میں کتب فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریق حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں اور جن کو مسائل فقہ کے اصل مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۴۰۸ قیمت ۲۰ روپے

اسلام — دین آسان

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

جو لوگ اسلام کے احکام کو بہت دشوار اور ناممکن العمل سمجھتے ہیں، انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کو ہماری تنگ نظری اور غلط فہمیوں نے دشوار بنا دیا ہے ورنہ حضور اکرمؐ کے فرمان کے مطابق دین آسان ہے۔ اس کتاب میں ایسے متعدد مسائل پر تفصیل سے عقلی روشنی ڈالی گئی ہے جو بہت الجھے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔

صفحات ۳۶۸ قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

پروفیسر اکرام علی ملک

انجمنِ اسلامیہ لاہور (۱۸۶۹-۱۹۰۲)

انجمن اسلامیہ لاہور، لاہور میں مسلمانوں کی سب سے پہلی جماعت تھی[1] جو اکتوبر ۱۸۶۹ میں مولوی برکت علی خاں کی تحریک سے قائم کی گئی[2] اس کی اصل ضرورت بادشاہی مسجد (لاہور) کی مرمت اور دیکھ بھال تھی، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہ صوبے کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ الحاقِ پنجاب (۱۸۴۹ء) کے وقت بادشاہی مسجد نہایت شکستہ حال اور فوجی حکام کی تحویل میں تھی۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں یہاں چھاؤنی اور بارود خانہ قائم تھا[3]۔ چند انگریز حکام نے اس کی مرمت کے لیے کوششیں کیں لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر کوئی عملی کام نہ ہو سکا۔ ۱۱ جون ۱۸۵۶ کو اسے مسلم معززین کی کمیٹی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اگرچہ اس سے مسجد عبادت کے لیے واگذار ہو گئی لیکن مرمت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اس مقصد کے لیے بہت بڑے سرمائے کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں میں بھی اس کام کو سرانجام دینے کے لیے کوئی تنظیم نہ تھی۔ جون ۱۸۶۸ میں لاہور کے تحصیل دار مولوی برکت علی خان نے اس مقصد کے لیے شہر میں اجناس وغیرہ کی درآمد پر ایک معمولی ٹیکس عائد کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد لوگوں کی شکایت پر اُسے منسوخ کر دیا گیا۔ برکت علی خان نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انجمنِ اسلامیہ پنجاب کی داغ بیل ڈالی۔ اس میں شہر کے اکثر مسلم معززین شامل تھے[4]۔ میاں شاہ دین کے بیان

---

[1] Mian Shah Din. Mohammadan Societies in The Punjab, The Indian Magazine (1888), p 188.

[2] رفیقِ ہند (لاہور) ۲ دسمبر ۱۸۸۴ء

[3] اکرام علی ملک، مسلمانوں سے رنجیت سنگھ کا سلوک، حصہ سوم Journal, Research Society of Pakistan, Lahore, Vol XI No 2, 1974

[4] Dr. M. Abdullah Chaghtai, The Badshahi Masjid, History and Architecture, Lahore, 1972, pp. 38-44

کے مطابق انجمن کا ایک اہم مقصد قومی ترقی و بہبود کے لیے مسلم رؤسا و اہلِ ثروت کی بے حسی و عدم توجہ کو ختم کرنا بھی تھا[۵۵]

انجمن نے مسجد کی مرمت اور آبادکاری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس میں اس کے صدر نواب نوازش علی خاں قزلباش، سیکرٹری مولوی برکت علی خان، نواب عبدالمجید خان اور دیگر مسلم معززین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسلم اہالیانِ شہر کو مسجد آباد کرنے اور بالخصوص مذہبی مواقع پر جمع ہونے کی درخواست کی گئی۔ مسجد کو قابلِ عبادت بنانے اور اس کی صفائی اور ضروری مرمت کے لیے چندے کی اپیل کی گئی، جس سے فوری نوعیت کی مرمت شروع کر دی گئی۔ ۱۸۷۲ء میں انجمن کے ایک وفد نے ڈپٹی کمشنر لاہور کیپٹن نسبت سے ملاقات کر کے حکومت سے بھی مالی امداد کی درخواست کی۔ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کی پُرزور حمایت کے نتیجے میں تین ہزار روپے کی رقم منظور ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی بحالیِ مسجد فنڈ قائم کر دیا گیا۔ لاہور میونسپل کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ نے بھی خطیر رقم کا وعدہ کیا۔ صوبائی حکومت نے مزید پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا، بشرطیکہ مسلمان اپنے وسائل سے دُگنی رقم جمع کریں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں بیس ہزار روپے کی رقم جمع ہو گئی۔ اس میں چند غیر مسلم افراد بالخصوص راجہ ہربنس سنگھ، پنڈت موتی لعل، پنڈت بدری ناتھ، منشی ہرسکھ رائے اور لالہ نہال چند نے بھی حصہ لیا۔ اس طرح تقریباً اکتیس ہزار روپے کی رقم جمع ہو گئی، جس سے مسجد کی صحیح مرمت کا کام شروع کر دیا گیا[۵۶]

انجمن نے مسجد میں مسلم بچوں کی تعلیم کے لیے ایک مکتب بھی قائم کیا۔ ۱۸۷۶ء میں چھ ہزار مسلمانوں نے اس میں عید کی نماز ادا کی۔ دیگر مذہبی مواقع مثلاً معراج النبی و ۱۲ ربیع الاوّل پر بھی اجتماعات کا اہتمام کیا گیا تاکہ مسجد کی سابقہ عظمت کو بحال اور اسے مسلمانوں کا مرکز بنایا جا سکے[۵۷]

انجمن نے شہر میں دیگر مساجد کی واگذاری کے لیے بھی کوششیں کیں۔ چنانچہ ٹکسالی گیٹ کی مسجد

---

۵۵ Mian Shah Din, op. cit. p. 188.

۵۶ Dr. M. Abdullah Chaghtai, op. cit. p44

۵۷ Ibid pp 44-45

کو واگزار کرا لیا گیا۔ گمٹی بازار میں ایک نئی مسجد تعمیر کی گئی[۸] انجمن نے مسلمانوں میں باہمی اتحاد کے لیے بھی بھرپور کوششیں کیں۔ ۱۸۷۳ء میں اہل حدیث کی طرف سے مسجد چینیاں والی میں قبروں کو مسمار کرنے سے شہر میں تشویش ناک صورت حال پیدا ہو گئی۔ انجمن کے عہدے داروں خاص کر مولوی برکت علی خان اور دیگر اکابرِ شہر نے اس مخالفت کو ختم کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا[۹] انجمن نے روس ترک جنگ (۱۸۷۷ - ۱۸۷۸ء) کے دوران ترک مجروحین کی امداد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے بھی مہم چلائی۔ جنوری ۱۸۷۷ میں اس مقصد کے لیے مسجد وزیر خان (لاہور) میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا جس میں مولوی برکت علی خان نے تقریر کرتے ہوئے سلطنتِ عثمانیہ کی اہمیت اور اسلامی اخوت کی ضرورت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ مسلمانانِ پنجاب نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صرف امرت سر میں تین دنوں میں دو ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ مسلم خواتین نے بھی پہلی مرتبہ اس تحریک میں زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کیا[۱۰] سال کے آخر تک انجمن کی طرف سے بمبئی میں متعین ترک کونسل کو پانچ ہزار روپے کی رقم بھیج دی گئی[۱۱]

مارچ ۱۸۸۴ میں حکومتِ پنجاب نے انجمن کو مسلمانوں کی مقتدر اور نمائندہ جماعت قرار دیتے ہوئے شاہی قلعہ لاہور میں موجود اسلامی تبرکات کو اس کے سپرد کر دیا۔ یہ تجویز سب سے پہلے میو سکول آف آرٹس کے پرنسپل نے پیش کی۔ کمشنر نے بھی اس کی بھرپور حمایت کی۔ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۸۸۴ میں ان تبرکات کو انجمن کے زیرِ اہتمام ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں بادشاہی مسجد لے جایا گیا۔ مسلمانوں نے اس موقعے پر بے پناہ عقیدت و جوش کا مظاہرہ کیا۔ انجمن نے حکومت کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے اس کا انتہائی شکریہ ادا کیا۔ اس کے مطابق اس سے حکومت اور مسلمانوں کے

---

۸ رفیقِ ہند ۲ دسمبر ۱۸۸۴

۹ Syad Mohammad Latif - Lahore its History Architecture Remains and Antiquities, Lahore, 1892, p 347. — رفیقِ ہند ۲ دسمبر ۱۸۸۴

۱۰ اخبارِ انجمن پنجاب (لاہور) یکم و ۸ جنوری ۱۸۷۷

۱۱ اخبارِ انجمن پنجاب ۷ دسمبر ۱۸۷۷

درمیان تعلقات پر نہایت اچھا اثر پڑے گا۔[۱۲] انجمن ویسے بھی حکومت کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنے اور وفاداری کے جذبات کو مضبوط کرنے کی خواہاں تھی۔ اس کے اکثر ممبر رئیس اور اعزاز یافتہ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک بڑی تعداد سرکاری ملازمین پر بھی مشتمل تھی۔[۱۳] اسی وجہ سے انجمن اور سرسید احمد خان کے نظریات میں مطابقت اور ان کے درمیان بہترین تعلقات قائم تھے۔ انجمن، بالخصوص مولوی برکت علی خان نے صوبے میں سرسید احمد خان کے نظریات کی ترویج اور علی گڑھ تحریک کو تقویت دینے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے سرسید احمد خان کو ۱۸۷۳ء اور ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے دورے کی دعوت دی اور اسے کامیاب بنانے کے لیے سخت محنت کی۔[۱۴] ۱۸۸۴ میں سرسید کی آمد سے قبل انھوں نے امرت سر، گورداس پور، لدھیانہ اور مالیر کوٹلہ کا دورہ کر کے مقامی معززین کو سرسید کا شایان شان استقبال کرنے کی درخواست کی۔[۱۵] انجمن کے دیگر عہدے داروں نے بھی اسے کامیاب بنانے کے لیے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ جائنٹ سیکریٹری مولوی محرم علی چشتی نے اپنے اخبار "رفیق ہند" میں سرسید کا بڑھ چڑھ کر استقبال کرنے اور علی گڑھ کالج کے لیے فراخ دلانہ امداد دینے کی اپیل کی۔[۱۶] لاہور میں آمد پر انھوں نے سرسید احمد خان کی مدح میں اخبار کا ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا۔[۱۷] یکم فروری کو انجمن کی طرف سے اسلام پر سرسید کے خصوصی لیکچر کا اہتمام[۱۸] اور ۳ فروری کو ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔[۱۹] تقریب کے اختتام پر برکت علی خان نے انجمن اسلامیہ اور احباب لاہور کی طرف سے دو ہزار چھ ہزار روپے کی ایک

---

۱۲ رفیق ہند، فروری و مارچ ۱۸۸۴ — Punjab Home-General proceeding B 355-356 January 1884 + Punjab Home-General proceeding B15 May 1884.

۱۳ رہبر ہند (لاہور) ۱۰، ۱۲ نومبر و ۱۵ دسمبر ۱۸۸۶

۱۴ عصر جدید ستمبر ۱۹۰۵، ص ۳۰۸

۱۵ رفیق ہند ۱۹ جنوری ۱۸۸۴

۱۶ رفیق ہند ۵ و ۱۹ جنوری ۱۸۸۴

۱۷ مولوی سید اقبال علی — سید احمد خان کا سفرنامۂ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳، ص ۱۸۶ - ۱۸۸

۱۸ ایضاً، ص ۲۵۹ - ۲۹۶ ۱۹ ایضاً، ص ۲۳۸ - ۲۴۴

تعلیل پیش کی۔[۱۲۰] سرسید کا یہ دورہ انتہائی کامیاب رہا۔ ایک خطیر رقم کے علاوہ اس سے صوبے کے مسلمانوں میں بیداری اور تحریک کی ایک نئی لہر دوڑ گئی - اس سے سرسید احمد خاں کے نظریات کے بارے میں پائے جانے والے شکوک کو دور کرنے میں مدد اور مستقبل کے لیے علی گڑھ تحریک میں مسلمانانِ پنجاب کی مضبوط وابستگی کی راہ ہموار ہوگئی - اس کی کامیابی کافی حد تک انجمن کے عہدے داروں کی ان تھک اور پرخلوص کوششوں کا نتیجہ تھی۔

انجمن نے اس کے بعد بھی سرسید اور ان کی تحریک سے اپنا گہرا تعلق برقرار رکھا۔ ۱۸۹۰ء میں انجمن نے دیگر مسلم جماعتوں کی طرح بریڈلا بل کے خلاف برطانوی پارلیمنٹ کو ایک یادداشت بھیجی۔ اس میں بل کی منظوری کے نتیجے میں اصولِ انتخاب کے ذریعے کونسلوں کی توسیع کے بارے میں مسلمانوں کے موقف اور خدشات کی ترجمانی کی گئی - اس کے مطابق ہندوستان میں مختلف قومیں آباد تھیں اور ہندوؤں کے رویے کے پیشِ نظر مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے - اصولِ انتخاب کے نفاذ سے ان کا اور دیگر اقلیتوں کا ہندو اکثریت کی غلامی میں چلے جانے کا خطرہ تھا۔ اس لیے انجمن نے نامزدگی کے نظام کو برقرار رکھنے کی سفارش کی۔[۱۲۱] انجمن نے سرسید کے سیاسی نظریات کی بھی بھرپور حمایت کی - ۱۸۸۹ء میں جب سرسید نے یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی تو اس نے فوراً اس کی حمایت و الحاق کا اعلان کر دیا۔[۱۲۲] انجمن نے علی گڑھ کی جانشینی کے مسئلے پر بھی سرسید کے موقف اور سید محمود کے تقرر کی بھرپور حمایت کی اور اس کی نامنظوری کی صورت میں کالج سے تعلق

---

۱۲۰ ایضاً، ص ۲۵۰

۱۲۱ Mohammad Yusuf Abbasi, Muslim politics in Indo Pakistan sub continent 1876-1892 Ph.D. Thesis Punjab University (Lahore) 1972 PP 424-25

۱۲۲ A. Meyers, Theodore Beck and Sayyid Ahmed Khan: The Myth of Provocateur and puppet, Ph.D. The American University (Washington) 1973. p 260

توڑ دینے کی دھمکی دی۔[۲۳] انجمن اور اس کے ممبران خاص کر مولوی برکت علی خان نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی کارکردگی اور کامیابی میں بھی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ سرسید پنجاب کی امداد سے خاصے متاثر اور تحریک کی کامیابی میں اسے اہم مددگار تصور کرتے تھے۔ ان کی وفات پر صوبے کے مسلمانوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ خبر ملتے ہی ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ کی شام کو لاہور میں برکت علی خان کی صدارت میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ متعدد معززین نے اُن کی بیش بہا قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی یاد کو تازہ رکھنے اور خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک مستقل یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ اسی جلسے میں اس پر عمل درآمد کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بھی قائم کر دی گئی۔[۲۴] جولائی ۱۸۹۸ میں سرسید میموریل فنڈ کے لیے چندے کی فراہمی کے لیے نواب محسن الملک کی سرکردگی میں ایک وفد نے لاہور کا دورہ کیا۔ انجمن نے اس کی کامیابی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ مولوی برکت علی خان نے تمام انتظامات کی خود نگرانی کی۔ ان کی وجہ سے کئی غیر مسلم معززین بھی جلسے میں شریک ہوئے اور فنڈ کے لیے چندے دیے[۲۵] اس جلسے میں پانچ ہزار روپے نقد اور آٹھ ہزار روپے کے وعدے کیے گئے[۲۶] انجمن نے حاجی محمد اسمٰعیل کی تجویز پر اسی سال دسمبر میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو لاہور میں اپنا سالانہ جلسہ منعقد کرنے کی دعوت دی۔ اس نے میموریل فنڈ کو دوبارہ متحرک کرنے اور کانفرنس کی کامیابی کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔[۲۷] نومبر میں کانفرنس کے مقاصد و افادیت کو اجاگر اور اس میں زیادہ سے زیادہ شرکت و دلچسپی بڑھانے کے لیے ہفتہ وار تمہیدی لیکچروں کا بندوبست کیا گیا۔ مولوی برکت علی خان نے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لیے سرسید کی خدمات

---

۲۳ چودھویں صدی (راولپنڈی) یکم اپریل ۱۸۹۸ — ۲۴ ایضاً

۲۵ چودھویں صدی ۸، ۲۳ جولائی ۱۸۹۸

The Muslim Chronicle (calcutta) July 1898

۲۶ چودھویں صدی یکم جولائی ۱۸۹۸

۲۷ چودھویں صدی ۸ مئی ۱۸۹۸

پر روشنی ڈالی[۲۸] انجمن نے اس کے بعد بھی کانفرنس سے اپنا مضبوط رشتہ برقرار رکھا۔ پنجاب نے اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے زیادہ تر حامی و محرکین بھی اسی صوبے سے تعلق رکھتے تھے[۲۹] ستمبر ۱۹۰۲ میں انجمن نے کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں زیادہ سے زیادہ شرکت کی ترغیب دینے کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا، جس میں متعدد مقررین نے محمڈن یونیورسٹی کے مطالبے کو تقویت دینے کے لیے دہلی میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کرنے کی تلقین کی۔[۳۰] اگلے سال بھی اسی طرح کے اجلاس منعقد کیے گئے[۳۱]

انجمن نے پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے بادشاہی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں دینی تعلیم کے علاوہ دنیاوی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ انجمن نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس پر کثیر رقم خرچ کی۔ اس مقصد کے لیے مولوی محرم علی چشتی کی سربراہی میں ایک تعلیمی کمیٹی بھی قائم کی۔ ۱۸۸۷ء میں محرم علی کی علیحدگی کے بعد منشی فضل الدین کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ سرمائے کی کمی کے پیش نظر مدرسے کی مڈل جماعتیں توڑ دی گئیں۔ انجمن نے انجمن حمایت اسلام کی مدد سے مدرسے کی ترقی کے لیے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ مدرسے میں ابتدائی مدارج تک قرآن شریف، اردو اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی[۳۲] جنوری ۱۸۸۷ میں انجمن نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خصوصی مالی امداد کے لیے حکومتِ پنجاب کو ایک عرض داشت پیش کی۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے انجمن نے خصوصی امداد کو نہایت ضروری قرار دیا۔ اس کے مطابق مسلمان اپنی غفلت پر نادم اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے خواہاں اور کوشاں تھے۔ لیکن غربت اور تعلیمی اخراجات

---

[۲۸] چودھویں صدی ۲۳ نومبر ۱۸۹۸

[۲۹] The Tribune (Lahore) 9 January, 1895

[۳۰] وطن (امرت سر) ۲۴ ستمبر ۱۹۰۲

[۳۱] وطن ۱۱، ۱۸ دسمبر ۱۹۰۲

[۳۲] رہبر ہند ۱۵ دسمبر ۱۸۸۷

کی کثرت کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم دلوانے سے قاصر تھے۔ تعلیمی کمشن نے بھی اپنی رپورٹ میں ان کی تعلیمی حالت پر ایک علیحدہ باب تحریر کیا اور ان کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کی سفارش کی۔ اس کے نتیجے میں بمبئی اور بنگال کی حکومتوں نے ان کے لیے خصوصی مالی امداد اور وظائف کا اعلان کر دیا تھا۔ انجمن کے مطابق یہ درخواست حکومت کے اصولوں کے عین مطابق اور اتنی بڑی قوم کی تباہی کو روکنے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ اس میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی کمی اور ان کے تقرر و ترقی میں حائل دشواریوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ حکومتِ پنجاب نے انجمن کی اکثر آرا سے اتفاق اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے مطابق اگرچہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی خاصی تعداد زیرِ تعلیم تھی لیکن آبادی کے اعتبار سے ہندوؤں اور سکھوں کی نسبت خاص کر اینگلو ورنیکلر سکولوں اور آرٹس کالجوں میں ان کی تعداد نہایت قلیل تھی۔ سرکاری دفاتر میں بھی ان کی تعداد کم تھی اور تقرری میں متعدد دشواریاں حائل تھیں۔ چنانچہ ان حالات کے پیشِ نظر حکومت نے مسلمانوں کو پانچ برس کے لیے جوبلی وظائف دینے کا اعلان کیا۔ ناظمِ تعلیم کو پسماندہ علاقوں یا خاص جماعتوں کے لیے تعلیمی امداد میں اضافہ اور فیسوں میں رعایت دینے کا اختیار بھی دے دیا گیا۔ تمام سرکاری دفاتر کے سربراہوں کو ایک سرکلر کے ذریعے مسلمانوں کے تناسب کو برقرار رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ اس فیصلے کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے چودہ یعنی دو بی اے، چار انٹرمیڈیٹ اور آٹھ انٹرنس کے امتحانوں کے نتائج پر جوبلی وظائف کا اجرا کر دیا گیا۔ ان کے لیے صرف وہی مسلم طلبا اہل تھے جو مساوی یا زائد مالیت کے سرکاری وظائف حاصل کرنے میں ناکام رہے ہوں۔ بی۔ اے یا انٹرمیڈیٹ امتحان کے نتیجے میں کوئی وظیفہ حاصل نہ کرنے کی صورت میں اُسے اگلے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر لینے والے طالب علم کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کے علاوہ مسلم طلبا کو فیسوں میں بھی رعایت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ وظائف اور رعایتیں سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی تعداد اور تعلیمی معیار کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ اسی برس انجمن نے بھی اپنے ذرائع سے مستحق طلبا کے لیے تین محمڈن جوبلی وظائف دینے کا اعلان کیا۔ جلد ہی ان کی تعداد بڑھا کر چار کر دی گئی۔[۱۳۳] انجمن نے اس مقصد کے لیے

---

۱۳۳ رہبرِ ہند ۱۵ دسمبر ۱۸۸۷

باقاعدہ ضابطے بھی مرتب کیے۔ جون ۱۸۸۹ میں تعلیمی کمیٹی کے سیکرٹری شیخ خیر الدین نے کالجوں میں زیرِ تعلیم مسلم طلبا کے لیے پانچ وظائف کا اعلان کیا۔[۳۴] انجمن کی تعلیمی کاوشوں اور دلچسپی کے پیشِ نظر ۱۸۸۸ میں حکومتِ پنجاب نے صوبائی تعلیمی کانفرنس کے لیے انجمن کو اپنا نمائندہ نامزد کرنے کی دعوت دی۔[۳۵]

۱۸۹۱ء میں انجمن نے مزید پانچ برس کے لیے جیوبلی وظائف کو جاری رکھنے کے لیے درخواست دی۔ اس کے مطابق اگرچہ سرکاری اداروں میں مسلم طلبا کی تعداد میں اضافہ اور متعدد طلبا نے جیوبلی وظائف سے استفادہ کیا تھا، لیکن مسلم قوم کی عزبت و اقتصادی پسماندگی ان کی تعلیمی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں اب بھی سدِ راہ تھی۔ فیسوں میں اضافے کے پیشِ نظر ان وظائف کے عدمِ اجرا سے ان کی تعلیمی ترقی پر بُرے اثرات پڑنے کا خطرہ تھا۔ لیفٹننٹ گورنر سر جیمس لائل نے اس کے نتیجے میں وظائف کو مزید پانچ سالوں یعنی ۱۸۹۲ - ۱۸۹۷ کے اختتام تک جاری رکھنے کا حکم دیا — اکتوبر ۱۸۹۶ میں انجمن نے مزید پانچ برسوں کے لیے وظائف کی تجدید کے لیے درخواست دی۔ اس میں بھی پہلی درخواستوں کی طرح دلائل پیش کیے گئے۔ محکمہ تعلیم کی سالانہ رپورٹوں کے حوالے دیتے ہوئے وظائف اور مسلمانوں کی اپنی کوششوں کے نتیجے میں ان کی تعلیمی ترقی پر روشنی ڈالی گئی۔ محکمۂ تعلیم کی سالانہ رپورٹ برائے ۱۸۹۴ - ۱۸۹۵ کے مطابق تمام قسم کے سرکاری اداروں میں مسلم طلبا کی تعداد میں ۲۸ فی صد جب کہ ثانوی مدارس میں ۲۹ فی صد اور یونیورسٹی تعلیم میں ۵۵ فی صد اضافہ ہوا تھا۔ مسلمانوں کی اپنی متعدد انجمنیں تعلیمی ترقی کے لیے کوشاں اور متعدد طلبا کو وظائف مہیا کر رہی تھیں۔ چناں چہ حکومتِ پنجاب نے مزید پانچ سالوں کے لیے وظائف جاری رکھنے کا حکم دے دیا۔ ۱۸۹۴ء تک انجمن خود اپنے فنڈ سے چودہ مسلم طلبا کو وظائف دے چکی تھی۔ اسی برس اس نے ان اداروں میں زیرِ تعلیم طلبا کو اپنے وظائف سے مستثنیٰ قرار دے دیا جن میں اسلام کے خلاف تعلیم یا اس کی توہین کی جاتی تھی۔[۳۶] رہبرِ ہند نے ۶ ستمبر ۱۸۹۴ کے شمارے میں مسلمانوں کی

---

[۳۴] The Tribune, 26 June 1889

[۳۵] The Tribune, 4 July 1889

[۳۶] رہبرِ ہند ۶ ستمبر ۱۸۹۴

تعلیمی اور دیگر امور میں ترقی کے لیے انجمن کی شاندار کاوشوں پر زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

انجمن نے سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ جنوری ۱۸۸۷ کے میموریل میں اس سلسلے میں مسلمانوں کو درپیش مشکلات کا ذکر کیا گیا۔ حکومت نے تمام محکموں کے سربراہوں کو اپنے دفاتر میں مسلمانوں کے صحیح تناسب کے لیے ایک سرکلر جاری کر دیا۔ اپریل میں نئے گورنر سر جیمس لائل کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے انجمن نے حکومت کی توجہ ایک مرتبہ پھر اس مسئلے کی طرف مبذول کروائی۔ گورنر نے اس کے حل کے لیے ہر معقول تجویز پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔[۳۷] جون میں انجمن نے ایک اور یادداشت کے ذریعے حکومت سے سرکلر کے اجرا کے بارے میں استفسار کیا۔ حکومت نے اپنے جواب میں انجمن کو مطلع کیا کہ سرکلر جاری کر دیا گیا تھا اور وہ مسلمانوں کی کمی کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ جولائی ۱۸۸۸ میں انجمن نے وائسرائے ڈفرن کے واپس جانے کے موقعے پر بھی سپاس نامہ پیش کیا۔[۳۸] اپریل ۱۸۹۲ میں اس نے نئے گورنر فٹنر پیٹرک کے تقرر پر ایک ایڈریس پیش کیا، جس میں مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لیے سابقہ گورنروں کی کوششوں بالخصوص جیوبلی وظائف کی تعریف کرتے ہوئے اسی فراخ دلانہ پالیسی کو برقرار رکھنے کی درخواست کی گئی۔ انجمن نے سرکاری ملازمتوں میں مناسب نمائندگی کے بارے میں سرکلر کے بے اثر ہونے کی بھی شکایت کی۔ اس کے بیان کے مطابق اگرچہ بعض محکموں میں اس کا کچھ اثر ہوا تھا لیکن عملی طور پر وہ منسوخ تصور کیا جاتا تھا۔[۳۹] گورنر نے جواب میں مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوتے ہر ممکن انصاف کا یقین دلایا۔[۴۰] انجمن مسلم عہدے داروں کے تقرر و ترقی پر بھی خوشی کا اظہار اور حکومت کا شکریہ ادا کرتی رہی۔[۴۱] اس کا مقصد مسلم افسروں کی حوصلہ افزائی اور قومی اتحاد کو فروغ دینا تھا۔

انجمن مسلمانوں کے دیگر مسائل پر بھی غور کرتی اور وقتاً فوقتاً حکومت کی توجہ مبذول کرواتی رہی۔

---

۳۷ The Tribune 27 April 1887

۳۸ اخبار عام (لاہور) ۵ جولائی ۱۸۸۸

۳۹ پنجاب (امرت سر) ۵ مئی ۱۸۹۲ ــ پیسہ اخبار (لاہور) ۲۵ اپریل ۱۸۹۲

۴۰ پیسہ اخبار ۲۵ اپریل ۱۸۹۲

۴۱ چودھویں صدی ۱۵ جولائی ۱۸۹۵

۱۸۸۸ء میں اس نے حکومتِ پنجاب سے صوبے میں اسلامی اوقاف کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے مناسب اور فوری کارروائی کرنے کی درخواست کی۔[۴۲] اس نے عیسائی مشنریوں کی اسلام دشمن کارروائیوں کے تدارک کے لیے بھی بھرپور کوششیں کیں۔ ۱۸۸۱ء میں ایک مشنری کے تحریر کردہ توہین آمیز رسالے پر سخت احتجاج کیا گیا۔ اسی طرح ۱۸۹۲ء میں پادری ولیمس کے رسالے "محمدؐ کی تواریخ کا اجمال" کی اشاعت پر بھی سخت احتجاج کیا گیا، جس کے نتیجے میں پادری کو معافی مانگنی پڑی اور رسالے کی ترسیل و اشاعت معطل کر دی گئی۔[۴۳] ۱۸۹۸ء میں انجمن نے ایک اور دلآزار رسالے "امہات المومنین" کے خلاف گورنر کو میموریل بھیجا۔[۴۴] ۱۸۹۱ء میں ایک میموریل میں صوبے سے گندم کی برآمد پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور پنجاب کونسل کے قیام کی ضرورت پر زور دیا گیا۔[۴۵] ۱۸۹۹ء میں اس نے مجوزہ پنجاب کورٹ بل پر شدید تنقید کرتے ہوئے حکومت کو میموریل بھیجنے کا فیصلہ کیا۔[۴۶]

انجمن نے صوبے کے مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اسی وجہ سے وہ ان کی ایک اہم اور مقتدر جماعت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ انجمن کی کارروائی مختلف اوقات میں تنقید کا نشانہ بھی بنتی رہی۔ کئی مسلمان اس کی سست روی[۴۷] اور مولوی برکت علی خان کی بالادستی اور اجارہ داری کے خلاف تھے۔ ۱۸۹۰ء میں اس کے محرر کی طرف سے غبن کی وجہ سے اسے مزید مخالفت و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔[۴۸] انجمن چند قومی مصلحین کی ایک رضاکارانہ جماعت تھی۔ اس کے مالی وسائل محدود اور ان کا انحصار قوم کے چندوں پر تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے مسلمانوں کی گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور ان میں بیداری کی ایک زبردست لہر پیدا کر دی۔

---

۴۲ رفیقِ ہند ۹ مارچ ۱۸۸۹

۴۳ پیسہ اخبار یکم، ۲۲ اگست ۱۸۹۲

۴۴ چودھویں صدی ۸ ستمبر ۱۸۹۸

۴۵ The Tribune 25 July 1891

۴۶ The Tribune 19 August 1899

۴۷ رفیقِ ہند ۲ دسمبر ۱۸۸۴، چودھویں صدی یکم اپریل ۱۸۹۵۔ ۲ جولائی ۱۸۹۶

۴۸ اخبارِ عام ۲۳ ستمبر ۱۸۹۰ The Tribune 12 July 1890

فقہائے ہند

جلد پنجم، حصہ دوم ——— محمد اسحاق بھٹی

کتاب کا یہ حصہ برصغیر پاک و ہند کے بارھویں صدی ہجری کے ۱۰۱ فقہائے عظام اور علمائے کرام کے حالات و سوانح پر مشتمل اور ان کی علمی و فقہی مساعی اور تدریسی و تصنیفی خدمات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اس عہد کو عہد زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مقدمۂ کتاب میں اس عہد کے سیاسی معاملات اور علمی کوائف کو موضوعِ بحث ٹھہرایا گیا ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں جو علاقائی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں ان کی ضروری تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ زوال پذیر عہد کے مغل بادشاہوں کے حالات، سلطنتِ اودھ، ریاستِ حیدر آباد، روہیل کھنڈ کی حکومت، بنگال میں سراج الدولہ کی حکومت اور میسور کی سلطنتِ خداداد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان حکمرانوں کے علما و فقہا سے روابط اور ان کے عہد میں ان کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل بھی اس میں درج ہے۔ علاوہ ازیں برصغیر میں انگریزوں کی آمد، ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اور سیاسی یلغار، نادر شاہ کی دہلی میں لوٹ کھسوٹ، احمد شاہ ابدالی کے حملے اور سکھوں کے واقعات کی وہ تفصیلات بھی معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں جو اس عہدِ زوال سے تعلق رکھتی ہیں۔

صفحات ۴۱۶+۱۶ قیمت ۳۵ روپے

اسلام اور فطرت

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن فطرت کیا ہے اور اسلام کیوں کر فطرت کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں اسی اہم موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

صفحات ۱۲۴+۸ قیمت ۵ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ڈاکٹر وفا راشدی

فقیر قادر بخش بیدؔل

سندھ کے دوسرے مقامات کی طرح روہڑی بھی شروع سے اہلِ علم و فضل اور اصحابِ تصوف و عرفان کا مولد و مسکن رہا ہے۔ فقیر قادر بخش بیدؔل اسی خطۂ روحانیت افزا کے بلند پایہ صوفی، عالم اور فاضل تھے۔

قادر بخش بیدؔل کے والد ماجد محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ روہڑی کے مشہور بزرگانِ دین میں سے تھے۔ حسب و نسب کے اعتبار سے قریش تھے۔ پارچہ بافی کا کام کرتے تھے، اس لیے پاٹولی[1] مشہور تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلسلۂ قادریہ کے مشہور عارف کامل، صوفی شاہ عنایت شہید[2] (۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۶ء — ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء) ساکن جھوک شریف کے کمال تصوف و معرفت کی بڑی شہرت تھی۔ محمد حسنؒ آپ سے بیعت تھے اور مسندِ خلافت پر فائز۔

عبدالقادر المعروف فقیر قادر بخش بیدؔل پانچ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے انھیں قرآنِ حکیم کی تعلیم کے لیے مسجد میں بٹھا دیا۔ وہ بچپن سے ذکی و ذہین تھے۔ بارہ سال کی عمر میں پہنچے تو قرآن، حدیث اور دینیات کی تعلیمات مکمل کر لیں۔ پھر اپنی خداداد ذہانت اور محنت و صلاحیت کی بنا پر فقہ، فلسفۂ دین، تصوف، علم الکلام اور دیگر علومِ دینوی پر کامل دست گاہ حاصل کی۔ حساس اور خاموش طبع تھے۔ اپنے درویش باپ کے ہمراہ زیادہ تر وقت علما و فضلا اور بزرگانِ دین کی صحبت میں گزارتے۔ آخری عمر تک سیر و سفر، خلوت، عبادت، مطالعہ، فکر و استغراق، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔

کہتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں فقیر بیدل نے برابر تین رات خواب میں دیکھا کہ ایک

---

[1] سندھ میں اردو شاعری۔ ص ۱۱۶

[2] مقالہ "شاہ شہید صوفی" تحریر پروفیسر محبوب علی چنا مرحوم۔ مطبوعہ نئی زندگی سندھی کراچی

لنگوٹ بند قلندر ان سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں : " ہمارے پاس آجاؤ " انھوں نے روہڑی سے سیوہن شریف تک کا سفر عالمِ جذب میں دیوانہ وار طے کیا۔ لعل قلندر شہباز سیوستانی کے مرقدِ مبارک پر تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر میمن عبد المجید سندھی اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں " وہاں سے آپ کو (یعنی بیدل کو) شعر کہنے کی اجازت ملی اور آپ نے دو غزلیں فارسی اور اردو میں کہیں "۔ [۳]

بیدل نے روہڑی واپس آکر اپنی دونوں غزلیں استادِ محترم کو دکھائیں۔ انھوں نے فرمایا۔" یہ غزلیں تو پنجاب کے ایک شاعر بیدل کی ہیں" یہ سنتے ہی وہ وجد میں آگئے اور مزید تین اردو، فارسی، عربی میں کہیں اور اپنی شاعرانہ صلاحیت ان پر ثابت کر دی۔

ابھی چودہ سال کے تھے کہ بیدل کے پدرِ بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انھوں نے اپنے والدِ محترم کے پیر و مرشد حضرت صوفی شاہ عنایت اللہ شہید[۴] کے خلیفہ، ارشد میر جان اللہ شاہ[۵] سے بیعت کی۔ بیدل کو اوائلِ عمر سے تلاشِ حق اور جستجوئے معرفت کا شوق تھا۔ ذوقِ جنوں میں انھوں نے دور دور کی سیر و سیاحت کی۔ بزرگوں کے آستانوں اور اللہ والوں کے درباروں میں حاضری دی۔ آلام و مصائب کی گھاٹیوں سے گزر کر مظاہرِ قدرت اور مشاہداتِ دنیا کے رنگارنگ

---

۳ "بیدل کی اردو شاعری" از ڈاکٹر میمن عبد المجید سندھی سہ ماہی اردو نامہ کراچی شمارہ ۱۱، ص ۸-۹

۴ بیدل کو صوفی شاہ شہید سے روحانی عقیدت تھی۔ انھوں نے ان کی شہادت (۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء) کے دلدوز واقعہ سے متاثر ہو کر ایک دل سوز مرثیہ کہا، جس کے چند اشعار یہ ہیں :

عشق چندیں حملہ بر عشاق بے سر و پا نمود | بر رُخِ صاحب دلاں صدرہ در رحمت کشود

سوئی صغرا قیامت در ہزار دسی و صد | سر بریدن صوفی بیخود کمالش وافزود

("مہران جا سوئی" سندھی پاکستان پبلیکیشن، ص ۴۳)

۵ میر جان اللہ شاہ رضوی (المتوفی یکم ربیع الاول ۱۱۷۷ھ بمقام روہڑی) متخلص بہ میر کے علم و عرفان کا فیض سکھر اور روہڑی میں عام تھا۔ فارسی کے بلند پایہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ایک مثنوی بھی یادگار ہے۔ (تحفۃ الکرام اردو، ص ۲۹۷۔ مضمون پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ مطبوعہ نئی زندگی شہید نمبر)

تجربات کی روشنی میں نہ صرف دنیاوی علوم سے سرفراز ہوئے بلکہ روحانی کسب و کمالات سے بھی بہرہ ور ہوئے۔

دوران سفر بیدلؔ نے پیر گوٹھ (خیر پور) میں سندھ کے مشہور ولی اللہ پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں اعتکاف کیا۔ اس عرصے میں پیر پگارا حضرت صبغت اللہ شاہ (۱۱۸۳ھ/ ۱۷۷۹ء ـــ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۲۱ء) کے فرزندِ عزیز سید علی گوہر شاہ کے استاد مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنے تلمیذ ارشد کو عربی و فارسی کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ مثنوی مولانا روم بھی شرح و بسط سے پڑھائی۔ فقیر بیدل کی باکمال و بافیض تعلیمات کی بدولت سید علی گوہر شاہ نہ صرف تصوف و معرفت کے علوم سے بہرہ ور ہوئے، عربی و فارسی کے عالم اور اعلیٰ درجے کے شاعر بن گئے۔

بیدلؔ فقیر پیر گوٹھ سے فارغ ہو کر ضلع خیر پور کے ایک قصبہ پریاں لوٹی تشریف لے گئے۔ یہ مقام روہڑی سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کر اپنے آبائی شہر روہڑی واپس آ گئے۔ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ذریعۂ معاش کی غرض سے کپڑے اور دیگر اشیا کا کاروبار کیا۔ فکرِ معاش کے بعد ہمہ وقت فکرِ دینی، ذکرِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں گزارتے۔ ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل تھے۔

بیدلؔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) میں روہڑی کی خاک سے اٹھے اور ۱۶ ذوالقعدہ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں وہیں پیوندِ زمین ہوئے۔ ان کی قبر روہڑی اسٹیشن سے متصل زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

فقیر بیدلؔ نے جب اس جہانِ فانی میں قدم رکھا، اس وقت سندھ میں تالپور خاندان برسرِ اقتدار تھا اور جب دارِ فانی سے دار البقا کی راہ لی، ان دنوں انگریزوں کی سلطنت کا سورج

لـ۶ الرحیم۔ مشاہیر سندھ نمبر۔ مرتبہ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی ص ۲۵

لـ۷ پیر سید علی گوہر شاہ (اوّل) راشدی اصغرؔ تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں پیدا ہوئے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں فوت ہوئے۔ اپنے والد حضرت سید صبغت اللہ شاہ راشدی کی وفات کے بعد سجادہ نشینی کی پگڑی ان کے سر بندھی اور پیر پگارا سوم کے لقب سے ملقب ہوئے۔ سندھی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ محفل رنگ و سماع کے شیدائی تھے۔ ان کی کافیوں کا رنگ اوروں سے جدا تھا، اس لیے اس صنف میں انھیں نمایاں شہرت ملی۔ (الرحیم۔ مشاہیر نمبر ص ۲۹)

نصف النہار پر جلوہ گر تھا۔ حضرت لعل قلندر شہباز سیوستانی، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست بیدل کے نامور بزرگانِ اسلاف میں سے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب شاہ صاحب کا وصال ہوا سچل سائیں کی عمر تیرہ برس کی تھی اور جب سچل سائیں اس دنیا سے رخصت ہوئے فقیر بیدل نے حیاتِ بے ثبات کی تیرھویں بہار دیکھی۔ فقیر بیدل کو اپنے زمانے میں وہی مقامِ عالی عطا ہوا جو مقام شاہ لطیف اور حضرت سچل جیسے اکابرِ سندھ کو اپنے اپنے زمانے میں حاصل تھا۔

بیدل نے حضرت عثمان مروندی عرف لعل قلندر شہباز سیوستانی، شاہ لطیف اور سائیں سچل کی مدح میں قصیدے بھی لکھے اور ان کی خدمتِ اقدس میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

قادر بخش بیدل کا شمار سندھ کے اکابرِ علم و ادب میں ہوتا ہے۔ صوفی، شاعر، مصنف، انشا پرداز اور فقیہ، ان کی ہر حیثیت مسلم و مستند تھی، عربی، فارسی، سندھی، سرائیکی، اردو، ہندی زبان و ادب پر عبور رکھتے تھے۔ ہر زبان میں نظم و نثر بڑی روانی اور مہارت سے لکھتے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا موضوع آیاتِ قرآنی، احادیث، مسائل تصوف اور فلسفۂ علم شریعت و فقہ کے باریک نکات کی تشریحات و توضیحات سے تعلق رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ایچ آئی سدارنگانی (سابق پروفیسر فارسی ڈی جے سندھ کالج کراچی) نے اپنی کتاب پرشین پوائنٹس آف سندھ میں قادر بخش بیدل کی اٹھارہ عربی، فارسی، سندھی، اردو تصانیف[۵] کا ذکر کیا ہے، حالانکہ ان کے علاوہ بھی مزید مخطوطات کا پتا چلتا ہے، جن کی تفصیل آگے بیان کی جارہی ہے۔

عربی

۱۔ منہاج الحقیقت۔ (مجموعۂ کلام)

---

۵ Pasian poets of Sind by Dr. H. J. Sadarangani P 243-246, Publishid by Sindhi Adabi Board Karachi. First-Impression 1956.

۲۔ المفوائد المعنوی : تصوف پر نثر میں لکھی گئی مع سندھی ترجمہ۔

فارسی / اردو

۱۔ سلوک الطالبین : دیوان فارسی، نوشتے غزلیات پر مشتمل۔ اس دیوان کی ہر غزل میں طالب تخلص کیا ہے۔ جب کہ دیگر تمام عربی فارسی، سندھی، سرائیکی اور اردو کلام میں بیدل تخلص کرتے تھے۔

۲۔ رموز القادری : حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے عربی قصیدے کا فارسی ترجمہ مع تشریح۔

۳۔ نہرالبحر : آیات قرآنی کی روشنی میں مثنوی مولانا روم کے فلسفۂ تصوف و معرفت کا عالمانہ جائزہ جس میں بیدل نے مولانا روم کو سمندر اور اپنے آپ کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔

۴۔ رموز العارفین : عارفانہ کلام کا مجموعہ۔

۵۔ قرۃ العینین فی منا السبطین : ملا کاشفی کے قصیدہ روضۃ الشہدا کے طرز پر واقعۂ کربلا کے متعلق رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے اسوۂ حسنہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ نثر اور دوسرا حصہ نظم پر مشتمل ہے۔

۶۔ فی باطن الاحدی : باطنی رموز اور روحانیت پر ایک رسالہ۔

۷۔ لغاتِ میزانِ طب : طبی اصطلاحات۔

۸۔ انشائے قادری : فارسی خطبات، مکتوبات اور ملفوظات کا مرقع۔

۹۔ دلکشا : ۲۵۰ بند پر مشتمل ایک طویل مثنوی۔

۱۰۔ مصباح الطریقت : فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔

سندھی / سرائیکی

۱۔ ریاض الفقر : دینی حکایات اور صوفیانہ خیالات پر مشتمل نثری مضامین۔ اس کے گیارہ ابواب ہیں۔ ایک ہزار اشعار بھی شامل ہیں۔

۲۔ سند المحی الدین : سندھی نظم و نثر میں سندھ اور ہند کے تصوف اور اہلِ تصوف کا تذکرہ۔

۳۔ تقویت القلوب (تذکرۃ المحبوب) : مسئلہ توحید پر ایک رسالہ نثر میں۔

۴۔ سرودنامہ : سندھی کافیاں، دوہڑے۔

۵- وحدت نامہ : سندھی اور سرائیکی میں حقیقت و معرفت کے مسائل پر مبنی منظومات۔
۶- پنج گنج ، پنج گنج کے نام سے حضرت امیر خسروؒ دہلوی کی ایک تصنیف فارسی میں موجود ہے - بیدلؔ نے اسی نام سے سندھی میں ایک کتاب لکھی جس میں قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں مولانا رومؒ اور شاہ لطیفؒ کے کلام کے مطالب اور تشریحات پیش کی ہیں - عربی و فارسی کے بعض مقتدر شعرائے کرام مثلاً جامی، عزیزی، سعدی، حافظ اور شاہ حسن بصری کے کلام اور شاہ لطیف کے کلام کا تقابلی مطالعہ عالمانہ و محققانہ اور مفکرانہ انداز میں کیا ہے۔

دیوانِ بیدلؔ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا - دوسرا ایڈیشن مرتبہ عبدالحسنین شاہ موسوی، سندھی ادبی بورڈ کے زیرِ اہتمام ۱۹۶۱ء میں منظرِ عام پر آیا - یہ دیوان رائل سائز کے ۲۹۲ صفحات پر محیط ہے - اس دیوان کے شروع میں بیدلؔ کی حیات و نگارشات پر سندھی زبان میں شرح و بسط سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

حصۂ نظم کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

ابیاتِ سندھی زیرِ عنوان وحدت نامۂ فرائض نامہ وغیرہ ص ۹، تا ۱۵۰ -
سرائیکی کافیاں (مناقب، مخمس، وغیرہ) ص ۱۵۱ تا ۲۶۳
اردو ہندی کلام - ص ۲۶۴ تا ۲۶۹
فارسی کلام - ص ۲۷۰ تا ۲۷۶
عربی کلام - ص ۲۷۷ تا ۲۸۲

علاوہ ازیں بیدل کا ایک اور غیر مطبوعہ شعری مجموعہ موسوم بہ "غزلیات فقیر بیدل" مخطوطے کی شکل میں موجود ہے - یہ مخطوطہ پروفیسر عطا محمد حامی مرحوم خیر پور کی ملکیت تھی۔ کوئی ایک سال قبل ان کا انتقال ہوا - اب معلوم نہیں یہ نسخہ کس کی تحویل میں ہے - اس مجموعے میں بیدلؔ کی چودہ اردو غزلیں بھی ہیں جو سات صفحات کی ہیں -- سید علی احمد زیدی کی مرتبہ کتاب "سندھ میں اردو مطبوعات" کے صفحہ ۵۳ پر اس کے قلمی نسخے کا ذکر ملتا ہے۔

فقیر بیدلؔ کے دینی عقائد اور صوفیانہ خیالات و نظریات کا عکس ان کے اشعار میں جابجا ملتا ہے - مثلاً وہ عربی میں کہتے ہیں :

انا الشیعی ولکن لا ابری — من الخلفاء هم سر ج الہدایۃ
انا السنی ولکن قائل الفضل — لقامع خیبر والی الولایہ

فارسی میں کہتے ہیں :

درویش نہ شیعہ و نہ سنّی است — پروانۂ شعشعۂ لالی است
صفا علامتِ صوفی بود، نہ جامہ صوف — دلِ منیر کجا ، خرقہ و کلاہ کجا
گدائے عشق بجوید تقربِ سلطان — غنائے فقر کجا، حبِ مال و جاہ کجا
بیدل اسلام جلوہ گر نشود — تا ہوا و ہوس نگردد مات

اردو اور سرائیکی میں کہتے ہیں :

بہت مذہب ہیں کثرت میں نہ جا بیدل مشقت میں — ہوا جو غرق وحدت میں اسے ملت سوی کیا مطلب
مکھ ماہی دا نور تجلی ، صورت حسن حقانی — مکھ ماہی دا قبلہ کعبہ ، عشق امام حقانی

یہ کائنات ہیہ موجودات ، فرش و عرش اور حدِ نگاہ کی تمام رنگینیاں و رعنائیاں دراصل سوزِ عشق کا مظہر ہیں ۔ مجاز سے حقیقت تک کی تمام منزلیں عشق کی بدولت طے ہوتی ہیں ، تب کہیں زندگی پر حیات کا راز منکشف ہوتا ہے ، کائنات کا حسن و رنگ نکھرتا ہے ۔ اللہ والوں کے کرب و جذب ، رندی و مستی ، بےخودی و مدہوشی ، یہ سب کچھ عشق کی جلوہ فرمائیاں تو ہیں ۔

وحدت الوجود ، ہمہ اوست ، وحدت میں کثرت ، کثرت میں وحدت ، فنا و بقا ، نفی و اثبات اور ذکر و فکر کے موضوعات اور ان موضوعات کے اسرار و رموز کی ترجمانی سندھ کے اکثر صوفی شعرا و علما نے اپنے افکار و معارف میں کی ہے ۔ لعل قلندر شہباز ، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست جیسے عظیم اولیائے کرام نے فارسی ، سندھی ، سرائیکی اور اردو میں رموزِ تصوف اور مسائل وحدت و کثرت بیان کیے ہیں ۔ فقیر قادر بخش بیدل کے فکر و خیال کی فضا پر انہی بزرگانِ طریقت کے فانوسِ تخیل کا پر تو دکھائی دیتا ہے ۔

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و محقق حفیظ ہوشیارپوری مرحوم مصنف "مقامِ غزل"[۹] رقم طراز

---

[۹] مقامِ غزل مرتبہ شان الحق حقی مطبوعہ ۱۹۷۳ء حفیظ ہوشیارپوری مرحوم کا پہلا اور آخری مجموعہ کلام ہے ۔

"قادر بخش بیدلؔ اپنی وسعتِ بیان کو کسی ایک زبان تک محدود نہ کر سکے اور انھوں نے عربی، فارسی، اردو اور سندھی کو بھی اپنے خیالات کا ذریعہ بنایا۔ ان کا علم وسیع، تصوف صحت مندانہ اور ان کا عشق سخت کوش ہے۔"[۱۰]

---

۱۰ خطبۂ صدارت ثقافتی کانفرنس زیرِ اہتمام لطیف اکیڈیمی سکھر منعقدہ ۱۹۵۹ء۔ اس خطبے کا قلمی نسخہ اس کانفرنس کے موقع پر خود حفیظ مرحوم نے (وہ ان دنوں حیدر آباد ریڈیو اسٹیشن کے ریجنل ڈائریکٹر تھے) اپنے دستخط سے اس خاکسار راقم کو عنایت فرمایا تھا جو اس کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ و موجود ہے۔

اسلام اور عدل و احسان

مولانا رئیس احمد جعفری

اسلام کے دشمنوں نے بھی باور کرایا اور ناواقف احوال مسلمانوں نے بھی سمجھا ہے کہ اسلام تشدد کا مذہب ہے، اسلام کا خدا جبار و قہار ہے۔ اسلام کے عبادات، معتقدات اور معمولات یکسر "عسر" یعنی سختی پر مبنی ہیں۔ اس تاریخی غلط بیانی کی تردید تاریخی شواہد اور قرآن و حدیث کی روشنی میں بڑے عمدہ پیرایہ میں کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام رحم، عدل، احسان اور محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کا خدا رحمان و رحیم بھی ہے، غفار و تواب بھی ہے۔ ان حقائق کا ایک مرتبہ مطالعہ کر لینے کے بعد وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں جو اسلام کے دشمنوں یا دوست نما دشمنوں نے اس کے بارے میں پھیلائی ہیں۔ کتاب میں کوئی دعویٰ بھی بغیر سند اور حوالے کے نہیں کیا گیا۔

محمد اشفاق چغتائی

"اسلامی فلسفۂ زندگی" کا مختصر تنقیدی جائزہ

"اسلامی فلسفۂ زندگی" نوجوان عالمِ دین پروفیسر محمد طاہر القادری سرپرست ادارہ منہاج القرآن لاہور کی تصنیف ہے۔ پروفیسر صاحب ان دنوں "منہاج القرآن" کے نام سے قرآنِ حکیم کی لازوال حکمتوں کے بیش بہا موتی تفسیری شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "اسلامی فلسفۂ زندگی" میں سورۂ فاتحہ کی آیتِ کریمہ "اھدنا الصراط المستقیم" کے تحت اسلامی فلسفۂ زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔

ماضی قریب میں اسلام کے فکری نظام کے خلاف اس قدر زہریلا پروپیگنڈا کیا گیا کہ دنیائے فکر و نظر میں اسلام کو ایک عظیم تحریک کی بجائے دھرم کی منجمد شاستر سمجھا جانے لگا۔ حکیم الاُمّت علامہ اقبال اور دیگر حضرات نے اس خطرناک سازش کو بھانپ کر اس کے خلاف آواز بلند کی اور اسلام کو ایک زندہ قوت اور متحرک دین ثابت کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو اسلامی انقلابی فکر اور شعورِ مقصد عطا کرنے کی کوشش کی اور انھیں خبردار کیا کہ:

دینِ بے قوت ہمہ مکر و فسوں!

ضرورت اس بات کی تھی کہ مفکرینِ ملت کی ان آوازوں کو حیات آفریں دعوتِ عمل کی صورت میں برقرار رکھا جاتا اور انھیں عقل و دانش کی غذا فراہم کی جاتی، مگر ہمارے ہاں اس نہج پر بہت زیادہ کام نہ ہو سکا۔ مقامِ مسرت ہے کہ اب دنیائے تصنیف و تالیف میں ایسی مستحسن کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔ پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب کی زیرِ نظر تصنیف اسی سلسلے کی ایک زریں کڑی ہے۔ موصوف نے وقت کے اصل مرض کی صحیح تشخیص کی ہے اور اپنی فکر کے مطابق اسلام سے اس کا علاج تجویز کیا ہے۔

موجودہ دور سرمایہ و محنت کا دور ہے، اب عالمی سطح پر جاگیرداری اپنی بساط لپیٹ چکی ہے اور معیشت و اقتصاد کے معبدوں میں سجے ہوئے سرمایہ داری کے بت اشتراکیت کی زلزلہ انگیزیوں سے لرزہ براندام ہیں۔ اس وقت دنیا راہِ نجات کی تلاش میں ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور سوچ

رہی ہے کہ سامراج کے قدموں میں گر جائے یا اشتراکی آمریت کا طوق زیب گلو کرلے۔ اس وقت دنیا کو یہ بتانا کہ "ان دو نظام ہائے معیشت کے علاوہ ایک تیسرا نظام بھی ہے جو انسانوں کو فردوسِ مقصود سے ہم کنار کرتا ہے"۔ فی الواقع بہت بڑا کام ہے لیکن یہ کام کھوکھلے نعروں سے نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کو بہترین نظامِ زندگی اور اکمل ضابطۂ حیات ثابت کرنے کے لیے ایسے لٹریچر سے بھری الماریاں کام نہیں آسکتیں جن میں اشتراکیت کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام کا سرپرست بنا کر پیش کیا گیا ہو اور نہ ہی ایسے دفاتر کام آسکتے ہیں جو سرمایہ داری کی مخالفت میں اتنے آگے بڑھ جائیں کہ انھیں اشتراکیت ہی کا مثنیٰ (supplicate) سمجھا جائے۔ اس وقت تو اسلام کے ایسے مطالعے کو برسرِ عام لانا اصل کام ہے جو اسے ان دونوں نظام ہائے معیشت سے ممیز و ممتاز کر سکے۔

زیرِ نظر کتاب "اسلامی فلسفۂ زندگی" میں فاضل مصنف نے ایسی ہی کوشش فرمائی ہے اور ہر قدم پر ان کا نقطۂ نظر اصل، بے میل اور خالص اسلام کو پیش کرنا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک معاشی ناہمواریوں کا پیدا کردہ کرب ہی ہے جس نے ہمیشہ سے دنیا کو اضطرابِ پیہم کا جہنم زار بنا رکھا ہے، اور یہ کوئی ایسی بیماری نہیں جو آج ہی پیدا ہوئی ہو اور آج ہم خود ہی اس کا علاج تجویز کرنے بیٹھ جائیں۔

پروفیسر صاحب نے بجا طور پر یہ سمجھا ہے کہ یہ مرضِ پارینہ آغازِ اسلام میں بھی معاشرے کو لاحق تھا اس لیے اس کا علاج بھی وہی ہونا چاہیے جو خود طبیبِ کائنات، شافیِ مطلق نے اپنے نسخۂ شفا میں تجویز فرمایا تھا:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی　　　علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

فاضل مصنف نے اپنی تصنیف میں اسی نسخۂ شفا سے ہدایت لینے کی کوشش کی ہے اور انسانی تاریخ کے مرضِ کہن کا علاج بھی وہی "آبِ نشاط انگیز" تجویز فرمایا ہے۔ لیکن اگر اجازت ہو تو نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی جسارت کروں کہ بعض نکات ایک خلجان کا موجب بن رہے ہیں، اگر ان کی مزید وضاحت ہو جاتی تو شاید ذہنوں میں خلش باقی نہ رہتی۔

اسلامی فلسفۂ زندگی میں رضائے الٰہی کا حصول انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا گیا ہے اور فعلِ احسان کو حصولِ نصب العین کا طریقِ کار بتایا گیا ہے، اور انفاق فی المال کو اس طریقِ کار کی

عملی اساس قرار دیا گیا ہے۔

انفاق فی المال قرآن کا حکم ہے اور حکم بھی ایسا کہ بقول پروفیسر صاحب یہ "دین کا وجوبی ضابطہ ہے" (اسلامی فلسفۂ زندگی ص ۸۹) اور اسی انفاق کے متعلق ان کا یہ اعلان ہے کہ "انفاق فی المال ہی حقیقت میں تصدیقِ دین اور اس کا ترک تکذیبِ دین ہے" (ص ۹۰) ۔ یہی انفاق فی المال ہے جسے وہ آیۂ کریمہ " ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان " میں فعل احسان کا محمل اور اس کی عملی اساس قرار دیتے ہیں اور پھر اسے فرضِ عین ٹھہراتے ہیں ۔ " لہٰذا احسان کا یہ مفہوم اہلِ ایمان کے لیے درجۂ فرضِ عین ہے" (ص ۵۰) ایسے فرض و واجب کے متعلق دوسری جگہ نفل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور احسان کو انفاق نافلہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: " یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ فعلِ احسان کا اطلاق انفاقِ واجبہ پر نہیں بلکہ انفاق نافلہ پر ہوگا۔ انفاقِ واجبہ کی تمام صورتیں قرآن کے حکم عدل کے تحت شمار کی جائیں گی کیوں کہ عدل کا مفہوم یہی ہے کہ جس قدر دینا لازم ہو اسی قدر دیا جائے اور شرعاً واجب حصے کے علاوہ دینا احسان ہے" (ص ۶۷)

اس عبارت میں انفاق یا احسان کو فرض و واجب کی بجائے نفل شمار کیا گیا ہے اور نفل فقہا کے نزدیک وہ بات ہوتی ہے جس کے کرنے والے کو ثواب ملے، مگر تارک پر کسی قسم کا گناہ نہ ہو۔ گویا فعلِ احسان، جسے انفاقِ نافلہ کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے، کا تارک کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فعلِ احسان تو فرضِ عین کے درجے میں تھا اور اس کا ترک تکذیبِ دین کے مترادف تھا تو اب وہ محض نفل کیسے ہوگیا۔

پروفیسر صاحب کے بقول اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں " اگر معاشرے کے کچھ لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ہوں اور صاحبِ دولت تعیشات کی زندگی بسر کرتا ہے تو یہ عدل کے خلاف ہے ۔ یعنی جو سہولتیں وہ خود کو مہیا کرنا چاہتا ہے، دوسروں کے لیے بھی ان ہی کا خیال رکھے ۔ اگر یہ احساس اور دردِ دل و دماغ میں مفقود ہو اور عمل ان خصائص سے عاری ہو تو زندگی خلافِ عدل ہوگی، کیوں کہ[1] خلافِ عدل کو ظلم کہتے ہیں اور ظلم منافیِ ایمان ہے۔ اس صورت

---

[1] چونکہ کی بجائے کیوں کہ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

میں یہ سمجھنا چاہیے کہ ایمان کا ادنیٰ تقاضا بھی پورا نہیں ہو رہا۔ (ص ۵۱)

اس عبارت سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اسلام مکمل مساوات پر مبنی معاشرے کی تخلیق چاہتا ہے، اور یہ ایمان کا ادنیٰ تقاضا ہے، دگرنہ ہر فردِ معاشرہ کو اس ایثار کا پیکر ہونا چاہیے کہ "میرا دوسرا بھائی مجھ سے بلند معیارِ زندگی کا حامل ہو" اور ہر مسلمان اپنی خوشیاں دوسرے مسلمان بھائی کے لیے قربان کرنے والا ہو۔ ابنِ جریر نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کر کے تاریخ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ : "مجھ میں اور رومۃ الکبریٰ کے بادشاہوں میں یہی فرق ہے کہ وہ لوگوں کی گردنوں پر اپنا تخت بچھاتے اور خود اس پر سوار ہو جاتے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ لوگ اپنا تخت میری گردن پر رکھیں اور خود اس پہ بیٹھ جائیں۔ (ابن جریر طبری ج ۳ مناقب ابی بکر) اور تاریخ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول کو بھی آج تک بجا طور پر اپنی متاعِ بیش بہا سمجھ رہی ہے، جس کے مطابق انھوں نے اپنے نانِ جویں کھانے پر اظہارِ تعجب کرنے والے کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا تھا کہ : "جب تک تمام مسلمانوں کو گندم کی روٹی اور زیتون کا تیل میسر نہ ہوں میں یہ چیزیں نہیں کھا سکتا۔" (ترمذی باب مناقب عمرؓ)

جب خلفائے راشدین کے نزدیک بھی ایمان کی میزان یہی عملِ حسن ٹھہرے تو پھر یقیناً یہ کہنا بجا ہے کہ عام مسلمان اگر دوسرے مسلمان بھائیوں کی ضروریات سے غافل ہو کر عیش و تنعم کی زندگی بسر کر رہا ہو تو وہ ادنیٰ درجے کے ایمان کا بھی حامل نہیں ہو سکتا۔ پھر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ گرامی بھی ہمارے سامنے رہے کہ "جس کا پڑوسی رات پھر بھوکا سویا اور اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا، وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا" اور شرعی توضیحات کے مطابق جب لفظ پڑوسی چاروں سمتوں میں چالیس چالیس گھروں کو محیط ہوتا چلا جائے تو پھر افلاس کا نشان کہاں باقی رہے گا؟ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو خارج از ایمان قرار دیتے ہیں جو انفاق کا عملِ حسن سر انجام نہیں دیتا — ان توضیحات کے پیشِ نظر انفاق اور فعلِ احسان کو عبادتِ نافلہ قرار دینا اس عملِ حسن کے تارک کے لیے جوازِ ایمان فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

فاضل مصنف نے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ یہ روایت بھی درج کی ہے کہ "آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا بنی آدم کے لیے سوائے تین چیزوں کے اور کوئی حق نہیں۔

ایک گھر جس میں رہ سکے اور کپڑا جس سے اس کا ستر چھپ جائے اور ایک وقت کا کھانا پانی"۔ (جامع ترمذی) اور پھر اس روایت سے یہ قابلِ قدر نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ "اگر کسی شخص کو یہ تینوں چیزیں حاصل ہوں اور اسی معاشرے کے بعض دیگر افراد ان سے بھی محروم ہوں تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان سے زائد اپنے پاس رکھے"۔ (ص ۱۱۳) ان عبارات کے مطالعے سے یہ امید پیدا ہونے لگتی ہے کہ پروفیسر صاحب ایک ایسے معاشرے کی تشکیل اسلام کا بنیادی تقاضا قرار دے رہے ہیں جس میں حاجت مندوں کے حق کا تعین ہو جائے گا، اس طرح وہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ وفی اموالھم حق للسائل والمحروم (اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے) گویا دولت مندوں کے اموال میں "سائل و محروم" کا اس قدر حق ہے کہ وہ ان کی ضرورت سے زائد ان سے وصول کرلیں۔ دوسری جگہ قرآنِ حکیم ہی سے اس کی تائید یوں فرمائی گئی ہے۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ (اے نبیؐ وہ آپ سے پوچھتے ہیں کیا انفاق کریں، فرما دیجیے کہ جو ضرورت سے زائد ہو)۔

یہ انقلابی تعلیمات فی الواقع ایک متوازن اور منفرد معاشی نظام کی حامل ہیں، مگر اسے کیا کہیے کہ ایسی خوب صورت اور انقلابی تجاویز پیش کرنے والے فاضل مصنف یوں بھی رقم طراز ہوتے ہیں کہ "احسان میں چوں کہ دوسرے شخص کے استحقاق کا قانونی تعین نہیں ہوتا اس لیے اس پر کوئی حد نہیں ہوتی"۔ (ص ۶۷)

اگر ان واضح احکام کے بعد بھی سائل و محروم کے حق کا قانونی تعین نہیں ہوا تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر صاحب اپنی حکمت و دانش کے باوجود ان لکیروں سے آگے نہیں نکل پائے جو ان سے پہلے وہ فقہا کھینچ گئے ہیں جن میں سے اکثر ملوکیت اور سرمایہ داری کے تحفظ کے فرائض سرانجام دینے پر مجبور تھے۔

میری اس تحریر کو معاندانہ تبصرے پر محمول نہ کیا جائے، میں نے احقاقِ حق کے لیے صرف چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ میں صرف چند اشکالات کی وضاحت چاہتا ہوں۔ میں نے ان فقہا کے بھی خلاف نہیں جن سے ان کی مجبوریوں نے نادانستہ کچھ لغزشیں کرائیں۔ میں ان کی خدماتِ جلیلہ کا پوری طرح معترف ہوں۔

بندۂ ہمتِ اسلافم و آن سفلہ نیم — کہ خورم نمک و باز نمکداں شکنم (میرزا صائب)

سید جمال الدین افغانی : حیات و افکار

از شاہد حسین رزاقی

سید جمال الدین افغانی کا شمار ان چند نادرۂ روزگار افراد میں ہوتا ہے جو مشرق و مغرب کے ذہنی افکار کے رمز شناس تھے اور جنھوں نے دنیائے اسلام کے مسلمانوں میں ملی بیداری، سیاسی شعور اور قومی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ازحد جدوجہد کی۔ افغانی کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنی مسلسل مساعی کی کی بنا پر عالم اسلام کی نشاۃ جدیدہ کے صحیح معنوں میں معمار تھے۔ ان کا زمانہ مغربی استعمار کے عروج اور اسلامی دنیا کے زوال کا زمانہ تھا اور اس کا انھیں انتہائی قلق تھا جو انھیں کہیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔

اس کتاب میں ان کی سعی و کوشش اور تگ و تاز کی تفصیلات خاص ترتیب اور عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

صفحات ۸ + ۲۰۸ قیمت ۲۵ روپے

سطعات

شاہ ولی اللہ ترجمہ : سید محمد متین ہاشمی

حضرت شاہ ولی اللہ نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی عظیم شخصیت تھے بلکہ اپنے دور میں عالم اسلام کی ایک نہایت قابل فخر اور بلند مرتبت ہستی تھے۔ وہ بہترین مصلح، بہت بڑے مصنف، اونچے درجے کے عالم دین، بے مثال مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔ ان کی تصنیفات اہل علم کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاہ صاحب کی گراں قدر تصنیفات میں "سطعات" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ ادارہ ثقافت اسلامیہ یہ سعادت حاصل کر رہا ہے۔

فاضل مترجم نے حل طلب مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں، نیز ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے حالات اور ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۸ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

محمد اسحاق بھٹی

مولانا سید محمد میاں کے چند مکاتیب

اس سے پہلے مئی ۱۹۸۳ کے "المعارف" میں مولانا سید محمد جعفر پھلواروی مرحوم کے اور جون کے شمارے میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے وہ مکتوبات شائع ہو چکے ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں اس بندۂ عاجز کے نام ارسال فرمائے۔ اب جولائی کے "المعارف" میں مولانا سید محمد میاں مرحوم کے مکاتیبِ گرامی شائع کیے جا رہے ہیں۔ مولانا ممدوح برصغیر پاک و ہند کے نامور علما میں سے تھے۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کے جیّد عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز مصنف اور بہت بڑے اہلِ قلم بھی تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں: سیرتِ مبارکہ، عہدِ زریں، مشکوٰۃ الآثار و مصباح الابرار، دینِ کامل، علمائے ہند کا شاندار ماضی، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، تحریکِ شیخ الہند (جسے تحریکِ ریشمی رومال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے)، حیاتِ شیخ الاسلام، اسیرانِ مالٹا، ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں۔

برصغیر پاک و ہند کی سیاسی اور علمی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا اور اس سلسلے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ مولانا مرحوم ۱۹۰۳ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ کو دہلی میں وفات پائی۔ راقم الحروف سے ان کا سلسلۂ خط و کتابت تھا۔ بعض معاملات سے متعلق انھوں نے راقم کے نام کئی خطوط ارسال فرمائے۔ افسوس ہے، محفوظ نہ رہ سکے۔ تین خط بچ گئے ہیں جو نذرِ قارئین ہیں۔ (محمد اسحاق بھٹی)

(۱)

جمعیۃ علمائے ہند — دہلی

مورخہ ۴ جمادی الثانیہ ۱۳۷۵ھ — ۱۸ جنوری ۱۹۵۶ء

محترم مولانا دام لطفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی — ایک عزیز دوست کی رہنمائی سے الاعتصام مورخہ ۶ جنوری ۱۹۵۶ء ۲۳

کے صفحہ ۳ کا مضمون پڑھا، جو جمعیۃ علمائے ہند کے سپاس نامے کے متعلق تحریر فرمایا گیا ہے۔ اس خادم یا سپاس نامہ[ف] کے متعلق اظہارِ خیال کا بہت شکریہ۔ علمائے ہند کے شاندار ماضی اور سپاس نامے میں (جناب کی نظر اور رائے عالی کے بموجب) جو کچھ کوتاہی ہوئی، اس کی تلافی کی ایک ہی شکل تھی کہ "حضرات علمائے صادق پور" کی جلیل القدر خدمات کا تذکرہ مستقلاً کیا جائے۔ چنانچہ تحریر و تالیف کی حد تک بفضلہ تعالیٰ اس فرض سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ طباعت و اشاعت کی بھی توفیق بخشے۔

ان بزرگوں کی خدمات کے صرف ایک جزو یعنی مالی قربانیوں کے متعلق احقر کا ایک مضمون اسی سال الجمعیۃ کے (غالباً) آزادی نمبر میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

ف ۱۹۵۵ کے دسمبر میں سعودی عرب کے سابق فرماں روا مرحوم شاہ سعود بن عبدالعزیز ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے تھے۔ وہ ۱۷ دن ہندوستان رہے اور مختلف مقامات میں گئے۔ ہندوستان کی کئی انجمنوں اور جماعتوں نے ان کو سپاس نامے پیش کیے۔ جمعیۃ علمائے ہند نے بھی ان کو سپاس نامہ پیش کیا۔ یہ سپاس نامہ یکم جنوری ۱۹۵۶ کو جمعیۃ علمائے ہند کے ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" (دہلی) میں شائع ہوا۔ اس سپاس نامے کا اسلوب کچھ ایسا تھا کہ اس میں جمعیۃ علمائے ہند اور علمائے دیوبند کو ایک ہی شے بتایا گیا تھا اور ملک کی آزادی میں ان حضرات کے علاوہ کسی اور کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ راقم السطور اس زمانے میں ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے ۶ جنوری ۱۹۵۶ کے "الاعتصام" میں لکھا کہ دیوبند اور جمعیۃ علمائے ہند ایک شے نہیں ہے، بعض مشاہیر علمائے دیوبند جنھوں نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا، جمعیۃ میں شامل نہ تھے۔ پھر ملک کی آزادی میں علمائے دیوبند کے علاوہ دوسرے علمانے بھی حصہ لیا اور قربانیاں دی ہیں۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ انداز و اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سپاس نامہ مولانا سید محمد میاں کا تحریر فرمودہ ہے، اس لیے کہ اس کا انداز وہی ہے جو ان کی مشہور کتاب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" کا ہے۔ اس کتاب میں علمائے صادق پور کو بھی مولانا نے نظر انداز کر دیا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم نے یہاں میرے ان ہی الفاظ کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں علمائے صادق پور کا الگ تذکرہ کیا ہے اور کتاب کی تیسری جلد ان ہی کے حالات پر مشتمل ہے۔

یہ تو احقر اور اس کا احساس فرض ہے۔ لیکن معاف فرمایئے اگر جناب والا سے دریافت کروں

(۱) سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی کے متعلق جناب والا کا کیا خیال ہے۔

جناب کے ارشاد کے مطابق مولانا آزاد کا نام تو اس لیے آیا کہ اس سے مفر نہیں تھا،

(اس حسنِ ظن کا بہت بہت شکریہ) مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا اسمِ گرامی کیوں آیا؟

(۲) احقر ان تمام بزرگوں کے حالات تلاش کر رہا ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں حصہ لیا۔ یہ احقر کا خاص موضوعِ تحقیق ہے۔ میں بہت ہی شکرگزار ہوں گا کہ جناب والا کچھ نام اور ہو سکے تو ان کے حالات (مع حوالہ) تحریر فرمادیں۔

(۳) مصنف ایضاح الادلہ قدس اللہ سرہ العزیز کے متعلق جناب کا انکشاف تحقیق طلب ہے۔

نہ صرف احقر بلکہ وہ بزرگ جو اس تحریک کے معتمد ارکان تھے، وہ بھی اس جدید انکشاف سے لاعلم ہیں۔

انکشاف بہرحال ایسا ہی ہونا چاہیے کہ خود صاحب واقعہ کو بھی خبر نہ ہو؟[ؑ۲]

نیازمند

محمد میاں

(۲)

جمعیۃ علماءِ ہند دہلی

۲۲ ربیع الاوّل ۱۳۷۷ھ — ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۷ء

محترم العلامہ دام ظلکم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی — گرامی نامہ مورخہ ۱۲ ستمبر سے احقر مشرف ہوا تھا۔ علماءِ ہند کا شاندار ماضی جناب لی

ؑ۲ اس کا تعلق شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور تحریک مجاہدین سے ہے۔ اس کا جواب راقم نے مولانا سید محمد میاں مرحوم کو اخبار میں نہیں دیا، ایک مفصل عریضے میں عرض کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا مرحوم نے بھی ازراہِ کرم گرامی نامہ تحریر فرمایا۔ پھر اس ضمن میں کچھ عرصہ سلسلۂ مراسلات جاری رہا۔ افسوس ہے وہ خط و کتابت محفوظ نہ رہی۔ البتہ ان خطوط کے مندرجات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ احقر کا پہلے سے تھا۔ جناب کے گرامی نامہ کے بعد ارادے میں وجوب اور فرض کی پختگی پیدا ہو گئی مگر چونکہ تیسری جلد کی تیاری میں دیر ہوئی اس لیے ارادہ جامۂ عمل سے برہنہ رہا ـــــ الحمد للہ تیسرا حصہ بھی مکمل ہو گیا ہے۔ آج جلد ۲ و جلد ۳ بذریعہ رجسٹرڈ بک پوسٹ ارسال کی ہیں۔ رسید سے مطلع فرما کر مطمئن فرمائیں۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ ملاحظہ فرمانے کے بعد آزادانہ رائے عالی کے پیش فرمانے میں تکلف نہ ہونا چاہیے بہتر ہو کہ غلطیوں کا علم ہو جائے تاکہ آئندہ اصلاح کی کوشش کی جائے۔

والسلام

نیاز مند محمد میاں

(۳)

جمعیۃ علماءِ ہند دہلی

یکم اپریل ۱۹۵۸ء

محترم مولانا دام لطفکم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج گرامی ـــــ احقر چندے کے سلسلے میں کلکتہ آیا ہوا ہے۔ گرامی نامہ دہلی سے واپس ہو کر کلکتہ پہونچا حالات سے آگاہ ہوا۔ ارشادِ گرامی کی تعمیل کروں گا (ان شاء اللہ) مگر مبادلہ پر۔ یعنی جناب والا الجمعیۃ کے "امیر الہند" نمبر کو مضمون عنایت فرمائیں۔[۵۳]

دوسری گزارش بہ سلسلہ مبادلہ الجمعیۃ ہے۔ احقر نے ابھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو دہلی لکھ دیا ہے کہ منظور فرمائیں اور اگر کوئی عذر ہو تو جناب کو مطلع فرمائیں۔

محتاج دعا

نیاز مند محمد میاں ۔ بمقام کولوٹولہ اسٹریٹ

---

[۵۳] جنوری ۱۹۵۸ میں راقم نے لاہور سے سہ روزہ "منہاج" جاری کیا تھا، لیکن ان دنوں نئے اخباروں کو اخباری کاغذ آسانی سے نہیں ملتا تھا، کرنافلی کاغذ خریدنا پڑتا تھا، جو بہت مہنگا تھا، اس لیے اپریل ۱۹۵۹ میں "منہاج" بند کر دیا گیا تھا ـــــ میں نے منہاج کا خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا تھا، مضمون کے لیے مولانا سید محمد میاں مرحوم سے بھی درخواست کی، جس کے جواب میں یہ خط آیا۔

...نا مجتبیٰ

ایک حدیث

...ن عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ
...ۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ (مشکوٰۃ، کتاب البیوع)

...حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فرض کی ...کے بعد، ایک فرض، کسبِ حلال کی طلب ہے۔

...اسلام نے مسلمان پر کئی چیزیں فرض کی ہیں، جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً نماز فرض کی ...دن اور رات میں پانچ وقت بہرحال پڑھنی چاہیے۔ انسان تندرست ہو، بیمار ہو، سفر میں ...حضر میں ہو، یہاں تک کہ حالتِ جنگ میں ہو، ہر صورت میں نماز ادا کرنا فرض ہے۔ ...و کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھ کر پڑھنا مشکل ہو تو لیٹ کر پڑھے، نماز پڑھنا ...ے گی۔

اسی طرح اگر تندرست ہو بیمار نہ ہو تو رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے۔ سفر یا عذر ...ورت میں البتہ بعد میں رکھے جا سکتے ہیں۔

اگر صاحبِ نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔

مال دار اور دولت مند ہو تو زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا بھی فرض ہے۔

کلمہ شہادت اور قبولِ اسلام کے بعد یہ اسلام کے بنیادی ارکان اور فرائض ہیں جن پر عمل کرنا ...ل اور ہر صورت میں ضروری ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور فرائض بھی ہیں جو مسلمان پر عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً غریب کی مدد کرنا، ...کے سرپرست شفقت رکھنا، مسکین سے ہمدردی کا برتاؤ کرنا، بیواؤں اور مستحق لوگوں ...ان کی جائز ضرورت کے مطابق روپے پیسے سے امداد کرنا۔ ہمسائے سے حسن سلوک کرنا، معروف ...تال تعاون کرنا، لوگوں سے حسنِ اخلاق سے پیش آنا، مسلمان اجتماعی یا انفرادی طور پر کسی تکلیف

میں مبتلا ہوں تو ان کی تکلیف رفع کرنے کے لیے کوشاں ہونا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا فرض اور بھی ہے، جس کا ذکر اس مختصر سی حدیث میں کیا گیا ہے اور جو دیگر فرائض کے ساتھ وابستہ ہے، اور وہ ہے کسبِ حلال۔! یعنی حلال کی کمائی۔!!

یہ حدیث ایک چھوٹے سے جملے پر مشتمل ہے، لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں اور اچھی خاصی تعداد میں ہیں، جو باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حاجی بھی ہیں، لیکن اس کی کوئی پروا نہیں کرتے کہ ان کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ انھوں نے نماز، روزے اور ذرائع آمدنی کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ وہ چور بازاری کرتے ہیں، سمگلنگ کرتے ہیں، ان کے لینے کے باٹ اور، دینے کے اور ہیں، کاروبار میں جھوٹ بولتے ہیں، قدم قدم پر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں، رشوت لیتے اور دیتے ہیں، اپنی مطلب برآری کے لیے لوگوں سے دھوکا اور فریب کرتے ہیں، دفتروں میں ملازم ہیں اور بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں غلط، خلافِ اسلام اور خلافِ شریعت ہیں۔ لیکن اس کا انھیں قطعاً کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک یہ کوئی گناہ کی بات نہیں، کیوں کہ وہ فرائض بجالاتے ہیں، یعنی نماز پڑھتے ہیں، رمضان کے روزے رکھتے ہیں، حج بیت اللہ کرتے ہیں اور مسجدوں کو چندہ دیتے ہیں۔

حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُو سے محض ان فرائض کی ادائیگی کفایت نہیں کرتی، جب کہ آمدنی کے ذرائع صحیح نہ ہوں اور جس طریقے سے رزق حاصل کیا جا رہا ہے، وہ نقص و عیب سے پاک نہ ہو۔

جس طرح نماز، روزہ اور صاحبِ حیثیت ہونے کی صورت میں حج اور زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح کسبِ حلال، کسبِ حلال کی طلب اور رزقِ حلال کا حصول بھی فرض ہے۔ یعنی فرائض کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس میں کسبِ حلال کی سعی و طلب بھی شامل ہے۔

جو شخص کھانے پینے اور حصولِ رزق میں احتیاط سے کام نہیں لیتا اور جو کچھ سامنے آیا، ہڑپ کر جاتا ہے، بارگاہِ خداوندی میں اس کی دعا کو بھی شرفِ قبولیت حاصل نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص انتہائی خشوع و خضوع سے اور انتہائی عاجزی سے اللہ کے حضور

دعا مانگتا ہے، مگر اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا کھانا پینا اور لباس وغیرہ سب حرام کے ذرائع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے شخص کی دعا کیوں کر قبول ہوسکتی ہے۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اپنے الفاظ اور مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آمدنی کے ذرائع کو معمولی نہ سمجھو، کسبِ حلال کی طلب اور کوشش بھی دوسرے فرائض کی طرح فرض ہے۔ اس کا ہر وقت اہتمام کرو۔ فرائض کی فہرست اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

نقد و نظر

قرآن مجید : اسلامی فکر کا سرچشمہ

مرتب : رشید احمد جالندھری

ناشر : جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

ملنے کا پتا : جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات کی مناسبت سے ملک بھر میں مقالات و مضامین کا جو علمی و تحقیقی سلسلہ شروع ہوا، یہ مجموعہ اس کی ایک درخشاں کڑی ہے۔ اس میں تقریباً ان تمام مقالات کو درج کیا گیا ہے جو جامعہ بلوچستان میں پڑھے گئے۔

مقالہ نگاروں میں آغا اکبر شاہ، مولانا محمد طاسین، مولانا صغیر حسن معصومی، منظور احمد، سید حسین جعفری، آر۔ اے بٹلر اور ہمارے فاضل دوست رشید احمد جالندھری ایسے معروف اور جانے بوجھے اصحاب فکر و دانش شامل ہیں۔ موضوعِ بحث جیسا کہ مجموعے کے نام سے ظاہر ہے، اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قرآنِ حکیم ہی وہ سرچشمۂ علوم و معارف اور گنجینۂ رشد و ہدایت ہے جس نے انسان کو فکر و دانش کی راہ دکھائی، اس میں شرف و ارتقا کے مضمرات کو اجاگر کیا، اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جو تہذیب، اخلاق، علمی جستجو اور طلب و شوق کے داعیات کے اعتبار سے ایک مثالی معاشرہ تھا۔ اور آج جب کہ اسلامی معاشرہ انحطاط پذیر، پراگندہ اور طرح طرح کی اقتصادی و سیاسی الجھنوں کا شکار ہے، صرف اس صورت میں پھر زندگی، آزادی اور اخلاقی و روحانی نشاط آفرینیوں سے بہرہ مند ہو سکتا ہے کہ جب یہ قرآن کو دوبارہ سوچ سمجھ کر پڑھے اور اپنے فکر و عمل کے سانچوں کو قرآن کی تعلیمات کے مطابق ڈھالے۔ یوں تو اس مجموعہ میں مندرجہ تمام مقالات سے قرآن حکیم کی عظمت کے گوناگوں نقوش فکر و نظر کی سطح پر ابھر اور نکھر کر سامنے آتے ہیں، مگر ہم سرِ دست صرف ان تین مقالات ہی پر اظہارِ خیال کریں گے۔

۱۔ قرآن مجید کا تصورِ معاشرہ
۲۔ شریعتِ اسلامی کی تعبیر و تشریح کا مسئلہ
۳۔ قرآن مجید کا فلسفیانہ پہلو

اوّل الذکر مقالہ خاصہ علمی و تحقیقی ہے، اس میں مولانا طاسین نے اس بات کو بدلائل واضح کیا ہے کہ قرآن نہ صرف انسانی زندگی کے تمام اجتماعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، بلکہ ایک مثالی معاشرے کے خدوخال کو بھی متعین کرتا ہے۔ مثالی معاشرہ کن اجزا سے ترتیب پذیر ہوتا ہے، اس پر اس مقالے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

مثالی معاشرے میں بنیادی حل طلب سوال یہ ہے کہ اس میں انسان کے بنیادی حقوق کا کس حد تک تحفظ کیا گیا ہے۔ ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ

"انسان ہونے کی حیثیت سے سب انسانوں کے برابر اور مساوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی حقوق میں سب انسان برابر ہیں" اور قرآن حکیم اسی مساوات کا داعی ہے۔

انسان کے بنیادی حقوق کے تعین میں در اصل دو اشکال پنہاں ہیں:

۱۔ یہ کہ پوری تاریخ انسانیت میں انسان کو بحیثیت ایک انسان اور ایک مستقل بالذات موجود کے اس حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ یہ معاشرہ، تہذیب و تمدن اور اخلاق و اقدار کے اس لگے بندھے ڈھانچے سے الگ تھلگ بھی اپنا ایک وجود رکھتا ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں، مختلف گروہوں، جماعتوں اور اشخاص نے وضع کیا۔ اس کی اپنی کیا خواہشیں، امنگیں اور فطری تقاضے ہیں، جن کی تکمیل ضروری ہے، اس سے کسی نے بھی تعرض نہیں کیا۔

۲۔ یہ کہ اس کے جو بھی بنیادی انسانی حقوق ہوں، سوال یہ ہے کہ ان کی حیثیت محض نصب العینی (IDEAL) تصور کی ہے، جس کے حصول کے لیے ہر معاشرے کو اپنے حالات کے مطابق کوشاں رہنا چاہیے، یا کوئی ایسا عملی نظام (SYSTEM) اور فلسفۂ حیات بھی ہے جس کو اپنا لینے سے یہ حقوق خود بخود اور اپنے آپ حاصل ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک پہلے اشکال کا تعلق ہے، اس کا کوئی تسلی بخش حل انسان پیش نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ ہمیشہ ایک مخصوص معاشرے، مخصوص حالات اور متعین اقدار و اعتقادات کے حصار

ہی میں پلا بڑھا ہے۔ رہا مجرد انسان ، صرف انسان کی حیثیت سے تو وہ کبھی بھی معمورۂ ارض پر پایا نہیں گیا۔ اس لیے اس کے بنیادی حقوق کے تعین میں ضروری ہے کہ ان تعصبات کی چھاپ بہرحال نمایاں ہو جو کسی معاشرے میں پہلے سے رائج و سائر ہوتے ہیں اور جن کو ماننے پر ہر دور میں انسان مجبور رہا ہے۔

اس اشکال کا صرف ایک ہی عملی اور دانشمندانہ حل ہے، جو یہ ہے کہ اگر انسان کی فطرت و کنہہ کے تقاضے ہم براہِ راست معلوم نہیں کر سکتے تو ہمیں اس رب کائنات کی طرف رجوع ہونا چاہیے جس نے انسانی فطرت کی تخلیق کی ہے۔ اس لیے کہ وہی خوب جانتا ہے کہ اس کی مخلوق انسان کیا ہے اور اسے تکمیل و اتمام کی منزلوں کو کیوں کر طے کرنا چاہیے۔ یہ اسلوبِ فکر اس بنا پر زیادہ معقول ہے کہ اگر کسی پیچیدہ مشین کی غرض و غایت معلوم نہ ہو سکے تو ہمیشہ اس کے بنانے والے سے پوچھا جاتا ہے کہ اس مشین کے عمل و انادہ کی کیا صورت ہے۔

مولانا طاسین نے انسان کے بنیادی حقوق کے تعین میں بجا طور پر یہی یقین آفرین راہ اختیار کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن حکیم نے جو اللہ تعالیٰ کا آخری کلام ہے، ایک مثالی معاشرے کی تکمیل کے سلسلے میں کن حقوق و فرائض کی نشان دہی کی ہے۔

دوسرے اشکال کا جواب اس مقالے میں نہیں دیا گیا، اور دراصل اس دور کا سب سے اہم اجتماعی سوال یہی ہے، جس پر تمام علما اور دانش وروں کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کون نظام، سسٹم اور فلسفۂ حیات ہے جس کو اپنا لینے سے انسان کے بنیادی حقوق معاشرے کے ہر فرد کو آپ سے آپ حاصل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں توقع رکھنا چاہیے کہ مولانا آئندہ اپنے کسی مقالے میں اس پر ضرور روشنی ڈالیں گے۔ (محمد حنیف ندوی)

(جاری ہے)

علمی رسائل کے مضامین

اردو نامہ، لاہور — اپریل ۱۹۸۳

قومی زبان کے نفاذ کی دشواریاں	بریگیڈیر (ریٹائرڈ) گلزار احمد
کچھ اصلاحِ لغت کے بارے میں	پروفیسر نیاز عرفان
پاکستان اور اردو	پروفیسر رحیم بخش شاہین
قسمت بہاولپور میں نفاذِ اردو کے اقدامات	عطش درانی
اردو اور تحریک پاکستان	زاہدہ اقبال

برہان، دہلی — مئی ۱۹۸۳

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہمیں اور مسائل و مقاصد (مسلسل)	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
سیرتِ شیخ بوعلی سینا کے بعض پہلو "القانون فی الطب" کی روشنی میں (مسلسل)	حکیم محمد زمان حسینی
بنک سے تعاون اور اس کے انٹرسٹ کا شرعی حکم (مسلسل)	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
عالمِ اسلام میں سائنس کے زوال کے اسباب اور اس کے احیاء کی شرائط	ڈاکٹر عرفان احمد

تدبر، لاہور — فروری ۱۹۸۳

فہمِ قرآن کے چند بنیادی اصول	مولانا امین احسن اصلاحی
فرائضِ دین کی پابندی کا مسئلہ	خالد مسعود
قرآن اور حدیث و سنت کا باہمی تعلق	مولانا امین احسن اصلاحی
تعلق باللہ اور اس کی اساسات	مولانا امین احسن اصلاحی

الحق، لاہور — اپریل ۱۹۸۳

علامہ عبدالعزیز المیمنی اور ادب عربی	ڈاکٹر ابوالفضل بخت رواں
علی گڑھ میں چند روز (مسلسل)	پروفیسر محمد اسلم

مجلۂ تحقیق، لاہور — (خصوصی شمارہ)

جامعہ پنجاب کا مرکس — ڈاکٹر لائٹنر	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
الشاعر الفارس ثابت قطنہ العتکی وشعرہ (عربی)	ڈاکٹر ظہور احمد اظہر
معجزات القرآن والعلم الحدیث (عربی)	ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک
الجذور الفکریۃ للقصۃ والنقد فی الادب الغربی الحدیث (عربی)	عثمان محمد یوسف اسماعیل
آداب اللغۃ العربیۃ فی پاکستان (عربی)	ڈاکٹر محمود محمد عبداللہ المصری
المہدی السودانی فی میزان الاسلام (عربی)	ڈاکٹر عبدالودود شبلی
الاسر فی الجاہلیۃ والاسلام (عربی)	ڈاکٹر احمد مختار البرزہ
حقیقتِ مرگ در نظر مولانا جلال الدین (فارسی)	ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام
کشش در تلفظ فارسی امروز (فارسی)	ڈاکٹر محمد بشیر حسین
نگاہی بہ تاریخ رشیدی و مؤلفش (فارسی)	ڈاکٹر آفتاب اصغر
نامہ و نامہ نویسی در فارسی (فارسی)	ڈاکٹر نسرین اختر
فارسی اور پنجابی کے لسانی روابط	ڈاکٹر محمد بشیر حسین — محمد اسلم رانا
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی دینی وعلمی خدمات	ڈاکٹر ثریا ڈار
سیرت فیروز شاہی	پروفیسر محمد اسلم
شاعری کا اسلامی تصور	مظہر معین
حافظ محمود خاں شیرانی	شیخ سر عبدالقادر
اقبال صاحب	ڈاکٹر سید عبداللہ
پروفیسر مولوی محمد شفیع	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

معارف، اعظم گڑھ — مئی ۱۹۸۳

اسلام اور مستشرقین (مسلسل)	پروفیسر سید حبیب الحق ندوی
حکم اقرأ کے ثقافتی پہلو اور شاہانِ عباسی	ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی
علامہ انور شاہ کشمیری کا قرآنی فہم [illegible]	[illegible]

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن:
مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن، حدیث، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات، تاریخ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے۔ پیرایۂ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اُٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند: تیرھویں صدی ہجری
جلد اول
محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

حیات غالب:
ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے۔

پہلے یہ کتاب "حکیم فرزانہ" ہی کا ایک حصہ تھی۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ "حکیم فرزانہ" کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے۔

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE

CLUB ROAD LAHORE (PAKISTAN)

اگست ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر
محمد اشرف ڈار
اعزازی معتمد

مقامِ اشاعت
ادارۂ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ ، لاہور

طابع و مطبع
ملک محمد عارف
دین محمدی پریس لاہور

فون ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۶ | اگست ۱۹۸۳ | شوال ۱۴۰۳ | شمارہ ۸

ترتیب

تاثرات

نہایت افسوس ہے کہ ۴ جولائی ۱۹۸۳ (۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۳) کو سید شریف احمد شرافت نوشاہی اپنے آبائی گاؤں ساہن پال ضلع گجرات میں وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ۱۳۲۵ھ میں پیدا ہوئے، وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً سنتر سال تھی۔ اس لحاظ سے وہ اگرچہ عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے، لیکن انھوں نے جو علمی اور تحقیقی خدمات انجام دیں اور اپنے انداز کے جس اہم کام میں وہ مصروف تھے، اس کے پیشِ نظر ان کی اس دنیا میں ابھی ضرورت تھی۔ یہ نقطۂ نظر ہم ظاہر بین لوگوں کا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے بالکل صحیح کرتا ہے، ہم اس کے فیصلے کو ماننے پر بہرحال مجبور ہیں۔

مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ نہایت محنت اور لگن سے کام کرتے تھے۔ ان کی وسعتِ کار کا یہ عالم ہے کہ وہ کم و بیش دو سو پچاس کتب و رسائل کے مصنف و مؤلف اور مترجم و مصحح تھے۔ ان کی زندگی ہمیشہ اسی کام کے لیے وقف رہی۔ سب سے اہم خدمت جو انھوں نے سر انجام دی وہ "شریف التواریخ" ہے۔ یہ ان کی ایک ضخیم تصنیف ہے جو آٹھ ہزار صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے سلسلۂ نوشاہیہ کے بارے میں وہ تمام معلومات خاص ترتیب اور پورے اہتمام سے جمع کردی ہیں جو اس سلسلے کے علم و تصوف سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کی چار سو سالہ تاریخ پر محیط ہیں۔

مرحوم کا ذوقِ تحقیق قابلِ تعریف تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا ذاتی کتب خانہ دس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے، ان کے کتب خانے میں اگرچہ ہر موضوع سے متعلق کتابیں موجود ہیں، تاہم زیادہ کتابیں وہ ہیں جو اُن کے خاص موضوع سے مناسبت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں کتبِ مراجع اور مخطوطات بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے احباب و متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

جناب کلیم اختر

قرآنِ حکیم کے کشمیری تراجم

اہلِ جموں و کشمیر کی اکثریت دینِ مصطفوی کے ماننے والوں کی ہے بلکہ کسی زمانے میں یہ ایک اسلامی ریاست تھی۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ خطۂ ارضی مسلمانوں کی سلطنت رہا ہے اور جہاں تک اس ریاست میں تبلیغ اسلام کا تعلق ہے جدید تحقیق کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد جن حکمرانوں کو دعوتِ اسلام دی اور خطوط تحریر فرمائے ان میں کشمیر کا راجہ بھی شامل تھا[1] اس کے بعد جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کا ایک مجاہد ضمیم بن اسامہ کشمیر آیا اور اس نے اسلام کی تبلیغ کی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کشمیر کے رہنے والوں کا دینِ مبین سے تعلق، اسلام کے اوائل ہی سے رہا ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ راجہ ہرش کے عہدِ حکومت میں ۱۰۸۹ء سے ۱۱۰۱ء تک بعض مسلمان کشمیری فوج میں ملازم تھے[2]۔ بعد ازاں کشمیر میں سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا اور حضرت بلال شاہ یا بلبل شاہ کی مساعیِ جمیلہ سے کشمیر میں اسلام پھیلا۔ اسی صدی یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں ایران سے حضرت امیر کبیر سید ہمدانی (شاہِ ہمدان) کشمیر میں تشریف لائے اور ان کی کوششوں سے ۳۷ ہزار کشمیری حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہِ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادے کی کوششوں سے اہلِ کشمیر کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر بہت اچھا اثر پڑا اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے یہ بالکل بجا لکھا ہے کہ "اگر چودھویں صدی میں کشمیر میں مسلمان بادشاہ برسرِ اقتدار نہ آتے اور وہاں کے عوام مذہب اسلام قبول نہ کر لیتے تو نہ معلوم کشمیر کی اس وقت کیا صورتِ حال ہوتی؟ ممکن ہے کہ یہ فنا ہو جاتا

---

[1] رشید تاثیر۔ تاریخِ حریتِ کشمیر حصہ اوّل

[2] آبِ کوثر

لیکن یہ امر یقینی ہے کہ کشمیریوں کی اختراعی قوتیں کبھی بروئے کار نہ آسکتیں اور وہ آرٹ اور ادب کے سلسلے میں اتنی ترقی نہ کر سکتے جتنی کہ انھوں نے اب کر لی ہے۔ مسلمانوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کشمیری نئی تہذیب اور نئے تمدن سے روشناس ہو گئے جس کے باعث وہ اس اقتصادی اور اخلاقی پستی سے نجات حاصل کر سکے جس کا وہ روز بروز شکار ہوتے جا رہے تھے۔ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد وہاں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی [۹۳]

حضرت شاہ ہمدانؒ کے زمانے میں ہی کشمیر میں اسلامی مدارس قائم ہونے لگے تھے۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت میں پہلا قرآنی تعلیمات کا مدرسہ قائم ہوا، بعد میں ان مدرسوں کی تعداد بڑھ گئی۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے قرآنی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے بقول ڈاکٹر سالم قدوائی قرآنِ حکیم کی عربی تفسیر بھی لکھی جس کا مقصد قرآنِ حکیم سے کشمیری مسلمانوں کو آگاہ کرنا تھا۔ بعد میں خود کشمیری علمائے کرام نے قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بہت کام کیا اور تاریخ کے ہر دور میں ہمیں ایسے ایسے کشمیری عالموں کے نام ملیں گے جن کی شہرت برصغیر پاک و ہند سے نکل کر بلادِ اسلامیہ تک پہنچی۔ تذکرہ علمائے ہند اور ہندوستانی مفسرین کے فاضل مولفین مولانا رحمٰن علی اور ڈاکٹر سالم قدوائی نے ان کشمیری علمائے کرام کے نام گنوائے ہیں جنھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں قرآنِ حکیم کے مکمل یا جزوی تراجم اور تفاسیر لکھیں۔ اُن علمائے کرام میں شیخ یعقوب صرفی (فارسی) ۱۵۹۵ء۔ خواجہ معین الدین نقشبندی (عربی) ۱۶۷۴ء۔ صفی الدین کشمیری (فارسی) ۱۶۷۶ء۔ بابا داؤد ملکوتی (عربی) ۱۶۸۵ء۔ ملا محمد سعید (عربی) ۱۷۹۳ء۔ شیخ محمد اسلم بن یحییٰ (عربی) ۱۷۹۷ء۔ شیخ محمد رفیق بن مصطفےٰ (عربی) ۱۸۱۳ء۔ شیخ رضا بن محمد بن مصطفےٰ رفیقی (عربی) ۱۸۶۱ء۔ مُلا عبدالرشید (عربی) ۱۸۸۰ء۔ علامہ تفضل حسینی (فارسی) ۱۸۰۱ء مولانا محمد معین الدین (عربی) ۱۸۹۸ء۔ مولانا محمد انور شاہ کاشمیری دیوبندی (عربی) ۱۹۳۲ء قابلِ ذکر ہیں۔

اہلِ جموں و کشمیر کو قرآنِ حکیم سے جو عشق اور محبت ہے وہ مثالی ہے۔ ان کو نہ صرف

---

۹۳ انصاف ۲۲ مارچ ۱۹۶۲

قرآن حکیم سے عقیدت وارادت ہے بلکہ انھیں آں جناب سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قدر سے بھی والہانہ لگاؤ ہے۔ چنانچہ کشمیر میں ہر نماز کے بعد" اورادِ فتحیہ" نہایت ہی ادب واحترام اور التزام سے پڑھا جاتا ہے۔ کشمیر میں رسولِ مقبول ؐ کی کئی یادگاریں ہیں جن میں موئے مقدس شامل ہے۔ کشمیر میں چوں کہ اعلیٰ درجے کا کاغذ پایا جاتا ہے اور وہاں کا فنِ خطاطی بھی بے مثل ہے، اس لیے کئی ایسی نادر اشیا وہاں موجود ہیں جن پر اسلامی آیات بڑی خوب صورتی سے رقم ہیں۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ قرآن حکیم کے ترجمے کا وہ نسخہ جو شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ہرن کی جھلی پر تحریر کروایا تھا کشمیر ہی میں تیار ہوا تھا۔ روایت ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۶۵۵ء میں جب تخت وتاج سنبھالا تو اس نے قرآن حکیم کا ایک ایسا ترجمہ تیار کرنے کا حکم دیا جس کی خوب صورتی رہتی دنیا تک قائم ودائم رہے۔ اس کام کے لیے کشمیر کے ایک جید عالم مفتی علامہ قریشی کو منتخب کیا گیا اور حضرت بل سے چند میل دور ایک خوب صورت پہاڑی پر ان کے رہنے کا بندوبست کیا گیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے انھیں قرآن حکیم کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی ہدایت کی۔ کشمیر کے عالم اور محقق سید امداد علی شاہ مرحوم کے والد کی بیاض میں اس قرآن حکیم کا ذکر موجود ہے۔ علامہ قریشی نے عربی سے فارسی ترجمے کا کام پانچ سال میں مکمل کیا۔ جتنا عرصہ ترجمے کا کام ہوتا رہا، کاغذ بنانے والے، سونے کے ورق تیار کرنے والے اور سونے سے نقش ونگار بنانے والے اپنے کام میں مصروف رہے۔ قرآن حکیم کا یہ نسخہ ایک مدت تک پاکستان کے مشہور سیاست دان میاں افتخار الدین کے پاس رہا جنھیں ایک ہندو دوست نے بطور تحفہ دیا تھا۔ آج کل یہ نسخہ خان پور کے سلطان گکھڑ کی حویلی میں موجود ہے جسے انھوں نے بہ عوض دس ہزار روپیہ میاں افتخار الدین سے حاصل کیا تھا۔ بہر حال یہ طے ہے کہ اگر میاں صاحب کے لواحقین یہ نسخہ حاصل کرنا چاہیں تو دس ہزار روپے دے کر نسخہ واپس لے سکتے ہیں۔ (جنگ)

اس وقت دنیا کی ہر زبان میں قرآن مجید کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں تھائی زبان میں بھی قرآن مجید کا ترجمہ ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں کلامِ پاک کا ترجمہ ۱۶۴۸ء میں ہوا اور لاطینی زبان میں ۱۱۴۳ء میں ہوا۔ جہاں تک برصغیر میں قرآن مجید کے ترجموں کا تعلق ہے، واقعات اس امر

کے شاہد ہیں کہ بارھویں صدی کے نصف آخر اور تیرھویں صدی کے ربعِ اوّل میں خاندان ولی اللہی نے اہم کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور بعد ازاں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اردو میں تراجم کیے۔ کشمیری زبان میں قرآن حکیم کے ترجمے کا آغاز تیرھویں صدی ہجری میں ہوا۔ اور یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ کشمیری زبان میں نثر کا آغاز بہت بعد میں ہوا، گو شعری تخلیقات کی عمر قدیم ہے۔

کشمیری زبان میں قرآن حکیم کے اولین مکمل کشمیری ترجمے کی سعادت مولانا محمد احمد مقبول سبحانی مرحوم کو حاصل ہے۔ آپ کا آبائی وطن ہاکھورہ ضلع اسلام آباد (کشمیر) تھا، مگر انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارا۔ ایک مدت تک دارالعلوم دیوبند میں بطور مدرس کے مقیم رہے۔ بعد میں مدینہ منورہ اٹھ گئے اور تا مرگ وہیں قیام رہا۔ آپ بہت بڑے عالمِ دین اور عربی زبان و ادب کے ماہر تھے۔ کشمیر میں ان کے دوست مولانا سید عنایت اللہ بخاری مرحوم والدِ ماجد مفتی سید ضیاء الحق بخاری تھے۔ جب کبھی کشمیر جاتے تو ان کے ہاں ہی قیام فرماتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں انھوں نے ممتاز اسلامی مورخ و محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحریک پر قرآن شریف کا کشمیری ترجمہ کیا جو انھوں نے ساڑھے سات ماہ میں مکمل کر لیا۔ یہ ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ "عالم گیر قرآنی تحریک" نے ۱۹۵۰ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ جب پاکستان کے سابق گورنر جنرل ملک غلام محمد مرحوم مدینہ منورہ گئے تو ان کی ملاقات مولانا مقبول سبحانی سے ہوئی جنھوں نے انھیں کشمیری ترجمہ دیا۔ اس سلسلے میں میر عبدالعزیز مدیر انصاف لکھتے ہیں کہ "قرآن حکیم کے کشمیری ترجمے کے پروف کی تصحیح نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی توجہ اس طرف مبذول کی تو صدر صاحب نے وزارتِ مذہبی امور کو حکم دیا کہ اس ترجمے کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔"

قرآن حکیم کا دوسرا کشمیری ترجمہ حضرت مولانا محمد یحییٰ شاہ نے کیا جن کا ۱۹۸۰ء میں انتقال ہوا۔ آپ کا تعلق کشمیر کے ممتاز دینی و مذہبی خانوادہ میر واعظ سے تھا۔ وہ یہ کام پورا نہ کر سکے اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

مولانا محمد یحییٰ شاہ کے بعد کئی علمائے دین نے اس کام کی طرف توجہ دی، مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب

کے باعث وہ اپنا کام مکمل نہ کر سکے۔ اس کے بعد جن بزرگوں نے اس طرف توجہ دی ان میں ایک بزرگ اورینٹل کالج لاہور کے سابق استاد مولانا سید میرک شاہ اندرابی مرحوم تھے۔ انھوں نے اپنی وفات سے قبل اس کے پچیس پاروں کا ترجمہ اور تفسیر مکمل کر لی تھی اور یہ مسودہ ان کے فرزند سید عبدالرشید اندرابی (ماڈل ٹاؤن لاہور) کے پاس موجود تھا۔ چند برس گزرے کہ سید میرک شاہ مرحوم کے بڑے فرزند سری نگر سے پاکستان تشریف لائے تو وہ قرآن حکیم کے اس کشمیری ترجمے کو اپنے ساتھ لے گئے جہاں پر انھوں نے اس کو مکمل کرنے کا عزم کیا۔ گزشتہ دنوں راقم کو سید عبدالرشید نے بتایا کہ ان کے بھائی صاحب نے ترجمہ مکمل کر لیا ہے اور ابھی تک یہ اطلاع نہیں ملی کہ آیا وہ ترجمہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے یا نہیں؟

پاکستان میں کشمیری زبان میں ترجمہ کرنے کی سعادت جس دوسری شخصیت کو حاصل ہوئی وہ میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ مرحوم ہیں۔ مولانا یوسف شاہ مرحوم نہ صرف ایک ممتاز سیاست دان تھے بلکہ بہت بڑے عالم دین بھی تھے اور یہ شرف صرف انہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے قرآن حکیم کا مکمل ترجمہ کر لیا، جسے اُن کے بھتیجے میر واعظ مولوی محمد فاروق نے سری نگر سے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اب تک کئی پارے چھپ چکے ہیں۔ پہلے دس پارے "بیان القرآن المعروف بہ تعلیم القرآن" کے نام سے طبع ہوئے ہیں۔ اس ترجمے کی ایک نقل پاکستان میں میر واعظ مولانا محمد احمد پسر مولانا یوسف شاہ مرحوم کے پاس موجود ہے، جسے یہاں طبع کرایا جا سکتا ہے۔ بلکہ حضرت مولانا مقبول سبحانی صاحب مرحوم کا ترجمہ بھی مفتی سید ضیاء الحق بخاری کے پاس ہے۔ خود مولانا مفتی سید ضیاء الحق بخاری نے بھی قرآن حکیم کا ترجمہ کیا ہے جو کہ مروّجہ کشمیری زبان میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان میں قرآن حکیم کا کشمیری زبان میں ترجمہ کرایا جائے۔ حکومتِ آزاد کشمیر نے کشمیری زبان کو نصابِ تعلیم میں شامل کر لیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں بھی اورینٹل کالج میں شعبۂ کشمیری زبان و ادب قائم کیا ہے جس کے نگران ممتاز کشمیری سکالر ڈاکٹر محمد یوسف بخاری ہیں جو کشمیری زبان میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی اس طرف توجہ دینا چاہیے۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کشمیری زبان میں احادیثِ نبویؐ اور اسلامی کتب کے تراجم ہونے چاہئیں۔ یہ بہت بڑی دینی خدمت بھی ہوگی اور اس سے بھارتی ثقافتی یلغار کو مقبوضہ کشمیر میں روکا جا سکے گا۔

روحِ اسلام اردو ترجمہ سپرٹ آف اسلام

سید ہادی حسن

سید امیر علی کی اس شہرہ آفاق کتاب کا عربی، فارسی اور بعض دوسری اسلامی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام کے اساسی عقاید کی حقانیت اور اس کی عالم گیر تہذیب کی برتری کو عہدِ حاضر کے عقلی و فلسفیانہ معیار پر پرکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسلام نہ صرف اس دور میں جب کہ اس کا ظہور ہوا بلکہ آج بھی انسانیت کے لیے سب سے اعلیٰ اور برتر پیغام ہے۔

اصل کتاب انگریزی زبان کا ایک ادبی شاہ کار ہے۔ سید ہادی حسن صاحب نے کتاب کے اُردو ترجمے میں اس کی ادبی شان کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔

صفحات ۱۶ + ۷۲۴ قیمت ۔۔۔ ۴۵ روپے

اسلام کا نظریۂ حیات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی شہرہ آفاق انگریزی تصنیف "اسلامک آئیڈیالوجی" کا ترجمہ ہے جس میں اسلام کے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کا دوسرے نظریات سے اور اسلامی نظریۂ حیات کا دوسرے نظام ہائے فکر سے مقابلہ کر کے ایک طرف تو مغربی دنیا کو دعوتِ فکر دی گئی ہے او ردوسری طرف خود مسلمانوں کو جمود و بے حسی کے طلسم کو توڑنے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

صفحات ۸ + ۳۹۶ قیمت ۔۔۔ ۲۰ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

ڈاکٹر ثریا ڈار

سید المفسرین شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے اسی سال بعد مغل حکمران محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے چار سال قبل ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (فروری ۱۷۰۳ء) میں یوپی کے ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ "پھلت" میں پیدا ہوئے۔ جہالت اور خود غرضی کے اس تاریک دور میں ایک طرف لوگ حق و انصاف اور مذہب و اخلاق سے بہت دور ہٹ چکے تھے تو دوسری طرف خارجی اور داخلی قوتیں مسلمانوں کی باہمی نااتفاقیوں اور گروہ بندیوں سے فائدہ اٹھا کر دینِ اسلام اور حکومت پر ڈاکے ڈال رہی تھیں۔ اس وقت شدت سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی جلیل القدر عالم، مجاہد اور عظیم مفکر پیدا ہو جو اسلام کے نظامِ عقائد کے احیا اور مسلم معاشرے کی معقول تربیت و اصلاح کے لیے انقلابی روح پھونکے۔ بدنظمی اور انتشار و خلفشار کے اس دور میں حالات کے خطرناک نتائج کو دور رس نگاہوں سے دیکھنے والی شاہ ولی اللہ کی ذات ستودہ صفات تھی۔ جو عارف کامل، شرعی علوم میں محقق امام اور میدانِ حکمتِ عملی کے شاہ سوار تھے۔ آپ برصغیر میں محی السنۃ، وارثِ کمالات نبوت اور حجۃ الاسلام ثابت ہوئے، ان کے فیوض و کمالات سے ملک و ملت اور نظامِ اسلام کو حیاتِ تازہ حاصل ہوئی۔ علم و معرفت کے اس منبع نے پُرآشوب دور اور دردناک حالات میں پیامِ محمدی کی از سرِ نو تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ گویا حضرت ممدوح کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اصلاح و تنظیم تھی۔ مولانا شبلی نعمانی تاریخ علم الکلام میں رقم طراز ہیں:

"ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابنِ رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"[1]

---

[1] علامہ شبلی نعمانی، تاریخ علم الکلام۔ ص ۸۷ - جاوید پریس کراچی، طبع اول

یعنی سترھویں صدی عیسوی کے تاریک اور حوصلہ شکن دور میں ہند کی اسلامی تاریخ میں ایک عظیم مفکر اور مجدد پیدا ہوتا ہے، جس کی نگاہِ دوررس غزالی اور ابنِ رشد کو بھی مات کر دیتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا سلسلۂ نسب والد بزرگوار کی طرف سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب اور والدہ محترمہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے، جس کی توضیح آپ نے اپنے رسالہ "امداد فی ماثر الاجداد" میں اس طرح فرمائی ہے۔

"سلسلۂ نسب این فقیر بامیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ می رسد باین طریق فقیر ولی اللہ ابن الشیخ عبد الرحیم بن الشہید وجیہہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود ..... بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم"[۵]

اسلامی حکومت کے آغاز میں ہندوستان میں وارد ہونے والے اس خاندان کے پہلے بزرگ شمس الدین مفتیٔ رہتک تھے، آپ کے بڑے بیٹے کمال الدین مفتی اور ان کے بعد شیخ عبد الملک، قاضی کبیر الدین، قاضی قاسم اور سب سے آخر میں قاضی قوام الدین عرف قازن بدستور اسی منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ قاضی قوام الدین کے بیٹے محمد کی شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی، لیکن ان کے صاحب زادے شیخ احمد جوانی میں رہتک لوٹ آئے تھے۔ شیخ احمد کے صاحب زادے منصور اور پوتے شیخ معظم بھی جلالتِ علمی میں ممتاز تھے۔ شیخ معظم کے بیٹے شیخ وجیہہ الدین (شاہ ولی اللہ کے دادا) نامور عالمِ دین اور صاحبِ دل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی بھی تھے۔ شاہ وجیہہ الدین کے فرزند شیخ عبد الرحیم اپنے وقت کے متبحر عالم، نامور صوفی اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ وہ ظاہری و باطنی علوم کے حامل اور دنیاوی عقل و فراست میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ دربارِ شاہی سے الگ تھلگ رہ کر درس و ارشاد میں مصروف رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے فقہ حنفی کی جامع کتاب "فتاویٰ عالم گیری" کی ترتیب و تدوین میں ان کو تعاون کی دعوت دی، جسے آپ نے دینی خدمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ گویا اس خاندان کا ہر فرد آسمانِ علم کا مہر جہاں تاب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت اور مجدد ملت شاہ ولی اللہ علمی تبحر، فضل و کمال اور خداداد قابلیت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

---

[۵] شاہ ولی اللہ، امداد فی ماثر الاجداد۔ ص ۱۵۲۔ مطبع احمدی طبع دوم ۱۸۸۴ء

اگرچہ اس جلیل القدر خاندان کا ہر فرد فاضل اور عالم تھا لیکن اس کے گزشتہ اعزاز و اقتدار کو قائم رکھنے اور ان میں ایک نئی روح پھونکنے میں پیش پیش شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ صاحب نے آئندہ نسلوں کی کامیابی کے لیے ایک ایسا بیج بو دیا جو بعد ازاں ان کی ان تھک کوششوں سے بہت پھلا پھولا۔ اس شریف و نجیب خاندان کو دوسرے علمی خاندانوں پر فضیلت و ترجیح بھی آپ ہی کے طفیل نصیب ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب بچپن ہی سے ذہین و فطین، قوی الحافظہ اور بزرگانہ متانت کے حامل تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی کتب پڑھنے کے ساتھ ساتھ مذہبی ارکان و فرائض بھی تدریجاً سیکھ لیے۔ دس سال کی عمر میں فارسی کی نوشت و خواند میں مہارت حاصل کر کے "شرح ملا جامی" اور "شرح الکافیہ" تک پہنچ گئے تھے۔ صرف و نحو پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پندرہ سال کی عمر میں تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام اور منطق وغیرہم کی تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ان تمام علوم میں متعدد کتب و رسائل کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں آپ کی شادی کر دی گئی۔ والد بزرگوار نے مختلف امراض کے غلبے کے باعث آپ کو بیعت و ارشاد کے ساتھ مسندِ درس و تدریس پر فائز کر دیا اور پورے بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کا درس دیتے رہے۔ جیسا کہ آپ نے خود انفاس العارفین میں فرمایا ہے۔

"بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کما بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ مواظبت نمود و در ہر علمی خوض واقع شد"[۳]

شاہ ولی اللہ علماً و عملاً ایک عظیم مفکر اور مجددِ کامل تھے۔ ہندوستان کے عوام و خواص اور اس عہد کے بڑے بڑے اساتذہ اور ماہرینِ فن آپ سے مستفید ہوئے۔ "مدرسہ رحیمیہ" میں بارہ سال تک درس و تدریس میں مشغول رہنے کے بعد ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۱ء میں زیارتِ حرمین شریفین سے سعادت اندوز ہونے کا شوق دل میں جاگزین ہوا۔ خود ارشاد فرماتے ہیں:

"بعد ازاں دوازدہ سال شوق زیارت حرمین محترمین در سر افتادہ"[۴]

۳ۂ شاہ ولی اللہ، الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف۔ ص ۵۔ مطبع احمدی، طبع دوم ۱۸۸۴ء

۴ۂ ایضاً، ص ۵۔

۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۱ء کے آخر میں بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۲ء میں ایک سال وہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں دربارِ قدسی سے آپ پر فیوض و برکات کی بے انتہا بارش ہوئی۔ سفر حرمین کے دوران میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے نامور اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت سے واپسی پر شیخ ابراہیم بن الحسن المدنی سے حدیث مسلسل کی بھی سند و اجازت حاصل کی۔ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۳ء میں بروز جمعہ وطنِ مالوف پہنچ کر دوبارہ والدِ ماجد کے مدرسۂ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سفرِ حج سے قبل تقریباً انتیس سال کی عمر تک تصنیف و تالیف کی بجائے درس و تدریس ہی میں مصروف رہے۔ اب آپ کا تمام وقت درس و تدریس، ترویج کتب و سنت، تلقین معارف و حقائق، مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا۔

حجاز سے واپسی کے بعد تقریباً ۳۲ برس کی عمر میں آپ نے تجدید و احیائے دین کے کام کا آغاز کیا۔ ابھی اصلاحی کام کو شروع کیے ہوئے بمشکل چار سال ہوئے ہوں گے کہ نادر شاہ کے حملے نے ہندوستان کو عموماً اور دارالسلطنت دہلی کو خصوصاً زیر و زبر کر دیا۔ اس دوران میں مسلمانوں کی بے حسی، بے حمیتی اور بے غیرتی انتہا کو چھو رہی تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوئی عملی تحریک تو شروع نہ کی البتہ ایک طویل عرصے تک تعلیم و تربیت کے ذریعے لوگوں کے دلوں کا میل اور دماغوں کا زنگ اتارنے کا ارادہ کیا۔

برصغیر میں عرصۂ دراز سے ہندی مسلمانوں کا یہ طریق کار چلا آرہا تھا کہ وہ قرآن پاک کی تلاوت محض کاروباری برکت کے لیے کرتے یا پھر قرآن پاک کو قسمیں اٹھانے کے لیے استعمال کرتے۔ ہندوستان کے مروجہ نصاب یعنی درسِ نظامیہ میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ حدیث کے علوم کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ فقہ میں مذاہب اربعہ کی کھینچ تان اور باہمی تعصب کا دور دورہ تھا۔ اجتہاد کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ عوام اوہام پرستی، گمراہی اور تباہی و بربادی کے راستے پر گامزن تھے۔

حجاز سے واپسی کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی تحریک کا پہلا قدم قرآن پاک کا فارسی ترجمہ اور اس کی مختصر شرح تھی، جس پر علمائے ہند کی برہمی ارادۂ قتل کی صورت میں آشکارا ہوئی۔ شاہ ولی اللہ نے

اپنی دینی یا سیاسی تحریک کے لیے قرآن کریم کو مشعل راہ بنایا۔

قرآن پاک کا یہ ترجمہ لفظی و معنوی صحت اور احتیاط کے اعتبار سے اب تک بے مثال ہے۔ شاہ ولی اللہ نے علم تفسیر پر بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" بہت کارآمد اور مشہور کتاب ہے۔ اس تفسیر سے فہم قرآن میں جو الجھنیں اور رکاوٹیں تھیں، دور ہو گئیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد علم حدیث کا ذوق و شوق بھی جاتا رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس کو مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لیے از سرِ نو زندہ کیا۔ شاہ صاحب نے سفر حجاز کے دوران میں جلیل القدر اساتذہ سے علوم حدیث کی سند بھی حاصل کی۔ حدیث رسول اللہ ؐ آپ کی غذائے علمی تھی۔ ملفوظات میں شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

"علم حدیث از مدینہ آوردہ، پدر من وقت رخصت از مدینہ استاد خود عرض کرد وادخوش شد کہ ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث۔"[۵]

گویا آپ نے چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر سند حدیث حاصل فرمائی۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ، ان کے جانشین اور تلامذہ وہ علما و فضلائے کرام ہیں، جن کے طفیل ہندوستان میں حدیث نے اتنا بلند مقام حاصل کیا کہ کوئی اسلامی ملک اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

شاہ ولی اللہ اپنے وصیت نامہ "وصیت ششم" میں طریق تعلیم دین کے تحت فرماتے ہیں کہ جب طالب علم کو عربی زبان پر قدرت ہو جائے تو موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ امصمودی پڑھائی جائے۔ اسے کسی حال میں نہ چھوڑا جائے کہ یہ علم حدیث کی اصل و اساس ہے۔ اس کے پڑھنے میں بہت ہی فیض ہے۔"[۶]

حجاز سے واپس آکر آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کیا اور طالب علموں کی کثیر تعداد

---

[۵] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی، ص ۹۳۔ مطبع مجتبائی میرٹھ۔ ذیقعدہ ۱۳۱۴

[۶] ابو اسلم محمد اسمٰعیل گودھروی، وصیت نامہ۔ وصیت ششم۔ ص ۷۔ جامع پریس دہلی، ۱۹۳۲ء

کے باعث مدرسہ رحیمیہ کی وسعت تنگ ہو گئی۔ اس لیے محمد شاہ رنگیلے نے دہلی شہر میں ایک عالی شان حویلی دی، جس میں آپ نے دارالحدیث قائم کیا۔ اس میں ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء تک تشنگان علم حدیث نبوی دور دراز سے جوق در جوق اپنی پیاس بجھانے آتے رہے۔ شاہ صاحب کے درس حدیث اور ان کی کتابوں سے ہندوستان میں ان کے منصب تجدید و احیائے اسلام کی تکمیل ہوئی اور یہی ان کا مقصدِ عظیم تھا۔ تفسیر و حدیث کے بعد شاہ صاحب نے مذاہبِ فقہ اور مسئلۂ تقلید و اجتہاد میں ایک معقول اور متوسط طریق اختیار کیا۔ انھوں نے چاروں مذاہبِ فقہ کے اختلافات کی بنیاد کو واضح کرنے کے لیے ایک کتاب "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" لکھی۔ شاہ صاحب مذاہبِ اربعہ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ انھوں نے نہ جانب داری سے کام لیا اور نہ دوسرے مذاہبِ فقہ پر نکتہ چینی کی۔ اپنی تصنیف "تفہیماتِ الٰہیہ" میں لکھتے ہیں کہ "ابو حنیفہ اور شافعی کے مذاہب زیادہ مشہور ہیں اور مسلمانوں میں زیادہ پیرو بھی ان ہی کے پائے جاتے ہیں۔ کتابیں بھی ان ہی کی زیادہ ہیں۔ فقہا، محدثین، مفسرین، متکلمین و صوفیا زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں اور حکومتیں اور عام لوگ زیادہ تر مذہبِ حنفی پر قائم ہیں۔ اس وقت جو امرِ حق ملاءِ اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کو یک جا کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو دواوینِ حدیث سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے جو اُن کے موافق ہوں، ان کو باقی رکھا جائے اور جس کی کوئی اصل نہ ملے، اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اور دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں، ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور اگر ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کر لیے جائیں اور دونوں پر عمل کرنا صحیح قرار دیا جائے۔"[۵۲]

ان علوم کی ترویج و اشاعت کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے اس نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مرکزی جماعت بنائی۔ اس جماعت کے افراد مولانا محمد عاشق پھلتی، مولوی نور اللہ بڈھانوی اور مولانا محمد امین کشمیری وغیرہم تھے۔ یہ جماعت صوفیا و علما اور امرا و رؤسا کے حلقوں میں رشد و ہدایت اور تعلیم کے ذریعے انقلابی تحریک کی اشاعت کرتی رہی۔

---

[۵۲] شاہ ولی اللہ، تفہیماتِ الٰہیہ۔ جلد اوّل۔ ص ۲۷۹، ۲۸۰۔ مطبع نجبت بعد حیدرآباد ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء

شاہ صاحب بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، مجتہد، متکلم اور صوفی تھے۔ انھوں نے اصولِ عقائد، علم منطق، علم معانی، علم ہندسہ و حساب اور علم ہیئت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے درس و تدریس اور تصانیف سے ہندوستان میں علوم و معارف کے دریا بہا دیے۔ آپ سے بے شمار ملکی اور غیر ملکی حضرات نے استفادہ کیا۔ آپ کی فراوانیِ علم کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم فرماتے ہیں کہ :

"انصاف این است کہ اگر وجودِ او در صدرِ اوّل و زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد۔"[۸]

شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے فرائض منصبی کو نہایت آزادی، مستعدی اور جواں مردی سے انجام دیا۔ آپ نے عزم صمیم کر لیا تھا کہ سرزمینِ ہند میں کتاب و سنت کا ایسا مضبوط علم گاڑ دیا جائے جو کبھی سرنگوں نہ ہونے پائے اور آپ اپنے اس بنیادی مقصد میں کامیاب رہے۔ اس کی تائید میں شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں :

"ہم شاہ صاحب کو محض کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے ورنہ جہاں تک علمی تبحر، دماغی قابلیت، مجتہدانہ نظر، سلیم الخیالی اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے، دنیائے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے، جن سے آپ پیچھے رہے ہیں۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر، حدیث، تصوف، فقہ، تاریخ، علم الکلام غرضیکہ علومِ اسلامی کی کوئی شاخ نہیں، جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو اور اللہ کا فضل ایسا شاملِ حال تھا کہ جس چیز کو ہاتھ لگاتے کندن ہو جاتی ہے۔"[۹]

تاریخِ اسلام میں بہت کم ہستیاں آپ کے پایہ کی گزری ہیں اور ہندوستان میں تو خصوصاً اس مرتبے کا آدمی کوئی ہوا ہی نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں :

"نعمت عظمٰی بریں صفت آنست کہ اورا خلعت فاتحیت دادند و فتح دورۂ بانپسیں بردست

۸؎ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء۔ ص ۴۳۰۔ مطبع نظامی واقع کان پور طبع الاول ۱۲۸۰ھ

۹؎ شیخ محمد اکرام، رود کوثر۔ ص ۵۵۱۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔ طبع ششم

ولے کردند[۱۱۰]

شاہ صاحب کے عہد میں مغلیہ حکومت کے اقتدار کی جڑیں کمزور ہو کر اکھڑتی جا رہی تھیں۔ غیر اسلامی طور طریقوں کو اپنانے، عیش و عشرت کی شمعیں روشن رکھنے اور قومی و ملی وجود کے احساس سے بے گانہ رہنے کے باعث حاکم و محکوم طبقے کے لوگ حد درجہ کمزور، کھوکھلے اور آرام طلب ہو گئے تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحب مسلمانوں کی طرف اژدہوں کی طرح بڑھنے والے گوناگوں خطرات کا الارم دے کر انھیں خبردار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جیسا کہ آپ کے شعر سے واضح ہوتا ہے:

"کان نجوما او مضت فی الغیاھب عیون الأفاعی او رؤس العقارب"[۱۱۱]

لیکن اس کے باوجود مسلمان قوم اپنی کاہلی اور سستی کے باعث خواب خرگوش کے مزے لیتی رہی اور شاہ صاحب مسلمانوں کے دینی و مذہبی وجود کے تحفظ کے لیے اپنا عمدہ اور ٹھوس کام سرانجام دے گئے۔ شاہ صاحب نے سیاسی انحطاط و زوال کے بدترین دور میں دینی علوم کی جس طرح تبلیغ و اشاعت کی، یہ ہندوستان کے مسلمانوں پر خصوصاً اور باقی دنیا کے مسلمانوں پر عموماً شاہ صاحب کا احسان ہے۔ صاحبِ اتحاف النبلا شاہ صاحب کے علم و فضل اور اشاعتِ حدیث کی تعریف میں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

"جناب شاہ ولی اللہ کا علومِ متداولہ میں وہ پایہ تھا، جس کا شمہ بھی بیان کرنے سے انسانی طاقت محض عاجز ہے۔ آپ فنونِ عقلیہ میں وہ دست گاہ رکھتے تھے جس کا عشرِ عشیر بھی دوسروں کو نصیب نہ تھا۔ قطع نظر ان تمام علوم کے حدیث میں اپنے تمام ہم عصروں سے امتیازیہ قوت رکھتے تھے اور اس علم میں مقتدائے وقت اور فرید عصر شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کی تقریر میں اس بلا کا جادو تھا کہ مخالف و موافق پر اس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ ابتدائی زمانے سے اگرچہ آپ کے فضل و کمال کے جھنڈے ایک عالم میں گڑ چکے تھے اور آپ کے نام کا امتیازی پھریرا ہندوستان سے لے کر عرب و عجم تک لہرا رہا تھا لیکن جب آپ عرب کے مقدس و مبارک سفر سے واپس تشریف لائے اور علم حدیث کی اور بھی

---

۱۱۰ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء۔ ص ۴۲۹

۱۱۱ شاہ ولی اللہ، اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم۔ ص ۲۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۳ھ

اشاعت کی نواب آپ اپنی مقبولیت کے سبب سے واقعی ہر دل عزیز ہو گئے اور اعزاز و اقتدار کا آفتاب پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگا۔ حقیقت میں جناب شاہ ولی اللہ کی درس گاہ اس وقت علوم حدیث و تفسیر کا مخزن اور حنفی فقہ کا سرچشمہ تھی۔ اس مقدس اور بلند پایہ علم کی خدمت جس قدر آپ سے وجود پذیر ہوئی، فی الواقع ہندوستان میں کوئی شخص اس کا دعوے دار نہیں بن سکتا۔ "عمل بالحدیث کا بیج ہندوستان کی بنجر اور ناقابل کاشت زمین میں آپ کے والد بزرگ وار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے ڈالا اور آپ نے اپنی ان تھک کوششوں سے اسے یہاں تک سینچا کہ چند ہی روز میں اس کا پودا اُگا اور سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگا اور اس کے پھل پھول سے لوگ جھولیاں بھر بھر کر لے جانے لگے۔ اسے ہندوستان کی بڑی خوش نصیبی کہنا چاہیے کہ جہاں علم حدیث کا نام و نشان تک زبان پر نہ لیا جاتا تھا، آج اس کے گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علم حدیث کے آوازے سنے جاتے ہیں۔"[12]

شیوخ حرم بھی موصوف کی فہم و فراست، شرح حدیث، معانی حدیث اور توضیح مطالب کے قائل تھے۔ چنانچہ شیخ ابوطاہر کردی موصوف کے متعلق فرماتے تھے:

"انہ یسندنی اللفظ وکنت اصحح منہ المعنی۔"[13]

اگرچہ اس جلیل القدر اور محترم خاندان کے ہر فرد کی خوش بیانی، برجستہ گوئی اور فصاحت و بلاغت کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے لیکن شاہ ولی اللہ کا مقام ان سب سے بلند تر ہے، کیوں کہ آپ ان تمام صفات میں غیر معمولی حیثیت کے حامل تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں علوم اسلامیہ کی تاریخ میں ان کا کوئی ثانی و ہمسر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید عبدالحی لکھنوی شاہ صاحب کے حالات کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"الشیخ الامام الھمام، حجۃ اللہ بین الانام، امام الائمۃ، قدوۃ الامۃ، علامۃ العلماء وارث الانبیاء، آخر المجتھدین، اوحد علماء الدین، زعیم المتصلبین بحمل اعباء الشرع المتین، محی السنۃ ومن عظمۃ اللہ بہ علینا المنۃ شیخ الاسلام قطب الدین احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری الدھلوی۔"[14]

---

[12] نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلا۔ ص ۴۱۷۔ ۴۳۰۔

[13] سید عبدالحی لکھنوی، نزہۃ الخواطر۔ جلد ۶، ص ۴۰۴۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن۔ ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء۔

[14] ایضاً، ص ۴۰۶

شاہ صاحب انشا پردازی اور تقریر و بیان میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ آپ کی بلند پایہ کتب، مکاتیب و خطوط اور علمی مناظروں سے آپ کی انشا پردازی کا پتا چلتا ہے۔ تقریر و بیان میں بلا کا جادو تھا۔ بڑے بڑے مناظروں اور علمی مجلسوں میں ان کی فصاحت و بلاغت سے موافق و مخالف عش عش کر اٹھے۔ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی تھی۔ عربی میں آپ کے قصائد اور فارسی میں بعض غزلیں اور رباعیاں موجود ہیں۔ فارسی میں آپ اپنا تخلص امین فرماتے تھے۔ گویا شاہ صاحب کو تمام علوم دینی و دنیوی پر عبور حاصل تھا۔

شاہ ولی اللہ بہت سی عظیم الشان اور اہم علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے ایک سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جو زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکیں بلکہ بعض کتابوں کا تو نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔ ان میں چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد اکاون [۵۱] کے قریب ہے، جن میں سے نصف کتابیں دست یاب ہیں اور باقی ابھی تک نادر اور نایاب ہیں۔ بعض اربابِ تحقیق کے مطابق کچھ ظالموں نے نہ صرف کتابیں لکھ کر شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے منسوب کر کے شائع کیں بلکہ ان کی کتابوں کی عبارتوں کو بھی بدل دیا۔ یوں تو آپ کی تمام تصنیفات بلند پایہ ہیں لیکن ان میں سے سب سے زیادہ مشہور "حجۃ اللہ البالغہ" ہے۔ آپ کی متعدد تصنیفات تفسیر، حدیث، اسرارِ شریعت، تصوف، سیر، عقائد اور مناظرہ میں چھپ چکی ہیں۔

شاہ صاحب کی ہر تصنیف اپنی مثال آپ ہے۔ ظلمت اور تاریکی کے اس دور میں شاہ صاحب اپنے مقصدِ اعلیٰ کو سرانجام دینے کے سلسلے میں ایک مکمل لائحہ عمل مرتب کر گئے۔ اس کے بعد کوئی انقلابی قدم اٹھانا آپ کے بعد میں آنے والوں کا کام تھا، جسے آپ کے صلبی پوتے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید اور دوسرے روحانی پوتے سید احمد شہید نے مناسب وقت پر سرانجام دیا۔

موت ہر چھوٹے بڑے کے لیے مقدر ہے، افسوس ہے شاہ صاحب ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں خفیف سی علالت کے بعد سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہجہان آباد سے جنوب میں پرانی دلی میں مہندیوں کے اندر اپنے والد شیخ عبدالرحیم کے پہلو میں راحت فرما ہوئے۔ اس خاندان کے ہر فرد کے آفتاب علم حدیث ہونے کے باعث یہ قبرستان "محدثین کے قبرستان" کے نام سے بھی مشہور ہے۔

شاہ صاحب کی پوری عمر کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ حیاتِ ولی کے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ جناب شاہ صاحب عمر کے تریسٹھ برس طے کر چکے تو چند روز خفیف سی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱۷۶ھ میں عازم سفر آخرت ہوئے[۱۵] لیکن اس کے برعکس ملفوظاتِ عزیزیہ کے جامع نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا یہ قول نقل کیا ہے:

"عمر شریف یعنی شصت یک سال و چہار ماہ شد چہارم شوال تولد گشت۔ در بست نہم محرم وفات یافت۔ تاریخ تولد شاہ ولی اللہ چہارم شوال و چہار شنبہ ۱۱۱۴ ہجری بود۔ تاریخ وفات او بود امام اعظم دین دیگر ہائے دل روزگار رفت بست نہم محرم وقت ظہر"[۱۶]

اگرچہ سن ولادت و وفات میں کوئی اختلاف موجود نہیں لیکن حیاتِ ولی میں آپ کی عمر تریسٹھ برس لکھی گئی ہے۔ جب کہ آپ کے فرزند گرامی نے آپ کی عمر اکسٹھ برس اور چار ماہ لکھی ہے اور یہی صحیح ترین معلوم ہوتا ہے۔

خداوند کریم نے آپ کو چار مایہ ناز فرزند عطا فرمائے تھے جو ہر لحاظ سے آپ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ (۱) شاہ عبدالعزیز (۲) شاہ رفیع الدین (۳) شاہ عبدالغنی (۴) شاہ عبدالقادر، شاہ ولی اللہ کے ایک اور بیٹے شاہ محمد دہلوی بھی تھے جو چاروں بھائیوں سے مختلف البطن اور سب سے بڑے اخیافی بھائی تھے۔ ان کا ذکر مولوی محسن بن یحییٰ الترہتی نے الیانع الجنی میں اس طرح کیا ہے۔

وکان لعبد العزیز اخ اقدم منه سنا اسمه محمد وکان اخا لابیه اخذ عن ابیه وهو ایضا قدیم الوفاة رحمهم الله تعالیٰ[۱۷]

شاہ ولی اللہ صاحب کا پہلا عقد شیخ عبید اللہ صاحب پھلتی کی صاحب زادی فاطمہ کے ساتھ چودہ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ ان سے ایک صاحب زادے شیخ محمد عاشق صاحب ہوئے۔ اس لیے شاہ محمد کی وجہ سے بعض مقامات پر شاہ ولی اللہ اپنی کنیت "ابو محمد" لکھتے ہیں۔ چنانچہ "الارشاد

---

[۱۵] رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، ص ۵۸۴۔ دین محمدی پریس مارچ ۱۹۵۵

[۱۶] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی۔ ص ۴۰

[۱۷] مولوی محسن بن یحییٰ الترہتی، الیانع الجنی۔ ص ۷۶۔ جید پریس دہلی، ۱۳۴۹ھ

الی مہمات الاسناد (در مطبع احمدی دہلی) کے سرورق پر شاہ ولی اللہ کی کنیت "ابو محمد" درج ہے اور اس کتاب میں اس بات کو ان الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے۔

ولہٗ ولد قبل مولٰنا عبدالعزیز مسمی بمحمد فکنی بابی محمد۔"[۵۸]

۵۸؎ شاہ ولی اللہ، الارشاد الیٰ مہمات الاسناد۔ ص ۲۔ مطبع احمدی۔ سن ندارد

تعلیماتِ غزالی

مولانا محمد حنیف ندوی

فقہ و قانون کی پابندیوں میں اگر احکام و مسائل کی اصل روح مفقود ہو جائے تو یہ پابندیاں تہذیب و تمدن کے لیے طوق و زنجیر بن جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر روح و معنی، فقہ و قانون کی پابندیوں کو گوارا کرنا چھوڑ دے تو اس سے دینی انارکی پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ غزالی کی چشمِ بصیرت نے سب سے پہلے اس خطرے کو محسوس کیا اور احیاء العلوم میں تفصیل کے ساتھ فقہ و تصوف میں رشتہ و تعلق کی جو نوعیت ہے، اس کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

تعلیماتِ غزالی میں احیا کے ان ابواب کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ ہے جن میں کہ غزالی نے ہر ہر فقہی مسئلے کی روح اور حکمت بیان کی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں فاضل مترجم نے مسئلہ تصوف کے جملہ اہم نکات کے بارے میں گراں قدر تشریحات پیش کی ہیں۔ تصوف کیا ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے تصوف کے کیا معنی ہیں؟ اس کی اصطلاحیں کن معانی اور مطالب کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں؟ اس کتاب میں ان تمام سوالات کا آپ کو تسلی بخش جواب ملے گا۔

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

خوابوں کی تعبیر — بحوالہ "بحر الفوائد"

بحر الفوائد فارسی کی ایک دلچسپ، معلومات افزا اور دائرۃ المعارف کے انداز کی کتاب ہے جو چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں شام میں لکھی گئی۔ اس لحاظ سے یہ غالباً پہلی فارسی کتاب ہے جو شام میں تصنیف ہوئی۔ اس میں بیسیوں موضوعات کو لیا گیا ہے اور ہر ہر مقام پر اسے دلچسپ اور پُر تاثیر بنانے کے لیے کہیں قصے کہانیوں، بزرگوں کے اقوال سے اور کہیں احادیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ بات مصنف کے کثیر المطالعہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے موضوعات میں جہاد، حکمت، اخلاق، اوراد، طلب حلال، معالجۂ ذنوب، محاسن شریعت، نوادر علما، اثبات النبوۃ اور تعبیر رویا وغیرہ شامل ہیں۔ افسوس کہ اس عمدہ اور دلچسپ کتاب کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ کتاب اب ایران میں شائع ہو چکی ہے۔ محمد تقی دانش پژوہ نے اسے مرتب کر کے ۱۳۴۵ شمسی میں تہران سے شائع کیا۔ دانش پژوہ کا کہنا ہے کہ اس کے مباحث کی تعداد امام غزالی کی کتاب کیمیائے سعادت کے مباحث سے زیادہ ہے اور یہ کہ مصنف نے اس ضمن میں کیمیائے سعادت سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، فاضل مصنف نے اپنی بات کو دلچسپ اور مؤثر بنانے کے لیے فلسفیانہ چکروں میں الجھنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی کہانیوں یا اقوال سے استفادہ کیا ہے جس کے سبب اس کا قاری کہیں بھی تھکن یا بوریت محسوس نہیں کرتا۔

کتاب خاصی ضخیم ہے اور اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ شائع ہو۔ راقم اس کتاب کا بہت سا حصہ، بفضلہ تعالیٰ اردو میں ڈھال چکا ہے۔ یہاں اس کے ایک باب کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو تعبیر خواب سے متعلق ہے۔ اس میں مصنف نے اکثر جگہ اختصار سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ یہ نہیں کہتا کہ اگر خواب میں فلاں چیز دیکھی جائے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی بلکہ صرف اتنا لکھتا ہے، شیر دشمن ہے۔ تاہم راقم نے کہیں کہیں ایسی عبارات کو واضح کر دیا ہے۔ یہ حصہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے —

(۱) خوابوں کے عجائب (۲) خدا اور رسولؐ کو (خواب میں) دیکھنے کی تعبیر (۳) اعضائے آدمی کی تعبیر (۴) شادی کی تعبیر (۵) درختوں اور پودوں وغیرہ کی تعبیر (۶) اونٹ اور خچر کی تعبیر (۷) بُرے خواب کی تعبیر (۸) گزشتہ لوگوں کے خواب

ابتدائیہ: اس میں کیا حکمت ہے کہ اچھا اور بھلائی کا خواب تو دیر سے عملی صورت اختیار کرتا ہے لیکن شر اور مصیبت سے متعلق خواب کی تعبیر جلد عمل میں آجاتی ہے۔ اس کا جواب (بزرگوں نے یہ) دیا کہ: خدائے بزرگ و برتر غفور اور رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کی خوشی اور رحمت کو عزیز رکھتا ہے۔ اچھا خواب ایک وعدہ ہے اور خوشی کا وعدہ ہے۔ اس لیے کہ جب کسی سے اس بات کا وعدہ کیا جاتا ہے کہ کل اسے خلعت سے نوازا جائے گا تو وہ خوش ہوجاتا ہے اور خدا اپنے بندے کو خوشی کے انتظار میں رکھتا ہے۔ کبھی تو خوشی کے وعدے سے اور کبھی خوشی کی حقیقت سے (یعنی اسے عملی جامہ پہنا کر)۔ اب رہا بُرا خواب تو وہ تو سراسر رنج و بلا ہے، اور خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے مسلسل عذاب میں رہیں، اس لیے اس (بُرے خواب) کو جلد عملی صورت دیتا ہے تاکہ بندے غم سے جلد نجات پا جائیں۔ واللہ اعلم۔

خوابوں کے عجائب

سلمان فارسی نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دونوں ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس کا ذکر حضرت ابوبکر سے کیا۔ وہ بولے: اللہ اکبر، قیامت تک کے لیے میرے ہاتھ اور پاؤں شر اور بدی سے باندھ (محفوظ کر) دیے گئے ہیں۔

کسی شخص نے ابن سیرین سے کہا: ایک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ وہ علما کے منبر پر چڑھ کر خطبہ دے رہا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: اگر اس میں بادشاہی کی اہلیت ہے تو وہ پالے گا، اور اگر وہ اس اہلیت سے عاری ہے تو اسے درخت سے لٹکا دیا جائے گا۔

ایک آدمی نے ابن سیرین سے (اس خواب کی تعبیر پوچھی کہ) میں نے نماز کی اذان دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تو حج کرے گا۔ ایک دوسرے آدمی نے بالکل ایسا ہی خواب دیکھنے کا دعویٰ کیا تو انھوں نے اسے بتایا کہ تیرے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔ شاگردوں نے (حیران ہوکر) پوچھا کہ ایک ہی خواب کی دو تعبیریں؟ عجیب بات ہے۔ انھوں نے اس کا جواب اثبات میں

نے ہوئے فرمایا کہ یہ دونوں باتیں میں نے قرآن کریم کی رو سے کی ہیں ۔ پہلا شخص نیک جبیں تھا اس
،میں نے یہ تعبیر کی " واذن فی الناس بالحج ... (اور لوگوں میں حج کے فرض ہونے کا اعلان کردو،
ے تمھارے پاس چلے آئیں گے ۔) ، جب کہ دوسرے آدمی میں میں نے برائی کی علامت دیکھی،
،لیے میں نے اس آیتِ قرآنی سے اس کی تاویل کی : " فاذن مؤذن ... (ایک پکارنے
لے نے پکارا اے قافلے والو ! بیشک تم چور ہو) ۔
اعشی ہمدانی ایک شاعر تھا ۔ کسی نے خواب میں اُسے جَو کے بدلے گندم بیچتے دیکھا ۔ شعبی
،اس کی تعبیر یوں کی کہ اس نے قرآن وحدیث دے کر شاعری لے لی ہے ۔ عمار جہنی نے
ب میں دیکھا کہ اس کا گھر سانپوں سے بھرا پڑا ہے ۔ اس نے ابن سیرین سے اس کی تعبیر
ھی ۔ انھوں نے کہا : خدا سے ڈر ۔ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہ کر ۔
حسن بصری نے خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور لوگوں کو دوزخ کی طرف ہانکا
ہا ہے ۔ دو فرشتوں نے میرے (حسن بصری کے) بازو پکڑ رکھے ہیں اور وہ مجھے دوزخ
طرف لے جا رہے ہیں ۔ اتنے میں حکم ہوا کہ اسے واپس لے جاؤ کہ یہ جمعے کی نماز باقاعدگی
پڑھا کرتا تھا ۔ حسن کہتے ہیں کہ میں جب نیند سے بیدار ہوا تو ایک ماہ تک میرے ہاتھ
تے رہے ۔
خضر کی ایک آنکھ بند ہوگئی ۔ کچھ عرصے کے بعد وہ آنکھ ٹھیک ہوگئی ۔ ان سے اس کا
ب پوچھا گیا ۔ بولے ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص مجھ سے کہہ رہا ہے : اگر تو
ا ہے کہ تیری آنکھ ٹھیک ہوجائے تو یہ دعا پڑھ ، چنانچہ میں نے اس کی بتائی ہوئی یہ دعا پڑھی :
یب یا سمیع ، یا مجیب الدعاء یا لطیفا لما یشاء ، اردد الی بصری " خدائے بزرگ وبرتر
میری آنکھ کو صحت عطا کر دی ۔
کسائی مقری (قاری قرآن کریم) کو کسی نے خواب میں دیکھا ، اس سے پوچھا کہ خدا نے تیرے
کیا سلوک کیا ۔ اس نے جواب دیا کہ خدا تعالیٰ نے قرآن کی خاطر اور اس کی شفاعت کی بدولت
بخش دیا ۔
حکایت : کسی شخص نے عبداللہ زاہد شمالی سے ، کہ حالتِ مرگ میں تھا ، کہا : اگر تجھ سے

ممکن ہو سکے تو ہمیں اس دنیا کی خبر دینا۔ جب وہ فوت ہوگیا تو ایک مدت کے بعد اُسی شخص نے اسے خواب میں یہ کہتے سنا: معاملہ ہمارے خیال کے برعکس آسان نکلا۔ خدا غفور و رحیم ہے، اس نے میرے گناہ معاف فرما دیے اور میرے جرم سبھی بخش دیے۔ البتہ جو شخص ظلم و ستم میں بہت بدنام ہو، اس کے لیے اس کی رحمت کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

حکایت: امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک قاضی کو شام کی طرف بھیجا۔ وہ آدمی راستے ہی سے لوٹ آیا۔ حضرت عمر نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ سورج اور چاند باہم برسرپیکار ہیں، اور ستاروں میں سے کچھ سورج کے ساتھ ہیں اور کچھ چاند کے ساتھ۔ انھوں نے اس سے پوچھا: تو کس کے ساتھ تھا؟ اس نے جواب دیا چاند کے ساتھ۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا: جا تو گھر جا بیٹھ، تو میری حکومت کے عمل کے لائق نہیں ہے، کیوں کہ تو حق کے ساتھ نہیں تھا بلکہ انتہائی کمزور سے وابستہ تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ شخص (قاضی) فتنۂ صفین میں مارا گیا۔

ایک آدمی نے ابن سیرین سے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دو ٹونٹیوں والے آفتابے سے پانی پی رہا ہوں۔ ایک کا پانی میٹھا ہے اور دوسری کا کھارا۔ انھوں نے جواب میں کہا: خدا سے ڈر کہ تیرے بیوی ہے اور تو اس کی بہن سے بھی صحبت رکھے ہوئے ہے۔ اس آدمی نے اقرار کیا کہ معاملہ ایسا ہی ہے۔

کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ اس نے اپنا پاؤں ایک چوہے کے سر پر رکھ دیا ہے۔ چوہے کے پیٹ سے ایک کھجور باہر نکل آئی اور وہ (چوہا) چھلانگ لگا گیا۔ اس کی تعبیر اسے یہ بتائی گئی کہ تیری ایک نابکار بیوی ہے جس کے شکم میں کسی غیر کا بچہ ہے۔

ایک شخص کا کہنا ہے کہ میں نے خواب میں ایک کوتاہ قد اور سیاہ رو عورت سے شادی کی ہے۔ اس کی تعبیر معبر نے یہ بتائی کہ چہرے کی سیاہی اس کا مال دار ہونا ہے اور کوتاہی (قد) اس کی عمر ہے۔ کسی دوسرے شخص نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انڈے کی سفیدی تو لے رہا ہوں اور زردی ایک طرف پھینک رہا ہوں۔ معبر نے اس کی یہ تعبیر کی کہ تو ایک کفن چور ہے یعنی گور کھنگاف ہے۔ کفن چرا کر تو مردوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

خدا اور رسولؐ کو دیکھنے کی تعبیر

کسی شہر یا ملک میں اگر کوئی شخص خواب میں خدائے بزرگ و برتر کو دیکھتا ہے تو اس شہر یا ملک میں عدل و انصاف، امن اور خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔" لان اللہ ھو الحق المبین" (بے شک اللہ تعالیٰ ایک روشن حقیقت ہے)۔ اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ خدا تعالیٰ اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو سمجھے کہ اس پر وہ رحمت فرمائے گا۔ اگر خواب میں یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تو یہ شخص گناہ گار ہے، اسے توبہ کرنی چاہیے۔ اور اگر کوئی یہ دیکھے کہ خدا نے اسے مالِ دنیا سے کچھ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے رنج و غم ملا ہے۔

ثابت بن حسن بن سہل نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص اس سے کہہ رہا ہے : تیرا خدا تجھے بلاتا ہے۔ اسی سال اس نے زادِ راہ تیار کیا اور حج پر روانہ ہوگیا لیکن راستے ہی میں موت نے اسے آلیا۔

بصرے میں کوئی عشار (عشر لینے والا) تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ اس نے خواب میں کسی شخص کو کہتے سنا کہ غریبوں پر رحمت کرنے والا فرماتا ہے : مَیں تجھ سے بیزار ہوں اور تو مجھ سے بیزار ہے۔

اگر کوئی شخص پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواب میں دیکھے تو اسے غموں سے نجات مل جائے گی۔ اگر کسی شہر میں دیکھے تو وہاں خوشحالی ہوگی۔ اور اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ وہ پیغمبر ہوگیا ہے تو دنیا کی سختیاں اس پر وارد ہوں گی، تاہم عاقبت اس کی بخیر ہوگی۔

اگر کوئی شخص خواب میں خود سلطان یا بادشاہ بنتا دیکھے تو اسے دولت و سلطنت تو ملے گی لیکن اس کا دین ناقص ہو جائے گا۔

خواب میں فرشتوں کو دیکھنا راحت و فرحت کی علامت ہے۔

قیامت کا دیکھنا اس جگہ یا مقام پر عدل و انصاف اور خوشحالی کے ظاہر ہونے کی علامت ہے۔ خود کو بہشت میں داخل ہوتے دیکھنا خیر و آشتی کے ساتھ خوشی ملنے کی علامت ہے۔

خواب میں کوئی پھل کھانا راحت و دولت کی علامت ہے۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر گیا ہے تو اسے عزت و عظمت حاصل ہوگی۔

خواب میں کعبہ کا دیکھنا خلیفۂ وقت بننے کی علامت ہے۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ اس نے قبلے سے منہ موڑ لیا ہے تو یہ سنتِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روگردانی ہوگی۔ خواب میں یہ دیکھنا کہ کعبے کا راستہ میں مل رہا، دین میں حیرت کی علامت ہوگی۔

اگر کوئی یہ دیکھے کہ وہ آگ کی پوجا کر رہا ہے تو وہ شخص یا تو سلطان کی خدمت کر کے خدا کو زار پہنچائے گا یا پھر وہ حرام کا طالب ہوگا۔

قرآن پڑھتے دیکھنا حکمت و دانش کی علامت ہے۔ نماز کی اذان دینا حج کرنے کی علامت ہے۔ اگر کوئی شخص (خواب میں) خود کو قاضی بنتا دیکھے، تو اگر وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتا ور وہ مسافر ہے تو وہ راہزنوں کا شکار ہوگا، اگر مسافر نہیں تو لوگوں کو تکلیف و اذیت دینے میں "مشہور" ہوگا اور اپنی ولایت (شہر) کا امام بنے گا۔

اگر کوئی دیکھے کہ سلطان یا امام کسی شہر کو گئے ہیں تو اس شہر کے لوگوں کو تکلیف اور تاوان کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

سورج، بادشاہ اور سلطان ہے۔ چاند، وزیر ہوگا (یعنی خواب میں ان عناصر کو دیکھنا مرتبے کو پہنچنے کی علامت ہے)

عضلۂ آدمی کی تعبیر

کسی آشنا شخص کو، یا اس کے ہم شکل یا اس کے ہم نام کو خواب میں دیکھا جائے تو اگر وہ نامعلوم ہو تو وہ دشمن ہوگا۔ سر دیکھنا سردار ہونا ہے۔ چہرہ علامت ہے آدمی کی آبرومندی کی۔ سر کے بال، اگر لمبے ہوں، تو یہ آدمیوں کے لیے غم کی علامت ہے۔ خوشبویات و عطریات دیکھنا اچھی تعریف کی علامت ہے۔ گردن (دیکھنا) امانت کی جگہ کی علامت ہے۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ اس کا سر کاٹ ڈالا گیا ہے تو وہ یا تو کسی غلام کو آزاد کرے گا یا پھر رئیس کو معزول کیا جائے گا۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ اس کی ڈاڑھی لمبی ہوگئی ہے تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ یا تو اسے کوئی غم پہنچے گا یا وہ مقروض ہوگا۔

شنوائی اور بینائی آدمی کا دین ہے۔ آواز، آدمی کی ہیبت ہے۔ ماتھا اور ناک، اس (آدمی) کی حرمت ہے۔ زبان آدمی کی ترجمان ہے۔ دانت (دیکھنا) آدمی کا اپنے عزیزوں (کو دیکھنا)

ہے۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ اس کا ایک دانت زیادہ اُگ آیا ہے تو اس کے عزیزوں میں ایک فرزند کا اضافہ ہوگا۔

بازو بھائی یا بیٹے کی علامت ہے، اگر کوئی دیکھے کہ اس کا بازو کاٹ دیا گیا ہے تو یہ کسی بھائی یا دوست کے فوت ہونے کی علامت ہے۔ انگلیاں اس شخص (دیکھنے والے) کے بھتیجوں کی علامت ہیں سینہ، آدمی کا حکم ہے۔ پستان، درخت ہیں۔ شکم، مال ہے۔ جگر، خزانے کی علامت ہے۔ اگر کوئی شخص خود کو درخت سے لٹکا ہوا دیکھے تو یا تو سلطان کی طرف سے اسے کوئی بلند مرتبگی حاصل ہوگی یا پھر اس کے دین میں نقصان ہوگا۔ آدمی کا قدم، مال کی علامت ہے۔ اگر کوئی خواب میں اپنے لباس پر خون دیکھے تو یہ حرام مال پانے کی علامت ہے۔ جسم میں کسی قسم کے اضافے کا مطلب حرام مال ہے۔ دیوانگی اور جسم پر سفیدی دیکھنا ہاتھ لگنے والے مال کی علامت ہے۔

شادی کرنے کی تعبیر

اگر کوئی دیکھے کہ اس کی شادی ہوئی ہے تو اسے کوئی ولایت (ملک، شہر، مراد حکومت حاصل ہوگی۔ اگر وہ دیکھے کہ وہ داماد (دولہا) ہے اور اس نے شادی کی ہے (یا رشتہ مانگا ہے) تو یہ ہلاکت کے خطرے کی علامت ہے۔ اگر کوئی مُردہ عورت سے شادی کرے (یعنی خواب میں) تو اسے کسی مُردے کا مال ملے گا۔

اگر کوئی (خواب میں) خود کو حاملہ ہوتے دیکھے تو اسے دنیا ملے گی۔ اگر وہ دیکھے کہ اس نے لڑکی جنی ہے تو اسے کچھ حاصل ہوگا۔ اگر وہ غلام ہو تو اسے غم پہنچے گا۔

اگر کوئی دیکھے کہ اس نے بیوی کو طلاق دی ہے تو اس کی معزولی ہوگی اور اگر وہ عورت کو دیکھے کہ اس کے سر پر تاج ہے تو وہ شوہر بنے گا۔ اگر بیوی کو داڑھی کے ساتھ دیکھے، تو اگر اس کی کوئی اولاد نہیں ہے تو وہ عورت (بیوی) بانجھ رہے گی، اور اگر اولاد ہے تو اسے ولایت (حکومت) ملے گی۔

اگر مُردوں سے کوئی چیز حاصل ہو تو یہ اچھی علامت ہے۔ اور اگر مردہ کسی سے کچھ لے تو یہ خواب دیکھنے والے کے لیے بُرا ہے۔ اگر کوئی دیکھے کہ وہ مر گیا ہے اور اسے تابوت میں رکھ دیا گیا ہے تو اسے ولایت (حکومت) حاصل ہوگی۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ اسے زندہ درگور کر دیا گیا ہے تو وہ تنگی سے

دو چار ہوگا۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ وہ دوسرے مُردوں کے ساتھ مُردہ ہے تو اسے ایک طویل سفر درپیش ہوگا۔ اگر کسی کو خواب میں یہ نظر آئے کہ مُردہ اسے بلا رہا ہے تو وہ اس کے پاس پہنچ جائے گا (یعنی مر جائے گا)۔

زمین، بیوی (عورت) ہے یا دنیا۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ زمین کو لپیٹ دیا گیا ہے تو اس کا مطلب اس کی زندگی ختم ہونا ہے۔ اگر زلزلہ دیکھے تو یہ سلطان کی طرف سے لوگوں کو کوئی حادثہ پیش آنے کی علامت ہے۔ اگر دیکھے کہ سرائے (مکان، محل) کھود رہا ہے، تو اسے مال حاصل ہوگا۔ اگر اسے ویران و تباہ کر رہا ہے تو غمگین ہوگا۔ پہاڑ، مرد ہے۔ اگر کوئی دیکھے کہ وہ کسی پہاڑ پر کھڑا ہے تو اس نے کسی آدمی پر اعتماد کیا ہے۔

بارش، برکت کی علامت ہے اور جب اس میں کیچڑ اور سیلاب ہو تو یہ غم کی علامت ہے۔ سیلاب دشمن کی علامت ہے اور دریا، بادشاہ کی۔ اگر کوئی دریا سے پانی پیئے، تو وہ بہت سا مال حاصل کرے گا۔ اگر وہ دیکھے کہ وہ پانی کھینچ رہا یا کسی باغ کو پانی دے رہا ہے تو وہ اسی مقدار کے مطابق مال پائے گا یا بیوی (حاصل کرے گا)۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ اس کے گھر میں پانی کا چشمہ جاری ہو گیا ہے تو یہ اس کے لیے مصیبت میں گرفتار ہونے کی علامت ہے۔ گرمابہ (یعنی غسل کرنے کی جگہ۔ حمام) غم کی علامت ہے۔ اسی طرح برف اور اولے (خواب میں دیکھنا) غم اور عذاب کی علامت ہے۔

خواب میں شراب دیکھنا حرام مال کی نشانی ہے۔ اگر کوئی (خواب میں) شراب کی ندی دیکھے تو اسے کوئی مصیبت آئے گی۔ انسانی دودھ حبس اور تنگی کی نشانی ہے۔

درختوں اور نباتات کی تعبیر

خواب میں ہر طرح کے درخت (دیکھنا) آدمیوں کی علامت ہے۔ زیتون کا درخت برکت کی علامت ہے۔ انار کا درخت دیکھنا خواہ مرد دیکھے یا عورت، وہ غم سے دوچار ہوگا۔ زر اور باغ، عورت (بیوی) کی علامت ہے، اسی طرح گلزار دیکھنا بھی عورت (بیوی) کی علامت ہے۔ سیاہ انگور اپنے وقت پر غم و اندوہ کی علامت ہے اور بے موقع (یعنی جب اس کا موسم نہ ہو) دیکھنا بیماری اور خوں کی علامت۔ سفید انگور، مال کی نشانی ہے، اسی طرح سیاہ اور سفید منقیٰ بھی مال ہے۔ پہلے

رنگ کا ہر پھل بیماری کی علامت ہے ۔ نیز زرد آلو اور امرود بھی بیماری کی علامت ہے اور کھٹا پھل غم کی نشانی ہے ۔

تمام ریاحین (پھول) غم واندوہ کی علامت ہیں ۔ کھیرا ککڑی ، ترکاریاں اور شلغم غم واندوہ کی نشانی ہیں ۔ لکڑی دین میں نفاق کی نشانی ہے ۔ ایندھن چغل خور ہے ۔ عصا ایک صاحب شرف آدمی کی علامت ہے ۔ گھاس پھوس بہت زیادہ مال ہے (یعنی اس کی علامت ہے) ، اگر کوئی دیکھے کہ وہ گھر (گھاس پھوس) لے گیا ہے ۔ گیاہ (سبز گھاس) مال کی نشانی ہے ۔ سوکھی اور کھجور روزی کی ۔

سفید لباس دین کے جمال کی اور سرخ لباس عورتوں کی علامت ہے ۔ پیلا لباس بیماری کی ، سیاہ لباس مال اور سرداری کی ، اونی لباس مال کی اور ریشمی اور اطلس کا بنا ہوا لباس سلطان کی علامت ہے ۔ چادر ، حشمت کی ، کلاہ رئیس (سردار ، سربراہ) کی اور عمامہ ولایت (حکومت) کی علامت ہے ۔ رسی (خواب میں دیکھنا) سفر کی نشانی ہے ۔ چٹائی ، دنیا کی علامت ہے ۔ فراش ، عورت (بیوی) کی نشانی ہے ۔ منبر ، سلطان کی ، پردے غم واندوہ کی ، کرسی عورت کی اور جوتی سفر کی علامت ہے ۔

(خواب میں) اسلحہ دیکھنا آدمی کے لیے دشمن کے مقابلے میں ڈھال کی علامت ہے ۔ تیر چلانا باتوں یا خطوط کی علامت ہے ۔ تلوار ، فرزند ہے ۔ اگر غمگین ہو تو بیٹا ہوگا ۔ لوہا ، سلطنت کی علامت ہے ۔ چھری فرزند (اولاد) کی اور زرہ بکتر اور چھوٹا نیزہ آدمی کے لیے پناہ کی علامت ہے ۔

(خواب میں) کمر دیکھنا پشتِ انسانی کی علامت ہے ۔ (پشت بمعنی پناہ بھی ہے) ۔ سونے اور چاندی کا پٹا اور گوہر ولایت (حکومت) کی علامت ہے ۔ مروارید خدا کا کلام ہے ۔ یاقوت ، نیک عورت (بیوی) ہے ۔ انگوٹھی سلطنت ہے اور ممکن ہے بیوی/عورت ہو (یعنی ان چیزوں کی علامت ہے) ۔ سونے کی پازیب ، حبس یا قید (کی علامت) ہے ، چاندی کی ہو تو بہتر رہے گا ۔ اگر خواب میں کسی کو زریں درہم نظر آئیں تو اگر اچھا ہوگا تو بات اچھی ہوگی اور اگر برا ہوگا تو بات بری ہوگی ۔ دیگ اور چراغ گھر کے سرپرست ہیں ۔ طوق ، کفر کی (علامت) ہے اور ممکن ہے بخل کی ہو ۔ آگ ، جنگ ہے ۔ اگر میدانِ جنگ نیچے (؟) ہو تو طاعون اور برسام (ایک بیماری) کی (علامت) ہے ۔ اگر کوئی خود کو اڑتا دیکھے تو وہ سفر کرے گا ۔

گھوڑے اور خچر کی تعبیر

سرکش گھوڑا (دیکھنا) ہوس اور خصومت (کی علامت) ہے ۔ گھوڑی ، جنگ ہے ۔ گدھا نصیبہ

ہے۔ بعض کے نزدیک گھوڑا، سلطان ہے (یعنی سلطان بننے کی علامت ہے)، خچر، سفر ہے۔ اگر کوئی اپنے سواری کے گدھے کو مرتا دیکھے تو وہ شخص خود مرجائے گا۔ اگر کوئی (خواب میں) گدھا خریدے تو اسے مال ہاتھ لگے گا اور ان گنت اونٹ نظر آئیں تو سفر (کی علامت) ہے۔ اگر خواب میں کوئی دیکھے کہ اس نے بہت سے اونٹ خریدے ہیں تو اسے حکومت ملے گی۔ گائے بیل، مال ہے۔ گائے کا گوشت حاکم کا مال ہے۔ اگر بہت سی بھول گائیں دیکھے تو یہ بیماریوں کی علامت ہے۔ اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ وہ گائے دوہ رہا ہے تو اگر وہ غریب ہے تو امیر بن جائے گا اور اگر امیر ہے تو اسے اور مال ملے گا۔

مینڈھا، سلطنت (کی علامت) ہے۔ قربانی (دیکھنا) گردن چھڑانا (یا چھوڑنا) ہے، اگر (خواب دیکھنے والا) غلام ہے تو آزاد ہوگا اور اگر خوف زدہ ہے تو امن میں ہو جائے گا۔ اگر کوئی دیکھے کہ وہ مینڈھے سے دشمنی کر رہا ہے تو یہ علامت ہوگی کسی بڑے آدمی سے دشمنی کرنے کی۔ بکرا بکری، مالِ غنیمت ہے۔ ہاتھی دیکھنا، سلطنت پانے کی علامت ہے۔ اگر خواب میں ہاتھی کو مارے (تو یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ وہ کسی) ایرانی یا غیر عرب پر سختی کرے گا۔ شیر، دشمن (کی علامت) ہے چیتا بھی یہی کچھ ہے۔ یوز (چیتے کی قسم کا ایک درندہ)، ببر اور کتا، کمزور دشمن کی علامت ہیں۔ بھیڑیا، جابر بادشاہ ہے۔ لومڑی، مقروض کی علامت ہے۔ کتیا، گھٹیا عورت (بیوی) ہے۔

مچھلی، مال اور غنیمت (منت) کے مال کی علامت ہے۔ سانپ، چھپا ہوا دشمن ہے۔

طبیب، فقیہ کی (علامت) ہے۔ چوری مردانگی (کی علامت) ہے۔ موچی، میراث عطا کرنے والا ہے۔ زین ساز اور پالان بنانے والا، عورت (کی علامت) ہے۔ جانور بیچنے والا صاحب الطلاق ہے۔ قصاب (دیکھنا) ملک الموت (کی علامت) ہے۔ باورچی وغیرہ چور اور راہزن ہے صورت (مصور) ایک ایسا آدمی ہے جو خدا پر بہتان رکھتا ہے۔ ترکاری فروش، غم واندوہ والا ہے (یعنی علامت ہے غم واندوہ والے کی)۔ جوہری اور مروارید فروش عالم (کی علامت) ہے۔ کہنہ فروش (کباڑی) غم سے نجات پایا ہے، جب کہ خریدار غم والم میں گرفتار ہوتا ہے۔ نور، ہدایت (کی علامت)۔ تاریکی، گمراہی کی۔ ویران جگہ گمراہی ہے۔ بانسری، ڈھول اور رقص، مصیبت (کی علامت)۔ شطرنج، کھوٹی بات ہے۔ نرد، ظلم وستم ہے۔ جن زمانے کے زیرک لوگ ہیں۔ اگر کوئی شخص بدلا

ں کوئی کمی دیکھے تو وہ دین میں کمی (کی علامت) ہوگی۔

رے خواب کے بارے میں

حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی اچھا خواب دیکھتا ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اس پر کرم ہے جو س پر کسی وقت ہوگا، اور اگر بُرا خواب دیکھے تو یہ شیطان کا فعل ہے، اس صورت میں بائیں جانب تین رتبہ پھونک مارنی چاہیے تاکہ شیطان دور ہو جائے۔ علاوہ ازیں "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" پڑھی جائیں۔ ایسا عمل کرنے سے ہر قسم کے نقصان سے بچاؤ ہوگا۔

کسی نادان اور جاہل کو خواب نہیں سنانا چاہیے۔ تاکہ اس موقع پر (نادانی کے باعث) اس کے منہ سے کوئی بُری بات نہ نکل جائے اور پھر وہ اس (بری بات) سے فال لے لی جائے۔ کوئی عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی اور بولی: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے گھر کا ستون گر گیا ہے۔ حضور نے فرمایا، تیرا شوہر ہے؟ بولی: ہاں۔ ارشاد ہوا، کہاں ہے؟ عرض کی: سفر پر گیا ہے۔ فرمایا: انشاء اللہ تیرا شوہر خیر و عافیت سے واپس آئے گا۔ چنانچہ وہ شخص چند روز کے بعد مال و اسباب کے ساتھ گھر پہنچ گیا۔ اِسی خواب کی تعبیر کسی اور سے پوچھی گئی۔ اس نے جواب دیا کہ تیرا شوہر اس دنیا سے کوچ کر جائے گا۔ کسی شخص نے حضور اکرمؐ سے پوچھا: یا رسول اللہ کیا اہلِ بہشت سوتے ہیں؟ ارشاد ہوا: نہیں۔ نیند، موت کی بہن ہے اور اہل بہشت کو موت نہیں ہے۔

گزرے ہوئے لوگوں کے خواب

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عمر کو خواب میں دیکھا ... فرمانے لگے: میں اب حساب سے فارغ ہوا ہوں۔ اگر خدائے بزرگ و برتر کریم نہ ہوتا تو اپنا معاملہ پُر خطر تھا۔

حکایت: عمر عبدالعزیزؒ کہتے ہیں: میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ تشریف فرما دیکھا۔ اسی اثنا میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو بلایا گیا اور انھیں گھر میں داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔ لیکن جلد ہی حضرت علی باہر نکل آئے اور بولے: "قضی لی ورب الکعبۃ" (خدا کی قسم میرے لیے یہی فیصلہ ہوا ہے) مجھے بھی اس نے بخش دیا اور معاف کر دیا۔

حکایت : جعفر صیدلانی کہتے ہیں : میں نے خواب میں رسول (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو چند صوفیوں کے ساتھ تشریف فرما دیکھا۔ اسی اثنا میں آسمان سے دو فرشتے آفتابہ اور طشت لیے اُترے۔ حضورؐ اور ان درویشوں نے ہاتھ دھوئے۔ پھر وہ چیزیں میرے سامنے لائی گئیں تاکہ میں بھی ہاتھ دھولوں۔ ایک فرشتے نے کہا کہ : اسے پانی نہ دو کیوں کہ یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا : یا رسول اللہؐ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ہے : جو کوئی کسی قوم (یا گروہ) سے محبت کرتا ہے وہ انہی میں سے ہے (ان کے ساتھ ہے) اور میں ان لوگوں (درویشوں) سے محبت کرتا ہوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا : یہ ان میں سے ہے۔

کسی نے اوزاعی کو خواب میں دیکھا ، اس نے ان سے پوچھا : کون سا عمل بہتر ہے؟ انھوں نے جواب دیا : میں نے علما کے درجے سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں دیکھا۔ اس کے بعد غم زدہ لوگوں کا درجہ آتا ہے۔

حکایت : کسی نے خواب میں زبیدہ (خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی) کو دیکھا تو اس سے پوچھا: خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے جواب دیا : اللہ نے مجھ پر رحمت فرمائی۔ پوچھا گیا : یہ رحمت اس مال کے بدلے میں تھی جو تو نے خرچ کیا؟ بولی : نہیں۔ اس مال کی اجرت تو اس کے مالکوں کو پہنچی۔ مجھے صرف نیّت کے طفیل بخشا گیا۔

کسی نے خواب میں جنید کو دیکھا اور ان سے پوچھا : خدا نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انھوں نے جواب دیا : اس نے مجھ پر رحمت فرمائی۔ وہ تمام عبارات و اشارات برباد ہوگئے اور ان سے کچھ حاصل نہ ہوا ، سوائے صبح کی دو رکعتوں کے (یعنی ان دو رکعتوں کے سبب بخشش ہوئی)۔

کسی نے خواب میں شبلی کو دیکھا اور ان سے پوچھا : خدا نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انھوں نے جواب دیا : اس نے میرا سخت حساب لیا یہاں تک کہ میں ناامید ہوگیا ، لیکن بعد میں مجھ پر رحمت فرمائی۔

کسی نے استاد سہل صعلوکی کو خواب میں دیکھا تو اُن سے پوچھا : خدا نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انھوں نے جواب دیا : وہ تمام اوراد اور اقوال بے سود ٹھہرے ، سوائے ان مسایل کے جوابوں کے جو لوگ پوچھا کرتے تھے۔

ربیع سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں امام شافعی رضی اللہ عنہ کو دیکھا : میں نے ان سے پوچھا ، خدا نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انھوں نے جواب دیا : مجھے اس نے بہت بڑے شیشے کے ظرف پر بٹھایا اور تر و تازہ موتی مجھ پر نچھاور کیے اور کثرت سے درود و سلام پڑھا اور آپ کے اطراف ...

سید عارف نوشاہی

سلسلۂ قدسیہ کے علما اور مصنفین

سلسلۂ قدسیہ شیخ سعد الدین احمد انصاری کابلی سے منسوب ہے ۔ شیخ موصوف ۱۱۴۰ ہجری میں کابل کے قریب ایک گاؤں "دہ یحیٰی" میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۵ ہجری میں وفات پا کر فضل آباد نزد کابل میں دفن ہوئے ۔ وہ اپنے عہد کے با اثر شیخ، پُر نویس مصنف اور پُر گو شاعر تھے ۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر ۳۲ کتابیں یادگار چھوڑیں، جن کے مخطوطات پاکستانی کتب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ ان کا فارسی دیوان "دیوان شورِ عشق" حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکا ہے ۔

شیخ کے سوانح اور اذکار پر اُن کے ایک ارادت مند مصطفیٰ بن محمد ابراہیم ہروی نے ۱۲۲۳ھ تا ۱۲۲۶ھ فارسی میں ایک جامع کتاب بنام "نشأۃ القدس" تالیف کی، جس کا نہایت مختصر خلاصہ بعنوان "یک مرد بزرگ" باہتمام محمد ابراہیم خلیل کابل سے چھپ چکا ہے ۔ "نشأۃ القدس" کے تین مخطوطات ہمارے علم میں ہیں ۔

۱۔ نسخۂ کتاب خانہ گنج بخش ۔ راولپنڈی نمبر ۴۰۴۵

۲۔ نسخۂ کتاب خانہ مولانا محمد علی، مکھڈ ضلع اٹک

۳۔ نسخۂ کابل جس پر شیخ کی مہر بھی ثبت ہے ۔

یقیناً یہ کتاب ایک فرد کے سوانح نہیں بلکہ اپنے عہد اور بخارا سے لے کر دہلی اور کشمیر تک کے علاقے کی ایک معاشرتی اور علمی تاریخ بھی ہے ۔ انشاء اللہ ہم اس کتاب سے کسی دوسری فرصت میں استفادہ کر کے شیخ کے مفصل احوال و آثار پر مقالہ قلم بند کریں گے ۔ فی الحال شیخ سے جاری ہونے والے سلسلۂ قدسیہ سے وابستہ کچھ مصنفین اور علما کا ذکر مقصود ہے، جن میں سے بعض کا تعلق موجودہ صوبہ سرحد سے ہے ۔

یہ مضمون نشأۃ القدس کے نسخۂ گنج بخش سے تیار کیا گیا ہے ۔

۱۔ شیخ ظہور الدین شنواری : آپ میر سید علی رضا مشہور بہ میاں میر کے مرید تھے جو شیخ سعد الدین

احمد انصاری کے مریدوں میں سے تھے۔ شیخ ظہور اگرچہ اُمّیِ مطلق تھے۔ لیکن تصوف میں ایک کتاب تصنیف کی۔ نشأۃ القدس کی تالیف کے وقت وفات پا چکے تھے۔ (نشأۃ القدس، ص ۲۱۰)

۲۔ خلیفہ محمد قاسم دہ نَوی : دہ نَو کابل کے کوہ دامن میں ایک گاؤں ہے۔ منصبِ افتا پر متمکن تھے۔ تصوف میں ایک کتاب موسوم بہ "نشاط العشق" لکھی۔ نشأۃ القدس کی تالیف کے وقت فوت ہو چکے تھے۔ (نشأۃ القدس، ص ۲۱۵)

۳۔ میاں منیر شاہ پشاوری : نشأۃ القدس کی تالیف کے وقت زندہ تھے۔ مصنف نے ان کا ذکر یوں کیا ہے :

" وہ صحیح النسب سید ہیں اور علومِ شریعت و طریقت اور حقیقت میں جامع ہیں۔ عالم ظاہر میں دو مرتبہ تحصیل فضیلت کی۔ اس کے بعد راہِ طلب میں قدم رکھا اور توکل اور قناعت اختیار کی۔ وہ حقیقت میں پیرزادہ اور صاحب زادہ ہیں۔ ان کے والد بزرگوار شیخِ وقت تھے اور مریدوں اور اخلاص مندوں کی تربیت کرتے تھے۔ ان کا نام میر فرخ سیر شاہ تھا۔ میاں منیر شاہ نے باوجود خود صاحب زادہ اور پیرزادہ ہونے کے حضرت شیخ (سعد الدین احمد) کی خدمت میں حاضر ہونے کو اپنے لیے عار نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنا علم و عمل اور بزرگ زادگی ایک طرف رکھی اور طریقت میں داخل ہو گئے اور طالب صادق اور صوفی صافی بنے۔ سخت ریاضت کی۔ سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ نقشبندیہ دونوں میں عمل و سلوک کی منزلیں طے کیں اور صاحبِ معرفت و یقین ہوئے۔ آپ یگانۂ روزگار، بے نظیر محقق اور مدقق اور اپنے وقت کے موحد ہیں۔ حضرت شیخ نے انھیں خلیفہ بنایا ہے اور اجازت نامہ اور پروانۂ خلافت عطا فرمایا ہے۔

آج کل پشاور میں گوشہ نشین ہیں اور قرآن مجید کے حواشی پر صوفیانہ اسلوب میں دقیق نکات لکھ رہے ہیں۔ اپنے حواشی کے مضمون کا تفسیر عرائس البیان کے نکات سے، جو درحقیقت اہلِ تحقیق کی تفاسیر کا لب لباب ہے، موازنہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کے نکات اور عرائس البیان کے نکات کی عبارت میں فرق ہے لیکن ان کے مضمون میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنا زیادہ تر وقت انھی دقیق قرآنی نکات میں صرف کرتے ہیں۔

ان مستجمع الحسنات اور جامع الکمالات شخص نے تیس سال سے زاید عرصے سے قطعاً گوشت

نہیں کھایا ہے۔ ان کا مشرب محمدی ہے اور اکثر فقر و فاقہ میں زندگی گزار رہے ہیں۔
وہ علم شریعت میں بھی اسی قدر مدقق ہیں اور انھیں خود سے ایسے نادر نکات سوجھتے ہیں کہ اگر انھیں مجتہد کہیں تو بے جا نہ ہوگا"

تصانیف : انھوں نے اپنے مقالات اور رسائل کو مرتب کیا ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔
۱۔ جبر و اختیار کے موضوع پر اُن کے مختصر رسالے کی نظیر نہیں ملتی۔
۲۔ انھوں نے حضرت شیخ (سعدالدین احمد) کے اسمائے متبرک کی صوفیانہ انداز میں تشریح کی ہے۔
۳۔ کتاب دلائل الخیرات کی بھی شرح لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب میں دلائل الخیرات کی شرح لکھ رہا تھا تو مجھے حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک، قاب قوسین ابرو اور مازاغ البصر کے سرمے والی آنکھیں نظر آتی تھیں۔

میں نے (مؤلفِ نشأۃ القدس نے) ان سے سنا ہے کہ وہ اسم ذات کو خلا میں منقش دیکھتے تھے۔ یہ اسم تمام فضا پر محیط ہوتا اور زرہ کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے سے پیوست دکھائی دیتا۔ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ میں (میاں منیر شاہ) آسمانی فرشتوں کی آواز سنا کرتا تھا لیکن مجھے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں اور تسبیح و تہلیل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی اشارات، رموز، حقائق اور دقائق قلم بند کیے ہیں۔ ان کی اکثر باتیں عربی زبان میں ہوتی ہیں۔ (نمونہ حذف کیا جاتا ہے)۔ میرے خیال میں اس وقت حضرت میاں منیر شاہ جیسا کوئی محقق نہیں ہے۔ گویا وہ اپنے زمانے کے امام ہیں اور ان کی مثال نہیں ملتی۔ وہ امام قشیری اور شیخ روزبہان کی مانند ہیں۔ اس وقت (۱۲۲۶ھ) میں بقید حیات ہیں۔" (نشأۃ القدس - ص ۲۲۰ - ۲۲۴ ملخصاً)

۴۔ ملا عبدالحکیم پشاوری : آپ بھی نشأۃ القدس کی تالیف کے وقت زندہ تھے۔ صاحب نشأۃ القدس ان کے بارے میں رقم طراز ہیں : حضرت (سعدالدین احمد) کے خاص مرید اور منظور نظر ہیں۔ صاحب ذوق و شوق اور سوز و گداز ہیں۔۔۔ راقم نے حضرت شیخ کی زبان سے ان کی تعریف سنی ہے۔ وہ سخی اور فیاض ہیں۔ طبابت بالخصوص کحالت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اکثر نابیناؤں کا علاج کیا ہے اور خدا تعالیٰ نے ان کے ہاتھ سے انھیں شفا دی اور بینائی بخشی ہے۔

تصانیف : شعر گوئی اور قافیہ سنجی میں موزوں طبع رکھتے ہیں۔ اپنے رسائل کو مرتب کیا ہے

سلسلۂ قادریہ کا شجرہ منظوم کیا ہے۔

حضرت شیخ کی مدح میں کئی قصائد اور اشعار لکھے ہیں اور انھیں دکھائے ہیں ۔ حضرت شیخ کی ان پر خاص نظر ہے ۔ آپ نے انھیں (ملا عبد الحکیم کو) خلافت سے نوازا ہے اور بخارا اور ترکستان کی ولایت پر بھیجا ہے۔ اب وہ بخارا میں (حضرت شیخ کے) خلیفہ ہیں اور بخارا ہی میں شادی کی ہے ، عیال دار ہیں ۔ البتہ پشاور میں بھی بدستور (خلیفہ ہیں) ۔ کچھ عرصہ بخارا اور اس کے نواح میں گزارتے ہیں اور پھر حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر زیارت کرتے ہیں اور ان سے اجازت لے کر پشاور آجاتے ہیں ۔ وہاں کچھ عرصہ گزار کر کابل آتے ہیں اور حضرت شیخ کی قدم بوسی کرتے ہیں اور اجازت لے کر بخارا چلے جاتے ہیں ۔ اسی طرح ان کی زندگی گزر رہی ہے ۔

ترکستان میں ان کے مریدین اور اخلاص مند احباب موجود ہیں ۔ مثلاً ملا محمد اسماعیل بخارائی جو مدرسۂ چوبین کے مدرس اور بخارا کے مشاہیر میں سے ہیں ، وہ خلیفہ عبد الحکیم کے مرید ہیں ۔ اسی طرح ملا سید خواجہ بخارائی ، ملا عوض بدل بخارائی اور محمد ابراہیم بخارائی بھی خلیفہ عبد الحکیم کے مریدوں میں شامل ہیں --- بخارا کے دیگر اکابر حتیٰ کہ بخارا کے بادشاہ کو بھی ان سے رغبت ہے ۔ سب لوگ ان سے فیض یاب ہو رہے ہیں ۔ راقم الحروف (مؤلف نشأۃ القدس) بھی ان کا احسان مند ہے ۔ انھوں نے کئی بار مجھ پر احسان فرمایا ہے اور فرماتے رہتے ہیں ۔ (نشأۃ القدس ص ۲۲۸ ۔ ۲۳۰ ملخصاً)

۵ ۔ ملا میر حسین پای مناری : پای منار شیخ سعد الدین انصاری کے مدفن دہ یحییٰ سے ایک میل کے فاصلے پر واقع گاؤں ہے ۔ آپ بھی نشأۃ القدس کی تصنیف کے وقت زندہ تھے ۔ مؤلف نے ان کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے : آپ حسینی سادات میں سے ہیں اور حضرت میر شیخ زیور الدین کی بیٹی کی اولاد سے ہیں ۔ صالح اور صاحب ورع و تقویٰ اور طہارت ہیں ۔ علم ظاہر و باطن میں بھی جامع ہیں ۔ طریقت میں مستقیم اور ثابت قدم ہیں ۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے آداب و حقائق پر کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ مثلاً (۱) شرح عقائد صوفیا (۲) دار الشفا (۳) رسالہ المعمور لاہل الحضور (۴) رسالہ بیان الاصطلاحات فی کلام القوم (نقشبندیہ) (۵) مخزن الجواہر (۶) تفسیر لطائف الاسرار ۔

ان کی تالیفات کی تعداد تقریباً بیس ہے ، لیکن یہاں ان کے ناموں کا اندراج موجب طوالت

ہوگا۔

اپنی کتاب مخزن الجواہر میں فرماتے ہیں : الصنم الاعظم و اللات الکبری هی النفس۔

یہ بھی انہی کا قول ہے : الصبر الاستقامۃ فیما امر و ما نهی بل فیما قدر و ماقضی۔

نیز ان کا قول ہے :

الفقر دوام الاحتیاج الی اللہ تعالی و استمرار الاستغناء من الناس ومن تزهد و التی لاهل الکرامات فهو مشرک و الکرامات طاغوته . . .

۷۔ مکتوبات

یہ شعر بھی ان کا ہے ۔

تا ریخت فیض بر سرم از شیخ سعد الدین از بایزید و شبلی و احرار فارغم

(نشأۃ القدس، ص ۲۳۰ - ۲۳۲ ملخصاً)

اکٹر مظفر عباس

مولانا حسرت موہانی ـــ قبولِ عام کی پون صدی

حسرت کے اپنے بیان کے مطابق ان کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۲ء میں ہوا اور ان کی پہلی غزل جو ۱۸۹۱ء کی ہے ، کلیاتِ حسرت کے ضمیمے میں شامل ہے۔ ۱۹۰۳ء میں وہ علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل ہوئے اور اسی سال اپنا معرکتہ آلارا ادبی مجلہ " اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ اگرچہ ان کی شاعری کی شہرت کا آغاز علی گڑھ کالج کے قیام کے دوران میں ہی ہو گیا تھا لیکن ۱۹۰۳ء کے بعد یہ شہرت علی گڑھ کی حدود سے باہر چار دانگ ہندوستان میں پھیل گئی اور ان کی مقبولیت ان کے کئی ایک بزرگ اور تمام معاصر شعرا سے بڑھ گئی۔ اس اعتبار سے حسرت کی مقبولیت کا آغاز آج سے کم و بیش پون صدی قبل ہوا۔ اس دور میں حسرت کی شخصیت اور فن کے بارے میں ان کے ناقدین کی رائے کیا تھی، یہ چند آرا بخوبی اس کی وضاحت کرتی ہیں۔

" تم آدمی ہو یا جن ـــ ! پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے، اور اب بنیے ہو گئے " (مولانا شبلی نعمانی)

" سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کر کے ان کی شان حضرت ابوذرؓ صحابی کی نظر آتی ہے جن کی نسبت رسول اللہؐ نے فرمایا ـــ ابوذرؓ سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی ـــ " (مولانا سید سلیمان ندوی)

" حسرت نے جس وقت غزل گوئی شروع کی اس وقت بھی وہ اپنے رنگ میں منفرد تھے اور اب بھی کہ تغزل کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے، ان کا کوئی ہم سر نہیں ـــ " (علامہ نیاز فتح پوری)

" حسرت کی شاعرانہ فطرت نے ان کی زندگی پر اور ان کے سوانح زندگی نے ان کی شاعری پر اثر ڈالا ہے ـــ حسرت عاشق ہیں تو شاعر ہیں، صوفی ہیں تو شاعر ہیں، مسلمان ہیں تو شاعر ہیں، محبِ قوم و وطن ہیں تو شاعر ہیں، میدانِ سیاست میں گرم رَو ہیں تو شاعر ہیں، گرفتار ہیں، تو شاعر ہیں۔" (پروفیسر حامد حسن قادری)

گزشتہ پون صدی میں اردو تنقید نے ایک طویل سفر طے کیا ہے، زمانہ بدلا، اذہان بدلے خیالات

بدلے، پیمانے بدلے، انداز بدلے، وہ نظریات جنھیں سرآنکھوں پر جگہ دی جاتی تھی، یکسر متروک قرار پائے، نئی آرا قابلِ قبول ٹھہریں، لیکن حسرتؔ کے فن کا کمال اور ان کی شخصیت کی شان یہ ہے کہ اس پورے عرصے میں ان کی مقبولیت و اہمیت میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہوئی، بلکہ قبولِ عام میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے، جس کا ثبوت موجودہ دور کی ان چند آرا میں بخوبی ملتا ہے ــــ

"حسرت کی شاعری کے چہرے پر ایسی سرخی ہے جو شاید ہی کسی اور غزل گو کے چہرۂ شاعری پر نظر آئے۔ اگر میرے کتب خانے سے امیرؔ و داغؔ سے لے کر آج تک کے غزل گو شعرا کے دواوین چوری ہو جائیں، مجھے ہر دیوان کے چوری ہو جانے کا غم ہوگا، لیکن حسرت کے دیوان کے چوری ہو جانے کا سب سے زیادہ قلق ہوگا ــــ" (فراق گورکھپوری)

"غالب کے بعد حسرتؔ پہلے شاعر ہیں جن کو میں اُردو کا سب سے توانا اور صحت مند شاعر سمجھتا ہوں ــــ" (پروفیسر رشید احمد صدیقی)

"حسرتؔ زندگی کے لیے ایک معمہ تھے، لیکن زندگی حسرت کے لیے معمہ نہ تھی... ان کے ذہنی شعور کے ہاتھوں نئی قدروں کی تخلیق ہوتی تھی، وہ نئی دنیا کی تعمیر کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ تنہا تھے لیکن ان کی یہ تنہائی ایک مستقل انجمن تھی ــ" (ڈاکٹر عبادت بریلوی)

"آخری گروپ میں وہ تین شاعر جنھیں میں حقیقی معنوں میں شاعر سمجھتا ہوں، حسرتؔ، فانیؔ اور فراقؔ ہیں ــــ یہ غزل کے لیے پیدا ہوئے ہیں ــــ" (پروفیسر کلیم الدین احمد)

"اگر میں اپنی زندگی میں کوئی قابلِ فخر بات محسوس کرتا ہوں تو صرف یہ کہ میں نے مولانا حسرتؔ کو دیکھا ہے، ان سے باتیں کی ہیں، ان کے ساتھ چند دن پھرا ہوں۔ تحریک پاکستان کے جلسوں میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اُن کے سامنے الٹی سیدھی تقریریں کی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میں نے فتح پور ہسوہ کے اس مدرسے میں تعلیم پائی ہے: جس کے ممتاز ترین طالب علم مولانا حسرتؔ موہانی ہیں ــــ" (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

"ان کے اشعار میں گرم و گداز جذبہ ایک زیریں لہر کی طرح تو سدا موجود رہتا ہے مگر حسرتؔ کی شخصیت کا رکھ رکھاؤ اور تہذیبی انداز اس میں عامیانہ پن پیدا نہیں ہونے دیتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری عشق کے جملہ لوازم سے عبارت ہونے کے باوجود کہیں بھی فحاشی سے ملوث نہیں ہونے پاتی۔"

(ڈاکٹر وزیر آغا)

گویا حسرت کے قبول عام کا سلسلہ پون صدی پر محیط ہے۔ بلکہ پرنسپل عبدالشکور کا خیال تو یہ ہے کہ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک انسان اور کائنات کا تعلق قائم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سوال کیا جاتا ہے کہ کیا حسرت کا کلام ابدی ہے، کیا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ انسان کے خون میں جب تک گرمی اور حرارت موجود ہے، حسرت کی گرماگرم غزلیں اور رنگین اشعار ہمیشہ پسند کیے جائیں گے۔ اس دنیا میں جب تک محبت کی داستانیں زندہ ہیں، اور عشق کا کاروبار قائم ہے، حسرت کے پرستاروں کی تعداد میں کمی واقع نہ ہوگی۔ (پرنسپل عبدالشکور)

لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسرت کے ہاں ایسی کیا کشش ہے جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے اور جو ذہنی بعد اور خیالات میں تبدیلی کے باوجود حسرت کے قبولِ عام پر کوئی زد نہیں آنے دیتی۔ اس سوال کا جواب اگرچہ کافی طویل ہو سکتا ہے لیکن انتہائی اختصار کے ساتھ اس کا جواب صرف ان دو لفظوں میں دیا جا سکتا ہے یعنی حسرت کا عشق — کہ جس کے اظہار کے لیے انھوں نے شاعری کو اور شاعری میں بھی صنف غزل کو ذریعہ بنایا کہ یہ صنف اپنے مزاج کے اعتبار سے حسرت کے موضوع سے ہم آہنگ اور قریب تر ہے۔ اس سلسلے میں حسرت نے اپنے کئی اشعار میں واضح اشارے کیے ہیں:

عشقِ حسرت کو ہے غزل کے سوا — نہ قصیدے، نہ مثنوی کی ہوس
لکھتا ہوں مرثیہ، نہ قصیدہ، نہ مثنوی — حسرت، غزل ہے صرف مری جانِ عاشقاں
سوئیت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک — مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

بلکہ اپنے دیوان کے حصۂ اول (طبع ثانی ۱۹۱۶ء) کے ضمیمے میں اپنے لیے غزل کی صنف کے انتخاب کا اعلان کرتے ہوئے واضح طور پر یہ کہا ہے —

"۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک کی شاعری کا ایک بڑا مجموعہ نظموں، قصیدوں، قطعوں، غزلوں اور نظم انگریزی کے ترجموں کی شکل میں راقم حروف کے پاس موجود ہے جس کی نسبت گمان یہ تھا کہ نظرثانی کے بعد قابلِ اشاعت ہو جائے گا۔ لیکن بعد میں کچھ تو اس خیال سے کہ ابتدائی کلام کی اصلاح و ترقی کی یہ کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق قرار پائے گی اور کچھ اس لحاظ سے

کہ رفتہ رفتہ راقم حروف کی طبیعت نے اپنے لیے اصنافِ سخن میں سے غزل کو اپنے حسب حال پاکر منتخب کرلیا ہے، اس کل مجموعۂ خرافات کو یک قلم نظر انداز کر دیا ہے" (عبارت، خاتمۂ دیوانِ حسرت، حصۂ اوّل (طبع ثانی) متعلق بہ ضمیمہ الف)

اسی طرح جب "اردوئے معلیٰ" میں انھوں نے شعرا کے انتخاب شائع کیے تو صنف غزل ہی کو درخورِ اعتنا سمجھا۔ اس پس منظر میں حسرت کی شہرت ہمارے سامنے ایک تکون کی صورت میں ابھرتی ہے جس کا ایک سرا حسرت ہیں، دوسرا غزل اور تیسرا عشق —— اور ان میں بنیادی اہمیت عشق کو حاصل ہے جس کے اظہار کے لیے حسرت نے غزل کو ذریعہ بنایا۔

میرے نزدیک حسرت کی شاعری کا حسین ترین پہلو اُن کی غزل گوئی اور ان کی غزل گوئی کا حسین ترین پہلو ان کا بیانِ عشق ہے۔ یوں تو ہر دور کے شعرا نے عشق کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور اس کا اظہار اپنے کلام میں مختلف و متنوع انداز سے کیا ہے، مثلاً ولی کا کہنا ہے:

شغل بہت ہے عشق بازی کا   کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

مگر حسرت کا عشق چیزے دیگر ہے کہ وہ عشق کو شغل سمجھ کر نہیں برتتے، ان کے ہاں عشق طرزِ زیست کی حیثیت میں ابھرتا ہے، جو اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے اور جس کا رچاؤ، ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بہت گہرا ہے۔ حسرت نے بارہا اپنے اشعار میں اس جانب اشارے بھی کیے ہیں:

قیدِ مذہب سے بھی کچھ بڑھ کے ہے قیدِ غمِ عشق   حسرتؔ آزاد ہے، کہنے ہی کو، آزاد نہیں

میرا ایمان عجب کیا ہے جو ایمانِ تصوف ہے   تصوف جانِ مذہب، عاشقی جانِ تصوف ہے

لیکن بات سے بات نکلتی ہے اور یہاں پھر یہ سوال مرتب ہوتا ہے کہ آخر حسرت کے عشق میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ سب ہی ان کا دم بھرتے ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف توجیہات ہمارے سامنے موجود ہیں، نفسیات اور دروں بینی کی دُور کی کوڑیاں لائی گئی ہیں، کسی نے انھیں رند شاہد باز تو کسی نے صوفی پاک باز تصور کیا ہے۔ سب باتیں اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن میرے خیال میں حسرت کا کمال صرف یہ ہے کہ وہ سب کچھ ہو کر بھی گوشت پوست کا انسان رہتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کی یہی خصوصیت ہمارے بعض ناقدوں کو کھٹکتی ہے اور وہ حسرتؔ سے

جس نظریہ ساز شاعری کی توضیح کرتے ہیں، جب وہ اس پر پورا نہیں اترتا تو اسے درجہ دوم کے اچھے شاعروں میں شمار کرنے لگتے ہیں، تاہم یہ بھی غنیمت ہے کہ پورا شاعر تو تسلیم کرتے ہیں، وگرنہ ہماری ادبی تاریخ میں ماضی میں بھی اور آج بھی کئی شاعروں کو "نصف شاعر" ہونے کا اعزاز بھی بخشا جاتا رہا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات حسرت کے عشق کی ہو رہی تھی۔ عشق کے خارزار صحرا میں کبھی تپتے جھلستے ریگ زاروں اور کبھی خنک نخلستانوں سے گزرتے ہوئے ایک انسان کا فطری ردِ عمل جو ہونا چاہیے، اور ہوتا ہے، اسی کا اظہار حسرت کی شاعری میں ہوا ہے۔ حسرت کا عشق نہ تو آفاق کی پہنائیوں میں گم ہو جانے والا وہ نغمہ ہے جس کی تھاہ کو کوئی نہ پہنچ سکے، اور نہ ہی وہ بلند آہنگ لے ہے جو کائنات کی وسعتوں میں گونج کر بکھر جایا کرتی ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا نغمہ ہے جو زندگی نیچے سُروں میں گاتی ہے اور جس کا رس کانوں کو حلاوت و شیرینی کے ذائقوں سے آشنا کرتا ہے۔ اور یہی حسرت کے قبول عام و بقائے دوام کا رازِ سربستہ ہے۔

از : احمد منزوی
ترجمہ : سید عارف نوشاہی

اسلامی فقہ پر نو دریافت دو کتابیں

(۱) فقہ بابری (۲) جواہر اوغانی

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، راولپنڈی نے نادر مطبوعات و مخطوطات جمع کرنے اور خریدنے کا کام دوبارہ شروع کر دیا ہے ، اس نے حال ہی میں دو قیمتی مخطوطات خریدے ہیں جو ہمارے خیال میں بے حد کم یاب ہیں ۔ یہاں اختصار کے ساتھ ان کا تعارف کرایا جاتا ہے ۔

۱۔ فقہ بابری (فارسی ۔ نثر)

اس کے مصنف نور الدین بن قطب الدین بن احمد بن زین الدین الخوافی نے اپنا نام دیباچے میں درج کیا ہے لیکن کتاب کے نام کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ۔ البتہ پہلے صفحے پر الحاقی خط میں کتاب کا نام " فقہ بابری " لکھا گیا ہے ۔ مصنف نے اسے " ظہیر السلطنۃ والدنیا والدین محمد بابر پادشاہ " (ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی ۹۳۲ - ۹۳۷ھ) کے نام معنون کیا ہے ۔

دیباچے میں مصنف نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ، اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک نامی خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

" آباء و اجداد این بیچارہ بہ وظائف دعوات درویشانہ ، نسبت بہ خاندان عالی شان آن حضرت اشتغال نمودہ در ظلال عواطف پادشاہانہ این دودمان مرفہ و خوش حال می بودہ اند "[1]

مصنف آگے چل کر لکھتا ہے :

" در اواخر سنہ خمس و عشرین و تسعمائۃ (۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء) بہ قصد دیدار آن پادشاہ و کسب رخصت سفر بہ جانب حرمین شریفین ، پس از سعی بسیار و طی منازل بہ وطن مالوف رسیدہ است و لنا ئشہ تحفہ ای برای مجلس عالی بود کہ حکم جہان رسید کہ کتابی در عبادات بہ زبان فارسی بنگارد "[2]

---

[1] فقہ بابری ، نسخہ کتابخانہ گنج بخش ، مرکز تحقیقات فارسی نمبر ۸۲۲۸
[2] ایضاً

چونکہ ۹۲۵ھ میں بابر کی موجودہ افغانستان پر حکومت تھی، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کا "وطن مالوف" کابل کے آس پاس ہی ہوگا۔

مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں فقہ کی سات کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ہر کتاب کے نام کے لیے اس نے مخفف حروف استعمال کیے ہیں۔ ھ "ھدایہ" کے لیے، ک "کفایہ" کے لیے، شو "شرح وقایہ" کے لیے، ش "شرح مختصر وقایہ" کے لیے، خ "خزانہ" کے لیے، ص "خلاصہ" کے لیے اور ق "فتاوی قاضی خان" کے لیے۔ مصنف نے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کے لیے حرف "ن" استعمال کیا ہے جو اس کے نام کا پہلا حرف بھی ہے اور آخری حرف بھی۔ اگرچہ مصنف کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے اپنی رائے کو حرف "ن" کے تحت فقہا کی رائے سے اس لیے الگ بیان کیا ہے کہ "کسی را در غلط نیندازد" (کسی کو مغالطے میں نہ ڈالے)۔ لیکن اس کا یہی کام اس امر کا پتا دیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا باصلاحیت فقیہ تھا۔

"فقہ بابری" حنفی فقہ کی کتاب ہے اور اس کا متن بہت سنجیدگی کا حامل ہے۔ مصنف نے موضوعات کو "کتاب" عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ ہر "کتاب" ایک "مقدمہ" اور چند "باب" پر مشتمل ہے۔ اور ہر باب چند "فصل" پر مبنی ہے۔ یہ کتاب طہارت کے مسائل سے شروع ہو کر حج کے مسائل پر ختم ہوتی ہے۔ موضوعات کی فہرست نسخے کے شروع میں موجود ہے۔ کتاب کا متن اسی فہرست کے مطابق ہے۔

آغاز: ومن یعتصم باللہ فقد ھدی۔ مندوب ترین فرضی کہ فقہای این پرور، کہ سالکان مسلک سعی و اجتہادند۔

یہ نسخہ پختہ نستعلیق میں لکھا گیا ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی ہجری سے متعلق ہے۔ پہلے ورق پر لطف اللہ کی مہر بھی ثبت ہے جس میں تاریخ ۱۲۰۱ھ کندہ ہے۔ کاغذ سمرقندی ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ نسخہ مکمل ہے۔ صرف ترقیمے کا آدھا حصہ موجود نہیں ہے۔ کل اوراق ۲۴۴ ہیں۔ آثار بتاتے ہیں کہ اس نسخے کے کاتب کا وطن افغانستان تھا۔[1]

---

[1] فقہ بابری کا دوسرا نسخہ خدا بخش لائبریری۔ بانکی پور میں ہے۔ اس کتاب پر قدرے تفصیلی مضمون مولانا محمد اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب "برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ" میں تحریر کیا ہے۔ (مترجم)

۲- جواہر اوغانی

مصنف عبداللہ نیازی، جس کے عہد کا علم نہیں ہو سکا۔ اگرچہ مصنف نے " رسالہ مخدومنا ضیاء الملۃ والدین السنامی " سے اقتباسات دیے ہیں۔ لیکن یہ سنامی، خواجہ نظام الدین اولیا (م ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) اور نخشبی (م ۷۵۱ھ/ ۱۳۵۰ء) کے معاصر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ مصنف نے اس میں متعدد بار متأخر کتب سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ یا تو لفظ " مخدومنا " کا استعمال صحیح نہیں ہوا یا یہ کوئی دوسرے سنامی ہیں۔ مصنف نے اپنے جو ماخذ دیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب " تفسیر حسینی " (ملا کاشفی نے ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۲ء میں لکھی) سے بعد میں اور گیارھویں صدی ہجری سے پہلے تالیف کی ہے جیسا کہ کتابت اور خط سے معلوم ہوتا ہے۔

کتاب کا نام مقدمے اور خاتمے میں درج ہے لیکن مصنف کا نام صرف خاتمے میں مذکور ہوا ہے۔ مضامین کی تقسیم پچاس " جوہر " پر ہوئی ہے، جن میں سے بعض چند " درہ " یا " فصل " یا " باب " پر مشتمل ہیں۔ مصنف نے معروف کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور ان کا حوالہ دیا ہے۔ جہاں عربی عبارت تھی، اسے عربی ہی میں رہنے دیا ہے۔ اکتیسویں جوہر میں مصنف نے سماع کی تردید میں ایک مکمل عربی رسالہ " قامع البدعۃ لنصرۃ الائمۃ الاربعۃ " درج کیا ہے جو ایک مقدمہ، چند فصل اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کے مصنف کا نام دیباچے میں مذکور نہیں اور نہ ہی اس کی ابتدائی عبارت رسالہ " قامع البدعۃ فی نصرۃ السنۃ " تالیف محی الدین محمد بن امیر حسینی معروف بہ سید عاشق کے ابتدائی کلمات سے ملتی ہے۔ مؤخر الذکر رسالے کا نام کشف الظنون میں موجود ہے[۲۵]

مضامین (جواہر) کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) ایمان (۲) طہارت (۳) صلاۃ (۹ درے)۔ (۴) زکوٰۃ (۵) صوم (۵ درے)۔ (۱۰) امر بہ معروف و نہی از منکر (۱۵) تقوی و صفات متقین (۲۰) خدمت و شرکت در امور حکومت (۲۵) لباس (۳۰) الابق والمکاتب (۳۵) صید و کشتار (۴۰) آفرینش جہان (۴۵) حرمت

---

[۲۵] کشف الظنون جلد ۲ صفحہ ۱۳۰۶ مطبوعہ استنبول

خمر و بنگ و افیون (۵۰) حدود و تعزیزات - خاتمہ در سعت رحمت پروردگار -

آغاز: الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ و آلہ واصحابہ ..... اما بعد مفسران می فرمایند کہ " با " بسم اللہ باب خزانہ حق است ... اما بعد جواہری چند معاون [۵]

یہ نسخہ خط نستعلیق میں گیارھویں صدی ہجری کے شروع میں لکھا گیا اور تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے -

---

۵ جواہر اوغانی - نسخہ گنج بخش، نمبر ۸۱۹۲ ——— [اسی مصنف (نیازی) کی فقہ پر ایک اور کتاب " نوادر اوغانی " جو دس ابواب پر مشتمل ہے، کا مخطوطہ مدنی مسجد راولپنڈی میں موجود ہے - عبداللہ نیازی کی فقہ پر ایک اور فارسی کتاب " تحفۂ زمانی " کا قلمی نسخہ قومی عجائب گھر پاکستان - کراچی (مخطوطہ نمبر ۱۹۶۱ - ۶۵۹) میں موجود ہے - یہ کتاب ۱۲ فصول پر مشتمل ہے اور بدعت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، ذکر امر بالمعروف، نکاح، عقیقہ، سرود وغیرہ کے مسائل پر بحث کرتی ہے - یہ تمام مسائل اہلِ سنت کے فقہی نقطۂ نظر سے پیش کیے گئے ہیں - مذکورہ مخطوطہ رجب ۱۰۸۶ھ میں کتابت ہوا -

کتب کے نام، مصنف کے نام، موضوع اور زمانہ تالیف میں پائی جانے والی چنداں یکسانیت کے باعث یہ امر قرینِ حقیقت معلوم ہوتا ہے کہ جواہر اوغانی، نوادر اوغانی اور تحفۂ زمانی کا مصنف ایک ہی شخص ہے -

---

پروفیسر محمد صدیق

پروفیسر خواجہ محمد اسلم مرحوم

ایک ممتاز ماہرِ تعلیم

اسلامیہ کالج لاہور کے اساتذہ کی طویل فہرست میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں، پروفیسر میاں محمد شریف، کرنل محمد اسلم، پروفیسر حمید احمد خان، پروفیسر علم الدین سالک، پروفیسر عمر حیات ملک، پروفیسر عبدالبشیر آفریدی، پروفیسر ابوالخیر عبداللہ، ڈاکٹر سعید اللہ، پروفیسر عبدالحمید بیگ، پروفیسر محمد نصیر، خواجہ محمد صدیق، پروفیسر یوسف جمال انصاری، سید ابوبکر غزنوی، پروفیسر فیض الحسن بخاری، پروفیسر اعزاز الحسن نقوی۔ یہ سب حضرات اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اور اب پروفیسر محمد اسلم بھی ۲۰ اپریل ۱۹۸۳ کو اس عالم آب و گل سے منہ موڑ کر عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خواجہ محمد اسلم لاہور کے ایک علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ یکم اپریل ۱۹۱۰ء کو خواجہ محمد امین کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ اس کالج سے ۱۹۲۸ء میں ایف اے اور ۱۹۳۰ء میں بی۔ اے آنرز کے امتحانات درجہ دوم میں پاس کیے۔ ۱۹۳۲ء میں اسی کالج کے ذریعے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اقتصادیات درجہ سوم میں پاس کیا۔

خواجہ صاحب مرحوم ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۸ کو ۷۵ روپے ماہوار تنخواہ پر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں انگریزی زبان و ادبیات کے جز وقتی استاد مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں پروفیسر ایم۔ اے غنی مرحوم کالج کے پرنسپل تھے۔ یہ عارضی آسامی ۲۳ ستمبر ۱۹۳۹ کو کالج کمیٹی، انجمن حمایت اسلام لاہور، منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۳۹ کی روداد نمبری ۱۴۰ کے ذریعے ۲۰۰-۱۰-۱۲۰ کے پے سکیل (pay scale) میں منتقل کر دی گئی۔ اب خواجہ صاحب نے انگریزی اور اقتصادیات ہر دو مضامین کی تدریس شروع کر دی۔

مرحوم نہایت محنت اور لگن سے نوجوان نسل کے ذہنوں کی آب یاری کرتے رہے۔ وہ تعلیم کو تہذیب ذہن کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ اور اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کو دو جداگانہ کالجوں کی حیثیت حاصل ہوئی تو وہ پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کے ساتھ اسلامیہ کالج سول لائنز کے صدر شعبۂ اکنامکس کی حیثیت سے اس کالج میں آگئے۔ ۱۹۶۲ء تک یہیں رہے۔ انھوں نے اس کالج کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے لیے بے حد کوشش کی۔

کرنل محمد اسلم کی وفات کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۶۲ کو وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے پرنسپل مقرر کر دیے گئے۔ جب پروفیسر حمید احمد خان (پرنسپل اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور) جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر بنا دیے گئے تو ۴ ستمبر ۱۹۶۳ کو پروفیسر خواجہ محمد اسلم کو اسلامیہ کالج سول لائنز کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ وہ یکم ستمبر ۱۹۷۲ تک اسی عہدہ پر فائز تھے کہ تمام کالج قومی تحویل میں آگئے۔ ان کی عمر ۷۰ سال ہو چکی تھی۔ وہ ریٹائرڈ کر دیے گئے، حالانکہ ۱ نومبر ۱۹۶۹ کو انجمن حمایتِ اسلام لاہور کی جنرل کونسل کے ریزولیوشن نمبر ۱۶۵ کے ذریعے، ان کی خدمات، عمدہ صحت اور اعلیٰ تجربے کی وجہ سے ان کی ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۰ سال سے بڑھاکر ۷۰ سال کر دی گئی تھی۔ انجمن کے ساتھ ان کا باقاعدہ تحریری معاہدہ موجود ہے۔ یہ معاہدہ کوئی مفید ثابت نہ ہوا۔ اس بات کا انھیں شدید صدمہ تھا۔ اسلامیہ کالج کی تاریخ میں ان کی پرنسپل شپ کا زمانہ طویل ترین عرصے پر محیط ہے۔

اسلامیہ کالج کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی شعبۂ اقتصادیات اور شعبۂ سیاسیات میں بھی ایک زمانے تک ایم۔ اے کی کلاسوں کو پڑھاتے رہے۔ انھیں ان مضامین پر عبور حاصل تھا، جس کی بنا پر وہ طلبا و طالبات میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

خواجہ صاحب کا قد درمیانہ، رنگ گورا سرخ و سفید، ہر لحظہ متحرک، روشن آنکھیں، پیشانی شگفتہ بارعب لب و لہجہ، بہترین انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور گہری سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ ان کا اردو اور انگریزی کا خط (HAND WRITING) ان کی شخصیت کی مانند خوب صورت تھا۔ تحریر بھی شخصیتوں کا آئینہ ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب وضعداری کی قدیم روایات کے علم بردار اور امین تھے۔ رکھ رکھاؤ ان کو ورثے میں ملا تھا، جس کا اب فقدان ہو چلا ہے۔ بہت مہمان نواز تھے، چائے اور مشروبات سے احباب و رفقا کار اور

طلبا کی خوب تواضع کرتے۔ خوش لباس، بے داغ ملبوسات زیب تن کرنے کے علاوہ رنگوں کے امتزاج کا خاص خیال رکھتے تھے۔ خوش خوراک اور خوش اخلاق تھے۔ چٹ پٹے اور تیز مسالے دار کھانے ان کو بے حد مرغوب تھے۔ لاہور میں کس کس مقام پر عمدہ ہریسہ، حلیم، شامی کباب، سری پائے اور نان دست یاب ہو سکتے ہیں، وہ یہ سب جانتے تھے۔

مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ گورنمنٹ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے اردو اور انگریزی کلاسیکی ادب کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ اس وجہ سے ان کتابوں کے حوالے ان کی دلچسپ اور پُر مغز گفتگو میں خود بخود چلے آتے تھے۔ احباب کی محفل میں ان کی رگِ مزاح پھڑک اٹھتی تھی۔ اردو تحریروں اور تقریروں کی نوک پلک سنوارنا، بے داغ انگریزی لکھنا انہی کا حصہ تھا۔ مسلسل، رواں اور صحیح تلفظ میں انگریزی بولتے تھے۔

خواجہ محمد اسلم صاحب بہترین منتظم تھے۔ کالج کے انتظامی امور کو بطریقِ احسن انجام دیتے۔ اس بنا پر ان کے لب و لہجے سے کسی کا دل میلا ہو سکتا تھا، ورنہ ان کا قلم ان کے دل کی طرح نرم اور شفیق تھا۔ اپنے رفقائے کار اور ماتحت ملازمین کی کامیابی کے لیے ہمہ وقت دل و جان سے تیار رہتے تھے۔ کالج کے معاملات پر ان کی گہری نظر تھی۔ کالج کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ بھی ان کے علم سے باہر نہ تھا۔ وہ روزانہ باقاعدگی سے کالج کیمپس کا راؤنڈ لگاتے اور اصلاح طلبا امور کے بارے میں متعلقہ انچارج کو ہدایات جاری کرتے۔ علم و فضل کے دل دادہ اور قدر دان تھے۔ اپنے رفقا کے تحقیقی اور تخلیقی کاموں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی عزت بڑھاتے۔ ان کے نام پر اسلامیہ کالج سول لائنز میں کے۔ ایم۔ اسلم ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہے، جو طلبا سے علمی و ادبی شاہ کار کے تراجم کراتی اور ان کو اپنے ماہوار اجلاس میں تنقید کے لیے پیش کرتی ہے۔

جدوجہد پاکستان کے لیے اسلامیہ کالج کے طلبا اور اساتذہ کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ خواجہ صاحب بھی تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم رکن تھے۔ پاکستان سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ قوم کا درد ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ حکومت پاکستان نے ان کی تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں تمغۂ امتیاز اور تمغۂ پاکستان کے اعلیٰ سول اعزازات عطا کیے۔ تمغۂ پاکستان انھیں ۱۹۶۵ء میں دیا گیا تھا۔

انھوں نے اقتصادیات اور سیاسیات پر اردو اور انگریزی میں متعدد مضامین قلم بند کیے، جو ملک کے مشہور رسائل اور اخبارات میں طبع ہوتے رہے۔ چند مقالات کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ (باقی صفحہ ۵۶ پر)

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ جَرِيْرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔ باب فضل الرفق)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص نرمی سے محروم ہے، وہ بھلائی سے محروم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہایت مختصر اور صرف ایک جملے پر مشتمل ہے۔ یہ جملہ الفاظ کے اعتبار سے بہت چھوٹا لیکن معنوی اعتبار سے بڑا وزن رکھتا ہے۔ اس میں یہ بنیادی اور اصولی بات بیان فرمائی گئی ہے کہ جو شخص نرمی کی صفت سے محروم ہے، وہ خیر و خوبی کے تمام اوصاف سے تہی دامن ہے۔

"نرمی" کے لیے اس حدیث میں لفظ "رفق" استعمال ہوا ہے، یعنی لطافت، مٹھاس، حسنِ سلوک اور مہربانی۔ یہ لفظ سختی اور شدت کی ضد ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا کے تمام پیش آئند معاملات میں انسان کو نرمی اختیار کرنی چاہیے۔ شدت اور سختی سے بچنا چاہیے۔ سہولت سے کام لینا چاہیے، سخت گیری سے احتراز کرنا چاہیے۔ یعنی بات کی جائے تو نرمی سے، کسی کو سمجھایا جائے تو آسان طریقے سے، کسی سے کچھ مانگا یا طلب کیا جائے تو میٹھے انداز میں، کسی سے کچھ کہنا ہو تو اس اسلوب سے کہ سننے والا اثر پذیر ہو کر اس کی طرف کھنچا چلا آئے، اور طرزِ کلام ایسا ہو کہ پتھر کا دل بھی موم ہو جائے۔ دلوں کو موہ لینا اور مخالفوں کو موافق بنا لینا وہ وصفِ عظیم ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ عطا کر دے، یوں سمجھیے کہ وہ خیر کثیر اور بہت بڑی بھلائی سے نواز اگیا، اور جس کو اس صفت سے محروم کر دے، وہ خیر و برکت اور نیکی اور بھلائی کے تمام تر سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

احادیث میں اللہ تعالیٰ کے جو اسمائے گرامی درج ہیں، ان میں ایک نام "رفیق" بھی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کمال مہربانی سے اپنے تمام بندوں کی خبر گیری کرتا ہے، لطف و کرم سے ان کو رزق

بہم پہنچاتا ہے اور رفق و ملائمت سے ان کی ضرورتیں اور حاجتیں پوری کرتا ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ اس ترحم و تلطف میں وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ لوگ اس کی اطاعت بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ اپنے مطیع و فرماں بردار بندوں سے بھی رفق و نرمی کا سلوک کرتا ہے اور جو لوگ اس کی اطاعت نہیں کرتے، ان پر بھی برابر لطف و کرم کی بارش فرماتا ہے۔ یعنی اس کا ابرِ رحم ہر شخص پر سایہ فگن ہے اور اس کی مہربانیوں کے ہمہ گیر دائرے میں ہر متنفس شامل ہے۔ اس کا اطاعت گزار بھی اور نافرمان بھی ــــ! اس کی عطاءِ غیر مجذوذ سے ہر ایک کو برابر فیض پہنچ رہا ہے۔

اللہ چوں کہ رفیق ہے، اس لیے رفق و نرمی کو پسند کرتا ہے اور اسی وجہ سے انسان کو اس کی ضرورت کی سب چیزیں عطا فرماتا ہے اور اس پر بے پناہ نوازشیں کرتا ہے۔ اپنے بندوں میں بھی وہ نرمی، رفق اور ملائمت کی صفت دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جو شخص انسانوں سے معاملات اور میل جول میں نرمی کا برتاؤ کرتا ہے، وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک حدیث روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهٗ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ

یعنی نرمی جس چیز میں پائی جائے، اس کو زینت عطا کرتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جائے وہ بدنما ہو جاتی ہے۔

بہرحال رفق اور نرمی کو اللہ کی بہت بڑی نعمت کی حیثیت حاصل ہے، جس شخص کو یہ نعمت میسّر آگئی، وہ دنیا کی تمام نعمتوں سے مالا مال ہو گیا، اور جو شخص اس سے محروم رہا، اس پر برائی اور قباحت نے قبضہ جما لیا اور بدنمائی اس کے حصے میں آئی۔

جو لوگ دوسروں سے سخت کلامی سے پیش آتے اور ہر وقت غصے سے بھرے رہتے ہیں، وہ نہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور نہ عام لوگ ہی انھیں احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ معاشرے میں انھیں کسی قدر و منزلت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ ان کا یہ طرزِ عمل اسلامی تعلیم کے خلاف، اخلاق کے منافی اور تہذیب و ثقافت کے صحت مندانہ اصولوں کے برعکس ہے۔ صحیح آدمی وہ ہے جو نرمی سے زندگی بسر کرتا اور سب سے الفت و محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔ سخت سے سخت مخالف سے بھی رحم و مودت سے پیش آتا ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی — جولائی ۱۹۸۳

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہیں، مسائل اور محرکات (مسلسل)	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
فتاویٰ فیروز شاہی اور عصری مسائل	جناب ظفر الاسلام
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تاریخ وفات اور ان کے خاندان کے مزارات اور کتبے	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی
قاضی ارتضا علی خاں خوشنود	محمد صلاح الدین عمری ایم اے

بینات، کراچی — جولائی، اگست ۱۹۸۳

رشوت	پروفیسر حبیب الرحمٰن
فضائلِ رمضان	مولوی سعید احمد جلال پوری
حضرت عبداللہ بن رقیہ	مولوی خالد محمود
مولانا سید محمد قطب	ڈاکٹر محمد حنیف

ترجمان الحدیث، لاہور — جون ۱۹۸۳

قرآنی نظامِ ربوبیت	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

تعمیرِ انسانیت، لاہور — جولائی ۱۹۸۳

خطباتِ سیرت	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
مسلمانوں کے زوال پر ایک نظر	علامہ فرید وجدی مصری
ہمارا قدیم نظامِ تعلیم اور جدید تقاضے (مسلسل)	ڈاکٹر الطاف جاوید
قانونِ شہادتِ نسواں — قرآن کی روشنی میں	علامہ عمر احمد عثمانی
تربیتِ اولاد	ڈاکٹر منیر احمد مغل

الحق، اکوڑہ خٹک — جون ۱۹۸۳

سرسید، مورخ کی حیثیت سے	حکیم سید محمود احمد برکاتی

سائنسی علوم و فنون میں مسلمانوں کا حصہ	پروفیسر ابوالبیان
طورو کے گیلانی سادات (مسلسل)	جناب عبدالحلیم اثر افغانی
تحریک روشنیہ اور اس کا بانی (مسلسل)	مولانا مدرار اللہ مدرار
مولانا مفتی عبدالقیوم پوپلزئی	پروفیسر حافظ عبدالغفور

الرشید، لاہور — جون، جولائی ۱۹۸۳

فضیلتِ علم اور اہلِ علم	مولانا شمس الحق افغانی
مولانا احمد رضا خاں اور علمِ حدیث	حافظ محمد اسلم
حکومتِ الہیہ اور فریضۂ جہاد	مقبول احمد
عیسائیت کی تبلیغ و تخریب	ڈاکٹر محمد انور قریشی

الفرقان، لکھنؤ — جون، جولائی ۱۹۸۳

اسراء و معراج، چند اشارات و اسرار (مسلسل)	خلیل الرحمٰن سجاد ندوی
ایک نومسلم کے قبولِ اسلام کی داستانِ عبرت	غازی احمد نومسلم
مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع؟ یا جامع معمر؟	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی

فکر و نظر، اسلام آباد — مئی ۱۹۸۳

فہارس قرآنِ مجید	سید عبدالقدوس ہاشمی
مسلمان اور جدید علوم	وقار احمد رضوی
انسانی معاشرے کا ارتقا اور امتِ مسلمہ	محمد یوسف رضوی

فکر و نظر، اسلام آباد — جون ۱۹۸۳

تعامل، عادت اور عرف، اسلامی قانون کی نظر میں	ساجد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی
علامہ عبدالعزیز میمن	خورشید رضوی
اسلام کا عادلانہ نظام معاشرت	ڈاکٹر نور محمد غفاری

محدث، لاہور — جولائی ۱۹۸۳

سید عبدالقادر جیلانی کا تجدیدی کارنامہ	پروفیسر غلام احمد حریری

[illegible]، اعظم گڑھ — جون ۱۹۸۳

اسلام اور مستشرقین (مسلسل)	پروفیسر سید حبیب الحق ندوی
سعدی شیرازی کی ولادت کے سلسلے کی چند داخلی شہادتوں کا تجزیہ	پروفیسر نذیر احمد
کتب خانہ رام پور کا ایک معالجاتی قلمی تذکرہ	حکیم محمد حسین خاں
الواح الصنادید	پروفیسر محمد اسلم

معارف، اعظم گڑھ — جولائی ۱۹۸۳

اسلام اور مستشرقین (مسلسل)	پروفیسر سید حبیب الحق ندوی
مرأۃ الاسرار کا ایک جائزہ	جناب معین احمد علوی
امام ابو ثور — امام شافعی کے ایک نامور شاگرد	حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی

میثاق، لاہور — جولائی ۱۹۸۳

اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور	ڈاکٹر اسرار احمد
وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا	محمد یونس جنجوعہ

(بقیہ پروفیسر خواجہ محمد اسلم مرحوم)

۱۔ رحمۃ للعالمین

۲۔ ہمارے نصاب میں نئے تعمیری رجحانات

۳۔ ECONOMIC DEVELOPMENT OF PAKISTAN.

۴۔ ISLAMIA COLLEGE CONTRIBUTES TO PAKISTAN MOVEMENT.

ان کی چند غیر نصابی کتب کے نام یہ ہیں:

۱۔ شہریت اور سیاست۔ مطبوعہ مکتبہ کاروان، لاہور

۲۔ معاشیات " " " "

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن :
مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاوراتِ عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایہء بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اُٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمتِ قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری
جلد اول
محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیاتِ غالب :
ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE

CLUB ROAD LAHORE (PAKISTAN)

ستمبر ۱۹۸۳

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس لاہور

فون ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۶ — ستمبر ۱۹۸۳ — ذی قعدہ ۱۴۰۳ — شمارہ

ترتیب

تاثرات

افسوس ہے ۲۹ اگست ۱۹۸۳ کو مشہور شیعہ عالم مفتی جعفر حسین حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ مرحوم ایک عرصے سے پھیپھڑے کے سرطان میں مبتلا تھے۔ گزشتہ تین ماہ سے یہ مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔ وہ ۲۶ جولائی ۱۹۸۳ کو علاج کے لیے لندن گئے، وہاں ان کا طبی معائنہ کیا گیا تو ڈاکٹر نے لاہور کے علاج پر اطمینان کا اظہار کیا جس کا اصل مطلب ان کی زندگی سے اظہارِ مایوسی تھا۔ چنانچہ وہ ۴ اگست کو واپس آ گئے۔ یہاں میو ہسپتال میں زیرِ علاج تھے کہ سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب مرحوم ۱۹۱۳ء کو گوجرانوالہ کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے تین جلیل القدر علما — مولانا محمد اسماعیل مرحوم، مولانا قاضی عبدالرحیم مرحوم اور مولانا محمد چراغ مدظلہٗ — سے حاصل کی۔ ان کے دو اوّل الذکر اساتذہ مسلکِ اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے اور تیسرے استاذِ محترم دیوبندی مکتبِ فکر سے وابستہ ہیں۔ مفتی صاحب کے دورِ طالب علمی میں گوجرانوالہ کے یہ علمی سرچشمے تھے، جن سے وہ ابتدائی عہد میں سیراب ہوئے۔ ان میں سے قاضی صاحب مرحوم سے انھوں نے زیادہ استفادہ کیا۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم کے دار العلوم میں نامور عالم و مصنف مولانا محمد حنیف ندوی بھی ان کے ہم درس تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ لکھنؤ گئے، وہاں سید نجم الحسن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد استاذِ محترم کی خواہش پر ان کے دار العلوم میں کچھ عرصہ فرائضِ تدریس بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نجف اشرف (عراق) تشریف لے گئے اور وہاں کے جید اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ نجف اشرف سے واپس آئے تو موضع نوگاؤں سادات (ضلع مراد آباد، یوپی) کی ایک علمی درس گاہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء کو پاکستان میں تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کے رکن منتخب کیے گئے۔ ۱۹۵۲ء کو کراچی میں مختلف مکاتبِ فکر کے اکتیس علما نے اسلامی نظام کے نفاذ

(باقی بر صفحہ ۵۰ پر)

پروفیسر محمد اسلم

شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات

"دُرّ المعارف" کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت

حضرت شاہ غلام علی دہلوی کا شمار ان اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانانِ پاک و ہند کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں اپنی سیرت و کردار کے اَن مِٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ دہلی اور اس کے اطراف میں انیسویں صدی کے ربع اوّل میں عوام کی رشد و ہدایت اور تعمیرِ ملت کا اہم فریضہ جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے شاہ غلام علی نے انجام دیا ہے، اس کی مثال مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ شاہ صاحب کے ملفوظات دُرّ المعارف کو سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی تعلیمات کا مرقع سمجھنا چاہیے۔ یہ کتاب اب تک تین بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۰۴ھ میں مطبع نامی سے شائع ہوا اور دوسری بار اُسے شاہ زید ابوالحسن فاروقی سجادہ نشین درگاہ شاہ ابوالخیر نے بڑے اہتمام کے ساتھ دہلی سے شائع کیا۔ تیسری بار یہ ۱۹۷۴ء میں استانبول میں طبع ہوئی۔ راقم الحروف کے پیشِ نظر اس کا پہلا ایڈیشن ہے۔

صاحبِ ملفوظات کا مختصر تعارف

شاہ غلام علیؒ، جن کا اصل نام عبداللہ تھا، ۱۷۴۵ء میں مشرقی پنجاب کے مشہور علمی اور روحانی مرکز بٹالہ میں پیدا ہوئے[1] ان کے والد بزرگوار شاہ عبداللطیف علوی، شاہ ناصرالدین قادریؒ سے بیعت تھے اور ان کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا۔

شاہ غلام علیؒ کی ابتدائی زندگی بٹالہ میں گزری۔ ان کے والد بزرگوار کی یہ دلی خواہش تھی کہ

---

[1] شاہ رؤف احمد نے جواہرِ علویہ میں بٹالہ کو خالص پنجابی لہجے میں وٹالہ لکھا ہے۔ سرسید احمد خان نے بھی تذکرہ اہلِ دہلی میں بٹالہ کی املا وٹالہ کی ہے۔

وہ اپنے فرزند ارجمند کو اپنے مرشد سے بیعت کرا دیں۔ جب شاہ صاحب کی عمر سولہ سترہ یا بہ روایتے اٹھارہ برس ہوئی تو ان کے والد نے انھیں دہلی طلب فرمایا[۲۵] جس دن شاہ غلام علیؒ دہلی پہنچے اسی روز شاہ ناصر الدین قادریؒ کا انتقال ہوا۔ شاہ صاحب کے والد نے ان سے کہا کہ اب موصوف جہاں چاہیں، بیعت کر لیں۔

شاہ غلام علی چار سال تک مختلف بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور اسی زمانے میں انھوں نے شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدین کی خدمت میں رہ کر دورۂ حدیث مکمل کیا۔ ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء میں وہ حضرت شمس الدین حبیب اللہ المعروف بہ مرزا مظہر جان جاناںؒ کی خدمت میں پہنچے اور مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا صاحب نے فرمایا: "جہاں ذوق و شوق اور کیفیات میسر آ سکیں وہاں بیعت کر لو، یہاں تو بغیر نمک کے پتھر کھانا ہے۔" شاہ صاحب نے عرض کیا: "مجھے یہی منظور ہے۔" مرزا صاحب نے ان کا جواب سن کر ارشاد فرمایا "مبارک ہو، آؤ بیعت کرو"[۲۶] شاہ صاحب نے مرزا صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کی اور یہ شعر پڑھا:[۲۷]

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم — سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

شاہ غلام علیؒ پندرہ سال تک مرزا مظہر جان جاناںؒ کی مجلس ذکر اور حلقے میں بیٹھے اور ان کی خصوصی توجہ سے سلوک کی منازل طے کیں۔ مرزا صاحب کی شہادت (۱۷۸۰ء) کے بعد شاہ غلام علیؒ مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے اور چالیس برس تک اپنے انفاسِ طیبہ اور حرارتِ عشق سے مرزا مظہر جان جاناں کی خانقاہ کو آباد رکھا۔

شاہ رؤف احمد رقم طراز ہیں کہ حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ میں سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، ملتان، کشمیر، لاہور، سرہند، امروہہ، سنبھل، بریلی، رام پور، جائس، بہرائچ، گورکھپور، عظیم آباد، ڈھاکہ، بنگالہ، حیدرآباد اور پونا کے باشندے دیکھنے میں

---

۲۵ شاہ رؤف احمد، دار المعارف، مطبوعہ نامی پریس ۱۳۰۴ھ، ص ۱۲۳

۲۶ شاہ رؤف احمد، جواہر علویہ، مطبوعہ اللہ والے، کشمیری بازار لاہور، تاریخ ندارد، ص ۱۴۱

۲۷ سرسید احمد خان، تذکرہ اہل دہلی، کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۲۵

آتے تھے[۵] درالمعارف میں ایک اور موقع پر شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کا رہنے والا ایک شخص شیخ خالد کردی سے شاہ غلام علیؒ کا ذکر سن کر ان کی زیارت کے لیے دہلی آیا۔ سر سید احمد خان رقم طراز ہیں "میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمات خانقاہ کو سعادتِ ابدی سمجھے اور قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر ہی نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح اُمڈتے تھے[۷] شاہ رؤف احمد اور سر سید احمد خان کی ان تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ غلام علی کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا اور ان کی خانقاہ کو برعظیم پاک و ہند میں مرکزی مقام حاصل تھا۔

شاہ غلام علی نے برعظیم پاک و ہند کے علاوہ افغانستان کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ شاہ رؤف احمد رقم طراز ہیں کہ ایک روز شاہ صاحب کو القا ہوا کہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ اپنے خلفا کو دکن بھیجا کرتے تھے، اس لیے انھیں اپنے خلفا کابل، قندھار اور بخارا بھیجنے چاہئیں[۸]

"درالمعارف" کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ غلام علیؒ کے مشہور خلیفہ شیخ خالد کردی نے بغداد میں قیام فرمایا تھا اور علمائے روم اور اکابرین عراق نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس علاقے میں یہ مشہور تھا کہ شیخ خالد کردی شاہ غلام علی سے طریقۂ نقشبندیہ اخذ کر کے آئے ہیں[۹]۔ شاہ صاحب شیخ کردی سے برابر رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ شاہ رؤف احمد نے ایک موقع پر شاہ غلام علی کے ایک خط کا ذکر کیا ہے، جو انھوں نے خالد کردی کے نام لکھوایا تھا[۱۰]۔ درالمعارف میں مرقوم ہے کہ ایک روز "مغرب" سے ایک شخص شاہ غلام علی کی زیارت کے لیے آیا۔ دہلی آنے سے قبل وہ بغداد میں شیخ خالد کردی سے مل چکا تھا۔ اس نے شاہ صاحب کو بتایا کہ ایک لاکھ کے قریب افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور اس نواح کے ایک ہزار عالم ان کے مرید ہیں[۱۱] ایک روز سمرقند سے کچھ لوگ شاہ غلام علیؒ کی خدمت

---

۵ شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۱۰۶

۶ ایضاً، ص ۱۱۵

۷ سر سید احمد خان، تذکرہ اہل دہلی، ص ۲۶

۸ شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۱۰۷

۹ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۰ ایضاً، ص ۱۲۸

۱۱ ایضاً، ص ۱۴۴

میں حاضر ہوئے تو موصوف انھیں دیکھ کر رونے لگے۔ شاہ غلام علی نے روتے روتے مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "حضور! میں اس قابل نہیں ہوں کہ لوگ اس طرح سے دور دراز کا سفر کر کے مجھے دیکھنے آئیں۔ یہ سب آپ کی عنایت ہے، ورنہ میں تو ایک نالائق پنجابی شخص ہوں"[۱۲]

شاہ غلام علی کا شمار نقشبندی سلسلے کے مجددین میں ہوتا ہے۔ سر سید احمد خان کی تربیت ان کی گود میں ہوئی تھی۔ سر سید ان کے بارے میں لکھتے ہیں، "حق یہ ہے کہ ایسا بہشتہ جان شیخ دیکھنے میں نہیں آیا اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور خود رفتگی کے سرمو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا اور جو کام تھا وہ باتباعِ سنت تھا۔ لقمۂ مشتبہ سے نہایت پرہیز کرتے اور مال مشتبہ ہرگز نہ لیتے۔ جو شخص خلاف شرع اور سنت ہوتا، اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے پاس اس کا آنا گوارا نہ کرتے"[۱۳]

شاہ غلام علی ۱۸۲۴ء میں فوت ہوئے۔ نماز جنازہ جامع مسجد میں ان کے خلیفہ اور جانشین شاہ ابو سعید مجددی نے پڑھائی اور انھیں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے پہلو میں جانب قبلہ ابدی آرام کے لیے جگہ ملی۔

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات شاہ رؤف احمد فاروقی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد تھے۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت مجدد الف ثانی سے اس طرح سے ملتا ہے: شاہ رؤف احمد بن شعور احمد بن محمد شرف بن رضی الدین بن زین العابدین بن محمد یحییٰ بن مجدد الف ثانیؒ[۱۴] موصوف ۳ محرم ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۶ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد انھوں نے شاہ درگاہی کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن کچھ عرصہ بعد اپنے خالہ زاد بھائی شاہ ابو سعید مجددی کے ساتھ شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں چلے آئے اور ان کی خدمت میں رہ کر سلوک کی منازل طے کیں۔

شاہ غلام علی سے حصولِ خلافت کے بعد موصوف بھوپال تشریف لے گئے۔ وہاں انھیں قبولِ عام

۱۲۔ شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۵۶، ۵۷

۱۳۔ سر سید احمد خان، تذکرہ اہل دہلی، ص ۲۸، ۲۹

۱۴۔ شاہ رؤف احمد، جواہر علویہ، ص ۲

کا درجہ حاصل ہوا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شاہ غلام علی کے طریقے کی اشاعت زیادہ تر انھی کے فیلیے ہوئی۔ ان کی تصانیف میں سے جواہرِ علویہ، درالمعارف اور مراتب الوصول خاص طور پر مشہور ہیں۔ شاہ رؤف احمد ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء میں سفرِ حج کے دوران میں فوت ہوئے۔ ہمارے زمانے میں ان کی اولاد سے شاہ محمد یعقوب مجددی بڑے صاحب دل بزرگ ہو گزرے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

درالمعارف

درالمعارف کا آغاز بروز ہفتہ ۱۲ ربیع الآخر ۱۲۳۱ھ کو ہوا اور یہ کتاب بروز اتوار یکم شوال ۱۲۳۱ کو مکمل ہوئی۔ جامع ملفوظات نے اکثر مجالس کی تاریخیں درج کی ہیں لیکن ان میں ایسے ملفوظات بھی موجود ہیں جن کی تاریخیں درج نہیں ہیں۔ شاہ غلام علی کے ملفوظات میں چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کے ملفوظات کی طرح حکایات کی بھرمار نہیں ہے۔ ان کے ملفوظات عالمانہ ہیں اور ان کا ایک ایک ملفوظہ ان کی شانِ علم پر دال ہے۔ درالمعارف کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ غلام علی اپنی خانقاہ میں قرآن حکیم، صحیح بخاری، ترمذی شریف اور مثنوی معنوی کا درس دیا کرتے تھے[۱۵] شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ ان کے پیر و مرشد فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں تین کتابوں کا جواب نہیں ہے اور یہ تین کتابیں قرآن حکیم، صحیح بخاری اور مثنوی معنوی ہیں[۱۶]

ایک دن شاہ رؤف احمد درس حدیث میں شریک تھے۔ شاہ غلام علی نے ترمذی شریف کی یہ حدیث بیان فرمائی: فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ یہ حدیث پڑھ کر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس حدیث سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر ثابت ہے اور انھیں یہ شرف ان کی علمیت، اجتہاد، فقاہت، ترک و تجرید اور محبوبیتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے[۱۷]

---

[۱۵] شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۱۲۳، ۱۵۳، ۱۵۴

[۱۶] ایضاً، ص ۱۵۳، ۱۶۴، ۱۸۹، ۲۳۳

[۱۷] ایضاً، ص ۱۵۲

گسستن اچھا یا پیوستن

صوفیائے کرام میں گسستن یا پیوستن کے بارے میں ہمیشہ سے اختلاف رائے چلا آتا ہے۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ ایک بار خواجہ حسن نظامی دہلوی نے علامہ اقبال کو "سرالوصال" کا خطاب دیا تو حضرتِ علامہ نے انھیں لکھا کہ وہ سرالوصال کی بجائے "سرالفصال" کہلانا پسند فرمائیں گے۔ بعض صوفیائے کرام کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصل سے سالک کی اپنی ہستی فنا ہو جاتی ہے اور فصل کی صورت میں اس کا ذاتی تشخص باقی رہتا ہے۔ جو صوفیا نظریۂ وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ ہمیشہ خدا کے ساتھ وصل کے متمنی رہتے ہیں لیکن جو بزرگ نظریۂ وحدت الشہود کے قائل ہیں وہ ذاتِ حق میں فنا کی بجائے بقا کے قائل ہیں۔ شاہ غلام علیؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک گسستن سے پیوستن اچھا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ صوفیا کے نزدیک یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جب خدا سے وصل ہوگا تو خلق سے خود بخود فصل ہو جائے گا اور اگر خلق سے فصل ہوگا تو خدا سے خود بخود وصل ہو جائے گا[18]

وحدت الوجود

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ان کے پیرِ طریقت کو وحدت الوجود کے موضوع پر بہت سے اشعار یاد تھے اور موصوف اس موضوع پر مولانا رومیؒ، ابن عربیؒ، مولانا جامیؒ، مولانا مغربیؒ اور شیخ احمد جامؒ کے اشعار پڑھا کرتے تھے[19]۔ شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار فرمایا کرتے تھے کہ انا الحق کہنا آسان ہے لیکن "انا" کو ختم کرنا مشکل ہے[20]

کشف و وجدان کی حقیقت

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ کشف میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے لیکن وجدان میں خطا نہیں ہوتی۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص دور سے کوئی چارپایہ دیکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ شیر ہے، حالانکہ وہاں شیر کی بجائے کوئی اور جانور ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کو پانی نظر آتا ہے لیکن وہ سراب

---

[18] شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۶۵ [19] ایضاً، ص ۴۹، ۵۵

[20] ایضاً، ص ۱۸۰ — انا الحق گفتن آسان ست و انا را شکستن مشکل است۔

ہوتا ہے۔ اہلِ کشف کی مثال ایسی ہی ہے ۔ وجدان کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص ہوا کو پالیتا ہے۔ ہوا یوں تو نظر نہیں آتی لیکن اس کی گرمی یا خنکی کی وجہ سے اسے ہوا کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے ادراک میں خطا کا احتمال نہیں ہوتا۔ یہ مثالیں بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ انھیں صحیح وجدان عطا ہوا ہے [۲۱]

حصولِ نسبتِ اویسی

شاہ غلام علی ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بزرگ سے اویسی نسبت حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ خلوت میں دوگانہ ادا کرے۔ بعد ازاں وہ اس بزرگ کے ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ پڑھے اور اس کی روح کی طرف متوجہ ہو جائے۔ ایسا کرنے سے چند ہی روز میں نسبت کا ظہور ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ سالک کو چاہیے کہ ہر شب عشا کے بعد خیال میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرے۔ وہ یہی خیال کرے کہ اس کا ہاتھ آنحضرتؐ کے ہاتھ میں ہے۔ بیعت کرتے وقت سالک کلمۂ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر کاربند رہنے کا عہد کرے [۲۲]

شاہ صاحب کا طریقِ بیعت

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک روز ایک شخص شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضر ہوا۔ انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے تین بار "استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ" پڑھوایا۔ اس کے بعد اس سے امنت باللہ . . . وبعث بعد الموت پڑھوایا اور اس سے امنت باللہ کما ھو باسمائہ وصفاتہ وقبلت جمیع احکامہ کا اقرار کرایا۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے اس سے تین بار کلمۂ شہادت اور ایک بار کلمۂ توحید پڑھوایا۔ اس کے بعد انھوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس سلسلے میں بیعت ہونا چاہتا ہے؟ اس نے بتایا کہ اس کا رجحان قادریہ سلسلے کی طرف ہے۔ شاہ صاحب نے فاتحہ پڑھ کر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور سلسلۂ قادریہ کے بزرگوں کی روح کو ایصالِ ثواب کیا اور اسے نقشبندی سلسلے کے معمول کے مطابق ذکرِ قلبی کی تلقین فرمائی [۲۳]

---

[۲۱] شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۵۲، ۵۳ [۲۲] ایضاً، ص ۱۴۲ [۲۳] ایضاً، ص ۲۴

بیعت کی اقسام

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ بیعت کی تین قسمیں ہیں : اوّل ، بیعتِ توسّل ، یہ بیعت بزرگوں کا وسیلہ حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ دوم ، بیعت برائے رفع معاصی ، یہ بیعت گناہوں سے توبہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص بیعت کرنے کے بعد کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کی بیعت ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے لیے تجدید بیعت لازم ہو جاتی ہے۔ سوم ، بیعت برائے کسب سلوکِ باطن ، یہ بیعت سلوک کے مقام طے کرنے کے لیے کسی مرشد کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔[۲۴]

مریدوں کو نصیحت

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ جو شخص ان کے ساتھ ملاقات رکھتا ہے ، اسے چاہیے کہ وہ ان جیسا لباس پہنے اور انہی کے طور طریقے اختیار کرے[۲۵]

مریدوں کا احترام

شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ ایک روز شاہ غلام علیؒ کے ایک مرید بشارت اللہ خانقاہ میں آئے تو شاہ صاحب ان کے استقبال کے لیے اپنی قیام گاہ سے نکل کر مرزا مظہر جان جاناں کے مزار تک تشریف لائے۔ بشارت اللہ سے مل کر موصوف بے حد خوش ہوئے اور ان سے کہا کہ وہ جتنی نسبت لے کر گئے تھے ، اس سے زیادہ لے کر واپس آئے ہیں ۔ شاہ صاحب نے ان سے خوش ہو کر انھیں کلاہ رضا عنایت فرمائی ، جو اس سے پہلے کسی اور مرید کو نہیں ملی تھی[۲۶]

طریقہء اجازت

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ شاہ غلام علی نے جناب مولوی شیر محمد کو اجازتِ طریقہ دینے سے قبل شیرینی طلب فرمائی ۔ انھوں نے مولوی صاحب کو اپنا خرقہ اور کلاہ پہنائے اور سلسلہء نقشبندیہ کے بزرگوں کی ارواح کے ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ پڑھی ۔ شاہ صاحب نے اس موقع پر بزرگوں سے استمداد چاہی اور مولوی صاحب کے حق میں دعا کی[۲۷]

۲۴ھ شاہ رؤف احمد ، درالمعارف ، ص ۶۳ ، ۶۴ — ۲۵ھ ایضاً ، ص ۱۵۴

۲۶ھ ایضاً ، ص ۲۵۷ — ۲۷ھ ایضاً ، ص ۸۷

طریقۂ توجہ

شاہ رؤف احمد تحریر فرماتے ہیں کہ اپنے آخری ایام حیات میں شاہ غلام علی تیس افراد کو صبح کے وقت اور اتنے ہی اصحاب کو نمازِ عصر کے بعد حلقہ کراتے تھے۔ اگر حلقے میں بیٹھنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی تو انھیں اگلے روز آنے کا حکم دیتے۔ شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ خواجہ محمد سعیدؒ، خواجہ محمد معصومؒ اور مرزا مظہر جان جاناںؒ کا بھی یہی طریقہ تھا۔[۲۸]

توجہ کی تاثیر کے بارے میں شاہ رؤف احمد نے شاہ صاحب کی زبان فیض ترجمان سے یہ واقعہ سنا تھا کہ ایک روز دریا میں ایک کشتی رواں تھی۔ شاہ صاحب نے اس پر توجہ کی تو وہ فوراً رک گئی۔[۲۹] شاہ عبد العزیز دہلوی کے ملفوظات میں مرقوم ہے کہ ایک دن ان کے جد امجد شاہ عبد الرحیم نے ایک پتھر پر توجہ ڈالی تو وہ اپنی جگہ سے سرک گیا۔[۳۰]

طریقۂ نقشبندیہ

شاہ غلام علی فرمایا کرتے تھے کہ قدما صوفیا بڑی بڑی ریاضتیں کیا کرتے تھے۔ "حضرت خواجہ خواجگان پیر پیراں مرہم دلہائے دردمند خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ" نے سنت خیر الانامؐ پر عمل کر کے راہِ طریقت کو آسان بنا دیا ہے۔ انھوں نے قرآن پاک کی اس آیت " یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" پر نظر رکھتے ہوئے سخت قسم کی ریاضتوں سے منع کر کے ہم ایسے کم ہمتوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس طریقے میں بغیر کسی محنت کے پیرانِ کبار کی توجہ سے فیض ملتا ہے اور سالک ہر مقام کے فیض سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔[۳۱] شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شاہ بہاء الدین نقشبند نے طریقۂ نقشبندیہ کی بنیاد دو چیزوں پر رکھی ہے۔ اوّل: محبت۔ دوم: متابعتِ شریعت۔[۳۲]

شاہ غلام علی نے ایک مجلس میں فرمایا کہ طریقۂ نقشبندیہ میں دو چیزیں اختیار کرتے ہیں۔ اوّل، سنت، دوم: توجہ بقلب۔ یہی طریقہ صحابہ کرام کا تھا اور وہ تمام امت کے اولیاء اللہ سے افضل ہیں۔

---

۲۸ شاہ رؤف احمد: درالمعارف، ص ۱۰۶، ۱۰۷ ۲۹ ایضاً، ص ۲۱

۳۰ ملفوظات شاہ عبد العزیز، (اردو ترجمہ)۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء، ص ۹۵

۳۱ شاہ رؤف احمد: درالمعارف، ص ۳۸ ۳۲ ایضاً، ص ۴۰

صحابۂ کرام کے کمالات اصول ہیں تو اولیاء اللہ کے فروع اور ظلال ہیں۔ پس وہی طریقہ جو صحابۂ کرامؓ کا طریقہ ہے، باقی تمام طریقوں سے افضل ہوگا[۳۳]۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ طریقۂ نقشبندیہ میں محرومی نہیں ہے۔ جو شخص اس سلسلے میں داخل ہوتا ہے وہ نسبتِ نقشبندیہ سے محروم نہیں رہتا اور جو ازلی بدبخت ہے وہ اس طریقے میں داخل ہی نہیں ہوتا[۳۴]۔ شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ طریقۂ نقشبندیہ سے چار چیزیں مراد ہیں۔ اوّل: بے خطرگی، دوم: دوام حضور و آگاہی، سوم: جذبات، چہارم: واردات[۳۵]۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نسبتِ نقشبندیہ کو "بے نمک" کہا کرتے تھے اور انھوں نے ایک بار یہ الفاظ شاہ صاحب کی موجودگی میں بھی کہے تھے[۳۶]۔

جس وقت شاہ غلام علی نے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ سے مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی تو انھوں نے جواب میں یہی فرمایا تھا۔ "جہاں ذوق و شوق اور کیفیات میسر آ سکیں وہاں بیعت کر لو۔ یہاں تو بغیر نمک کے پتھر کھانا ہے"[۳۷]۔

شاہ غلام علی کی تجرد پسندی

شاہ غلام علی نے اپنی عمر فقر و تجرد میں گزار دی اور زوج و اولاد سے بے نیاز رہے۔ دُرّ المعارف میں جابجا ان کی تجرد پسندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایک صوفی کو دنیا سے روگردانی کر کے ترک و تجرید کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ غیر اللہ سے انحراف کرے اور امیروں کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نکاح ان چیزوں میں مانع آتا ہے، کیوں کہ عورتوں میں صبر، توکل اور قناعت جیسی صفات نہیں ہوتیں۔ الا ما شاء اللہ[۳۸]۔ شاہ صاحب دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بیوی اپنے خاوند کو دنیاوی اشیا کے حصول کی طرف مائل کرتی

۳۳۔ شاہ رؤف احمد: دُرّ المعارف، ص ۴۰، ۴۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۹۱ ۳۵۔ ایضاً، ص ۳۰

۳۶۔ ایضاً، ص ۴۸ — نسبتِ این طریقۂ نقشبندیہ بے نمک است

۳۷۔ شاہ رؤف احمد، جواہر علویہ، ص ۱۴۱

۳۸۔ شاہ رؤف احمد، دُرّ المعارف، ص ۲۳

ہے اور یہ چیز ترک و تجرید کے منافی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ صوفی زوج و اولاد سے بے نیاز رہے۔

شاہ غلام علی نے ایک روز اپنی مجلس میں فرمایا کہ ایک بار خواجہ ناصر الدین عبد الرشید احرارؒ نے ارشاد فرمایا کہ ان سے ایک ایسا گناہ سرزد ہوا ہے کہ اگر وہ پانچ سو سال تک زندہ رہیں اور توبہ و استغفار کرتے رہیں، تب بھی اس گناہ کا کفارہ ممکن نہیں۔ حاضرینِ مجلس نے عرض کیا کہ ایسا کون سا گناہ ان سے سرزد ہوا ہے؟ خواجہ بزرگ نے فرمایا: "نکاح"[۳۹]

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے نکاح کیا تو ان کے ہم عصر صوفیوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ شیخ موصوف نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انھوں نے یہ نکاح امرِ ربی کے تحت کیا ہے[۴۰] اسی ضمن میں ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ صوفی کو نکاح نہیں کرنا چاہیے اور اسے عورتوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "آداب المریدین" میں حضرت ابو نجیب عبد القاہر سہروردی لکھتے ہیں: "ہمارے زمانے میں صوفی کو نکاح نہیں کرنا چاہیے"۔ یہ کئی سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں جو صوفی نکاح کرتے ہیں، ان پر سخت افسوس ہے[۴۱]

شاہ غلام علی کا استغنا

ایک روز شاہ صاحب نے اپنے احباب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کی خانقاہ میں ۴۰۰ طالبانِ حق موجود ہیں، لیکن انھیں ان کے کھانے اور کپڑے کی مطلق فکر نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے مزید ارشاد فرمایا کہ انھوں نے اس کا خیال ہی دل سے نکال دیا ہے[۴۲] سر سید احمد خان، جن کا بچپن غلام علیؒ کی خانقاہ میں گزرا تھا، لکھتے ہیں: "حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمے تھا۔ اور باوجودے کہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا۔ اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا"[۴۳] شاہ رؤف احمد رقم طراز ہیں کہ شاہ صاحب کبھی کبھی یہ رباعی، جو اُن کے حسب حال تھی، پڑھا کرتے تھے:

۳۹ھ شاہ رؤف احمد، در المعارف، ص ۲۳

۴۰ھ ایضاً، ص ۲۰

۴۱ھ ایضاً، ص ۲۲

۴۲ھ ایضاً، ص ۴۵

۴۳ھ سر سید احمد خان، تذکرہ اہل دہلی، ص ۲۶

ما در دو جہاں غیر خدا کار نداریم | ما یار بجز حضرت جبار نداریم
مستانہ فدائیم سر و پای برہنہ | حاجت بکسی جبہ و دستار نداریم[۴۴]

ایک بار نواب ٹونک امیر خان نے خانقاہ کے خرچ کے لیے کچھ رقم مقرر کرنا چاہی تو شاہ صاحب نے شاہ رؤف احمد سے کہا کہ نواب صاحب کو یہ شعر لکھ کر بھیج دیں :

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم | با میر خان بگوی کہ روزی مقدر است[۴۵]

شاہ رؤف احمد رقم طراز ہیں کہ جب کوئی حکمران یا امیر خانقاہ کے لیے رقم مقرر کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا تو شاہ صاحب یہ قطعہ پڑھ کر اس کی درخواست رد فرما دیتے۔

خاک نشینیم در رحمانیم | بہ کہ ز ملک سلیمانیم
ہست چہل سال کہ ندپوشمش | کہنہ نہ شد جامۂ عریانیم[۴۶]

شاہ غلام علی کی جواں ہمتی

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ جن دنوں موصوف درالمعارف کی تدوین میں مصروف تھے، ان دنوں شاہ غلام علی کی عمر پچھتر برس تھی[۴۷] ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ اب موصوف کمزور ہو گئے ہیں۔ جس زمانے میں ان میں طاقت تھی تو موصوف جامع مسجد دہلی کے حوض کا پانی پیتے تھے اور قرآن پاک کے دس پارے روزانہ تلاوت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں دس ہزار بار نفی اثبات ان کا روزانہ معمول تھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں انھیں جامع مسجد انوار سے پُر نظر آتی تھی اور موصوف جس گلی محلے سے گزرتے تھے، وہاں نور ہی نور نظر آتا تھا۔[۴۸]

شاہ رؤف احمد فرماتے ہیں کہ شاہ غلام علیؒ کسی کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اگر ان کے کسی معتقد کے ہاں سے کھانا آتا تو موصوف اسے محتاجوں میں تقسیم فرما دیتے۔ ایک روز ایک امیر اور ایک "زن فاحشہ" کے ہاں سے کھانا آیا تو شاہ صاحب نے وہ کھانا محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔[۴۹]

(باقی آئندہ)

۴۴ھ شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۹۰
۴۵ھ شاہ رؤف احمد، جواہر علویہ، ص ۱۴۶
۴۶ھ ایضاً
۴۷ھ شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۲۲۶
۴۸ھ ایضاً، ص ۲۱۰
۴۹ھ ایضاً، ص ۲۲۷

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

سلطنتِ مغلیہ کے زوال پر ایک نظر

برعظیم پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کا دور نہایت شان دار رہا ہے، بابر نے ۱۵۲۶ء میں لودی خاندان کا خاتمہ کر کے اس کی بنیاد رکھی۔ اکبر اعظم نے نہ صرف اسے وسعت دی بلکہ مضبوط و مستحکم کر کے واقعی ایک شان دار سلطنت بنا دیا اور اس کے چھٹے حکمران اورنگ زیب عالم گیر (۱۷۰۷ء) تک اس کا استحکام غلبہ برقرار رہا۔ اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا زوال شروع ہوا، اس کے جانشین اس کی حفاظت نہ کر سکے بلکہ مجبور و مقہور ہو کر ننگِ خاندان ثابت ہوئے۔ نومبر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر کے "شاہ عالم بادشاہ کو" قلعۂ معلیٰ" کا مکین اور وظیفہ خوار بنا دیا۔ اس کا فرزند اور جانشین اکبر شاہ ثانی اپنے وظیفے میں اضافہ نہ کرا سکا اور آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا، شکست و نامرادی سے دوچار ہوا، شہزادے قتل ہوئے، بادشاہ گرفتار ہوا۔ مقدمہ چلا، نومبر ۱۸۵۸ء میں جلاوطن ہو کر رنگون روانہ ہوا، اور ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں فوت ہوا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اس عظیم سلطنت کے زوال پر جب ہم غور کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی جلدی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بہر حال جب سلطنت کا زوال شروع ہوا تو بعض غیر ملکی اور غیر مسلم قوتیں پورے منصوبے کے تحت ملک میں سیاسی قسمت آزمائی شروع کر چکی تھیں۔ وہ موقع و محل کے اعتبار سے زور آزمائی اور پنجہ کشی کر رہی تھیں اور ان کو بعض حالات میں کامیابی بھی ہو رہی تھی۔ ان غیر ملکی قوتوں میں مندرجہ ذیل خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ ڈچ
۲۔ پرتگالی
۳۔ فرانسیسی
۴۔ انگریز

ان میں اوّل الذکر تینوں قوتیں نبرد آزمائی کے بعد ہمت ہار گئیں مگر انگریز میدان میں رہ گئے اور اپنی شاطرانہ چالوں سے کامیاب ہوئے۔ غیر مسلموں میں مندرجہ ذیل قوتیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ مرہٹے

۲۔ سکھ

۳۔ جاٹ

جاٹوں نے آگرہ اور بھرت پور کے علاقے میں ہاتھ پاؤں مارے اور غلبہ و اقتدار حاصل کر لیا۔ مرہٹوں کے سیلاب نے ملک کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا، ان کی تاخت نے تمام شمالی ہند کو روند ڈالا، وہ بنگال اور پنجاب کی حدود تک پہنچے اور ملک کے امن و امان کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ مرہٹوں نے کم و بیش تیرہ مرتبہ شمالی ہند پر اور چھ مرتبہ بنگال پر چڑھائی کی اور سلطنتِ مغلیہ، مسلم ریاستوں اور امیروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ البتہ ۱۷۶۱ء میں ان کی قوت کو سخت دھچکا لگا لیکن پھر انھوں نے اپنا آپ سنبھال لیا مگر اب میدان میں ان کے حریف انگریز رہے۔ یہاں ہم دو غیر ملکی حملہ آوروں کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے سلطنتِ مغلیہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا اور اس کو نیم بسمل کر دیا۔ (۱) نادر شاہ کا حملہ ۱۷۳۹ء (۲) احمد شاہ ابدالی کے مسلسل سات حملے (۱۷۴۸ء - ۱۷۶۲ء)

نادر شاہ نے نہ صرف دہلی میں قتلِ عام کیا بلکہ تختِ طاؤس، تختِ رواں، کوہ نور ہیرا، کروڑوں روپیہ نقد، کروڑوں کا مال اسباب، ہاتھی گھوڑے اور نہ جانے کیا کیا لے گیا۔

احمد شاہ ابدالی نے بھی خوب لوٹا مگر ۱۷۶۱ء کی جنگِ پانی پت میں اس نے مرہٹوں کے زور کو البتہ توڑا اور سکھوں کو سزا دی، یہی ایک بات اس کے حق میں جاتی ہے۔

مرکز میں امیروں اور وزیروں کی سازشیں اور زور آزمائیاں بھی سلطنت کی کمزوری کا سبب ہوئیں۔ عبداللہ اور حسین علی برادران کے ہاتھوں نہ صرف بادشاہ کٹھ پتلی بنے رہے بلکہ ان کا عزل و نصب اور موت و حیات ان ہی سید برادران کے اشارۂ چشم و ابرو کی رہین منت تھیں۔ انھوں نے مرہٹوں کو چوتھ اور سردیش مکھی کا حق دے کر نہ صرف ان کی بالادستی قبول کر لی بلکہ ان کو لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی۔ سید برادران کی سیاست کا یہ سب سے گھناؤنا اور بدترین پہلو ہے۔

مرکز کی گروہ بندیوں اور سازشوں کے نتیجے میں مندرجہ ذیل چھوٹی بڑی نیم خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں۔

دیکھیے ان میں کون کون امرا اور پارٹیاں ہیں:

۱۔ بنگال میں علی وردی خاں

۲۔ اودھ میں برہان الملک

۳۔ دکن میں نظام الملک

۴۔ فرخ آباد میں بنگش

۵۔ روہیل کھنڈ میں روہیلے

۶۔ نجیب آباد میں نجیب الدولہ

ان ریاستوں کے قیام کی وجہ سے مرکز کمزور سے کمزور تر ہوا۔ پھر یہ ایک دوسرے سے آپس میں بھی نبرد آزما رہتی تھیں۔ بنگال کی حکومت کا خاتمہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں ہوا، جس میں سراج الدولہ کو ناکامی ہوئی، مگر پھر انگریزوں کا کٹھ پتلی اور ننگ قوم میر جعفر اور اس کی اولاد بھی جلد ہی کیفر کردار کو پہنچی۔ علی وردی خاں اور اس کے خاندان کی ریاست و حکومت کی وجہ سے ایرانی افکار و خیالات کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔

نظام الملک نے دکن میں بساطِ ریاست بچھائی، ان کے خاندان نے کم و بیش دو سو سال حکومت کی اور ۱۹۴۸ء میں ریاست حیدر آباد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

برہان الملک اودھ میں صوبے دار بن کر پہنچا۔ اس نے نادر شاہ کے حملے میں خاص کردار ادا کیا تھا، اس کی ہمدردیاں نادر شاہ کے ساتھ تھیں۔ برہان الملک نے پورب کی اکثریت سے فکری ہم آہنگی نہ رکھنے کی وجہ سے علما و مشائخ کی جاگیریں ضبط کر لیں، جس سے بہت سے مدرسے اور درس گاہیں ویران ہو گئیں۔ ہم عصر مؤرخ غلام علی آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام" میں اور قریب العصر شیعی تذکرہ نویس خیر الدین محمد الہ آبادی نے "تذکرۃ العلما" میں اس موضوع پر وضاحت سے لکھا ہے:

برہان الملک کے جانشین صفدر جنگ نے دلی کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وزارت پر قابض ہو گیا۔ اس نے مذہبی اختلاف کی بنا پر بنگشوں اور روہیلوں کی بیخ کنی میں پوری پوری کوشش کی۔ اس کا جانشین شجاع الدولہ بھی "نواب وزیر" کے منصب پر سرفراز ہوا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی پالیسی کو اپنایا، مرہٹوں اور انگریزوں سے معاملت کی۔ میر قاسم (بنگالہ) کو در بدر کی ٹھوکریں کھلائیں۔ شاہ عالم

کو چک پھیریاں دیں۔ وہ معاہدۂ الہ آباد ۱۷۶۵ء میں انگریزوں کا حلیف رہا اور شاہ عالم کو نجف خاں ایرانی کے ہمراہ دہلی بھیج کر اسے مرہٹوں کی سرپرستی میں دے دیا۔ انگریزوں کی مدد سے ۱۷۷۴ء میں روہیل کھنڈ کی ریاست (حافظ رحمت خاں) کا خاتمہ کر دیا اور بعدازاں بنگشوں کی ریاست فرخ آباد کو بھی ہڑپ کر گیا، لیکن پون صدی کے بعد اودھ کی حکومت بھی ہندوستان کے نقشے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں (ف ۱۹۲۵ء) مؤلف تاریخ مطیع (تاریخ شاہجہان پور) نے شجاع الدولہ کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی پر کیسا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے:

"اسلامی حکومت کا خاتمہ روہیل کھنڈ میں دراصل حافظ الملک کی شہادت کے دن ہو چکا تھا۔ اودھ کی حکومت رقص بسمل تھی جو بہت جلد سرد ہو گئی۔ اگر شجاع الدولہ نے انگریزی توپوں کے استعمال سے روہیلوں کا خاتمہ نہ کیا ہوتا تو لارڈ ڈلہوزی کی باریک بین نظر کو انڈیا کے نقشے پر ریاست اودھ بدنما داغ معلوم نہ ہوتی اور وہ اس کو مٹانے میں عجلت سے کام نہ لیتے"[1]

فروری ۱۸۵۶ء میں "پیاجان عالم" واجد علی شاہ کو بیک بینی و دوگوش سلطنت سے معزول کر کے مٹیا برج (کلکتہ) بھیج دیا گیا۔ حیرت ہے کہ عزلِ شاہ اور ضبطیٔ سلطنت کا اتنا بڑا واقعہ ہوا اور لکھنؤ میں نکسیر تک نہ پھوٹی۔ یا تو رعایا اس نظامِ حکومت سے نالاں تھی یا پھر غیرت و حمیت کا جنازہ نکل گیا تھا۔

اودھ میں ایرانی عقائد و افکار کی خوب نشر و اشاعت ہوئی، گویا لکھنؤ نے ایک چھوٹے سے ایران کی صورت اختیار کر لی۔ آصف الدولہ کے زمانے میں حسن رضا خاں نے شیعیت کی اشاعت میں بدرجۂ غایت دلچسپی لی۔ جمعہ و جماعت کا علیحدہ قیام عمل میں آیا اور مولوی دلدار علی صاحب مجتہد اوّل قرار پائے۔ عقائد و اعمال، تہذیب و ثقافت اور شعر و ادب پر ایرانی اثرات مرتب ہوئے۔ نصیر الدین حیدر اور بادشاہ بیگم کے دور میں تو یہ بات درجۂ کمال کو پہنچ گئی اور "غلو" کی سرحدیں پار ہو گئیں۔ ہم عصر تاریخوں میں جب تفصیلات نظر سے گزرتی ہیں تو بے اختیار زبان پر آتا ہے کہ:

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

حکومتِ اودھ کی "رواداری" کا اس سے اندازہ لگائیے کہ تعزیہ داری کے ایک قضیۂ نامرضیہ کے

---

[1] تاریخ شاہجہان پور (لکھنؤ ۱۹۳۲ء) ص ۱۲۵

سلسلے میں ملا عبد العلی بحر العلوم اور ملا حسن فرنگی محلی جیسے عبقریانِ زمانہ خارج البلد کیے گئے، ان کو تا زندگی سرزمینِ وطن دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اوّل الذکر نے مدراس میں اور ثانی الذکر نے رام پور میں عالم آخرت کی راہ لی۔ بات ذرا آگے بڑھ گئی، اب پھر ہم اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ولی عہدی کے بارے میں مغلیہ سلطنت کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہ تھا، اسی وجہ سے قتل و غارت گری اور جنگ و جدل کی نوبت آجاتی تھی یا پھر امراء و وزرا کی سازشیں اپنا رنگ دکھاتی تھیں۔ بعض امرا تو باقاعدہ شہزادوں کو اپنی حفاظت و حراست میں رکھتے تھے تاکہ حسب ضرورت بادشاہ گری کا مظاہرہ کر سکیں اور ایسے مظاہرے اکثر ہوا کرتے تھے۔ جاگیردارانہ اور منصب داری نظام کی وجہ سے فوج کا نظام بھی ابتر تھا۔ اس نظام میں اہمیت "اشرافیہ" کی تھی اور یہ لوگ بالعموم باہر سے درآمد ہوتے تھے، ایران و توران سے آکر نظامِ سلطنت سے منسلک ہو جاتے تھے اور پھر ہاتھ پاؤں مار کر اپنے لیے مقام پیدا کر لیتے تھے۔ انھیں اس سے غرض نہیں تھی کہ انگریزوں سے ساز باز ہو رہی ہے یا مرہٹوں سے، انھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ علی وردی خاں، برہان الملک، صفدر جنگ، سالار جنگ، نجف خاں وغیرہ نہ جانے کتنے ایسے "اشراف" تھے کہ جو ایران و توران سے ہندوستان میں آئے۔ عمائد اور ارکینِ سلطنت کے توسط و توسل سے ٹھکانا بنایا، شرافت و سیادت کا ڈھنڈورا پیٹا اور ملک و معیشت پر قابض ہو گئے۔ سلطنتِ دہلی کا چراغ گل ہو رہا تھا کہ قاسم جان و عارف جان اور مرزا غالب کے خاندان واردِ ہند ہوئے، مختلف امیروں اور رئیسوں کی ملازمتیں کیں، اور جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دلی فتح کی، تو عارف جان کے بیٹے احمد بخش خاں اس کے معین و مددگار تھے اور انھوں نے انگریزوں کی دوسری خدمات بھی انجام دیں اور ان ہی خدمات کے بدلے میں لوہارو اور فیروز پور جھرکہ کی جاگیریں حاصل کیں، یہاں تک کہ مرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں انگریزوں کی وفاداری میں مارے گئے اور ان کی حسنِ خدمات کی پنشن ان کے اکلوتے وارث مرزا غالب تمام عمر کھاتے رہے۔ "اشرافیہ" نے انگریزوں کی ہر محاذ پر خدمت کی اور مستفید ہوئے۔ علامہ تفضل حسین خاں، دبیر الدولہ فرید الدین احمد خاں، کاظم علی خاں، سید رجب علی، شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ نہ جانے کتنے حضرات ہیں کہ جنھوں نے انگریزوں کی سیاسی خدمات انجام دیں اور معزز و محترم ٹھہرے۔

برصغیر پاک و ہند میں تبلیغِ اسلام کا کام نہ صرف سرکاری سرپرستی سے محروم رہا بلکہ بعض اوقات آ سرکار و دربار کی طرف سے اس میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ بہرحال تبلیغ اسلام کا جس قدر کام ہوا، وہ اولا

کی کوششوں، سیاسی غلبے، معاشی ضرورتوں اور بعض معاشرتی عوامل کا رہینِ منت رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں جو پہلی مردم شماری ہوئی، اس کی رو سے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ چار کروڑ لگایا گیا تھا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں، امرا و رؤسا اور زعما و قائدین نے عددی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا، اور جب ہندوستان میں انگریزی حکومت کی طرف سے دستوری مراعات کا سلسلہ شروع ہوا تو صاف نظر آنے لگا کہ ملک میں بالغ رائے دہی کا دور ہوگا اور عددی قوت کو سیاسی غلبہ ملے گا۔ اس وقت بھی مسلمانوں نے تبلیغِ اسلام کی کوئی باقاعدہ اور مربوط کوشش نہیں کی اور عددی قوت کے اضافے کے لیے کوئی اجتماعی قدم نہیں اٹھایا، بلکہ جب انگریزوں کی شہ پر ہندوؤں کا ایک نوزائیدہ فرقہ "آریہ سماج" وجود میں آیا اور شدھی کی تحریک برپا کر کے غیر ہندوؤں کو ہندو بنانے کا ہنگامہ برپا کیا تو مسلمانانِ ہند کی طرف سے تمام تر مدافعانہ کوششیں عمل میں آئیں اور وہ بھی بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم غیر مربوط اور غیر منظم رہیں۔

انگریزی دور میں تین حلقوں سے تبلیغِ اسلام کی کسی قدر اجتماعی کوششیں ہوئیں:

۱۔ مولوی عبید اللہ (۱۳۱۰ھ) مصنف تحفۃ الہند کی کوششیں۔ جس کے نتیجے میں بہت سے خاندان مسلمان ہوئے اور پھر اس سلسلے کو مزید وسعت ہوئی۔

۲۔ سندھ میں علما و امرا کی اجتماعی کوششیں۔ اس سلسلے میں مٹیاری کے علما نے خاص کردار ادا کیا ہے اور اسی تحریک کے نتیجے میں شیخ عبدالرحیم (۱۹۱۵ء) (برادر آچاریہ کرپلانی) اور شیخ عبدالمجید سندھی (ف ۱۹۷۸ء) جیسے اکابر مشرف باسلام ہوئے۔

۳۔ نواب بہادر یار جنگ کی کوششیں۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے حیدر آباد دکن کے خاص حالات کے تحت منظم طور پر تبلیغِ اسلام کا کام انجام دیا، جس کے نتیجے میں پانچ ہزار آدمی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور تقریباً بیس ہزار مختلف اوقات میں داخلِ اسلام ہوئے۔

آج جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل ہر طرح سے تاریک ہے اور ان کی حیثیت تیسرے درجے کے شہری سے کسی طرح بہتر نہیں ہے مگر پھر بھی لوگ جوق در جوق اسلام کی طرف رجوع کر رہے ہیں، یہاں تک کہ سرکاری حلقوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے، کاش مسلمان اپنے دورِ عروج و اقتدار میں اس طرف توجہ کرتے تو بلاشبہ اس کے نتائج بہتر ہوتے اور فلاحِ انسانیت کا ایک عظیم کارنامہ انجام پاتا۔ افسوس یہ ہے کہ پاکستان میں بھی اس طرف سے سہل انگاری برتی گئی ہے۔ نواحِ ٹھٹھہ کے بھیل، بہاولپور کے گجراتی

ا چی کے آدباسی اور پنجاب کے بہت سے خانہ بدوش قبائل، عیسائی مشنریوں بلکہ بہائیوں تک کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور مسلم علما و زعما اس سے بالکل بے خبر ہیں۔

سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے ساتھ ساتھ اقتصادی و معاشی زوال ا شروع ہوا۔ ریاستیں، جاگیریں اور زمینداریاں آہستہ آہستہ ختم ہوئیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت ، باب میں سرکار کی طرف سے نہ کوئی حکمتِ عملی تھی اور نہ سرپرستی، بلکہ صنعت و حرفت کو حقارت کی نظر ، دیکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں صنعت کار اور اہلِ حرفہ کا کوئی مقام نہ تھا۔ دہلی میں کارخانہ دار "کرخندار" لر رہ گیا اور یہ لفظ معاشرے میں تحقیر و تضحیک کی علامت بن گیا۔ اس سے ہم صنعت کی زبوں حالی کا اندازہ سکتے ہیں، پھر مسلم صنعت کاروں کی صنعت و حرفت اور محنت و مشقت سے ہندو سرمایہ داروں نے رپور فائدہ اٹھایا۔ کاش مسلم زعما اور قائدین صنعت و تجارت کی اہمیت کا اندازہ کرتے تو مسلمان اس وں حالی سے دوچار نہ ہوتے۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں اس رجحان میں کسی قدر کمی ہوئی ہے اور ، صنعت و حرفت اور ہر پیشے میں دخیل ہو گئے ہیں۔

مغلیہ سلطنت جب تک مضبوط رہی، "تخت و اقتدار" مسلمانوں کی یک جہتی کا ذریعہ تھا، اس کے نحطاط پذیر اور زود بہ زوال ہوتے ہی مسلمانوں میں قومی یک جہتی کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی اور جو کچھ می یک جہتی یا ملک گیر مسلم رابطے کی جھلک نظر آتی ہے، اس کے مندرجہ ذیل تین عوامل معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ اسلام کی آفاقیت

۲۔ علما کے درس و تدریس کے مدارس

۳۔ مشائخ کے سلاسل اور رابطے

انگریزی دور میں جب سیاسی ادارے وجود میں آئے اور سیاسی تحریکات کا آغاز ہوا تو مسلمانوں ل قومی یک جہتی سیاسی اداروں کے ذریعے ظہور پذیر ہوئی، اس سلسلے میں جہاد تحریک، علی گڑھ تحریک، لافت تحریک، ترکِ موالات تحریک اور پاکستان تحریک نے موثر کردار ادا کیا ہے۔ آج پاکستان میں ومی یک جہتی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ کاش اس طرف بھرپور توجہ ہوتی۔

سلطنتِ مغلیہ کے عہدِ زوال کے تین علمی خانوادوں کا ذکر ضروری ہے کہ اس میدان میں ان کی نمایاں دمات ہیں۔

۱۔ لکھنؤ کا خانوادۂ فرنگی محل : اس میں نامی گرامی علما و فضلا پیدا ہوئے، درسِ نظامی کا اجرا ہوا۔ معقولات میں اس خانوادے کو خاص امتیاز و اختصاص حاصل ہوا، اور ایک زمانے تک اس کی علمی قیادت و سیادت برقرار رہی۔ اس خاندان کے دورِ آخر کے دو علما مولانا عبدالحی اور مولانا عبدالباری کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں کہ جن کی علمی و سیاسی خدمات تاریخ کا روشن باب ہیں۔

۲۔ دہلی کا خانوادۂ شاہ ولی اللہ : اس خانوادے کی نمایاں اسلامی خدمات ہیں۔ اس نے علمِ حدیث و قرآن کو عام کیا۔ قرآن و حدیث کے فارسی و اردو میں ترجمے کیے۔ دوسرے اسلامی علوم میں قابلِ قدر کام کیا۔ شاہ ولی اللہ سیاست و اقتصادیات میں بھی نہایت صحت مند رجحانات رکھتے تھے اور عصری ضرورتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی تحریک کو ان کے لائق صاحب زادگان اور تلامذہ نے آگے بڑھایا اور مدارس و تصانیف کے ذریعے ان کے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت کی۔ اصلاحِ ملت کا خوب کام کیا کہ جس کے اثرات برِعظیم پاک و ہند میں آج بھی محسوس ہوتے ہیں۔

۳۔ سندھ کا خانوادۂ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی ۔ شمالی ہند میں تبلیغ و اصلاح کا جو کام شاہ ولی اللہ نے انجام دیا، دیارِ سندھ میں وہی کام مخدوم محمد ہاشم (۱۱۷۴ھ - ۶۱-۱۷۶۰ء) اور ان کے خانوادے نے انجام دیا ہے۔ مخدوم ہاشم ممتاز عالم، مفسر، محدث اور مبلّغ کی حیثیت سے معروف ہیں۔

سلطنتِ مغلیہ کے دورِ انحطاط کے تعلق سے یہ چند باتیں ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ پاکستان کو ماضی کی تاریخ سے سبق لینا چاہیے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر کہیں ہم ان ہی غلطیوں کو نہ دہرائیں کہ جو ہمارے زوال کا سبب بنی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ پاکستان کو "بنیان مرصوص" بنا دینا چاہیے۔ قومی یک جہتی کو ہر صورت میں برقرار رکھنا چاہیے۔ مذہبی، علاقائی، ادبی، غرض ہر نوع کی عصبیتوں کو خیرباد کہہ دینا چاہیے۔

پروفیسر اکرام علی ملک

انجمن اسلامیہ امرتسر (۱۸۷۳-۱۹۰۱ء)

یہ امرتسر کے مسلمانوں کی پہلی اہم ترین جماعت تھی۔ امرتسر میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق شہر کی کل آبادی ۱۵۱,۸۹۶ میں ان کا تناسب پچاس فی صد تھا۔[۱] متعدد افراد تجارت خاص کر پشمینے کا کاروبار کرتے تھے، لیکن دیگر علاقوں کی طرح مجموعی اعتبار سے ان کی حالت پس ماندہ تھی۔ ۱۸۷۲ء میں گزشتہ سال کے لیے محکمہ تعلیم کی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لیفٹننٹ گورنر نے سرکاری مدارس میں مسلم طلبا کی نہایت کم تعداد پر حیرانی اور افسوس کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس کمی کی تحقیق و تدارک کے لیے اسباب تلاش کرنے کی غرض سے چند مسلم معززین نے اپریل ۱۸۷۳ میں انجمن کی بنیاد ڈالی۔[۲] شروع میں اس کا نام مجلس اسلامیہ امرتسر تھا۔[۳] فوری طور پر مسجد میں ایک مدرسہ قائم کر دیا گیا اور پھر نواب صادق محمد خاں والئ بہاول پور کی مالی امداد سے اس میں انگریزی کی تعلیم بھی جاری کر دی گئی۔[۴] اس میں دنیوی علوم کے علاوہ دینی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ شروع میں انجمن کے مقاصد صرف تعلیمی کوششوں تک محدود تھے۔ لیکن بعد میں ملک و قوم کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان میں اضافہ کر دیا گیا۔ حکومت کو بھی مختلف مسائل و امور کے بارے میں مقامی انجمنوں اور سوسائٹیوں سے مشاورت کی ضرورت رہتی تھی۔ نیز مسلمانوں کی متعدد رسومات شدید اور فوری طور قابلِ اصلاح تھیں۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۸۲ میں قواعد میں ترمیم کر کے یہ مقاصد مرتب کیے گئے۔

---

[۱] GAZETTEAR OF THE AMRITSAR DISTRICT 1883-84, PUNJAB GOVERNMENT, TABLE NO. XLIII, P XXIII

[۲] REPORT OF THE PUNJAB PROVINCIAL COMMITTEE OF THE EDUCATION COMMISSION, CALCUTTA. 1884, P 146

[۳] قواعد انجمن اسلامیہ امرتسر (پنجاب)، ۱۹۲۱ء (بار دوم)، ص ۱

[۴] تقریر خواجہ یوسف شاہ، سید احمد خاں کا سفر نامۂ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳، ص ۸۵

(ا) اشاعتِ علومِ دینی و علومِ مروجہ (ب) اصلاحِ رفاہِ قوم (ج) اغراضِ قوم کا گورنمنٹ کی خدمت میں عرض کرنا (د) دیگر امور جو قوم کے لیے مفید ہیں، ان کی سعی کرنا اور مناسب وقت میں تجاویز بھی دینا۔[۵۵] اس کے ساتھ ہی اس کا نام بھی تبدیل کرکے انجمنِ اسلامیہ امرت سر رکھ دیا گیا۔ جون ۱۸۹۶ میں نئے قواعد مرتب کیے گئے اور مقاصد میں مزید دو شقوں کا اضافہ کر دیا گیا یعنی (ل) وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت پولیٹکل غور و خوض کرنا اور پھر تحریک کرنا (ب) اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف کا بہم پہنچانا۔ اس سے انجمن کی حیثیت پر بھی اثر پڑا، اور وہ شہر کے علاوہ صوبے اور ملک کی اہم اور نمائندہ مسلم جماعتوں میں شمار ہونے لگی۔ تمام معاملات کا انتظام انجمن کے ارکان کے سپرد تھا۔ ارکان دو قسم کے تھے، یعنی وہ کارکن جو ماہانہ چندہ دیتے تھے اور اعزازی جو مجلس میں شریک ہونے سے معذور تھے، لیکن تجاویز بھیج سکتے تھے۔ ان کے لیے چندے کی ادائیگی اختیاری تھی۔ ارکان کی تعداد معین نہ تھی، ہر رکن خود استعفیٰ دینے یا جلسۂ انجمن کی کثرتِ رائے سے اخراج تک مستقل تصور کیا جاتا تھا۔ عہدے داروں میں صدر، نائب صدر، معین، نائب معین، امین اور سپرنٹنڈنٹ جائداد غیر منقولہ شامل تھے۔ ایک فرد دو عہدوں پر بھی فائز ہو سکتا تھا۔ امین کے لیے رکن ہونا ضروری نہ تھا۔ مجلسِ اراکین کا اجلاس ماہِ رمضان اور عشرۂ محرم کے سوا ہر مہینے کم از کم ایک بار ہونا ضروری تھا۔ اس کے فیصلے سادہ کثرتِ رائے سے کیے جاتے تھے۔ انجمن مختلف امور کے لیے سب کمیٹیاں بھی مقرر کر سکتی تھی۔ اس کے ذرائع آمدنی حکومت، امرت سر میونسپل کمیٹی، رؤسا، ریاست بہاول پور اور دیگر اہلِ ثروت کے عطیات و محاصلِ جائداد پر منحصر تھے۔ سرکاری گرانٹ دنیوی تعلیم کے لیے مخصوص تھی جب کہ ریاستِ بہاول پور کی امداد دینی و دنیوی تعلیم کے لیے خرچ کی جاتی تھی۔ ماہانہ اور دیگر چندوں کو جو وقتاً فوقتاً جمع کیے جاتے تھے، ایک علیحدہ یعنی اتفاقیہ فنڈ میں رکھا جاتا تھا۔ ماہانہ چندے کی رقم معین نہ تھی، لیکن آٹھ آنے سے کم نہ ہوتی تھی۔[۵۶] ایک اور اہم ذریعہ عیدین کے مواقع پر عطیات، چندوں اور قربانی کی کھالوں سے آمدنی تھا۔[۵۷] اس کے علاوہ مسلم گھروں سے

---

۵۵ فہرست انجمن ہائے اسلامیہ ہندوستان مرتبہ منشی نظیر علی، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چوتھا سالانہ جلسہ، آگرہ، ۱۸۹۰ء، ص ۱۵

۵۶ قواعد انجمنِ اسلامیہ امرت سر، ص ۲ - ۱۳

۵۷ THEODORE BECK TO SYED AHMED KHAN 3 MAY 1866, SELECTED DOCUMENTS FROM THE ALIGARH ARCHIVES, ED. BY YUSUF HUSSAIN,

مٹھی بھر آٹا جمع کرنے سے بھی ایک معقول رقم حاصل ہو جاتی تھی۔ ہر سال دسمبر میں بجٹ تیار ہوتا اور مارچ میں گزشتہ برس کا حساب منظوری کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ ماہانہ اجلاس میں بھی ہر مہینے کا حساب آمدنی اور خرچ پیش کیا جاتا تھا۔ ہر ممبر امین کی موجودگی میں رجسٹر حساب اور دیگر ریکارڈ کی جانچ پڑتال کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ آمدنی اور خرچ کے گوشوارے اور چندہ دہندگان کی رقوم کی فہرستیں انجمن کی رپورٹوں میں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ سپرنٹنڈنٹ جائداد کرایہ و آمدنی، شرحِ کرایہ، پیداوارِ اراضی و مرمتِ مکان کا ذمہ دار تھا۔

مدرسۃ المسلمین کا درجہ تھوڑے ہی عرصے میں مڈل اور جولائی ۱۸۸۵ء میں انٹرنس تک بڑھا دیا گیا۔ داخلے کے لیے مذہب کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کے انتظام کے لیے ایک علیحدہ مینجنگ کمیٹی قائم تھی جس کے عہدے داران و اراکین انجمن خود نامزد کرتی تھی۔ کمیٹی ہیڈ ماسٹر اور مدرسِ دینیات کے علاوہ اساتذہ کا تقرر، نصاب کا انتخاب اور بورڈنگ ہاؤس کا انتظام بھی کرتی تھی۔ فیس والدین کی حیثیت کے مطابق اور عموماً سرکاری مدارس سے کم لی جاتی تھی۔ ذہین اور نادار طلبا کو وظائف بھی دیے جاتے تھے[58] مسلم طلبا کے لیے دینی تعلیم خاص کر نماز کی پابندی لازمی تھی[59] اہلِ سنت و اثنا عشریہ کے لیے مذہبی تعلیم کا علیحدہ انتظام تھا۔ نصاب اور نگرانی کے لیے ہر دو فرقوں کے افراد پر مشتمل کمیٹیاں قائم تھیں۔ مدرسہ دو حصوں پر مشتمل تھا، یعنی اینگلو ورنیکلر سیکشن جس میں انٹرنس تک تعلیم دی جاتی تھی اور شعبۂ دینیات جس میں عربی، فارسی اور کتبِ فقہ و حدیث کے علاوہ طلبا کو مولوی فاضل، منشی فاضل کے امتحانات کے لیے بھی تیار کیا جاتا تھا۔ اس میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ اس کی ایک جماعت حفظِ قرآن کے لیے مخصوص تھی۔ اساتذہ سے اوقات کی پابندی سختی سے کروائی جاتی تھی۔ پانچ منٹ تاخیر سے آنے والے استاد کی آدھے دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی، نیز ان سے ملازمت کی میعاد وغیرہ کے بارے میں اقرار نامہ لیا جاتا تھا۔[60] اس کا نظام مدرسۃ المسلمین علی گڑھ سے کافی حد تک مشابہت رکھتا تھا۔[61] اس کا ہیڈ ماسٹر ایک قابل انگریز روتھ ویل (Rothwell) مقرر تھا۔ ۱۸۸۶ء میں اس میں

---

[58] قواعد انجمن اسلامیہ امرت سر، ص ۲، ۲۰، ۳۵

[59] اخبار الفقیہہ (امرتسر) ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء

[60] قواعد انجمن اسلامیہ امرت سر، ص ۴۹ - ۶۲

[61] EDWARD D. CHURCHILL JR. MUSLIM SOCIETIES OF THE PUNJAB, 1860-1890. THE PUNJAB PAST AND PRESENT. [illegible] PATIALA. P. 83.

چھ سو طلبا زیر تعلیم تھے جن میں تقریباً ایک تہائی غیر مسلم تھے[12]۔ ۱۸۹۰ء میں کل تعداد ۱۳۳۰ تھی جس میں مسلم طلبا کی تعداد ۳۴۳ تھی۔[13] اس کا شمار صوبے کے کامیاب مدرسوں میں ہوتا تھا۔ اسی لیے محکمہ تعلیم کی متعدد سالانہ رپورٹوں میں اس کی عمدہ کارکردگی، تعلیم، انتظام و نتائج کی تعریف کی گئی ہے۔

انجمن نے صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس نے متعدد مواقع پر مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے اسباب کو دور کرنے کے لیے حکومت کو توجہ دلانے کی کوشش کی۔ ہنٹر ایجوکیشن کمیشن کو اپنے تفصیلی بیان میں اس نے ان کی تعلیم کے لیے خصوصی وظائف اور مالی امداد کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے مطابق مسلمان اپنی غربت اور اس غلط مفروضے کی وجہ سے کہ انگریزی تعلیم سے ان کے مذہبی اعتقادات پر برے اثرات پڑیں گے، تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ حکومت نے ان وجوہ کے تدارک کے لیے کوئی اقدام اور مناسب ماحول پیدا نہیں کیا تھا۔ انجمن نے تعلیمی اداروں کے انتظام بالخصوص اعلیٰ تعلیم کی ذمے داری سے حکومت کی بے پروائی کی بھی مخالفت کی۔ اس کے نزدیک مقامی آبادی میں اتنا شعور اور صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھا سکیں۔ عیسائی مشنریوں کو یہ کام سونپنے سے تعلیمی ترقی کے بجائے تباہی بڑھنے کا شدید خطرہ تھا۔ صرف ورنیکلر پرائمری سکولوں کو میونسپل اور ضلع کمیٹیوں کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔ انجمن نے پرائمری تعلیم کی ترقی کے لیے پالیسی اور مسئلے کی آڑ لے کر اعلیٰ تعلیم پر توجہ کم کرنے کی بھی مخالفت کی۔ اس نے اردو زبان کو برقرار رکھنے اور ہندوستانی تعلیم یافتہ افراد کے لیے ملازمت کے مواقع وسیع کرنے کی سفارش کی۔[14] ۱۳ نومبر ۱۸۸۴ء کو انجمن نے وائسرائے لارڈ رپن کو اپنے سپاس نامے میں بھی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے خصوصی اقدامات کی درخواست کی۔ اس کے خیال میں مسلمان تعلیمی دوڑ میں اتنے پیچھے رہ گئے تھے کہ خصوصی اور ٹھوس امداد کے بغیر وہ اپنے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ نہیں چل سکتے تھے۔ انجمن نے لارڈ رپن کو اپنے دور حکومت کے ختم ہونے سے قبل اس اہم مسئلے کو حل کرنے کی درخواست کی۔ رپن نے اپنے جواب میں

12۔ Theodore Beck to Syed Ahmed Khan op.cit, pp 306-07.

13۔ رپورٹ آنریری سیکرٹری، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چوتھا سالانہ جلسہ، ص ۵۰

14۔ Report of the Punjab Provincial Committee of the Education Commission, Calcutta, pp. 144-149.

انجمن کی تعلیمی کوششوں نے جن مقاصد کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے دورِ حکومت میں اس وقت کے چیف خالصہ اور مسلم نمائندوں سے مناسب بات چیت کے بغیر خصوصی اقدامات کا فیصلہ کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ مرکزی حکومت نے بلاشبہ مسلمانوں کی تعلیم کو خصوصی مسئلہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن جیسے وہ اپنی سفارش کے ساتھ اپنے جانشین کے لیے چھوڑ گئے جا رہا تھا۔[15] ۲۶ نومبر ۱۸۸۴ء میں انجمن نے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچیسن کے دورہ امرتسر کے موقع پر ایک سپاس نامہ پیش کیا جس میں اس سے بنگال کی طرح پنجاب کے مسلمانوں کے لیے بھی خصوصی امداد و مراعات دینے کی درخواست کی گئی۔ سر چارلس ایچیسن نے انجمن اسلامیہ، سکھ سبھا اور ہندو سبھا کو اپنے مشترکہ جواب میں اپنی کوششوں کو جاری رکھتے ہوئے دیگر مسائل مثلاً تعلیم نسواں، رفاعی اداروں کے بہتر انتظام اور لوگوں کو طبی سہولتیں مہیا کرنے کی طرف توجہ مبذول کرنے کی تلقین کی۔[16]

انجمن نے متعدد مستحق اور نادار طلبا کو وظائف اور مالی امداد بھی دی۔ ۱۸۹۰ء میں جب یونیورسٹی کے بی۔ اے کے امتحان میں شریک تمام مسلم طلبا ناکام ہو گئے تو اس نے ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے استطاعت نہ رکھنے والے تمام طلبا کو وظائف دینے کی پیشکش کی۔ چنانچہ پینتالیس روپے کے چندے سے چار طلبا کو وظائف دیے گئے۔ اس کے علاوہ ایک مسلم طالب علم کو دس روپے ماہوار جوبلی سکالرشپ اور مختلف آمدنیوں سے متعدد چھوٹے وظائف بھی دیے جاتے تھے۔[17]

انجمن نے صوبے میں سرسید احمد خاں کے نظریات اور علی گڑھ تحریک کے مقاصد کے فروغ و مقبولیت کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کا شمار سرسید احمد خاں کی سرگرم ترین حامی جماعتوں میں ہوتا تھا۔[18] ۱۸۸۴ء کے دورۂ پنجاب کے دوران سرسید احمد خان امرتسر بھی تشریف لائے۔ انجمن نے ان کے استقبال، خاطر مدارات اور مالی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۲۵ جنوری کو ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اسی روز انجمن کے بانی اور صدر خان محمد شاہ نے ان کے اعزاز میں ایک ایوننگ پارٹی دی جس میں معززینِ شہر کی

---

۱۵ اخبار ٹریبیون (لاہور) ۱۵، ۲۰ نومبر ۱۸۸۴ء — ۱۶ ایضاً، ۲۷ نومبر ۱۸۸۶

۱۷ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چوتھا سالانہ جلسہ، ص ۵۰، ۵۱

۱۸ EDWARD D. CHURCHILL: MUSLIM SOCIETIES OF THE PUNJAB 1860-1890, P 78

ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اگلے روز سرسید نے انجمن کے مدرسے کے جلسۂ تقسیمِ انعامات کی صدارت کی جو ان کی آمد تک ملتوی رکھا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں انجمن کی کاوشوں اور خدمات کی تعریف کرتے ہوئے مدرسے کے لیے سرکاری اور دیگر بیرونی امداد کے انحصار پر افسوس کا اظہار کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی کارروائیوں کے لیے اپنی مدد آپ کا اصول اپنانے اور دیگر ہم وطنوں سے برادرانہ تعلقات قائم رکھنے کی تلقین کی۔ اسی جلسے میں مدرسے کے اساتذہ نے بھی سرسید کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ رات کو ٹاؤن ہال میں ایک اور تقریب میں انجمن اسلامیہ اور بزرگانِ امرت سر کی جانب سے ایک ایڈریس اور تقریب کے اختتام پر علی گڑھ کالج کی امداد کے لیے ایک ہزار پچاس روپیہ کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ انجمن نے اس مقصد کے لیے مزید ساڑھے چار سو روپے کا بھی وعدہ کیا جسے جلد پورا کر دیا گیا[19] ۲۹ جنوری کو سرسید، شیخ غلام حسین اور خواجہ یوسف شاہ کے ہمراہ دوبارہ تشریف لائے اور اسی شام ٹاؤن ہال میں تعلیم اور قومی اتفاق کے موضوع پر لیکچر دیا[20]۔ انجمن نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ترقی اور کامیابی کے لیے بہت مدد کی۔ اس کے متعدد اراکین اس کے اجلاسوں میں شرکت کرتے اور کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۸۹ء کے اجلاس میں خواجہ یوسف شاہ نے دو قرار دادیں پیش کیں۔ دوسری قرارداد میں علی گڑھ کالج کی سیکرٹری شپ کے لیے سید محمود شاہ کی جانشینی کی حمایت کی گئی تھی۔ انجمن کے متعدد ممبران نے کانفرنس کے لیے چندے بھی دیے[21]۔ ۱۸۹۰ء میں انجمن نے ضلع امرت سر سے کانفرنس کے لیے ایک سو تین مندوبین منتخب کرکے بھیجے جو اس سال کے لیے شمال مغربی صوبہ جات کے کل نمائندگان کی تعداد سے زیادہ تھے[22]۔ انجمن نے کانفرنس کی مقبولیت، نشر و اشاعت اور مقامی طلبا کی مالی امداد اور وظائف کے لیے سٹینڈنگ کمیٹیوں کے قیام کی حمایت کی اور صرف چند انجمنوں کے ساتھ اسے عملی جامہ پہنایا[23]۔

---

[19] سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب، ص ۷۷۔۱۱۰ [20] ایضاً، ص ۱۵۲ - ۱۷۵

[21] اخبار پنجاب (امرت سر) ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۹ء

[22] EDWARD D. CHURCHILL, THE MOHAMMADAN EDUCATIONAL CONFERENCE AND THE ALIGARH MOVEMENT 1886-1900, THE PUNJAB PAST AND PRESENT, OCTOBER P36

[23] عبدالرشید خاں، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں اس کا کردار ۱۸۸۶ء تا ۱۹۰۶ء، پنجاب یونیورسٹی ایم۔اے تاریخ مقالہ (غیر مطبوعہ) برائے ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۵

انجمن نے سرسید احمد خاں کے سیاسی نظریات کی بھی حمایت کی ۔ دسمبر ۱۸۸۷ء میں جب سرسید احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تو انجمن نے ایک عام اجلاس منعقد کر کے سرسید احمد خاں کی حمایت اور کانگریس کی مخالفت میں قرار دادیں منظور کیں ۔ اس میں سرسید احمد خاں کی کان پور کی تقریر کی کاپیاں منگوا کر امرتسر کے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔[24] ۱۸۸۸ء میں انجمن نے سرسید احمد خاں کی طرف سے قائم کردہ یونائیٹڈ پیٹرائیک (PATRIOTIC) ایسوسی ایشن کی بھی حمایت کی ۔ ۲ ستمبر ۱۸۸۸ کو منعقدہ اپنے اجلاس میں اس نے ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کی حمایت اور اس سے مکمل اتفاق کا اعلان کیا۔ اس نے اپنے کسی ممبر کی طرف سے کانگریس کے اجلاس یا اس کے حامی افراد کی طرف سے منعقدہ اجلاس میں شرکت کرنے پر اس کی رکنیت ختم کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ ایک اور قرار داد کے ذریعے قوم کو کانگریس کے مضر اثرات اور یونائیٹڈ پیٹرائیک ایسوسی ایشن کے فوائد سے آگاہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔[25] انجمن نے انڈین کونسلز میں منتخب اراکین کی شمولیت کے لیے بریڈلا بل کی بھی سخت مخالفت کی ۔ اس نے فوری طور پر ایک جلسہ منعقد کر کے اس کے خلاف برطانوی پارلیمنٹ کو عرض داشت بھیجنے کا فیصلہ کیا ۔ اس کے صدر شیخ غلام حسین نے اس سلسلے میں مسلمانوں کا مشترکہ موقف مرتب کرنے کے لیے سرسید احمد خاں اور سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے سیکرٹری سید امیر حسن سے رابطہ قائم کیا ، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی طرف سے تین نمائندہ ایڈریس بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا، یعنی سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، بنگال اور انجمن اسلامیہ لاہور، پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے ایڈریس بھیجے جائیں کہ پیٹرائیٹک ایسوسی ایشن کا میموریل کسی صوبے کے لیے محدود نہ ہو۔ انجمن اسلامیہ لاہور نے بھی انجمن اسلامیہ امرتسر کے تیار کردہ میموریل کو معمولی ترمیم کے ساتھ اپنا کر پارلیمنٹ کو بھیجا۔[26] اس میں کانگریس کے پروگرام اور کونسلوں کے لیے اصولِ انتخاب کے مجوزہ

---

[24] HAFEEZ MALIK (ED) POLITICAL PROFILE OF SIR SYED AHMED KHAN- A DOCUMENTARY RECORD, APPENDIX MAHOMEDANS AND THE CONGRESS, LETTER OF MAHOMED SHAFI TO THE PIONEER, ISLAMABAD 1982. PP 390-9

[25] اخبار رفیق ہند (لاہور) ۱۵ ستمبر ۱۸۸۸

[26] MUHAMMAD YUSAF ABBASI, MUSLIM POLITICS AND LEADERSHIP IN SOUTH ASIA 1876-1892 - ISLAMABAD, 1981 PP 299-300.

اجلاس میں معتبر افراد کی نشان دہی کی گئی تھی۔ مجوزہ بل کی حمایت میں عرض داشت پر صرف بیس مسلمانوں کے دستخط تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں متعدد اختلافات پائے جاتے تھے جن کی وجہ سے کئی خونریز فسادات بھی ہو چکے تھے۔ انتخابات کے نفاذ سے ان اختلافات میں مزید اضافے کا اندیشہ تھا۔ ان حالات کے پیش نظر اور ملک کے امن و امان کے لیے نامزدگی کے موجودہ نظام کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔[۲۷]

انجمن نے امرت سر میونسپل کمیٹی کے انتخابات اور معاملات میں بھی سرگرم کردار ادا کیا۔ اس کی رکنیت کمیٹی کی ممبرشپ کے لیے ضامن سمجھی جاتی تھی۔ ۱۸۸۳ء میں اس نے کمیٹی کے انتخابات کے انتظامات کے بارے میں ایک عرض داشت پیش کی۔[۲۸] ان انتخابات میں اس نے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۸۸۸ء میں اس نے ہندو سبھا اور مجلس موحدین اسلام کے ہمراہ کمیٹی کے انتخابات کو مزید تین سال کے لیے ملتوی رکھنے کی درخواست پیش کی۔ اس کے مطابق انتخابات فرقہ وارانہ کشیدگی اور اختلافات کا باعث ثابت ہوتے تھے۔ گزشتہ انتخابات کے دوران بھی خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ موجودہ ممبران نہایت قابل اور موزوں افراد تھے۔ خالی نشستوں کو اسی قوم کے افراد سے نامزدگی کے ذریعے پُر کیا جا سکتا تھا۔ انجمن نے کمیٹی کی بہتر کارکردگی اور انتظام کے لیے ڈپٹی کمشنر اور کمشنر امرت سر نے اس تجویز کی حمایت کی۔ ان کے خیال میں عرض دہندگان شہر کی ہندو اور مسلم آبادی کی اکثریت کی نمائندگی کرتے تھے۔ میونسپل اداروں کے اختیارات میں اضافے کے بعد دونوں قوموں کے درمیان شدید مقابلہ اور چپقلش کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ گزشتہ تین برس کے دوران مقامی انتظامیہ کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے امن قائم ہوا تھا۔ انتخابات کے انعقاد سے اس میں دوبارہ خلل پڑنے کا شدید خطرہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ نامزدگی کے طریق کار کو قبول نہ کرنے کی صورت میں ان سوسائٹیوں کو اپنے اپنے فرقوں میں انتخاب کر کے ہر حلقے کے لیے تین امیدوار نامزد کرنے کا اختیار دے دیا جائے، جن میں سے ڈپٹی کمشنر ایک شخص کو منتخب کر لے۔ اس طرح انتخاب کے اصول کو برقرار رکھتے ہوئے تصادم کا خطرہ ٹل سکتا تھا۔ کمشنر نے اس تجویز

۲۷۔ REPORT OF THE SELECT COMMITTEE OF THE HOUSE OF COMMONS ON PUBLIC PETITIONS. 1890, PP. 91-92.

۲۸۔ PUNJAB HOME GENERAL PROCEEDING B NO JULY 1883.

سے اتفاق نہ کیا اور انتخابات کے فیصلے کی صورت میں انھیں مروجہ طریقے کے مطابق ہی منعقد کرنے کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے انجمن اور دیگر لوگوں کی طرف سے انتخابات کے موقع پر تصادم کے بارے میں ان کی تشویش سے ہمدردی اور اتفاق کرتے ہوئے اس مسئلے کے حل کے لیے کمیٹی کے لیے نئے قواعد تجویز کرنے کی سفارش کی۔ انجمن نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ کمیٹی کے اٹھارہ منتخب ارکان کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور دونوں کے رائے دہندگان صرف اپنی اپنی قوم کے امیدواروں کو ووٹ دیں۔ نیز کمیٹی کے دو یعنی ایک ہندو اور ایک مسلمان نائب صدر ہوں۔ انھوں نے کمیٹی کے ایک تہائی ممبروں کو ہر سال سبکدوش کرنے کے طریقے کو بھی ختم کرنے کی سفارش کی۔ یہ تجویز نہایت دور رس نتائج کی حامل اور دیگر میونسپل کمیٹیوں میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے نفاذ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

انجمن نے سرکاری ملازمتوں پر اہلِ ہند کی زیادہ سے زیادہ تعداد مقرر کرنے کی بھی سفارش کی۔ پبلک سروس کمیشن کو بیان دیتے ہوئے اس نے موجودہ نظام کو ملک کے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے لیے نہایت غیر تسلی بخش قرار دیا۔ اس کے مطابق تعلیمی ترقی اور معاشی خوش حالی کے پیشِ نظر ملک کے امورِ حکومت و انتظام میں زیادہ حصہ اور قابلِ عزت مقام کے لیے ان میں پیدا ہونے والی خواہشات عین قدرتی اور جائز تھیں۔ انجمن نے اہلِ ہند کی اصلاح میں بھی ترمیم کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے مطابق اس میں صرف انھی افراد کو شامل کرنا چاہیے جو کافی عرصے سے ہندوستان میں رہائش پذیر تھے اور جن پر ہندوستانی فوجداری قانون مساوی طور پر لاگو ہوتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس میں برطانوی سلطنت میں شامل دیگر اقوام و ہندوستان میں آباد یوریشین (EURASIAN) نسل کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔

انجمن کے بانیوں میں آغا قلب عابد اعزازی اسسٹنٹ کمشنر، منشی محمد مہدی خاں سابق وزیر اعظم بہاولپور، خان بہادر خان محمد شاہ خاں اعزازی مجسٹریٹ، خان بہادر میاں محمد جان اعزازی مجسٹریٹ، حاجی سیف الدین رئیس، خان بہادر شیخ غلام حسن اعزازی مجسٹریٹ اور میاں اسد اللہ اعزازی مجسٹریٹ شامل تھے۔[29] اگرچہ اس کے ارکین کی تعداد وسیع نہ تھی لیکن اس میں شہر کے اکثر مسلم معززین شامل تھے۔ تشکیل اور کارکردگی کی وجہ سے اسے شہر بالخصوص مسلمانوں میں ایک نمائندہ مقام حاصل تھا۔ اس کے ارکین کی تعداد پچاس کے قریب تھی اور ان میں مسلمانوں کے

---

[29] قواعد انجمنِ اسلامیہ، امرت سر، ص ا

ہر طبقے کے افراد شامل تھے۔ اس کے سر کردہ اراکین میں حاجی غلام حسن ممبر ایجوکیشن کمشن، شیخ حسن اعزازی مجسٹریٹ، خواجہ یوسف شاہ رئیس و اعزازی مجسٹریٹ، میاں اسد اللہ وکیل، شیخ غلام محمد اعزازی مجسٹریٹ، خواجہ ظہور شاہ، حاجی شیخ بڈھا تاجر، شیخ غلام صادق، خواجہ غلام حسن، خواجہ احمد حسن اور منشی محکم الدین شامل تھے۔

انجمن اسلامیہ لاہور کی طرح یہ انجمن بھی برطانوی حکومت سے وفاداری کی حامی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں ملکہ وکٹوریہ پر حملے کے موقع پر اس نے اپنے غم و ہمدردی کے جذبات پر مبنی ایک ایڈریس بھیجا۔ نواب صادق محمد والیِ بہاولپور کی وفات پر بھی اس نے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔[۳۰] اس نے عیسائی مشنریوں کی اسلام دشمن کارروائیوں کے تدارک کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۹۸ء میں اس نے احمد شائق کی کتاب "امہات المومنین" کے خلاف زبردست غم و غصے کا اظہار کیا اور حکومت سے اس کی ضبطی کے لیے پُرزور مطالبہ کیا۔[۳۱] انجمن کو بعض اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے تنقید و مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر ۱۸۸۹ء میں مدرسے کے لیے کھیل کے میدان کے لیے جگہ حاصل کرنے کے لیے پُرانے قبرستان کو مسمار کرنے کی کارروائی پر نکتہ چینی کی گئی۔[۳۲] اخبار چودھویں صدی (راولپنڈی) کے شمارے مورخہ ۲۳ مئی ۱۸۹۶ء میں شائع شدہ ایک خط میں مدرسے کی کارکردگی بالخصوص سرکاری گرانٹ پر انحصار کو ہدف بنایا گیا۔ اس کے مطابق دینیات کی تعلیم کا معیار انتہائی غیر تسلی بخش تھا، نیز انجمن تعلیم کو بہتر بنانے کی بجائے دیگر کارروائیوں پر زیادہ توجہ دیتی تھی۔ مکتوب نگار نے انجمن کے فنڈ کو بنک یا کسی منافع بخش کاروبار میں لگانے کی بجائے امین کے پاس رکھنے کی کارروائی پر بھی نکتہ چینی کی۔ اسی طرح ۲ ستمبر ۱۹۰۱ء کے اخبار وکیل میں شائع شدہ ایک خط میں انجمن کے اراکین کے خلاف اس کی رکنیت کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنے کی شکایت کی گئی۔ اپنی چند خامیوں اور نقائص کے باوجود انجمن نے امرت سر اور پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ اسے ملک کی فعال اور نمائندہ مسلم جماعتوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے حصے میں جب کہ مسلمان اقتصادی بدحالی اور معاشرتی انتشار کا شکار تھے، ان اسلامی انجمنوں نے انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور ان کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

---

۳۰ وکیل (امرت سر) ۲۴ فروری ۱۸۹۹

۳۱ THE MUSLIM CHRONICLE (CALCUTTA)) 27 AUGUST 1898.

۳۲ پنجابی اخبار (لاہور) جنوری ۱۸۹۹

سید سبط الحسن ضیغم

پنجاب کے منفرد تذکرہ نویس

شریف احمد شرافت نوشاہی مرحوم

پنجاب دنیا کا وہ غیر معمولی اور منفرد خطہ ہے جس کا ہر عہدِ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دنیا کی قدیم ترین اور پہلی کتاب رِگ وید، اہلِ پنجاب ہی کے قلم کا شاہکار ہے، اور دنیا کا پہلا صرف و نحو کا مرتب پانینی بھی پنجاب ہی کا فرزند تھا۔ ٹیکسلا یونیورسٹی اور اس کے اساتذہ کو تو اس میں انفرادیت حاصل تھی۔

یونانی، ایرانی اور عرب جب آئے تو علم و فن کے نئے انداز ساتھ لائے، مگر انگریز نے ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قبضہ کرتے ہی پرانی مسند لپیٹ دی۔ علم و فن اور درس و تدریس کی شمعیں گل کر دیں۔ پھر بھی پنجاب میں ماضی کے علم و ادب، فکر و فن، درس و دانش کے کچھ نہ کچھ اثرات موجود رہے۔ نور احمد چشتی، مفتی غلام سرور لاہوری، غلام محی الدین بوٹے شاہ، مولوی غلام رسول عالم پوری، میاں محمد بخش، خواجہ غلام فرید چاچڑوی، مولانا عبدالعزیز پرہاروی، حافظ محمد لکھوی، محمد عزیز الدین المتوطن بہاول پور، مولانا ثناء اللہ امرت سری، عبداللہ چکڑالوی، مولانا حسین علی واں بھچراں، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، حافظ احمد علی کوہاڑہ، مولانا عبدالمالک گجراتی، سید میرکھی شاہ گولڑوی، سنت گوردت سنگھ آلو مہاری، حکیم غلام حسین ساہو والوی، مولانا فیروز ڈسکوی، مفتی امام بخش بٹالوی، پنڈت خدا بخش امرت سری، پنڈت علی بخش امرت سری، پیرزادہ محمد حسین، رشو ناتھ یوگی، بشن وید لاہوری، غلام غوث گوجرانوالوی، فضل حسین جہلمی، حکیم قادر بخش احمد آبادی، پادری شہباز، مولوی محمد حسین احمد آبادی، وید چندر بھان چنیوٹی، منشی غلام حسین کیلوی، مولوی غلام رسول عادل گڑھی، محمد علی راجن پوری، پنڈت حکیم برکت رام لونا روی، شوکت مرزا مواحد جالندھری، کھیم راج کو شیر راہوں، غیاث الدین لدھیانوی، امداد علی جگراؤں، علامہ اقبال مرحوم جیسے شاعر، ادیب، دانش ور، صرفی، نحوی، مفسر، محدث، حکیم، وید، طبیب، مدرس، پنڈت، بھائی، پادری، گیلانی، ریاضی دان، مہندس، منطقی، فلسفی، متکلم، کاتب، مؤرخ، تذکرہ نویس، گائیک، مصور، جراح، عربی، فارسی، سنسکرت،

ہندی، پنجابی کے ماہر، لسانیات کے استاد، لغت کے امام اور دوسرے علوم کے فضلا، پنجاب کے اسی عہد کی چند شخصیات ہیں، جنھوں نے اپنے فن اور علم کے جاوداں نقوش چھوڑے ہیں۔ پنجاب کا ہر گاؤں ایک مثالی درس گاہ تھا، جس کی پاٹھ شالاؤں، دھرم سالوں، گوردواروں، مکتبوں، مدرسوں اور مسجدوں میں مذکورا بالا تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔

انگریزی عہد کے پنجاب میں بھی ماضی کے اثرات کی وجہ سے بہت قدآور شخصیات پیدا ہوئیں شریف احمد شرافت انھی میں سے ایک ہیں۔ معروف مؤرخ حکیم محمد موسیٰ، شرافت نوشاہی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ان عظمتوں کے ساتھ حضرت شرافت ظاہری علوم و فنون میں بھی ایسے باکمال ہیں کہ ان کے علوم کی گہرائی، گیرائی اور ان کے بے مثل علمی و تحقیقی کارناموں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، اور آج سے صدیوں پہلے کے علما و فضلا اور مصنفین کی علمی کاوشوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔"[۱]

شریف احمد شرافت اپنے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"میرا نام شریف احمد، تخلص و لقب شرافت، کنیت ابوالظفر ہے۔ میری پیدائش ۱۹ شعبان ۱۳۲۵ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۷ء - ۱۳ اسوج ۱۹۶۴ب کو بمقام ساہن پال شریف تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں ہوئی۔"[۲]

شرافت صاحب نے اپنے جدِ بزرگوار محمد شاہ سے قرآن مجید اور ابتدائی فارسی کتب پڑھیں اور بقول خود عربی اپنے والد صاحب سے پڑھی اور فن کتابت مولوی محمد حسین مبارک رقم عادل گڑھی سے سیکھا۔ کتابت میں نفیس رقم تخلص چنا۔ اپنے والد کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ میں بیعت کی اور انھی کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔[۳]

شرافت صاحب نے جوانی میں کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ جب ۱۹۲۸ء میں پھالیہ میں احمد یار مرالوی کی کتابوں کی اشاعت کا پروگرام چند علم دوست اور احمد یار کے خاندان کے افراد نے بنایا تو کتابت کا کام شریف احمد شرافت ہی نے کیا۔ چنانچہ دیگر کتابوں کے علاوہ انھوں نے ہیر احمد یار کی کتابت بھی کی، جس سے ایک اچھے کاتب کے طور پر متعارف ہوئے۔

شریف احمد شرافت سلسلۂ نوشاہیہ کے بانی حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش (۱۶۵۴-۱۵۵۲ء) کی نسل

۱۔ شریف التواریخ، ص ۱۸۳۱۔ جلد دوم حصہ دوم

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۳۹

۳۔ ایضاً، ص ۱۸۴۰

سے ہیں جو حضرت سلیمان نوری قادری کھلوالی کے جانشین، خلیفہ اور مرید تھے۔ ان سے قادری سلسلے کی ایک نئی شاخ نوشاہیہ وجود میں آئی۔

تصوف کے دوسرے صوفی سلاسل چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی کے بالمقابل یہ سلسلہ پنجاب میں پیدا ہوا، اور یہی وہ سلسلہ سلوک ہے، جس نے دوسرے سلاسل کے برعکس بہت زیادہ مقامی اثرات قبول کیے۔ منقول ہے کہ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے خلفا میں پنجابی رومانی داستان مرزا صاحباں کا اہم ترین کردار مرزا بھی شامل ہے، جو آپ ہی کی دعا سے پیدا ہوا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سلسلے کو ظاہر پرست طبقے میں مقبولیت حاصل نہ ہوئی اور وہ ان سے ناخوش ہی رہا، جیسا کہ شیخ رحمٰن شاہ سکنہ بھڑی شاہ رحمٰن اور مشہور پنجابی شاعر حافظ برخوردار سکنہ بچہ چیٹھہ کے مشہور جھگڑے سے نشان دہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے اشغال وحال پر بھی مقامی رنگ کی چھاپ انتہائی گہری اور اَن مٹ ہے۔ نوشاہی درویش، کیف و مستی اور بے خودی کے عالم میں رقص کرتے ہیں، دھمال ڈالتے ہیں اور "حال" کھیلتے ہیں، ان میں مستی اور سرشاری اس حد تک ہوتی ہے کہ انھیں الٹا لٹکا دینے کی "ترشی" بھی عام حالت میں انھیں واپس نہیں لا سکتی۔ بعض نوشاہی درویش نشہ آور اشیا کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے، ضلع گجرات میں اس سلسلے کی اور بہت سی شاخیں پیدا ہوئیں۔

شرافت صاحب نے نوشاہی سلسلے کے درویشوں کو شریعت کے حصار میں لانے کی کوشش کی، مگر جنھیں شریعت کی راہ پر لانا چاہا، انھوں نے اسے ظاہر پرستی قرار دے کر اپنی سابقہ ڈگر اور پندار کو قائم رکھا، اور ان کی بھرپور مخالفت کی۔ شرافت صاحب نے کتابت کا پیشہ اختیار تو کر لیا، لیکن جب صوفی درویشوں کی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ان کے ملفوظات سے رہنمائی حاصل کی تو طبیعت انھیں تالیف و تصنیف کی جانب لے گئی، اور مرتے دم تک وہ اس عظیم شغل میں مصروف رہے۔ اگرچہ شروع میں مناظرہ بازی کا شوق ان کی راہ روک لیتا تھا، لیکن واجبی دلچسپی کے بعد یہ بحث و مباحثہ اور مجادلے کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے نکل گئے۔ مگر جب اس شوق کی آبیاری کے لیے کسی گاؤں جاتے تو انھیں اس گاؤں کی تاریخ، وہاں کے افراد، اہلِ علم، صاحبانِ سیف و قلم اور ان کے کارنامے اپنی جانب کھینچ لیتے۔ انھی معلومات کی کثرت کو انھوں نے اپنی کتابوں کا حصہ بنایا۔ شرافت صاحب گاؤں گاؤں گھومتے۔ وہاں کے مقابر کی زیارت کرتے، مساجد میں نماز پڑھتے، اہلِ علم گھرانوں کے

کتب خانوں سے استفادہ کرتے اور نادر و نایاب گوہر نکال کر اپنی بیاض کا حصہ بنا لیتے۔ کوئی خطی نسخہ کتنا ہی بدخط، شکستہ اور کرم خوردہ کیوں نہ ہو، وہ اسے پڑھنے اور نقل کرنے کی جس مہارت اور قدرت سے بہرہ ور تھے، ان کے معاصرین میں شاید ہی کوئی ان کا اس میدان میں حریف بن سکے۔ کئی نایاب قلمی نسخوں کی نقلیں انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری کے لیے تیار کیں۔

شرافت نوشاہی نے تاریخ، تذکرہ، تفسیر، تصوف، حدیث، فقہ، تراجم، ادب، رجال، طب، انشا، مجادلہ کے موضوع پر پنجابی، اردو، عربی اور فارسی چاروں زبانوں میں نظم و نثر میں ۲۴۰ سے زائد کتابیں تالیف و تصنیف کیں۔

تاریخ و تذکرہ میں سنین کو اول حیثیت حاصل ہے اور اسی طرح جدید تذکرہ نویسی اور تاریخی ترتیب کے تقاضے بڑھ گئے ہیں۔ یورپی اقوام نے تحقیق و تدقیق کے لیے نئے نئے زاویے بنائے ہیں، اگرچہ شرافت صاحب یورپی زبانوں سے نابلد ہونے کی وجہ سے ان میں سے ایسے مواد کی موجودگی سے استفادہ نہیں کر سکے، مگر ان کی تصانیف یورپی علما کے بنائے ہوئے معیار پر بہت حد تک پوری اترتی ہیں، جو انھیں ایک بلند پایہ اور منفرد تذکرہ نویس اور محقق کے طور پر زندہ رکھیں گی۔ تاہم ان کے تحقیقی نتائج سے اختلاف بھی کیا گیا ہے اور ان اختلاف کرنے والوں میں خود میں بھی شامل ہوں۔ مثلاً حضرت نوشہ گنج بخش کی گوت کیا تھی۔ سادات علوی کا مسئلہ یا پھر قطب شاہ حضرت حنفیہ بن حضرت علی کی نسل میں سے تھے یا حضرت عباس علم دار کی اولاد بابرکت میں سے ہے؟ یا وہ تھے بھی یا نہیں، کھوکھر عربی گوت ہے، یا یہ سکندر مقدونی کے حملے کے وقت بھی پنجاب میں موجود تھے اور پھر گنج شریف حضرت نوشہ گنج بخش کی تخلیق ہے یا اس کے مصنف فقیر غلام محی الدین المعروف نوشہ ثانی ہیں یا کون کون نوشاہی بزرگ اصحاب تصنیف تھے؟ یا کون سی کتاب کس کی تصنیف ہے، اور شرافت صاحب نے جو نتائج نکالے ہیں، ان کا وزن کتنا ہے؟ —— لیکن تحقیق میں کوئی آخری اور حتمی بات نہیں ہوتی۔ ایک محقق اپنی عقل و دانش اور صواب دید کے مطابق نتائج نکالتا ہے، اور دوسرے محقق کی سوچ اور اندازِ فکر اس سے بالکل الٹ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اتفاق اور عدم اتفاق کی راہیں نکلتی رہتی ہیں اور یہ اختلافی راستے کسی اہلِ قلم یا مؤرخ کے تمام تخلیقی کام اور مواد کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے، اس لیے متذکرہ بالا تمام سوالات اہمیت رکھنے کے باوجود بھی شرافت صاحب کے مقام و مرتبہ اور کام کی

عظمت کو کم نہیں کر سکتے ۔

شرافت صاحب کا سب سے جامع کام شریف التواریخ ہے، جو بظاہر سلسلۂ نوشاہیہ کی تاریخ ہے، لیکن ایک انداز سے یہ پنجاب کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ ہے، جس کے ذریعے ہم پنجاب کے ان فرزندوں سے پوری طرح متعارف ہوتے ہیں، جن کے بارے میں ہمارے پاس معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں اور بعض شخصیات تو ہمارے لیے بالکل نئی ہیں، جو شرافت صاحب نے گاؤں گاؤں کی سیاحت کے دوران کھود نکالیں، اہلِ پنجاب ان کے اس کارنامے کی وجہ سے ہمیشہ ان کے احسان مند رہیں گے، اور شریف اقوام اپنے ایسے محسنوں اور فرزندوں کو ہمیشہ احترام و خلوص سے یاد کرتی ہیں۔ شرافت صاحب رجالِ پنجاب سے شاید سب سے زیادہ باخبر اہلِ قلم ہیں ۔

شرافت صاحب کی تصانیف و تالیفات کی فہرست حسب ذیل ہے جو متذکرہ بالا رائے قائم کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے :

تفسیر : ۱۔ دُرّ الیتیم فی فضائل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (عربی)	صفحات ۳۹	سن تالیف ۱۳۵۷ھ
۲۔ علوم القرآن (اردو)	۲۰۰	۱۳۶۳ھ
حدیث : ۳۔ الروض الجنان فی احادیث سید الانس والجان (صلی اللہ علیہ وسلم)	۴۸	۱۳۷۹ھ
فقہ : ۴۔ انوار السیادت فی آثار السعادت	۲۰۴	۱۳۷۵ھ
۵۔ تحفۃ المحبین فی جواز سماع العاشقین	۹۷	۱۳۵۳ھ
۶۔ سعادۃ العلویہ	۱۵۳	۱۳۷۹ھ
۷۔ صحیفۂ مسائل (رشاہدیات)	۲۲۰	۱۳۷۵ھ
۸۔ نقشبندیوں میں سجدۂ تعظیم	۳۶	۱۳۷۶ھ
۹۔ وعظ نوشاہی	۳۵	۱۳۵۹ھ
مناظرہ : ۱۰۔ سجادہ نشین	۱۷۰	۱۳۴۹ھ
۱۱۔ مناظرہ شیعہ سنی	×	۱۳۵۰ھ
۱۲۔ ظفر حنفیہ بر فرقۂ مرزائیہ	۹۷۰	۱۳۶۱ھ
۱۳۔ فیصلہ حقہ	۱۲	۱۳۳۹ھ

۱۴۔ کشف الحقائق	۲۴	۱۳۸۰ھ
۱۵۔ مرأۃ الحق	۴۵	۱۳۵۱ھ
وف: ۱۶۔ اثبات صحبۃ الحسن مع الامام ابی الحسن	۳۰	۱۳۸۷ھ
۱۷۔ الاسرار و المعارف	۱۶	۱۳۹۰ھ
۱۸۔ برکات المحبوب فی زیارت السالک والمجذوب	۲۴	۱۳۶۹ھ
۱۹۔ جواہرات ترجمہ اردو کلماتِ طیبات	×	×
۲۰۔ جواہرِ مکنون (مطبوعہ)	×	×
۲۱۔ خزائن الاسرار	۱۵۴	۱۳۷۵ھ
۲۲۔ ذخائر الجواہر فی بصائر الزواہر	۷۰	۱۳۷۱ھ
۲۳۔ ضیاء العارفین (مجالسِ نوشاہی)	۱۰۴	۱۳۶۶ھ
۲۴۔ فیضِ چشتیہ (فارسی)	۳۲	۱۳۵۷ھ
۲۵۔ کلماتِ طیبات	۱۰۱	۱۳۷۷ھ
۲۶۔ ارشاداتِ سلیمانیہ	۲۱	×
۲۷۔ کلماتِ قدسیہ (مطبوعہ)	۳۴	۱۳۴۶ھ
۲۸۔ کنز المعرفت (ملفوظاتِ نوشاہیہ) جلد اوّل	۴۴۳	۱۳۶۳ھ
۲۹۔ کنز المعرفت جلد دوم	۶۷۷	۱۳۶۵ھ
۳۰۔ کنز المعرفت جلد سوم	۵۷۲	۱۳۷۰ھ
۳۱۔ کنز المعرفت جلد چہارم	۵۲۸	۱۳۸۴ھ
۳۲۔ گوہر آب دار	۱۵	۱۳۶۸ھ
۳۳۔ لطائف الاشارات (مطبوعہ)	۱۱	۱۳۴۴ھ
۳۴۔ ہدایت السالکین (معمولاتِ نوشاہی)	۱۰۰	۱۳۶۵ھ
تاریخ وتذکرہ: ۳۵۔ اعجاز التواریخ۔ فارسی منظوم	۳۰۰	۱۳۸۶ھ
۳۶۔ اعداد التاریخ	۲۱۲	×

۳۷- تاریخ ساہن پال	۷۰۰	۱۳۸۲ھ
۳۸- تاریخ سلاطین	۲۰۰	۱۳۹۳ھ
۳۹- تذکرہ نوشہ گنج بخشؒ (مطبوعہ)	۱۹۲	۱۳۹۶ھ
۴۰- تاریخ عباسی دو حصے	۵۶۶	۱۳۵۴ھ
۴۱- واقعات جنگ ۱۹۶۵ء پاک و ہند	×	۱۹۶۵ء
۴۲- حیات نوشہ گنجؒ کے ماخذ	×	مئی ۱۹۷۰
۴۳- شریف التواریخ جلد اول تاریخ الاقطاب (مطبوعہ)	۱۱۲+۱۳۷۵	۱۳۵۵ھ
۴۴- شریف التواریخ جلد دوم ـ طبقات نوشاہیہ (مطبوعہ)	۱۲۸+۲۰۰۰	۱۳۸۱ھ
۴۵- شریف التواریخ جلد سوم تذکرۃ النوشاہیہ المعروف تحائف الاطہار (مطبوعہ) ۲۹+۵۷۱		
۴۶- شریف التواریخ جلد سوم لطائف الاخیار	۶۱ +۴۵۳	
۴۷- شریف التواریخ جلد سوم معارف الابرار	۴۴ +۳۲۱	
۴۸- شریف التواریخ جلد سوم مآثر الاخیار	۳۰ +۲۳۱	
۴۹- شریف التواریخ جلد سوم عوارف الانوار	۲۴ +۱۵۶	
۵۰- شریف التواریخ جلد سوم صحائف الاسرار	۳۷ +۲۸۲	
۵۱- شریف التواریخ جلد سوم مناہج الآثار	۵۹ +۴۲۸	
۵۲- شریف التواریخ جلد سوم شواہد الافکار	۴۷ +۲۷۶	
۵۳- شریف التواریخ جلد سوم فوائد الاذکار	۷۹ +۴۶۰	
۵۴- شریف التواریخ جلد سوم عمائد الادوار	۱۲۱ +۴۹۵	
۵۵- شریف التواریخ جلد سوم روائح الازہار	۷۹ +۴۰۹	
۵۶- شریف التواریخ جلد سوم طوالع الاظفار	۴۰ +۲۳۶	
۵۷- ماخذ احوال مشائخ نوشاہیہ	۴۸	۱۳۹۴ھ
۵۸- آثار محمد شاہی ـ تاریخ محمد شاہی	۱۱۳	۱۳۸۰ھ
۵۹- اذکار نوشاہیہ	۱۱۲	۱۳۵۴ھ

۶۰۔ ارشاد الاخیار	۱۴۰	۱۳۴۹ھ
۶۱۔ انوارِ نوشاہیہ	۳۲	۱۳۷۱ھ
۶۲۔ تحفۂ نوشاہی	×	×
۶۳۔ تذکرۃ المخدرات	۴۷۸	×
۶۴۔ عواقب المعاقب تعلیق ثواقب المناقب (فارسی)	۱۲۵	۱۳۹۴ھ
۶۵۔ تذکرہ شعرائے نوشاہیہ (ضیافت الابرار من اشعار الاخیار)	۲۱۰۰	۱۳۹۶ھ
۶۶۔ تذکرہ محمد شاہی	۹۰۰	۱۳۸۰ھ
۶۷۔ تذکرہ مصنفین نوشاہیہ	۵۰۰	۱۳۸۶ھ
۶۸۔ تذکرہ میر نواب	۵۰	۱۹۶۱ء
۶۹۔ تذکرہ نوشاہِ عالی جاہ	۶۰۰	۱۳۸۰ھ
۷۰۔ فیضانِ الٰہی ترجمہ اردو تذکرہ نوشاہی	۴۸۰	۱۳۵۲ھ
۷۱۔ جواہر نوشاہیہ	۱۲۰	۱۳۵۳ھ
۷۲۔ تذکرہ آفتاب پنجاب سیالکوٹی (ملا عبدالحکیم)	۵۲	۱۳۹۱ھ
۷۳۔ مرقات الضروریہ ترجمہ اردو مرات الغفوریہ	۱۷۲	۱۴۰۰ھ
۷۴۔ حیاتِ ربانی	۱۲۴	۱۳۷۸ھ
۷۵۔ خلیفۂ اعظم	۱۴۰	۱۳۷۸ھ
۷۶۔ ذکرِ نوشاہی (مطبوعہ)	۳۲	۱۳۸۵ھ
۷۷۔ شاہ عبدالرحمن پاک (مطبوعہ)	۴۰	۱۳۹۱ھ
۷۸۔ صحیفۂ نور	۱۰۰	۱۳۸۰ھ
۷۹۔ تبرکاتِ اوچ متبرکہ گیلانی (مطبوعہ المعارف لاہور)	×	×
۸۰۔ طرز الاولیاء (عربی)	۲۵	۱۳۷۴ھ
۸۱۔ عروۃ الوثقیٰ فی آثار المصطفیٰ	۶۵	۱۳۵۰ھ
۸۲۔ کلید بخشش	۹۴	۱۳۸۰ھ

۸۳ - مآثر الجمال	۶۸	۱۳۷۸ھ
۸۴ - مرات الامین	۷۰	۱۳۸۰ھ
۸۵ - القول المعظم فی مناقب الامام الاعظم (مطبوعہ)	۱۸	۱۹۷۵ء
۸۶ - اعلیٰ حضرت نوشاہی معاصرین کی نظر میں	۳۶	۱۳۹۷ھ
۸۷ - نوشاہ و زمان	۲۲۴	۱۳۸۷ھ
فضائل و مناقب: ۸۸ - استنباہ فی القاب النوشاہ (فارسی)	۲۴۱	۱۳۷۰ھ
۸۹ - خزینۃ الکمالات	۹۶	۱۳۸۲ھ
۹۰ - خصائص القادریہ فی فضائل النوشاہیہ	۱۷۵	۱۳۷۵ھ
۹۱ - زبدۃ الکمالات	۳۹۴	۱۳۸۲ھ
۹۲ - عمدۃ المقامات	۱۵۷	۱۳۸۲ھ
۹۳ - قسطاس القادریہ بموازنۂ قرطاس النقشبندیہ (فارسی)	۹۶	۱۳۶۰ھ
۹۴ - نظائر والاشباہ فی مناقب اولاد النوشاہ (فارسی)	۷۸	۱۳۵۵ھ
۹۵ - یواقیت والمرجان فی مناقب شیخ عبدالرحمٰن (فارسی)	۴۶	۱۳۵۵ھ
نسب نامے و شجرے: ۹۶ - جمہرۃ النسب کا اردو ترجمہ	×	×
۹۷ - حدیقۃ الانساب	۲۰۰۰	۱۳۵۳ھ
۹۸ - نبذۃ السلاسل	۹۵	۱۳۷۸ھ
۹۹ - سلاسل اولیاء اللہ	×	×
ذاتی حالات، مکتوبات، روزنامچے، سفرنامے: ۱۰۰ - کتاب المسطور بین الشرافت والطور	۱۸۳	۱۳۸۰ھ
۱۰۱ - مراسلۃ العظیم بین الشرافت والسلیم	۲۰۸	۱۳۷۰ھ
۱۰۲ - مقالات النورانی بین الشرافۃ والسرور الکیانی	۱۲۸	۱۳۷۰ھ
۱۰۳ - مکاتبۃ اللطیف بین الامین والشریف حصہ اول	۸۰۰	۱۳۶۲ھ
۱۰۴ - مکاتبۃ اللطیف بین الامین والشریف حصہ دوم	۳۰۰	۱۳۶۵ھ

	۱۰۵۔ مکاتیب الاطہر بین الشرافت والاختر	۳۰۶	۱۳۷۰ھ
	۱۰۶۔ مکتوباتِ شرافت	۸۱	۱۳۷۶ھ
	۱۰۷۔ مکتوباتِ شرافت - یادگارِ محبوب	۱۱۰	۱۹۵۶ء
	۱۰۸۔ مکتوباتِ شرافت	×	×
روزنامچے :	۱۰۹۔ روزنامچہ شرافت	۵۰۰	۱۳۷۲ھ
	۱۱۰۔ روزنامچہ شرافت	×	۱۹۷۰ء
	۱۱۱۔ روزنامچہ شرافت	×	۱۹۷۱ء
	۱۱۲۔ یارانِ شرافت حصہ اوّل	۲۳۲	۱۳۸۲ھ
	۱۱۳۔ یارانِ شرافت حصہ دوم	۱۶۴	۱۳۹۰ھ
	۱۱۴۔ یارانِ شرافت حصہ سوم	۱۴	۱۳۹۵ھ
سفرنامے :	۱۱۵۔ بیان الاسفار - (فارسی اردو)	۱۰۵۰	۱۳۹۵ھ
	۱۱۶۔ ثبات الایقان فی سفر الملتان	۹۳	۱۳۷۱ھ
	۱۱۷۔ حدائق الانوار فی زیارت السادات الابرار	۳۷۵	۱۳۵۳ھ
	۱۱۸۔ ہدیۂ احباب سفرنامہ خوشاب	۴۵	۱۳۵۰ھ
	۱۱۹۔ سفرنامۂ حج	۴۹۰	۱۳۹۶ھ
اوراد و عملیات :	۱۲۰۔ شجرہ قادریہ نوشاہیہ (عربی)	×	×
	۱۲۱۔ شجرہ قادریہ نوشاہیہ صلواتیہ (بطرز دیگر)	×	×
	۱۲۲۔ شجرہ شریف نوشاہیہ منظوم - لامیہ	×	×
	۱۲۳۔ شجرہ شریف نوشاہیہ - منظوم - نونیہ	×	×
	۱۲۴۔ شریف الصلوات علی سید الکائنات (عربی) مطبوعہ	۱۰۴	۱۳۸۶ھ
	۱۲۵۔ شمس الانوار فارسی منظوم ترجمہ گنج الاسرار مطبوعہ	۱۵	۱۳۷۲ھ
	۱۲۶۔ صلوات الحسنیٰ	۲۲	۱۳۸۱ھ
	۱۲۷۔ ظہور الانوار فی زیارت النبی المختارؐ	۲۹	۱۳۷۳ھ

	۱۲۸۔ فیض القادریہ فی سلسلۃ النوشاہیہ	۲۴	۱۳۷۱ھ
	۱۲۹۔ قادریہ دعائیں	۳۵	۱۳۷۴ھ
عملیات:	۱۳۰۔ افضل الاعمال	۱۲	۱۳۸۷ھ
	۱۳۱۔ تحفۂ محبوب	۲۴	۱۳۷۱ھ
	۱۳۲۔ ذخیرۂ عملیات	۱۰	۱۳۷۹ھ
	۱۳۳۔ عملیاتِ شرافت زاد العاملین حصہ اوّل	۱۰۰	۱۳۵۷ھ
	۱۳۴۔ عملیاتِ شرافت، طریق الصالحین حصہ دوم	۱۸۳	۱۳۷۹ھ
	۱۳۵۔ وصایائے شرافت	۱۲	۱۴۰۱ھ
ادب:	۱۳۶۔ ارمغانِ امینیہ۔ فارسی، اردو	۲۰	۱۳۷۶ھ
	۱۳۷۔ پنجاب میں اردو غزل کی تاسیس، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ	×	۱۳۸۹ھ
	۱۳۸۔ شاہد نامہ بطرز محمود نامہ (فارسی)	۱۰	۱۳۷۳ھ
	۱۳۹۔ ضرب الامثال (پنجابی اکھان)	۱۶۶	۱۳۵۶ھ
	۱۴۰۔ لطائف علمیہ مطبوعہ	۱۲۸	۱۳۷۳ھ
تحقیق وتنقید:	۱۴۱۔ اصلاح شجرہ شریف نوشاہی (مطبوعہ)	×	۱۳۸۷ھ
	۱۴۲۔ جناب برق کی کتاب نوشہ گنج بخش کا محاسبہ	۴۷	۱۳۹۷ھ
	۱۴۳۔ معارف بجواب تعارف سلسلۂ نوشاہیہ	۷۸	۱۳۹۳ھ
	۱۴۴۔ البرق علی البرق	۴۸	۱۳۹۵ھ
	۱۴۵۔ محاکمہ گلدستہ نوشاہیہ	۱۲۸	۱۳۹۵ھ
	۱۴۶۔ آثارِ شرافت کا تجزیہ	۳۲	۱۳۹۷ھ
	۱۴۷۔ نوشہ پیر مصنف برق کا تجزیہ	۴۴	۱۳۹۷ھ
	۱۴۸۔ نوشۂ پھل گلاب پر تنقیدی نظر	۲۷	۱۳۹۹ھ
	۱۴۹۔ تعیین الحدود جواب حقیقت وحدت الوجود	۱۳۰	۱۳۹۴ھ
	۱۵۰۔ تنقیح الاخبار از مقدمہ چہار باغ	۷۱	۱۴۰۰ھ

۱۵۱۔ تنبیہ الجہلا، تنقیح نوشاہی شعرا	۹۷	۱۴۰۰ھ
۱۵۲۔ تصحیح الاغلاط	×	۱۳۵۰ھ
۱۵۳۔ تحقیق الاخبار من حیات السچیار	۲۳	۱۳۵۰ھ
طب: ۱۵۴۔ رموز الطب	۷۱	۱۳۷۸ھ
متفرقات: ۱۵۵۔ افکارِ شرافت (بیاض)	۷۰۶	۱۳۹۱ھ
۱۵۶۔ بشارات متعلقہ بشارت	×	۱۳۸۱ھ
۱۵۷۔ تحریرِ شرافت (بیاض)	۳۹۶	۱۳۵۰ھ
۱۵۸۔ خزینۃ العلوم (بیاض)	۴۸۶	۱۳۹۱ھ
۱۵۹۔ خزینۂ شرافت (بیاض)	۴۸۸	×
۱۶۰۔ خواب ہائے شرافت	×	۱۳۴۵ھ
۱۶۱۔ درۃ البیضا (بیاض)	۲۲۵	۱۳۹۲ھ
۱۶۲۔ دستور الاخوان	۱۷۴	×
۱۶۳۔ دستورِ شرافت (بیاض)	۱۶۴	۱۳۴۶ھ
۱۶۴۔ رویائے صالحہ	۲۸	۱۳۸۴ھ
۱۶۵۔ سفینۂ شرافت (بیاض)	۴۲۸	۱۳۶۸ھ
۱۶۶۔ فروغِ انجمن	۱۴۴	۱۳۵۸ھ
۱۶۷۔ فوائدِ شرافت (بیاض)	۲۰۰	۱۳۸۸ھ
۱۶۸۔ فوائدِ متفرقہ (بیاض)	×	۱۳۴۵ھ
۱۶۹۔ گنجینۂ شرافت (بیاض)	۶۸۲	۱۳۸۵ھ
۱۷۰۔ مبشراتِ شرافت (بیاض)	۲۴	۱۳۷۳ھ
۱۷۱۔ مخزنِ نوشاہی (بیاض)	۱۳۰	۱۳۹۲ھ
۱۷۲۔ یادگارِ شرافت (بیاض)	۱۵۰	۱۳۷۹ھ
۱۷۳۔ تفریح المؤرخین (بیاض)	۱۱۶	۱۳۸۹ھ

	۱۷۴- توضیح العلوم (بیاض)	۴۶۲	۱۳۹۷ھ
	۱۷۵- تشریح العلوم (بیاض)	۳۶۷	۱۴۰۰ھ
	۱۷۶- مقاصدِ شرافت (بیاض)	۲۵۴	۱۴۰۰ھ
	۱۷۷- مواہب العلوم (بیاض)	۵۱۲	۱۳۹۵ھ
ترتیب وتدوین:	۱۷۸- ختمات القرآن مصنف بشارت نوشاہی علومِ قرآن	۳۲	۱۳۸۱ھ
	۱۷۹- صد ختم کلام اللہ- مصنف بشارت	۳۲	۱۳۸۱ھ
	۱۸۰- فالنامہ قرآنی- فارسی- از نوراللہ نوشاہی	۸	۱۳۶۰ھ
	۱۸۱- تفسیر نوشاہی تفسیر سورہ مزمل از غلام مصطفےٰ نوشاہی	۲۲۲	۱۳۹۳ھ
فقہ:	۱۸۲- مواعظِ نوشۂ پیر المعروف نوشہ پیر دیاں سمجھاؤنیاں	۳۴	۱۳۸۸ھ
تصوف:	۱۸۳- رموزِ عشق از امام شاہ نوشاہی وزیر آبادی	×	۱۳۴۷ھ
	۱۸۴- انتخاب گنج شریف اردو- منسوب بہ کلیات نوشہؒ- مطبوعہ	۴۷۶	۱۳۸۸ھ
	۱۸۵- انتخاب گنج شریف پنجابی منسوب بہ کلیاتِ نوشہ مطبوعہ	۶۲۴	۱۳۸۹ھ
	۱۸۶- معارفِ تصوف- منسوب بہ کلام نوشہ مطبوعہ	۷	۱۳۷۲ھ
	۱۸۷- زاد التقویٰ منظوم مصنف غلام مصطفےٰ نوشاہی	۱۲۶	۱۳۹۸ھ
تاریخ:	۱۸۸- تاریخ نامہ قلعہ رہتاس (فارسی) مطبوعہ المعارف لاہور	×	فروری ۱۹۷۰
	۱۸۹- عیون التواریخ از غلام مصطفےٰ نوشاہی پانچ حصے	۱۰۰۰ سے زائد	۱۳۸۴ھ
تذکرہ:	۱۹۰- تذکرہ سید بشارت نوشاہی تالیف گوہر نوشاہی	۲۰	۱۳۸۱ھ
	۱۹۱- اذکار الابرار از حاجی نواب علی نوشہروی (مطبوعہ)	۱۹۲	۱۳۵۷ھ
	۱۹۲- اذکار الصالحین از محمد حیات نوشاہی شرق پوری	×	۱۳۵۲ھ
	۱۹۳- انوار الصالحین از سید معصوم شاہ گیلانی	×	۱۳۵۲ھ
	۱۹۴- تشریف الفقرا از فقیر غلام محی الدین بخاری نوشاہی نوشہ ثانی	۲۸	۱۳۹۰ھ
	۱۹۵- کتاب المناقب بعد حیات حضرات نوشاہیہ از غلام مصطفےٰ نوشاہی اوراق ۶۰۶		۱۳۹۹ھ
	۱۹۶- قصائد نوشاہی از غلام مصطفےٰ نوشاہی	اوراق ۸۳	۱۳۹۹ھ

۱۹۷۔ گلشنِ نوشاہی منظوم۔ از غلام مصطفےٰ نوشاہی	اوراق ۸۳	۱۳۹۹ھ
۱۹۸۔ روزنامچہ محمد شاہی از حافظ محمد شاہ نوشاہی	×	۱۳۷۴ھ
۱۹۹۔ کشکولِ نوشاہی از فقیر غلام محی الدین بخاری نوشہ ثانی (فارسی)	×	۱۳۸۹ھ
مکتوبات: ۲۰۰۔ انشائے نور اللہ، فارسی از مولانا حافظ نور اللہ نوشاہی	۳۴	۱۳۸۷ھ
۲۰۱۔ رقعاتِ نور اللہ۔ فارسی از مولانا حافظ نور اللہ نوشاہی	×	۱۳۸۷ھ
۲۰۲۔ مکتوبات نور اللہ۔ فارسی از مولانا حافظ نور اللہ نوشاہی	۲۳	۱۳۶۰ھ
۲۰۳۔ مکتوباتِ نوشاہی۔ از غلام مصطفےٰ نوشاہی ساہن پالوی	۲۵۲۴	۱۳۸۸ھ
۲۰۴۔ رقعاتِ نوشاہی۔ از غلام مصطفےٰ نوشاہی ساہن پالوی	۲۴۴	۱۳۸۸ھ
۲۰۵۔ مکتوباتِ تعزیت لبشارت	ص ۱۵۰	۱۳۸۱ھ
۲۰۶۔ مکتوباتِ اعظمیہ۔ مولانا محمد اعظم نوشاہی میروو الوی	۹۶	۱۳۷۵ھ
۲۰۷۔ مکتوباتِ یوسفیہ۔ از مولانا محمد یوسف مردانوی	×	۱۳۹۴ھ
سفرنامے: ۲۰۸۔ زینۃ الاوراق سفرنامۂ عراق۔ از حاجی نواب علی نوشاہی نوشہروی	×	
نسب نامے، شجرے: ۲۰۹۔ تلخیص جمہرۃ النسب (عربی)	۱۸	۱۳۸۵ھ
۲۱۰۔ گلزارِ فقرا از مولانا حکیم کرم الٰہی فاروقی	۴۸	۱۳۸۱ھ
۲۱۱۔ گلزارِ آدم از مولانا حکیم کرم الٰہی فاروقی	×	×
اوراد و عملیات: ۲۱۲۔ بستان الاوراد المعروف وظائف نوشہ ثانی مولانا قل احمد نوشاہی	۱۷۴	۱۳۶۶ھ

{یہاں شرافت نوشاہی صاحب نے حافظ قل احمد پاک ذات کو نوشہ ثانی کہا ہے۔ جب کہ نوشاہی لٹریچر میں یہ لقب فقیر غلام محی الدین انصاری المعروف بخاری والد فقیر عزیز الدین وغیرہ وزرائے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے مخصوص ہے، جن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم درویش بھی تھے اور پنجابی، اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر، صاحبِ تصنیف اور گنج شریف الیسی کلیات کے مصنف بھی تھے۔ منیغم}

۲۱۳۔ جوامع الاسرار از حافظ محمد برخوردار نوشاہی، بحر العشق	۵۳	۱۳۷۳ھ
۲۱۴۔ گنج الاسرار مبینہ تصنیف، حضرت نوشہؒ مطبوعہ	۳۵	۱۳۷۳ھ
۲۱۵۔ مخزن الاعمال المعروف بہ عملیات نوشاہ ثانی، قل احمد نوشاہی	۱۲۲	۱۳۸۱ھ

	۲۱۶ - مخزن القادریہ از مولانا محمد حیات نوشاہی شرقپوری	×	۱۳۵۶ھ
	۲۱۷ - وظیفۂ امینیہ، محمد امین نوشاہی	۴۳	۱۳۹۱ھ
ادب :	۲۱۸ - جذباتِ عشق حصہ اوّل (نوشاہی شاعروں کا پنجابی کلام)	۴۳۴	۱۳۸۸ھ
	۲۱۹ - جذباتِ عشق حصہ دوم (نوشاہی شاعروں کا پنجابی کلام)	۱۲۵	۱۳۹۲ھ
	۲۲۰ - شمحاتِ امین - از محمد امین بن محمد فاضل نوشاہی نوشہروی	۳۹۲	۱۳۸۷ھ
	۲۲۱ - سیلابِ عشق از عنایت اللہ شاہد رضا شرافتی نوڑکوی	۸۱	۱۹۵۴ء
	۲۲۲ - کلیاتِ اشرف - از حکیم محمد اشرف منچری (فارسی، پنجابی، اردو کلام)	۲۵۰	۱۳۸۴ھ
	۲۲۳ - کلیاتِ قل احمد - از قل احمد منچری (فارسی، پنجابی، اردو کلام)	۱۱۴	۱۳۸۴ھ
	۲۲۴ - بہارِ عشق از سائیں خدا بخش درویش نوشاہی	اوراق ۱۸	۱۳۹۶ھ
	۲۲۵ - شاہ نامہ نوشاہی از غلام مصطفےٰ نوشاہی ساہن پالوی	×	×
	۲۲۶ - سی حرفی ہائے نوشاہی	۲۷۰	۱۳۹۴ھ
لغت :	۲۲۷ - لغاتِ نوشاہی فارسی، حافظ قل احمد نوشاہی		
طب :	۲۲۸ - مجرباتِ محمد شاہی از حافظ محمد شاہ نوشاہی	۲۴	۱۳۷۸ھ
	۲۲۹ - مصباح العلاج از حافظ قل احمد نوشاہی	۴۲	۱۳۸۸ھ
	۲۳۰ - مفتاح العلاج از حکیم حافظ الٰہی بخش منظر حق نوشاہی	۴۴	۱۳۷۸ھ
متفرقات :	۲۳۱ - ترویح القلوب از محمد حیات ربانی نوشاہی	۱۹۸	۱۳۶۰ھ
	۲۳۲ - ثمرات الافکار از حافظ قل احمد نوشاہی	۷۸	۱۳۷۸ھ
	۲۳۳ - حقائق الآثار از حافظ جمال اللہ نوشاہی	۱۴	۱۳۷۳ھ
	۲۳۴ - حقائقِ نوریہ از مفتی حافظ نور اللہ نوشاہی رسول نگری	۸۰	۱۳۶۱ھ
	۲۳۵ - روضۃ الزکیہ فی حقائق العلیہ از حافظ الٰہی بخش منظر حق نوشاہی	۲۰۶	۱۳۷۸ھ
	۲۳۶ - فہرست کتب خانہ اعظمیہ، مولانا غلام اعظم نوشاہی	×	۱۳۸۸ھ
	۲۳۷ - کتاب الفوائد از حافظ محمد شاہ نیک اختر نوشاہی	۳۵۶	۱۳۷۸ھ
	۲۳۸ - لطائف گل شاہی از مولانا گل محمد نوشاہی	۱۴۳	۱۳۸۱ھ

۲۳۹۔ وسائط العلوم از حافظ قل احمد نوشاہی	۱۷۴	۱۳۸۱ھ
۲۴۰۔ تبیان القرآن، از حافظ قل احمد نوشاہی	۳۰	۱۳۷۳ھ

پنجاب کے یہ نامور فرزند ۴ جولائی ۱۹۸۳ کو مختصر سی علالت کے بعد اپنے مالکِ حقیقی کے حضور حاضر ہو گئے اور ۵ جولائی ۱۹۸۳ کو صبح انھیں اپنے جدامجد اور دوسرے بزرگوں کے قریب ساہن پال تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں دفن کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً ان یادداشتوں، حاصل مطالعہ اور تاریخی نتائج کو بھی صفحات قرطاس پر منتقل کر دیتے جو ان کے ساتھ ہی وادیِ فنا کا حصہ بن چکے ہیں۔

اہلِ پنجاب، سلسلۂ نوشاہیہ سے منسلک حضرات اور تاریخ تصوف کے طالب علموں کے لیے یہ موت ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ کیوں کہ اس سے جو کمی واقع ہوئی ہے، اس کا پورا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

شریف احمد شرافت مرحوم الفاظ سے مادۂ تاریخ نکالنے میں بہت ماہر تھے، انھوں نے اپنے بیشتر معاصرین کی تاریخ ہائے ولادت و وفات وغیرہ نظم کی ہیں۔ اعجاز التواریخ کا موضوع یہی ہے۔ ان کی دوسری کتاب جو اس موضوع سے متعلق ہے، وہ اعداد التاریخ ہے جس میں ایک ہجری سے ۱۵۰۰ ہجری تک تاریخی مادے دیے گئے ہیں، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات پر کہے ہوئے مادہ ہائے تاریخ دیے جائیں۔ یہ ان کے چند معاصرین کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جو ان کے اظہارِ غم کے لیے اس دنیائے فانی میں موجود ہیں۔

قطعۂ تاریخ وفات جناب شریف احمد شرافت نوشاہی

۱۔ علامہ محمد حسین عرشی امرتسری

پاک سیرت آں شرافت نوشہی ۔۔۔ از دل استقبالِ صورت موت کرد
سالِ ترحیلش بگوشِ منتظر ۔۔۔ گفت ہاتف "پاک سیرت فوت کرد"

شرافت کہ بودہ مہ اوجِ علم ۔۔۔ جہاں تاب در علم و عمل آمدہ
چو رفت از جہاں، سالِ ترحیلِ او ۔۔۔ "غروب مہ اوجِ علم" آمدہ

از مرگِ شرافتِ محقق — تحقیق تمام شد وا دریغا
ہاتف تاریخِ رحلتِ او — "تحقیق تمام شد" بگفتا
۱۴۰۳ھ

۲۔ سید نظیر لدھیانوی

عالمِ معقول شد مستور آہ — دوستاں را رنج و کلفت رخ نمود
سالِ تاریخش ز ہاتف خواستم — "آہ عالی مرتبت مرد" او سرود
۱۴۰۳ھ

۳۔ بشیر حسین ناظم

محقق، مدقق، لطافت شعار — حکیم سخن، ماہرِ طب و طب
مسجل، موقر، مکرم، نبیل — عجم ان کا مادح، موصف عرب
نگہبانِ تعلیم مردانِ حق — قبولِ تصوف کے روشن سبب
خبر اُن کی رحلت کی سن کر ہوا — کوئی نیم بسمل، کوئی جاں بلب
اگر چشم نرگس سے ڈھونڈے کوئی — ملے گی مثال ان کی دنیا میں کب
جو پوچھا گیا ان کا حالِ رحیل — گئے چھوڑ کر عالمِ فانی جب
سرِ حق سے ہاتف نے مجھ سے کہا — مجسم شرافت، سراپا ادب
+۸ — ۱۳۹۵ = ۱۴۰۳ھ

۴۔ محمد حسن میرانی بہاول پوری

حسن را ہاتفِ غیبی و صالش — "شرافت معدنِ انوار" گفتا
قلم برداشتم چوں بہرِ تاریخ — ندا آمد "شرافت پیرو صدیق"
۱۴۰۳ھ

اسلام اور مذاہبِ عالم : مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

مذاہبِ عالم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ۔ یہ کتاب یہ بھی وضاحت کرتی ہے کہ اسلام انسان کے مذہبی ارتقا کی فیصلہ کن منزل تھی۔ اس نے تمام مذاہب کے حقائق کو یک جا کر کے اپنی وحدت میں سمو لیا۔

صفحات ۲۴۸ — قیمت ۳۰ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور ۳

(بقیہ تاثرات)

کے لیے جو بائیس نکات مرتب کیے تھے، مفتی صاحب مرحوم اور حافظ کفایت حسین مرحوم نے ان کی ترتیب وتشکیل میں بہت حصہ لیا۔ ان دونوں بزرگوں نے اس میں شیعہ مکتبِ فکر کی نمائندگی کی۔

ملک کے تمام مسالکِ فکر کے اصحابِ علم پر مشتمل جو اسلامی نظریاتی کونسل بنائی گئی تھی، مفتی صاحب ابتدا ہی سے اس کے رکن چلے آرہے تھے۔ بھٹو دورِ حکومت میں اس کی کارکردگی پر عدم اطمینان کی بنا پر اس سے مستعفی ہو گئے تھے۔ موجودہ عہدِ حکومت میں انھیں اس کونسل کا دوبارہ رکن منتخب کیا گیا، لیکن جب فقہ جعفریہ کے بعض بنیادی مسائل کے سلسلے میں حکومت سے اختلاف پیدا ہوا تو ۳۰ اپریل ۱۹۷۸ کو اس سے استعفا دے دیا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۷۸ کو انھیں بھکر میں شیعہ کے ایک بہت بڑے اجتماع میں قائد ملت جعفریہ منتخب کیا گیا۔ ۲۰ جون ۱۹۸۰ میں حکومت نے زکوٰۃ وعشر کا نظام نافذ کیا تو ۵ جولائی ۱۹۸۰ کو اسلام آباد میں مفتی صاحب کی قیادت میں شیعان پاکستان کی کثیر تعداد نے حکومت کے سامنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ایک معاہدے کے ذریعے شیعہ حضرات کو زکوٰۃ وعشر کی وصولی سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

بہرحال مفتی صاحب مرحوم اپنے دور کے شیعہ مکتبِ فکر کے جلیل القدر عالم اور مجتہد تھے۔ بہت ذہین اور معاملہ فہم تھے۔ تمام مکاتبِ فکر کے اہلِ علم سے ان کے تعلقات و روابط تھے۔ ان کی وفات ایک عظیم علمی سانحہ ہے۔

اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ سُلَامَى
مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيهِ الشَّمْسُ يَعْدِلُ بَيْنَ الِاثْنَيْنِ
صَدَقَةٌ، وَيُعِينُ الرَّجُلَ عَلَى دَابَّتِهِ فَيَحْمِلُ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، أَوْ يَرْفَعُ
عَلَيْهِ مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ خُطْوَةٍ يَخْطُوهَا
إِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ، وَيُمِيطُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ۔ (صحیح مسلم، کتاب
الزکوٰة، باب بیان ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
روزانہ جب سورج نکلتا ہے تو انسان کے جسم میں جتنے جوڑ اور بند ہیں، ان سب کی طرف سے اس پر ضروری
ہے کہ صدقہ کرے۔

۱۔ وہ دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملے میں فیصلہ کرا دیتا ہے، یہ بھی صدقہ ہے۔

۲۔ کسی سوار کی مدد کرتا اور اس کو سواری پر سوار کرا دیتا ہے، یہ بھی صدقہ ہے۔

۳۔ کسی کا سامان اٹھانے میں اس کی اعانت کرتا ہے، یہ بھی صدقہ ہے۔

۴۔ کوئی اچھی بات زبان سے نکالتا ہے، یہ بھی صدقہ ہے۔

۵۔ ہر وہ قدم جو نماز کے لیے اٹھاتا ہے، صدقہ ہے۔

۶۔ راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہوئی دیکھتا ہے اور اسے اٹھا کر دور پھینک دیتا ہے، یہ
بھی صدقہ ہے۔

صدقہ اور نیکی دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ بہت بڑا احسان
ہے کہ اس نے بعض نیکیوں کو انسان کے لیے نہایت آسان بنا دیا ہے اور اس کے لیے اتنی سہولتیں
پیدا کر دی ہیں کہ وہ بغیر کسی تکلیف اور دشواری کے نیکی اور صدقے کے اہم فرائض سے سبک دوش

ہو سکتا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حدود کی وضاحت فرما دی ہے۔ مثلاً :

دو شخص آپس میں کسی وجہ سے خفا ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بغض و عداوت رکھتے ہیں، ان دونوں کی صلح کرا دینا اور ان کی باہمی رنجش کا خاتمہ کرا دینا بہت بڑی نیکی اور بہت بڑا صدقہ ہے — دو شخصوں کی یہ خفگی ممکن ہے بظاہر کسی کو معمولی بات معلوم ہوتی ہو، لیکن درحقیقت یہ بڑی خطرناک شے ہے، اس کو ابتدا ہی میں اگر ختم نہ کر دیا جائے تو یہ دونوں کے دلوں میں برابر پلتی اور بڑھتی رہتی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر ہر وقت یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ کسی دن اس کے نتائج خطرناک نہ نکل آئیں اور یہ معمولی رنجش کسی بہت بڑے فتنے کا دروازہ نہ کھول دے — لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے دن ہی اس کا سد باب کر دیا جائے، جو شخص اس سلسلے میں آگے بڑھتا اور فریقین کی مصالحت کرا دیتا ہے، وہ بہت بڑی نیکی اور بہت بڑا صدقہ کرتا ہے۔

اسی طرح سواری پر سوار ہونے میں کسی کی مدد کرنا، اس کا سامان اٹھا کر سواری پر رکھ دینا، اس کے لیے ٹکٹ خرید دینا، اسے لوگوں کی بھیڑ سے باہر نکال دینا، عظیم نیکی اور صدقہ ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی جسمانی کمزوری یا کسی اور وجہ سے ان نیکیوں میں سے کوئی نیکی بھی کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، یا سستی اور کاہلی کے باعث اس طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا، وہ زبان سے میٹھا بول بولے اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالے جس سے کسی کو قلبی اور ذہنی تکلیف پہنچتی ہو، یہ بھی بہت بڑی نیکی ہے اور بہت بڑے اجر کا کام ہے۔ جب کچھ بولنا ہی ہے اور زبان سے کوئی بات نکالنا ہی ہے، تو کیوں اچھی اور میٹھی بات نہ کی جائے اور گفتگو میں مخاطب کو پیار، محبت اور نرمی سے خطاب نہ کیا جائے۔

نماز کے لیے مسجد کو جانا عظیم الشان اور بنیادی نیکی ہے، اس سلسلے میں جو قدم بھی اٹھے گا، اسے مستقل صدقے کی حیثیت حاصل ہو گی۔

راستے میں پڑی ہوئی کسی تکلیف دہ چیز کو اٹھا کر دور کر دینا کہ اس سے کسی کو اذیت نہ پہنچے، نیکی اور صدقہ ہے۔ مثلاً کیلے کا چھلکا، خربوزے کا چھلکا، اینٹ روڑا وغیرہ راستے سے اٹھا دینا

تاکہ کوئی راہ گزر پھسل نہ جائے یا اسے ٹھوکر نہ لگے، یہ سب باتیں نیکی اور صدقے کی تعریف میں آتی ہیں۔

اس دنیا میں نیکی اور صدقے کی کوئی کمی نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انسان یہ عہد اور تہیہ کر لے کہ اسے ہر صورت میں نیکی کرنا اور برائی سے حتی الامکان مجتنب رہنا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص اثر و رسوخ کے باوجود دو جھگڑے والے فریقوں میں مصالحت نہیں کراتا، کمزور کی امداد نہیں کرتا، نرمی کی بجائے گفتگو میں سخت لب و لہجہ اختیار کرتا ہے، نماز کے لیے مسجد میں نہیں جاتا، تکلیف دہ چیز کو راستے میں پھینک دیتا ہے، وہ برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔

بہر حال اس دنیا میں نیکی اور برائی دونوں کی کثرت ہے۔ جو شخص نیکی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے بھی میدان کھلا ہے، جتنی نیکی چاہے کرتا جائے، اس کی کوئی حد نہیں — جو برائی کا خواہش مند ہے، اس کی حدود بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور بڑی طویل و عریض ہیں، جس قدر چاہے برائی کا ارتکاب کرتا جائے، اگر دل میں خوفِ خدا نہیں ہے تو کوئی اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں —

اسلامی نقطۂ نظر سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنے لیے بھی اچھائی اور خیر کو پسند کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتا ہے۔ اس عالم آب و گل میں نیکی کو پھیلانا اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے کوشاں رہنا، اصل اور بنیادی کام ہے اور اس کی بے شمار صورتیں ہیں۔

نقد و نظر

ایران کے عوامی گیت

از : بذلِ حق محمود

ملنے کا پتا : مکتبۂ فارس، حق سٹریٹ، اردو بازار۔ لاہور۔

کاغذ، کتابت، جلد، سرورق عمدہ

صفحات ۱۷۶ - قیمت ۲۱ روپے

بذلِ حق محمود، اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ علوم کے بعض گوشوں پر مرحوم کی وسیع نظر تھی۔ فارسی میں انھیں بالخصوص درک حاصل تھا۔ زیرِ نظر کتاب "ایران کے عوامی گیت" ان کی وہ تصنیف ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فارسی علم و ادب کے ہر پہلو پر عبور رکھتے تھے۔ کسی ملک کے عوامی گیتوں کو جمع کرنا بہت مشکل کام ہے، اپنی زبان کے عوامی گیتوں کو یکجا کرنا ہی ایک کٹھن مرحلہ ہے چہ جائے کہ دوسرے ملک کی زبان میں اس قدر مواد اکٹھا کیا جائے، بلاشبہ یہ انتہائی دل گردے کی بات ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ مصنف نے کس درجے محنت اور جستجو سے ترک فارسی، تاتاری، ماژندرانی، گورگانی، آذری اور لری زبانوں کے عوامی گیتوں کو منتخب کر کے کتابی شکل دے دی۔ پھر انھوں نے ان گیتوں کا تاریخی پس منظر بھی بیان کیا ہے اور ان کی صوتی اہمیت بھی اپنے قاری کے ذہن نشین کرا دی ہے۔ علاوہ ازیں جو گیت بھی درجِ کتاب کیا ہے، اس میں اس قدیم عہد کی تہذیب و ثقافت سے بھی قارئین کو روشناس کرایا ہے۔

مختلف علاقوں کی جو زبان ان گیتوں میں استعمال ہوئی ہے، اس میں قدیم فارسی کے متروک اور غیر مانوس الفاظ بھی آئے ہیں، جن کو فہم کی گرفت میں لانا بہت مشکل ہے، اس مشکل کو مصنف نے اس طرح حل کیا ہے کہ ان گیتوں کا رواں اور شستہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے، تاکہ ان کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو، اور قاری اس میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے سکے۔

بہر حال کتاب اپنے موضوع میں دلچسپ ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق بھی فاضل مصنف کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ عوامی بولیاں اور گیت کسی خطۂ ملک اور علاقے کی ثقافت کا مظہر ہوتے ہیں، اس کتاب میں جو گیت درج کیے گئے ہیں، ان سے ایران کی قدیم ثقافت کی جھلک نمایاں ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان

از : زاہد منیر عامر

ناشر : مکتبۂ لولاک، فیصل آباد

کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، سرورق بہترین۔

صفحات ۲۰۸ ــ قیمت اعلیٰ کاغذ پندرہ روپے۔ عام کاغذ دس روپے۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے عہد کی نامور شخصیت تھے۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۹۲ کو پٹنہ (صوبہ بہار ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر میں اقامت اختیار کی۔ ۱۹۱۶ء میں اسی شہر میں خطابتی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ (امرتسر) کے حادثے سے متاثر ہو کر میدانِ سیاست میں قدم رکھا۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۱ کو شام چھ بج کر پچیس منٹ پر ملتان میں اس دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھا اور عالمِ جاودانی کی راہ لی۔ ۲۲ اگست کو ملتان میں دفن کیے گئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے مثال مقرر اور خطیب تھے۔ قیامِ پاکستان تک انھوں نے انگریزی حکومت کو اپنا ہدفِ تنقید ٹھہرائے رکھا۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جیل اور ریل میں گزرا۔ مختلف اوقات میں متعدد مرتبہ گرفتار ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو پاکستان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کتاب میں اس سلسلے کی تمام تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ نوجوان مصنف زاہد منیر عامر نے بڑی محنت سے یہ معلومات جمع کی ہیں جو کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔

علمی رسائل کے مضامین

بینات، کراچی — ستمبر ۱۹۸۳

امام سیوطی اور اسبابِ نزول — سید سعید اللہ

حضرت عبداللہ بن رقیہ رضی اللہ عنہما — خالد محمود

امام طحاوی — عبدالرشید عراقی

تعمیرِ انسانیت، لاہور — اگست ۱۹۸۳

قانونِ شہادتِ نسواں — مولانا عمر احمد عثمانی

مسلمانوں کے زوال پر ایک نظر (مسلسل) — علامہ فرید وجدی مصری

عرفات، لاہور — اگست ۱۹۸۳

حضرت نظام الدین اولیا — مفتی محمد حسین نعیمی

الفرقان، لکھنؤ — اگست ۱۹۸۳

سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال — ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

نواب صاحب چھتاری خطوط کے آئینے میں — سید ابوالحسن علی ندوی

ایک نومسلم کے قبولِ اسلام کی داستان — مولانا غازی احمد (سابق کرشن لعل)

محدث، لاہور — اگست ۱۹۸۳

نواب صدیق حسن خاں کی عربی زبان میں دینی اور ادبی خدمات — پروفیسر غلام نبی عارف

میثاق، لاہور — اگست ۱۹۸۳

اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی پہلو — ڈاکٹر اسرار احمد

اظہارِ حق — قاضی نصیر احمد غزنوی

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن : مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاوراتِ عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایۂ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اُٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمتِ قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری

جلد اول — محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیاتِ غالب : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

اکتوبر ، نومبر ۱۹۸۳ء
[illegible]

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

اقبال نمبر

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

مجلسِ ادارت

صدر

پروفیسر محمد سعید شیخ

مدیر مسئول

محمد اسحاق بھٹی

ارکان

مولانا محمد حنیف ندوی — **محمد اشرف ڈار ، معتمد مجلس**

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے
صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس لاہور

فون ۵۳۹۰۸

اقبال نمبر

المعارف لاہور

جلد ۱۶ || اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ || ذی الحجہ ۱۴۰۳، محرم الحرام ۱۴۰۴ || شمارہ ۱۰-۱۱

ترتیب

تاثرات

المعارف کا یہ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ کا مشترکہ شمارہ ہے اور اقبال نمبر ہے۔ علامہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ کو پیدا ہوئے اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو وفات پائی۔ ان کا زمانہ بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نہایت پریشانی کا زمانہ تھا۔ ان کی ولادت کے وقت مغل حکومت کے اختتام پر بیس برس گزر چکے تھے اور یہ ملک مکمل طور پر انگریزی اقتدار کے ماتحت جاچکا تھا۔ معاشرت بدل چکی تھی، رہن سہن کے طور طریقوں میں تغیر آچکا تھا، سیاسی حالات دگرگوں تھے، تعلیم کا اسلوب نئے قالب میں ڈھل چکا تھا اور سوچ بچار کے زاویوں نے اور ہی رخ اختیار کر لیا تھا۔ ان حالات میں اقبال نے اہلِ ہند کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص خطاب کیا، ان کے ذہن و فکر کے دروازے پر دستک دی اور ان کو نئے ولولے اور جوش سے آشنا کیا۔

علامہ اقبال نظم اور نثر دونوں کے بادشاہ تھے، اور انگریزی، فارسی، اردو زبانوں پر ان کی حکمرانی تھی۔ پھر تمام مروجہ علوم پر وہ عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اہلِ ہند اور مسلمانوں کو صدا دی، تمام اقوامِ مشرق کو پکارا اور انتہائی دردمندانہ انداز سے ان کو اپنے افکارِ عالیہ سے آگاہ کیا اور شاعرِ مشرق کے مرتبۂ بلند سے سرفراز ہوئے۔ ان کی زبان ان کے دل کی ترجمان ہے اور بجا طور پر وہ مفکرِ اسلام ہیں۔

انھوں نے دنیا کو غور و فکر کی نئی راہیں دکھائیں، مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ سے آگاہ کیا اور اس عالمِ آب و گل میں عزت و آبرو سے زندہ رہنے کا درس دیا۔

"المعارف" کے اقبال نمبر میں ان کی تعلیمات کے چند پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس بزم میں جن حضرات نے شرکت کی اور علامہ کے افکار کو بیان کیا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ پروفیسر محمد سعید شیخ: انھوں نے اپنے انگریزی مضمون میں اقبال کو اسلام کا جدید ترجمان اور عظیم شارح ثابت کیا ہے۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ جناب عاصم صحرائی صاحب نے کیا ہے جو "اسلام کا

شارحِ عظیم ۔ علامہ اقبال" کے عنوان سے شائع کیا جا رہا ہے. مضمون علمی لحاظ سے لائق مطالعہ ہے ۔

۲۔ سلیم خاں گمی : اقبالیات کے سلسلے میں ان کی نظر بہت وسیع ہے ۔ انھوں نے " اقبال اور تہذیبِ حاضر" کے عنوان سے اقبال کے افکار پیش کیے ہیں ۔

۳۔ ڈاکٹر محمد ریاض : انھوں نے "مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے علامہ اقبال کی دعائیں" کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب اقبالیات کے ماہر ہیں اور " المعارف" کے معزز قارئین ان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں ۔

۴۔ توقیر سلیم : ان کے مضمون کا عنوان " بالِ جبریل کا ایک شعر" ہے ۔ توقیر سلیم کا شمار نوجوان مضمون نگاروں میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے علامہ کے مختلف افکار کو سلجھے ہوئے اسلوب میں بیان کیا ہے ۔

۵۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم : ان کا یہ مضمون اب سے چھپن (۵۶) سال پہلے " علامہ ڈاکٹر سر اقبال" کے عنوان سے علامہ کی زندگی میں مارچ ۱۹۲۷ کے ماہنامہ " آفتاب" (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون جناب محمد عبداللہ قریشی صاحب نے عنایت کیا ہے اور اقبال سے عقیدت و اخلاص کا مظہر ہے ۔

علامہ اقبال سے متعلق ان پانچ مضامین کے علاوہ " دولتِ ہماریہ منصورہ" کے موضوع پر پروفیسر رحمت فرخ آبادی، " اسلام میں دولت کی عادلانہ تقسیم" کے بارے میں ڈاکٹر محمد عبدالقدوس، " جنوبی ایشیا میں عہدِ سلاطین کے کتب خانے" کے متعلق جناب محمد فاضل بلوچ اور " شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات" (دوسری اور آخری قسط) کے سلسلے میں پروفیسر محمد اسلم کے تحقیقی مضامین شائع کیے جا رہے ہیں ۔

ہم ان تمام حضرات کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ " المعارف " کے لیے ان کا سلسلۂ تعاون جاری رہے گا ۔

تحریر: پروفیسر محمد سعید شیخ
ترجمہ: جناب عاصم صہبائی

اسلام کا شارحِ عظیم ــــــ علامہ اقبال

اقبال نے اپنی تحریروں میں جدید سائنس اور فلسفے کی روشنی میں مذہب اسلام اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا نہایت عمیق نظر ــــ سے جائزہ لیا ہے ۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیسوی صدی میں اقبال ہی واحد شخص تھا جسے ہم اسلام کا ممتاز ترین ترجمان اور مفکر کہہ سکتے ہیں ۔ اقبال کے ہم عصر مسلمان مفکرین یا وہ جن کا تعلق گزشتہ نسل سے تھا، جن میں ترکی کے نامق کمال اور ضیا گوک لپ، مصر کے محمد عبدہٗ، رشید رضا اور عبدالرزاق ، ایران کے کاظم عصر ، علامہ طبا طبائی اور علی حسین رشید، شام کے محمد کرد علی، انڈونیشیا کے حاجی آغا سلیم اور اقبال کے اپنے ہم وطنوں میں سرسید، شبلی، امیر علی اور ابوالکلام آزاد سرِ فہرست نظر آتے ہیں ۔ بے شک ان مشاہیر نے اپنے اپنے رنگ میں اسلام کی خدمت کی ہے ۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی اسلام کی ترجمانی جدید فلسفیانہ انداز میں نہیں کی ، اور نہ ان میں سے کوئی مغربی فلسفے پر اقبال جتنی دسترس رکھتا تھا ۔ مزید برآں اقبال نے حقائق کی ترجمانی کے لیے شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا ۔ یہ انداز بھی اس کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا ۔ یہ کہتے ہوئے قطعی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کو سائنس اور فلسفے کے بدلتے ہوئے افق کی روشنی میں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کی اشد ضرورت تھی تاکہ تغیر پذیر حالات میں اقوامِ عالم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مؤثر انداز میں تعلقات استوار کیے جا سکیں ۔

یہ پوچھنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے کہ جدید سائنس اور فلسفے کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تعبیر کی کہاں تک گنجائش ہے اور کیا یہ عمل قرآن و حدیث کی روشنی میں درست ہے ؟ نیز انسان نے جو اپنے طور پر سائنس اور فلسفے کے ذریعے حقائق دریافت کیے ہیں، ان کے اور اسلامی تعلیمات کے درمیان تطابق کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اس کا جواز کیا ہے ؟ اقبال کے ذہن میں اس تطابق و توافق کا پس منظر کیا تھا ۔ ایسا کرنے سے عملاً کیا نتائج مرتب ہوئے ؟ اس مضمون میں اس قسم کے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔

قرآن حکیم میں عقیدہ (FAITH) اور علم (KNOWLEDGE) کے درمیان کوئی قطعی حدِ فاصل مقرر نہیں کی گئی۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ فرد کی دینی اور دنیوی، انفرادی اور سماجی زندگی کے مابین کوئی انفصال وانفکاک نہیں۔ قرآن حکیم میں اس امر کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ یہ کتاب بار بار پڑھی جانے والی ہے۔ اس کے معانی وقت کے ساتھ عیاں ہوتے رہیں گے۔ قرآن حکیم کو جہاں اور دوسرے ناموں سے پکارا گیا ہے، وہاں اس کا نام "الکتاب" بھی ہے۔ "الکتاب" سے مراد ایسی کتاب ہے جس کی تحریر مکمل، جامع اور پیش آئند مسائل کا ساتھ دینے کے قابل ہو۔ قرآنِ حکیم میں تعلیم وتعلم کو سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام حاصل ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں جو سب سے پہلا انقلاب آیا، وہ خواندگی کے ذریعے جہالت کے خاتمے پر مبنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے "قلم" کی تقدیس کی قسم کھائی ہے۔ اور قلم کو القلم کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ الٰہی کی پیام رسانی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو یہ دعا کرنے کا حکم دیا کہ "اے میرے رب میرے علم میں مزید اضافہ فرما۔" (قل رب زدنی علما) علم نہ صرف انسان کے وقار کو بلند کرتا ہے، بلکہ اس کا حصول فرد کی ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کی آب یاری بھی کرتا ہے اور انہیں جلا بخشتا ہے اور انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ حقائق فطرت کو اپنی گرفت میں لا سکے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے کہ انسان فرشتوں سے اس لیے بھی بہتر ہے کہ وہ اشیا کو ان کے صحیح ناموں سے پکار سکتا ہے۔ نئی اشیا کے لیے نئے نام تجویز کر سکتا ہے۔ اشیا کو نئے نام دینے کا مطلب استقرائی تعلیم کے ذریعے تعلقات وضع کرنا ہے۔ مذکورہ بالا معروضات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ قرآن حکیم نے علم اور اس کے حصول کو کس قدر فضیلت بخشی ہے۔ احادیث میں بھی حصولِ علم کے سلسلے میں بے شمار ارشادات ملتے ہیں۔ یہ حدیث تو بہت ہی مشہور ہے: "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ" (علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے) یہ ارشاد بھی حضور کی طرف منسوب ہے۔ "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" (علم حاصل کرو، خواہ اس کے لیے تمہیں چین تک جانا پڑے)۔

ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کوئی جامد مذہب نہیں ہے بلکہ اسلام

تو نام ہے ایک متحرک اور فعال مذہب کا، جس میں تحقیق و تدقیق، دریافت و بازیافت اور اختیار و اجتہاد کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ قرآن اور احادیث کے بعد اجتہاد ہی وہ تیسرا سرچشمہ ہے جس کی مدد سے روزمرہ کی زندگی اور بدلتے ہوئے تقاضوں کے لیے قوانین و ضوابط وضع کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے مسائل جن میں شک و شبہ کا امکان ہو قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے لیے قوانین و ضوابط مرتب کرنے کا نام اجتہاد ہے۔ قرآن حکیم میں سوچ بچار پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ کئی جگہ پر اس قسم کے ارشادات پائے جاتے ہیں: "کیا تم سوچتے نہیں؟" "آخر تم سمجھتے کیوں نہیں؟" "دلیل کیوں نہیں دیتے؟" "کیا تم بصیرت نہیں رکھتے؟" دوسرے مذہب کے لوگوں سے بحث کے دوران بھی اس بات کا حکم ہے کہ معقولیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ دوسروں کو ہمیشہ دلائل و براہین کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسے لوگ جو دلائل سے کام نہیں لیتے اور اپنی اس استعداد کو بروئے کار نہیں لاتے، قرآن نے انھیں گونگے اور بہرے کہا ہے اور انھیں حیوان بلکہ اس سے بھی بدتر مخلوق قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ "خدا کی نظر میں ایسے لوگ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں جو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔" اس کے برعکس وہ لوگ جو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور قرآن کے معانی کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، استنباط اور استدلال کے بغیر نہ تو کسی شے کو قبول کرتے ہیں اور نہ اسے رد کرتے ہیں، قرآن نے انہیں نبیوں کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق گو وحی کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے اور اسلام کے تمام بنیادی اصول وحی ہی کے تابع ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض مسائل کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، تاکہ لوگوں کی عقلی اور ذہنی صلاحیتیں زنگ آلود نہ ہو جائیں۔ ایسے لوگ جنھوں نے اسلامی تعلیمات میں دسترس پیدا کر لی ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ غور و فکر کے ذریعے کتاب و سنت کے مخفی گوشوں کو اجاگر کریں اور انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کریں۔ اس سلسلے میں اسلام نے دو قسم کے اصول وضع کیے ہیں۔ پہلی قسم کے اصول تو وہ ہیں جنھیں قطعی کہا جا سکتا ہے یعنی ان میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں لیکن دوسری قسم کے اصول وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات میں تغیر اور سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ابھرنے والے نئے نئے مسائل کے ساتھ تطبیق پیدا کرنا بھی ضروری ہے اور تطبیق صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب

قوانین میں تغیر پذیری کی گنجائش موجود ہو۔ چنانچہ احادیث میں واضح طور پر اجتہاد کی اجازت موجود ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی ضرورت کے وقت صحابہ کرام اپنی اپنی بصیرت کے مطابق اجتہاد کرتے تھے۔ ایک بار جب حضرت معاذ کو یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تو حضور نے معاذ سے پوچھا کہ "تم لوگوں کے انتظامی امور کس طرح طے کیا کرو گے ؟" ——— حضرت معاذ نے جواب دیا" قرآن کی روشنی میں" حضورؐ نے دریافت فرمایا" لیکن اگر تمھیں قرآن سے رہنمائی نہ مل سکے، ایسی صورت میں کیا کرو گے"؟ حضرت معاذ نے جواب دیا: "سنت کی روشنی میں" آپ نے فرمایا: "لیکن اگر سنت سے بھی رہنمائی نہ مل سکے ؟" انھوں نے عرض کیا کہ "ایسی صورت میں مَیں اپنی ذاتی بصیرت اور اجتہاد سے کام لوں گا"۔ حضرت معاذ نے یہ نہیں کہا کہ میں ایسی صورت میں حضور کی خدمت میں نمائندہ بھجوا کر مشورہ حاصل کروں گا۔ نہ حضور ہی نے اس قسم کی کوئی نصیحت فرمائی، بلکہ حضرت معاذ کے جواب پر خوشنودی کا اظہار فرمایا، اور اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: ہر قسم کی حمد و ثنا اس ذات کے لیے ہے جو جس طرح چاہتا ہے اپنے بندوں کے لیے ہدایت کا سامان پیدا کرتا ہے۔

مندرجہ بالا واقعات علم کے حصول، استدلال اور اجتہاد کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اقبال کا یہی کارنامہ ہے کہ اس نے مسلمہ طور پر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے اسلامی تعلیمات اور سائنس اور فلسفے کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرح نو ڈالی۔

فلسفے کا لفظ یونانی الفاظ PHILEIN اور SOPHIA سے مشتق ہے جس کا مطلب دانائی سے محبت ہے۔ عربی زبان میں فلسفہ اور دانائی کے لیے "حکمت" کا لفظ مستعمل ہے۔ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں کم از کم نو بار اور احادیث میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔

ولیم جیمز کے نزدیک فلسفہ ہمیں اشیا کے متعلق صاف اور واضح انداز میں سوچنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ فلسفے کے ذریعے ہم تعقلات اور خیالات کی صحت جانچتے ہیں۔ یہ اہم کام صرف فلسفہ ہی سرانجام دیتا ہے، جب کہ دوسرے علوم اس سے محروم ہیں۔ ایک اور جدید فلسفی جی ٹی ڈبلیو پیٹرک (G. T. W. PATRICK) کے خیال میں فلسفے کا کام ہماری روزمرہ زندگی کے مشترکہ تجربات اور سائنسی نتائج کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اوّل الذکر کو ہم تجزیاتی تعریف کہتے ہیں، جب کہ مؤخر الذکر کو فلسفے کی ترکیبی تعریف کا نام دیا جاتا ہے۔ بہرکیف ان معنوں کا مقصد قیاسات کا مطالعہ کرنا

ہے۔ لیکن آج منطقی اثباتیت اور فلسفیانہ تجزیات کی ترقی کے باعث ہمارے دور میں فلسفہ اپنا صحیح مقام کھو بیٹھا ہے۔

قرآن حکیم کی اصطلاح "حکمت" کا مفہوم اس سے کہیں دور ہے۔ جزوی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکمت سے مراد حقائق کی کنہ تک پہنچنا اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین کرنا ہے۔ حکمت کا عملی پہلو یہ ہے کہ انسان باطنی صفائی اور روح کی تہذیب کے ذریعے بصیرت اور روشنی حاصل کرے اور روح و جسم کے درمیان توافق کے ذریعے اپنی سماجی زندگی میں توازن پیدا کرے۔ حکمت و فلسفہ سے مراد محض ذہنی یا عقلی برتری نہیں۔ نہ اس کا کام محض کسی ذہنی نظریے کو جنم دینا ہے بلکہ اس کا حقیقی مفہوم زندگی کے حقائق کا جذب و انجذاب ہے۔ زندگی کے نئے پہلوؤں کا سراغ لگانا۔ کائنات کے نئے افقوں کی جستجو کرنا اور پھر انھیں اپنی ذات کا حصہ بنانا یہی فلسفے کا مقصد وحید ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں دانائی اور حکمت کے متعلق ارشاد ہے۔ "ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً" (جس شخص کو حکمت اور دانائی عطا کی گئی بلاشبہ اسے بہت ہی اچھی اور نفع رساں چیز دی گئی) قرآن کا اپنے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جو دانائی کی باتیں سکھاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ دانائی مومن کی کھوئی ہوئی شی ہے۔ چنانچہ یہ جہاں سے بھی اسے ملے وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں آتا ہے "کاد الحکیم ان یکون نبیاً" (دانا شخص نبوت کے قریب ہوتا ہے)۔ مندرجہ بالا ارشادات حکمت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ایک اور روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور یوں دعا مانگا کرتے تھے۔ اے رب مجھے اشیا کے مخفی حقائق اور ان کے اصلی روپ سے آگاہ کر۔ آپؐ کی یہ دعا سراسر فلسفیانہ قسم کی تھی جو ہمیں کانٹ کے تصورِ حقیقت کی یاد دلاتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس سے یہ نتیجہ نکال لے کہ شاید یہ قرآن اور حدیث کے فلسفیانہ رویہ کا نتیجہ تھا کہ اقبالؔ نے کانٹ کے خیالات کی تردید میں مذہب کے مابعد الطبیعیاتی امکان کے عنوان سے مقالہ لکھا تھا۔

جہاں تک قرآنی تعلیمات کا تعلق ہے سائنس کے بارے میں اس کا رویہ مثبت ہے۔ چنانچہ اقبال نے واضح الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ اسلام کا آغاز حقیقتہً استقرائی ذہن کی ابتدا تھی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآن میں مستعمل "آیات" کے لفظ (جس کا واحد آیۃ ہے) کا مفہوم ہے کہ قرآن ایک ایسی

کھلی ہوئی کتاب ہے جس میں ایک طرف تو ہر شے بالصراحت بیان کی گئی ہے اور دوسری طرف اس میں مظاہر کائنات کے متعلق غور و فکر سے کام لینے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن میں اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ لوگ کائنات کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں تاکہ انھیں خالقِ کائنات کا علم ہو سکے۔ کیونکہ یہ کائنات خدا کی ذات کی مظہر ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس مفہوم کی متعدد آیات کریمہ ہیں جن میں سے چند ایک کا یہاں ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

"آسمان اور زمین کی تخلیق اور دن رات کے تغیر میں فہم و بصیرت رکھنے والوں کے لیے یقیناً کئی نشانیاں (آیات) موجود ہیں۔" (آل عمران : ۱۸۹)

"یہ وہی ذات ہے جو بادلوں میں سے بارش برساتی ہے۔ پھر دیکھو اس کے ذریعے ہم نے ہر چیز میں روئیدگی پیدا کی اور کھیتوں کو شاداب کیا جس سے ہم تہ بہ تہ دانے نکالتے ہیں اور کھجوریں پیدا کرتے ہیں اور انگور، زیتون اور انار کے ایسے باغات اگاتے ہیں جن میں سے بعض آپس میں ملتے جلتے ہیں اور بعض مختلف ہیں۔ جب ان میں سے ہر قسم کے درخت کو پھل آتا ہے تو پھلوں کے پکنے کے عمل پر غور کرو۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے بہت سے نشانات مخفی ہیں۔" (الانعام : ۹۹)

"وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور کیا۔ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے تم دنوں اور سالوں کا حساب لگاتے ہو ..... رات اور دن کے آگے پیچھے آنے اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہت نشانیاں ہیں۔" (یونس : ۵-۶)

"اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا، اس پر پہاڑ اور دریا بنائے اور پھر تمام اقسام کے پھلوں کے جوڑے بنائے۔ اس نے رات کو ڈھانپنے والا بنایا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، اور زمین میں کئی قسم کے قطعات ہیں جن میں انگوروں کے باغات، فصلیں اور کھجوروں کے درخت اُگتے ہیں ..... ان کی آب یاری ایک ہی طرح کے پانی سے کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہم پھلوں کو نکالتے ہیں اور ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں۔ اس عمل میں اہلِ بصیرت افراد کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔" (الرعد : ۳-۴)

"یہ وہی ذات ہے جو تمھارے لیے بادلوں سے پانی بھیجتی ہے، جس سے تم اپنی پیاس بجھاتے ہو اور اسی سے درخت نشو و نما پا کر تمھارے لیے سامانِ خوراک فراہم کرتے ہیں۔ زمین سے نباتات اگتی ہیں۔

زیتون، کھجور، انگور اور دیگر اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں بھی صاحب بصیرت کے لیے ایک واضح نشانی ہے اور یہ وہی ذات ہے جس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخر کیا ہوا ہے۔ اس کے حکم سے ستارے بھی تمھاری خدمت پر مامور ہیں۔ بصیرت رکھنے والوں کے لیے ان میں کئی نشانیاں موجود ہیں، اور جو مختلف قسم کی چیزیں اس نے تمھارے لیے زمین پر پیدا کی ہیں اللہ کو یاد کرنے والوں کے لیے ان میں بھی یقیناً نشانی پائی جاتی ہے۔" (النحل : ۱۰-۱۳)

"کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو کہ اسے کس طرح بلند کیا گیا۔ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ انھیں کس طرح زمین میں میخوں کی طرح ٹھونکا گیا ہے، اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔" (الغاشیہ : ۱۷-۲۲)

"کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جنھیں آسمان کی فضا میں مسخر کیا گیا ہے اور بجز اللہ کے انھیں کوئی نہیں تھامتا۔ اہل ایمان کے لیے یقیناً اس میں کئی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔" (النحل : ۷۹)

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنی تعلیم سراسر عقلی اور تجرباتی ہے۔ حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل کیے ہوئے علم کو توہماتی یا غیر حقیقی نہیں قرار دیا گیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اس نے انسان کو کان، آنکھ اور دل اس لیے عطا کیے ہیں کہ وہ اس کا شکر گزار ہو۔ حسی تجربات فطرت کے مظاہر کا علم حاصل کرنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پھلوں کے پکنے، پرندوں کے اڑنے، رات اور دن کے بدلنے اور سورج اور چاند کے طلوع ہونے کے بارے میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یقیناً کائنات میں ایک ایسی عظیم اور طاقتور قوت موجود ہے جو یہ سب کام سرانجام دیتی ہے۔ جوں جوں ہم کائنات کی باریکیوں میں جاتے ہیں ہماری عقل خالق کائنات کی عظمت پر دنگ ہوتی جاتی ہے۔

ان حقائق کے بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق جب تک ہم اشیا کا سائنسی مطالعہ اور تجزیہ نہیں کرتے، اس وقت تک ہم ان کے رازوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اشیا کی ماہیت پر غور کرنے کا یہ سادہ سا عمل اپنی نوعیت کے لحاظ سے کافی پیچیدہ اور پُراسرار ہے۔ ایک ذرّے میں الیکٹرون اور پروٹون کا وجود اور ان کی حرکات و سکنات کا سائنسی مشاہدہ کافی مشکل کام ہے اس سلسلے میں ہر دور کے حکما اور فلاسفہ خاصے الجھے رہے ہیں۔ قدیم و جدید ماہرین طبیعیات کی مشترکہ

کاوشوں سے آج غیر معین اور نامعلوم اشیا کے اصول بھی وضع ہو گئے ہیں۔ کائنات کے بھید اور اسرار کھلتے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے ہم حقائق کی تہ تک پہنچتے جاتے ہیں، ہماری حیرت کی انتہا میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ہم اس ہستی کی عظمت کے ترانے گانے لگتے ہیں جس نے بڑے منظم طریق سے اس کائنات کی تخلیق کی ہے۔ یہی وہ نشانیاں (آیات) ہیں جن کے بارے میں جگہ جگہ غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ کائنات خدا کی کھلی کتاب ہے۔ مظاہر فطرت کے سائنسی مشاہدے کو ہم مقدس کتاب کے مختلف ابواب (سورۃ) کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جنھیں ہم قوانینِ فطرت کا نام دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی سنت یا عادت ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات کا علم حقیقتاً خدا کی ذات کے بارے میں خدا کی ذات سے آگہی حاصل کرنا بھی عبادت ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ اسلام مسلمان اور ایک سائنس دان کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھتا۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ اسلام اور سائنس کے درمیان کبھی کوئی کشمکش یا تنازعہ نہیں پایا گیا۔ حالانکہ عیسائیت کی تاریخ اس الزام سے بری نہیں۔

یہ قرآنی تعلیمات ہی کا کرشمہ ہے کہ سائنسی دور کے آغاز سے قبل مسلمانوں نے بہت سی اشیا کا سائنسی نہج پر مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ فلکیات، ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، جغرافیہ اور تاریخ نویسی میں خاص دسترس پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج سائنسی عمارت استوار ہو سکی ہے۔ اس پس منظر میں اقبال کی یہ بات بہت وزنی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کا آغاز ہی حقیقتاً استقرائی ذہن کی ابتدا تھی۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسلمان سائنس دانوں نے تحقیق و تدقیق کے لیے جو اصول وضع کیے، سائنسی تحقیق کے لیے کم و بیش آج بھی وہی اصول استعمال ہو رہے ہیں۔ اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ یہ یونانیوں کی نہیں، بلکہ عربوں کی تحقیق اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مغربی علما نے پہلی بار سائنسی دریافتوں کے لیے استقرائی طریقے استعمال کیے۔ اقبال کے اس دعوے کی بازگشت بریفالٹ (BRIFFAULT) کی مشہور کتاب THE MAKING OF HUMANITY میں سنی جا سکتی ہے۔ بریفالٹ اس کتاب میں رقم طراز ہے:

"ہماری سائنس عربوں کی تحقیق و تدقیق کی مرہونِ منت ہے۔ انھوں نے سائنسی دور سے قبل ہی فلکیات اور ریاضیات میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ موجودہ سائنسی ترقی میں عربوں کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ موجودہ سائنسی ترقی یونانیوں کی کاوشوں کی مرہونِ منت ہے۔ یہ درست ہے کہ یونانیوں نے بھی تحقیق کے میدان میں قابلِ قدر کام کیا تھا۔ لیکن ان کا طریق کار انتہائی غیر سائنسی تھا۔ عمیق مشاہدہ اور تجرباتی مطالعہ

یونانیوں کے مزاج کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ آج یورپ میں جس سائنسی ترقی کا دور دورہ ہے، اس کی بنیاد عربوں نے ہی استوار کی تھی۔ یونانی تو تجرباتی اصولوں سے بالکل ناواقف تھے۔"

اقبال نے اسلامی تعلیمات کے فکری پہلوؤں کو سائنس اور فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہے۔ اقبال اس توافق وتطابق کے لیے حق بجانب تھے، لیکن کیا یہ کاوش فلسفیانہ طور پر بھی درست ہے؟ اقبال کی فلسفیانہ فکر کا مرکز ومحور عقیدۂ توحید ہے۔ وجودیاتی نقطۂ نظر سے اقبال موحد (MONIST) ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حقیقت ایک اکائی ہے، گو اس کے اظہار کے کئی مراحل یا درجے ہیں۔ مادہ، زندگی، ذہن انسانی بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب حقیقت واحد کے اظہار کے کئی پرتو ہیں، انھیں متعدد حقیقتیں کہنا درست نہیں۔ جہاں تک اقبال کے فلسفۂ علم کا تعلق ہے ہمیں دو قسم کے نظریاتِ علم میں امتیاز کرنا ہوگا۔ ایک وہ جن کی بنا وجودیاتی مفروضات (ONTOLOGICAL PRESUPPOSITIONS) پر ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن کی ابتدا ایسے مفروضات سے نہیں ہوتی۔ اقبال کے نظریۂ علم کا تعلق مؤخر الذکر قسم سے ہے، وہ خدا کی ذات اور اس کی وحدت پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ اس طرح اقبال کا نظریۂ علم قرآن حکیم کے تتبع میں ایک ہمہ گیر نظریۂ علم ہے، جس میں ہر قسم کے ذہنی اور عقلی تجربات کے لیے گنجائش موجود ہے۔ حسی ادراک، استدلال، وجدان، پیغمبرانہ وحی والہام یہ تمام پہلو ایک ہی حقیقت کے کئی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے مختلف ذرائع کا کام دیتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب انسان کو ایک ہی حقیقت کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ سائنس، فلسفہ اور مذہب انسان کے ذہنی اور عقلی ذرائع پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور ان تینوں کی زبانیں مختلف ہیں، ہر ایک کی اپنی اصطلاحیں، اپنا ذخیرۂ الفاظ اور اپنی گرامر ہے، ان کی رسائی کے راستے بھی مختلف ہیں، لیکن یہ اختلاف محض درجہ یا سطح کا ہے، قسم یا نوع کا نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان میں تناقض یا تضاد نہیں ہے۔ اقبال نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے کہ انھیں آپس میں قدم ملا کر چلنا چاہیے، اور یہ بات منطقی طور پر نہ تو ایک مسلمان کے لیے ناممکن ہے اور نہ سائنس دان کے لیے مشکل۔

مسلمان کے لیے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات ضروری ہے کہ وہ اشیا کی حقیقت پر سائنسی اصولوں کے تحت غور کرے کیونکہ مذہب کا مدعا بھی یہی ہے، حیاتیات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم اپنی شخصیت کی داخلی

وحدت اور سالمیت پر زیادہ زور دیں، تاکہ ہم سائنسی، مذہبی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر میں توافق، یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔

اقبال نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" پر اپنی معرکۃ الآرا انگریزی کتاب کے دیباچے میں پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اسلام، جدید سائنس اور فلسفہ کے درمیان ربط پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے پیشرو فلاسفہ کی تقلید کی ہے۔ اس کوشش کی ابتدا الکندی نے کی تھی، اور یہ سلسلہ اس کے وقت سے چلا آرہا ہے کیونکہ بعد میں آنے والے فلاسفہ نے بھی اپنے عقائد کو سائنسی اور فلسفیانہ علم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

امام غزالی، ابن خلدون اور امام ابن تیمیہ اس روش سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایسے فلاسفہ کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ تاہم اقبال نے اس بات کو شدت سے محسوس کر لیا تھا کہ بیسویں صدی کے مسلمان اپنے عقائد کو مغرب میں ہونے والی سائنسی ترقی سے منفصل نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ اقبال نے اسلام کی جو جدید ترجمانی کی ہے اور اسے سائنس اور فلسفیانہ نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ محض قیاسی یا نظریاتی نہیں بلکہ سراسر تجرباتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہی کوشش ایک واحد ذریعہ ہے جس سے مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ ممکن ہے اور جس سے انھیں جہالت کے اندھیرے سے نکالا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اپنے سفرِ یورپ سے واپسی پر محسوس کیا کہ پوری دنیا کے مسلمان دوسری قوموں سے نہ صرف سیاسی لحاظ سے پیچھے رہ گئے ہیں، بلکہ دوسری قومیں زندگی کے ہر شعبے میں ان سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ ٹکنالوجی میں مسلمان قابلِ رحم حد تک غیر ترقی یافتہ تھے۔ ذہنی طور پر ان کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ ان کی اخلاقی حالت بھی دگرگوں تھی۔ بے ہمتی، سستی، کاہلی اور بے نظمی ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بری طرح چھائی ہوئی تھی۔ مذہب جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی مادی محرومیوں کی تلافی کے لیے کافی ہے، محض رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ اپنی ثقافت گم کر چکے تھے اور مغرب کی اندھی تقلید کیے جا رہے تھے، انھوں نے سوچنا ترک کر دیا تھا، اور محض غیر ملکی خیالات اور فیشن کی درآمد پر اکتفا کر لیا تھا۔ ایسے حالات میں اقبال کی صدائے دردمند ابھری جس نے نہ صرف دنیا کے مسلمانوں کو خواب گراں سے اٹھایا بلکہ ان میں ایک نئی بصیرت پیدا کی اور انھیں زندگی سے پنجہ آزما ہونے کی صلاحیت بخشی۔

سلیم خاں گمی

اقبال اور تہذیبِ حاضر

حضرت علامہ اقبال گرم و سرد چشیدہ تھے، ایک زمانہ دیکھا تھا، کئی سال مغرب میں رہے، مغربی اداروں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، شہر شہر قریہ قریہ گھومے، دانش وروں، ادیبوں اور حکیموں سے ملے، قدر و منزلت پائی، کئی امور و معاملات جن سے ہمارا واسطہ نہ پڑا ان کے مشاہدہ و تجربہ میں آئے۔ وہ اہلِ فرنگ یا اہلِ یورپ کی خوبیوں اور خامیوں سے کماحقہ آگاہ تھے۔ انھوں نے اہلِ فرنگ کی فکری تحریکوں کا مطالعہ کیا تھا۔ مغربی دنیا کے مذہبی مسلکوں کا قریب سے تقابلی مطالعہ کیا تھا، وہ عالمی ادیان سے بہت متعارف تھے۔ یہ باتیں ذہن میں تھیں جب ہرمن ہیس نے حضرت علامہ اقبال کے متعلق یہ لکھا کہ وہ فکر و دانش کی تین سلطنتوں کے فرماں روا ہیں۔ (۱) ہندی فکر (۲) مغربی فکر اور (۳) اسلامی فکر، اتنا بڑا مفکر جب اپنی جچی تلی ہوئی رائے پیش کرتا ہے تو ایک دنیا کیا پوری دنیا کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

علامہ اقبال جب تہذیب حاضر کا ذکر کرتے ہیں تو لامحالہ ان کی مراد تہذیب فرنگ سے ہے یعنی اہلِ یورپ کا فکری نظام اور اس فکری نظام کے تحت رواں دواں مختلف ادارے، خواہ یہ ادارے سیاسی ہوں خواہ اقتصادی۔ سماجی ہوں یا تفریحی۔ علامہ ان پر اپنی رائے دو ٹوک انداز میں دیتے ہیں۔

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں — بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے — یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بے باکی

تو تہذیب حاضر کے اثرات نوجوانوں پر کیا مرتب ہوئے، شوخی و شرارت۔ آپ چاہیں تو اس زمرے میں ہڑتالیں، توڑ پھوڑ کی کاروائیاں اور تشدد آمیز جتھہ بندیاں بھی لا سکتے ہیں، یہ تو تھی بات رعنائی کی۔ بیداری میں ملحدانہ خیالات و افکار آتے ہیں۔ مارکس، لینن، ماؤ اور چی گویرا کے خیالات اور کردار کی پسندیدگی اور سرپرستی۔ آزادی سے مراد مادر پدر آزادی ہے۔ یہ آزادی بدتمیزی اور بدقماشی کا دوسرا نام ہے۔ بے باکی، جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جرأت و بے باکی نہیں،

بڑوں اور بزرگوں کی آرا سے اختلاف کا دوسرا نام ہے۔ اساتذہ اور والدین کے احترام سے کنارہ کشی کو بھی بے باکی ہی تصور کیا جائے گا۔ تہذیبِ حاضر نے یہ "تحائف" تو نوجوانوں کو دیے ہیں۔ اگر آپ کو لفظ "تحائف" پر اعتراض ہے تو آپ اسے زہر کہہ لیجیے۔ اقبال نے اِسے زہر ہی کا نام دیا ہے:

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب، اے انقلاب!

تہذیب حاضر نے مسلمان نوجوانوں کو خصوصاً طلبا کو تین چیزیں اور دی ہیں۔ وہ ہیں:

(۱) بے ثباتی (۲) بے یقینی (۳) بے حضوری۔ علامہ فرماتے ہیں:

دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سُرور بے ثبات و بے یقین و بے حضور

نوجوانوں کے اذہان و قلوب میں یہ عوارض کیوں پیدا ہوئے؟ اس لیے کہ نوجوانوں نے اسلام کی حیات آموز تعلیمات پر عمل پیرا ہونے والے اسلاف کی میراث کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

تہذیبِ حاضر نے عہدِ حاضر کو بے حیا کر دیا ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ حضرت علامہ اقبال دعا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

نوجوانوں کے لیے حضرت علامہ کے پاس خصوصی پروگرام بھی ہے۔ وہ کیا ہے؟

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

آج کا نوجوان "لا الہ الا اللہ" پر عمل پیرا ہو کر تہذیبِ حاضر کی آلائشوں سے نہ صرف پاک رہ سکتا ہے بلکہ اُن کو ختم بھی کر سکتا ہے۔ یہی بات ایک اور طرح سے کلامِ اقبال میں ادا ہوئی ہے:

جو ہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخِ گل پر چہک ولیکن کر اپنی خودی میں آشیانہ

ایک دوسری جگہ فرمایا:

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن قدم اُٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے — علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — تیرے بدن میں اگر سوزِ لاالٰہ نہیں

علامہ اقبال مرض کا اعلان کرتے ہیں ۔ پوری توجہ سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، نسخہ بتاتے ہیں تاکہ شفا ہو ۔ پرہیز بھی بیان کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے باوجود اگر تہذیب حاضر کے والا و شیدا اس طرف متوجہ نہ ہوں تو وہ پکار اٹھتے ہیں :

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ظاہر ہے اس کے بغیر کوئی دوسرا چارۂ کار بھی نہیں ۔

اہلِ فرنگ نے ہم مسلمانوں کو ایک اور تہذیبی تحفہ دیا ہے جسے مغربی فلسفہ کہا جاتا ہے ۔ اقبال اسے حکمتِ مغرب کہہ کر یاد کرتے ہیں ۔ اس مغربی فلسفے پر چل کر ہماری جو دُرگت ہوئی، اس کے متعلق فرمایا :

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

دریں چہ شک ۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھی اسی حکمتِ مغرب کی مرہونِ منت ہے ۔ لسانی اور ثقافتی تفرقہ بازی کے جو افکار و تصورات آج کے افق سیاست پر اُڑتے نظر آتے ہیں، یہ مغربی علم السیاست ہی کی تو دین ہیں ۔ جن دنوں ہندی مسلمان اپنے حقوق کے لیے انگریزوں سے سرزمینِ ہند میں بر سرِ پیکار تھے ان دنوں سیاسی اصطلاحوں کی شکل میں انگریزوں نے جو کچھ کیا اس کا ذکر اقبال نے اپنے ایک طنزیہ شعر میں یوں کیا ہے :

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

حضرت علامہ اقبال نے تہذیبِ حاضر کو "کارگہِ شیشہ گراں" بیان کیا ہے ۔ اس کارگاہِ شیشہ گراں کے شب و روز کیا ہیں؟ کلامِ اقبال سے ان کا پتا یوں چلتا ہے :

یہی زمانۂ حاضر کی [illegible] ہے کیا؟ — دماغ روشن و دل تیرہ نگہ بے باک

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں — چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے روا رو — اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں — جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ

یہ حُوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب — بہشتِ مغربیاں، جلوہ ہائے پا برکاب

تہذیبِ حاضر کی ایک اور خصوصیت ملوکیت یا نو آبادیاتی نظام ہے۔ اہلِ یورپ تجارت اور سوداگری کا لبادہ اوڑھ کر آتے تھے اور ملکوں اور قوموں پر ملوکانہ قبضہ کر لیتے تھے۔ ہندوستان میں یہی کچھ ہوا۔ تاجر کے بھیس میں آئے۔ پہلے سازش سے پھر تلوار سے کام لیا اور بحرِ ہند سے بلتستان تک سارے ہندوستان کے مالک بن گئے۔ علامہ اقبال نے اس لائحہ عمل کو "تختہ دُکاں شریکِ تخت و تاج" بیان فرمایا ہے۔ ایک دوسری جگہ وہ اس سیاست گری یا تجارت گری کو قاہری اور سوداگری کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔ کیا زوردار مصرع ہے ؎

قاہری در عصرِ حاضر سوداگری است

سوداگری قاہری کیونکر بنتی ہے؟ یوں کہ فکر ملوکانہ ایسی ہی ایجاد چاہتا ہے۔ فکرِ ملوکانہ کی آرزو اور کوشش سے سوداگری قاہری کا روپ دھار لیتی ہے۔ ایک دوسری جگہ علامہ نے فکرِ ملوکانہ کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت — جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

مزے کی بات یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر تلبیس کے فن میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ملوکیت اور قاہری کے ساتھ ساتھ مساوات کا سبق بھی دیا جاتا ہے تاکہ جن پہ مشقِ ناز ہو رہی ہے ان کو پتا تک نہ چلے کہ درحقیقت ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ استعماریت، ملوکیت، قاہری، آبادیت یا نو آبادیت کے پیروکار محکوم لوگوں اور قوموں کا خون بھی چوستے ہیں اور مساوات کا درس بھی دیتے ہیں:

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و مےخواری و افلاس　　کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

یورپ کا سماجی نظام سرمایہ دارانہ نظام ہے، اس کی بنیاد مادہ پرستی ہے۔ ہر طرف پیسے کی عظمت ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ قوموں کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ ایڈم سمتھ نے مغربی دنیا کا اقتصادی نظام ترتیب دیا ہے۔ اس نے "دولتِ اقوام" نام کی کتاب میں جو کچھ لکھا اس پر آج بھی شد و مد سے عمل ہو رہا ہے۔ اقتصادی بلندی اور اقتصادی پستی مغرب کے سماجی رویے طے کرتی ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ امیر، امیر ترکیوں بن رہا ہے، غریب، غریب ترکیوں بن گیا ہے۔ مساوات کا صرف نام لیا جاتا ہے، اس پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام بندہ گری، بندہ پروری اور بندہ نوازی کا قلع قمع کرتا ہے۔ اس طرف حضرت علامہ اقبال نے یوں اشارہ فرمایا ہے:

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اقبالؒ حکمتِ مغرب کی پیدا کردہ مدنیت کو ختم کرنے کے آرزومند ہیں۔ وہ ایک نئی دنیا پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی دنیا جو حکمتِ قرآن کے مطابق ہو۔

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز　　عالمے در انتظارِ قم ہنوز

مغربی دنیا کی تاخت و تاراج کا اصل سبب کیا ہے؟ ظاہر ہے جدید سائنس اور ٹکنالوجی جس کی بدولت اہلِ مغرب نے مشین پیدا کی۔ مشین کی بدولت صنعتی انقلاب آیا۔ صنعتی انقلاب نے اپنے مخصوص دور کا اخلاق تخلیق کیا، اس اخلاقی نظام نے خدا کو نظر انداز کیا اور اقتصادی دانش نے انسان کو حیوان بنا دیا۔ گویا اہلِ مغرب کی مشینوں کی بدولت اقتصادی حیوان کو جنم دیا ہے۔ آج مسلمان کا مقابلہ اسی اقتصادی حیوان سے ہے جو تہذیبِ حاضر کا خالق بھی ہے اور بندہ بھی۔

علامہ اقبال نے اس کیفیت کو تمثیلی شکل عطا کی ہے۔ ایک بوڑھا بلوچ اپنے بیٹے کو یوں نصیحت کرتا ہے،

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت — ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش — تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اساسیاتِ اسلام

مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں اور کس حد تک ان سے فرد و معاشرے کے تقاضے پورے ہوتے ہیں؟ موجودہ دور کے غلط علمی رجحانات نے کن غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کا کیا جواب ہے؟ اسلام علوم و فنون کے ارتقا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور عقیدہ و عمل کے وہ کون سے خطوط ہیں جو انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں؟

اساسیاتِ اسلام میں ان سوالات سے متعلق بڑے یقین پرور اور پُر اثر اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں ان تمام مشکلات کا تسلی بخش حل پایا جاتا ہے، جن سے کہ آج نوع انسانی دوچار ہے۔

صفحات ۱۶+۲۸۴ — قیمت ۲۵ روپے

اسلام اور فطرت

مولانا محمد جعفر پھلواروی

اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن فطرت کیا ہے اور اسلام کیونکر فطرت کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں اسی اہم موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

صفحات ۸+۱۲۴ — قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے علامہ اقبال کی دعائیں

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہے منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو

اسلام میں دعا کی بے حد اہمیت ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ رسول میں کئی دعائیں ملتی ہیں مسلمانوں کی کوئی نماز اور عبادت دعا سے خالی نہیں۔ اللہ اور رسول نے مسلمانوں کو بار بار ہدایات کی ہیں کہ وہ ہر حال میں خدا کو پکاریں، ہر کامیابی پر خدا کا شکر ادا کریں اور ہر مشکل اور ناکامی کی صورت میں اسی سے مدد مانگیں۔ علامہ اقبال کو ہر سچے اور مخلص مسلمان کی طرح دعا پر بے حد یقین تھا۔ انھوں نے اپنی نثر اور نظم میں دعا کی اہمیت پہ لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت خلوص کے ساتھ مسلمانوں کے اتحاد اور ترقی کے لیے دعائیں لکھتے رہے۔ ان کی بعض دعائیں عام مسلمانوں کے لیے اور بعض مسلم نوجوانوں کے لیے ہیں۔ مگر ہر دعا قبول نہیں ہوتی اور علامہ اقبال کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ البتہ دعا و مناجات دراصل اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ ہے اور ہر پرخلوص بات اور دعا اثر رکھتی ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

دعا کو شرفِ قبولیت بخشنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ علامہ اقبال کو پختہ یقین تھا کہ دعا قبول ہو یا نہ ہو، وہ اپنا خوش گوار اثر ضرور دکھاتی ہے، مگر ممکن ہے بعض دعاؤں کا نتیجہ دیر میں ظاہر ہو۔

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے

علامہ اقبال نے اردو اور فارسی میں بہت سی منظوم دعائیں لکھی ہیں۔ پہلے ہم مختصر طور پہ ان دعاؤں کے بارے میں بحث کر رہے ہیں جو علامہ کے اردو کلام میں کوئی بارہ یا تیرہ جگہوں پر ملتی ہیں۔

ان میں دو تین تو مستقل نظموں کی صورت میں ہیں۔ ایک بانگِ درا میں اس طرح ہے :

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے — پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں، پھر شورشِ محشر کر — اس محملِ خالی کو، پھر شاہدِ لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو — وہ داغِ محبت دے، جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر — خود داریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو — سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا — امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

ان اشعار میں اقبال نے مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی روحانی اور مادی ترقی کی دعا بڑی دردمندی سے کی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے دعا کرتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اور دل اس نورِ بصیرت سے بھر دیے جائیں جو اس شاعرِ اسلام کو عطا ہوا ہے۔ وہ وادی فاران اور حرمِ پاک کا ذکر کرتے ہیں۔ مکہ مکرمہ مسلمانوں کے اتحاد کا مرکز ہے۔ اقبال دعا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عملی طور پر اس مرکزِ اسلام کی طرف متوجہ رکھے، انھیں ایک دوسرے کو حقیقی معنی میں بھائی سمجھنے کی توفیق دے، ان کے دل ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انھیں ایثار اور قربانی کا جذبہ عطا ہو۔ دانائے راز دعا فرماتے ہیں کہ مسلمان اپنے شاندار ماضی کو یاد کرنے والے بنیں، اپنے حال کو بہتر بنائیں، مگر اس سے بھی اہم تر یہ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا سوچنے والے ہوں۔ ماضی یا حال کی ناکامیوں کی روشنی میں وہ اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی ضمانت دینے کے قابل ہوں۔ اس دعا کے آخری شعر میں اقبال اللہ تعالیٰ سے التماس کرتے ہیں کہ ان کی پُرخلوص دعا اور صدا پُراثر ہو :

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد — نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

یہ دعا واقعی بڑی پُر اثر ہے اور اس میں اقبال کی یہ آرزو کتنی مبارک ہے کہ مسلمان صاحب نظر بنیں اور حکیم الامت کی فراست اور بصیرت سے انھیں بھی حصہ ملے ۔ یہ دعا جہاں ایک طرف علامہ کی خود شناسی کو ظاہر کرتی ہے وہاں ملتِ اسلامیہ کے لیے ان کا درد اور سوز بھی اس سے ظاہر اور آشکار ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کے کتنے آرزو مند تھے کہ ان کے افکار اور خیالات عالم انسانی میں اور خصوصاً عالم اسلام میں پھیلیں ۔ انھیں اپنی قرآنی بصیرت کی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بصیرت کی تجلیاں دوسرے مسلمانوں کے دلوں تک بھی پہنچیں :

مری ناؤ گرداب سے پار کر یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر
بتا مجھکو اسرارِ مرگ و حیات کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر ، کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری ، آرزوئیں مری امیدیں مری ، جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل ، مری رزم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر ، یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ، ٹھکانے لگادے اسے

ساقی نامے (بال جبریل) کے یہ اشعار کتنے پُر اثر بلکہ رقت انگیز ہیں ۔ اقبال کشتیٔ ملت کے تیز حرکت کرنے کی دعا کرتے ہیں ۔ ان کے پاس جو کچھ ہے ، اسے وہ قافلۂ اسلامی میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ ان کے پاس تھا کیا ؟ قوم کے درد میں راتوں کو جاگتے رہنے کے دوران کے آنسو، رات اور دن ، مجلس آرائی اور تنہائیوں کا جمع کیا ہوا سوز و ساز اور مسلمانوں کے اتحاد اور ترقی کی آرزوؤں کا سرمایہ۔ اپنے "شکوہ" کے آخر میں بھی انھوں نے دعا فرمائی تھی،

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

اس دعا سے اس آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اسلام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے اور انھیں عجمی اور غیر اسلامی اصولوں کے نقصانات سے آگاہی دے۔ اقبال اسی لیے حجازی بننا چاہتے تھے:

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال ۔ اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کا آخری بند اس دعا اور آرزو پر مبنی ہے کہ مسلمان حکیم الامت کے اس شعری پیغام سے بیدار ہوں جو اردو یا فارسی میں ہے مگر اس کی اصل اسلامی، حجازی اور عربی ہے:

جاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں ۔ جاگنے والے اس بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں ۔ پھر اس بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

اقبال نے دوسری جگہ فرمایا ہے:

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ ۔ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اب دیکھنا یہ ہے کہ ماضی کے تعلق سے اقبال نے دعا و مناجات میں کس طرح کام لیا ہے؟ اقبال بہت بڑے عاشقِ رسولؐ تھے۔ ان کے نزدیک عشقِ رسول سے مسلمانوں کو اتحاد نصیب ہو سکتا ہے اور ایمان و یقین کی لذت بھی عاشقِ رسول، تہذیبِ حاضر اور مغربیت کے فتنوں سے قطعاً محفوظ رہتا ہے۔ اپنے متعلق انھوں نے کیا خوب فرمایا ہے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ ۔ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اس لیے وہ مسلمانوں کے لیے دعا کرتے ہیں کہ وہ عاشقِ رسولؐ بنیں۔ ان کے ایک شعر میں، واقعۂ معراج کی مناسبت سے، صاحبِ مازاغ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے:

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے ۔ تری نظر کا محافظ ہو صاحبِ "مازاغ"

قرآن مجید میں مومنوں کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ ان کا دل ہر قسم کے رنج و غم اور خوف و ہراس سے پاک ہوتا ہے۔ وہ رضائے خداوندی کے طالب ہوتے ہیں اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں، خصوصاً

ابہ کرام کی زندگیاں ایسے ہی ایمان کا نمونہ رہی ہیں۔ وہ عقل و خرد کے نہیں، عشق و جنون کے
، دادہ تھے اور اقبال دعا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی حقیقی کامیابیوں کی خاطر ان مومنوں کی سی دولت
ن نصیب ہو۔ بالِ جبریل کی یہ دو بیتی کس قدر ایمان پرور ہے۔

عطا اسلاف کا سوز دروں کر   شریک زمرۂ "لا یحزنون" کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں   مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

یہ دعا انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی شان رکھتی ہے۔ کیونکہ اقبال، ایک مردِ مومن کے جذبے کے مطابق، اپنے لیے وہی چاہتے تھے جو وہ پوری ملتِ اسلامیہ کے لیے چاہتے تھے۔

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکر بلند   کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

گویا اقبال نے عشقِ رسولؐ اور اسلاف کے سچے ایمان او رعمل کے حوالے سے مسلمانوں کے لیے دعائیں کی ہیں کہ وہ بھی عشقِ رسول اور حقیقی ایمان کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ البتہ حضرت علامہ نے بعض دعاؤں میں کئی بزرگانِ دین کی سیرت کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے۔ اقبال کو استغنا یا بے نیازی کی صفت بہت پسند تھی کیونکہ اسی صفت پر اللہ تعالیٰ کی شانِ صمدیت کا سایہ اور پرتو نظر آتا ہے:

خدائے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں   ذرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر   کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

وہ ایک بیتی میں دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صفت بے نیازی سے مالا مال کرے تاکہ انھیں مہر و وفا اور صاحبِ الہٰی کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بے نظیر شجاعت و قوت سے بھی بہرہ ملے۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر   حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے   اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

پھر اقبال مجاہدین اسلام کے کارناموں کی رعایت سے یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ مسلمان حق کے علم بردار ہوں، باطل کو نیچا دکھانے کے قابل ہو سکیں اور ان کی نگاہوں میں بجلی اور شمشیرِ بے نیام کی سی چمک پیدا ہو:

دل مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے | وہ گرمی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے | نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اقبال نگاہوں سے تلوار اور شمشیر کا کام لینا چاہتے تھے مگر اس بات کی میں مزید وضاحت کر دوں، اقبال کے نزدیک "مردِ مومن" کی نگاہ وہی کام کرتی ہے جو کسی بادشاہ یا سلطان کے لشکر کی تلواریں۔ "ارمغان حجاز" میں اس مناسبت سے وہ اپنے لیے دعا فرماتے ہیں کہ اگر وہ حضرت علی کی شمشیر کے اہل نہیں تو ان کی نگاہ ہی اس شمشیر کی سی ہو جائے تاکہ اس سے وہ دل کے خیبر فتح کرتے جائیں۔ ایک مقام پر وہ اپنے جذبۂ جہاد پر خوش بھی نظر آتے ہیں:

مقابلہ تو زمانے کا خوب کرتا ہوں | اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں، نے امیر جنود
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور | عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود

اقبال باطل کے مقابلے کے لیے شمشیر و اسلحہ کی ضرورت سے بے نیاز یا غافل نہ تھے مگر وہ اسلحہ کے ساتھ ساتھ سیرت و کردار کی پختگی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی | ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اقبال ماضی یا حال کے نہیں بلکہ مستقبل کے شاعر اور مفکر تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے قرآنی افکار پر نوجوان ہمیشہ توجہ کرتے رہیں گے۔ اسی لیے انھوں نے جوانوں پر خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے جوانوں کو اخلاق اور تعلیم و تربیت اپنانے کے معاملے میں عمدہ نصیحتیں کیں اور ان کی امکانی صلاحیتوں کی داد دی۔ جیسے:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے | ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور | قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

اقبال کے نزدیک نوجوان کسی قوم کے جذبۂ عشق کے مانند ہیں اور

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم | عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

اس لیے حضرت علامہ نے نوجوانوں کے لیے خصوصی دعائیں بھی مانگی ہیں۔ دو شعر یوں ہیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے | پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا، آرزو میری یہی ہے | مرا نورِ بصیرت عام کر دے

علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی جوانی بے داغ ہو تاکہ ان میں سے مثالی مردِ مومن پیدا ہو سکیں، لیکن اس کے لیے ایک ضروری بات یہ ہے کہ وہ صحبتِ ناجنس سے بچیں:

خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبتِ زاغ ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی

حضرت علامہ کی توقعات اور ان کی دعائیں بڑی حد تک عملی اور قبول ہوتی نظر آ رہی ہیں، کیونکہ نوجوان پورے عالمِ اسلام میں دین سے سخت وابستگی دکھا رہے ہیں اور عالمِ اسلام میں احیا اور نشاۃ ثانیہ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں، جن کے پیچھے اتحاد، یک جہتی اور کوششِ پیہم کے امور دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر نوجوانوں کے سلسلے میں اقبال کی دعاؤں کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ ان کی ایک اہم دعا ساقی نامے میں یوں ملتی ہے:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے نفَس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے

سبحان اللہ، یہ کیا عظیم دعا ہے کہ "جوانوں کو پیروں کا استاد کر" اور "جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے"۔ حضرت علامہ کا مدعا یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کے ذریعے تعلیماتِ اسلامی کا بھرپور احیا ہو جائے۔ زندگی کے آخری دس گیارہ برس اقبال نوجوانوں پر زیادہ متوجہ رہے۔ کوئی پچاس برس کی عمر تک اقبال ہم خیال دوست تلاش کرتے رہے اور عام مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیتے رہے۔ پھر وہ نوجوانوں کے لیے خصوصی دعاؤں کا آغاز کرتے ہیں۔ پہلا شعر زبورِ عجم میں نظر آتا ہے جو پہلی بار ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

زبادہ کہ بخاکِ من آتشے آمیخت　　پیالۂ بجوانانِ نونیاز آورد

جاوید نامہ اقبال کی عظیم فارسی کتاب ہے جو پہلی بار ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کا ضمیمہ خطاب بہ جاوید (نئی نسل سے باتیں) جوانانِ ملت سے متعلق ہے۔ اقبال نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ اگر وہ دانائے راز کی باتوں کو حرزِ جاں بنائیں تو وہ ان کے لیے بعد از مرگ قبر میں بھی دعاگو رہیں گے:

سرِّ دینِ مصطفیٰؐ گویم ترا　　ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

اس کتاب کی "مناجات" بے بدل اور کم عدیل ہیں۔ اقبال نے اس کتاب میں عظیم حقائق بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ خدا کرے یہ کتاب جوانانِ ملت کے لیے قابلِ فہم و استفادہ ہو:

بحرم و از من کم آشوبی خطاست　　آنکہ در مقرم فرود آید کجاست

یک جہاں بر ساحلِ من آرمید　　از کراں غیر از رم موجے ندید

من کہ نومیدم ز پیران کہن　　دارم از روزے کہ می آید، سخن

بر جواناں سہل کن حرفِ مرا　　بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

ترجمہ: میں ایک سمندر ہوں اور اگر میں طوفان خیز نہ ہوں تو یہ میری خامی ہوگی۔ کہاں ہے وہ جو میری گہرائی تک جا پہنچے۔ ایک دنیا میرے ساحل پر آ رکی۔ کنارے سے اہلِ دنیا نے حرکتِ امواج کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ میں پرانے بوڑھوں سے مایوس ہوں۔ میرے پاس آنے والے دن (مستقبل) کی بات ہے۔ خدایا۔ جوانانِ ملت پر میری بات آسان کر دے۔ ان کے لیے میرے اتھاہ سمندر کو پایاب بنا دے۔

مثنوی پس چہ باید کرد، (اشاعت اوّل ۱۹۳۶ء) کے آخر میں حضورِ رسالت مآبؐ اقبال کی ایک دردمندانہ التجا ملتی ہے۔ اس التماس میں شاعر اپنی صحت کی دعا کرتے ہیں کیوں کہ آواز بیٹھ جانے سے انھیں سحر کے وقت قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں بے لطفی محسوس ہو رہی ہے اور کڑوی دوائیں پی پی کر وہ بے حد اذیت محسوس کر رہے ہیں۔ اس التماس کے علاوہ باقی مناجات ملی امور کے لیے وقف ہے اور جوانانِ ملت کی اصلاحِ حال کی آرزو کو وہ فراموش بھی کیسے کر سکتے تھے؟

این مسلمان زادۂ روشن دماغ　　ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ

در جوانی نرم و نازک چوں حریر   آرزو در سینۂ او زود میر
این غلام ابن غلام ابن غلام   حریت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود   از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
آتش افرنگیاں بگداختش   یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش
"قم باذنی" گوئے و اورا زندہ کن   در دلش "اللہ ھو" را زندہ کن

ترجمہ : اس روشن خیال مسلمان نوجوان کے دل کا تاریک خانہ چراغ کے بغیر ہے۔ جوانی میں وہ ریشم کی طرح نرم و نازک ہے۔ اس کے سینے میں چراغِ آرزو جلد بجھ رہا ہے۔ اس غلام ابنِ غلام کی عقل کے لیے آزادیٔ فکر حرام ہے۔ فرنگیوں کی آگ نے اسے پگھلا دیا یعنی مغربیوں کے دوزخ نے اس جوانِ ملت کی حیثیت بدل دی ہے۔ یا رسول اللہ، قم باذنی" (میری اجازت اور حکم سے اُٹھ) کے کلمات سے اس جوانِ ملت کو زندہ فرمائیں اور اس کے دل میں اللہ ھو (ذکرِ حق) کا ذوق پیدا فرمائیں۔

اقبال، ملت کے نوجوانوں کی ہر کامیابی اور ان کے جوش و ولولہ سے بے حد دل گرم ہوتے تھے۔ چنانچہ جنگِ یرموک میں ایک نوجوان کے جوش جہاد اور ۱۹۱۲ء میں طرابلس و اٹلی کی جنگ کے دوران فاطمہ بنت عبداللہ، ایک گیارہ سالہ عرب لڑکی، کی شہادت کے بارے میں انھوں نے مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ ارمغانِ حجاز، میں وہ جاوید کو مصروفِ نماز دیکھ کر کتنے مسرور ہوتے ہیں۔

چہ می خواہی ازیں مرد تن آسائے   بہر بادے کہ آمد رفتم از جائے
سحر جاوید را در سجدہ دیدم   بہ صبحش چہرۂ شامم بیارائے

وہ آرزو مند تھے کہ جاوید اور جملہ نوجوانانِ ملت عشق رسول کی حلاوت سے مستفید ہوں:

ز شوق آموختم آں ہا و ہوئے   کہ از سنگے کشاید آب جوئے
ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید   ز عشق بگرو رنگ و بوئے

اس دو بیتی کے بعد کی دو دعائیہ دو بیتیاں دیکھیں اور حکیم الامت کے دردِ ملت کو محسوس کریں اور جوانانِ ملت کے لیے ان کی دل سوزی کو بھی۔

یکے بنگر فرنگی کج کلاہان   تو گوئی آفتا نند در ماہان

جوانِ سادہ من گرم خون است — نگہدارش ازیں کافر نگاہاں
بدہ دستے ز پا افتادگاں را — بہ غیر اللہ دل نادادگان را
از آن آتش کہ جانِ من برافروخت — نصیبے دہ مسلماں زادگاں را

یعنی یا رسول اللہ، فرنگی کج کلاہ اور متکبر دیکھنے میں آفتاب و ماہ کی طرح تاب ناک و بارعب ہیں۔ میرے سادہ جوانانِ ملت گرم خون اور اثر پذیر ہیں۔ یا رسول اللہ! ان کافرادا اور فتنہ پرور نگاہ والوں سے میرے یہ نوجوان محفوظ رہیں۔ ہم زوال یافتہ مگر غیر اللہ کو دل نہ دینے والوں کی مدد فرمایئے۔ یا رسول اللہ! جس آگ نے میری روح کو پُرتپش بنا رکھا ہے، اس سے جوانانِ ملت کو بھی حصہ ملے۔

ارمغانِ حجاز کے اس حصے کی چند دوسری رباعیاں بھی ملاحظہ کریں جو اسی سلسلے کی ہیں:

مسلماں آں فقیر کج کلاہے — رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد، چرا نالد؟ نداند — نگاہے یا رسول اللہ! نگاہے
[بی]یاں احوال اورا بر لب آرم — تو جہ بینی نہان و آشکارم
[ز] [دا]د دو صد سالش ہمیں بس — کہ دل چوں کُندہ قصاب دارم
[د]ل عالم بہشتے خرّمے ہست — بشاخ او ز اشکِ من نمے ہست
نصیبِ او ہنوز آں ہاو ہو نیست — کہ او در انتظار آدمے ہست
بدہ او را جوانِ پاک بازے — سرورش از شراب خانہ سازے
قوی بازوے او مانند حیدرؓ — دلِ او از دو گیتی بے نیازے

یعنی مسلمان جو کبھی کج کلاہ تھا اس کے دل سے سوزِ آہ جاتا رہا۔ اس کا دل رو رہا ہے، مگر اسے خبر نہیں کیوں! یا رسول اللہ اس پر نگاہِ التفات فرمائیں۔ آپ پر میرا ظاہر و باطن آشکار ہے۔ میں اس ملت کی حالت کیسے بیان کروں بجز اس کے کہ اس کی دو سو سالہ تاریخ سے میرا دل قصاب کے کندہ "گوشت کی طرح ہے۔ عالمِ اسلام میں ایک مبارک جنت نظر آ رہی ہے، جس کی شاخ میرے آنسوؤں سے تر ہے۔ مگر اس عالم میں ہنگامے بپا نہیں کیونکہ وہ کسی انقلابی انسا[ن] کی تلاش میں ہے۔ یا رسول اللہ! عالمِ اسلام کو پاک باز نوجوان نصیب ہو۔ ایسا نوجوان جس کا

ایک خانہ ساز شراب سے ہو۔ اس نوجوان کے بازو حضرت علی حیدرؓ کے بازوؤں کی طرح قوی ہوں اور اس کا دل دو جہاں سے بے نیاز ہو۔ پھر یوں تو ہر مسلمان کو مؤدب بننا چاہیے مگر اقبال نوجوانوں اور طلبا سے اس صفت کا بالخصوص مطالبہ کرتے ہیں۔ جاوید نامہ میں فرمایا:

نوجوانے را چو بینم بے ادب — روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا — یادِ عہدِ مصطفیٰؐ آید مرا
از زمانِ خود پشیماں می شوم — در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم

مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کو غیر مؤدب دیکھ کر اقبال سخت پریشان اور غم ناک ہوتے تھے۔ اس حالت میں آپ خیر القرون خصوصاً نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک کو یاد کرتے تھے۔

ارمغانِ حجاز میں انھوں نے نہایت واضح طور پر فرمایا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور ادب آموزی میں بھی اضافہ ہونا چاہیے۔

ادب پیرایۂ نادان و دانا ست — خوش آنکو از ادب خود را بیاراست
ندارم آں مسلمان زادہ را دوست — کہ در دانش فزود و در ادب کاست

ایک ادب خوردۂ دل نوجوان کے لیے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اقبال کا ایک مثالی نوجوان ہے اور ان اشعار کا مصداق ہے:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا، غزالِ تاتاری

مطالعۂ حدیث

مولانا محمد حنیف ندوی

استشراق زدہ حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث و سنت کی تدوین و تسوید تیسری صدی ہجری میں محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرض ظہور میں آئی۔ مولانا ندوی نے اس کتاب میں اس اعتراض کا محققانہ جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ حدیث نبوی کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ایک خاص قسم کا تسلسل لیے ہوئے ہے، جس میں شک و ارتیاب کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے حدیث کے علوم و معارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ایک مکمل سائنس ہے، جس میں رجال و روات کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور ان اصولوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جن سے محدثین نے متن کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے۔ اسلام میں حدیث و سنت کا جو درجہ ہے، اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

صفحات ۱۲+ ۲۱۵ قیمت ۲۵ روپے

مقالات

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں آپ کو کچھ ایسے نکات ملیں گے جو اس سے پہلے سامنے نہیں آئے۔ ضروری نہیں کہ مؤلف کے تمام افکار سے آپ کو اتفاق ہو، لیکن یہ بھی کوئی مستحسن بات نہیں کہ ہر فکر نو کو صرف اس لیے ناقابل اعتنا قرار دیا جائے کہ یہ بات پہلے نہیں سنی تھی۔ فکر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور قدرت کا منشا بھی یہی ہے کہ فکری ارتقا جاری رہے۔ جس طرح دین کے خلاف کوئی فکر ہمارے لیے جائز نہیں، اسی طرح دین پر جمود کا قفل لگا دینا بھی درست نہیں۔ اس مجموعے میں آپ کو یہی خصوصیت نظر آئے گی۔ اصول میں استحکام اور فروع میں غور و فکر کی لچک۔

صفحات ۵۰۰ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

جناب توقیر سلیم

بالِ جبریل کا ایک شعر

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

مندرجہ بالا شعر "بالِ جبریل" کا ہے۔ علامہ اقبال کی یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت تک اقبال لندن اور دوسرے یورپی ملکوں کو دیکھ چکے تھے۔ سب سے پہلے وہ ۱۹۰۵ء میں حصولِ تعلیم کے لیے ہندوستان سے باہر گئے اور ۱۹۰۸ء میں واپس آئے، جب وہ یورپ سے واپس آئے تو بار ایٹ لا اور ڈاکٹر تھے، گویا مغربی حکمت و دانش اور فکر و فلسفہ کا گہرا مطالعہ کر کے لوٹے تھے۔ آخری بار ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ساتھ مل کر ہندی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے لیے شب و روز کام کیا۔ گویا مندرجہ بالا شعر امرِ واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
بالفاظِ دیگر یہ شعر اقبال کی حقیقت نگاری کی ایک درخشاں مثال ہے۔ علامہ اقبال نے یہ شعر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے ایک دورے کے دوران کہا۔ یہ ان کی ایک طویل نظم کا شعر ہے۔ اس نظم کو علامہ اقبال نے "افکارِ پریشاں" کا نام دیا، اور یہ نظم حکیم سنائی غزنوی کے مزار کی زیارت کی یاد میں نوکِ قلم پر آئی۔ حکیم سنائی غزنوی شاعر بھی تھے، چنانچہ یہ نظم حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی میں سپردِ قلم کی گئی۔ اس شعر سے پہلے جو اشعار آتے ہیں، ان میں سے دو شعر خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اگر اس شعر کو ان دو اشعار کے سیاق میں پڑھا جائے تو مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی — اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

زیرِ بحث شعر کے مصرعِ اولیٰ میں دعویٰ کیا گیا ہے اور مصرعِ ثانی میں دلیل دی گئی ہے۔ لغوی مفہوم یہ ہے کہ مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ اس لیے اندھا نہ کر سکا کہ میری آنکھوں میں مدینہ و نجف کی

دھول نے سرمے کا کام کیا۔ مرادی مفہوم یہ ہے کہ میری تربیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہوئی تھی، اس لیے فرنگی تہذیب کی چکا چوند میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اگر میری ذہنی و اخلاقی تربیت اسوۂ حسنہ کی مرہونِ منت نہ ہوتی تو ممکن تھا اہلِ فرنگ کی پیش کردہ تہذیب اور دانش کے سامنے میں اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتا اور مغربی طرزِ حیات کے سامنے ہتھیار ڈال کر بے بس ہو جاتا۔ یہ سب کچھ اس لیے نہ ہوا کہ میں مسلمان تھا اور میرا خمیر عشقِ رسول سے اٹھا تھا۔ یہ شعر کلامِ اقبال میں دعوے اور دلیل کی بھی ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔ اس شعر کی تیسری خوبی وہ تیقن ہے جو اس شعر کی ادائیگی اور اظہار میں ملتا ہے۔ اس شعر کی چوتھی اور آخری خوبی اس کا مجاہدانہ اور مجادلانہ انداز ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال نے معرکۂ حق و باطل میں اہلِ حق کی طرف سے اہلِ باطل کو للکارا ہے اور انھیں حق و باطل کی پیکار میں اہلِ حق کی کُلّی فتح کا بھرپور یقین ہے۔ ان چار خوبیوں کی بدولت اقبال کا یہ شعر اقبال شناسی اور اقبال فہمی میں بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں اس شعر کی بنیادی اہمیت کیا ہے۔ آیئے اس پر غور کریں۔

سیاسی پس منظر

اگر اس شعر کو وقت کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ شعر جس زمانے (۱۹۳۳ء) میں کہا گیا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کس مپرسی، زبوں حالی اور آشفتہ سری کا زمانہ تھا۔ پاکستان کے حصول کی جدوجہد ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب بالِ جبریل چھپ کر آئی اس وقت تک مسلم لیگ کی سیاسی زندگی کا دورِ جدید بھی شروع نہ ہوا تھا۔ محمد علی جناح نے جو اس وقت قائدِ اعظم نہ بنے تھے، صوبوں میں رابطۂ عوام کی مہم شروع نہ کی تھی اور نہ مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کا کام شروع ہوا تھا۔ پاکستان کے حصول کا مطالبہ جو ۱۹۴۰ء میں ایک قرارداد کے ذریعے لاہور میں کیا گیا، ابھی پانچ سال دور تھا۔ انگریز اقتدار کی کرسی پر پوری طرح قابض تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں چار سال باقی تھے اور انگریزوں کو نہ جرمنی سے ڈر تھا اور نہ جاپان سے خوف۔ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے اقتدار اور ہندوستان کی اکثریت کے سامنے بے بس تھے۔ ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ ابھی رُوبہ عمل نہ آیا تھا اور ہندوستان میں جمہوریت کی بنیاد استوار نہ ہو سکی تھی۔ فرنگی حکمران کی مرضی پر سیاست و انتظامیہ کا انحصار تھا۔ ہندی مسلمان اقتصادی طور پر پس ماندہ تھے۔ مسلمان

روایت پرستی کا شکار اور جاگیرداری اور زمین داری کا زخم خوردہ تھا۔ مسلمانوں میں ایک اونچا خطاب یافتہ طبقہ پیدا ہوا تھا، جو اسلاف کے کارناموں کو فراموش کر چکا تھا اور انگریز کی غلامی پر نازاں تھا اور اس کی خوشامد میں فخر محسوس کرتا تھا۔ عمومی طور پر بھی یہ انگریز کی تقلید اور غلامی کا زمانہ تھا۔ تقلیدِ فرنگی طرزِ حیات کی اور طرزِ فکر کی اور غلامی انگریزوں کی سیاست اور سیادت کی۔ یہ ایک نہایت تاریک اور کربناک دور تھا۔ اس عہد کی اتھاہ تاریکی، بے پناہ کرب اور افق تا افق آشوب کو اقبال نے اپنی روح کے اندر انگارے کی طرح محسوس کیا اور ہندی مسلمانوں کو فرنگی طرزِ حیات اور طرزِ فکر کی خامیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کیا۔ مسلم جوانوں کو تو اقبال نے خصوصی طور پر خطاب کیا، کیونکہ یہی وہ طبقہ تھا جس میں ایک تو اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ تھی اور دوسرے مستقبل کی امیدوں کا مرکز و محور بھی جوانوں کا یہی طبقہ تھا۔ علامہ کی دور بین نگاہ نوجوان طبقے کو تحریک حصولِ پاکستان کے ہراول دستے کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال شاہین بچوں کے لیے آہِ سحر اور بال و پر کی دعا بارگاہِ ایزدی میں مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہماری ملّی تاریخ کے اس دور میں ہندی مسلمان میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا تھا اور دنیا کی آسودگی بھی چھن چکی تھی کہ علامہ نے سرورِ کائنات تک یہ پیغام بھجوایا:

اے بادِ صبا! کملی والے سے کہو پیغام مرا ‏ ‏ قبضے سے امت بیچاری کے دین بھی گیا دنیا بھی گئی

مغربی تعلیم

اُمت کی یہ بے چارگی فرنگی اقتدار اور مغربی افکار کے باعث پیدا ہوئی۔ ۱۸۳۵ء میں مغل فرماں روا کا سکّہ انگریزوں کے حکم سے بند ہوا۔ ۱۹۳۵ء تک ایک سو سال کے فرنگی اقتدار میں ہندی مسلمان فرنگی اقتدار اور ہندو اکثریت کے دو پاٹوں میں پس کر اپنا قومی تشخص کھو چکے تھے۔ چند خیر خواہانِ ملت نے فرنگی تعلیم و تدریس اور فرنگی دانش و خرد میں نجات کی راہ دیکھی لیکن یہ راہ مسلمانوں کے لیے تاریک راہ ثابت ہوئی، کیونکہ فرنگیوں کے نظام تعلیم نے مسلمانوں کو مذہب سے لاتعلق کر دیا اور یوں ان کے اسلامی عقاید پاش پاش ہو گئے۔

محسوس یہ بنا ہے علومِ جدید کی ‏ ‏ اس دور میں ہے شیشہ عقاید کا پاش پاش

افکار و تصورات کی یہ رزم آرائی کلاسیکل انداز میں سامنے آئی۔ کفر و باطل کی طاقتیں ایک بار پھر حق و صداقت کے سامنے صف آرا ہو گئیں۔ اسلام کے خلاف یورپ کی یہ جنگ ہر کہیں لڑی جا

رہی تھی، لیکن ہندوستان میں یہ جنگ زیادہ شدید تھی۔ اقبال ایک دوراندیش سالار کی حیثیت سے صفِ اوّل میں تھے اور ہندی مسلمانوں کو غنیم کے پینتروں اور تدبیروں سے مسلسل آگاہ کر رہے تھے :

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

کفر و اسلام کا یہ معرکہ سرزمینِ ہند میں کئی محاذوں پر برپا تھا۔ ان میں سے ایک محاذ تعلیم تھا۔ اقبال نے یورپ کی دانش گاہوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ خود بھی کچھ عرصے تک درس و تدریس سے وابستہ رہے تھے۔ اس لیے مغربی تعلیم کے حسن و قبح سے بخوبی آگاہ تھے۔ غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مغربی تعلیم الحاد کے لیے راستہ صاف کرتی ہے اور مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو اسلامی افکار و عقاید سے نہ صرف دور لے جاتی ہے بلکہ بعض حالتوں میں اسلام کے ابطال پر اکساتی ہے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں کہتے ہیں :

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم! — کیا خبر تھی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

یہ بات نہ تھی کہ اقبال جوانوں کو ترقی کرتے ہوئے نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جس قسم کی ترقی مغربی نظامِ تعلیم سے حاصل ہوتی تھی، اس کی تان فرنگیوں کی ملازمت پر ٹوٹتی تھی جسے اقبال دو کفِ جو کا حصول قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے مسلمان بچوں کی تعلیم کی غرض و غایت دو کفِ جو کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس قسم کی تعلیم صرف غلام پیدا کر سکتی ہے اور ہندوستان میں انگریزوں کا اوّلین مقصد ایسے ہی غلاموں کی ساخت و پرورش تھا تاکہ ان کے اقتدار کو دوام حاصل ہو۔ یہ دوام دو کفِ جو کے متلاشی ہی دے سکتے تھے۔

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے روا رو — اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں — جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

دو کفِ جو کی تلاش کرنے والوں کے لیے اقبال کا پیغام واضح تھا:

نری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

اقبال اس اہتمام کے خلاف تھے کہ اقتصادی فوائد کے پیشِ نظر مسلمان اپنی ہستی کا چراغ گل کردے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مسلمان تو کائنات کا مالک ہے:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا تیری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

اقبال کو بعض ناقد ماضی پرست یا عینیت پرست کہتے ہیں جو درست نہیں، اسلام زمانۂ ماضی کا مذہب نہیں۔ اسلام ماضی میں تھا، حال میں ہے اور مستقبل میں روزِ حشر تک رہے گا۔ عینیت پرست جو آرزو کرتا ہے وہ کبھی پوری نہیں ہوتی لیکن اقبال نے آج سے چالیس پچاس سال پیشتر جو کچھ کہا وہ حقیقت بن کر آج ہمارے سامنے ہے۔ اقبال کے پیغمبرانہ اشعار آج حقیقت میں ڈھل چکے ہیں۔ جب وہ مسلمان کو ایشیا کا پاسبان کہتا ہے تو وہ اپنی اس پیغمبرانہ حیثیت سے بات کرتا ہے:

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

غور کا مقام ہے کہ کہاں دو کفِ جو کا متلاشی اور کہاں اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسبان۔ اقبال ہندی مسلمان کو ایشیا کا پاسبان دیکھنا چاہتے ہیں جبکہ مغربی تعلیم اسے ایک بھکاری بنا دیتی ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جسے اقبال مطعون گردانتا ہے:

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز ہو نہ اخلاص تو دعوئ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم!! ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ہمارے انگریز حکمرانوں نے میکالے اور دیگر ماہرین تعلیم کے ذریعے جو نظامِ تعلیم ہم پر مسلط کیا اس کا اصل مقصد ہمیں مسلسل غلام رکھنا تھا۔ اقبال انگریزوں کے اس مقصد سے آگاہ تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو اس سازش سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ علامہ نے جہاں کہیں بھی مغربی تعلیم کا لفظ

استعمال کیا ہے، اس سے مراد برصغیر پاک و ہند میں مروج نظامِ تعلیم سے ہے، جو ان بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا کہ یہاں کے نوجوانوں کو بدستور انگریز کی غلامی میں رکھا جائے۔

اک لرڈ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

علامہ اقبال قدم قدم پر مسلم نوجوانوں کو خبردار کرتے ہیں کہ یہ مغربی تعلیم اسلامی عقاید کو پاش پاش کر کے لادینیت لاتی ہے۔ مردانِ حر کو دکفِ جو کی گداگری پر مجبور کرتی ہے اور جوانوں کی خودی کو ختم کر دیتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خودی کے خاتمے پر ہوتا کیا ہے؟ علامہ کے نزدیک خودی کے چار مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ اطاعت، دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس، تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی اور چوتھا مرحلہ ملتِ اسلامیہ سے وابستگی اور ارتباط۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
فرد میگرد ز ملّت احترام — ملّت از افراد می یابد نظام

خودی کا خاتمہ غلامی کی طرف پہلا قدم ہے اور غلامی روح و بدن کی موت کا اعلان اور ملی انتشار کا ثبوت ہے:

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بار تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد — این و آں و این و آں اندر نبرد

برصغیر پاک و ہند میں مروجہ نظامِ تعلیم سے جس قسم کے جوان تیار ہوتے ہیں ان کو علامہ اقبالؒ نے "بتانِ عصرِ حاضر" کا نام دیا ہے، لیکن یہ وہ بت ہیں جن کی ادا دل کو گرفت میں نہیں لیتی اور تراش خراش آنکھوں کو ٹھنڈک نہیں پہنچا سکتی۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ

بت میں روح تو ہوتی نہیں صرف صورت اور پیکر سے کام چلتا ہے اور اگر صورت غمزہ ادا، تراش خراش اور خط و خال بھی دلآویز نہ ہوں تو پیکر تراشی اور بت گری کارِ عبث ہے۔

رہا روح اور آواز کا مسئلہ تو جب خودی نہ ہوگی تو روح اور آواز کہاں سے پیدا ہوگی۔ کیونکہ وہ دانش گاہیں جہاں مغربی تعلیم دی جاتی ہے، روح کا گلا گھونٹ دیتی ہے:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اقبال ایسے تمام علوم کے خلاف ہیں جن سے مسلمان معاشی طور پر انگریزوں کے دستِ نگر ہوں۔ ان کی خودی خودداری اور ان کی عزت نفس مجروح ہو اور ان ناقابلِ تلافی نقصانات کے باوجود وہ بدصورت اور بدہیئت کاٹھ کے انسان بن جائیں۔ ان کے خیال میں ایسے علم کے بغیر بھی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

اقبال اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مغربی تعلیم سے عزت بھی مل سکتی ہے اور دنیا کی دوسری آسائشیں بھی میسر آسکتی ہیں، لیکن اس سے ہمارے جوانوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اسلام کی درخشاں تعلیمات سے دست کش ہو جائیں گے۔

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا آئی صدا پاؤ گے تعلیم سے اعجاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی فطرت جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

علامہ اقبال مسلمان جوانوں کے لیے مغربی تعلیم کے بجائے اسلامی طرزِ تعلیم کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ یہ نسخہ مسلمان طالب علم کے امراض کا کافی و شافی علاج ہے۔ اگر مسلمان طالب علم اس نسخے پر عمل کرے گا تو الحاد، گداگری اور ذات کی نفی کے عوارض سے رستگاری پالے گا۔ اس کا ضمیر پاک ہوگا، نگہ بلند ہوگی اور شوق کی مستی سے اس کا قلب سرشار ہوگا۔ اس کا سینہ آرزو سے آباد ہوگا اور اس قابل ہو جائے گا کہ دنیا کی امامت کر سکے:

مٹائے قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مغربی خرد

مغربی تعلیم کے بعد جلوۂ دانشِ فرنگ کا دوسرا مظہر مغربی خرد ہے۔ اقبال نے یورپ میں

مغربی خرد کے کئی مظاہرے دیکھے اور ان کے سیاق و سباق پر غور کیا۔ لیکن یہ مظاہرے علامہ کو متاثر نہ کر سکے۔ یہ مظاہرے سطحی جادوگری سے زیادہ نہ تھے:

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی — مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا

جو مسلمان جوان انگریزوں کی عقلی جادوگری سے متاثر ہوا، اقبال اس کو مریض تصور کرتے ہیں، اور اس کا علاج آتشِ رومی کے سوز میں بتاتے ہیں:

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے تیرا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

علامہ اقبال کو احساس ہے کہ فرنگیوں کی فسوں کاری میں گرفتار جوان ان کی بات پر بُرا مان جائیں گے۔ چنانچہ وہ ان سے کہتے ہیں کہ فرنگی عقل و خرد کو آزما کر دیکھ لو نتیجہ سامنے آجائے گا:

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے — فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری

علامہ اقبال نے مغربی فکر و خرد کو خود آزما کر دیکھا ہے۔ اس لیے وہ نتیجے سے پوری طرح آگاہ ہیں:

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟ — دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ حالت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

زمانۂ حاضر کی فکر و دانش نے جو سحر پھونکا ہے اس کے اثرات سے بچ نکلنا آسان نہیں۔ اقبال نے اس سحر کو سحرِ قدیم کا نام دیا ہے کیونکہ اس سحر کی جڑیں افلاطون کے عہد میں پیوست ہیں۔ وہی افلاطون جس کے بارے میں علامہ نے فرمایا:

راہبِ اوّل فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم

انگریز کے اس سحرِ قدیم سے نجات پانے کے لیے بھی علامہ اقبال کے پاس تیر بہدف نسخہ ہے:

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم — گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

مغربی خرد بظاہر روشنی لیکن بباطن تاریکی ہے اور اس کے اثرات سماجی طور پر سخت تلخ:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

ظاہر ہے یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں ضرور تبدیلی واقع ہوگی اور بدیلی ایک بہتر صورتِ حال پیدا کرے گی۔

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ — سست بنیاد بھی ہے آئینۂ دیوار بھی ہے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سست بنیاد ایوان فرنگ جو اہلِ فرنگ نے عقل و خرد کے سحرِ قدیم ے سجا رکھا ہے تباہ کیوں کر ہوگا؟ اس سوال کا جواب یوں ہوگا کہ اس کی بنیاد سیاسی استحصال پر ستوار کی گئی ہے، اس لیے تباہی اس کا مقدر ہے:

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت — جو کچھ ہے وہ ہے فکر ملوکانہ ایجاد

مغربی عقل و خرد میں وقتی اور ہنگامی چکا چوند تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا دامن گہرائی و گیرائی سے خالی ہتا ہے:

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد — تجلی کی فراوانی سے فریاد

گوارا ہے اسے نظارۂ غیر — نگہ کی نا مسلمانی سے فریاد

مغربی عقل و خرد کے کھوکھلا پن سے انسان اور شیطان دونوں آگاہ ہیں۔ یہ بات شیطان کی مجلس ں بیان ہوئی ہے۔ نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں" ابلیس کا پانچواں مشیر اسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اب اسے اہلِ فرنگ کی فراست پر یقین نہیں رہا۔ یعنی اہلِ فرنگ اپنے مخصوص اندازِ فکر میں شیطان ور اس کے ساتھیوں سے بھی کچھ آگے ہی نکل گئے ہیں:

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام — اب مجھے ان کی فراست پر نہیں اعتبار

جس طرح مغربی خرد گمراہ کن اور کھوکھلی ہے، اسی طرح مغربی جنون بھی مصنوعی اور بے اثر ہے اور س میں اتنی سکت نہیں کہ کوئی گریباں چاک ہو سکے:

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک — اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک

اہلِ مغرب کا جنوں اور خرد دونوں مسلمان کے لیے مضر ہیں اور ان سے چھٹکارا بے حد ضروری ہے۔ چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے؟ اس کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ نوجوان طبقہ اسلامی فکر کی پیروی کرے۔ یہ وہی اسلامی فکر ہے جس کے سوتے سرزمینِ عرب سے پھوٹتے ہیں:

فکر صالح در ادب می بائیدت رجعتے سوئے عرب می بسائیدت

اگر ہمارا نوجوان طبقہ اسلامی فکر اپنا لے گا تو اسے برگساں، اشپنگلر، شوپنہار، رسل اور کانٹ کے افکار و تصورات کا مرہون احسان نہ ہونا پڑے گا۔

مغربی تہذیب و ثقافت

مغربی عقل و خرد کے بعد جلوۂ دانشِ فرنگ کا تیسرا مظہر مغربی تہذیب و ثقافت ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب و ثقافت ہمارے لیے زہر کی طرح مہلک ہے۔ مغربی تہذیب نے نوجوان طبقے کے فہم و ادراک اور طرزِ زندگی کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی ذات کو مٹا چکا ہے اور مغربی نوجوانوں کا روپ اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کی وضع قطع، اس کا لباس، اس کی جذباتی کیفیت، اس کا اندازِ نظر، اس کی موسیقی، اس کی مصوری، اس کی ادب نوازی، اس کے کھیل، اس کی مذہب سے بیزاری، اس کی طرف سے مشرقی قدروں کی تضحیک، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مسلمان ہوتے ہوئے انسان کا یورپی ایڈیشن ہو۔ وہ تہذیبِ مغرب کی تقلید میں فخر محسوس کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ یہ نشہ ذہنی بیماری پر دلالت کرتا ہے:

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں بھڑک اٹھا بھبھوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بے باکی

مغربی تہذیب کے والا و شیدا اشیا کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ہیئت پر فدا ہیں۔ انھیں ان اشیا کے باطن کا علم نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی معمولی بات پر مشرق سے ناراض اور مغرب سے خوش ہو جاتے ہیں۔ ان پر اقبال کا طنز بے جا نہیں۔

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے وہاں کنستر سب بلوری ہیں یہاں ایک پرانا مٹکا ہے

ظاہری ٹیپ ٹاپ کی پرستش اور باطن سے بے خبری کا یہی موضوع اس شعر میں ملتا ہے:

نئی تہذیب تکلیف کے سوا کچھ بھی نہیں چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

مغربی تہذیب میں گلگونہ فروش کی رعایت سے مغربی عورت کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو:

یہ حورانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابرکاب

مغربی عورت کے مقابلے میں مسلمان عورت اس لیے بہتر سماجی اور تہذیبی حیثیت کی مالک ہے کہ اسے

لونہ یا غازہ کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ علامہ اقبال مسلمان عورت کو جو مشورہ دیتے ہیں وہ قیمتی بھی ہے اور قابلِ دید بھی۔

بہل اے دخترک دلبری ہا مسلمان را نزیبد کافری ہا
منہ دل بر جمالِ غازہ پرور بیاموز از نگاہ غارت گری ہا

دختران ملت کے لیے علامہ اقبال کا یہ پیغام بھی کچھ کم اہم نہیں۔

ز شام ما بروں آور سحر را بقراں باز خواں اہلِ نظر را
تو میدانی کہ سوزِ قرأت تو دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

مغرب کی کھوکھلی تہذیب میں جس چیز کو آزادی کا نام دیا گیا ہے، دراصل وہ غلامی کا دوسرا نام ہے۔ انسانی تہذیب میں اگر کہیں صحیح آزادی میسّر ہے تو وہ صرف اسلام میں ملتی ہے:

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر مری دانش ہے افرنگی، مرا ایمان ہے زناری

مغربی تہذیب کے انعامات، شراب، جوا اور زنانِ بازاری کا اندازہ علامہ کی نظم "یورپ اور سوریا" سے لگایا جا سکتا ہے۔

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبی عفت و غمخواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے مئے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اہلِ فرنگ کے قلب و نظر میں فساد اور انتشار ہے اور فرنگی مدنیت کی روح ناپاک ہے:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اس فسادِ قلب و نظر کی ایک اور وجہ بھی ہے جسے یکتائی کے فقدان سے تعبیر کیا جائے گا۔ یورپ جغرافیائی قوم پرستی پر یقین رکھتا ہے۔ مختلف قومیں جغرافیہ کے سانچوں میں اسیر ہیں اس لیے خیر کے لیے کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ان کے لیے مشکل ہے۔ البتہ شر کے لیے وہ آسانی سے یک جا ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں شر کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ نظریاتی اعتبار سے جغرافیہ یا رنگ و نسل کا

امتیاز بھی اسلام میں مفقود ہے۔

بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی روح بیمار ہے اور جو بیماری اُسے لاحق ہے وہ لاعلاج ہے۔ یہ بیماری بے ثباتی، بے یقینی اور بے حضوری کی ہے، فسادِ قلب و نظر نے اس بیماری کو اور پیچیدہ بنا دیا ہے:

دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور　　　بے ثبات و بے یقین و بے حضور

اس بیمار تہذیبی ماحول میں ہمارے نوجوان طبقے کے جو افراد پلے بڑھے ہیں اور مغربی تہذیب و ثقافت پر جان نثار کرتے ہیں، ان کے لیے علامہ اقبال کا ردِ عمل ڈھکا چھپا نہیں، واضح اور دو ٹوک ہے۔ علامہ اقبال دردِ دل سے مسلمان نوجوانوں کو مشورہ دیتے ہیں اور خلوصِ دل سے دعا بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے مغربی تہذیب کے بُرے اور مضر اثرات سے بچائے:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی　　　خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

حکیم فرزانہ

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

اب تک غالب کی شاعری اور شخصیت پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس میں اضافہ کرنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا، مگر شیخ محمد اکرام نے "حکیم فرزانہ" میں غالب کی "دید و دانش" کی جو نوبہ نو پرتیں کھولی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی غالب پر وہ کچھ لکھا ہی نہیں گیا جو لکھا جانا چاہیے تھا، اور شیخ صاحب نے "حکیم فرزانہ" کی صورت میں اس جستجو کا ایسا آغاز کیا ہے جو امکانات سے پُر ہے۔ دراصل ان کے نزدیک جدید تنقید کا معیار یہ ہے کہ وہ شعر و ادب کے مطالعے کو حیاتِ انسانی کی عمیق گہرائیوں کا مطالعہ بنا دے اور حق بات یہ ہے کہ شعرِ غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام نے جدید نقاد کا یہ فریضہ کمال خوبی سے پورا کیا ہے۔

صفحات: ۸ + ۲۰۷　　　قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم
ترتیب: محمد عبداللہ قریشی

علامہ ڈاکٹر سر اقبال

اب سے کوئی چھپن ۵۶ برس پیشتر لاہور کے مطلع صحافت پر ماہنامہ "آفتاب" طلوع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی اور ان کے شاگرد آغا نند شرر تھے۔ آغا شاعر، دلی کی آبرو تھے۔ شاعری میں نواب فصیح الملک بہادر میرزا داغ دہلوی کے شاگرد اور علامہ اقبال کے استاد بھائی تھے۔ خود بھی ایک باکمال شاعر اور نثر نگار تھے، اسی بنا پر راجہ صاحب جھالاوار نے اپنی عقل و دانش میں اضافے کی خاطر انھیں اپنی مصاحبت میں لے رکھا تھا۔ شیخ عبدالقادر مدیر مخزن لاہور نے اپنے ادارۂ مخزن کی جانب سے ان کا مجموعۂ کلام "تیر و نشتر" کے نام سے شائع کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا تھا۔ قرآن مجید اور رباعیات عمر خیام کے منظوم تراجم ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

ماہنامہ آفتاب کی مارچ ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں آغا صاحب نے "گرامی، اقبال اور حسرت" کے زیر عنوان ایک نہایت پیارا سا مضمون لکھا تھا، جس میں ان تینوں ہم عصروں کے کمالات کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ ذیل کی چند سطور اسی مضمون کا حصہ ہیں جو آج تبرک کے طور پر دوبارہ پیش کی جاتی ہیں۔

(محمد عبداللہ قریشی)

شرم پر شرم اور حیا پر حیا دامن گیر ہوتی ہے کہ ایسے باکمال، مشہور و معروف، فاضل اجل، یگانۂ روزگار شاعر کی بابت مجھ جیسا بے سواد کچھ حرف زنی کرے۔ مگر کیا کیا جائے یہ زمانہ ہی ایسا ہے جس میں درباری مسخروں کو، جن کا شین قاف تک درست نہیں، ملک الشعرا کا خطاب دیا جاتا ہے اور اس کے بھی لوگ طرف دار پیدا ہو جاتے ہیں، حالاں کہ جس کو خطاب دیا گیا ہے وہ مَلک اور مِلک اور مُلک کا قطعی امتیاز نہیں جانتا۔ یہ سب تقدیری امور ہیں۔ بس ایسا ہی نااہل مجھے بھی سمجھ لیا جائے اور جو کچھ مجھ سے سر اقبال کی بابت لغزش ہو، وہ صرف میری ہی ایک رائے سمجھی جائے۔

میرے خیال میں سر اقبال کی شخصیت بالکل اسی طرح ظہور پذیر ہوئی ہے جس طرح اور لاثانی انسانوں کی زندگیاں یعنی ابتدا ان کی نہایت معمولی مگر بڑھتے بڑھتے وہ شہرت کے اس فلک الافلاک تک جا پہنچے،

جہاں ان سے پہلے کوئی نہ جا سکا تھا۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے۔ سیالکوٹ کا ایک طالب علم، جس کا معمولی سے معمولی تعلیم میں بھی جی نہ لگتا ہو، رفقا اور عزیزوں کے مارے باندھے سے وہ تعلیم پائے اور پھر وہی محسود روزگار ہو جائے۔ کون جانتا تھا، کسی کو سان وگمان بھی نہ تھا کہ یہ دنیا سے بیزار خاموش وضع لڑکا، اپنے دماغ میں کیا کیا فیضان دبہی چھپائے ہے، جس سے قلیل مدت میں مغربی علوم کے ماسوا، وہ مشرقی زبانوں پر بھی فاضلانہ عبور کر جائے گا، پنجابی ہو کر صاف ستھری اردو میں طرز خاص کا موجد بن جائے گا۔ شارٹ ورڈڈ ہونے پر بھی وہ ایسے اچھوتے خیالات کو ورک کرے گا کہ نئی تانتی اس کو اپنا امام مفترض الطاعت سمجھنے لگے گی۔ ماشاء اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس کی شہرت کا یہ عالم ہوگا کہ کلکتہ کے گرانڈ ہوٹل میں امریکن سیاحوں کی ایک بڑی پارٹی (ملینرز) آکر ٹھہرتی ہے، ہندوستان کا ایک مشہور و معروف شاعر ان لوگوں سے ملنے جاتا ہے، جو بزعم خود اپنے آپ کو سر اقبال سے بدرجہا سینئر سمجھتا ہے مگر جب امریکن سیاح (ان میں سے ایک شخص) ان سے ہم کلام ہوتا ہے تو شاعر صاحب کو اپنی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر اقبال کی لافانی شخصیت بھی۔ ذیل کا مکالمہ اس کی کافی شرح کر دے گا۔

شاعر صاحب : کیوں جناب! آپ امریکہ میں کس درجے کے آدمی ہیں ؟

امریکن : میں ؟ میں تو ایک غریب آدمی ہوں ؟

بھلا کس قدر غریب جناب ؟

بس یہی سمجھ لیجیے کہ میری پارٹی میں مجھ سے زیادہ غریب کوئی نہیں۔ میں صرف دو فرم کا مالک ہوں۔

کیا خوب! امریکہ کے دو فرم کا مالک اور آپ اسے غریب کہتے ہیں۔ افسوس! آپ کو اس ملک کی حالت معلوم نہیں۔ یہاں غریب وہ بدنصیب ہیں جن کو ہر روز آدھا پیٹ کھانے کو بھی نہیں ملتا بلکہ اکثر نان شبینہ کو بھی محتاج ہوتے ہیں۔

آخاہ! یہ تو بڑی مصیبت کی بات ہے، مگر سنیے تو آپ کون ہیں اور کیا پیشہ کرتے ہیں ؟

میں ایک راجہ صاحب کا مصاحب ہوں اور اس ملک کا مشہور و معروف شاعر بھی ؟

ہیں تو کیا آپ اقبال ہیں، مسٹر اقبال ؟

یہ سنتے ہی میں پتھر کا ہو گیا اور ڈاکٹر اقبال کی اس عظیم الشان مقبولیت کا مجھے دل سے اعتراف کرنا

پڑا۔ یہ ہے خدا کی دین، جس پر کسی کا بس نہیں۔ مثال کے طور پر میں جناب ڈاکٹر اقبال کی ایک معمولی نظم کے کچھ شعر لکھ دیتا ہوں اور ان حضرات سے مخاطب ہوتا ہوں جو محض اُردو کے دعوے دار بن کر اکثر اوقات اپنی عصبیت کا نہایت ناموزوں اظہار کرتے رہتے ہیں۔ وہ چشم انصاف سے دیکھیں اور خاک پنجاب کے اس منفرد جوہرِ قابل کو دل سے سراہیں۔ دیکھیے اقبال جب صاف صاف اور سیدھا سیدھا لکھتا ہے تو یہ چیز ہوتی ہے، جو کسی طرح بھی آپ کے بس کا روگ نہیں:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ

جبھی تو دنیا کی کوئی مہذب زبان اس کے خیالات کے عکس سے خالی نہیں۔ جرمن، فرانس، جاپان، ایران، کابل، ترکستان تمام علمی دنیا میں موجود ہیں۔ خصوصاً اپنے ملک کی یونیورسٹیاں تو اس پر اتنا وثوق کامل رکھتی ہیں (عام اس سے کہ وہ اس چیز کو جانے یا نہ جانے) کہ ہر صنف پر اس کا فیصلہ بہترین تمغائے امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

کلام معجز نظام جناب اقبال

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

یہ اقبال کی ایک معمولی نظم ہے جو بچوں کی کتاب میں سے ایک ٹکڑا یا پرچہ میرے بھی ہاتھ لگ گیا ہے اور میں نے اسی کو یہاں نمونتاً پیش کر دیا ہے۔ یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں ۔۔۔۔ اس سادگی پر لاکھ بناؤ قربان ہیں:

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

بعض نازک دماغ فرمائیں گے، ستارہ تو ٹوٹ کر گرتا ہے۔ اڑ کر نہیں آتا اور یہ مہتاب کی کرن کیا چیز ہے۔ جناب میں عرض کروں گا، بے شک جناب کا ارشاد بجا و درست۔ آپ اہل زبان ہیں۔ لیکن جب ستارہ ٹوٹ کر گرا تو اس میں جان کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ مہتاب کی کرن کو اگر کرن نہ کہیں تو کیا پاپوش کی کرن یہاں زیادہ سجے گی؟ چلیے آگے چلیے:

کیا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا، گمنام تھا وطن میں

اے سبحان اللہ! یہ ہے اجتہاد کامل۔ مگر معاف کیا جائے سطحی نظر رکھنے والے اس تخیل کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ جہاں ایک صدر المہام کے دماغ کی ضرورت ہے۔ کیسی نادر تشبیہ ہے جس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

اور پھر ع۔ غربت میں آکے چمکا، گمنام تھا وطن میں

اس لطافت کو کوئی کس طرح پیدا کر سکتا ہے:

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرّہ ہے یاں نمایاں سورج کے پیرہن میں

تشبیہ پر تشبیہ نرالی تشبیہ پھر کس قدر زیبا اور انوکھی:

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا

اے قربانت شوم! کیا عجب ہے جو علامہ سخنور کو یہ شعر لکھتے وقت:

ترا نہ تکمۂ لعل است در لباس حریر شد است قطرہ خونِ منت گریباں گیر

کی جھلک یاد آگئی ہو:

حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت کی انجمن میں

یہاں دیدہ ور حضرات سے انصاف کا مطالبہ ہے۔ میرے خیال میں اس وقت دلی اور لکھنؤ کی علم برادری کو ایک کنارے کر دینا چاہیے۔ اقبال کی شاعری کے لیے نیچر اور حقیقت کو سب سے پہلے اسٹڈی کرنے کی ضرورت ہے پھر حسن قدیم، اس کی پوشیدہ جھلک اور کرمک شب تاب کا خلوت سے انجمن میں آجانا بالکل واضح ہو جائے گا اور اس وقت سب سمجھ لیں گے کہ صحیفۂ قدرت کا مطالعہ کرنے والا جگنو جیسے حقیر پتنگے میں کیا کچھ دیکھ رہا ہے اور کس طرح قلم برداشتہ اس کو ٹانکتا چلا جاتا ہے:

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

یہ ہے مبدء فیاض کا خاص عطیہ۔ ایک متضاد حالت کو جو حقیقت سے لبریز ہے کیسے پیارے لفظوں میں

[illegible]

ڈاکٹر محمد عبدالقدوس

اسلام میں دولت کی عادلانہ تقسیم

اسلام میں قرض دے کر سود (ربٰو) لینا ممنوع ہے اور قرآنِ حکیم میں متعدد جگہوں پر اس کا ذکر ہے ——— سود کے ناجائز ہونے کا سبب یہ ہے کہ قرض دینے والا اپنی کوشش اور جدوجہد کے بغیر سود لے کر اس مال میں حصے دار بن جاتا ہے جو قرض لینے والے کی ذاتی کوشش سے پیدا ہوتا ہے جب روپیہ کوشش کے بغیر خود بخود نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے تو قرض دینے والے کے اس روپیہ میں جو اس نے بطور قرض کسی کو دیا ہے، زیادتی کیوں ہو اور اس کو سود کیوں ملے؟ جو روپیہ اس کو سود کی صورت میں ملتا ہے وہ اصل میں چوں کہ قرض لینے والے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے قرآن نے سود لینے کو ظلم قرار دیا ہے اور قرآن ہی کے مطابق اللہ کے بندوں پر اس طرح ظلم کرنا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ (البقرہ : ۲۷۹) اس کے برعکس تجارت کو جو اللہ کے بندوں کی ایک خدمت ہے، جائز قرار دیا گیا ہے۔ (البقرہ : ۲۷۵ - النساء ۲۹)

تاجر ضرورت کی چیزیں خریداروں تک پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں، اس لیے ضرورت کی ان چیزوں کو حاصل کرنے اور پھر ان کو خریداروں تک پہنچانے کے کام کا کوئی نہ کوئی مناسب معاوضہ تاجر کو ملنا چاہیے جو اس کو قیمت کی صورت میں ملتا ہے۔ تاجر جو روپیہ اپنے مال کی قیمت کے طور پر خریدار سے حاصل کرتا ہے، وہ بھی چونکہ خریدار کی کوشش ہی سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے خرید و فروخت کے معاملے میں تاجر اور خریدار دونوں اصل میں اپنی اپنی کوشش کا ایک دوسرے کے ساتھ مبادلہ کرتے ہیں۔ نہ صرف وہ روپیہ جو خریدار قیمت کے طور پر تاجر کو ادا کرتا ہے، خریدار کی جدوجہد سے پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ روپیہ بھی کسی نہ کسی جدوجہد ہی سے پیدا ہوتا ہے جو کارخانہ دار، مزدور کو اس کے کام کے عوض دیتا ہے، اور جس طرح تاجر اور خریدار ایک دوسرے کے ساتھ کام کا کام سے مبادلہ کرتے ہیں، اسی طرح کارخانہ دار اور مزدور

بھی کام کا مبادلہ کام ہی سے کرتے ہیں ۔ اگر یہ مبادلہ فریقین کی باہمی رضامندی اور خوشی کے ساتھ ہو تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ اس معاملے میں ان میں سے کسی کے ساتھ بھی ناانصافی نہیں ہوئی اور یہ مبادلہ ٹھیک ہوا ۔ اگر تاجر یہ دیکھے کہ خریدار ، اس شے کا جسے وہ فروخت کرنا چاہتا ہے ، پورا پورا معاوضہ قیمت کی صورت میں ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ اپنی اس شے کو فروخت ہی نہیں کرے گا ، اور اسی طرح اگر خریدار یہ دیکھے کہ جو قیمت کسی شے کی اس سے طلب کی جارہی ہے ، وہ زیادہ ہے تو وہ بھی ایسی شے نہیں خریدے گا ۔ لیکن اگر بعض موقعوں پر خریدار کو زیادہ قیمت دینے پر مجبور کیا جائے تو اس جبر کا کوئی جواز نہیں ہوتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ناجائز طور پر نفع کمانے کے لیے ذخیرہ اندوزی ، اسلام میں اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے ۔ حضور کے الفاظ یہ ہیں :

عن النبی صلی اللہ تعالی قال الجالب مرزوق والمحتکر ملعون (ابن ماجہ ، مشکوٰۃ)

فرمایا کاروبار میں محنت کرنے والا رزق سے نوازا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے ۔

قرآن حکیم اسی تجارت کو جائز قرار دیتا ہے جس میں حصہ لینے والے دونوں فریق اپنے اس معاملے پر دل سے خوش ہوں اور کسی کو بھی دوسرے کا مال ناجائز طور پر کھانے کا موقع نہ ملے ۔ (النسا : ۲۹) قرآن حکیم نے ایک عام حکم کے ذریعے ایمان داروں کو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے کھانے سے منع کیا ہے ۔ (البقرہ : ۱۸۸) سود لینا ناجائز طریقے سے دوسروں کا مال کھانے کی ایک خاص صورت ہے اور تاجروں کا مصنوعی طریقوں سے چیزوں کی قیمت بڑھا کر ان کو گراں بیچنا یا تجارت میں دھوکا دینا (کم تولنا ، کم ناپنا ، آمیزش کرنا ، یا جس چیز پر معاملہ طے ہو اس کی بجائے کوئی دوسری چیز خریدار کو دینا) مزدوروں یا ملازموں کو (خواہ وہ کسی حکومت سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی ادارے اور کارخانے سے) کم اجرت یا معاوضہ دینا یا ان کا زیادہ اجرت اور معاوضہ لینا ، کارخانہ داروں کا کارخانے کے مال کو زیادہ قیمت پر بیچنا تاکہ اس سے خود بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور قرض لی ہوئی رقم کا سود بھی ادا کریں ۔ زمین داروں کا کسی استحقاق اور کاشت کاروں کے ساتھ تعاون کے بغیر زمین کی پیداوار میں شریک ہونا ، جوئے میں روپیہ جیتنا ، رشوت لینا ، چوری کرنا ، ڈاکہ ڈالنا وغیرہ ، دوسروں کا مال ناجائز طریقوں سے کھانے

کی مختلف صورتیں ہیں، جس طرح ناحق دوسروں کا مال کھانا جائز نہیں، اسی طرح مردوں عورتوں کو غلام بنانا یا ان سے بہ جبر و اکراہ اپنی مرضی کے مطابق کام لینا بھی جائز نہیں اور یہ بھی دوسروں کا مال کھانے کے برابر بلکہ اس سے بھی بُرا ہے۔

ناجائز طریقوں سے دوسروں کا مال کھانے اور دوسروں پر ظلم کرنے اور انسانی مساوات کا احترام نہ کرنے ہی کی وجہ سے انسانی معاشرہ مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے، جن میں سے ایک طبقہ عمدہ غذاؤں، عالی شان محلوں، قیمتی ملبوسات اور آرام و آسائش کی زندگی سے بہرہ ور ہوتا ہے تو ایک دوسرا طبقہ فاقہ کشی اور نکبت و افلاس میں مبتلا رہتا ہے۔

جن لوگوں کو اسلام نے ابتدا میں غلام بنانے کی اجازت دی ان کے بارے میں ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح آزاد مرد اور آزاد عورتیں اللہ کی عبادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اسی طرح یہ غلام اور لونڈیاں بھی جو جنگ میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ آتے تھے، اللہ ہی کی عبادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم کی اس تعلیم پر ایمان رکھتے ہوئے کہ اللہ نے تمام انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے (الذاریات : ۵۶)۔ مسلمان کس طرح اپنے غلاموں سے ایسے کام لے سکتے ہیں جو اللہ کی عبادت کے منافی ہوں؟ اللہ کی راہ میں ہونے والی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھ آنے والے غیر مسلم مردوں اور عورتوں کو مسلمانوں کی غلامی میں اس لیے نہیں دیا جاتا تھا کہ مسلمان ان پر ظلم کریں یا وہ ان کو کفر کی یا فسق و فجور کی راہوں پر چلائیں، بلکہ ان کو مسلمانوں کی غلامی میں اس لیے دیا جاتا تھا کہ اس میں یہ مصلحتیں تھیں کہ وہ آزاد رہنے کی وجہ سے، تیار ہو کر دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے میں نہ آسکیں، ان کو مسلمانوں کے ساتھ رہ کر ایک اچھی اسلامی زندگی کے مطالعے کا موقع مل سکے اور وہ ان مسلمانوں کے معین و مددگار بن سکیں جن سے وہ ناحق جنگ کرتے اور جن کو طرح طرح کے مصائب سے دوچار کر دیتے تھے۔

ابتدا میں ان غیر مسلموں کو جو جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھ آتے تھے مسلمانوں کی غلامی میں دینا نامناسب نہ سمجھا گیا لیکن بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے کم از کم عربوں کو غلام بنانے کی ممانعت کر دی گئی۔ انہی غلاموں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مسلمان جو خود کھاتے ہیں وہی اپنے غلاموں کو کھلائیں اور جو خود پہنتے ہیں وہی ان کو پہنائیں۔

الفاظ یہ ہیں :

ارقاءکم ارقاءکم اطعموھم مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون (متفق علیہ)

یعنی اپنے غلاموں کا خاص طور سے خیال رکھو، ان کو وہی کچھ کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی لباس پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔

آنحضرتؐ نے مسلمان صالح غلاموں کو یہ بشارت بھی دی کہ ان کو اللہ کے پاس دگنا اجر ملے گا۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے :

۹۔۔۔۔ والعبد المملوك اذا ادّی حق اللہ وحق موالیہ ورجل کانت لہ امۃ فادبھا فاحسن تادیبھا وعلمھا فاحسن تعلیمھا ثم اعتقھا فتزوجھا فلہ اجران۔ (بخاری، مسلم)

یعنی جو غلام اللہ کا اور اپنے مالک کا حق ادا کرے اور اگر کسی کے پاس کوئی کنیز ہو، اس کو وہ اچھی طرح ادب آداب سکھائے اور اس کو اچھی تعلیم دلائے، پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

مسلمان اپنے غلاموں کو انسانوں کی حیثیت سے اپنے برابر ہی سمجھتے تھے اور اسی بنا پر مسلمانوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ ان کو آزاد کریں۔ مسلمانوں نے اپنے معاشرے میں ان کو ہر وہ عزت دی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر وہ مسلمان ہو جاتے ہیں تو غلام ہونے کے باوجود وہ ان کے بھائی ہوتے ہیں۔ (الحجرات : ۱۰) تمام مسلمانوں کی طرح ان کی عزت کا دار و مدار بھی عمل اور تقوے ہی پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس خطاب میں کہ "تم میں سب سے زیادہ قابلِ عزت و احترام وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔" (الحجرات : ۱۳) صرف آزاد مسلمان ہی نہیں بلکہ وہ غلام بھی (اس خطاب میں) داخل ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ غلامی کی اجازت دینے کے باوجود قرآن حکیم میں وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۞ فَكُّ رَقَبَةٍ ۞ (البلد : ۱۲،۱۳) کہہ کر اللہ نے یہ ظاہر کر دیا کہ غلامی سے کسی کی گردن چھڑانا اللہ کی راہ میں چلنے کا آسان اور معمولی کام نہیں بلکہ ایک دشوار راہ کو عبور کرنا ہے۔ یہ ایک ایسا ہی اہم فرض ہے جیسا ایک بھوکے یتیم و مسکین کو کھلانا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اور غلامی سے انسانوں کی گردن چھڑانے ہی کی خاطر اللہ کی طرف سے

مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ بیت المال میں جمع ہونے والے مال کا ایک حصہ اس کام میں بھی استعمال کیا جائے۔
جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، ان کو اسلام نے انسانوں کی حیثیت سے مردوں کے برابر قرار دیا۔ البتہ ان کی بعض خصوصیات کی وجہ سے مردوں کو ان کا نگران اور محافظ بنایا۔ عورتیں مردوں کی طرح میراث میں حصہ پاتی ہیں جو مردوں کے حصے سے کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو مہر بھی ملتا ہے اور ان کے نان و نفقہ کی ذمے داری بھی ان کے مردوں ہی پر ہوتی ہے۔ عدل کے اعتبار سے کسی عورت کا قاتل اگر مرد ہو تو اس کی سزا میں قاتل مرد کو بھی قتل کیا جائے گا۔ اگر عورتوں اور مردوں میں مساوات نہ ہوتی تو اسلام میں قاتل کی یہ سزا نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر مردوں کو طلاق دینے کا حق ہے تو عورتوں کو خلع لینے کا حق ہے۔ تعلیم بھی صرف مردوں پر فرض نہیں بلکہ عورتوں پر بھی مردوں ہی کی طرح فرض ہے۔

دولت چونکہ صرف کام کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے کام کرنے والوں میں دولت کی عادلانہ تقسیم اس طرح ممکن ہے کہ دولت ہر شخص کے کام کے تناسب سے تقسیم ہو، یعنی جو شخص جتنا کام کرتا ہے اس کو اتنی ہی دولت کام کے معاوضے کے طور پر پانے کا مستحق قرار دیا جائے۔ دولت کی عادلانہ تقسیم میں ایک مشکل اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ دولت اور کام دونوں مختلف نوعیتوں کے ہوتے ہیں، مثلاً کسی شخص کے پاس دولت سونے یا چاندی کی شکل میں ہوتی ہے، کسی کے پاس مویشی اور پالتو جانوروں کی شکل میں، کسی کے پاس اناج اور غلے کی صورت میں اور کسی کے پاس آلات اور مشینوں کی صورت میں۔ اسی طرح کاشت کار کا کام اس شخص کے کام سے مختلف ہوتا ہے جو کسی کارخانے میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا ہے، اور جو شخص ایک دفتر میں کام کرتا ہے اس کا کام کاشت کار اور مزدور دونوں کے کام سے مختلف ہوتا ہے۔ مختلف اشخاص کی دولت کا اندازہ کرنے کے لیے ہم ان کی دولت کو جو مختلف شکلوں میں پائی جاتی ہے، روپے کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اس کے بعد یہ پتا چلاتے ہیں کہ کس کے پاس کتنی دولت ہے۔ مختلف نوعیتوں کے کاموں کا اندازہ کرنے کے لیے بھی ہم اس کو اسی طرح کا کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے مختلف نوعیتوں کے کاموں کو ایک ہی نوعیت کے کام میں تبدیل کر دیں۔ (اگر ہمارے پاس مختلف قیمتوں کے سکے ہوں تو اس وقت بھی ہم ان سکوں کو ایک ہی قیمت کے

سکوں میں تبدیل کر دیتے ہیں) اور پھر اس مخصوص نوعیت کے کام کی کسی چھوٹی مقدار کو ایک یونٹ تصور کر کے کام کی چھوٹی بڑی مقداروں کو ناپیں۔ اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ کس نے کتنا کام کیا ہے تو پھر یہ معلوم کرنا آسان ہوگا کہ کسی جگہ کام کرنے والوں نے جو دولت مجموعی طور پر پیدا کی ہے اس میں ان کام کرنے والوں میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہے۔ مختلف نوعیت کے کاموں کو ایک ہی نوعیت کے کام میں تبدیل کرنے کے لیے مختلف چیزوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مثلاً یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک شخص کسی کام میں کتنی قوت اور کتنا وقت صرف کرتا ہے اور یہ کہ کسی کام کی قابلیت یا مہارت پیدا کرنے کے لیے اس کو کتنا وقت اور کتنا روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے اور کتنی مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور یہ کہ کسی کا کام کرنے والے کی زندگی اور عمر پر کیا اثر ہوتا ہے وغیرہ۔ اجرتوں کی نگرانی اور ان کو معین حدوں سے بڑھنے نہ دینا حکومتوں کا کام ہے۔ اگر حکومتیں اجرتوں اور قیمتوں کی نگرانی اور ان پر کنٹرول نہ کریں تو اس کا لازمی نتیجہ گرانی کی صورت میں نمودار ہوگا۔ گرانی اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ مزدور اور تاجر بغیر کسی اصول کے اپنی اجرتیں اور قیمتیں بڑھائیں جبکہ وہ ایسا کرنے کی قدرت رکھتے ہوں۔ قیمتوں کے بڑھنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں جو عام طور پر یہ ہوتی ہیں کہ کسی ملک کی پیداوار یعنی خام پیداوار یا مصنوعات بیرونِ ملک زیادہ قیمت حاصل کرنے کی خاطر یا ملک ہی میں ان کی قیمت بڑھانے کی خاطر اسمگل کی جائیں یا ملک کی ضرورت کو نظر انداز کر کے ان کو برآمد کیا جائے یا ان کی ذخیرہ اندوزی کی جائے یا پیداوار کو خواہ زرعی پیداوار ہو یا مصنوعات کی پیداوار ہو گھٹا یا جائے، مثلاً مصنوعات پر کسی کارخانہ کے مالک یا مالکوں کا اجارہ ہو اور یہ اجارہ دار اس کی پیداوار کو اس لیے گھٹا دیں کہ اپنی مرضی کے مطابق قیمتیں وصول کریں جب کہ لوگ انہی کو لینے پر مجبور ہوں یا کسی ملک کے سکے کی قیمت بہت کم ہو یا اس کو بڑی قیمتیں دے کر مال درآمد کرنا پڑتا ہو اور وہ اپنے خسارے کو پورا کرنے کے لیے اپنے مال کی قیمتیں بھی بڑھا دیں یا آبادی کے ایک حصے کی قوتِ خرید بہت بڑھ جائے اور تاجر سب ہی سے زیادہ قیمت وصول کریں جب کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہوں اور مال کی رسد کو گھٹا بڑھا سکیں۔ قدرتی اسباب میں سے قحط بھی گرانی کا سبب ہو سکتا ہے۔ دولت کی عادلانہ تقسیم میں جہاں یہ ضروری ہے کہ قیمتوں اور اجرتوں کو معین کردہ حدوں سے بڑھنے نہ دیا جائے وہاں مبادلۂ دولت میں دو مختلف ملکوں کے سکوں کی قیمت کا تعین بھی اصول عدل کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ کسی طرح جائز نہیں کہ

ایک ملک کے سکے کی قیمت کسی دوسرے ملک کے اسی وزن اور دھات کے سکے کی قیمت کے مقابلے میں کم یا زیادہ ہو۔ ایک ہی دھات کے مساوی وزن رکھنے والے سکوں کی قیمتیں گھٹانا بڑھانا زیادتی ہے۔ اگر اس طرح کسی ملک کے سکے کی قیمت کسی دوسرے ملک کے سکے کی قیمت کی آدھی ہو جائے تو وہ ملک جس کے سکے کی قیمت نصف ہو جائے جو چیز پہلے ایک ہزار میں درآمد کرتا تھا وہی چیز اب دو ہزار میں درآمد کرے گا اور وہ ملک جس کے سکے کی قیمت زیادہ ہے اس ملک سے جس کے سکے کی قیمت کم ہے ایک ہزار قیمت رکھنے والی شے پانچ سو ہی میں خرید سکے گا۔ لیکن اگر کسی ملک میں خسارے سے بچنے کے لیے پانچ سو کی چیز کی قیمت بڑھا کر ایک ہزار کر دی جائے تو کسی چیز کی قیمت اس طرح بڑھ جانے کا اثر یہ ہو گا کہ اس ملک کی دوسری چیزوں کی قیمتیں بھی بڑھا دی جائیں گی۔

جس طرح کسی کے مال میں کام کیے بغیر حصے دار بننا یا کسی سے بہ جبر و اکراہ کام لینا جائز نہیں، اسی طرح مال و دولت پیدا کرنے کے لیے کوئی ایسا کام کرنا یا دوسروں سے لینا یا کسی ایسے کام میں کسی کی مدد کرنا بھی جائز نہیں جو گناہ ہو۔ مثلاً نااہل ہونے کے باوجود اسلامی مملکت میں کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ مقام یا منصب یا ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور اس پر فائز رہنا یا کوئی مقام یا منصب یا ملازمت حاصل کرنے کے بعد مملکت اسلامی کی پولیس، فوج اور ملازمین سے ایسے کام لینا جو شرعِ اسلامی میں یا قانوناً ممنوع ہوں، قرآنِ حکیم کی لفظی یا معنوی تحریف کرنا یا دین کی شکل و صورت کو مسخ کرنا یا مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے اور پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرنا یا دوسروں کے ساتھ اور خاص طور پر دشمنانِ اسلام کے ساتھ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں تعاون کرنا یا نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ساتھ نہ دینا، ممنوع یا نشہ والی چیزوں کی کاشت کرنا، ان کو بنانا یا ان کی خرید و فروخت کرنا، جھوٹی شہادت دینا، رشوت لینا، عصمت فروشی، ناچنا گانا جو زنا سے قریب کرے، فحش اور عریاں فلمیں دکھانا، فحش نگاری، پوچ اور رکیک شاعری، ناپسندیدہ اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان کاموں کا تقوے اور طہارت سے کوئی علاقہ اور واسطہ نہیں ہوتا۔ جرم چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔ جو جرم جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوتا ہے۔ بڑے جرم وہی ہوتے ہیں جن سے اللہ کی مخلوق کو زیادہ نقصان پہنچتا ہو۔

ان گناہوں میں جن کا ذکر کیا گیا ہے اسلامی مملکت میں نا اہل ہونے کے باوجود کوئی اعلیٰ مقام یا منصب حاصل کرنا، اسلامی مملکت اور مسلمانوں کے قومی مقاصد کی راہ میں روڑا اٹکانا ہے، اس لیے بہت بڑا گناہ ہے جس کا ارتکاب خلافتِ راشدہ کے بعد اکثر و بیشتر ہوتا رہا ہے۔ اسی قسم کے لوگ دنیا حاصل کرنے کے لیے پارٹی حکومت بنا لیتے ہیں۔

اگر بعض کام روپے پیسے کے لیے بھی نہ ہوں اور بظاہر گناہ بھی معلوم نہ ہوتے ہوں بلکہ دل بہلانے اور طبیعت کو خوش کرنے کے لیے ہوں تو بھی ممنوع ہیں جب کہ ان میں حصہ لینے کے سبب ضروری اور اہم کاموں کے لیے وقت نہ ملتا ہو یا کم ملتا ہو۔

برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالم گیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں کتبِ فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریقِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے اس کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں اور جن کو مسائلِ فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۴۰۸ قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

جناب محمد فاضل بلوچ

جنوبی ایشیا میں عہد سلاطین کے کتب خانے

بنی نوع انسان کے جدِ اعلیٰ سیدنا آدم علیہ السلام کو فرشتوں جیسی پاکیزہ مخلوق پر محض علم کی وجہ سے فوقیت وفضیلت بخشی گئی اور خلیفۃ اللہ فی الارض کا اعزاز عطا کیا گیا۔ لہٰذا اولادِ آدم میں سے جس فرد اور قوم نے علم کے اس ورثے کو جس قدر پایا اسی قدر عروج حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بامِ عروج پر پہنچنے والی تمام اقوام وملل نے اس مقدس امانت کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے اپنے اپنے ادوار میں شان دار کتب خانے قائم کیے اور یوں رفتہ رفتہ کتب خانے الہامی اور اکتسابی علوم کے خزینے بنتے چلے گئے۔ خود اسی وسط ایشیا میں نالندہ یونیورسٹی کی ایک عظیم الشان لائبریری تھی جو تین عمارات میں واقع تھی۔ یہ عمارات رتنا ساگرہ، رتنو دادھی اور رتنا رنجکا کے نام سے موسوم تھیں۔ رتنو دادھی نو منزلہ عمارت تھی جس میں مقدس مخطوطات (از قسم) پرجنا پرمیتا اور رتنا نترک۔ پوری لائبریری جو تین بڑی عمارات پر مشتمل تھی، دھرم گنج (DARMAGANJA) کے نام سے مشہور تھی۔ لیکن "تصنیف وتالیف" اور علمی ذخیروں کا مرتب ومحفوظ رکھنا مسلمانوں کا قومی شعار تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں جس کثرت سے کتب خانے اور دار العلم پائے جاتے تھے، شاید دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

ہموا یمرڈی جانسن جیسا متعصب (جس کے نزدیک " اسلام زیادہ تر فوجی طاقت کے بل بوتے پر پھیلا اور مسلمانوں میں کچھ رہنما ایسے گزرے ہیں جو بجز قرآن کسی کتاب کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے)" وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ " دنیائے اسلام عموماً کتاب پسند واقع ہوئی ہے اور کتابوں کو مسلمانوں کے ہاں جو مقام حاصل ہے شاید ہی دنیا کی تاریخ اس کی کوئی مثال پیش کر سکے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں جہاں بغداد عروسِ علم تھا وہاں قرطبہ " اللہ کی زمینوں میں سے سب سے زیادہ کتب رکھنے والا تھا۔[1] لیکن جب کوئی قوم اقتدار پر فائز ہونے کے باوجود

---

[1] المقری، نفح الطیب (مصر، مطبع عیسٰی البابی الحلبی، ۱۹۳۶ء) ص ۳۰۵

صداقت، شرافت اور عدالت کا دامن چھوڑ کر اخلاق رذیلہ میں مبتلا ہو جاتی ہے تو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ اُسے بام ثریا سے تحت الثریٰ پر دے مارتا ہے۔ ملت بیضا بھی جزوی طور پر اسی سنتِ الٰہی کی مستحق ٹھہری۔ لیکن یہ اس اُمت کی خوش نصیبی تھی کہ اس نے اس حادثہ کبریٰ کو اپنے لیے وجہ تنبیہ سمجھا اور پھر جہاں جہاں پہنچی، وہاں اخلاقِ عالیہ کے فروغ کے لیے علوم و فنون کی بساط بچھادی۔ ان کی تصنیف شدہ کتب سے یورپ کے کتب خانے آج بھی مزین ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں بحیثیت فاتح داخل ہوئے تو ہندوؤں میں علم نحو، ریاضی، طب اور علم نجوم مروج تھے۔ ان متداولہ علوم میں سے علم نجوم کو برتر سمجھا جاتا تھا کیوں کہ ان کے دینی معاملات کا اس علم کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔[3] لیکن جہاں علم کی دولت پر کسی ایک طبقے کی اجارہ داری قائم ہو جائے تو اس سے بڑھ کر ننگِ انسانیت اور مکروہ فعل کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس زمانے میں ہندو من حیث القوم اسی بلا میں گرفتار تھے۔ اس کی گواہی ان کے اپنے مصنف بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہندو مؤرخ جادوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ کتابوں کو نقل کر کے تقسیم کرنے اور علم کی عام اشاعت کے لیے ہم اسلامی اثرات کے مرہونِ منت ہیں، ورنہ ہندو مصنفین تو اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کے شیدائی تھے۔[4] مسلمانوں نے اشاعتِ علم کے لیے شروع ہی سے مساجد، خانقاہیں اور کتب خانے قائم کیے۔ لیکن تاریخ کی کتابوں میں ان کے کتب خانوں کا ذکر عموماً اس لیے نہیں ملتا کہ ہندوستان کے قدیم مسلمان حکمران کتب خانوں کے لیے الگ عمارات نہیں بنواتے تھے۔ بلکہ تعلیمی ادارے، مساجد اور خانقاہیں ہی ایسی جگہیں تھیں جہاں کتابوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ مقدسی کے الفاظ میں "الاسلام عندھم طراوۃ والعلم واھلہ کثیر۔" یعنی ان کے ہاں اسلام تروتازہ ہے، علم اور اہلِ علم کی کثرت ہے۔

محمد بن قاسم کی فتح کے بعد سندھ پر عربوں نے اڑھائی سو برس سے کچھ زائد عرصے تک حکومت کی۔[5]

---

[3] ابوریحان البیرونی۔ کتاب الہند ترجمہ (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۵ء) ص ۱۸۴، ۱۸۵۔

[4] محمد زبیر۔ اسلامی کتب خانے (دہلی، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، ۱۹۶۱ء) ص ۱۴۸ بحوالہ جادوناتھ سرکار [illegible]

[5] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء) جلد ۲ [illegible] ص ۲۰

اس دور میں سندھ کے شہر منصورہ اور دیبل، عراق کے شہر بغداد و بصرہ کی مانند اسلامی علوم و فنون کے مرکز تھے اور گھر گھر دار العلوم بنا ہوا تھا[۵۵] لیکن صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کے قدم سرزمینِ ہند میں سلطان محمود غزنوی کی مجاہدانہ مساعی کی بدولت جمے، امن و امان قائم ہوا، اور علما کے ہاتھوں میں کتاب و قلم نظر آنے لگے[۵۶]۔ اب ہم ذیل میں صرف ان سلاطین، امرا اور علما کے کتب خانوں کا ذکر کریں گے جو قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں قائم ہوئے۔

کتب خانہ سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء)

سلطان محمود غزنوی نہ صرف عالم تھا، بلکہ بقول امام مسعود بن شعبہ بہت بڑا فقیہ بھی تھا۔ اس نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں سے ایک "التفرید" فقہ کی کتاب ہے جو غزنہ اور اس کے گرد و نواح میں متداول رہی[۵۷]۔ سلطان چونکہ خود عالم اور علما کا سرپرست تھا، اس لیے اس کے دربار میں جس قدر اہلِ علم، شعرا اور دیگر مشاہیرِ روزگار جمع ہوئے تھے شاید ہی کسی اور شاہی دربار میں جمع ہوئے ہوں، اسی لیے پروفیسر براؤن سلطان کو "اغوا کنندہ علما" لکھتے ہیں۔ سلطان ان پر چار لاکھ دینار سالانہ خرچ کرتا تھا[۵۸]

سلطان محمود کو سخن فہمی میں بھی کمال حاصل تھا، کالنجر کے راجا نے جب سلطان کی خدمت میں مدحیہ شعر لکھ کر بھیجے تو سلطان نے راجا کو انعام کے طور پر کالنجر اور پندرہ دیگر قلعوں کی حکومت سونپ دی[۵۹] اور جب سلطان کو قنوج کی فتح نصیب ہوئی تو اس نے تحدیثِ نعمت کے طور پر ایک جامع مسجد اور ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا اور مدرسے کے ساتھ نہایت قیمتی اور نادر کتب پر مشتمل ایک

---

۵۵ اطہر مبارک پوری، قاضی۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۷ء) ص ۱۵۰

۵۶ ابوالحسنات ندوی۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں (امرتسر، الیکٹرک پریس ہال بازار، ۱۳۴۱ھ) ص ۱۹،۱۸

۵۷ عبدالحی، مولانا۔ نزہۃ الخواطر، ترجمہ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی (لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۵ء) ج ۱، ص ۵۶

۵۸ مستوفی، قزوینی، حمید اللہ بن ابوبکر بن حامد بن نظر تاریخ گزیدہ ترجمہ ایلیٹ دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹورینز (لاہور، اسلامک بک سروس، ۱۹۷۶ء) ج III، ص ۶۳

۵۹ سجان رائے بٹالوی۔ خلاصۃ التواریخ مترجمہ ناظر حسن زیدی (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۶ء، ص ۷۰

کتب خانہ قائم کیا[۱۰] اور پھر اس کتب خانے کو اس وقت چار چاند لگ گئے جب "رے اور بخارا پر قبضے کے نتیجے میں عضد الدولہ دیلمی، مشہور وزیر صاحب بن عباد اور نوح بن منصور کے شہرہ آفاق کتب خانے، جو انھوں نے خون پسینہ ایک کر کے جمع کیے تھے، اس (سلطان) کے ہاتھ لگے"[۱۱]

سلطان محمود کے بعد اس کا بیٹا سلطان مسعود تخت نشین ہوا، لیکن ہمیں سلطان مسعود کے کتب خانے کا صراحت سے کوئی ذکر نہیں ملتا، تاہم قدیم و جدید محققین کی آرا کی روشنی میں وہ سلطان محمود کے تخت کے ساتھ ساتھ اس کے کتب خانے کا بھی وارث تھا۔ چنانچہ پروفیسر لا لکھتے ہیں کہ "مسعود دراصل محمود کا صحیح جانشین تھا، جس نے باپ کی روایات کو قائم رکھا۔ اس کے زمانے میں نہ صرف عربی اور فارسی ادب نے ترقی کی بلکہ سنسکرت اور یونانی ادب کی قیمتی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا گیا۔ مشہور مؤرخ فرشتہ مسعود کو سخی، خوش اخلاق اور علما و فضلا کا قدر دان لکھتا ہے۔ اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ ابو ریحان منجم نے اپنی تصنیف "قانون مسعودی" اور ابو محمد ناصحی نے اپنی کتاب "کتاب مسعودی" اسی کے نام معنون کی ہے۔

سلطان محمد غوری (متوفی ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء)

ہر چند کہ سلطان محمد غوری کا زیادہ وقت جہاد میں گزرا، لیکن اسے جب بھی فرصت ملی اس نے دینی علوم کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اجمیر کی فتح پر سلطان نے بت پرستی کے خاتمے کے لیے مندروں کو نیست نابود کیا۔ ان کی جگہ مساجد اور جامعات قائم کیں اور اسلامی نظریے اور قانون کو نافذ کیا۔[۱۲] غالباً اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر بمل کمار دت لکھتا ہے کہ "محمد غوری اور کچھ دیگر سلاطین مثلاً قطب الدین ایبک اور بختیار نے جاہلانہ تعصب کی وجہ سے ہندو اور بدھی تعلیمی مرکزوں، مندروں، عبادت گاہوں، درس گاہوں اور کتب خانوں کو تباہ کیا۔ لیکن اس تباہی کی تلافی انھوں نے اس طرح

---

[۱۰] فرشتہ، محمد قاسم حوالہ سابقہ ج ۱، ص ۹۴

[۱۱] آفتاب اصغر (ڈاکٹر) "برصغیر کے قدیم اسلامی کتب خانے" المعارف" (لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۸۲ء) جلد ۱۵ شمارہ ۷، ص ۷

[۱۲] حسن نظامی۔ تاج المآثر مترجمہ ایلیٹ حوالہ سابقہ ج ۲، ص ۲۱۵

کی کہ مسجدیں، کالج اور کتب خانے بنوائے؟ یہی شواہد سلطان محمد کی علم پسندی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی علم دوستی کا یہ حال تھا کہ باوجود مقتدر فرماں روا ہونے کے ہمیشہ علما اور اولیا کی صحبت میں بیٹھتا اور ان کی عزت و تکریم کرنا سعادت دارین جانتا تھا۔ اس لیے ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سلطان نے علم کی اشاعت کے لیے یقیناً شان دار کتب خانے بھی قائم کیے ہوں گے۔

سلطان قطب الدین ایبک (متوفی ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء)

یہ سلطان خاندانِ غلاماں کا بانی ہے۔ اسے بچپن میں ترکستان سے لایا گیا اور نیشاپور میں بطور غلام قاضی فخر الدین کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ اس نے قاضی صاحب کی توجہ سے بچپن میں علم و ادب کی قدر و منزلت کو خوب جان لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب قیدِ غلامی سے تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس نے اشاعتِ علم کے لیے ہزاروں مساجد تعمیر کرائیں۔ سلطان نے صرف بنارس میں ایک ہزار مساجد بنوائیں۔[۱۳] یہ مساجد عہدِ وسطیٰ کے یورپی گرجاگھروں کی طرح مذہب اور تعلیم بیک وقت دونوں کا مرکز تھیں۔

جہاں تک سلطان کے کتب خانوں کے قیام کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر بمل کمار دت جیسا ہندو مصنف جو سلطان کو جاہلانہ تعصب کا حامل قرار دیتا ہے، اس کا اعتراف کرتا ہے کہ سلطان نے مساجد، کالج اور کتب خانے بنوائے تاکہ اسلامی تعلیم اور مذہب کی اشاعت ہو۔ ملک کے مختلف مقامات پر مساجد، کالج اور کتب خانے قائم کرنے والے سلطان سے متعلق یہ سوچنا قرینِ قیاس نہیں کہ اس نے شاہی محل اور شاہی محل سے متصل مسجد قوت الاسلام کے ساتھ کتب خانے قائم نہیں کیے ہوں گے۔

سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء)

اس سلطان کے عہد میں کتب خانے قائم تھے۔[۱۴] سلطان بیرونِ ہند سے اچھی اچھی کتابیں منگوا کر اس ملک کے علمی خزائن (کتب خانوں) کو مالامال کیا کرتا تھا۔[۱۵] سلطان کی علم دوستی اور مساجد و مدارس

---

[۱۳] حسن نظامی۔ تاج المآثر مترجمہ ایلیٹ، ج ۲، ص ۲۲۳

[۱۴] محمد زبیر۔ محولہ بالا، ص ۱۷۸

[۱۵] شیخ محمد اکرام، آب کوثر (لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۱۸

کی تعمیر بھی اس بات کی واضح شہادت دیتی ہے کہ اس نے مساجد اور مدارس کے ساتھ اس دور کے رواج کے مطابق کتب خانے بھی قائم کیے۔ اس نے سب سے پہلے دہلی میں ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا اور اسے اپنے ولی نعمت سلطان شہاب الدین غوری کے اصل نام معزالدین محمد کی نسبت سے مدرسہ معزیہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے علاوہ صرف دہلی میں متعدد مدارس قائم کیے۔ علم کی اشاعت کے لیے اس نے تخت نشین ہوتے ہی نامور بزرگوں، سادات اور علما و امرا کو اپنے دربار میں اکٹھا کرنا شروع کیا۔ سلطان ان پر ہر سال دس کروڑ سے زائد رقم خرچ کرتا تھا[16]۔ یہ امرا درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ سلطان کی زیر سرپرستی فضلا اور انشا پردازوں کی ایک پوری جماعت تصنیف و تالیف سے امرا و عوام کی علمی پیاس بجھا رہی تھی اور یہ علمی ذخائر مرتب و محفوظ رکھنے کے لیے کتب خانوں کا قیام ایک فطری امر تھا۔

سلطان ناصر الدین محمودؒ (متوفی ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء)

سلطان ناصر الدین محمود نے اپنے بیس سالہ دور حکومت میں تعلیم کو فروغ دیا۔ اس کے دور میں جالندھر کے مقام پر ایک جامعہ (یونیورسٹی) قائم ہوئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے بے شمار مساجد خانقاہیں اور سرائیں بنوائیں۔ چنانچہ مساجد، خانقاہوں اور جامعہ کے ساتھ کتب خانے بھی یقیناً قائم کیے ہوں گے، لیکن ان کا ذکر علیحدہ اس لیے نہیں ملتا کہ کتب خانوں کے لیے الگ عمارات تعمیر نہیں کی جاتی تھیں، بلکہ تعلیمی ادارے، مساجد اور خانقاہیں ہی ایسی جگہیں تھیں جہاں کتابوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ سلطان کے عہد میں کتب خانوں کے قیام کی مزید توثیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ سلطان کو کتابوں سے عشق تھا اور جس چیز سے عشق ہو، اس کی حفاظت ایک فطری امر ہے۔

سلطان چونکہ عالم اور درویش حکمران تھا، اس لیے علما اور صوفیا کو دوست رکھتا تھا اور ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ علما کا یہ گروہ درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف بھی کرتا ہوگا، جب کہ سلطان نے خود اپنے ذاتی مصارف کی کفالت کے لیے کتابت کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ بادشاہ ہر سال دو قرآن مجید اپنے ہاتھ سے نقل کرتا تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ "قاضی

---

[16] منہاج سراج۔ طبقات ناصری، ترجمہ غلام رسول مہر (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۵ء)، ص ۸۳،

کمال الدین نے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف مجھ کو دکھایا، جس کا خط اچھا تھا اور کتابت پختہ تھی۔[۱۷]
کتابت کے سلسلے میں سلطان کا ایک واقعہ جو احترامِ آدمیت کے متعلق ہے، آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک دفعہ بادشاہ کتابتِ قرآن میں مشغول تھا کہ ایک سائل حاضر ہوا، اس کی نگاہ کھلے ہوئے صفحے کی اس سطر پر پڑی جہاں "فیہ فیہ" مکرر لکھا ہوا تھا، سائل نے کہا کہ ایک "فیہ" زائد ہے۔ بادشاہ نے فوراً قلم دوات لے کر ایک "فیہ" کے گرد دائرہ کھینچ دیا، لیکن جب سائل چلا گیا تو بادشاہ نے وہ دائرہ مٹا دیا۔ خادم جو پاس کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا، عرض پرداز ہوا کہ دائرے کو مٹانے میں کیا حکمت ہے؟ بادشاہ نے کہا "فیہ فیہ" یہاں دو مرتبہ لکھنا ہی درست ہے۔ مگر سائل کا دل رکھنے کے لیے میں نے ایک "فیہ" کے گرد دائرہ کھینچ دیا۔ اب لفظ کا احاطہ کرنے والا دائرہ مٹانا آسان ہے، بہ نسبت اس دائرے کے جو سائل کی بات نہ ماننا تو اس کے دل پر پڑ جاتا۔

کتب خانہ سلطان غیاث الدین بلبن (متوفی ۶۸۵ھ/ ۱۲۸۶ء)

بادشاہ بننے سے قبل غیاث الدین بلبن جہاں خوش آواز کتاب خواں کو نوازتا تھا، وہاں شیریں زبان ندیموں اور گانے والوں کی بھی پرورش کرتا تھا۔ لیکن بادشاہ ہونے کے بعد تو علما کی موجودگی کے بغیر کھانے کی طرف بھی ہاتھ نہ بڑھاتا، اور کھانے کے دوران بھی علما سے دین کے مسائل دریافت کیا کرتا۔[۱۸] یہی وجہ ہے کہ سلطان کے عہد میں کمینہ خصلت اور نااہل اشخاص کے لیے گوشۂ گمنامی مقدر ہوا اور نیک و سعادت مند افراد کا بول بالا ہوا۔[۱۹] علما کی صحبت اور دین سے محبت کے نتیجے میں سلطان نے مساجد، مدارس اور کتب خانے قائم کیے تاکہ اسلامی تعلیم اور مذہب پھیلے۔ دیگر کتب خانوں کے علاوہ سلطان نے شاہی کتب خانہ بھی قائم کیا جو اس کے علمی شغف اور عالی مرتبت درباری علما کی شب و روز جدوجہد کی بدولت بڑی ترقی کر گیا تھا۔

۱۷۔ ابن بطوطہ۔ سفر نامہ ابن بطوطہ، مترجم رئیس احمد جعفری (کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۷ء)، ص ۵۳
۱۸۔ ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی مترجمہ معین الحق (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۹۲
۱۹۔ ابوالفضل۔ آئینِ اکبری ترجمہ محمد فدا علی طالب (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ت ـ ن)، ص ۵۴

کتب خانہ حضرت نظام الدین اولیا (متوفی ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء)

محمد بن احمد بن علی البخاری نے سلطان المشائخ، سلطان جی، سلطان الاولیا، سلطان السلاطین اور نظام الدین اولیا جیسے القاب سے شہرت پائی اور محبوب الٰہی کے نام سے یاد کیے گئے۔ آپ کا شمار اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔ آپ بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ حق دکھانے کے لیے شب و روز کوشاں رہتے۔ اس خدمت کے لیے علم کی شدید ترین ضرورت ہوتی ہے، اور کتب خانے ہی الہامی اور اکتسابی علوم کے خزینے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت نظام الدین اولیا نے بھی اس ضرورت کے پیش نظر ایک شاندار کتب خانہ قائم فرمایا۔[۲۰] ان کا کتب خانہ دہلی کے علاقہ غیاث پورہ میں قائم ہوا جو آج بھی موجود ہے۔ یہ کتب خانہ شروع ہی سے وقف عام تھا، جس سے اشراف و اکابر اور علما و عوام سب مستفید ہوتے تھے۔ لوگ زیادہ تر سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور بعض بزرگ تو کتابیں ساتھ بھی لے جاتے تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے شیخ سراج الدین عثمانی گوری کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے مولانا رکن الدین سے کفایہ مفصل، قدوری، مجمع البحرین بخوبی پڑھیں اور شیخ نظام الدین اولیا کی وفات کے بعد بھی تین سال تک دیگر علوم حاصل کرتے رہے اور بعد ازاں شیخ کے وقف کتب خانے سے کچھ کتابیں، کپڑے اور شیخ سے حاصل کردہ خلافت نامہ اپنے ساتھ لے گئے۔[۲۱]

کتب خانہ سلطان جلال الدین خلجی (متوفی ۶۹۵ھ/ ۱۲۹۵ء)

سلطان جلال الدین خلجی کا علمی ذوق بہت نمایاں تھا۔ وہ علما کی خاطر خواہ قدر و منزلت کرتا، جس سے شاہی دربار میں ایسا علمی ماحول پیدا ہو گیا تھا جو اس سے قبل مفقود تھا۔ امیر خسروؒ نے بحیثیت شاعر، شہزادہ محمد بن بلبن کی ملازمت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور شہزادے کی وفات کے بعد سلطان بلبن سے سلطان غیاث الدین تغلق تک متعدد سلاطین کی زیر سرپرستی رہے اور پھر سلاطین اور امرا کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کے پیش نظر دہلی میں جو علمی ماحول پیدا ہوا، امیر خسروؒ

۲۰؎ عبد المجید سالک۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں (لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۷ء)، ص ۱۹۲

۲۱؎ عبد الحق، محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد (کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۶۸ء)، ص ۱۶۳

بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ دہلی دانش وری میں وسط ایشیا کی مشہور جامعہ بخارا کی ہم سر ہے۔

سلطان بلبن کے عہد میں متعدد مساجد، کالج اور کتب خانے قائم ہوئے۔ عام کتب خانوں کے علاوہ سلطان نے شاہی کتب خانے کی تعمیر و ترقی میں مؤثر اقدام کیا۔ ان میں سب سے اہم قدم امیر خسروؒ کو بطور مصحف بردار اور ناظم کتب خانہ تعینات کرنا تھا۔[۲۲]

کتب خانہ سلطان علاء الدین خلجی (متوفی ۷۱۶ھ/ ۱۳۱۶ء)

اس میں شک نہیں کہ سلطان آغاز میں ناخواندہ تھا، لیکن اس نے اپنی ناخواندگی کو شدت سے محسوس کیا اور پوشیدہ طور پر تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور جلد ہی فارسی زبان میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ خطبات پڑھ کر سنانے اور بہترین مصنفین کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو گیا۔ ظاہر ہے اسی دوران میں سلطان نے شاہی کتب خانے سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اور اس کی ترقی کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور پھر کثیر علما کا وجود بھی کثیر ذخیرۂ کتب کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ برنی کا قول ہے کہ دارالحکومت دہلی بے نظیر شخصیتوں کے وجود سے ایک عظیم شہر بن گیا تھا۔ درحقیقت دہلی ان ایام میں رشکِ بغداد، غیرتِ مصر اور ہمسرِ قسطنطنیہ اور بیت المقدس تھا۔

سلطان علاء الدین نے اپنے عہد میں حوض خاص سے متصل ایک بڑا مدرسہ قائم کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے کہ مدرسۂ علائی کے دروازے کے نقوش اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ سلطان نے علم و ادب کو ترقی دی، نیز اس نے کالجوں (اعلیٰ مدارس) کے ضوابط بنائے۔ اور عبادت گاہوں کو استحکام بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ جس کثرت سے مساجد، خانقاہیں اور حوض علاء الدین نے تعمیر کرائے کسی اور بادشاہ کے زمانے میں تعمیر نہیں ہوئے۔

بختیار خلجی (متوفی ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء)

بختیار خلجی کا پہلا حملہ بہار میں واقع بدھ مذہب کی خانقاہی درس گاہ پر ہوا جو بدھ طلبا اور راہبوں سے معمور تھی اور یہاں عمدہ کتب خانے بھی تھے۔ اس کے بعد بختیار نے اپنی تخریبی کارروائی

۲۲۔ ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی ترجمہ خدا علی طالب (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ت۔ن)، ص ۲۰۵

کی جزوی تلافی اس طرح کی کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور اشاعتِ دین کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں مساجد، دانش گاہیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ بختیار خلجی کو بہار کی فتح کے موقع پر ہندوؤں کی کتابیں بھی دستیاب ہوئیں لیکن ان کتابوں کے پڑھنے والا اور سمجھانے والا کوئی نہیں ملا۔

بختیار خلجی کے عہد میں اگرچہ کتب خانوں کی تفصیل نہیں ملتی۔ تاہم یہ طے شدہ امر ہے کہ بختیار کے عہدِ حکومت میں کتب خانے قائم ہوئے، چنانچہ ڈاکٹر بمل کماردت طبقات ناصری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اس نے مساجد، کالج اور کتب خانے بنوائے تاکہ اسلامی تعلیم اور مذہب پھیلے۔

سلطان محمد بن تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۰ء)

اس میں شک نہیں کہ سلطان محمد بن تغلق متضاد صفات کا مالک تھا، چنانچہ مشہور مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے کہ اگر موروثی اسلام مانع نہ ہوتا تو یہ بادشاہ شاید فرعون کی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا لیکن دوسری طرف وہ اسلام کی پوری پوری پیروی کرتا تھا، یہاں تک کہ فرض، سنت، نفل و مستحب کا پابند تھا۔ محمد تغلق کو فلسفہ اور معقولات کے تمام علوم سے عموماً اور نجوم وطب، ریاضی اور منطق سے خصوصاً دلچسپی تھی۔ وہ فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا اور پرانے شعرا کے کلام کو خوب سمجھتا تھا۔[۲۳] دینی علوم کا یہ حال تھا کہ قرآن عزیز اور حنفی مسلک کی مشہور کتاب الهدایہ زبانی یاد تھی۔[۲۴] کیا اتنے علوم و فنون میں مہارت رکھنے والا بادشاہ اپنے علمی و ادبی ذوق کی تسکین کتب خانے کے بغیر کرتا ہوگا؟ جب کہ اسے کتابیں پیش کرنے والے بیش قیمت انعامات سے نوازے جاتے تھے۔ ایک شخص نے ابن سینا کی کتاب کا نسخہ پیش کیا تو اس کے عوض سلطان نے دو مثقال یا اس سے بھی زیادہ سونا دیا۔ اس علم پروری کی بنا پر مدارس کے کتب خانوں میں طرح طرح کی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا۔

کتب خانہ سلطان فیروز تغلق (متوفی ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء)

سلطان فیروز تغلق نہایت درجہ عالم اور فاضل بادشاہ تھا۔ تاریخ فیروز شاہی اس کی لیاقت

۲۳ھ فرشتہ، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۰، ۱۱

۲۴ھ ابوالعباس، شہاب الدین سالک الابصار فی ممالک الابصار۔ ترجمہ ایلیٹ ج ۳، ص ۵۸۰

کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔ چونکہ سلطان خود عالم تھا، اس لیے اس نے اپنے دور کے تمام علوم کو ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور اپنے دربار میں آنے والے کسی ہندوستانی یا غیر ہندوستانی عالم کو نظر انداز نہ کیا۔ سلطان کے عہد میں مدارس اور مساجد طلبا سے معمور تھے اور علم کا چرچا عام ہوگیا تھا۔ اساتذہ کو ہزاروں گاؤں بطور انعام ملے۔ عام طلبا کے علاوہ سلطان کے اپنے غلاموں میں سے بعض تو ہر وقت تلاوت و حفظِ قرآن میں مشغول رہتے جبکہ بعض غلام علم کے حصول میں معروف تھے۔ اور بعض کتابوں کو نقل کرنے پر مامور تھے[۲۵]

سلطان نے شاہی محل کے تمام امور کو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں بانٹ رکھا تھا، اور ہر شعبہ کارخانہ کہلاتا تھا۔ ہر شعبے کا نگران کوئی امیر مملکت ہوتا جسے بادشاہ خود مقرر کرتا تھا۔ ان شعبوں میں سے ایک شعبہ کتب خانہ بھی تھا جو "علم خانہ" کے نام سے موسوم تھا۔ اس کتب خانے کا ناظم مشہور مورخ عفیف کا چچا تھا۔ سلطان کو کتابوں سے بے حد محبت تھی، چنانچہ سلطان نے جب نگرکوٹ فتح کیا اور سلطان کو اس کا علم ہوا کہ جوالا مکھی نامی کتب خانے میں تیرہ سو کتابیں بھی موجود ہیں تو سلطان نے ان کو اپنے کتب خانے میں منتقل کیا اور برہمنوں سے کچھ کتابوں کے تراجم کرائے۔ فیروز شاہ کے عہد کے ایک مشہور شاعر اعز الدین خالد ثانی نے حکمت طبعی اور شگون و فال کی ایک کتاب کا فارسی زبان میں منظوم ترجمہ کیا، اور اپنی اس تالیف کو "دلائل فیروز شاہی" کے نام سے موسوم کیا۔ "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق اس دور میں مسلمان امرا و وزرا کے علاوہ ہندو راجاؤں نے بھی اپنے اپنے کتب خانے قائم کیے۔

کتب خانہ تاتار خاں

تاتار خاں سلطان غیاث الدین کے عہد کا مشہور امیر ہے، وہ جہاں عدل و شجاعت میں مشہور تھا وہاں علم و کمال میں بھی ممتاز تھا۔ تاتار خاں نے علما کے ایک گروہ کو اکٹھا کیا اور اس وقت تک لکھی گئی تفاسیر کو بھی جمع کیا۔ علمائے کرام کی علمی معاونت سے ایک تفسیر مرتب کی جس میں آئمہ تفاسیر کے اختلافات کو ان کے نام کے ساتھ جمع کیا۔ تاتار خاں نے اپنی تفسیر "تفسیر تاتار خانی" کی تالیف

---

۲۵ شمس سراج عفیف۔ تاریخ فیروز شاہی ترجمہ ایلیٹ جلد ۳ / ص ۱۴۱ ۳

میں دل وجان سے کوشش کی۔ علاوہ ازیں تاتارخاں نے ایک مجموعۂ فتاویٰ بھی مرتب کیا جو تقریباً تیس جلدوں پر مشتمل تھا۔

ایک انگریز ادیب سیموپل جانسن نے خوب کہا ہے کہ ایک کتاب تصنیف کرنے میں تقریباً آدھے کتب خانے کو کھنگالنا پڑتا ہے، چنانچہ تاتارخاں نے بھی اپنی دو عظیم الشان تالیفات اپنے شان دار کتب خانے کی مدد سے تیار کیں۔ تاتارخاں کی ایک ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں فتاوے کے موضوع پر بے شمار قیمتی کتابیں موجود تھیں۔

سلطان بہلول لودھی (متوفی ۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ء)

لودھی خاندان کا یہ پہلا بادشاہ تھا، وہ اپنا بیشتر وقت حکما اور علما کی صحبت میں گزارتا تھا اور غربا و مستحقین سے متعلق خصوصی معلومات حاصل کرتا تھا۔ اس نے کسی ضرورت مند کو کبھی نہیں ٹالا۔ وہ نماز پنجگانہ ہمیشہ عوام کے ساتھ باجماعت ادا کرتا تھا۔ سلطان سفر و حضر میں عالموں اور درویشوں کے ساتھ رہتا۔ پروفیسر لا لکھتا ہے کہ سلطان موصوف کے عہد میں امن وامان قائم ہوا اور اس کے ساتھ ہی مملکت کی طرف سے علمی ذوق اور تعلیمی ترقی کی ہمت افزائی بھی شروع ہوگئی۔ "ماثر رحیمی" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چند جامعات تعمیر کیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ اس دور کی روایت کے مطابق جامعات کے ساتھ کتب خانے بھی قائم کیے ہوں گے۔ نیز شاہی کتب خانے نے بھی سلطان کے زمانے میں خوب ترقی کی ہوگی۔

کتب خانے اور سلطان سکندر لودھی (متوفی ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء)

سلطان سکندر کے پاس ایک شاہی کتب خانہ بھی تھا اور اس زمانے میں ملک میں اور بھی بے شمار کتب خانے وجود میں آئے۔ اس کے امرا اور درباریوں نے بھی اپنے اپنے کتب خانے قائم کیے۔ ان میں سے غازی خاں کا کتب خانہ قابل ذکر ہے، غازی خاں کے علاوہ اس کا ایک اور امیر میاں بدھا تھا، وہ کچھ کتابیں خراسان سے لایا اور علما و صلحا کو دیں۔ سلطان کی زیر سرپرستی علما ہمیشہ کتابوں کے تراجم میں لگے رہتے۔ اس نے خراسان اور ہندوستان کے تمام اطبا کو جمع کیا اور طب سے متعلق بہت سی کتابیں اکٹھی کیں۔ چنانچہ سلطان کے عہد میں طب کی ارکرحھایدک نامی کتاب کا ترجمہ کیا گیا جس نے طب سکندری کا نام پایا۔ اس سے زیادہ مستند کتاب پورے ہندوستان میں نہیں ہے۔[۱۱] سلطان

بہترین شاعر تھا اور گلرخی تخلص کرتا تھا۔[۲۷] سلطان نے علم و ادب کی ہر لحاظ سے حوصلہ افزائی کی۔ اس نے ملک کے ہر حصے میں مدارس قائم کیے اور آگرہ کے کالجوں میں ممتاز علما کا تقرر کیا۔ اس نے اپنی فوج کے افسروں کے لیے تعلیم لازمی قرار دی۔ ہندوؤں نے فارسی تعلیم حاصل کرنا اسی کے عہدِ حکومت میں شروع کیا تھا۔[۲۸]

مدارس اور کالجوں کا قیام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے ساتھ کتب خانے بھی قائم ہوئے ہوں گے، کیوں کہ کتب خانے تعلیمی اداروں کے لیے ہمیشہ سے روح رواں کا درجہ رکھتے ہیں۔

کتب خانہ غازی خاں

غازی خاں عہد سکندری کا ایک امیر تھا۔ مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے کہ غازی خاں ایک جید عالم تھا اور شاعری کا بہترین مذاق رکھتا تھا۔ اس نے ہر موضوع کی عمدہ کتابیں خوش خط لکھوا کر اپنے کتب خانے میں جمع کی تھیں۔[۲۹] یہ کتب خانہ دہلی کے قلعے میں تھا جس پر بابر نے ۱۵۲۵ء میں ہندوستان کی فتح کے موقع پر قبضہ کیا۔ تزکِ بابری میں لکھا ہے کہ میں نے غازی خاں کے کتب خانے کا معائنہ کیا اور اس میں مفید کتابوں کی ایک بڑی تعداد پائی۔ اس کے علاوہ مذہب سے متعلق بھی بہت کتابیں ملیں۔ بابر نے کتب خانے کے حصے بخرے کر کے کئی لوگوں کی علمی کفالت کی۔ اس کا ایک حصہ شہزادہ ہمایوں کو دیا۔ کچھ کتابیں کامران مرزا کے لیے کابل بھجوائیں اور کچھ کتابیں اپنے لیے رکھیں۔

کتب خانہ سید ابراہیم دہلوی (متوفی ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء)

سکندر لودھی کے عہد کے ایک غیر مشہور عالم دین سید ابراہیم تھے۔ وہ دانش مند، فلسفی، تمام علوم عقلی و نقلی کے ماہر اور کثیر المطالعہ بزرگ تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کی تصحیح بھی کی۔ مزید برآں انھوں نے مشکل کتابوں کے مشکل مضامین کو سلیس زبان میں پیش کیا۔ غرضیکہ وہ دہلی کے یکتائے روزگار عالم تھے۔ ان کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا

۲۷؎ فرشتہ، ج ۲، ص ۱۶۲

۲۸؎ ابوالحسنات ندوی۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں۔ ص ۳۶

۲۹؎ فرشتہ، ج ۲، ص ۲۰۶

ان کے کتب خانے سے کثیر تعداد میں کتابیں برآمد ہوئیں اور ان میں سے اکثر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔[۵۳]

کتب خانہ شیخ سعد اللہ متوفی (۹۱۷ھ/ ۱۵۱۱)

شیخ سعد اللہ بھی سکندر لودھی کے دور کے عالم تھے جو ایک صاحبِ دل بزرگ تھے۔ کتابوں کے بے حد شائق تھے، ان کی ایک قابلِ قدر لائبریری تھی۔

کتب خانے اور سلاطین کشمیر

سلاطینِ دہلی کی طرح سلاطینِ کشمیر بھی علم و ادب کے دل دادہ تھے۔ انھوں نے علوم کی سرپرستی کی۔ اس سلسلے میں سلطان زین العابدین قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے اشاعتِ علم کے لیے اپنے محل کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا اور مولانا کبیر کو اس کا مہتمم بنایا۔ سلطان گاہے بگاہے مولانا کا درس سننے جاتا اور مدرسے کے مستحق طلبا کو وظائف دیتا تھا۔ اس مدرسے کے علاوہ سلطان نے بہت سے ادبی ادارے اور کتب خانے قائم کیے۔ سلطان نے ایک تکنیکی سکول بھی قائم کیا جس میں طلبا کاغذ سازی، جلد سازی اور دیگر فنون سیکھتے تھے۔

زندہ اقوام کی ہمیشہ یہ روایت رہی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اسلاف کے قائم کردہ کتب خانوں اور علمی ورثوں کی حفاظت کرتی ہیں بلکہ ان میں معتدبہ اضافہ کرکے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا اہتمام بھی کرتی ہیں جو اس سے استفادہ کرتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے حال کا ماضی کے آئینے میں جائزہ لیتی ہیں کہ کیا وہ اپنے نظریہ حیات کے مطابق صحیح راہ پر گامزن ہیں یا نہیں۔ آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں، اس کے پیشِ نظر ہمیں انفرادی طور پر جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہمیں نہ صرف اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنا چاہیے بلکہ انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں کی رہنمائی بھی کرنی چاہیے۔

---

۵۳ عبدالحق، محدث دہلوی اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (دہلی، مطبع مجتبائی، ۱۳۳۲ھ)، ص ۲۵۰

پروفیسر رحمت فرخ آبادی ایم اے

دولتِ ہباریہ منصورہ (سندھ)

دولتِ ہباریہ کا بانی عمر بن عبدالعزیز ہباری تھا۔ اس نے ۲۴۷ھ میں سندھ میں ایک آزاد اور خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی، اس کا پایۂ تخت منصورہ تھا۔

اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت ہبار بن اسود اسدی قرشیؓ تھے ۔ یہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے اور مدینہ میں قیام پذیر ہوئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ہبار بن اسود ملک شام کی طرف چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ان کا انتقال ۵۱ھ میں ہوا۔

حضرت ہبار بن اسود کے تین لڑکے تھے ۔ (۱) علی بن ہبار (۲) عبدالرحمٰن بن ہبار (۳) اسمٰعیل بن ہبار۔ سندھ میں ہباری سلطنت کے بانی عمر بن عبدالعزیز انہی عبدالرحمٰن بن ہبار کی اولاد سے ہیں ۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے : عمر بن عبدالعزیز بن منذر بن زبیر بن عبدالرحمٰن بن ہبار بن اسود۔

درحقیقت عبدالرحمٰن بن ہبار کے پوتے منذر بن زبیر ہباری اموی دورِ خلافت میں سندھ آئے۔ ابنِ خلدون لکھتا ہے کہ ابن ہبار کا خاندان بنوامیہ اور بنوعباس دونوں ادوار میں سلطنت کے کاموں میں شریک رہا اور آہستہ آہستہ حجازی قبیلے کا سردار ہوگیا۔ عمر بن عبدالعزیز ہباری انہی کے پوتے تھے جنھوں نے سندھ کے ایک علاقے پر قبضہ کرکے اپنی خود مختار حکومت قائم کی، لیکن اس کے باوجود عباسی خلافت کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ ہباری خاندان کی سندھ پر حکومت ۴۱۷ھ تک قائم رہی ۔ اس طرح اس خاندان نے تقریباً پونے دوسو سال تک حکومت کی ۔ اس خاندان کے جن حکمرانوں کے حالات کتبِ تواریخ سے دست یاب ہوئے ہیں وہ ہم بیان کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے علاوہ اس خاندان کے دیگر افراد بھی حکمراں رہے ہوں لیکن تاریخ ان کے بارے میں خاموش ہے۔

۱۔عمر بن عبدالعزیز ہباری : مشہور مؤرخ بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں والئ عراق خالد بن عبداللہ قسری نے ۱۰۸ھ میں حکم بن عوانہ

کلبی کو سندھ کا حاکم بنا کر بھیجا تو اسی کے ساتھ عمر بن عبد العزیز کا دادا، منذر بن زبیر بھی سندھ آئے، اور سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر یانیہ میں رہائش اختیار کی۔ منذر بن زبیر تقریباً پچیس سال تک یانیہ میں خاموشی سے زندگی گزارتے رہے۔ لیکن جب بنو عباس کا دور آیا تو انھوں نے سندھ سے نکل کر ۱۳۲ھ میں قرقیسیا میں اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کی اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عباسیوں کے خلاف باغیوں کی رہنمائی کی، لیکن گرفتار ہوئے اور بعد میں انھیں قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۳۶ھ کا ہے۔ منذر بن زبیر کے قتل کے بعد کافی عرصے تک ہباری خاندان کی سرگرمیوں کا حال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ ہباری خاندان نے سندھ کے شہر یانیہ میں رہ کر عباسی خلافت سے اپنی وفاداری اور اپنے تعلق کو قائم رکھا۔

۲۲۷ھ میں جب عباسی خلیفہ واثق باللہ کے دور میں سندھ میں مقیم عربوں کی قبائلی جنگ نے یمنی اور نزاری عصبیت پیدا کر دی تو سندھ کے عباسی حکمران عمران بن موسیٰ برمکی نے یمنیوں کا ساتھ دیا اور بلاذری کے الفاظ میں منذر بن زبیر کے پوتے عمر بن عبد العزیز نے حجاز کے نزاریوں کا ساتھ دیا اور عباسی گورنر عمران کا مقابلہ کیا، اور آخرکار عمر بن عبد العزیز کے ہاتھوں عمران قتل ہوا۔ اس کی اس کامیابی کی وجہ سے سندھ میں اس کی کافی شہرت و ناموری ہوئی اور اس طرح سندھ میں اس کے اقتدار کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود عمر بن عبد العزیز ہباری نے عباسی خلافت سے تعلق قائم رکھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خلیفہ معتصم باللہ کے والیٔ سندھ عنبسہ بن اسحاق کے ماتحت رہ کر عباسی خلافت کا وفادار رہا۔ اس دور میں بھی عمر بن عبد العزیز کا اقتدار مطلق العنان حکمراں سے کسی طرح کم نہ تھا اور اس کی مرضی اور استقبال کے بغیر کوئی عباسی حاکم سندھ میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی شان و شوکت اور اقتدار نے اس کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ چنانچہ جب ۲۴۰ھ میں سندھ کا عباسی والی ہارون بن ابو خالد مروزی قتل کر دیا گیا تو عمر بن عبد العزیز نے منصورہ پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ متوکل نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے سندھ کا والی مقرر کر دیا لیکن جب ۲۴۷ھ میں خلیفہ متوکل قتل ہوگیا تو عمر بن عبد العزیز نے سندھ میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی، لیکن اب بھی اس نے عباسی خلافت سے تعلق برقرار رکھا اور عباسی خلفا ہی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ خلافتِ بغداد سے اس کے خوش گوار تعلقات کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ

عباسی خلافت بھی سندھ کو اپنے مقبوضات میں شمار کرتی تھی۔ چنانچہ جب عباسی خلیفہ معتمد نے یعقوب بن لیث الصفار کو ۲۵۷ھ میں ترکستان، طبرستان سجستان، جرجان، آذر بائیجان، رے اور کرمان کی سند امارت دی تو سندھ کا علاقہ بھی اس میں شامل تھا۔ اور یہ کہ ۲۶۱ھ میں جب خلیفہ معتمد نے اپنے بھائی موفق کو مشرقی علاقوں کی سند امارت دی تب بھی اس میں سندھ شامل تھا۔ بقول قاضی اطہر مبارک پوری اس نے اپنے زمانے میں نہایت کامیاب اور شان دار حکومت کی۔ پورے سندھ میں امن وامان قائم کیا۔ عوام میں مقبولیت حاصل کی، خراج اور ٹیکس وصول کیا اور اسی کی نسبت سے منصورہ کے ہباری حکمران بعد میں بنو عمر بن عبدالعزیز کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اسی کے دور میں برصغیر کے معاملات سے اہلِ عرب زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ چنانچہ مولانا ابوظفر ندوی لکھتے ہیں کہ ابن ندیم جس نے اپنی کتاب ۳۷۷ھ میں ترتیب دی تھی، لکھتا ہے کہ ایک کتاب میری نظر سے گزری جس میں ہندوستان کے مذاہب کا بیان تھا۔ یہ جمعہ ۳ محرم ۲۴۹ھ کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کا کاتب یعقوب بن اسحاق کندی تھا۔ اس میں لکھا کہ یحییٰ بن خالد برمکی نے کچھ لوگوں کو ہندوستان اس لیے بھیجا کہ یہاں کے نباتات کی تحقیقات کی جائے اور کارآمد اشیا اپنے ساتھ لائیں اور دینی امور کی بھی چھان بین کی جائے، چنانچہ واپسی پر انھوں نے ایک رپورٹ پیش کی یہ اسی کا خلاصہ ہے۔ عمر بن عبدالعزیز نے صرف تین سال حکومت کی۔ اس کا انتقال ۲۵۰ھ میں ہوا۔

۲۔ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز ہباری: عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد اس کا لڑکا عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوا۔ مولانا ابوظفر ندوی لکھتے ہیں کہ وہ ۲۷۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا جو غلط ہے۔ البتہ وہ ۲۷۰ھ میں حکمران تھا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی طرح سندھ پر بہت کامیابی سے حکومت کی ــــ یہ اپنی شرافت اور دیانت داری کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس کا دربار علما، فضلا، ادبا اور شعرا سے بھرا رہتا تھا۔ اسی کے دورِ حکومت میں بنوکندہ کے ایک آزاد کردہ غلام الوالصمہ (جو تیسری صدی ہجری کے شروع میں عباسی والیٔ سندھ عمر بن حفص کے ساتھ سندھ آیا تھا) کے لڑکے ابوسمہ نے سندھ میں بغاوت کر کے منصورہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ عبداللہ بن عمر چونکہ بانیہ میں رہتا تھا جو منصورہ سے سات میل دور تھا، اس لیے محفوظ رہا۔ بعد میں عبداللہ بن عمر نے اسے شکست دے کر منصورہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اسی وقت سے بانیہ کے بجائے

منصورہ میں رہنا شروع کر دیا۔

عبداللہ بن عمر کے دور کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ کشمیر کے قرب و جوار میں الور کے راجہ مہروق بن رائق نے جو ہندوستان کے نامی گرامی بادشاہوں میں سے تھا، ۲۷۰ھ میں حاکم منصورہ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ وہ اس کے لیے اسلامی شریعت اور احکام کو ہندی زبان میں شرح کے ساتھ بیان کرنے کے لیے کسی عالم کو بھیجے۔ عبداللہ بن عمر نے ایک عالم و فاضل کو بلایا جو منصورہ میں رہتا تھا، اس کا خاندان عراق کا تھا۔ یہ عالم ذہین و طباع اور معاملہ فہم ہونے کے ساتھ عربی زبان کا بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی تھی اور وہ یہاں کی مختلف زبانوں سے واقف تھا۔ عبداللہ بن عمر نے الور کے راجہ مہروق بن رائق کی خواہش اس کے سامنے رکھی۔ اس نے راجہ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے ایک قصیدہ لکھ کر بھیج دیا۔ اس نے اس قصیدے میں اپنی ضروریات کا ذکر کیا تھا جو راجہ کے پاس جانے پر درکار تھیں۔ جب یہ قصیدہ راجہ کو سنایا گیا تو وہ بہت خوش ہوا اور عبداللہ بن عمر کو لکھا کہ اس قصیدے کے لکھنے والے عالم کو فوراً بھیج دیا جائے، چنانچہ عبداللہ بن عمر نے اس عالم کو راجہ کے پاس الور بھیج دیا جہاں وہ تین سال مقیم رہا۔

جب یہ عالم منصورہ واپس آیا تو عبداللہ بن عمر نے راجہ کے بارے میں دریافت کیا۔ اس عالم نے پوری تفصیل بیان کی اور کہا کہ میں نے راجہ کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ قلب و زبان سے تو وہ مسلمان ہو گیا ہے مگر حالات کی نزاکت اور سلطنت کے خیال سے اپنے اسلام کا اظہار نہیں کر سکا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ راجہ نے مجھ سے قرآن کریم کی تفسیر ہندی زبان میں بیان کرنے کی فرمائش کی تو میں نے اس کے ایما پر یہ کام بھی کیا۔ اس نے اور دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ راجہ نے اپنے لیے ایک مخصوص کمرہ بھی بنوایا تھا جس میں وہ تنہا داخل ہو کر نماز پڑھتا تھا اور کسی دوسرے کو اطلاع نہیں ہوتی تھی۔ ارکانِ دولت سمجھتے تھے کہ راجہ مہماتِ سلطنت اور ذاتی معاملات پر غور و فکر کے لیے اس کمرے میں جایا کرتا ہے اور یہ کہ اس عرصے میں راجہ نے مجھے تین بار ہدیہ میں سونا دیا جس کی مجموعی تعداد چھ سو سیر تھی۔

عبداللہ بن عمر ہی کے دور میں سندھ کے ایک سرحدی علاقے کا راجہ ۲۵۹ھ میں مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے سونے کی ایک زنجیر جو زمرد اور یاقوت سے پچیکاری کی ہوئی تھی بطور ہدیہ بیت اللہ

شریف بھیجی جس کے ساتھ سبز رنگ کا یاقوت بھی تھا۔ بعد میں جب یہ خبر بغداد پہنچی تو یہ ز
خلیفہ معتمد کے سامنے پیش کی گئی۔ اس نے حکم دیا کہ کعبے میں اس کو آویزاں کیا جائے، چنانچہ ا
حکم کی تعمیل کی گئی۔

اسی کے زمانے میں مشہور سیاح ابو زید سیرافی ۲۶۴ھ میں ہندوستان آیا۔ اسی طرح اسما
داعی بھی عبداللہ بن عمر کے دور ۲۷۰ھ میں سندھ آئے۔ اس وقت اسماعیلیوں کے امام عب
المہدی تھے۔ انھوں نے جس داعی کو روانہ کیا اس کا نام ہیثم تھا۔ اسی نے سندھ میں اسما
انقلابی تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک نے آگے چل کر سندھ میں اپنی سلطنت بھی قائم کر لی تھی۔
مولانا قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں مہاراجگان الور، سلاطین منصورہ کی
میں ان کے باج گزار بن کر حکومت کرتے تھے اور رالور میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی اور اسا
شان و شوکت چہار سو برپا تھی۔

۳۔ موسیٰ بن عمر بن عبدالعزیز: یہ عبداللہ بن عمر کا حقیقی بھائی تھا۔ ۲۷۱ھ میں اس
حکمران ہونے کا پتا چلتا ہے۔ عباسی خلفا کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ اس
۲۷۱ھ میں عباسی خلیفہ معتضد کی خدمت میں ہدیہ بھیجا تھا جس میں عظیم الجثہ ہاتھی، عمدہ نس
اونٹ اور گائے کی مانند ہرن جن کا رنگ سیاہی مائل تھا، سونے کے تین مجسمے، مشک وعن
ریشمی کپڑے، عود کا تخت اور اسی قسم کی دوسری گراں مایہ اشیا شامل تھیں۔ اس کے اس
ہدیہ بھیجنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ اس کی حکومت کا پہلا سال ہو اور اسی منا
سے عباسی خلیفہ کو ہدیہ روانہ کیا ہو۔ ان تحفے تحائف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہباری حکم
کے تعلقات عباسی خلافت سے نہایت خوش گوار اور پرخلوص تھے اور وہ ان کے نام کا خ
پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے اقتدار کے بھی گن گاتے تھے۔

ابن کثیر لکھتا ہے کہ انھی کے زمانے میں شوال ۲۸۰ھ میں سندھ کی بندرگاہ دیبل میں چا
لگا۔ غالباً سورج گرہن بھی تھا، کیونکہ عصر کے وقت تک تاریکی چھائی رہی تھی۔ پھر عصر کے وقت
سیاہ رنگ کی ایک شدید آندھی چلی جو تہائی رات تک چلتی رہی۔ دیبل کے لوگ جب آرام
نیند کے مزے لے رہے تھے اور رات کا تہائی حصہ گزر چکا تھا کہ یکایک بڑے زور کا زلزلہ آ

دیبل تباہ ہوگیا، بمشکل ایک سو مکان بچے ہوں گے۔ اس کے بعد پھر پانچ مرتبہ زلزلہ آیا۔ ملبے کے نیچے سے ایک لاکھ پچاس ہزار آدمی مردہ نکلے۔ مجروح اور زندہ رہنے والے افراد کی تعداد اور جو صحیح سلامت بچ رہے، اس کے علاوہ ہے۔ اس سے دیبل کی آبادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفا میں لکھا ہے کہ اس واقعے کی خبر فوراً پرچہ نویس نے بغداد روانہ کی۔ بغداد میں اس وقت معتضد باللہ خلیفہ تھا جس کی حکومت ۲۷۹ھ ۲۸۶ھ تک رہی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سندھ پر اس وقت تک عباسی خلیفہ کا اثر موجود تھا اور یہ کہ ڈاک اور خفیہ پولیس کا انتظام بھی براہِ راست خلیفۂ بغداد کے ماتحت تھا۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ انہی کے زمانے میں ۲۸۳ھ میں بغداد سے محمد بن ابی الشوارب پایۂ تخت منصورہ کے قاضی منتخب کیے گئے۔ یہ بڑے اہل علم اور لائق لوگوں میں سے تھے۔ اگر یہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو سندھ کو بڑا فائدہ پہنچتا، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور سندھ کے چھ ماہ بعد ہی شوال ۲۸۳ھ میں انتقال کر گئے۔

۴۔ **ابو المنذر عمر بن عبداللہ:** یہ دولتِ ہباریہ منصورہ کا چوتھا حکمران تھا۔ اس کا نام عمر اور کنیت ابو المنذر تھی۔ اس کے زمانے میں (۳۰۰ھ سے ۳۰۴ھ میں) مشہور عرب سیاح المسعودی سندھ آیا تھا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب مروج الذہب میں اس کے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے وزیر کا نام رباح ہے۔ اس کے دو لڑکے ہیں جن میں ایک کا نام محمد اور دوسرے کا نام علی ہے۔ ارکانِ دولت میں سے ایک شخص حمزہ نامی بڑا با اثر تھا۔ یہ غالباً امیر الامرا کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ ایک عرب خاندان کا معزز شخص تھا۔ منصورہ میں علویوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ سندھ کے ملوک، منصورہ اور بغداد کے آل ابن ابی الشوارب کے درمیان خوش گوار تعلقات اور رشتہ داریاں ہیں۔ ان کا پایۂ تخت منصورہ ہے جو ملتان سے تقریباً چھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ حکومتِ منصورہ سے متعلق جو علاقہ ہے اس میں تین لاکھ ایسے دیہات اور بستیاں ہیں جن کا شمار ہو سکا ہے۔ پوری مملکت میں کھیتیاں، درخت اور قریب قریب آبادیاں ہیں۔ اس میں میدنامی ایک قوم ہے جس سے اکثر جنگ رہا کرتی ہے۔ منصورہ کے بادشاہ کے پاس اسی جنگی ہاتھی ہیں اور یہاں کے جنگی اصول کے مطابق ہر ہاتھی کے اردگرد پانچ سو پیدل فوج ہوتی ہے۔ ایک ہاتھی ایک ہزار گھڑسواروں سے مقابلہ کرتا ہے۔ میں نے منصورہ کے حاکم کے یہاں دو ایسے ہاتھی دیکھے جو بہادری اور حملہ آوری میں سندھ اور

ہندوستان کے تمام راجوں، مہاراجوں میں مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام منفرقلس اور دوسرے ہاتھی کا نام حیدرہ ہے۔ منفرقلس کے بارے میں ان اطراف میں حیرت انگیز واقعات مشہور ہیں۔ مسعودی مزید لکھتا ہے کہ اس ملک میں ہاتھیوں سے لڑائی کے سوا دوسرے کام بھی لیتے تھے، مثلاً رتھ کھینچنے، بوجھ اٹھانے اور غلہ نکالنے کے کام۔

اس وقت منصورہ میں مقامی لوگ سندھی بولتے تھے مگر حکمران طبقہ اور خواص عربی اور سندھی دونوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ اگرچہ یہاں کا خود اپنا سکہ بھی تھا مگر تجارت میں آسانی کے خیال سے قندھاری اور طاطری (سماٹرا کے) سکے کا بھی رواج تھا۔ اس کے دور میں تجارت کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا۔

۵۔ محمد بن عمر بن عبداللہ: اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ محمد کا بھائی اور عمر بن عبداللہ کا لڑکا تھا۔ لیکن اگر اس نے حکومت کی تو کب سے کب تک؟ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

۶۔ علی بن عمر بن عبداللہ: اس کے بارے میں صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ محمد کا بھائی اور عمر بن عبداللہ کا لڑکا تھا۔ اس نے حکومت کی یا نہیں کی، اس بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔

۷۔ یحییٰ بن محمد: یہ محمد بن عمر بن عبداللہ کا لڑکا تھا۔ ایک روایت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۳۷۷ھ میں حکمراں تھا۔ اس کی حکومت نہ صرف پورے سندھ پر تھی بلکہ بغائین کے حکمران بھی اسے خراج دیتے تھے۔ یہ بھی دوسرے ہباری حکمرانوں کی طرح بنو عباس کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا۔ اس نے بعد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کیا۔ یہ بڑا مذہبی اور دین دار حکمران تھا اور اسلام کے شرعی قوانین کی خلاف ورزی پر شرعی حد جاری کرتا تھا۔

دولت ہباریہ کا خاتمہ

سندھ اور ملتان کی دوسری خود مختار حکومتوں کی طرح منصورہ کی دولتِ ہباریہ کا خاتمہ بھی سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا۔ ابن کثیر اور ابن خلدون نے اس بارے میں لکھا ہے کہ منصورہ کا حاکم مرتد ہوگیا تھا، چنانچہ جب محمود غزنوی کو اس کا پتا چلا تو اس نے منصورہ پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ جب حاکمِ منصورہ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ منصورہ چھوڑ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا، مگر سلطان محمود غزنوی نے

دو طرف سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا اور قتلِ عام شروع کیا۔ بہت سے لوگ قتل ہو گئے اور بہت کم بچ سکے، لیکن اس بارے میں قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں کہ سلطان منصورہ کے اسلام سے مرتد ہونے کی تصریح بڑی حیرت انگیز اور قابل نقد و نظر ہے، کیونکہ ملوک منصورہ انتہائی دیندار اور پابندِ سنت تھے، امام داؤد ظاہری کے طریقے پر شدت سے عامل تھے، دولتِ ہباریہ کا سرکاری مذہب بھی ظاہری تھا اور وہ اوّل سے آخر تک عباسی خلفا سے متعلق رہے۔ انہی کے زمانے میں سندھ کا ایک راجہ مسلمان ہوا۔ اسی طرح ہباری حکمرانوں نے خالص دینی اور اسلامی کام کیے جو ان کے دورِ حکومت کے قابلِ فخر کارنامے ہیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں سلطان محمود کے ہندوستان پر بار بار حملہ آور اور فتح یاب ہونے کے زمانے میں منصورہ کے بادشاہ کا اسلام ہی سے برگشتہ ہو جانا بالکل قرینِ قیاس نہیں ہے اور نہ کوئی اس کی دلیل ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری مزید لکھتے ہیں کہ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی یلغار نے ہندوستان کو اس طرح اپنے حلقے میں لے لیا تھا کہ پنجاب، کشمیر، سندھ اور گجرات تک کے علاقے اس کی حکومت میں آ گئے تھے۔ سندھ اور ملتان کی خود مختار عرب حکومت بھی اس کی حکومت کا حصہ بن چکی تھیں۔ صرف منصورہ کی ایک حکومت اب تک الگ تھی، لہٰذا اس کو بھی دولتِ غزنویہ میں شامل کرنے کے لیے جواز کی شکل ڈھونڈ لی گئی اور منصورہ کی خالص سُنّی اور متدین دینی حکومت کی پیشانی پر ارتداد کا ٹیکہ لگا کر اس کو بھی فتح کر لیا گیا۔ غالباً ایسا اس لیے کیا گیا کہ منصورہ میں علویوں کی بہت بڑی آبادی تھی اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے آبا و اجداد بنو عباس کے خلاف خروج و بغاوت میں نمایاں حصہ لے چکے تھے اور جہاں بھی ان علویوں کا زور چلتا وہ اپنے اس کام سے نہیں چوکتے تھے جیسا کہ انہی لوگوں نے ملتان کی سُنّی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔"

یہاں ایک بات اور محلِ نظر رہے کہ عام طور سے علوی، عباسی خلافت کے خلاف خروج وغیرہ میں سرگرمی دکھانے کی وجہ سے ہر طرف اپنے لیے خطرات محسوس کرتے تھے۔ ان میں بے گناہ بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ہباری حکمران ان بے گناہ علویوں سے محبت کرتے تھے اور ان کو بغیر کسی شک و شبہ کے اپنے یہاں رہنے کی اجازت دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کو منصورہ کے ان علویوں اور ان کے طرف داروں سے خطرہ محسوس ہوتا ہو اور اس نے منصورہ کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کے لیے ارتداد کی خبر عام کرائی ہو۔ ملک گیری کی سیاست میں یہ سب

کا درجہ رکھتی ہیں۔

اسی خلافت سے تعلق

منصورہ کے ہباری حکمران اگرچہ خود مختار اور آزاد تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنا تعلق اسی خلافت سے برقرار رکھا۔ ان کے علاقے میں عباسی خلفا ہی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ طرح انھوں نے عباسی خلافت کے مخالفوں یعنی علویوں، خارجیوں اور شیعوں کا بھی ساتھ نہ دیا انچہ ہباری خاندان کے دورِ حکومت میں سندھ کا پورا علاقہ عباسی خلافت کے دائرۂ اقتدار میں امل سمجھا جاتا تھا اور ہباری حکمران ان کے نائب کی حیثیت رکھتے تھے، البتہ ایک وقت ایسا ں آیا جب آل بویہ کے دوسرے حکمران عضدالدولہ دیلمی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، لیکن اس بارے میں ی مقدسی لکھتا ہے کہ آل بویہ کے نام کا خطبہ صرف سندھ کے ساحلی شہروں ہی میں پڑھا گیا اور لہ یہ سلسلہ صرف چند دنوں تک قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۳۶۸ھ میں عباسی خلیفہ طائع للہ نے دیلمیوں کے دباؤ سے خود حکم جاری کیا تھا کہ تمام ماتحت علاقوں میں عضدالدولہ کے نام کا طبہ پڑھا جائے۔ آل ہبار کا آلِ بویہ کے نام کا خطبہ پڑھنا درحقیقت عباسی خلیفہ ہی کے حکم کی اعت تھی، اس طرح ۲۴۷ھ سے ۴۱۶ھ تک تقریباً ایک سو ستر (۱۷۰) سال کی مدت میں منصورہ کے مرانوں نے خلافتِ عباسیہ کے جن خلفا کا خطبہ پڑھا ان کی تعداد پندرہ ہے۔

اسی طرح آل ہبار کے بغداد کے آل ابن ابی الشوارب سے بھی نہ صرف دیرینہ تعلقات قائم تھے بلکہ آپس میں دونوں کی رشتہ داریاں تک تھیں۔ آل ابن ابی الشوارب سے ان کے تعلقات سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس طرح ابن ابی الشوارب کا گھرانہ علم و فضل میں مشہور تھا، اسی طرح آلِ ہبار بھی علم و دین میں معزز و محترم شمار کیے جاتے تھے۔

نظمِ حکومت

بنو ہبار کے دور میں ان کی حدودِ مملکت میں مکمل طور پر امن و امان رہا۔ ان کے اقتدار میں آنے سے قبل سندھ سیاسی ابتری کا شکار تھا اور یہاں کی ریاستیں سرکشی کی راہ اختیار کر رہی تھیں، لیکن جب آلِ ہبار نے اقتدار سنبھالا تو ان کی حدودِ مملکت میں واقع الور کی طاقت ور ہندو ریاست نے بھی ان کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ آلِ ہبار نے اپنے نظمِ مملکت کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی

جس کی وجہ سے ہر طرف عدل وانصاف اور امن وخوش حالی کا دور دورہ ہوا۔ اسی لیے ابن حوقل بغدادی لکھتا ہے کہ "ہباری حکمرانوں نے ملکی انتظام میں وہ قابلیت دکھائی جس نے رعایا کے دلوں کو ان کی طرف کھینچ لیا اور وہ دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں ہباریوں کو چاہنے لگے۔" دولتِ ہباریہ کے نظمِ حکومت کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ ان کے بعض مقبوضہ شہروں میں مقامی حکمران ہوا کرتے تھے جو اگرچہ وہاں کے مستقل حکمران ہوتے تھے مگر خراج ادا کرکے اور بعض دوسرے شرائط منظور کرکے مرکز منصورہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ دولتِ ہباریہ کے ماتحت علاقے تھے۔ چنانچہ سندھ کا شہر الور اسی اعتبار سے حکومتِ منصورہ میں شامل تھا کہ یہاں کے راجے ماتحت تھے اور یہ کہ وہ ہباری حکمرانوں کی باج گزاری اور امان میں حکومت کرتے تھے۔

منصورہ کے ہباری حکمرانوں نے ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے فوجی طاقت اور فوجی نظام کے استحکام پر بہت زور دیا، چنانچہ مسعودی کے قول کے مطابق ان کی فوج میں اسّی جنگی ہاتھی تھے اور ہر ہاتھی کے ساتھ پانچ سو پیدل سپاہی ہوتے جو ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس زمانے میں تلوار اور نیزے عام آلاتِ جنگ تھے۔ اس کے علاوہ زرہیں، طرخونی جنگی لباس، بکتر بند اور سینہ بند وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔

ہباریوں نے اپنے پورے دورِ اقتدار میں اپنے قرب وجوار کی کسی بھی ریاست سے کوئی جنگ نہ لڑی۔ ان کا پورا دور صلحِ کل کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔ البتہ سندھ کی ساحلی قوم مید سے ان کی ہمیشہ جنگ رہی۔ یہ قوم سندھ کے ساحلی علاقوں سے لے کر ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک آباد تھی۔ یہ درحقیقت سمندری رہزن تھے، اسی لیے ان کے بارے میں مسعودی نے لکھا ہے کہ "منصورہ کی حدود میں میدوں سے بکثرت لڑائیاں جاری رہتی تھیں۔ یہ سندھ وغیرہ کی ایک قوم ہے اور یہ لوگ یہاں کی حدود میں آباد ہیں۔ آلِ ہبار نے نہ صرف ان سے بری اور بحری لڑائیاں لڑیں بلکہ ساحلی علاقوں میں ان کی طاقت کو بری طرح کچل کے امن وامان قائم کیا اور اس طرح غیر ملکی بری اور بحری تجارت کو ترقی ہوئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر کا سامان تجارت یہاں آکر فروخت ہوتا تھا اور ملک میں تجارتی راستوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ راستے ہر طرح سے محفوظ تھے۔ خشکی کے راستے منصورہ کی تجارت صغد، چین، تبت اور خراسان سے ہوتی تھی۔ اسی طرح ان کے دور میں بحری تجارت بھی کافی عروج پر تھی

اور بصرہ، ابلہ اور سیراف وغیرہ کے تاجر ہندوستان اور چین کا سفر کرتے تھے۔ دیبل میں ہر جگہ کے بحری تاجر جمع ہوتے تھے اور بندرگاہ دیبل ان کے دور میں ایک عالمی تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ دیبل کے علاوہ منصورہ، نیرون اور قالری (کلری) بھی اندرون سندھ اہم تجارتی مرکز تھے۔ ہباری دور میں سندھ کی بری اور بحری تجارت بھی عروج پر تھی اور پورے عالم اسلام میں اس کا تجارتی تعلق قائم تھا۔

غیر مسلموں سے سلوک

آلِ ہبار کے دور میں غیر مسلموں کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ ذمیوں کے بارے میں اسلامی شریعت کی پابندی کرتے تھے، چنانچہ بقول قاضی اطہر مبارک پوری یہ غیر مسلم اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے مقابلے میں ان مسلم حکمرانوں کو ترجیح دیتے تھے اور ان سے خوش رہتے تھے بلکہ ہندو حکومتوں کے حکمران اور عوام مسلمانوں سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور آل ہبار کی اسی رواداری اور حکمتِ عملی اور حسنِ سیاست کا یہ نتیجہ تھا کہ یہاں کے راجے اور مہاراجے بھی اسلام قبول کرکے اس کی خدمت کرتے تھے۔

علم وادب

ہباری دورِ حکومت میں سندھ میں کئی شہر اسلامی علوم و فنون کے مرکز تھے۔ ان شہروں میں جگہ جگہ دارالعلوم قائم تھے اور ایک ایک محلے میں کئی کئی علما بستے تھے۔ علم وادب کی اس ترقی کی وجہ یہ تھی کہ آل ہبار خود علم دوست اور اہلِ علم کے قدر دان تھے۔ انھوں نے علوم و علما کی سرپرستی کی۔ علمی خاندانوں سے ان کے تعلقات تھے اور اہلِ علم و فضل ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ بڑے بڑے شہروں کی زبان عربی اور سندھی دونوں تھیں۔ اس زمانے میں الور ایک بہت بڑا شہر تھا اور وہاں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی تھی۔ یہ شہر بھی ہباری حکومت کے زمانے میں علم و فن کا مرکز اور دینی سرگرمیوں کا گہوارہ تھا۔ بیرون بھی خالص اسلامی شہر تھا۔ دیبل علما و فقہا کا مرکز تھا، اسی لیے یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ دیبل کی طرف رواتِ حدیث کی ایک جماعت منسوب ہے۔ دیبل کا شہر سندھ میں محدثین اور رواتِ حدیث کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مرکز تھا اور اس نواح کے تمام شہروں پر فوقیت رکھتا تھا۔ یہاں کے علما پورے عالمِ اسلام سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ملک میں ان کی آمدورفت تھی۔ سندھ کا یہ شہر بقول قاضی اطہر مبارک پوری احادیثِ رسول کا شہر تھا

اور یہاں پر احادیث کی تعلیم و روایت تھی۔ دیبل ساحلی شہر اور عرب و ہند تجارت کا اہم مرکز تھا۔ اس لیے یہاں کے بعض محدثین تاجر بھی تھے، چنانچہ ابو محمد حسن بن حامد دیبلی بغدادی جو علم حدیث میں اہم مقام کے حامل تھے بغداد کے بڑے تاجروں میں سے تھے، اور منصورہ تو گویا دار الاسلام و المسلمین بن کر بغداد کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کے رسم و رواج عراق سے ملتے جلتے تھے۔ حسنِ اخلاق اور شرافت میں بھی یہ لوگ مشہور تھے۔ منصورہ کے بارے میں مقدسی لکھتا ہے کہ "یہاں اسلام تروتازہ ہے اور علم اور اہلِ علم کی کثرت ہے۔ ان کے اخلاق و عادات اہلِ عراق سے ملتے جلتے ہیں اور ان میں بردباری اور حسنِ اخلاق ہے۔"

منصورہ بھی آلِ ہبار کی دینی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور یہاں بھی اسی قسم کی درس گاہیں تھیں جن میں علما و محدثین باقاعدہ کتاب و سنت کا درس دیتے، احادیث کی روایت کرتے اور فقہ کی تعلیم دیتے۔ یہاں دوسرے علوم کے مقابلے میں علومِ شرعیہ کا زیادہ رواج تھا، چنانچہ منصورہ میں قاضی ابو محمد منصوری کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں اور تصنیفی کارگزاری کے بارے میں مقدسی لکھتا ہے کہ ان کے درس کی مجلس ہے اور تصنیفات ہیں، وہ کئی اچھی اچھی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ یہی حال سندھ کے ایک اور قدیم شہر بوقان کا تھا۔ یہ سندھ کے ان خاص شہروں میں سے ہے جہاں ابتدا ہی سے مسلمان آباد تھے۔ اس کے قریب ہی عباسی گورنر عمران بن موسیٰ برمکی نے بیضا نامی شہر آباد کیا۔ یہ مقام ابتدا ہی سے اسلام اور علمی و دینی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ ہباری دور میں بھی یہاں کئی علما و محدثین موجود تھے، جنھوں نے بوقان اور اس کے باہر دیگر ممالک میں دینی علوم و فنون کی اشاعت کی۔ دولتِ ہباریہ منصورہ کے دور کے علما و محدثین کا مختصر ترین تذکرہ بھی کافی طویل ہوگا۔ ان علما کی تعداد کئی سو سے زاید تھی۔ سطور ذیل میں ہم اس دور کے صرف تین مشہور ترین علما کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ **محمد بن ابی الشوارب**: یہ منصورہ کے قاضی تھے اور ۲۸۳ھ میں عراق سے آکر سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ اپنے وقت کے زبردست عالم تھے، ان کے بارے میں مسعودی نے لکھا ہے کہ بغداد کے لوگ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور خلیفۂ بغداد اور عباسی شہزادے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتے تھے اور بوقتِ ضرورت ان کی حاجت برآری بھی کرتے تھے۔ ان کے بعد اُن کے لڑکے علی بن محمد ابن ابی الشوارب منصورہ کے قاضی مقرر ہوئے، ان کا خاندان چوتھی صدی ہجری کے ابتدائی سالوں تک

سندھ میں رہا۔

۲۔ ابو محمد المنصوری : ان کا خاندان چوتھی صدی ہجری کے آخر میں سندھ میں موجود تھا۔ یہ بھی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور مذہبِ داؤد ظاہری کے امام تھے، متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ مقدسی اپنی کتاب احسن التقاسیم میں لکھتا ہے کہ ان کا پایہ علم میں بہت بلند تھا، اسی لیے منصورہ کی قضا کا عہدہ ان کے سپرد کیا گیا۔

۳۔ قاضی ابوالعباس احمد بن محمد صالح تمیمی المنصوری : شہر منصورہ کے قاضی اور ظاہری مذہب کے امام تھے۔ ان کا شمار ظاہری فرقے کے عالموں میں ہوتا تھا، کئی اعلیٰ کتب تحریر کیں۔ ابتدا میں اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے تعلیم حاصل کی، پھر بغداد جاکر وہاں کے علما و محدثین سے احادیث کی روایت کی اور منصورہ آکر عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔

الفہرست : محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق

اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآن مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیونکر عالم وجود میں آئے، پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ — قیمت ۴۵ روپے

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے پیش کردہ اصولِ تاریخ صرف گزشتہ اقوام کے لیے ہی نہیں بلکہ موجودہ قوموں کے لیے بھی بصیرت افروز ہیں۔

صفحات ۲۱۶ — قیمت ۱۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

پروفیسر محمد اسلم

شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات

"درالمعارف" کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت

(دوسری اور آخری قسط)

شیأ للہ

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ ایک روز انھوں نے کہا: یا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ شیأ للہ۔ فوراً غیب سے یہ آواز آئی: "کہو یا ارحم الراحمین شیأ للہ"[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت انھیں شرک سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی اور جب ان کی زبان سے جوشِ عقیدت میں ایک شرکیہ کلمہ نکلا تو غیرتِ حق فوراً جوش میں آئی اور انھوں نے ہاتفِ غیبی کو یہ کہتے ہوئے سنا: "کہو یا ارحم الراحمین شیأ للہ۔"

توسیع خانقاہ

حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی خانقاہ میں جگہ ناکافی تھی اور شاہ غلام علی اردگرد کے مکانات خانقاہ میں شامل کر کے اس کی توسیع کرنا چاہتے تھے۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان کے بعد شاہ ابوسعید یہاں حلقہ کرائیں گے۔ اس کے علاوہ وہ حدیث اور تفسیر کا درس دیں گے، اس لیے زیادہ ضرورت پڑے گی۔ علاوہ بریں لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں اور انھیں رہنے کو جگہ نہیں ملتی[2]

صوفی کی تعریف

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ صوفی کو چاہیے کہ دنیا و آخرت کو پس پشت ڈال کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے کوئی سروکار نہ رکھے[3] شاہ صاحب نے ایک مجلس میں فقیر کا مطلب بتاتے ہوئے فرمایا کہ فقیر چار لفظوں سے مل کر بنا ہے اور جوان پر عامل ہے،

---

[1] شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۴۵ [2] ایضاً، ص ۴۶، [3] ایضاً، ص ۴۷

وہی فقیر ہے ۔ ف : فاقہ کشیدن و بتوکل نشستن۔ ق : قناعت کردن و رشتہ جستجو گسستن۔
ی : یاد یزدان و فراموشی از ہر دو جہان ۔ ر : ریاضت کردن و مجاہدہ نمودن [54]

مرد باتمیز کی پہچان

شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ مرد باتمیز کی یہ پہچان ہے کہ اس کی دو چیزیں شکستہ اور دو درست ہوتی ہیں ۔ اس کا دل اور پیر شکستہ ہوتے ہیں اور اس کا دین اور یقین درست ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس کا دل آرزو سے خالی ہوتا ہے اور اس میں سوائے اپنے مولا کی تمنا کے اور کچھ موجود نہیں ہوتا۔ اس کے پاؤں شکستہ ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ماسویٰ کی تلاش اور جستجو کے لیے نہیں نکلتا۔ اس کا دین درست ہوتا ہے کیونکہ وہ موافق شریعت اور سنت ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا یقین درست ہوتا ہے کیونکہ اس کی اساس حقیقت اور معرفت پر ہوتی ہے [55]

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ مردوں کی چار قسمیں ہوتی ہیں ۔ اولاً : نامرد، جو دنیا کے طالب ہوتے ہیں۔ ثانیاً : مرد، جو دنیا اور آخرت دونوں کے طالب ہوتے ہیں۔ ثالثاً : مرد، جو آخرت کے ساتھ دیدارِ خدا کے بھی طالب ہوتے ہیں۔ رابعاً : جواں مرد، جو آخرت میں صرف خدا کے دیدار کے طالب ہوتے ہیں اور دنیا و آخرت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے [56]

فنا کی حقیقت

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ قدما کے نزدیک فنا سے مراد بے شعوری ہے اور عدم بے شعوری کا نام انھوں نے فناء الفنا رکھا ہے ۔ بالفاظ دیگر جب ماسوی اللہ کا شعور دل سے محو ہو جائے تو سالک کو فنا حاصل ہو جاتی ہے [57] اسی ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام غزالی کے نزدیک فنا سے مراد رذیل خصائل کے گم ہونے کا نام ہے [58]

زیارتِ قبور اور شاہ غلام علیؒ

در المعارف کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اولیائے دہلی کے مزارات کی زیارت

---

[54] شاہ رؤف احمد، ص ۶-۵ [55] ایضاً، ص ۴۲
[56] ایضاً، ص ۹۰ [57] ایضاً، ص ۸۶ [58] ایضاً، ص ۵۰

کو جایا کرتے تھے۔ شاہ رؤف احمد نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت نظام الدین اولیا کے مزارات پر شاہ غلام علی کی حاضری کا ذکر کیا ہے۔[۹] ایک دوسرے موقع پر جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ شاہ غلام علی کبھی کبھی خواجہ باقی باللہ کے مزار پر بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔[۱۰]

حضرت شاہ غلام علی کا یہ معمول تھا کہ موصوف بزرگوں کے یوم وفات پر کھانا پکوا کر غریبوں اور محتاجوں کو کھلایا کرتے تھے۔ شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ان کی موجودگی میں حضرت علیؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور شیخ محمد عابدؒ کے ایصالِ ثواب کے لیے کھانا پکوا کر تقسیم کیا تھا۔[۱۱]

نصابِ زکوٰۃ

شاہ غلام علی کی مجلس میں زکوٰۃ کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو موصوف نے فرمایا کہ زکوٰۃ ایک سال کے بعد واجب ہوتی ہے لیکن انھیں جب بھی کہیں سے کوئی رقم ملتی ہے موصوف اسی وقت اس کی زکوٰۃ نکال دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر شبلیؒ سے کسی نے زکوٰۃ کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ شریعت کے مطابق سو روپے پر سال گزر جانے کے بعد ڈھائی روپے زکوٰۃ ہوگی لیکن ان کے نزدیک ڈھائی روپے بھی مستحقین میں تقسیم کر دیں اور سو روپے بھی۔[۱۲]

شاہ غلام علی اور سماع

ایک چشتی بزرگ نے حضرت خواجہ مودودؒ چشتی کے عرس کی تقریبات میں شرکت کے لیے شاہ صاحب کو دعوت نامہ بھیجا تو آپ نے کہا:

مادر جائیکہ مجلس سماع و وجد و تواجد باشد ہرگز نرویم اگر فاتحہ بزرگے از بزرگانِ دین باشد۔

ہم ایسی جگہ جہاں مجلس سماع، وجد اور تواجد ہو، ہرگز نہیں جائیں گے خواہ وہاں بزرگانِ دین میں سے کسی بزرگ کی فاتحہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا "یا اللہ مجھ سے کون سی ایسی خطا سرزد ہوئی ہے کہ آج علی الصبح

۹۔ شاہ رؤف احمد: دُرالمعارف، ص ۱۷ — ۱۰۔ ایضاً، ص ۵۵-۵۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۲۷ — ۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱

مجھے ایک مجلس بدعت میں بلایا گیا ہے۔[۱۳]

شاہ رؤف احمد نے ایک مجلس میں شاہ غلام علی کو یہ فرماتے سنا کہ سماع ولایت قلبی میں ترقی کا باعث ہوتی ہے لیکن ولایاتِ عالیہ میں تلاوت قرآن پاک، درود خوانی اور کثرت نوافل ترقی کا موجب ہوتی ہے[۱۴] شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک بار " حضرت پیر طریقت ہادی حقیقت قطب بحری دکوہی حضرت خواجہ عبدالقدوس گنگوہیؒ " کی توجہ حرمتِ سماع کی طرف مبذول کرائی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ سماع کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ سماع کے دوران قلب کا میلان فسق کی طرف ہو جاتا ہے لیکن ان کا رجوع حق کی طرف ہوتا ہے۔ اس صورت میں جب حرمت کا سبب ہی موجود نہیں تو پھر حرمت کیونکر ہوگی؟[۱۵]

شاہ غلام علی اور ہنود

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک روز جب شاہ صاحب کی مجلس میں پہنچے تو اس وقت وہاں مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مکتوبات کا درس ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب نے ایک موقع پر ہندوؤں کے مذہب کی بنیاد اور ان کی چاروں کتابوں کا ذکر فرمایا ہے۔ مرزا صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ الہامی کتابیں تھیں اور انھوں نے ایک کتاب میں " معارف " کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مرزا صاحب کی تحریر پڑھ کر شاہ غلام علی نے فرمایا کہ اپنے پیر و مرشد کے کلام پر حرف گیری کرنا کمال بے ادبی ہے لیکن ان کے نزدیک ان کی کتابوں میں معارف نہیں پائے جاتے[۱۶] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اپنے پیر و مرشد کی نسبت ہندوؤں کے بارے میں سخت رویہ رکھتے تھے۔

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ چرن داس نامی ایک ہندو زاہد تھا اور وہ ترک و تجرید میں ثابت قدم تھا۔ ایک بار اس کا ایک معتقد ہر قدم پہ ماتھا ٹیکتا ہوا کئی ماہ میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے خود اسے یہ مسافت طے کرتے ہوئے دیکھا تھا اور موصوف اس کے مجاہدے سے بڑے حیران ہوئے تھے۔ شاہ صاحب ابھی اتنا ہی کہنے پائے

---

۱۳ شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۱۴۱-۱۴۲ ۱۴ ایضاً، ص ۴۴

۱۵ ایضاً، ص ۴۳، ۴۴ ۱۶ ایضاً، ص ۶۵

کے کتنا ایسے لوگوں کے عمل ہی کا خیال آیا اور انھوں نے استغفار پڑھتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں ایسے لوگوں کی عبادات کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ بعد ازاں انھوں نے تین بار کلمۂ طیبہ پڑھا اور اس کے بعد وہ خوب روئے اور پیچ و تاب کھانے لگے۔

حضرات حسنین کا صحیح مقام

شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ ایک روز میر قمر الدین سمرقندی نے شاہ غلام علیؒ سے دریافت کیا کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے یا تابعین میں سے؟ شاہ صاحب نے فرمایا ان کا شمار چھوٹے درجے کے صحابہ میں ہوتا ہے۔

خصوصیات مذاہب اربعہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ چاروں مذاہب کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ مثلاً حنفی مذہب میں ہدایہ جیسی عظیم کتاب موجود ہے جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ شافعی مذہب میں امام غزالیؒ جیسا فاضل موجود ہے اور حنبلی مذہب میں سید عبدالقادر جیلانیؒ جیسا بزرگ موجود ہے۔ مالکی مذہب میں امام مالکؒ جیسی شخصیت موجود ہے جو آیاتِ الٰہی میں سے ایک آیت تھے۔

حنفی مذہب

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی، امام ابو حنیفہؒ کے مقلد تھے، لیکن اس کے باوجود موصوف امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے امام ابو حنیفہ کو خواب میں دیکھا تو انھوں نے خواجہ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کے مذہب میں بڑے بڑے اولیا ہو گزرے ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اس واقعہ کے بعد خواجہ صاحب نے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی ترک کر دی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کسی نہ کسی امام کی تقلید لازمی ہے لیکن امام ابو حنیفہ کی پیروی بہتر ہے کیونکہ ایک ایسا جم غفیر اسی مسلک پر گامزن ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تین چوتھائی امت کا مذہب حنفی ہے اور ایک چوتھائی امت بقیہ تین ائمہ کی تقلید کرتی ہے۔ شاہ صاحب اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے: پیروی مذ

شاہ غلام علی: در المعارف۔ ص ۲۳۳

ایضاً: ص ۔۔۔ درمقامات ابو حنیفہ

ایضاً ص [illegible]

مسائل جزئیات بمذہب حنفی اولی است [۲۰]

شاہ غلام علی اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ ایک حنفی کے لیے اپنے پاس مؤطا امام محمدؒ رکھنی ضروری ہے کیوں کہ اس کتاب میں امام موصوف نے اپنے مذہب کی تائید میں "اخبارِ صریح" اور "آثارِ صحیح" جمع کیے ہیں۔[۲۱]

حضرت مجدد الف ثانی

ایک روز ایک شخص شاہ غلام علی کی مجلس میں کہنے لگا کہ حضرت مجدد الف ثانی ہندوستان کے تمام اولیا سے افضل ہیں۔ اس کی بات سن کر شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ وہ کرۂ ارض کے اولیا سے افضل ہیں۔[۲۲] جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک روز ایک شخص شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کے دوران کہنے لگا کہ شیخ احمد کے مکتوبات میں اس طرح لکھا ہے۔ شاہ صاحب نے پوچھا کون شیخ احمد؟ اس نے کہا کہ شیخ احمد سرہندی۔ شاہ غلام علی نے فرمایا "میری مجلس سے نکل جاؤ۔ میرے سامنے میرے پیر کی اس طرح بے ادبی کہتے ہو" چنانچہ اس شخص کو مجلس سے نکال دیا گیا۔[۲۳]

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر کس طرح کیا جا سکتا ہے؛ ان کی ذاتِ گرامی ان سے پہلے ہزار سال میں گزرنے والے تمام اولیاء اللہ کے برابر ہے۔[۲۴] ایک روز شاہ رؤف احمد حاضر خدمت ہوئے تو اس وقت شاہ غلام علی حضرت مجدد الف ثانی کے فضائل بیان کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ حضرت مجدد الف ثانی "ہموزن اولیاء ہزار سالہ" ہیں۔[۲۵] ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات آپ کے نام کی برکت سے ہزار سال بعد حضرت مجدد الف ثانی کی ذات میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔[۲۶] ایک بار شاہ صاحب نے ایک مجلس میں حضرت خواجہ باقی باللہ کا یہ مشہور قول سنایا "شیخ احمد آفتاب ہے اور ہمارے

۲۰ھ شاہ رؤف احمد: درالمعارف، ص ۲۰۲ — ۲۱ھ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۲ھ ایضاً، ص ۲۴۴ — ۲۳ھ ایضاً، ص ۴۷

۲۴ھ ایضاً، ص ۳۲ — ۲۵ھ ایضاً، ص ۳۶ - ۳۷ — ۲۶ھ ایضاً، ص ۳۲

جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہیں۔ شیخ احمد کے معارف انبیائے کرام کے معارف جیسے ہیں۔"[۲۷]

جامع ملفوظات تحریر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت موصوف مکتوباتِ امام ربانی کا درس دے رہے تھے۔ اسی طرح دو اور موقعوں پر بھی انھوں نے مکتوبات کے درس کا ذکر کیا ہے۔ شاہ صاحب مکتوبات امام ربانی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ زمین و آسمان میں عرفانِ یزداں میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات جیسی اور کوئی کتاب نہیں ہے۔[۲۸]

شاہ صاحب نے ایک مجلس میں حاضرین کو بتایا کہ حضرت مجدد الف ثانی نے جو معارف بیان فرمائے ہیں امتِ مسلمہ میں سے کسی دوسرے بزرگ نے ان کا اظہار نہیں فرمایا۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مکتوبات کو سمجھنے میں ان کا ایسا ہی معاملہ ہے جیسا ایک عجمی اور اُمّی قرآن پاک کھول کر الفاظ پر انگلی رکھ کر یہ کہتا جائے: الٰہی راست گفتی، راست گفتی درسفتی درسفتی۔[۲۹]

شاہ رؤف احمد لکھتے ہیں کہ شاہ غلام علی مکتوبات امام ربانی کو پیر کامل سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے " این ہم بجائی پیر است۔"[۳۰] شاہ غلام علی سے روایت ہے کہ حضرت آدم بنوڑی نے حضرت مجدد الف ثانی کے احوال تحریر فرمائے تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک موقع پر یہ تحریر فرمایا تھا:

از توجہ اکابران طریقت در دل سالک توجہی پیدا می شود و از توجہ مرشد من زوال توجہ از دل من می شود۔[۳۱]

اکابران طریقت کی توجہ سے سالک کے دل میں توجہ پیدا ہوتی ہے لیکن میرے مرشد کی توجہ سے دل سے توجہ زائل ہو جاتی ہے۔

خدا ہی جانتا ہے کہ اس کتاب میں حضرت آدم بنوڑی نے کیسے کیسے موتی رولے ہوں گے۔ اب یہ کتاب ناپید ہو چکی ہے اور اگر اس کا کوئی نسخہ کہیں سے دریافت ہو جائے تو حضرت مجدد الف ثانی کے روحانی کمالات کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

۲۷۔ شاہ رؤف احمد، در المعارف، ص ۱۰

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۲۹۔ ایضاً، ص ۹۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۸۴

بو علی سینا

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ ایک روز انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کا مطالعہ کیا اور ان کی برکت سے بڑا فیض پایا۔ بعد ازاں انھوں نے شاہ ولی اللہ محدث کی ایک کتاب پڑھی جس سے اسرار ملکوت ان کے دل پر وارد ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے امام غزالی کی احیاء العلوم پڑھی تو ان کے دل پر فیضِ ملکوت ظاہر ہوا۔ ایک روز انھوں نے بو علی سینا کی ایک کتاب مطالعہ کے لیے اٹھائی تو ابھی ایک صفحہ بھی پڑھنے نہ پائے تھے کہ ان کے قلب پر تاریکی چھانے لگی۔ انھوں نے وہ کتاب رکھ دی اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اس تاریکی کو دور کرنے میں مصروف ہو گئے۔[۱۳۲]

شیخ عبد القادر جیلانیؒ

در المعارف میں متعدد بار حضرت عبد القادر جیلانی کا ذکر آیا ہے۔ شاہ صاحب کے آباؤ اجداد سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔[۱۳۳] شاہ صاحب کے والد بزرگوار انھیں اپنے مرشد شاہ ناصر الدین سے بیعت کرانا چاہتے تھے لیکن جس روز شاہ غلام علی بٹالہ سے دہلی پہنچے اسی روز شاہ ناصر الدین انتقال کر گئے۔ شاہ غلام علی اگرچہ نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے لیکن انھیں حضرت عبد القادر جیلانی کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ملفوظات میں موصوف کا بار بار ذکر آتا ہے۔

خواجہ معین الدین اجمیری

یہ واقعہ اکثر تذکروں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ خواجہ معین الدینؒ اپنے بیٹوں کے اصرار پر حصولِ ارض کے لیے سلطان شمس الدین التمتش سے ملنے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب جیسا تارک الدنیا بزرگ غنی کے دروازے پر جانے کے لیے کس طرح آمادہ ہو گیا اور زمین لے کر کیسے راضی ہو گیا؟[۱۳۴]

حضرت نظام الدین اولیا اور سماع

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیا کی مجلس میں سماع کے وقت مزامیر، مستورات اور بے ریش نوجوان موجود نہیں ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں سماع کے دوران تالی بجانے کا بھی

---

۱۳۲ شاہ رؤف احمد، در المعارف، ص ۲۳۴ ۱۳۳ ایضاً، ص ۹۴ ۱۳۴ ایضاً، ص ۹۰

حالت میں۔ اس طرح کی سماع شریعت میں جائز ہے۔ شاہ صاحب سے روایت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے کہ کاش ان کا انتقال سماع سنتے ہوئے ہو۔ شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ اہل سماع وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور غیر اللہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی سنتے ہیں اسے حق کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ ان کی نظروں سے "غیریت" اُٹھ جاتی ہے۔

شاہ سعد اللہ گلشن

شاہ گلشنؒ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے اور اپنے زہد و ریاضت کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ ان کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے تیس سال ایک ہی کمبل میں گزار دیے تھے۔ شاہ غلام علیؒ فرماتے ہیں کہ وہ تین روز بعد موصوف بازار سے گرے پڑے خربوزے اور تربوز کے چھلکے جمع کرلاتے اور انھیں دھو کر تناول فرماتے تھے۔ ان کی رہائش جامع مسجد میں تھی اور جب انھیں پیاس لگتی تو حوض سے پانی کے دو تین چلو پی لیتے تھے۔ ایک روز ایک فاحشہ عورت، جو بڑے اچھے کپڑے پہنے اور بناؤ سنگھار کیے ہوئے تھی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ شاہ گلشن کے معتقدین نے ان سے کہا کہ اسے توجہ دیں۔ شاہ گلشن نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ عورت سر منڈائے اور کفنی پہنے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے شاہ گلشن کے ہاتھ پر توبہ کی اور ان کے حلقۂ مریدی میں داخل ہو گئی۔

شاہ غلام علی سے روایت ہے کہ ایک روز شاہ گلشنؒ تشریف فرما تھے کہ ایک غیر مسلم اُدھر آنکلا۔ شاہ گلشن اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ایک غیر مسلم کا اس قدر احترام دیکھ کر حاضرین بڑے حیران ہوئے۔ جب وہ غیر مسلم قریب آیا تو شاہ صاحب نے اس سے پوچھا "تم سے میرے مرشد کی خوشبو آرہی ہے۔" اس نے عرض کیا کہ اس کے پاس ایک کتاب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ شاہ گلشن نے جب کتاب کو کھولی تو اس میں ان کے مرشد حضرت عبدالاحد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر موجود تھی۔

شاہ رؤف احمد: درالمعارف، ص ۷

ایضاً، ص ۶

ایضاً، ص ۶

ایضاً، ص ۱۷

ایضاً، ص ۱۳۳

شاہ ابو سعید مجددی

شاہ ابو سعیدؒ شاہ غلام علی کے لاڈلے مرید، خلیفہ اور جانشین تھے۔ شاہ صاحب ان کے ساتھ بڑی شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان پر اس قدر شفقت اور عنایت کا سبب پوچھتا تو موصوف فرماتے کہ ابو سعید صاحبِ اجازت و خلافت تھے اور ان کے پانصد مرید تھے۔ وہ سب کو چھوڑ کر اپنے مرشد کی زندگی ہی میں ان کے پاس چلے آئے تھے، اس لیے ان پر خاص لطف و عنایت کیوں نہ کریں۔[۱۴۰]

شیخ ابن عربیؒ

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ طائفہ وجودیہ کے سرخیل حضرت محی الدین اکبر ابن عربی، حضرت مجدد الف ثانی کی توجہ سے اس "مقام تنگ" سے ترقی کر کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جائیں گے۔[۱۴۱]

حضرت آدم بنوڑی

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت آدم بنوڑی جس شخص کو بیعت کرتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اسے فنا قلبی تک پہنچا دیتے تھے۔ ایک بار ایک فاسق نے مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا کہ پہلے اپنا ظاہر سنت کے مطابق بنا کر آؤ پھر تمھاری بیعت لوں گا۔ وہ شخص بے دل ہو کر ان کی خانقاہ سے لوٹ گیا۔ اس کی واپسی کے بعد انھیں القا ہوا کہ انھوں نے ایک طالبِ خدا کو اپنے دَر سے محروم لٹا دیا ہے۔ حضرت نے فوراً ایک شخص کو اس کی تلاش میں دوڑایا اور اسے فوراً ان کی خدمت میں پہنچنے کا پیغام دیا۔ اس شخص نے شیخ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے ایک دوسرے شخص کو بلانے بھیجا لیکن اس نے حسبِ سابق آنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے ایک اور شخص کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس کے کان میں "اللہ" کہہ دے۔ حضرت کا حکم ملتے ہی وہ شخص بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے کہا کہ وہ چپکے سے اس کی بات سن لے۔ جب اس نے اپنا کان قریب کیا تو قاصد نے کہا کہ شیخ نے "اللہ" کہا ہے۔ اللہ کا نام سنتے ہی وہ شخص بے تاب ہو گیا اور

۱۴۰؎ شاہ رؤف احمد: دُر المعارف، ص ۷۵ ۱۴۱؎ ایضاً، ص ۱۵۴

گرتے پڑتے حضرت کی خدمت میں پہنچا۔ شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ حضرت نے اس سے بیعت لی اور اسے "ولایتِ نقشبندی" حاصل ہوگئی [۴۲] شاہ غلام علی نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ جب حضرت آدم بنوڑی حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو مسجد قبا سے مسجد نبوی تک ہر قدم پر دوگانہ ادا کرتے ہوئے پہنچے تھے [۴۳]

خواجہ محمد زبیر

شاہ غلام علی سے روایت ہے کہ خواجہ محمد زبیر سرہندیؒ نماز مغرب کے بعد اوّابین کے نوافل ادا فرماتے اور ان نوافل میں دو پارے تلاوت فرماتے۔ اوّابین سے فراغت کے بعد موصوف حلقہ کرتے اور مریدوں کو توجہ دیتے۔ بعد ازاں آپ گھر تشریف لے جاتے اور وہاں عورتوں کو توجہ دیتے۔ نصف شب کے بعد خواجہ صاحب چند گھڑی آرام فرماتے اور بیدار ہو کر تہجد کی نماز ادا فرماتے۔ تہجد کے نوافل میں موصوف چالیس اور کبھی ساٹھ مرتبہ سورۂ یٰسٓ تلاوت فرماتے۔ تہجد سے لے کر چاشت کی نماز تک موصوف مراقبہ فرماتے اور اگر طبیعت چاہتی تو حلقہ بھی کرتے تھے۔ چاشت کے بعد خواجہ صاحب قیلولہ فرماتے اور بیدار ہو کر زوال کے نفل ادا فرماتے۔ ان نوافل میں بڑی لمبی قرأت فرماتے۔ یہ عمل چار گھڑی جاری رہتا تھا۔ بعد ازاں موصوف ختم خواجگان پڑھتے اور نماز ظہر کے بعد تلاوت فرماتے تھے۔ تلاوت سے فراغت کے بعد کھانا تناول فرماتے۔ یہی کھانا رات دن کے لیے کافی ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد آں جناب عصر کی نماز ادا فرماتے اور نماز سے فارغ ہو کر مشکوٰۃ شریف یا مکتوبات امام ربانی کا درس دیتے تھے۔

خواجہ محمد زبیر گھر سے مسجد آتے تو راستے میں امرا اپنے دوشالے زمین پر بچھاتے اور ان کے قدم زمین پر نہ پڑنے دیتے۔ اگر کبھی کسی کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو ان کی سواری شاہانہ انداز سے نکلتی تھی۔ ایک بار خواجہ صاحب کی سواری جامع مسجد کے نیچے سے گزری تو شاہ گلشن نے دیکھا کہ ایک پالکی میں کوئی صاحب سوار ہیں اور ان کی پالکی کے پیچھے کئی پالکیاں جا رہی ہیں۔ ان پالکیوں کے ساتھ لوگوں کا ہجوم تھا۔ شاہ گلشن نے دیکھا کہ جو پالکی سب سے آگے ہے اس پالکی سے لے کر

---

[۴۲] شاہ رؤف احمد: درالمعارف، ص ۹۹-۹۸

[۴۳] ایضاً، ص ۱۰۷

آسمان تک نور ہی نور نظر آرہا ہے اور گلی کوچے اس نور سے پُر ہیں۔ شاہ گلشن اس وقت ایک کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کمبل میں تیس سال گزارے تھے۔ موصوف نے حاضرین سے کہا کہ یہ کیا سبب ہے کہ اس کمبل میں وہ انوار نظر نہیں آتے جو اس امیر کی پالکی میں نظر آرہے ہیں۔ شاہ گلشنؒ کے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص نے ان کی بات سن کر کہا کہ یہ خواجہ محمد زبیر کی سواری جا رہی ہے۔ شاہ گلشن نے اس کی بات سن کر فرمایا "الحمد للہ۔ وہ ہمارے پیرزادے ہیں۔ ہماری آبرو رہ گئی ہے"۔ موصوف نے اپنے مریدوں کو خواجہ صاحب کی خدمت میں فیض حاصل کرنے کے لیے بھیجا اور یہ اعلان کیا کہ جب تک خواجہ صاحب یہاں موجود ہیں، ان کے لیے مرید کرنا جائز نہیں ہے[۳۴]

شاہ رؤف احمد رقم طراز ہیں کہ شاہ غلام علی خواجہ محمد زبیر کے کمالات کے معترف تھے اور ان کے مرید ان کی اجازت سے خواجہ صاحب کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے[۳۵]

خانوادہ شاہ ولی اللہ سے تعلقات

جامع ملفوظات اس بات کے شاہد ہیں کہ شاہ غلام علی کی شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین کے ساتھ صحبت رہتی تھی اور موصوف ان کے ساتھ علمی مسائل پر گفتگو فرمایا کرتے تھے[۳۶] شاہ غلام علی کو شاہ عبد العزیز سے تلمذ تھا اور اس کے باوجود شاہ عبد العزیز ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔ شاہ صاحب اپنے شاگرد رشید کی علمیت کے بھی معترف تھے[۳۷] شاہ عبد العزیز کے تلامذہ جب نصاب تعلیم مکمل کر لیتے تو موصوف انھیں روحانی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ عرصے کے لیے شاہ غلام علی کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے

شاہ ولی اللہ سے اختلاف

شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریۂ وحدت الوجود اور نظریۂ وحدت الشہود میں جو تطبیق کی ہے اس میں ان سے خطا ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حال کو قال بنا کر معارف کشفیہ کو علمی بحث بنا دیا ہے۔ چونکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے

---

[۳۴] شاہ رؤف احمد، درّ المعارف، ص ۱۱۹-۱۱۸ [۳۵] ایضاً، ص ۹۵

[۳۶] ایضاً، ص ۴۸ [۳۷] ایضاً، ص ۱۳۳

معارف سے فیض یاب ہوئے ہیں ان کا یہ تجربہ ہے کہ ابتدا میں توحید وجودی ظاہر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ان پر لطیفۂ قلب کے اسرار ظاہر ہوتے ہیں اور بعد ازاں جب وہ لطیفۂ نفس کے اسرار سے واقف ہوتے ہیں تو ان پر توحید شہودی منکشف ہوتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے معارف ان دونوں مقامات سے ماورا ہیں۔ شاہ غلام علی فرماتے ہیں کہ ابن عربی کے معارف اگر قطرہ ہیں تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے معارف کو دریائے محیط کہا جا سکتا ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابن عربی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہم عصر ہوتے اور ان کی زبان سے یہ معارف سنتے اور سمجھتے تو موصوف ان سے فیض یاب ہوتے۔[۳۵]

ہیر رانجھا

شاہ غلام علی کا بچپن پنجاب کی فضا میں گزرا تھا اور انھوں نے ہیر رانجھے کا قصہ ضرور پڑھا ہوگا۔ شاہ رؤف احمد فرماتے ہیں کہ ایک روز شاہ صاحب نے ہیر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ حضرت بہاء الدین زکریا کی مرید تھی۔ ایک روز حضرت زکریا نماز ادا کر رہے تھے کہ ہیر اُن کے آگے سے گزری۔ نماز سے فراغت کے بعد حضرت زکریا نے ہیر سے کہا کہ جس وقت موصوف نماز ادا کر رہے تھے تو اس وقت وہ ان کے سامنے سے گزری تھی۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے، اس لیے اسے آئندہ ایسا نہ کرنا چاہیے۔ حضرت زکریا کی بات سن کر ہیر نے کہا "سبحان اللہ میں ایک بندے کے عشق میں اتنی بے ہوش تھی کہ مجھے آپ کا اور آپ کی نماز کا خیال تک نہ رہا۔ آپ تو خدا کے عاشق کہلاتے ہیں اور — عین حضور — کے وقت سامنے سے گزرنے والے کا خیال بھی رکھتے ہیں۔" ہیر کی بات سن کر حضرت زکریاؒ شرمندہ ہوئے اور انھوں نے اپنا گریبان چاک کرتے ہوئے ہیر کو مخاطب کر کے فرمایا: "میں تیرے حق میں دعا کرتا ہوں تو واصل حق ہوگی۔" ہیر نے جواب میں کہا: "اگر یہی بات ہے اور آپ میں روحانی طاقت ہے تو مجھے رانجھے تک پہنچا دیں۔"[۳۶]

حضرت بہاء الدین زکریا اور ہیر کے مکالمات بڑے دلچسپ ہیں اور صاحب دل لوگوں کے لیے تازیانے کا حکم رکھتے ہیں۔

ہماری تحقیق کے مطابق ہیر لودھیوں کی ہم عصر تھی اور حضرت بہاء الدین زکریا کو انتقال کیے اس

---

[۳۵] شاہ رؤف احمد، درالمعارف، ص ۱۰۵ [۳۶] ایضاً، ص ۱۶۰

وقت دو صدیاں گزر چکی تھیں۔ پتا نہیں کہ شاہ غلام علی نے یہ کہاں سے سن لیا تھا کہ پیر حضرت بہاء الدین زکریا کی مرید اور ملوک سلاطین کی ہم عصر تھی۔

شاہ غلام علی کی ایک نادر تصنیف

در المعارف کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے " رسالہ مراقبات" کے عنوان سے ایک تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ شاہ رؤف احمد نے یہ مختصر سا رسالہ در المعارف میں شامل کر دیا۔

اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْهَا اٰخَرَ (صحیح مسلم، کتاب نکاح، باب الوصیۃ بالنساء)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کسی مومن مرد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی مومنہ بیوی سے بغض رکھے۔ اس کی ایک عادت اگر اسے ناپسند ہوگی تو دوسری عادت اسے پسند بھی ہوگی۔

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک اہم اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کے ساتھ رہیں، باہمی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کریں، کسی کو مطعون نہ ٹھہرائیں اور کسی پر الزام تراشی نہ کریں۔ کوئی شخص کسی کے متعلق ایسا رویہ اختیار نہ کرے جو شکوک وشبہات میں مبتلا کردے اور باہمی تعلقات میں بگاڑ پیدا کرنے کا باعث بن جائے۔

یوں تو سب کے لیے ضروری ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھیں اور کسی مرحلے پر بھی آپس کے معاملات کو خراب نہ ہونے دیں، لیکن میاں بیوی کے لیے بالخصوص لازم ہے کہ ان امور کو پیشِ نگاہ رکھیں اور اپنے نازک اور اہم رشتے کو کسی صورت میں بھی بدگمانی اور سوءِ ظن سے ملوث نہ ہونے دیں۔

میاں بیوی کے تعلقات کی نوعیت گھر کی چھوٹی سی مملکت کی ہے اور اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اگر میاں بیوی کے تعلقات خوش گوار ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے حسنِ ظن رکھتے ہیں تو ان کی یہ "مملکت" نہایت کامیابی سے چلے گی، اور اگر یہ ایک دوسرے سے بدظن ہیں، بے اعتمادی سے کام لیتے ہیں اور آپس میں بغض وعداوت رکھتے ہیں تو ان کے گھر کا کوئی کام بھی حسن وخوبی سے انجام نہیں پاسکے گا اور ان کی اس "مملکت" کا کوئی پہلو بھی صحیح اور درست نہ ہوگا۔ اسی بنا پر حدیث میں ان کے باہمی تعلقات بہتر رکھنے پر زور دیا گیا ہے اور تاکید فرمائی گئی ہے کہ

یہ ایک دوسرے پر بدگمانی نہ کریں اور بغض و عداوت کا مظاہرہ نہ کریں، کیوں کہ یہ چیز ان کی معاشرتی اور گھریلو زندگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

میاں بیوی بعض دفعہ گھر میں لڑجھگڑ بھی پڑتے ہیں، اور یہ لڑائی جھگڑا عام طور پر کسی بدگمانی اور سوء ظن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں چھوٹی چھوٹی بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں جو بعد میں خوف ناک صورت اختیار کر لیتی ہیں اور بغض و عداوت میں بدل جاتی ہیں۔ حدیث میں انہی بدگمانیوں، بدظنیوں اور بغض و عداوت سے روکا گیا ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات کا سلسلہ نہایت نازک اور انتہائی دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے، اس کو نبھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے جھگڑے کا اثر اولاد پر بھی پڑتا ہے اور گھر کا ہر فرد اس سے پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مرد کو اگر بیوی سے کوئی شکایت بھی ہو تو اسے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بیوی کی اگر ایک عادت مرد کے لیے ناپسندیدہ ہے تو دوسری عادت پسندیدہ بھی ہوگی، مثلاً اگر وہ کھانا پکانے میں مہارت نہیں رکھتی تو شرافت و دیانت کی نعمت سے بہرہ ور ہوگی، یا وہ زبان کی تیز ہے تو نیکی اور صالحیت کے زیور سے آراستہ ہوگی۔

بہرحال اگر کوئی عادت اس میں اچھی نہیں تو کوئی اچھی بھی تو ہوگی۔ ضروری ہے کہ اس عادت کا لحاظ رکھا جائے جو اچھی اور پسندیدہ ہے۔ محض ناپسندیدہ عادت کو سامنے رکھ کر لڑائی جھگڑے اور بغض و عداوت کا راستہ نہ اختیار کیا جائے۔ یہ راستہ اختیار کرنے سے وہ دونوں زندگی کی اس وسیع و عریض منزل میں چند قدم بھی آسانی سے آگے نہیں بڑھا سکیں گے۔ ان کے علاوہ ان کے متعلقین و رشتے دار بھی ہمیشہ پریشانی کا شکار رہیں گے۔ اولاد کی تربیت بھی صحیح نہ ہو سکے گی اور گھر میں آنے جانے والے لوگ اور مہمان بھی برا اثر لیں گے۔

نقد و نظر

مکتوباتِ شاہ ولی اللہ دہلوی (فارسی)

ترتیب اور تحقیق و تعلیق : مولانا محمد عطاء اللہ حنیف

ناشر : المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ۔ لاہور

کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق عمدہ۔ صفحات ۸۸۔ قیمت ۱۵ روپے

پاکستان کے اشاعتی اداروں میں لاہور کا مکتبہ سلفیہ ایک مشہور ادارہ ہے۔ اس کو بہت سی علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ اس کی مطبوعات میں زیرِ تبصرہ کتاب "مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی" ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ شاہ صاحب کے یہ فارسی مکتوبات ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حضرت امام بخاری اور امام ابن تیمیہ کے مناقب بھی شامل ہیں جو حضرت شاہ صاحب کے تحریر فرمودہ ہیں۔ ابتدا میں سید نواب صدیق حسن کی تصنیف "تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار" سے شاہ صاحب کا مختصر ترجمہ دیا گیا ہے۔

آج سے تقریباً اسّی سال پیشتر مطبع احمدی دہلی نے شاہ صاحب کی ایک کتاب "مکتوبات مع مناقب بخاری و فضیلت ابن تیمیہ" شائع کی تھی۔ اپنے موضوع میں وہ بہت اچھی کتاب تھی، لیکن اب نایاب تھی، یہ وہی کتاب ہے جو اب مکتبہ سلفیہ نے شائع کی ہے، اس میں کئی اضافے کیے گئے ہیں۔ ایک تو شاہ صاحب کے وہ مکتوبات اس میں شامل کیے گئے ہیں جو انھوں نے میرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ابوسعید کے نام تحریر فرمائے اور "کلمات طیبات" میں درج ہیں۔ دوسرے شاہ صاحب کا مختصر ترجمہ دیا گیا ہے، تیسرے نامور عالم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے اس پر تعلیقات لکھی ہیں، آیات و احادیث کے حوالے دیے ہیں اور شاہ صاحب نے مکتوبات میں جن اعیان و اکابر کا ذکر کیا ہے، ان کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔

یہ خالص علمی مکتوبات ہیں، جو تصوف و طریقت کے نکات اور بہت سے علمی مباحث پر محیط ہیں۔ مثلاً مکتوب در مناقب امام بخاری و خصوصیات صحیح بخاری، مکتوب در مناقب و دفاعِ ابن تیمیہ،

سند اجازت مرویات کتب حدیث و تلقین ذکر، مکتوب در بیان مذاہب صوفیہ۔ مکتوب متعلق بعض شجرات صوفیہ، جواب بعض سوالات و کشف بعض شبہات، شبہ دربارۂ فرقۂ صوفیہ، معرفت فرقۂ ناجیہ، شرح حدیث مشکل المعنی، تحقیق سند سیادت، تحقیق اصلاح نسبت و فقہی مسلک، مسئلہ تفضیل نبوت ولایت۔ اس طرح کے یہ متعدد مکتوبات ہیں جو شاہ صاحب نے مختلف حضرات کو بعض دقیق اور علمی سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے۔ کتابوں میں ان مکتوبات کے حوالے دیے جاتے ہیں اور اہل علم کے نزدیک یہ بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے ان کی ترتیب و تعلیق میں جو محنت کی ہے، وہ انتہائی لائق تحسین ہے اور مکتبہ سلفیہ نے ان کو شائع کر کے اہل علم پر احسان کیا ہے۔ فارسی کی یہ نایاب کتاب اب بہترین صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

شاہ صاحب نہایت اونچے مرتبے کے حامل ہیں اور تمام اصناف علم پر ان کو عبور حاصل تھا۔ ان کی تصانیف میں جو گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے، وہ کم ہی اہل علم کی کتابوں میں موجود ہے۔ ان کی تحریروں کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے فارسی مکتوبات کو بھی علم و تحقیق کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف کو اس نوع کی کتابوں سے جو دلچسپی اور تعلق خاطر ہے، اس کی بنا پر یہ مکتوبات باسلوب جدید شائع کیے گئے ہیں۔ امید ہے اہل نظر ان سے مستفید ہوں گے۔

علمی رسائل کے مضامین

اردو نامہ، لاہور — ستمبر ۱۹۸۳

اردو کا مولد، سندھ اور تحقیق سلیمانی	ڈاکٹر وفا راشدی
۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو مطبوعات	خلیل الرحمٰن داؤدی

برہان، دہلی — ستمبر ۱۹۸۳

عہدِ نبوی کی ابتدائی مہیں (مسلسل)	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
کیکاؤس کا نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ	جناب احمد حسن
غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کی شرعی حیثیت اور اس کی ضرورت و اہمیت	مولانا عتیق الرحمٰن احمد بستوی
شاہ ولی اللہ دہلوی کے گم نام خلیفہ — حافظ عبدالنبی	مسعود انور علوی

بینات، کراچی — اکتوبر ۱۹۸۳

معلم الحجاج پر حاشیے، اضافات اور تصحیحات	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی
شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی علمی خدمات	ملک عبدالرشید عراقی

الحق، اکوڑہ خٹک — اگست ۱۹۸۳

فرقہ روشنیہ اور فری میسن تحریک	جناب روشن دین
کمپیوٹر کے ذریعے اوقاتِ نماز کا تعین	سید شبیر احمد کاکاخیل
اسلام کا نظامِ عدل و انصاف	مولانا غلام الرحمٰن

سب رس، کراچی — اگست ۱۹۸۳

انشائے بے بدل	جلیل قدوائی
اہلِ یورپ کی اردو خدمات	پروفیسر شفقت رضوی

صحیفہ، لاہور — جولائی۔ستمبر ۱۹۸۳

بابر کی آخری بیماری کا واقعہ کیا تھا؟	مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن : مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایۂ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اُٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری

جلد اول — محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیات غالب : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اُردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اُردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*

INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE

CLUB ROAD LAHORE (PAKISTAN)

دسمبر ۱۹۸۷

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱٦ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

طابع و مطبع	مقامِ اشاعت	ناشر
ملک محمد عارف	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	محمد اشرف ڈار
دین محمدی پریس لاہور	کلب روڈ ، لاہور	اعزازی معتمد

فون ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۶ | دسمبر ۱۹۸۳ | صفر المظفر ۱۴۰۴ | شمارہ ۱۲

ترتیب

تاثرات

برصغیر کے بیسویں صدی کے مسلمانوں کے نزدیک ماہِ دسمبر کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس کی ۲۵ تاریخ کو قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔ آج سے ٹھیک ایک سو سات سال پہلے ۱۸۷۶ کو ان کی ولادت ہوئی — ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ کو انھوں نے اس دنیائے فانی سے رخصتِ سفر باندھا اور عالمِ جاودانی کی راہ لی۔ ان کی حیاتِ مستعار کے لیل و نہار ڈھائی مہینے کم بہتّر سال پر مشتمل ہیں۔ ان کی پیدائش کے وقت یہ برصغیر برطانوی اقتدار کی آہنی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا اور مسلمان بالخصوص انتہائی پسماندگی کا شکار تھے۔ محمد علی جناح نے تعلیم کی منزلیں طے کرنے کے کچھ عرصہ بعد وادیٔ سیاست میں قدم رکھا اور پھر اسی کے ہو رہے۔ ابتدا میں وہ تمام اقوامِ ہند کے اتحاد کے زبردست حامی تھے اور اس ضمن میں ان کی مساعی برصغیر کی تاریخِ سیاست کے بہت سے ابواب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ملک کے حالات نے ایسی کروٹ لی کہ سیاسیات کا دھارا بالکل بدل گیا اور ہندو اکثریت کے متعصبانہ طرزِ عمل نے محمد علی جناح اور بہت سے مسلمان اکابر کو فکر و عمل کی نئی راہ پر گامزن ہونے کے لیے مجبور کر دیا۔ چنانچہ وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آئے اور مسلمانوں میں قانون، نظم و ضبط اور اسلامی تہذیب کی انفرادیت کی نئی روح پھونکنے کی مہم شروع کی۔ جس محنت اور لگن سے انھوں نے مسلمانوں کو منظم کیا، حصولِ پاکستان کی جدوجہد کی اور جس خلوص و کردار سے اپنے طریقِ کار کو آگے بڑھایا، اس کی بنا پر قوم نے ان کو بجا طور پر قائدِ اعظم کا خطاب عطا کیا اور یہ ان کی قربانیوں اور سرگرمیوں کا بہت بڑا اعتراف ہے۔

قائدِاعظم بہت بڑے قانون دان، اسلام کے ترجمان اور جمہوریت کے دلدادہ تھے، اور زندگی کا تمام سفر انھوں نے انھی اصولوں کی روشنی میں طے کیا۔ حصولِ پاکستان کی پوری تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ قائدِ اعظم ابتدا سے آخر تک قانون کی بالادستی، اسلام دوستی اور جمہوری قدروں کا احترام کرتے رہے۔ انھوں نے انگریزی استبداد سے شجاعانہ ٹکر لی، ہندو تعصب کا مقابلہ کیا اور ہر اس طاقت کا جو ان کی کوششوں کا صحیح راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھی، قانون اور جمہوریت کے دائرے میں رہ کر زور توڑا — یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا اور مطالبۂ پاکستان اور تحریکِ پاکستان میں ان کو حق بجانب ٹھہرایا۔ جو نظریہ انھوں نے پیش کیا اور جن مقاصد کے حصول کے لیے وہ میدانِ عمل میں اترے، اس میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت ان کی ہم نوا تھی، اور اس میں بلاشبہ یہ جذبہ کارفرما تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو، اسلامی تہذیب پروان چڑھے، اسلامی آئین کی حکمرانی ہو اور اسلام کی جمہوری روایات کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہونے کے مواقع میسر آئیں — ہمیں چاہیے کہ ہم قائدِ اعظم کے ان سنہری کارناموں کو اپنے عمل سے زندۂ جاوید رکھیں۔

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

اسلام کی روشنی میں معاشرتی برائیوں کا انسداد

معاشرتی برائیوں سے مراد انسان کے ایسے اعمال و افعال ہیں جو معاشرت میں اضطراب و فساد پیدا کریں اور جن سے معاشرتی نظام درہم برہم ہو۔ ان برائیوں میں کذب و افترا، دھوکہ بازی، فریب طرازی، الزام تراشی، بے راہ روی، چوری، ڈاکہ زنی، قتل و غارت گری، شر و فساد انگیزی اور خوں ریزی شامل ہیں۔ قرآن و سنت میں ان میں سے ایک ایک برائی کا ذکر کر کے اس کے مرتکب کو مجتنب رہنے کی تاکید کی گئی ہے اور بار بار ارتکاب کرنے والوں کو دنیا میں تباہی و بربادی اور آخرت میں خسران و عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ قرآن و سنت میں معاشرتی برائیوں کے لیے جامع اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں، جن میں "منکر" اور "فحش" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جھوٹ جسے عربی میں کذب کہتے ہیں معاشرتی برائیوں کی جڑ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی برائیوں کا منبع جھوٹ ہے۔ انسان قول اور فعل کے ذریعے دوسرے انسانوں سے تعلق پیدا کرتا ہے قلب و ذہن کی تمام برائیاں پہلے قول سے جنم لیتی ہیں پھر فعل اور عمل کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ جھوٹ انسان کو ناکامی و نامرادی تک پہنچا دیتا ہے اور وہ خسرانِ مبین کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان جب انسانوں کے ساتھ معاملات میں جھوٹ و فریب اور کذب و افترا اختیار کر لیتا ہے تو وہ بڑھتا بڑھتا انکارِ خدا تک جا پہنچتا ہے۔ اس بات کو قرآن حکیم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ (الانعام: ۳۱)

جن لوگوں نے اللہ سے ملاقات کا انکار کیا وہ گھاٹے میں رہے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ (الاعراف، ۱۴۷)

جن لوگوں نے ہماری آیتوں اور قیامت کی ملاقات کا انکار کیا ان کے تمام اعمال برباد ہو گئے۔

اللہ اور قیامت کے انکار کو اعمال کی بربادی کے مترادف قرار دیا گیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسان

یہ سمجھنے لگے کہ اس سے بالا کوئی ہستی نہیں، وہ خود ہی ہر چیز پر قادر ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ بے خوف ہو جائے کہ وہ جس قسم کے بھی اعمال کرے گا اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو گا۔ جب انسان میں یہ بات راسخ ہو جائے تو وہ ہر قسم کی برائی کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے انکار سے انسان میں مسئولیت کی فکر ختم ہو جاتی ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کے بُرے اعمال و افعال کا محاسبہ نہیں ہو گا اور موت کے بعد حشر کا میدان بپا نہیں ہو گا۔ زندگی کا اختتام موت سے اور اعمال و افعال کا اختتام دنیا سے رخصت پر ہے۔ اس عدمِ مسئولیت کے نظریے سے افراد اور اقوام ایسی برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں جو ہلاکت اور بربادی تک پہنچا دیتی ہیں۔

اللہ اور قیامت پر ایمان سے انکار کی ابتدا رسالت و نبوت سے انکار سے ہوتی ہے۔ رسول اور نبی، اللہ اور قیامت پر ایمان کا داعی ہوتا ہے۔ جو لوگ اس کا انکار کر دیں، نبوت و رسالت کو نہ مانیں، وہ ان تعلیمات کے بھی منکر ہوں گے جو وہ رسول ان کے پاس لاتا ہے۔ ان تعلیمات کی بنیاد ہی ایمان باللہ پر ہے۔ جو لوگ رسالت کے منکر ہوں گے وہ لازمی طور پر اللہ کے بھی منکر ہوں گے۔ ایسے ہی منکرین اللہ اور قیامت کے متعلق قرآنِ حکیم میں بیان کیا گیا ہے کہ جب قیامت بپا ہو گی اور میدانِ حشر میں باز پرس کی جائے گی تو جن لوگوں نے قیامت کے روز مسئولیت کے عقیدے کا انکار کیا ہو گا وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ان کے پاس تو کوئی نذیر یعنی ڈرانے والا آیا ہی نہیں تھا۔ اور جب خود ان کے اعضا و جوارح ان کے جھوٹ پر گواہی دیں گے، ان کے اعمال و افعال ان کے خلاف شہادت دیں گے اور انبیا و رسل کو جھٹلانے کے لیے ایسے جھوٹے لوگوں نے جو کچھ دنیا میں کیا ہو گا وہ ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا تو اس وقت ان کے پاس اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ وہ پکار اٹھیں گے:

قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا (الملک: ۹)

ہاں ڈرانے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے انکار کر دیا تھا۔

اس سے واضح ہوا کہ تمام برائیوں کی جڑ جھوٹ ہے۔ جھوٹ کا منبع انکارِ خدا، انکارِ قیامت اور انکارِ رسالت ہے۔ جو انسان اللہ، آخرت اور رسالت کا منکر ہو جاتا ہے، وہ ہر قسم کی برائی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ دھوکا، فریب، بہتان، الزام، چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، رشوت، سفارش، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹنگ ایسے لوگوں کا معمول بن جاتا ہے۔ دل اور ضمیر کی خلش محسوس کیے بغیر وہ مسلسل ان برائیوں کا

ارتکاب کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایمان دل سے نکل جاتا ہے، دل اور ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں، ہوس، لالچ اور طمع کی مکمل گرفت میں آکر وہ توازن اور اعتدال کو کھو بیٹھتے ہیں اور بالآخر انسانیت کے شرف سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آپڑتے ہیں، بلکہ وہ حیوانیت کی سطح سے بھی پست ہو جاتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○ (الاعراف، ۱۷۹)

یہ لوگ حیوانوں کی طرح ہو جاتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غافل ہیں۔

عقل و ضمیر کے یہ اندھے لوگ صرف دنیا میں گمراہ نہیں بلکہ انھیں اس اندھے پن کی حالت ہی میں آخرت کو اٹھایا جائے گا اور وہ اپنی صریح گمراہی کے سبب اندھے ہی اٹھیں گے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۲)

جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے، وہ شخص آخرت میں بھی اندھا ہے اور روش کے اعتبار سے گمراہ ترین شخص ہے۔

خدا اور انسانیت کے ان دشمنوں کا ٹھکانا دنیا اور آخرت دونوں میں بہت برا ہوگا اور وہ طرز زندگی اور روشِ حیات کے اعتبار سے انتہائی گمراہ ہیں:

أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا ○ (الفرقان، ۳۴)

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا بہت برا ہے اور وہ روش کے اعتبار سے انتہائی گمراہ ہیں۔

قرآن حکیم نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ معاشرے کے ان گمراہ لوگوں کی گمراہی کے اسباب کیا ہیں اور وہ کیوں انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کو اختیار کرتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک — اللہ — کی طرف سے جو ہدایت قرآنِ حکیم کی صورت میں بھیجی گئی ہے، اسے چھوڑ کر اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں، وہی تباہی و بربادی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ ۚ (القصص، ۵۰)

اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

معاشرے کے یہ دشمن لوگ جب قیامت میں اٹھائے جائیں گے اور معاشرتی برائیوں کے سبب انھوں نے جو انسانیت سوز اعمال و افعال کیے ہوں گے، ان کا نتیجہ عذاب کی صورت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو انھیں خود پتا چل جائے گا کہ انھوں نے گمراہ ترین روش اپنا رکھی تھی۔

وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا ○ (الفرقان: ۴۲)

معلوم ہو جائے گا، جب وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ روش کے اعتبار سے کون زیادہ گمراہ تھا۔

قرآن حکیم نے خدا اور انسان کے ان مجرموں کے ارتکابِ جرم کے اسباب و علل بڑی وضاحت سے بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ اس گمراہ کن روش کو یہ کس طرح اپناتے جاتے ہیں۔ گمراہی کے اسباب میں سرفہرست سبب مادہ پرستی ہے۔ جب انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس دنیا کے بعد دوبارہ زندگی نہیں ہوگی، اس کے اعمال و افعال کا محاسبہ نہیں کیا جائے گا اور اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہوگا تو وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اس دنیا میں مادی ذرائع و وسائل کا حصول ہی منتہائے مقصود ہے، انسان کی یہ سوچ اسے دنیوی اسباب اور مادی ذرائع و وسائل کے حصول میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ بالکل آزاد ہو کر مذہبی اور معاشرتی برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ ناجائز اور حرام ذرائع سے جمع کردہ دولت، اور دھوکہ اور فریب سے حاصل کردہ جاہ و جلال اور شان و شوکت کو اپنی کامیابی قرار دیتا ہے۔ مگر یہ انسان کی کوتاہ بینی اور حقائق سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ یہ کامیابی نہیں بلکہ دنیا و آخرت میں گمراہی، نقصان اور خسران ہے۔

قرآن حکیم نے تاریخِ انسانیت میں انسان کے عروج و زوال کے اسباب کو سامنے رکھ کر پوری تاریخ اور زمانے کی قسم کھا کر انسان کی اس روش کو خسرانِ مبین اور نقصانِ عظیم قرار دیا ہے۔ فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ (العصر: ۱، ۲)

زمانے کی قسم، انسان سراسر خسارے میں ہے۔

اس خسارے کے اسباب یہ بیان کیے کہ انسان مادی اور الحادی عقیدے اور طرزِ عمل کو اپنا لیتا ہے۔ اس روش سے جن اعمال و افعال کا اس سے صدور ہوتا ہے وہ اسے خسران و ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کتابِ ہدایت ہے، اس لیے جہاں اس میں انسانوں کی ہلاکت و بربادی کے اسباب بیان ہوئے ہیں وہاں اس کی کامیابی و کامرانی کے لیے رشد و ہدایت کی راہیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر: ۳)

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔

گویا معاشرتی برائیوں، عقیدہ و عمل کی گمراہی سے نجات اور دنیا و آخرت میں کامیابی کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ جو لوگ راہِ راست پر آنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہوں، وہ دل و ضمیر کی آواز سن سکیں اور ذہنی و قلبی سکون حاصل کر سکیں تو ان کے لیے ایک

ہی راہ کھلی ہے اور وہ راہ ایمان اور عملِ صالح کی راہ ہے۔ مادی اور الحادی روش اپنانے سے انسان کو ذہنی اور قلبی سکون ہرگز نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ مادی ذرائع و وسائل کے حصول میں جتنے آپ کو جتنا زیادہ کامیاب پاتا ہے قلب و ذہن کے اعتبار سے وہ اتنا ہی بے چین و مضطرب ہوتا ہے۔ اس کی زندہ مثال مغرب و مشرق کے مادی اور الحادی نظام ہائے حیات کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ وہ کون سی دنیوی آسائش اور سہولت ہے جو آج ان معاشروں کو دست یاب نہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور تسخیرِ کائنات سے انسان کو جو دنیوی مال و آسودگی آج حاصل ہے وہ اس سے قبل کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ حقیقت ان مادی و الحادی نظاموں کے علم برداروں کی بیان کردہ ہے کہ خودکشی، چوری، ڈاکہ زنی، فریب طرازی، بے چینی، اغوا اور اضطراب کی جو لہر ان معاشروں میں آئی ہوئی ہے وہ کبھی تاریخِ انسانیت میں اس سے قبل دیکھی نہیں گئی۔

اس تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ جو معاشرے اپنے آپ کو مذہبی قرار دیتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے مذہب کی باتیں کرتے ہیں ان کی حالت بھی قابلِ رشک نہیں۔ وہاں نہ مادی آسائشیں ہیں اور نہ ذہنی و قلبی سکون ہے۔ ان معاشروں میں بسنے والے اکثر لوگ فرار کر کے مادی معاشروں میں جانے کے لیے بے قرار ہیں۔ اگر ان معاشروں میں بے چینی، اضطراب اور معاشرتی برائیوں کے ارتکاب کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کل دنیا میں مذہب صرف زبان کی حد تک محدود ہے، قلب و ذہن اس سے محروم ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں، ایک یہ کہ لوگ دین کی اصل تعلیمات سے بے بہرہ ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ اللہ نے دینی زندگی گزارنے کے لیے کیا ہدایات بھیجی ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض اوقات مذہب کو ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ قرآن حکیم انسان کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ ہے، اس لیے وہ ایسے لوگوں کے ارادوں اور نیتوں سے واقف ہے۔ چنانچہ اس نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جو لوگ بظاہر مذہبی ہیں مگر مذہب کو دل و جان سے اپناتے نہیں وہ اپنے اعمال و افعال کے اعتبار سے معاشرے میں بہتر نتائج پیدا نہیں کر سکتے، ایک جگہ فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط۔ (العنکبوت: ۴۵)

نماز فحش اور برے کاموں سے انسان کو روک لیتی ہے۔

اس وقت سمگلروں، ذخیرہ اندوزوں، بلیک مارکیٹ کرنے والوں، ملاوٹ اور گرانی کے مجرموں

کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں ایسے بھی ہوں گے جو نمازیں بھی پڑھتے ہوں گے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی نماز انھیں فحش ومنکر سے باز نہیں رکھ رہی۔ جس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ ایسے لوگ اس نماز کو قائم نہیں کر رہے جس کا تقاضا قرآنِ حکیم کرتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسے لوگ قرآن کے مطابق نماز کو ادا کرتے تو وہ فحشا اور منکر کے مرتکب نہ ہوتے۔ ایسے نمازی جو نماز کی غرض وغایت سے غافل ہیں، ان کے لیے ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ (الماعون: ۴-۶)

ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے، جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں، جو محض دکھاوا کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے ان لوگوں کو بے دین اور منکرِ دین قرار دیا ہے جو یتیموں اور مسکینوں کی کفالت کا انتظام نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ ملک ومعاشرہ منکرِ دین قرار پاتا ہے جس میں ساکین ویتامیٰ کو دھکے ملتے ہوں اور ان کے لیے روزی کا بندوبست نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۙ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ (الماعون: ۱-۳)

کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی رغبت نہیں دیتا۔

قرآن کی نظر میں وہ معاشرہ جس میں یتیموں کو دھکے دیے جائیں اور مسکینوں کے کھانے اور ان کے ذرائع روزگار کا معقول اور باعزت بندوبست نہ ہو وہ منکرِ دین معاشرہ ہے۔ یتیموں اور مسکینوں، محتاجوں، معذوروں کی کفالت نہ کرنا بہت بڑی معاشرتی خرابی ہے۔ دین دار اور بے دین معاشرے کی قرآنی پہچان یہ ہے کہ دین دار معاشرے میں تمام افرادِ ملت کے ذرائع روزگار کا معقول اور باعزت انتظام ہوتا ہے جب کہ بے دین معاشرہ ان فرائض سے غافل ہوتا ہے۔ اسلام نے ان تمام برائیوں کی اصلاح کے لیے انسانیت کو جو لائحہ عمل عطا کیا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں: (۱) عقائد وایمانیات (۲) عبادات (۳) معاملات۔

عقائد وایمانیات میں سرِ فہرست ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسل ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لے آتے ہیں وہ اللہ کے سوا تمام معبودوں کا انکار کر دیتے ہیں، جسے کلمہ طیبہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: لا الٰہ الا اللہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی طاقت

قدرت اور اتھارٹی ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب، تمدن، تعلیم، عدالت، خاندان، روزی، عزت و ذلت تمام شعبہ ہائے حیات میں ضروریات، حاجات، خواہشات، اغراض، مقاصد کی تکمیل اور ان کا حصول صرف اور صرف خدا سے کیا جائے، اسے چھوڑ کر اول تو کسی میں ان کی تکمیل اور عطا کی قوت اور قدرت نہیں، دوم اگر انسان بے خبری، جہالت اور غفلت سے دوسروں سے مانگے تو اُسے ناکامی و نامرادی ہوگی۔

ایمان بالآخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس بات پر ایمان لائے کہ اس کے تمام اعمال و افعال کا محاسبہ روز قیامت کو ہوگا، حتیٰ کہ رائی کے دانے کے برابر بھی اگر انسان نے کوئی خیر یا شر کا کام کیا ہے تو وہ اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور اس کے مطابق جزا و سزا پائے گا۔ ایمان بالرسالت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور آخرت کے بارے میں تفصیلی تعلیمات دینے کے لیے انسانوں میں سے ایک رسول مبعوث کیا گیا جو ان الٰہی تعلیمات پر غور کر کے انسانوں کے سامنے عملی نمونہ پیش کرے تاکہ انسان قیامت کے روز یہ حجت پیش نہ کر سکیں کہ ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا گیا تھا، اگر ان کے پاس ڈرانے والا بھیجا جاتا تو وہ راہِ راست پر آجاتے۔ اس لیے خدا اور انسانیت کے مجرمین پر اتمام حجت کے لیے ہر قوم میں انبیا و رُسل مبعوث ہوئے اور بالآخر سب سے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، جو انسانیت کے لیے کامل و مکمل، تمام و کمال، غیر متغیر و غیر متبدل دین لے کر آئے، جنھوں نے اس دین پر خود عمل کر کے دنیا کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا اور ثابت کیا کہ یہ دین ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے قابلِ عمل ہے۔ پھر آپؐ نے ہزاروں انسانوں کو تعلیم و تربیت دے کر ایک نہایت پاکیزہ اور ترقی یافتہ معاشرہ قائم فرمایا جو ہر قسم کی معاشرتی اور اخلاقی برائیوں اور بیماریوں سے پاک تھا اور ہزاروں نفوسِ قدسیہ کی جماعت تیار کر کے ثابت کیا کہ اگر اس دین پر صحیح معنوں میں عمل کیا جائے تو مثالی معاشرہ قائم ہو سکتا ہے، لہٰذا قیامت تک کے لیے راہِ ہدایت دکھانے والی کتاب قرآن حکیم کی عملی تصویر اسوۂ رسولؐ اور اسوۂ رسول کی عملی تصویر حیاتِ صحابۂ کرام ہے

اگر آج کوئی فرد، کوئی جماعت، کوئی معاشرہ، کوئی حکومت یا پوری انسانیت خیر و صلاح چاہتی ہے تو اس کے لیے یہی راہِ نجات ہے کہ وہ اللہ کے اس آخری دین کو دل و جان سے اپنا لے۔ اس کا طریقِ کار وہی ہے جو نبیِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا تھا۔ سب سے پہلے عقائد کی اصلاح کی جائے

جن کا ذکر قرآن و سنت میں مذکور ہے۔ پھر عبادات کے اس نظام پر عمل کیا جائے جس پر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا تھا۔ ان عبادات کی ادائیگی میں اس سنت پر عمل کیا جائے جو نبی آخرالزمان کی سنت ہے۔ نماز اس طرح ادا کی جائے کہ نماز، نمازی کو فحشا اور منکر سے روک لے۔ روزہ اس طرح رکھا جائے کہ اس سے روزہ دار میں تقویٰ اور احساس ذمے داری بیدار ہو جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو ضرورت نہیں کہ وہ انسان کو خواہ مخواہ بھوک اور پیاس کی صعوبتوں سے دوچار کرے۔ زکوٰۃ اس طرح ادا کی جائے کہ ملک سے غربت و افلاس کا مکمل خاتمہ ہو جائے اور زکوٰۃ دینے والا اپنے آپ کو زکوٰۃ لینے والے سے افضل و برتر خیال نہ کرے، بلکہ فضیلت و برتری کی بنیاد صرف تقویٰ ہو: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ حج اس لیے ادا کیا جائے کہ اللہ کی کبریائی حاجی کے دل پر ثبت ہو جائے، بیت اللہ کی عظمت اس کے دل پر نقش ہو اور وہ تاحیات ہر قسم کی برائیوں سے اجتناب کرنے کا عزمِ صمیم لے کر لوٹے، حج کی ادائیگی مسلمانوں میں اخوت و مساوات کے جذبات کو پروان چڑھائے اور ان کے دلوں سے رنگ، نسل، دولت، قومیت کے امتیازات ختم کر کے وحدتِ ملّی کا عقیدہ تازہ کرے۔ قربانی اس لیے دی جائے کہ قربانی دینے والا ذاتی و نفسانی اغراض و خواہشات کی قربانی دے، ایثار و قربانی کو اپنائے، ورنہ اللہ نے فرما دیا ہے کہ اسے قربانی کے جانوروں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ کھال و بال۔

معاملات میں عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تمام معاشرتی برائیوں کی جڑ بے انصافی، زیادتی اور معاشرتی اور معاشی ناہمواری ہے۔ اگر اسلامی نظامِ معاملات کو اپنا لیا جائے تو عدل و انصاف کا نظام قائم ہو جاتا ہے، ظلم و زیادتی ختم ہو جاتی ہے اور معاشرتی و معاشی بے اعتدالی کا انسداد ہو جاتا ہے۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کو اس دنیا کو لانے والے نبی و رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا جائے۔ آپ نے اسلام کے نفاذ کی ابتدا اصلاحِ عقائد سے فرمائی۔ آج بھی وہی طریقِ نفاذِ اسلام کامیاب ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے قائدین عملی نمونہ پیش کریں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے یہی کہا تھا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ o (یونس: ۱۶)

میں تمہارے اندر اس سے قبل ایک زندگی گزار چکا ہوں کیا تم سمجھتے نہیں۔
دوسرا کام یہ کیا جائے کہ قوم کی اصلاح کے لیے نظام تعلیم کو قرآنی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے۔ قرآنی نظام تعلیم ترتیب دیا جائے اور اس کے مطابق قوم کی تربیت کی جائے۔ اس کا موجودہ حالات میں طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ پرائمری سطح تک ہر طالب علم ناظرہ قرآن لازمی طور پر پڑھے۔ میٹرک تک ہر طالب علم قرآن باترجمہ لازمی طور پر پڑھے۔ بی۔ اے / بی ایس سی تک ہر طالب علم قرآن کے اسرار و رموز اور حکمت قرآنی سے پوری طرح واقف ہو جائے۔ تزکیے کا عمل پرائمری، مڈل، میٹرک، ایف۔ اے، بی۔ اے، ایم۔ اے کی تعلیم کے دوران طلبا کی ذہنی سطح کے مطابق جاری رہے۔ قلب و ذہن کی تمام آلائشوں سے طلبا کو پاک کر کے ان میں وسعت فکر و نظر پیدا کی جائے۔ وہ روح کی پاکیزگی کے ساتھ بہترین ڈاکٹر، انجنیئر، منصف، حاکم، کاشت کار، صنعت کار، تاجر، محنت کش، استاد، خطیب، امام بن کر نکلیں، ملک میں معاشرتی اور اقتصادی برائیوں سے پاک معاشرہ قائم کریں، دنیا کے سامنے اپنی سیرت و کردار کو نمونے کے طور پر پیش کر کے قرآنی صداقت کو عمل کی شکل دیں۔

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ : ۱۴۳)

تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔

جناب سلیم خاں گمی

پنجابی میں سیرت نگاری

پنجابی میں سیرت نگاری کی ابتدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے انتہائی جذبۂ عقیدت کی بنا پر ہوئی، اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ حضور نبی اکرمؐ کے بے پناہ احسانات کی بدولت سیرت نگاری کا آغاز عقیدت کے نقطۂ نظر ہی سے ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات صرف پنجابی زبان تک ہی محدود نہیں ہے، عربی میں بھی باقاعدہ سیرت نگاری سے پہلے حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ اقدس سے عقیدت کا اظہار نعت اور قصیدے کے ذریعے ہوا۔ یہی بات فارسی اور اردو زبان کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ پنجابی زبان میں سب سے پہلے گورو نانک، مُلا عبدی کوذج، مولوی عبداللہ لاہوری، نوشہ گنج بخش قادری اور شاہ حسین نے نعتوں کے ذریعے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے عقیدت کا اظہار کیا۔ نعت گوئی کے بعد مولود سرائی کی طرف توجہ ہوئی، پھر سراپا نگاری کی باری آئی اور حضورؐ کے شمائل پر بہت کچھ لکھا گیا۔ سراپا نگاری میں سیرت کے بجائے صورت کو اوّلیت دی گئی۔ سراپا نگاروں نے سیرت نگاری کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ لیکن زیادہ تر زورِ قلم سراپا نگاری پر صرف کیا۔ اس بنا پر ایسی تمام نگارشات کو خالص سیرت نگاری کے شعبے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال یہ طے ہے کہ ان کوششوں سے نعت گوئی کا فن اونچی اور اعلیٰ منزلوں تک پہنچا۔ نعت گوئی کے بعد ولادت نامے، مولود نامے، آفرینش نامے، وفات نامے، نور نامے اور معراج نامے ضبطِ تحریر میں آئے، اور یوں ہزاروں اور لاکھوں عقیدت مندوں نے خیرالبشرؐ سے اپنی گہری عقیدت اور انتہائی محبت کا اظہار کیا۔ یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی تمام تحریروں میں عقیدت کا رنگ بہت گہرا تھا، اور ان میں تاریخی سیاق و سباق کی کمی تھی۔ چنانچہ یہ تحریریں نعت گوئی کے شعبے میں آتی ہیں۔ تاریخی سیرت نگاری کا شعبہ ان سے الگ ہے، جس میں سیرت نگار تاریخ فہمی، تاریخ شناسی اور واقعہ نگاری پر زیادہ زور دیتا ہے تاکہ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ بابرکات کی روشنی میں خارجی حالات و واقعات کے زیرِ اثر داخلی جذباتی اور

ذہنی زندگی کا مطالعہ پیش کر سکے۔ سچی بات یہ ہے کہ نعت گوئی اور قصیدہ خوانی کے بہت بعد پنجابی میں سیرت نگاری کا کام شروع ہوا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیرت نگاری کی حدود کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب ہمیں ابنِ ہشام کی مرتب کردہ کتاب سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مطبوعہ بیروت (لبنان) کے مقدمے میں ملتا ہے۔ لکھا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں یہ ہے کہ آپؐ کی حیاتِ مبارکہ سے پوری پوری واقفیت کروائی جائے۔

(۱) آپ کی آمد سے پہلے ان نشانیوں کا تذکرہ کیا جائے جن سے آپ کی ذاتِ مقدس کا تعلق ہے اور جو رسالت کی تمہید ہیں۔ (۲) آپؐ کی ولادتِ باسعادت کے ان واقعات کا ذکر کیا جائے جن کا دعوتِ محمدیہ سے تعلق ہے۔ (۳) آپؐ کی تربیت اور نشوونما کے واقعات جو آپؐ کی بعثت تک پھیلے ہوتے ہیں۔ یعنی دینِ حق کی دعوت کے سلسلے کے واقعات۔ (۴) اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں جو واقعات رونما ہوئے۔ (۵) آپؐ اور آپؐ کے دشمنوں کے درمیان گفت و شنید اور تلوار کے استعمال کے دوران جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ (۶) ان لوگوں کا ذکر جنھوں نے حضورؐ کی دعوت قبول کی اور حق کی آواز کو بلند کیا۔ (۷) وہ واقعات جن سے ایمان کی روشنی پھیلی۔ (۸) ان جنگوں کے حالات جو دعوتِ اسلام کے سلسلے میں حضورؐ کو یا حضورؐ کے ساتھیوں کو پیش آئے۔ عنوانات کی اس فہرست میں (۹) حضورؐ کا نسب نامہ (۱۰) آپؐ کے عہد کے عرب کا جغرافیہ (۱۱) دنیا کے تجارتی، اقتصادی، مذہبی، سماجی اور سیاسی حالات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

ایک انگریز مصنف منٹگمری واٹ نے تو حضورؐ کی مکی اور مدنی زندگی کے حالات عمرانی نقطۂ نظر سے لکھے ہیں۔ اس کی انگریزی کتابیں (محمدؐ ان مکہ اور محمدؐ ان مدینہ) مغربی دنیا میں بے حد مقبول ہوئیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کا قاری ذہنی طور پر آج سے تیس چالیس سال قبل کے قاری سے جداگانہ خیالات کا حامل ہے۔ اگرچہ پہلے عقیدے کا زور تھا لیکن آج عقیدے کے زور کے ساتھ ساتھ عقل اور منطق بھی زوروں پر ہے، اس لیے آج کے سیرت نگاروں کو آج کے علوم کی روشنی میں بات کرنی پڑتی ہے۔

سیرت کا آخری موضوع میرے خیال میں (۱۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور

آپؐ کے کارناموں کا عالمی نقطۂ فکر سے مطالعہ ہے ۔ حضورؐ کی وفات کے بعد دنیا کے عمرانی حالات خاص طور پہ ایک سو سال کے اندر اندر کس طرح بدلے اور آئندہ ان میں کیا کیا تبدیلیاں رو نما ہوں گی، یہ تمام موضوعات جو کم و بیش بارہ ہیں، سیرت نگار کی خصوصی توجہ کے طالب ہیں ۔ گویا سیرت نگار کو سوانح نگاری کے علم کے علاوہ دیگر معاشرتی علوم کا ماہر بھی ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ طبعی علوم سے کماحقہٗ آگاہی بھی ضروری ہے ۔ کیونکہ قرآن کریم میں سماجی اور طبعی علوم کی نشان دہی کی گئی ہے اور قرآن کریم حضورؐ کی ذات بابرکات کے واسطے ہی سے ہم تک پہنچا ۔ اسی ذاتِ کریمی کا داخلی و خارجی اظہارِ عمل سیرت نگاری اور سیرت شناسی ہے ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سلسلے میں پنجابی میں اوّلین تحریر کون سی ہے ؟

پنجابی زبان و ادب میں بابا فرید گنج شکرؒ (پاک پتن) کی حیثیت باوا آدم کی ہے ۔ ان کے کلام کو بول یا اشلوک کہا جاتا ہے ۔ وہ صوفی شاعر تھے اور انھوں نے متصوفانہ خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے شاعری کا ذریعۂ اظہار اپنایا، لیکن ان کا کوئی بھی اشلوک یا بول سیرتِ رسول اللہؐ کی طرف اشارہ نہیں کرتا ۔ حتّٰی کہ ان کا کوئی نعتیہ شعر بھی دست یاب نہیں ۔ باباگورونانک (پ ۱۴۶۹ء) پہلے پنجابی شاعر ہیں جن کا نعتیہ شعر دست یاب ہے :

ص صلاحت محمدیؐ مکھ تھیں آکھو نِت

خاصہ بندہ سجیا سِر منزاں ہو ست

یعنی ہمیں ہر وقت حضور نبی اکرمؐ کی تعریف کرنی چاہیے، وہ خیر البشر ہیں اور ہمارے دوستوں کے سردار اور دوست ہیں ۔ باباگورونانک کے کچھ اور نعتیہ اشعار بھی ملتے ہیں، ان کو نعت کے شعبے میں تو شامل کیا جا سکتا ہے، سیرت کے شعبے میں جگہ نہیں دی جا سکتی، اور ظاہر ہے مدحِ رسولؐ اور سیرتِ رسولؐ میں نمایاں فرق ہے ۔

باباگورونانک کے بعد شاہ حسین (پ ۱۵۳۹ء) کا نام آتا ہے ۔ وہ بھی صوفی شاعر تھے ۔ ان کا ایک نعتیہ قطعہ ملتا ہے، سیرت کے بارے میں ان کی کوئی تحریر دست یاب نہیں ۔ البتہ ان کا نعتیہ قطعہ یہ ہے :

عشق نبی سرور دے مینوں ڈاہڈا چینک لایا ہے
زلفاں کھول بیر اگن ہوئیاں گھر گھر الکھ جگایا ہے
زلف واللیل تے مکھ والشمس مینوں سوہناں نظریں آیا ہے
وانگ زلیخا دے میں اڑیو رو رو حال ونجایا ہے

حاجی محمد نوشہ گنج بخش یکم رمضان ۹۵۹ھ (۲۱-اگست ۱۵۵۲ء) کو موضع گھوگانوالی تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہ پنجابی زبان کے پہلے نثر نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ ایک عظیم صوفی شاعر تھے اور ان کی تحریریں بھی ان کے پنجابی دیوان "گنج شریف" میں ملتی ہیں۔ سیرت رسول اللہؐ کے سلسلے میں ان کی کوئی تحریر ہم تک نہیں پہنچی، البتہ ان کے نعتیہ اشعار بکثرت ملتے ہیں۔

حافظ برخوردار رانجھا (پ ۱۰۳۰ھ) پنجابی کے مشہور شاعر ہیں، ان کی تصنیفات یہ ہیں: (۱) یازدہ اسمائے غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی کا منظوم پنجابی ترجمہ - (۲) شرح پنجابی نظم دعائے گنج العرش (۳) شرح پنجابی نودونہ اسمائے غوث دستگیر۔ (۴) شرح ترجمہ پنجابی قصیدہ غوثیہ (۵) پنجابی ترجمہ چہل کاف غوث الثقلین (۶) قصیدہ رومی عربی و پنجابی منظوم ترجمہ (۷) ترجمہ و شرح قصیدہ بردہ (۸) منظوم شرح درود شریف - (۹) نودونہ اسمائے رسول اللہؐ کا پنجابی منظوم ترجمہ و منظوم شرح۔ (۱۰) حکایت پاک رسولؐ دی۔ (۱۱) منظوم ترجمہ قصیدہ بانت سعاد۔

ترجمہ و شرح قصیدہ بردہ، حکایت پاک رسول دی اور منظوم ترجمہ قصیدہ بانت سعاد کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حافظ برخوردار پنجابی میں حضور نبی اکرم کے پہلے سیرت نگار ہیں۔ ان کا نام برخوردار اور تخلص حافظ ہے، قوم جاٹ اور گوت رانجھا۔ وہ قرآن پاک کے حافظ تھے۔ ان کا گاؤں مسلمانی وا تخت ہزارہ ہے جو ضلع سرگودھا میں ہے۔ کتاب "حکایت پاک رسول دی" ایک نادر کتاب ہے جس کے دو نسخے دست یاب ہیں اور وہ ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر احمد حسین قلعداری کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قصیدہ بانت سعاد (مصنف کعب بن زہیر) عربی زبان کا مایہ ناز قصیدہ ہے، جسے مغربی دنیا میں سب سے پہلے لیڈن میں ۱۷۴۰ء میں چھاپا گیا۔ اس قصیدے کا ترجمہ اور شرحیں دنیا کی ہر بڑی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ پنجابی زبان میں سب سے

پہلے حافظ برخوردار رانجھا نے اس کا منظوم ترجمہ کیا۔ عربی زبان کے دوسرے مقبول و مشہور قصیدے، قصیدہ بردہ (مصنف امام بوصیری) کا پنجابی ترجمہ بھی سب سے پہلے حافظ برخوردار رانجھا نے کیا۔ ان کے بعد قصیدہ بردہ کے ترجمے کی سعادت سید وارث شاہ، شہیدی، حافظ خان محمدؒ، ڈاکٹر مہر عبدالحق، عزیزالدین قریشی، نیک عالم میرپوری، احمد حسین قریشی اور مطیع اللہ کو حاصل ہوئی۔

مولانا غلام محی الدین قصوری (۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷ء - ۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کئی کتابیں تحریر کیں جن میں سے یہ کتابیں مشہور ہیں۔ (۱) تحفۂ رسولیہ، فارسی نظم (۲) دیوان حضوری، فارسی نظم۔ (۳) رسالہ نظامی، فارسی نظم (۴) خطباتِ جمعہ و عیدین، عربی فارسی نظم (۵) زادالحاج۔ پنجابی زبان میں اولین منظوم سفرنامہ (۶) حلیہ شریف، فارسی نظم۔

تحفۂ رسولیہ کا پنجابی منظوم ترجمہ کئی شاعروں نے کیا۔ اس کی وجہ اس کی مقبولیت تھی۔ یہ فارسی نظم درس نظامی کے نصاب میں بھی شامل تھی، مولوی غلام رسول ساکن عادل گڑھ ضلع گوجرانوالہ نے اس نظم کا منظوم پنجابی ترجمہ "شارق الانوار" کے عنوان سے کیا۔ ان کے بعد مولوی محمد اشرف ساکن گلیانہ ضلع گجرات نے اس کا ترجمہ کیا۔ اس فارسی نظم کے ان حصوں کا جو حضور کے معجزات پر مبنی تھے، نجم الدین فائز ساکن شادی وال ضلع گجرات نے ترجمہ کیا۔ اسی طرح مولوی محمد عالم قلعداری ضلع گجرات نے بھی اس فارسی نظم کے کچھ حصوں کا پنجابی نظم میں ترجمہ کیا۔ اسی عنوان سے میاں محمد بخش صاحب سیف الملوک نے پنجابی نظم لکھی۔ ظاہر ہے ان تصنیفات میں سے کوئی بھی تصنیف سیرتِ طیبہ پر نہیں ہے۔ محمد یار ولد پیر محمد ساکن کوٹ کالی متصل تخت ہزارہ ضلع سرگودھا نے ۱۱۹۴ھ میں حضور اکرمؐ کی ولادت پر منظوم رسالہ تحریر کیا جس کا عنوان ہے "آفرینش نامہ"۔ سید وارث شاہ (پ ۱۱۳۵ھ)، حامد شاہ عباسی (پ ۱۱۶۱ھ)، سید ہاشم شاہ (پ ۱۷۵۲ء)، مولوی احمد یار (پ ۱۷۶۸ء)، امام بخش قریشی (پ ۱۷۷۸ء)، نور محمد نور (پ ۱۷۸۲ء) اور قادر یار امین آبادی (پ ۱۸۰۲ء) کی تحریریں یا تو قصہ کہانی کا احاطہ کرتی ہیں، یا پھر شرع و فقہ کے نکات کی وضاحت ان کا مطلوب و مقصود ہے۔

حافظ برخوردار رانجھا کے بعد حکیم احمد یار نے اپنے قلم کو سیرت رسول اللہؐ کے لیے وقف کیا۔ وہ سوہدرہ تحصیل وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ میں ۱۷۶۸ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۸۴۵ء میں وفات

ں ۔ حضور کی سیرتِ طیبہ پر انھوں نے پانچ رسالے پنجابی نظم میں تحریر کیے ۔ ان رسالوں کے عنوان
ے ۔ (۱) جنگِ بدر (۲) جنگِ احد (۳) جنگِ خندق (۴) تولد نامہ (۵) وفات نامہ ۔

مولوی محمد مسلم (پ ۱۸۵۵ء) لدھیانہ کے رہنے والے تھے، پھر جالندھر شہر آگئے اور انگریزوں
ملازمت اختیار کر لی ۔ ملازمت سے جی اُکتا گیا تو کتابوں کی دکان کھول لی اور ساری زندگی اسلام کے لیے
ف کر دی ۔ انھوں نے چار کتابیں لکھیں (۱) گلزارِ آدم (۲) گلزارِ موسیٰ (۳) گلزارِ سکندری (۴)
زارِ محمدی ۔ گلزارِ محمدی میں حضور نبی اکرم کی سیرتِ طیبہ کو پیش کیا گیا ہے ۔ یہ ایک طویل پنجابی نظم
ے، جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ۔ یہ کتاب آج بھی پنجاب یونیورسٹی میں ایم ۔ اے (پنجابی)
ہ نصاب میں شامل ہے اور اس کا منتخب متن طلبا کو درساً درساً پڑھایا جاتا ہے ۔ یہ کتاب ۲۳۰
فحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۳ء میں جالندھر میں پہلی بار شائع ہوئی ۔

مولوی عبدالستار (پ ۱۸۲۳ء) نے دو کتابیں تحریر کیں (۱) مدح نبی کریمؐ اور (۲) اکرام محمدیؐ ۔
لی کتاب نعتوں پر مشتمل ہے اور دوسری کتاب فقہی مسائل سے متعلق ہے ۔

سید فضل حسین شاہ (پ ۱۸۲۷ء) نے نعتوں پر مشتمل کتاب لکھی جس کا عنوان تھا "تحفۂ فضل"۔
ں کے بعد انھوں نے حضورؐ کے ۳۷ معجزوں کو نظم کیا ۔ میاں محمدؒ جن کی شاعرانہ عظمت کی بنیاد قصہ
یف الملوک ہے، بارہ منظوم کتابوں کے مصنف ہیں، لیکن ان کو سیرت نگار نہیں کہا جا سکتا ۔
افظ محمد مطیع اللہ نے قصیدہ بردہ کا منظوم ترجمہ کیا اور حافظ خان محمد سیالکوٹی نے قصیدہ بانت سعاد
د پنجابی کے قالب میں ڈھالا ۔ حافظ خان محمد سیالکوٹی نے کل بیس رسالے تحریر کیے ۔ ان سب رسالوں
ر ایک کتاب کی شکل دی گئی ہے اور کتاب کا نام "انواع حافظ" رکھا گیا ہے ۔ یہ کتاب شرعیات
ر قرآن کے بارے میں ہے، سیرت پر نہیں ہے ۔ حافظ محمد مطیع اللہ اور حافظ خان محمد سیالکوٹی
ے حالاتِ زندگی معلوم نہیں ہو سکے ۔ پنجابی نعت گو شہیدی کے حالاتِ زندگی بھی میسر نہیں ہیں ۔
ہا جاتا ہے کہ شہیدی نام کے دو شاعر ہوئے ہیں ۔ ایک اردو میں نعت کہتے تھے اور دوسرے
نجابی میں ۔ اردو نعت گو مراد آباد کے رہنے والے تھے اور وہ ۱۲۴۴ھ میں جاں بحق ہوئے ۔
نجابی نعت گو نے قصیدہ بردہ کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا جو تا حال نہیں چھپا ۔ البتہ اس ترجمے کا دستی
سودہ (ہتھ لکھت) ملتا ہے ۔ میرے خیال میں شہیدی نام کے دو شاعر نہیں تھے ۔ یہ ایک ہی

صاحب تھے جو پنجاب سے مرادآباد چلے گئے اور اردو اور پنجابی زبانوں میں حضورؐ نبی اکرم کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے تھے۔ بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے۔

مولوی غلام نبی کلانوری، ضلع گورداس پور کی تحصیل بٹالہ کے مشہور قصبہ کلانور میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے اور امرت سر میں ۱۹۲۹ء کو جاں بحق ہوئے۔ ان کا سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں سب سے بڑا کارنامہ فارسی میں معین الدین کاشفی کی سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ عنوان "معارج النبوت" کا منظوم پنجابی ترجمہ ہے، جو چار جلدوں میں "گلزارِ احمدی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کی دوسری تصنیف سفرنامہ حجاز ہے جو منظوم ہے اور پنجابی زبان کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ (پہلا سفرنامہ مولانا محی الدین قصوری کا ہے)۔ ان کی تیسری کتاب مسجد نبوی کا حلیہ ہے۔ مولوی روشن دین روشن ضلع گورداس پور کے ایک گاؤں گھمن خورد میں ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے اور ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں سٹھیالی میں ۱۹۲۲ء کو وفات پائی۔ انھوں نے حضورؐ کی زندگی پر آٹھ قصے تحریر کیے۔ (۱) شمع محمدی (۲) سراجِ محمدیؐ (۳) باغیچہ محمدی (۴) کامن محمدی (۵) فضائل محمدیؐ (۶) ہجرت محمدیؐ (۷) شان محمدیؐ (۸) نقارۂ محمدیؐ۔ ان آٹھ قصوں کے علاوہ انھوں نے نو دوسرے قصے تحریر کیے جو اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں تھے۔ گویا مولوی روشن دین روشن نے اپنی ساری زندگی تبلیغ اسلام اور سیرت طیبہ کے لیے وقف کی۔ جزوی طور پر سہی لیکن وہ پنجابی زبان و ادب میں حضور کے پانچویں سیرت نگار ہیں۔ ان سے پہلے حافظ برخوردار رانجھا، حکیم احمدیار، مولوی محمد مسلم اور مولوی غلام نبی کلانوری سیرت پاک کے سلسلے میں کام کر چکے تھے۔ چھٹے سیرت نگار مولوی محمد حسین احمد آبادی ہیں جو ضلع سرگودھا کے قصبہ بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ۱۸۴۴ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں بھیرہ میں جاں بحق ہوئے۔ ان کے والد مولوی قادر بخش بھی شاعر تھے اور ان کی کتاب، جو فقہی مسائل پر ہے "مٹھی روٹی" کے نام سے دست یاب ہے۔ مولوی محمد حسین احمد آبادی کا سب سے بڑا کارنامہ سیرتِ رسول اللہؐ پر ان کی کتاب "گلزارِ حسینی" ہے۔ سیرت پر ان کی دوسری کتاب "معجزاتِ محمدی" ہے۔ ان کی تیسری مشہور کتاب "گلزارِ آدم" ہے۔ ان کی ان تین کتابوں کے ادبی محاسن ناقدوں سے ہدیۂ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

محمد بوٹا گجراتی (پ ۱۸۵۱ء۔ م ۱۹۳۰ء) نے وفات نامہ سرورِ کائنات لکھا۔ پیر محمد شاہ نیک عالم

(پ ۱۸۵۷ء) گجرات کے ایک گاؤں کلا پور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے سی حرفی "عشق محمدی" لکھی جو نعت گوئی کے شعبے میں آتی ہے۔ وہ امام بوصیری کے قصیدہ بردہ کے مترجم بھی ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل (پ ۱۸۶۰ء) گوجرانوالہ کے گاؤں بڑدے کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے شرعیات پر تین کتابیں (۱) نشانِ محمدی (۲) چراغِ محمدی اور (۳) بیانِ محمدی تحریر کیں۔ مولوی حبیب اللہ (ولادت ۱۸۷۰ء وفات ۱۲ مارچ ۱۹۵۴) ضلع امرت سر کے گاؤں کبوہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے چھوٹی بڑی ۳۲ کتابیں تصنیف کیں، لیکن ان میں سے ایک بھی سیرتِ رسول اللہؐ پر نہیں ہے۔ مولوی کرم دین عرف مولوی از ہر (پ ۱۸۷۲ء) ضلع سرگودھا کے قصبہ بھیرہ کے رہنے والے تھے، وہ حضورؐ کے چھٹے سیرت نگار ہیں۔ انھوں نے تین حصوں میں گلزار محمدی لکھی۔ اس کتاب کے علاوہ بھی انھوں نے کئی قصے اور رسالے تحریر کیے۔ سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ساتواں نام مولوی دلپذیر بھیروی کا ہے۔ وہ ۱۸۷۵ء میں بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ سیرت پاکؐ پر ان کی یہ تصنیفات دست یاب ہیں (۱) گلزارِ محمدی (۲) اکرامِ محمدی (۳) گلدستہ معجزات (۴) گلزارِ مکہ (۵) معراج نامہ دلپذیر۔ گلزار مکہ حج بیت اللہ شریف کا منظوم سفرنامہ ہے۔ مولوی دلپذیر بھیروی آخری عمر میں قادیانی ہو گئے تھے۔

محمد بخش قرشی امرتسر کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔ وہ قصہ گو بھی تھے اور نعت گو بھی۔ راقب قصوری کے رنگ میں نعتیں لکھتے تھے۔ ان کے دو قصے محمدی جوگن اور فدائے رسولؐ بہت مشہور ہوئے۔ قصہ فدائے رسولؐ غازی علم الدین شہید کی زندگی اور کارناموں پر ہے۔ انھوں نے منظوم "سوانح عمری رسول مقبولؐ دی" لکھی، یہ خالص سیرت کی کتاب ہے، لیکن کہیں کہیں عقیدت کے طور پر اس میں نعتیں بھی ملتی ہیں۔

مولوی کریم بخش بدر کے حالات دست یاب نہیں ہیں۔ وہ لاہور کے کشمیری بازار میں کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی کتاب "تذکرۃ الانبیا" ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء میں چھپی۔ اس منظوم کتاب کا دوسرا نام گلزارِ آدمؑ، گلزارِ نوحؑ، گلزارِ خلیل، گلزارِ موسےٰ، گلزارِ داؤدؑ اور گلزارِ محمدی ہے۔ اس کتاب میں سانحۂ کربلا کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کتاب میں آیاتِ کریمہ اور احادیثِ نبوی کے منظوم ترجمے بھی دیے گئے ہیں۔ اصحابِ کہف اور اصحابِ فیل کے قصے بھی

ہیں اور خلفائے راشدین کے حالات بھی۔ مولوی کریم بخش بتدریج جزوی طور پر حضور نبی اکرم کے سیرت نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مولوی ولی محمد کے حالاتِ زندگی بھی دست یاب نہیں۔ انھوں نے الواقدی کی مشہور کتاب "المغازی" کا پنجابی میں منظوم ترجمہ کیا۔ یہ صرف ترجمہ ہی نہیں، مولوی ولی محمد نے اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔ کتاب حضورؐ کے غزوات سے شروع ہو کر واقعات کربلا پر ختم ہوتی ہے۔

اب جس سیرت نگار کا ذکر کروں گا، ان کی دو امتیازی خصوصیات ہیں، ایک تو وہ مسلمان نہیں ہیں، سکھ ہیں اور دوسرے وہ شاعر نہیں ہیں نثر نگار ہیں۔ بابا فرید گنج شکر سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل تک پنجابی زبان میں سیرت پر جو ذخیرۂ کتب ملتا ہے، وہ سارا نظم میں ہے، نثر میں نہیں ہے۔ سیوا سنگھ امرت سری پہلے سیرت نگار ہیں جنھوں نے پنجابی نثر میں سرکارِ دو عالمؐ کی سیرت پر کتاب تحریر کی، جس کا عنوان ہے "حضرت محمدؐ صاحب جی دا پوتر جیون (حضرت محمدؐ صاحب جی کی مقدس اور پاک زندگی)۔ اس کتاب کے ۱۳۶ صفحات ہیں۔ کتاب گورمکھی رسم الخط میں ہے اور برٹش انڈیا لائبریری لندن میں موجود ہے۔ سیوا سنگھ امرتسری کی دوسری کتاب "قرآن دی کنجی" (قرآن کریم کی چابی) ہے۔

عبداللطیف عارف ۱۸۹۵ء میں سیالکوٹ کے گاؤں گھرتل میں پیدا ہوئے۔ جب وہ چوبیس برس کو پہنچے تو انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔ پہلے سیالکوٹ جیل میں تھے، پھر ان کو ڈسٹرکٹ جیل میانوالی میں بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے پنجابی میں منظوم کتاب "خیر البشر عرف کملی والا" تحریر کی۔ سیرت پر یہ ایک خوب صورت اور مؤثر کتاب ہے۔ حضور کے کمبل یا لوئی کے تعلق سے دوسری کتاب ولایت امرتسری کی کتاب "کملی والا عرف توحید دا باغ" ہے۔ یہ ایک عام منظوم کتاب ہے اور اس کی کوئی ادبی یا تاریخی اہمیت نہیں ہے۔

حافظ مولوی حاجی محمد اسماعیل چک نمبر ۵۵ ڈاکخانہ کوٹ رادھا کشن تحصیل چونیاں ضلع قصور کی کتاب "نور اسلام" تین جلدوں میں چھپی ہے۔ یہ کتاب سیرت رسول اللہؐ کے متعلق نثر میں ہے۔ اس کے بعد نظم بھی آتی ہے۔ اندازِ تحریر مدلل، مؤثر اور مناظرانہ ہے۔ ان کی شرعیات پر بھی کتابیں ملتی ہیں۔ چوہدری فضل حق سب جج چکوال ضلع جہلم نے ۱۹۲۲ء میں حضورؐ کی سیرت پر منظوم پنجابی

میں جو کتاب لکھی اس کا نام ہے "سیرت الحبیبؐ"۔ چوہدری صاحب پہلے سیرت نگار ہیں جو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے جاننے والے تھے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی (ولادت ۱۸۶۰ء وفات ۱۹۴۴ء) اکبری منڈی لاہور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے پنجابی میں کئی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک "شفاء القلوب" ہے۔ اس کے متعلق عام خیال ہے کہ یہ کتاب سیرت رسول اللہؐ پر ہے مگر یہ درست نہیں۔ یہ کتاب فضائل درود پر ہے۔ علاوہ ازیں سرور کائنات فخرِ موجوداتؐ کے کمالات بھی اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ حضورؐ کا حلیہ شریف بھی منظوم صورت میں دست یاب ہے لیکن یہ کتاب سیرت پر نہیں ہے۔ محمد عبد الکریم قرشی (ولادت ۱۷ فروری ۱۸۵۷ء وفات ۱۹ ستمبر ۱۹۵۵ء) گجرات کے رہنے والے تھے، ان کے ۹ عدد رسالے ملتے ہیں، جن میں سے تین یعنی (۱) المیلاد فی ذکر المیلاد (۲) صلح نامہ حدیبیہ (۳) تاریخ فتح مکہ۔ جزوی طور پر سیرت پر ہیں۔ یہ تینوں رسالے منظوم ہیں۔

کملی والے کے تعلق سے تیسری کتاب، دائم اقبال کی تحریر کردہ "کمل پوش" ہے۔ اس سے پہلے حکیم عبد اللطیف عارف اور استاد ولایت امرتسری کی کتابوں کا ذکر آچکا ہے۔ دائم کی سیرت پر منظوم کتاب کا پورا نام "ختم الرسل عرف کمل پوش" ہے۔ دائم اقبال زندہ ہیں۔ وہ ۱۹۰۶ء میں موضع واسو نزد منڈی بہاء الدین ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کی کتاب سیرت لٹریچر میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ کتاب دو سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، سائز بڑا ہے، کاغذ گھٹیا۔ کتابت خراب اور پروف ریڈنگ کمزور۔ کتاب کو ایڈٹ کرنے کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ کہیں کہیں غیر متعلق واقعات بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔

حفیظ جالندھری مرحوم نے اردو میں شاہنامہ اسلام لکھا تو ان سے متاثر ہو کر غلام سرور کنجاہی نے حضورؐ کی سوانح عمری پنجابی میں منظوم کی۔ اس میں اسلام کے ابتدائی دور کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کا اسلوب نگارش پیر وارث شاہ کا ہے، یعنی بحر طویل ہے۔ غلام سرور کنجاہی کا "شاہنامہ اسلام" دو جلدوں میں دین محمدی پریس لاہور سے شائع ہوا۔

میاں محمد امرتسری کے بعد نثر کی دوسری کتاب ایم حبیب اللہ فاروقی نے ۱۹۴۲ء میں پنجابی آنرز کے طلبا و طالبات کے لیے تحریر کی۔ عنوان رکھا "نبیاں دا سردار" (نبیوں کا سردار) سیرت

اللہ پر پاکستان میں پنجابی نثر میں یہ پہلی کتاب تھی۔ اس کے کل اوراق ۱۵۲ تھے اور اس
دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ آج کل ناپید ہے۔ کتاب میں دو دیباچے چار پیش لفظ اور کئی
بار نعتیں اور نظمیں دی گئی ہیں، کہیں کہیں مواد مناظرانہ ہے۔ چونکہ کتاب طلباء و طالبات
کی ضروریات کے پیشِ نظر لکھی گئی ہے، اس لیے ادبی اور تحقیقی سطح دو سری ہے۔
سیرت رسول اللہ پر پنجابی نثر کی پاکستان میں دوسری کتاب عبدالکریم ثمر کی تصنیف کردہ ہے
۔ اس کے صفحات ۷۶ ہیں، ہر صفحے پر سیرت نگار کی حضورؐ سے محبت و شیفتگی اور عقیدت
ہے۔ ویسے تو سیرت رسول اللہ پر ہر کتاب اچھی ہے لیکن یہ کتاب "مسلمان تنبیہاں دا
یار" سے اسلوب نگارش اور مواد کی پیش کش میں مقابلتاً بہتر ہے۔ فقیر محمد فقیر (ولادت
۱۹۰۰ء، وفات ۱۱ستمبر ۱۹۷۴ء) کی تالیف "پنج ہادی" میں خیر الوریٰ، خیر البشر ختمی مرتبت
لانبیا حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر مواد دستیاب ہے۔ لیکن یہ کتاب کل طور پر جیسا کہ
ان سے ظاہر ہے حضورؐ کی سیرت پر نہیں ہے۔ نثر میں سیرت رسول اللہ پر مختصر جستہ جستہ کتابچہ
ملتا ہے۔

۱۹۸۲ء میں مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور میں نے پنجابی نثر میں کتاب بعنوان "...
میا" لکھی جو اسی سال تلات پبلشرز کوئٹہ نے شائع کی۔ اس کتاب کے کل صفحات
۔ کتاب کے آغاز میں پچاس صفحے کا مقالہ ہے جس کا عنوان ہے "پنجابی میں سیرت نگاری"
قالہ پہلے گیارہ اقساط میں روزنامہ "امروز" لاہور کے پنجابی سیکشن میں شائع ہوا اور پھر
کا ملخص کتاب "چن عربوں چڑھیا" میں دیا گیا۔ زیرِ نظر مضمون اسی ملخص کا ملخص ہے۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موضوع پر اردو یا پنجابی میں باقاعدہ کتاب شائع کی جائے۔

مسلم ثقافت ہندوستان میں

مولانا عبدالمجید سالک

اس کتاب میں بڑی وضاحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند کو گزشتہ ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔ مسلم ثقافت کی بنیادیں کن اصول و عقائد اور اقدار و معیارات پر قائم تھیں اور قدیم ہند کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح میں ان اصول و اقدار نے کتنا حصہ لیا۔ مسلم حکومتوں نے علم و تعلیم، صنعت و حرفت اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں کس قدر دریا دلی سے کام لیا اور ان کے عہد میں تہذیب و ثقافت کو کتنا فروغ ہوا۔ ہندو دھرم کے بنیادی عقائد کو اسلام نے کس طرح متاثر کیا، اور ان اثرات کی پیدا کردہ اصلاحی تحریکوں نے عوامی زندگی اور مقامی معاشرے پر کیا اثر ڈالا۔ مسلمانوں کا دورِ عروج ختم ہونے کے بعد تجدید و اصلاح کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئیں۔ شاہ ولی اللہ اور سید احمد خاں کی تحریکوں کے کیا کیا نتائج نکلے۔ اقبال نے مسلمانانِ ہند میں دینی و سیاسی بیداری پیدا کر کے کس منزل کی طرف ان کی رہنمائی کی اور قائدِ اعظم نے کس طرح مسلمانوں کو متحد و منظم کیا اور تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنا کر مسلم ثقافت کی تاریخ میں ایک نئے اور درخشاں باب کا آغاز کیا۔

صفحات ۱۱۷   قیمت ۴۵ روپے

تصوراتِ عرب قبلِ اسلام

عبیداللہ قدسی

اسلام سے قبل عرب، کن توہمات میں گرفتار تھے اور خالق و ارواح، زندگی و موت اور تہذیب و اخلاق کے متعلق ان کے کیا تصورات تھے۔ نیز یہودیت اور نصرانیت کا جزیرۂ عرب میں کہاں تک اثر تھا۔ اس کتاب میں انہی امور پر بحث کی گئی ہے۔

صفحات ۱۶۴   قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور ۳

میرزا عیسیٰ خان ترخان ثانی

مرزا عیسیٰ خان ترخان اس معتدر خاندان کا فرد ہے جو ارغونوں کے ساتھ مل کر ترکستان کی چھوٹی سی ریاست قندھار کے انتظام و انصرام حکومت میں شریک تھا۔ لیکن بابر بادشاہ کے متواتر حملوں سے دل برداشتہ ہو کر اور حکم بابری کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے نقل وطن پر مجبور ہوا۔ چوں کہ خاندان ترخان اور ارغون کی رگوں میں حکمرانی کا لہو دوڑ رہا تھا، لہذا سندھ میں، قندھار کے مفتوح کی حیثیت سے نہیں بلکہ فاتح سندھ بن کر داخل ہوئے۔ ابھی سندھ میں ارغونوں کی حکومت قائم ہوئے تینتیس سال ہوئے تھے کہ خاندانِ ترخان میں اسی سرزمین پر ۹۶۰ھ میں مرزا عیسیٰ خان پیدا ہوا۔ اس کی ولادت کے دو ہی سال بعد یعنی ۹۶۲ھ میں اس کے دادا مرزا عیسیٰ ترخان (اوّل) ٹھٹھہ کی حکومت پر قابض ہوا۔ اس نے اٹھارہ سال حکومت کرنے کے بعد ۹۸۰ھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹوں صالح، غالب، جان بابا اور مرزا باقی کے درمیان تخت نشینی کی جنگ ہوئی۔ اور مرزا باقی کو اس میں فتح حاصل ہوئی۔ جان بابا، مرزا عیسیٰ خان کا والد اسی جنگِ اقتدار میں لقمہ اجل بنا۔

ان حالات میں مرزا عیسیٰ ترخان اپنے ننھیال میں سیمچہ قبیلے کے ساتھ سکونت پذیر ہوا تاکہ مرزا باقی کی خون آشام حکومت سے محفوظ رہ سکے۔ لیکن کچھ عرصے بعد مرزا باقی نے خودکشی کرلی اور اس کی جگہ مرزا پائندہ بیگ اور اس کے بیٹے مرزا جان بیگ نے ٹھٹھہ کی حکومت سنبھالی، اگرچہ مرزا باقی کی موت نے مرزا عیسیٰ خان کی امنگ حکمرانی کو بڑھا ضرور دیا تھا، لیکن مرزا جان بیگ کی حکمت و سیاست نے اسے اس قدر نوازا کہ اس کا شوقِ حکمرانی مرزا جان بیگ کی عنایت و شفقت اور مہربانی کے بوجھ تلے دب گیا۔ "ترخان نامہ" کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ جب حکومت مرزا جانی بیگ کے ہاتھ آئی تو وہ اسے تسلی دے کر نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے زمانے میں ٹھٹھہ میں لے آیا۔

سید میر محمد لکھتے ہیں:

"و میرزا عیسیٰ ترخان بن جان بابا ترخان کہ از ملاحظہ میرزا محمد باقی در احتشام سیمچہ مختفی بود، بہزار

تملق و دلاسا با عزاز و اکرام در تحتہ آوردہ عمۂ خود را در حبالۂ نکاح او آوردہ و جاگیر و منصب مقرر نمود۔[1]

انہی وجوہ کی بنا مرزا عیسیٰ اپنے والد کے دعویٰ حکومت سے دست بردار ہو گیا حالانکہ اس دور پُر آشوب میں مغلوں کا حملہ بھی ہوا اور سندھ کی خود مختاری بھی متاثر ہوئی، کیونکہ مرزا جانی کے اکبر اعظم کے پاس جانے سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اب سندھ میں خود مختاری کی جنگ نہیں لڑی جائے گی بلکہ یہ بھی ہندوستان کے دیگر بارہ صوبوں کی طرح مزید تیرھواں صوبہ بنے گا۔

جب یہ واقعات رونما ہو رہے تھے، اس وقت مرزا عیسیٰ تمام پہلوؤں کا جائزہ لے رہا تھا اور منتظر تھا کہ شاید دستِ غیبی سے اس کے لیے بھی کوئی راہ نکل آئے، اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں جانی بیگ کا انتقال برہان پور میں ہوا اور ادھر مرزا عیسیٰ نے حکومت کی ہوس میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ خسرو خان چرکسی نے جو اس خاندانِ ترخان کا مستقل وکیل تھا، مرزا غازی کو باپ کا جانشین بنایا اور اس نے چاہا کہ مرزا عیسیٰ کو قید کر دے۔[2] لیکن مرزا عیسیٰ دوبارہ سیمجہ لوگوں میں چلا گیا اور قدرتِ الٰہی سے اس بات کا منتظر تھا کہ اس کے لیے بھی کوئی راہ نکل آئے۔ لیکن "ابو القاسم کے گرفتار اور اندھا ہونے کے بعد جان کے خوف سے وہ شہنشاہِ اکبر کے حضور میں چلا گیا تھا۔ وہاں وہ ملازموں کی فہرست میں داخل ہو کر طرح طرح کی خدمتیں بجا لانے لگا۔[3] مرزا فوری طور پر اکبر کے پاس نہیں گیا تھا بلکہ کچھ عرصہ اس نے سندھ میں گزارا اور تقریباً دس بارہ سال کی روپوشی کے بعد وہ اکبر اعظم کے پاس پہنچا تھا۔ مصنف ترخان نامہ لکھتے ہیں۔ "وہ جب ۱۰۱۲ھ میں اکبر بادشاہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا تو بادشاہ سلامت نے اس کے حال پر بہت زیادہ عنایت و مہربانی کی اور خلاف قاعدہ اس پر اتنی رعایت و شفقت کی کہ وہ امرا جو مملکت کے انتظامی امور میں شریک تھے، ان میں شامل کر لیا اور سو سوار کا منصب زیادہ کر دیا۔"[4] اکبر نے میرزا عیسیٰ خان کے منصب میں اس لیے اضافہ کیا تھا کہ اگر

---

[1] سید میر محمد بن سید جلال تتوی - ترخان نامہ، ص ۶۶

[2] صمصام الدولہ - ماثر الامرا جلد سوم، ص ۴۰۸، ۴۰۹

[3] میر علی شیر قانع ٹھٹھوی - تحفۃ الکرام، ص ۲۹۴

[4] ترخان نامہ - ص ۹۶

ضرورت پڑے تو یہ مغل منصب دار سندھ کا انتظام احسن طریقے سے سنبھال سکے، کیوں کہ اس وقت مرزا غازی، دربار اکبری میں آنے سے لیت و لعل کر رہا تھا۔ بالآخر غازی بیگ نے اپنی سپاہ کی قوت اور مغلوں کی طاقت کا موازنہ کرتے ہوئے دربار میں پیش ہونے کو ترجیح دی۔ جس وقت مرزا غازی بیگ نے اکبر سے شرفِ ملاقات حاصل کیا، اس وقت غازی بیگ کی عمر بمشکل بیس سال تھی۔ اکبر نے اس کے باپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اسے بھی شاہی عنایات سے نوازا اور ولایتِ سندھ اس کو دے دی۔ جبکہ جہاں گیر نے قندھار کی حکومت کا مزید اضافہ اپنے دور میں کیا اور اس طرح مرزا غازی سندھ اور قندھار کا صوبے دار بن گیا۔

مرزا عیسیٰ کے بارے میں مزید معلومات دورِ اکبری میں نہیں بلکہ عہدِ جہاں گیری میں ملتی ہیں۔ یوں تو اس نے اکبر سے منصب حاصل کرنے کے بعد یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ بھی دوسرے مغل امیروں سے صلاحیت میں کم نہیں، لیکن اصل خدمات جو اس نے انجام دیں وہ جہاں گیری اور شاہ جہانی دور سے متعلق ہیں۔ شیخ فرید بھکری لکھتے ہیں:۔ "حضرتِ جہاں گیری رسید و بمنصب فاخرہ رسیدہ تعینات دکن گشت[۵۵]" غالباً اسی علاقے کے بارے میں ترخان نامہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ بہت سے ارکانِ دولت اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوئے اور اس کو ان مقامات پر مقرر کروایا جہاں کے لوگ سخت زور آور تھے۔[۵۶]" تقریباً چھ سال تک وہ خان جہاں کے ساتھ وابستہ رہا اور دکن میں خدمات انجام دیں۔ "جب ۱۰۲۱ھ میں مرزا غازی کی خبر وفات پہنچی[۵۷]" تو اس وقت بھی مرزا کو یہیں سے طلب کیا گیا۔ اسی لیے شیخ فرید لکھتے ہیں:۔ "پس از فوت مرزا غازی بیگ در ہزار سال و بیست و یک ہجری بموجب فرمان طلب از دکن بحضور آمد۔[۵۸]" اس دفعہ خصوصی طور پر مرزا عیسیٰ اور میرزا رستم قندھاری، دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کے لیے دربار میں بلوائے گئے کیونکہ سندھ میں خسرو خاں چرکس نے اپنا اقتدار اس قدر بڑھا لیا تھا کہ بغیر بادشاہ کی مرضی معلوم کیے ایک شخص عبدالعلی کو نامزد کر کے خود حکمرانی کرنے لگا چونکہ

---

۵۵ شیخ فرید بھکری۔ ذخیرۃ الخوانین، ص۔۲۱۰

۵۶ ترخان نامہ، ص ۹۶، ۹۷

۵۷ محمد صالح کنبوہ۔ شاہ جہان نامہ، ص ۷۷

۵۸ ذخیرۃ الخوانین۔ ۲۱۰

یہ من مانی خلاف اقتدار اعلیٰ تھی لہٰذا جہاں گیر نے فوری طور پر میرزا عیسیٰ ترخان کو دکن سے طلب کیا تاکہ وہ ٹھٹھہ کے صوبے کا انتظام سنبھال لے۔ جہاں گیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے :

" میرزا عیسیٰ ترخان جو میرزا غازی کے رشتے داروں میں تھا اور دکن کے لشکر میں متعین تھا، میں نے اسے ٹھٹھہ بھیجنے کے خیال سے طلب کیا تھا۔ اس نے اسی تاریخ میں میری خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل کی، چونکہ وہ مہربانیوں اور نوازشوں کے قابل تھا، اس لیے میں نے اسے ہزاری ذات اور پانصد سوار کے منصب سے ممتاز کیا۔"[۹]

جہاں گیر نے یہاں بھی اس بات کا خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اس کو ٹھٹھہ بھیجنا چاہتا تھا، لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس کو بھیج دیا۔ اس کے برعکس اس کی توزک اس بات کی تائید کرتی ہے کہ مرزا غازی کے انتقال کے بعد مرزا رستم قندھاری کو ٹھٹھہ بھیجا، کیونکہ مرزا غازی کے انتقال کے وقت نہ تو مرزا رستم قندھاری دربار میں موجود تھا اور نہ میرزا عیسیٰ ترخان۔ لہٰذا ان دو میں سے کسی ایک کو سندھ اور قندھار کے علاقوں کی مناسبت سے بھیجنا تھا۔ جہاں گیر لکھتا ہے :

مجھے خیال آیا کہ اسے (میرزا رستم کو) ٹھٹھے کی حکومت پر بھیجوں تاکہ وہ وہاں اپنے ذاتی جوہر و قابلیت دکھا کر اچھے طریقے سے ملک کی حفاظت و نگرانی کرے، چنانچہ میں نے اسے پنج ہزاری ذات و سوار کے منصب سے سرفراز کر کے دو لاکھ روپیہ نقد بطور مدد خرچ کے دیے اور ٹھٹھے کی صوبے داری کے لیے روانہ کیا۔"[۱۰]

جہاں گیر تو اس سے اچھی توقعات لگائے بیٹھا اور ادھر اہلِ سندھ میرزا کے ظلم و ستم کا شکار تھے، اور دربار میں برابر اس کی کوئی نہ کوئی نئی شکایت آتی رہتی تھی۔ لہٰذا یہ شکایات اس کی برطرفی کا سبب بنیں، بلکہ کچھ عرصہ اسے " انی رائے سنگھ دلن" کی حراست میں بھی رہنا پڑا۔ اس طرح میرزا رستم ۱۰۲۱ھ سے ۱۰۲۳ھ تک سندھ میں بحیثیت صوبے دار رہا۔ لیکن جہاں گیری عہد کے مستند مورخ معتمد خان نے مرزا عیسیٰ کے بارے میں نہیں لکھا کہ کس وجہ سے اس کو ٹھٹھہ نہیں بھیجا گیا، اور نہ ہی توزکِ جہاں گیری میں اس کا کوئی حوالہ ملتا ہے۔ مگر " ترخان نامہ" اور " ذخیرۃ الخوانین" کے مصنفین نے

---

۹ نورالدین جہاں گیر بادشاہ۔ توزکِ جہاں گیری، ج دوم، ص ۳۷۰

۱۰ ایضاً۔ ص ۴۲۶

واضح طور پر میرزا عیسیٰ تئے امرا کے حسد و رقابت کو بیان کیا ہے۔ مصنف ترخان نامہ لکھتے ہیں: "جہاں گیر بادشاہ کے ایامِ حکومت میں مدار المہامی کا عہدہ اکثر کسی نہ کسی وسیلے سے ملتا تھا۔ لیکن عیسیٰ ترخاں نے یہ عہدہ بادشاہ سے بغیر کسی وسیلے کے حاصل کیا اور کسی کا وسیلہ تلاش نہ کیا۔ یہاں تک کہ بہت سے ارکانِ دولت اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے۔"[۱۱] گویا دربار میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو مرزا کی مخالفت نہایت شدت سے کرتا تھا اور بادشاہ اس گروہ سے اس قدر متاثر تھا کہ باوجود مرزا عیسیٰ کے بروقت دربار میں حاضری دینے کے اس کو ٹھٹھے نہیں بھیجا گیا۔ یہاں یہ واضح طور پر تو نہیں کہا جاسکتا کہ کون کون اشخاص اس کے مخالف تھے، البتہ سندھ کے حالات کا مکمل جائزہ لینے سے یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اس علاقے کی صوبے داری کے بہت سے لوگ امیدوار ہوں گے، کیوں کہ یہ علاقہ امن پسند باشندوں کا وطن تھا، جب کہ اس کے برعکس دکن اور بنگال میں آئے دن کی بغاوتیں کسی بھی صوبے دار کو چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔ پھر مرزا عیسیٰ کا تو یہ وطن تھا اور اس سے زیادہ خواہش کسی اور کو کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن مرزا رستم قندھاری کی بھی بالکل یہی حالت تھی، کیوں کہ اس کا وطن قندھار بھی اس دور میں سندھ کے صوبے سے متعلق تھا، اور جس طرح مرزا غازی کو سندھ اور قندھار کی حکومت ملی تھی، اس کی خواہش بھی یہی رہی ہوگی کہ اس کو بھی سندھ و قندھار ملیں گے۔ لیکن اس کی امیدوں کے برخلاف اسے صرف سندھ کا صوبے دار بنایا گیا، البتہ یہاں مرزا عیسیٰ ترخان کے اثرات ان سے زیادہ تھے۔ لہٰذا مرزا رستم کی صوبے داری کو ناکام بنانے کے لیے سندھ کے لوگوں نے طرح طرح کی شکایتیں دربار جہاں گیری میں پہنچائیں اور ان ہی شکایات کی بنا پر نہ صرف مرزا رستم کو ٹھٹھے کی صوبے داری سے معزول کیا گیا بلکہ کچھ عرصہ وہ رائے دلپ سنگھ کی حراست میں بھی رہا لیکن بے بنیاد شکایتوں کی تحقیقات کے بعد مرزا قندھاری کا عہدہ دوسرے صوبے میں بحال کر دیا گیا۔

انھی مذکورہ بالا واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ فرید بھکری لکھتے ہیں کہ بعض حاسد امرا نے بادشاہ سے عرض کیا کہ مرزا ایک زمانے سے اپنے موروثی ملک کی آرزو میں ہے، اگر اس نے مستقل طور سے قبضہ کر لیا اور کیچ و مکران اور سرحد کے حاکم سے جو قریب ہی ہے مدد حاصل کر کے بادشاہ عباس صفوی (والیِ

---

[۱۱] ترخان نامہ، ص ۹۶

ان) سے تعلق پیدا کرلیا تو اس کے تدارک میں بہت وقت لگے گا۔ بادشاہ نے بدگمان ہوکر مرزا رستم رھاری کو اس ملک کی حکومت پر مامور فرمادیا۔"[12] اس وقت مرزا عیسیٰ کا منصب دوہزاری ذات و دار تھا۔ بہرحال مرزا عیسیٰ کی تقدیر میں ٹھٹھے کا گورنر بننا منظور نہ تھا، لہٰذا وہ احکام جو اس کی صوبے داری کے تھے، منسوخ ہوئے اور اس کی جگہ تھوڑی سی جاگیر مرزا کی تالیفِ قلب کے لیے دے دی گئی۔

صمام الدولہ کے بیان کے مطابق اس کو "دھن پور" گجرات کی جاگیرداری ملی اور وہ اس صوبے میں مین ہوا۔[13] ۱۰۲۱-۲۲ھ کے بعد مرزا عیسیٰ ترخان کا ذکر ٹھٹھے کی گورنری کے ضمن میں دوبارہ ۱۷ ربیع الثانی ۱۰۶ھ/ ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کے آخری سنِ جلوس میں آتا ہے، جب کہ اقبال نامہ، شاہجہان نامہ، ذخیرۃ الخوانین مآثر الامرا کے مصنفین نے جہاں اس کے منصب میں چار ہزاری ذات اور دو ہزار پانچ سو سوار کا ذکر کیا ہے، وہاں کی ٹھٹھے کی صوبے داری کا بھی ذکر ہے، جو اس کو شاہ جہان نے دینی چاہی۔ محمد صالح کنبوہ ۱۷ ربیع الثانی ۲۶ دسمبر، ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء کے واقعات میں لکھتے ہیں۔ "مرزا عیسیٰ ترخان کو چار ہزاری ذات، ہزار پانچ سو سوار کا منصب اور ٹھٹھے کی صوبے داری عطا کرکے ادھر روانہ کیا۔"[14] کیوں کہ جہانگیر کے ری عہد میں شاہ جہان نے باغیانہ سرگرمیوں کا آغاز کردیا تھا اور وہ عمر کوٹ اور ٹھٹھہ وغیرہ کے راستے برات پہنچا تھا، لیکن گجرات کے صوبے دار سیف خاں نے شاہ جہان سے مقابلہ کیا اور شب خون بھی سے، جب کہ گجرات کے جاگیردار اور امرا شاہ جہان کے ساتھ تھے، ان میں مرزا عیسیٰ بھی تھا اور وہ سب بازی لے گیا اور وہ اس طرح کہ "بہ کمالِ خلوص و دانائی" گجرات کے صوبے دار سے پوچھے بغیر احمد آباد عیدگاہ میں صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ کا خطبہ پڑھوایا اور خود شاہ جہان سے ملنے احمد آباد ے تیس کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں میں قدم بوسی سے مشرف ہوا اور شاہ جہان بادشاہ کو دیگر امرا سے پہلے اس صوبے میں تھے، کورنش و مبارک باد پیش کی۔"[15] حالاں کہ اس وقت تک شاہ جہان کی تاج پوشی بھی

---

[12] ذخیرۃ الخوانین، ص ۲۱۱ — نیز بحوالہ مآثر الامرا، ص ۴۰۹

[13] مآثر الامرا۔ جلد سوم، ص ۴۰۹

[14] شاہجہان نامہ، جلد اوّل، ص ۲۵۲

[15] ترخان نامہ، ص ۹۷

نہ ہوئی تھی، اور تاج پوشی ہی کے جشن میں شرکت کرنے کے واسطے مرزا عیسٰی بھی ساتھ ساتھ تھا، لیکن راستے ہی میں ان کو ٹھٹھے کی صوبے داری پر نامزد کر دیا گیا۔ محمد صالح کنبوہ نے نامزدگی کے ان احکام کی دو ماہ بعد پھر تائید کرتے ہوئے لکھا ہے: یہ صوبہ (ٹھٹھہ) حسب فیصلہ مرزا عیسٰی ترخان کے نام رہا، جسے آپ نے گجرات سے ٹھٹھہ روانہ کیا۔[16]

تقریباً دو ماہ میں مرزا عیسٰی نے تیاری مکمل کی، اس کی اس تاخیر کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ گزشتہ احکام سے ایک مرتبہ دل برداشتہ ہو چکا تھا، جب کہ جہاں گیر نے نامزدگی بھی کی اور وہ ایک روز اس کے دربار میں حاضر بھی ہوا، لیکن کوئی امید افزا نتائج برآمد نہ ہوئے تھے۔ غالباً وہ اس بات سے واقف تھا کہ اس کے یہ احکام بھی دوبارہ منسوخ ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا، کیوں کہ جب وہ گجرات کی حدود کو پار کرنے ہی والا تھا کہ اس کے ہاتھ میں شاہی احکام تھما دیے گئے، جس کے مطابق اسے واپس بلوا لیا گیا تھا۔

مستند ماخذوں کے مطالعے سے تو یہی معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ اس کو واپس بلوا لیا گیا تھا اور وہ ٹھٹھے کی صوبے داری کا چارج بھی نہ لے پایا تھا، بلکہ یہ کہ مرزا عیسٰی ٹھٹھہ یا سندھ میں داخل ہی نہ ہوا تھا کیونکہ راستے ہی میں خواجہ باقی (مشیر خواجہ) کا انتقال ہو گیا تھا، جس نے اس کو واپسی کے احکام دیے تھے اور خود اپنی صوبے داری کا پروانہ دکھایا تھا۔ لیکن ترخان نامہ کے مصنف نے اس کے برعکس ایک اور ہی انداز اختیار کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ مرزا عیسٰی خان نہ صرف ٹھٹھے میں آیا بلکہ شریف الملک کو گرفتار بھی کیا۔[17] مصنف ترخان نامہ لکھتے ہیں۔ اس کو (ٹھٹھہ) کا صوبے دار بنا کر یہ حکم دیا کہ مرزا ٹھٹھہ جا کر شریف الملک کو پکڑ کر بادشاہ کے دربار میں بھیج دے، تاکہ وہ اپنے افعال و کردار شنیعہ کی سزا پا سکے، اور اگر وہ جنگ کرے تو اس کو جان سے مار دے۔[18] اس بیان کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ دوسری کتابوں میں نہیں ہے، لہٰذا قابلِ اعتماد بھی نہیں۔ ترخان نامہ کے اس بیان کی تائید اس طرح سے

---

[16] شاہ جہان نامہ۔ ص ۳۰۳

[17] ایضاً۔ ص ۲۵۲ — شریف الملک گکرالہ کا جاگیردار تھا، مرزا خسرو کی طرف سے اس نے شاہ جہان سے مقابلہ بھی کیا تھا، جب وہ سندھ میں داخل ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت گکرالہ کا علاقہ اوچ کے ساتھ اور گجرات کے ساتھ ہونے کی وجہ سے سندھ سے خود مختار تھا، غلام شاہ کلہوڑا کے عہد میں گکرالہ کا الحاق سندھ سے ہوا۔

[18] ترخان نامہ۔ ص ۹۸

ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے مرزا عیسیٰ نے گجرات کے اس علاقے کے شریف الملک یا شیر الملک کو قابو میں کیا ہو، اور جیسا کہ مصنف کا بیان ہے " شیر الملک جو خود بھی بہت بہادر اور دلیر تھا اور بہادروں اور دلیروں کا لشکر بھی رکھتا تھا، مقابلے پر آیا ہو، لیکن عیسیٰ خان بادشاہی لشکر اطراف و جوانب سے جمع کر کے اس کے مقابلے پر نکلا ہو اور سخت جنگ کے بعد اس کو گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا ہو"[۵۱] یہ تمام واقعات درست مان لیے جائیں تو یہ بات ثابت ہے کہ مغلوں کے دور میں ککرالہ کا علاقہ جو اوچ اور گجرات تھا، سندھ سے ملحق نہ تھا، بلکہ گجرات سے ملحق تھا۔

شاہ جہان نامہ نے مرزا عیسیٰ ترخان کے بارے میں تاریخ وار بھی لکھا ہے۔ پھر جب مصنف نے مرزا عیسیٰ کا ذکر کیا تو تاریخ بھی دی اور ان تاریخوں کے ہوتے ہوئے کسی غیر تاریخی تصنیف کو ماننا دشوار ہے۔ مصنف لکھتے ہیں۔ " مرزا عیسیٰ ترخان ٹھٹھے کی صوبے داری پر متعین ہوا تھا، لیکن ضرورت وقت کے تقاضے سے وہ صوبہ شیر خواجہ کے سپرد کر دیا گیا۔ مرزا عیسیٰ ترخان راستے سے واپس آگیا اور چار ہزاری ذات، تین ہزار سوار کے منصب پر سرفراز ہوا"[۵۲] جب جہاں گیر نے نامزدگی کے احکام منسوخ کیے تھے تو اس کی جگہ مرزا رستم قندھاری کو بھیجا تھا اور جب شاہ جہان نے احکام دے کر منسوخ کیے تو خواجہ باقی کو ٹھٹھہ بھیجا تھا، اور مرزا عیسیٰ اس دوران یعنی ۲۳ شعبان (۲۸ اپریل) ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء کو دربار میں پہنچ چکا تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ مرزا عیسیٰ کے احکام جو منسوخ ہو گئے تھے، وہ اس کو اپریل میں ملے جب کہ خواجہ باقی (شیر خواجہ) کے حق میں ٹھٹھے کی صوبیداری کے احکام ۲ رجب (۸ مارچ) ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء کو جاری ہوئے۔ اسی سن وار تاریخ کے حوالے سے محمد صالح لکھتے ہیں کہ خواجہ باقی خاں کو چار ہزاری ذات، ساڑھے تین ہزار سوار کا منصب، خلعت، خنجر مرصع، گھوڑا، علم اور نقارہ نیز صوبہ ٹھٹھہ کی صوبے داری عطا ہوئی۔[۵۳] گویا دوسری دفعہ ۲۶ دسمبر ۱۶۲۷ء سے ۸ مارچ ۱۶۲۸ء تک یعنی دو ماہ اور بارہ دن تک مرزا عیسیٰ ہی کے لیے ٹھٹھے کی صوبیداری کے احکام ہے لیکن اس قلیل عرصے میں مرزا عیسیٰ اپنے عہدے کا چارج نہ لے سکا۔

---

[۵۱] ترخان نامہ - ص ۹۸

[۵۲] شاہ جہان نامہ - ص ۲۶۶

[۵۳] ایضاً، ص ۲۶۸

سندھ کے نامور مؤرخ حسام الدین راشدی مرحوم نے مکلی نامہ کے حواشی میں لکھا ہے کہ "مرزا عیسیٰ کے تبادلے کا فرمان یکم رجب ۱۰۳۷ھ کو جاری ہوا، لیکن شیر خواجہ کے ٹھٹھے پہنچنے میں غالباً کچھ عرصہ لگا اور مرزا عیسیٰ نے اپنے تقرر سے نو ماہ بعد ربیع الاوّل ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء کو چارج دیا۔"[۲۳] حسام الدین راشدی صاحب نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ غالباً ان کی نظر سے شاہ جہان نامہ کے مذکورہ بالا سن نہیں گزرے تھے، لہٰذا ان سے یہ غلطی ہوئی۔ پھر یہ کہ شیر خواجہ نے اس سے اس عہدے کا چارج ہی نہیں لیا، کیوں کہ وہ خود راستے ہی میں فوت ہوگیا تھا۔ محمد صالح لکھتے ہیں۔ "۷ خرداد (۲۷ مئی ۱۶۲۸ء) کو میر حسام الدین انجو کو مرتضیٰ[۲۴] خان کا خطاب اور خنجر مرصع، ہاتھی اور پچاس ہزار روپیہ انعام عطا ہوا۔ اسے ترقی دے کر اس کا منصب چار ہزاری ذات، تین ہزار سوار مقرر ہوا)۔ ٹھٹھہ کی صوبہ داری عطا ہوئی، پہلے یہ عہدہ شیر خواجہ کو عطا ہوا تھا، لیکن وہ راستے ہی میں فوت ہوگیا تھا، لہٰذا یہ منصب اس کے حوالے ہوا۔"[۲۴]

بہر حال مرزا عیسیٰ خان یاس و بیم کی حالت میں دار الخلافہ واپس ہوا، اور اس کی خاطرداری اور دلجوئی کے لیے اس کو کچھ عرصہ دربار میں رکھا، پھر پانچویں سن جلوس شاہ جہان شعبان (مارچ) ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۲ء میں مرزا عیسیٰ ترخان کو خلعت گھوڑا اور اینچ پور کی جاگیرداری عطا ہوئی۔[۲۵] لیکن صمصام الدولہ کا بیان محمد صالح کنبوہ سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "مرزا (عیسیٰ) ناکام راستے سے واپس لوٹ آیا اور متھرا اور اس کے قرب و جوار کی جاگیرداری پر فائز ہوا۔"[۲۶] اصل کتاب کے مترجم نے اس سلسلے میں نوٹ دے کر معلومات میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ان کے مطابق "متھرا کے قریب اس کے نام پر ایک گاؤں عیسیٰ پور آج بھی موجود ہے۔"[۲۷] غالباً اس نے کئی جگہ مختلف آبادیاں بسائیں اور ویرانوں کو آبادی کی شکل میں تبدیل کیا۔ اس کی پہلی

---

۲۳ سید میر علی شیر قانع ٹھٹھوی — "مکلی نامہ" حواشی سید حسام الدین، ص ۲۹۷

۲۴ مرتضیٰ خاں انجو کا انتقال ٹھٹھے میں ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں ہوا، اسی سال امیر خاں صوبے دار ملتان کو صوبے دار ٹھٹھہ بنا کر بھیجا گیا۔ جامع مسجد ٹھٹھہ انہی کے عہد کی تعمیر ہے۔

۲۵ شاہ جہان نامہ، ص ۲۶۸.

۲۶ ایضاً، جلد اوّل، ص ۳۳۶

۲۷ ایضاً، ص ۳۱۰

۲۸ [illegible]، ص ۳۱۰

کوششیں انفرادی تھیں جس کا مقصد رفاہِ عامہ کے سلسلے کو تیز کرنا بھی تھا اور اس طرح بروقت سپاہیوں کی سہولتیں بھی حاصل کی جا سکتی تھیں، پھر یہ کہ ملک یا کم از کم اس صوبے کی پیداوار میں یہ مقامی لوگ باعث اضافہ بھی بنتے تھے۔ اس طرح ملک کو مزید خراج حاصل ہوتا تھا۔

مرزا عیسٰی کی تعریف میں سید جلال بخاری لکھتے ہیں۔ "وہ شخص بہت خلیق، علم دوست، حلیم و بردبار، صاحبِ ہمت و غیرت، قبیلہ پرور، سپاہیوں کا دوست اور ویرانوں کو آبادی میں تبدیل کرنے والا تھا"۔[۵۲۸]

مرزا نے بہ حیثیت منصب دار کے ہر کام بہ حسن و خوبی انجام دیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے بڑے سے بڑا منصب حاصل کیا۔ یہی نہیں، مرزا کی اولاد بھی بڑے بڑے منصبوں پر مرزا کی زندگی ہی میں فائز ہو گئی۔

تیرھویں سن جلوس شاہ جہانی میں ان کو "سرکار سورت کی فوج داری ملی"۔[۵۲۹] یکم جمادی الثانی ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء کو تیرھویں سال جلوس ہی کے موقع پر اس کے منصب میں ترقی ہوئی اور "ہزار سوار کی ترقی دے کر پنج ہزار ذات و سوار، ایک ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کے منصب پر سربلندی بخشی"۔[۵۳۰] اس وقت جب کہ وہ سورت کا صوبے دار تھا اس کی عمر نوے سال کی تھی اور اس بڑھاپے میں ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں اعظم خان کی جگہ گجرات کا صوبے دار مقرر فرمایا۔ اگرچہ اعظم خان نے سرکشوں کی تنبیہ بخوبی کی تھی لیکن گجرات کی رعایا کے ساتھ مناسب سلوک نہ کر سکا۔ مرزا عیسٰی کے سواروں (پانچ ہزار) میں سے ڈھائی ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ مقرر ہوئے۔[۵۳۱] گویا مرزا کو ہر اس جگہ بھیجا جاتا تھا جہاں یا تو سرکشی عروج پر ہوتا کہ سرکشوں کا سر نیچے کر سکے اور اگر رعایا بدحال ہے تو ان کو خوش حال بنا دے۔

مرزا نے گجرات آتے ہی عوام کے دل جیت لیے، تمام شورشیں آہستہ آہستہ دب گئیں اور پورے گجرات میں امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔ مرزا کو یہاں حکومت کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی، کیوں کہ مرزا عیسٰی یہاں بہت عرصہ تک رہا تھا، لہٰذا ان کا مزاج شناس ہو گیا تھا،

---

۵۲۸ ترخان نامہ، ص ۹۷
۵۲۹ ماثر الامرا، ص ۳۱۰
۵۳۰ شاہ جہان نامہ، ص ۲۵۵
۵۳۱ ایضاً، ص ۳۰۰

اس لیے رعیت کی مرضی کے مطابق تمام مسائل حل کیے، جونہی یہاں امن و امان قائم ہوا، جون ۱۶۴۴ء کو شاہی فرمان پہنچا جس کے مطابق "مرزا عیسٰی ترخان کو ڈھائی ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کی ترقی دے کر پنج ہزاری ذات، پانچ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب عطا فرمایا اور خلعت اور طلائی زین کا گھوڑا عنایت کرکے الہ آباد کو روانہ کیا۔"[۳۲] مرزا کی خدمات یہیں پر ختم نہیں ہوئیں۔ اس بڑھاپے میں بھی وہ جوانوں کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر الہ آباد سے قندھار کی طرف روانہ ہوگیا۔ غرض یہ کہ اس نے سورت اور الہ آباد سے لے کر قندھار تک چپے چپے کی خاک اپنے گھوڑے کے سموں سے ہر طرف بکھیر دی۔

جہاں تک قندھار کے قلعہ "ارک" کا تعلق ہے، اس کی تمام تر ذمے داری مرزا عیسٰی خان پر نہیں ڈالی جاسکتی، اس لیے کہ نہ تو وہ قلعے دار تھا اور نہ تن تنہا شہنشاہ ایران کا مقابلہ اس کے بس کی بات تھی، لہٰذا اس کی حفاظت وہ پوری طرح نہ کرسکا اور یہ قلعہ آخرکار شہنشاہ ایران کے حوالے کرنا پڑا، لیکن یہاں مرزا عیسٰی سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے "شاہ ایران سے گنج علی کے باغ میں ملاقات (بھی) کی۔"[۳۳] لیکن شہنشاہ شاہ جہان نے چشم پوشی سے کام لیتے ہوئے اس سے کوئی باز پرس نہیں کی، بلکہ سورت کی جاگیر حسبِ سابق برقرار رکھی۔

۱۳ محرم (۲۶ دسمبر ۱۶۵۱) کو مرزا عیسٰی ترخان کا انتقال ہوا۔ وہ جوناگڑھ سے بارگاہِ شاہی میں حاضر ہونے کے لیے آرہا تھا کہ راستے میں بمقام سانبھر فوت ہوگیا۔[۳۴]

جس طرح مرزا نے اپنی زندگی میں ویران جگہوں کو آباد کیا، علاقوں کو سرسبز و شاداب اور عوام الناس کو خوش حال کیا، اسی طرح اس نے اپنے آبائی قبرستان کی ویرانی کو ختم کرنے اور اہل مکلی کے قرب و جوار کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے اپنے ہی مقبرے کی تعمیر شروع کروادی۔ غالباً اس مردِ شہسوار کو اپنی موت کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی، اس کی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ اس صد سالہ

---

۳۲ شاہ جہان نامہ، ص ۳۳۹ ۳۳ ایضاً، ص ۵۴۰

۳۴ ایضاً، ص ۵۴۰ — ذخیرۃ الخوانین (ص ۲۱۲) کے مطابق اس کی عمر ۱۱۲ سال بنتی ہے اور مآثر الامرا کے مطابق سو سال سے زیادہ ہے، جب کہ مصنف "ترخان نامہ" لکھتے ہیں کہ "عمر شریفش نود و پنج سال بود" یعنی پنچانوے (۹۵) سال کی عمر پائی۔

بوڑھے کے ہاتھ میں تسبیح کی جگہ ہمیشہ گھوڑے کی باگ، تلوار یا مینا و جام یا گلفام ہوتی۔ یہ اس کی خوبی تھی کہ اس نے عیش و عشرت میں ڈوبے رہنے کے باوجود رشتۂ حیات کے منقطع ہونے کے دن کو ہمیشہ یاد رکھا۔ کہتے ہیں (درگاہ کے لیے) پتھر اس نے خود اسی علاقے سے بھیجے تھے اور وہ اٹھارہ سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس پر خرچ موضع لورائی کی آمدنی سے ہوا تھا، جو اس کے بزرگوں کی قبروں کے اخراجات کے لیے وقف تھا۔[۳۵] میر علی شیر قانع نے اس علاقے کا نام نہیں دیا جہاں سے یہ پتھر دیا گیا تھا۔ لیکن پاکستان کے ماہرین آثارِ قدیمہ کی نظر میں یہ پتھر جھنگ (علاقہ سندھ) سے بھیجا گیا۔ آج بھی اس کی مرمت کے لیے یہیں کا پتھر استعمال کیا جاتا ہے، تاکہ مقبرے کی قدامت جدیدیت کی آمیزش کے باوجود برقرار رہے، جب کہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اس مقبرے کے پتھر خود مرزا عیسیٰ نے کاٹھیاواڑ (گجرات) سے بھیجے تھے اور غالباً ۱۶۴۲ء میں بھیجنے شروع کیے اور اسی سال مقبرے کی تعمیر بھی شروع ہو گئی، اس طرح تقریباً ۹ سال کے عرصے میں یہ مقبرہ تکمیل کی حالت کو پہنچا۔ کہتے ہیں اس درگاہ (خانقاہ) کے دوران تعمیر ہی مرزا وفات پا گیا اور اس کے عمال نے اس کی مزید تعمیر روک دی۔[۳۶] ورنہ مرزا کا خیال تھا کہ بڑے نشیمن کے سامنے چاروں طرف قابلِ دید نشیمن ایک دوسرے کے جواب میں تعمیر کرائے جائیں۔

اس مقبرے کو اگر ذرا دور سے دیکھا جائے تو ہندی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے، لیکن جونہی قریب جائیں تو ہندی مسلم فنِ تعمیر کی حسین آمیزش نظر آتی ہے، کیوں کہ اس کے ستون ہندی اثرات کے حامل ہیں اور محرابیں مسلم فنِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔ مقبرے پر ایک طرف عربی اور فارسی رسم الخط کی تحریریں ہیں اور دوسری طرف کنول کے پھول ہیں۔ مقبرے کی مینت کاری، اینٹوں پر تراشے ہوئے مختلف ڈیزائن اور اس کے وقار کو دیکھ کر بہت سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہی گمان کرتے ہیں کہ یہ سندھ کے حاکم یا صوبے دار کا مقبرہ ہے۔

۳۵۔ تحفۃ الکرام۔ ص ۲۹۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۹۵

مولانا سعید الرحمٰن علوی

مولانا قاری محمد طیب

دارالعلوم دیوبند کے ساتویں مہتمم (چانسلر) مولانا محمد طیب قاسمی ۶ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ (۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء) کو دیوبند میں انتقال فرماگئے۔ اس مشہور عالم قصبے کے قبرستان قاسمی میں ہی آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ مولانا عامر عثمانی مرحوم مدیر تجلی دیوبند اس مدرسے کے متعلق کہا کرتے تھے کہ "یہ ہمارا تاج محل ہے اور یہ ہماری موتی مسجد ہے۔" نیز ان کا کہنا تھا کہ "اگر بزرگانِ دین دارالعلوم دیوبند کی بنیاد نہ ڈالتے تو دین ہندوستان میں بیگانہ اور اجنبی بن کر رہ جاتا۔"[1]

برعظیم میں مسلمانوں کی عظمت کا محل انہی کی بے اتفاقی اور غیروں کی بے دردی کے سبب ۱۸۵۷ء میں زمین بوس ہوا تو اسے از سرِ نو تعمیر کرنے کی غرض سے جو لوگ میدانِ عمل میں آئے جو اب تک بدیسی حکمرانوں سے باقاعدہ عملی میدان میں نبرد آزما تھے۔ ان اساطینِ ملت کا شجرۂ علمی و روحانی حضرت الامام ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ سے ملتا تھا۔ اب کے ان حضرات نے توپ و تفنگ کے بجائے شہری آبادیوں سے بہت دور اس چھوٹے سے قصبے دیوبند میں ایک مکتب کی بنیاد ڈالی جو دراصل ایک علمی تحریک تھی — ایک دانشور نے اس مدرسہ و تحریکِ علمی کو "برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ اور اسلامی تعلیم و ثقافت اور ملت کی نشاۃِ ثانیہ کا سرچشمہ" قرار دیا۔ تو دوسرے نے "۱۸۵۷ء کے بعد ملک و ملت کی نشاۃِ ثانیہ کا مظہر" لکھا۔ اس کے اصل محرک و قائد قاری محمد طیب صاحب کے جدِ امجد مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔

حضرت قاری صاحب اس عظیم ادارے کے ہی سند یافتہ تھے اور اسی کی خدمت کے لیے ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں بطور نائب مہتمم اور پھر ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں بطور مہتمم ان کا تقرر ہوا۔ مرحوم کی یہ تقرری مجلسِ شوریٰ نے کی جو ہر دور میں اس ادارے کا با اختیار ادارہ رہی اور اب بھی اس کی وہی حیثیت ہے۔ وفات سے سال ڈیڑھ سال قبل وہ اس منصب سے مستعفی ہوئے۔ اس طرح انھوں نے مجموعی طور پر اس ادارے کی ساٹھ برس

---

[1] تجلی، اشاعت خاص ص ۹۹ — ماہ اپریل ۱۹۸۰

کے قریب خدمت کی جو ایک ریکارڈ ہے۔ مرحوم سید محبوب رضوی صاحب تاریخ دارالعلوم میں ان کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب آپ نے اہتمام کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے، اب ۲۳ ہیں۔ جب سالانہ آمدنی پچاس ہزار کچھ روپے تھی، اب ۲۶ لاکھ ہے۔[۵۲] (یہ تحریر ۱۹۷۸ کی ہے لیکن اب سالانہ بجٹ ۴۷ لاکھ ہے)۔ اس سے آگے ان عمارات کی تفصیل ہے جو مرحوم کے زمانے میں تعمیر ہوئیں، ان میں دارالتفسیر، دارالافتا، دارالقرآن، مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، مسجد کا بالائی حصہ باب الظاہر (منسوب بہ ظاہر شاہ افغان حکمران)، جامعہ طبیہ جدید، دو منزلہ دارالاقامہ، مہمان خانہ، وسیع اور عظیم الشان کتب خانہ، مزید جدید دارالاقامہ، افریقی منزل، درس گاہیں اور مسجد چھتہ (جس سے مدرسہ شروع ہوا) نیز اس سے ملحقہ درس گاہوں کی تعمیر و مرمت۔"

حقیقت یہ ہے کہ تعمیرات کے اعتبار سے قاری صاحب کا دور انتہائی شاندار دور تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دورِ اہتمام میں تعمیرات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ علمی طور پر دارالعلوم دیوبند کا یہ دور بھی بڑا پُرشکوہ ہے۔ دنیائے اسلام میں اس علمی تحریک کا تعارف نیز بین الاقوامی محافل علمی میں علما کی مؤثر و بھرپور نمائندگی کا سہرا بھی قاری صاحب کے سر ہے۔

آپ جب نائب مہتمم تھے تو اس وقت مدرسے کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری تھے جن کے درس حدیث کو سن کر علامہ سید رشید رضا مصری نے بھی تحسین کے کلمات کہے تھے۔ قاری صاحب خود بھی حضرت شاہ صاحب کے شاگرد تھے، مدرسۂ دیوبند کے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن بانی تحریک ریشمی رومال نے ۱۹۱۵ء میں جب حجاز مقدس کا سفر کیا تو یہ سال قاری صاحب اور ان کے رفقائے گرامی (جن میں مولانا غلام غوث ہزاروی بھی تھے) کی فراغت کا سال تھا، لیکن شیخ الہند کے سفر کے سبب ان سب حضرات نے شاہ صاحب سے استفادہ کیا، گویا آپ حضرت شاہ صاحب کے سالِ اول کے شاگرد تھے۔ اساتذہ کی موجودگی میں چند سال نائب مہتمم کے طور پر بھی آپ کو کام کرنے کا موقع ملا، پھر جب اہتمام کا وقت آیا تو مولانا سید حسین احمد مدنی کا دورِ صدارت تھا

---

۵۲ تاریخ دارالعلوم۔ ج ۲، ص ۲۳۶

جنھوں نے پینتیس سال مدرسے کی خدمت کی۔ ان کے بعد مولانا سید فخر الدین احمد، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا فخر الحسن مراد آبادی، مولانا شریف حسن، مولانا نصیر احمد خان صاحب، شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے اور اس پورے عرصے میں قاری صاحب مہتمم تھے۔

۱۹۳۴ء میں (نائب مہتمم ہونے کے زمانے میں) آپ نے حجاز مقدس کا ایک سفر ایک محترم و مؤقر وفد کے سربراہ کے طور پر کیا۔ سلطان ابن سعود رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس خاص میں اس نمائندہ وفد کے قائد کے طور پر آپ نے جو تقریر فرمائی وہ برعظیم میں علما کی شاندار خدمات کی بہترین عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ قاری صاحب کی ذہانت اور علمی بصیرت کی غماز تھی جس کا سلطان مرحوم نے زبردست اثر قبول کیا۔

۱۹۳۹ء میں آپ نے افغانستان کا سفر اختیار فرمایا جس کی ایک مستقل داستان ہے۔ افغانستان کے ساتھ اس تحریک علمی سے وابستہ علما کے تعلقات تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ایک قریبی عزیز مولانا منصور انصاری (مصنف انواع الاوّل) اور مولانا عبید اللہ سندھی جیسے حضرات شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریکِ حریت کے نمائندوں کے طور پر وہاں کام کر چکے تھے، مولانا انصاری کا انتقال بھی وہیں ہوا تھا۔ خود افغانستان کے متعدد علما دیوبند کے فیض یافتہ تھے، اس لیے جب قاری صاحب وہاں تشریف لے گئے تو ایک شاہی مہمان کے طور پر ان کی پذیرائی ہوئی۔

پھر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان مصر کے زعیم جمال عبد الناصر مرحوم نے ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے نام سے جو مؤتمر قائم کی، اس میں برعظیم کے جن علما نے شرکت کر کے گہرے اثرات چھوڑے، ان میں قاری صاحب کے ساتھ مولانا مدنی کے صاحبزادے مولانا سید اسعد مدنی، مولانا سید محمد یوسف بنوری، مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا مفتی محمود کے نام قابلِ ذکر ہیں — علاوہ ازیں برما، جنوبی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، مڈغاسکر، حبشہ، انگلینڈ، فرانس، مغربی جرمنی اور آخر میں امریکہ میں آپ نے متعدد دعوتی اور تبلیغی سفر اختیار فرمائے، جن کی روداد یں سن کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان مبلغین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

رہا پاکستان تو وہ ایک طرح سے آپ کا گھر تھا۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے ابتدا ہی سے بیعت و تربیت کا تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بعد یہ تعلق مولانا اشرف علی تھانوی سے قائم ہوا۔ انھی سے آپ مجاز تھے۔ مجاز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی افکار کی آپ پر گہری چھاپ تھی اور

آپ تحریک پاکستان اور تقسیم ملک کے زبردست مؤید و ترجمان تھے، اسی لیے تقسیم کے بعد آپ ہندوستان سے بوریا بستر سمیٹ کر پاکستان چلے آئے اور یہاں مستقل قیام کا ارادہ فرما لیا، لیکن مولانا حسین احمد مدنی کے اصرار پر اپنے دادا جان کے چمن کی رکھوالی کے لیے واپسی اختیار فرمائی۔ واپسی کے ضمن میں انڈین گورنمنٹ کی طرف سے حائل رکاوٹوں کو دور کرانے میں مولانا مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مؤثر کردار ادا کیا، اور جب قاری صاحب واپس تشریف لے گئے تو تمام اساتذہ و ملازمان مدرسہ نیز طالب علم برادری اور شہر کے بے شمار افراد نے سٹیشن پر مولانا مدنی کی قیادت میں آپ کو خوش آمدید کہا۔ استقبالیہ جلسہ مسجد میں ہوا، مولانا مدنی نے استقبالی تقریر میں یہ شعر پڑھ کر سارے مجمع کو تڑپا دیا ؎

اے تماشہ گاہِ عالم روئے تو　　　تو کجا بہر تماشہ می روی

قاری صاحب کے برادر اصغر مولانا قاری محمد طاہر مرحوم کا خاندان پاکستان میں ہے اور خود آپ کے ایک داماد یہاں ہیں، نیز سیکڑوں دینی مدارس، ہزاروں علما اور لاکھوں طلبا آپ کا وہ قبیلہ ہے جنھیں آپ کبھی فراموش نہیں فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصے تک یہاں کے متعدد مدارس کے جلسوں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے رہے۔ دستار بندی اور تقسیم اسناد آپ کے ہاتھوں ہوتی رہی۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں سیرت کانفرنس کے کئی اجلاسوں میں بطور سرکاری مہمان آپ کی آمد ہوئی اور یہاں آپ کی تقاریر و مقالات بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنے گئے۔

ہندوستان کا کوئی کونہ ایسا نہ تھا جہاں آپ دعوت و تبلیغ اور مدرسے کی ضروریات کے لیے تشریف نہ لے گئے ہوں اور اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ علی گڑھ یونیورسٹی ہو یا جامعہ ملیہ دہلی یا دوسرے اس نوع کے عصری تعلیم کے ادارے، مہمان خصوصی کی حیثیت سے ان کی تقاریب میں قاری صاحب کی شرکت ضروری ہوتی۔

علی گڑھ میں ایک مرتبہ "سائنس اور اسلام" کے موضوع پر اچانک آپ کی تقریر کا اعلان ہوا۔ ان سطور کے راقم نے پاکستان کے ایک سفر میں براہ راست آپ سے سنا کہ سٹیج تک پہنچتے پہنچتے بھی اس قسم کے عنوان کا اشارہ تک نہ تھا۔ اب جو اعلان ہوا تو پسینے چھوٹ گئے کہ اس درسگاہ کے اساتذہ و طلبہ کی موجودگی میں اس موضوع پر کیا تقریر کروں گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا کرم کیا کہ ایسی تقریر ہوئی کہ [illegible] کی جا سکی۔ یہ تقریر [illegible] سے چھپ کر [illegible] تعدد [illegible] شائع ہوئی [illegible]

ہے۔ اس قسم کے آپ کے دورے علمی دنیا میں زبردست انقلابات کا باعث بنتے اور ایک زمانہ بوریہ نشین حضرات کی عظمتوں کا معترف ہوتا — مدرسہ دیوبند میں مختلف تعلیمی شعبوں کی از سرِ نو تنظیم، شعبۂ تصنیف و تالیف کا قیام، کتب خانے کا نظم اور بین الاقوامی وفود کو یہاں کے کام سے متعارف کرانا، نیز مختلف زبانوں پہ لٹریچر تیار کرنا جیسے متعدد کام آپ کے عہدِ زریں کی یادگار ہیں۔

آپ کی زندگی کا آخری کارنامہ مارچ ۱۹۸۰ کا وہ عظیم اجتماع ہے جو دیوبند کی سرزمین پر منعقد ہوا۔ مبالغہ سے بچ کر نہایت احتیاط اور دیانت داری سے کہا جائے تو اس میں ۲۰ لاکھ سے زائد انسانوں کا ہجوم تھا۔ اس اجتماع میں ہندوستانی وزیرِ اعظم اور وہاں کی اپوزیشن کی مشہور شخصیات بھی شامل تھیں، جن میں حزبِ مخالف کے لیڈر جگ جیون رام بھی شریک تھے۔ ادھر ہندوستان بھر کے علما، صلحا، شعرا و ادبا کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ ہزاروں علما و عوام پاکستان سے گئے تھے۔ علاوہ ازیں سعودی عرب اور مصر سمیت تمام عرب ممالک اور امریکہ، روس، چائنا، انگلینڈ اور کئی یورپین ممالک، افریقی ممالک، ایشیائی ممالک غرض کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کے علما اور دین دار عوام نہ آئے ہوں۔ بعض یورپین، افریقی اور ممالک کے لوگ مستقل طیارے لے کر آئے۔

محرم ۱۳۱۵ (جون ۱۸۹۷) آپ کا سالِ پیدائش ہے۔ گویا آپ قمری حساب سے ۸۸ برس اور شمسی حساب سے ۸۶ برس اس دنیا میں موجود رہے۔ تذکرہ نگاروں کے بقول مظفر الدین تاریخی نام ہے جو ان کی خدمات دینی کے اعتبار سے ایک غیبی اشارہ کہنا چاہیے۔ عرفی نام محمد طیب تھا، یہی مشہور ہوا، تاہم قرأت قرآن کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو مقام بخشا تھا اس کے پیشِ نظر قاری صاحب گویا آپ کے نام کا لازمی حصہ بلکہ اصل نام سے زیادہ معروف ہو گیا۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ نے مکتب دیوبند کے شعبۂ حفظِ قرآن میں داخلہ لیا۔ قدیم رسم کے مطابق تقریب مکتب نشینی و بسم اللہ بڑے اہتمام سے ہوئی جس میں اس دور کے دیوبند کے جملہ شیوخ و اساتذہ نے شریک ہو کر اس فرزندِ عزیز کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے والدِ بزرگوار مولانا فضل الرحمن نے ایک رباعی اس موقع پر ارشاد فرمائی جس سے مکتب نشینی کی تاریخ بھی برآمد ہوتی ہے۔

جشنِ مکتب طیب کی مبارک تقریب — کہ نئی طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر
رب یسر جو کہا اس نے تو بیر دیئے ا تا — فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

ایک محسن و مربی نے جس محبت سے تمم بالخیر کہا اور باقی سب نے آمین کہی، اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ ۱سال میں کلام مجید حفظ ہوگیا۔ پھر قدیم فارسی نصاب بڑے اہتمام سے ۵ سال میں پورا کیا، اس کے بعد درجۂ عربی میں داخل ہوکر ۱۳۳۷ھ میں تکمیل فرمائی ــــ مدرسے کی روایات اور خاندانی اثرات نیز ذاتی ذوق کی بنا پر آپ نے تدریس کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنایا اور اہتمام کے زمانے میں بھی طویل عرصے تک بڑے اہتمام سے تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ تاہم آخری چند سال جب ضعف بڑھ گیا اور امور مدرسہ وسعت پذیر ہوگئے تو اس سے آپ دست کش ہوگئے۔ لیکن دعوت و تبلیغ اور علمی مجالس و محافل کا سلسلہ دم واپسیں تک جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطالعہ کا نہایت بلند ذوق عطا فرمایا تھا، دوران سفر بھی یہ شغل جاری رہتا اور پھر جہاں بیٹھتے، علم و فضل کے موتی بکھیرتے۔ احقر کے والد بزرگوار مولانا محمد ... نے دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی کے جلسے کے موقع پر (جس کا سال اب ذہن میں نہیں) قاری صاحب سے حضرت امام شافعی قدس سرہٗ کی مشہور رباعی۔ علی ثیاب لو یباع انھا الخ اپنے قلم سے لکھ کر عنایت فرمانے کی درخواست کی تو آپ نے فوراً کاغذ قلم ہاتھ میں لیا، لیکن اسی وقت بتی بند ہوگئی۔ اندھیرے ہی میں آپ نے رباعی لکھ ڈالی، خط نہایت خوب صورت اور پاکیزہ تھا۔ یہ رباعی والد صاحب کے ذخیرۂ کاغذات میں بطور تبرک موجود ہے۔ احقر نے چند بار آپ کی زیارت کی، ملاقات کا شرف حاصل کیا اور خدمت کی سعادت حاصل کی۔ یاد پڑتا ہے کہ پہلی زیارت و ملاقات ۱۹۵۸ء میں ہوئی، جب کہ احقر اپنے محسن و بزرگ بھائی مولانا عزیز الرحمٰن خورشید کے ہمراہ ملتان کی مشہور دینی درس گاہ خیر المدارس کا طالب علم تھا۔ استاذ مکرم مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مہتمم و منتظم تھے۔ قاری صاحب کے ساتھ آپ کے مراسم بہت گہرے تھے۔ قاری صاحب کی ایک صاحب زادی ان دنوں ڈیرہ غازی خان میں تھیں، ان سے ملاقات کی غرض سے آپ نے سفر فرمایا، شہر میں آنے کی اجازت نہ تھی، اس لیے مولانا خیر محمد اور جملہ اساتذہ و طلبا اسٹیشن پر گئے۔ ملتان کی گرمی، دوپہر کا وقت، لیکن حضرت قاری صاحب انتظار گاہ سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر آگئے۔ چادریں بچھادی گئیں اور سب لوگ بیٹھ گئے۔ ہمارے مہتمم صاحب نے حضرت قاری صاحب سے قرأت قرآن کی درخواست کی تو آپ نے سفر کی تکان کے سبب اپنے برادرزادے قاری زاہر القاسمی صاحب کو تلاوت کا حکم دیا۔ ان کے بعد ظہر کی نماز آپ کی اقتدا میں پڑھی گئی۔ مسافر ہونے کے سبب آپ نے دوگانہ پڑھا۔ ہم نے باقی نماز پوری کی۔ یہ مختصر لیکن روح آفریں ملاقات سب سے پہلے ہوئی۔

دوسری ملاقات وزیارت اور اس کے ساتھ خدمت کی سعادت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی کے مدرسہ سراج العلوم سرگودھا میں نصیب ہوئی ۔ یہ اغلباً ۱۹۶۳ء کا سال تھا ۔ حضرت قاری صاحب دو ماہ سے زائد عرصہ پاکستان رہے ۔ اکثر شہروں میں تشریف لے گئے اور مواعظ وتقاریر کا سلسلہ جاری رہا ۔ مولانا مفتی محمد شفیع سے مرحوم کے بہت گہرے مراسم تھے ، دونوں مولانا انور شاہ کے شاگرد تھے ۔ قیام پاکستان سے قبل مولانا محمد شفیع نے اپنے آبائی قصبہ گنجیال تحصیل قائد آباد ضلع خوشاب میں مدرسہ قائم کیا تو اس کی افتتاحی تقریب میں مولانا مدنی ، قاری صاحب ، مولانا اعزاز علی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب جیسے اکابر بلائے گئے ۔ اسی موقع پر شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ قاری طیب نہیں بولتے ، مولانا نانوتوی کی روح بولتی ہے ، اور یہ کہ میں ان کی ایک تقریر سن کر اس سے کئی تقریریں بنا لیتا ہوں ۔ اب کے سرگودھا میں قاری صاحب انہی کے مہمان تھے ۔ بلاک ۲ کی مسجد سے متصل ایک عزیز کے مکان میں رہائش کا انتظام تھا ۔ قاری صاحب کے برادر نسبتی بلاک ۱۹ میں مقیم تھے اور ہمدرد دواخانہ کی سرگودھا شاخ سے متعلق تھے ۔ اس سفر میں آپ کی اہلیہ ہمراہ تھیں جو اپنے بھائی کے گھر مقیم تھیں ۔ چند طلبا کو جنہیں مرحوم کی خدمت کے لیے نامزد کیا گیا ، ہم دونوں بھائی بھی ان میں شامل تھے ۔ یہ حضرت مفتی صاحب کا ہم پر خاص کرم تھا ۔ دس دن حضرت قاری صاحب کی خدمت کا موقع ملا ۔ دن بھر اور رات گئے علمی محافل ومجالس ہوتیں ، مطالعہ اور علمی مسائل زیر بحث آتے ، اکابر واسلاف کے سبق آموز واقعات سنائے جاتے ۔ نفاست وصفائی قاری صاحب کا لازمہ تھیں ۔ خوراک برائے نام ۔ البتہ دیوبند کی مناسبت سے آموں کے رسیا ۔ چال میں وقار ، نشست میں توازن واعتدال ۔ ہنسنے یا کھلانے کا قصہ نہ تھا ۔ الغرض علو اخلاق ، تواضع ، شرم وحیا کا ایک پیکر ہم نے دیکھا ۔

ایک شب لوگوں کے اصرار سے جلسۂ عام ہوا ۔ سرگودھا کی تاریخ میں چند خاص جلسوں میں سے یہ جلسہ تھا ، حاضری کتنی کہ کوئی حساب نہ تھا ۔ ۲½ گھنٹے کی تقریر میں با نعرہ ملانا یا اس قسم کی حرکات کرنا جو موجودہ مبلغین کا شیوہ ہے نام کو نہ تھیں ۔ تسلسل اور روانی ایسی کہ ندی بہہ رہی ہے ۔ علمائے دیوبند سے شدید اختلاف رکھنے والے عناصر اور ان کے مذہبی رہنماؤں کی ایک بڑی جماعت جلسے میں موجود تھی ، سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔

اس کے علاوہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور جامعہ اشرفیہ لاہور ، نیز انجمن خدام الدین شیرانوالہ لاہور

میں متعدد مرتبہ ان کی زیارت و ملاقات کا موقع ملا۔ آخری ملاقات مارچ ۱۹۸۰ میں دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ اجتماع صد سالہ کی فقید المثال تقریب میں ہم لوگ بھی شریک ہوئے۔ ایک دن قبل وہاں پہنچ گئے۔ قاری صاحب بہت نڈھال ہو چکے تھے، لیکن ہر معاملے کی دیکھ بھال کے لیے ذاتی طور پر سرگرم عمل تھے مولانا حسین احمد مدنی کے مکان کے سامنے مصافحہ ہوا۔ عرب مسلمانوں کی طرف جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دفتر اہتمام میں حاضری ہوئی۔ برادرم خورشید صاحب کے علاوہ مدیر "الرشید" لاہور مولانا عبدالرشید ارشد اور دوسرے احباب ہمراہ تھے۔ دیوبند سے متعلق مولانا ظفر علی خان مرحوم کی مشہور نظم

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند

مشہور خطاط سید نفیس شاہ صاحب سے لکھوا کر اور خوب صورت آرٹ پیپر پر کئی ہزار چھپوا کر ہم بطور ہدیہ ساتھ لے گئے تھے، وہ پیش کی۔ خدام الدین کے بعض پرچے جن میں دارالعلوم سے متعلق مضامین تھے پیش کیے۔ بے حد خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ مختلف حضرات کے سلام پہنچائے، اور آپ نے ان کی خیریت دریافت کی اور بار بار معذرت کی کہ ہم آپ کی صحیح خدمت نہ کر سکے، نہ خاطر خواہ انتظام ہو سکا۔ اس معذرت میں رواتی کسر نفسی نہ تھی، یہ ان کی قلبی آواز تھی، جس نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ اجتماع سے فارغ ہو کر ہم دہلی وغیرہ چلے گئے۔ واپسی پر چند گھنٹوں کے لیے پھر دیوبند آئے۔ مرحوم کے مکان پر حاضری دی۔ احباب کا مجمع تھا اور قاری صاحب میر محفل۔ ہر ایک خوش تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اجتماع کو کامیاب فرمایا۔ قاری صاحب سراپا عجز اللہ تعالیٰ کی حمد میں مصروف اور بار بار مہمانوں سے معذرت میں مشغول کہ ہم خاطر خواہ انتظام نہ کر سکے۔

واپسی ہوئی تو ہمیں آخری کھانا مولانا سید حسین احمد مدنی کے قدیم مکان پر اور انہی کے دستر خوان پر صاحبزادہ گرامی مولانا محمد ارشد کے ساتھ نصیب ہوا۔ اس کے بعد آں مخدوم کی زیارت نہ ہوئی۔ بلکہ وہاں اختلاف سے متعلق خبریں آنے لگیں جن کے سبب از حد پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی دورِ کشمکش میں مرحوم نے رضا کارانہ استعفےٰ کے ذریعے اپنے آپ کو دیوبند کے نظم سے الگ کر لیا اور صحت جو پوری طرح ہل چکی تھی، اس کی بحالی کے لیے بمبئی اور بعد میں اپنے نواسوں کے پاس امریکہ قیام پذیر رہے۔ واپسی پر اطمینان تھا، لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ اطمینان عارضی ہے۔ چنانچہ تکلیف کے اشتداد کے پیشِ نظر دو مرتبہ دہلی ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔ بالآخر موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

میں نے اپنے اساتذہ، شیوخ اور دوسرے علما و صلحا سے موصوف کے لیے ہمیشہ اونچے کلمات سنے جس سے، ان کی عظمت روز بروز میرے دل میں بڑھتی چلی گئی۔ یہ قصہ میرے سامنے کا ہے کہ مولانا عبید اللہ انور جو ان کے شاگرد ہیں، ان سے ملنے گئے تو قاری صاحب نے بڑے تپاک سے ان کو گلے لگایا اور فرمایا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے تعلق سے آپ تو ہمارے مخدوم ہیں اور خود ہی بتلایا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب اللہ صاحب کے ساتھ پڑھنے کی غرض سے جب آپ کو دیوبند بھیجا گیا تو مولانا سندھی نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر آپ کے داخلے کے لیے لکھا جسے میں نے چوم کر بطور تبرک و نسخہ نجات اپنے پاس محفوظ کرلیا۔

میں نے یہ بات بھی براہ راست ان سے سنی کہ کابل کے عظیم الشان دربار میں جب سپاس نامہ پیش ہو چکا تو جوابی تقریر کے سلسلے میں ذرا سا میں تشویش کا شکار ہوا کہ روانی سے فارسی کیونکر بول سکوں گا؟ لیکن معاً میری توجہ مولانا مدنی کی طرف گئی اور پھر ایسا انشراح ہوا کہ کہنے کی بات نہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مجاز و خادم مولانا محمد اشرف سلیمانی پشاور یونیورسٹی نے دیوبند اور قاری صاحب کے باہمی تعلق پر خوب لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

" دارالعلوم کے فیض نے حضرت قاری صاحب کے جواہر باطنی کو تابانی بخشی اور ان کی خداداد استعداد کو نکھارا اور انھیں وہ بنایا جس سے پورے عالم میں ان کے کمالات کا اظہار ہوا۔ قاری صاحب نے دارالعلوم کی بقا، شہرت، نیک نامی اور ترقی و وسعت کے لیے زندگی صرف کر دی "۔ موصوف مزید فرماتے ہیں کہ:

قاری صاحب ہمارے پرانے دبستان علم کی فیروزمندیوں کا نشان، ہمارے قدیم نظام تعلیم کی کامیابی اور ثمرآوری کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

مولانا محمد اشرف کے اس دعوے کا ثبوت موصوف کی وہ متعدد تقاریر و خطابات ہیں جو جدید ترین اور ادق ترین مسائل پر علی گڑھ، دہلی اور دوسرے مقامات کی جامعات میں دیے گئے، جن میں سے ایک کا ذکر سائنس اور اسلام کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ پھر اس کا ثبوت آپ کی تصانیف کثیرہ ہیں، جن میں علم کی گہرائی، معلومات کی وسعت، نکتہ آفرینی اور ادبی چاشنی سب کچھ موجود ہے۔

اسلام اور مسیحی اقوام نامی آپ کی تصنیف کے متعلق مولانا محمد اشرف فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۱ء میں یہ کتاب پڑھی، اس کے نقوش آج تک دل و دماغ میں مرتسم ہیں۔ یہ پہلی کتاب تھی جس نے حضرت قاری

صاحب کی عظمت اور علما کی قدر دل پر ثبت کی ہے [۱]

دینی کتابوں کے متعلق ان کی مجموعی رائے یہ ہے: "ان کی تصانیف ان کے متکلمانہ، حکیمانہ اور عالمانہ انداز میں علوم و فیوض کا بحرِ ذخار ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری از خود اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیم کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے اور شک و ریب کی ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔

اسلام اور مسیحی اقوام کے علاوہ التشبہ فی الاسلام، فطری حکومت، اسلام اور فرقہ واریت، مشاہیر امت، شرعی پردہ، داڑھی کی شرعی حیثیت، مسئلۂ تقدیر، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، غیب، خاتم النبیین، اسلام اور مغربی تہذیب، اصولِ دعوت، اسلام — عالمی مذہب، کلمۂ حقیقت، نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر، آفتابِ نبوت، اجتہاد اور تقلید، حدیثِ رسول کا معیارِ قرآنی، اسلام کا اخلاقی نظام۔ یہ تمام کتابیں ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب ہندوستان اور پاکستان میں بار بار طبع ہو چکی ہے اور مانگ ہے کہ ختم نہیں ہوتی — ان مستقل تصانیف کے علاوہ آپ کی متعدد معرکۃ الآرا تقاریر خوب صورتی سے مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہیں، جن میں سائنس اور اسلام کے علاوہ شانِ رسالت، فلسفۂ نماز اور فلسفۂ طہارت نیز دعظِ یوسفی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

المختصر یہ کہ وہ اس شعر کا بجا طور پر مصداق تھے:

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی جامعیت عطا فرمائی تھی۔ شریعت و طریقت کی مجالس ہوں یا قدیم و جدید کی محافل، وہ ہر جگہ میر مجلس ہوتے اور ان کے وجود سے علمائے وقار اور عظمت کا لوگوں کو اعتراف کرنا پڑتا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ۔

---

[۱] البیان پشاور، اگست ۱۹۸۳

ترتیب و حواشی: محمد اسحاق بھٹی

مشاہیر کے تین غیر مطبوعہ مکتوبات

(۱) علامہ شبلی (۲) علامہ اقبال (۳) مولانا ابوالکلام آزاد

[بہاول پور سے جناب محمد کامران فاروقی نے از راہِ کرم "المعارف" میں اشاعت کے لیے تین خطوط کی فوٹو کاپیاں رسال کی ہیں۔ یہ خطوط انھیں مولوی فضل محمد مرحوم سابق ڈسٹرکٹ جج کے کتب خانے سے دست یاب ہوئے ہیں۔ نا میں سے ایک خط علامہ شبلی کا، ایک علامہ اقبال کا اور ایک مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ یہ تینوں خطوط یر مطبوعہ ہیں۔ پہلی دفعہ ان کی اشاعت کا فخر "المعارف" کو حاصل ہو رہا ہے۔ ہم جناب محمد کامران فاروقی کے شکر گزار ہیں کہ اکابر کے اس تبرک کی اشاعت کے لیے انھوں نے "المعارف" کو یاد فرمایا۔ (محمد اسحاق بھٹی)

— ۱ —

علامہ شبلی کا خط

۱۳۷۰

جنابِ من

السلام علیکم۔ والا نامہ آیا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ آپ فوراً قرآنِ مجید[۱] مذکور بھیج دیں، کتب خانہ ندوہ میں داخل کر دیا جائے گا اور میں مختصر سی کیفیت کے ساتھ اس کا ذکر اخبارات اور

---

[۱] معلوم ہوتا ہے قرآن مجید کا یہ نسخہ کسی خاص نوعیت اور اہمیت کا حامل تھا۔ یا تو بہت پرانا قلمی نسخہ ہوگا یا اس میں کوئی اور ندرت پائی جاتی ہوگی، اسی لیے علامہ شبلی نے اخبارات اور رسالہ "ندوہ" ںا اس سے متعلق کچھ لکھنا ضروری خیال کیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خط کس کے نام ہے۔ مولوی فضل محمد کے نام تو نہیں وگا، اس لیے کہ مولوی صاحب مرحوم نے ۲۲ جولائی ۱۹۸۳ کو بہاول پور میں وفات پائی اور یہ خط ۱۷ مارچ ۱۹۰۹ کا مکتوبہ ہے۔ خط تحریر کرتے وقت مولوی صاحب شاید سن و سال کے اعتبار سے اس پوزیشن میں نہیں ہوں گے کہ اکابر سے اس قسم کی خط و کتابت کر سکیں۔

رسالہ الندوہ میں کروں گا

شبلی ۱۷ مارچ ۱۹۰۹

—— ۳ ——

علامہ اقبال کا خط

Dr. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.
...................19

مخدومی جناب میر صاحب السلام علیکم۔

ایک بزرگ علامہ عبدالعزیز پلہاروی[۲] تھے جن کا انتقال ۱۲۶۰ ہجری میں ہوا۔ انھوں نے ایک رسالہ "سر السما" نام لکھا تھا جس کی تلاش مجھے ایک مدت سے ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ علامہ موصوف کا کتب خانہ ایک بزرگ مولوی شمس الدین بہاول پوری کے قبضے میں چلا گیا تھا[۳]۔ شاید مولوی شمس الدین ان کے کوئی عزیز تھے یا کیا؟ بہرحال اس عریضے کا مقصود یہ ہے کہ از راہ عنایت آپ مذکورہ بالا رسالے کی تلاش میں مجھے مدد دیں۔ قابل دریافت امر یہ ہے کہ کیا علامہ عبدالعزیز مرحوم کا کتب خانہ بہاول پور میں محفوظ ہے؟ ممکن ہے مولوی شمس الدین صاحب کے خاندان میں اس کتب خانے کی کتابیں محفوظ ہوں۔ اگر مولوی شمس الدین صاحب کے خاندان میں وہ کتب محفوظ ہیں تو رسالہ مذکورہ بالا ممکن ہے

---

۲ یہ علامہ عبدالعزیز پلہاروی نہیں "پرہیاروی" تھے، جو کوٹ ادو (ضلع مظفر گڑھ) کے ایک نواحی قصبہ "پرہاراں" میں سکونت پذیر تھے۔ ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے اور عالم جوانی ہی میں ۱۲۳۹ھ میں انتقال کر گئے۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے، ان کی ایک تصنیف "سر السما" بھی ہے، جس کا علامہ اقبال نے اس خط میں ذکر کیا ہے۔ (ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو، "المعارف" جون ۱۹۱۳ — راقم الحروف نے ان کا تذکرہ اپنی تصنیف "فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" کی جلد دوم میں کیا ہے، جو زیر طبع ہے)۔

۳ مولوی شمس الدین نے علامہ پرہیاروی کی ایک کتاب "الاکسیر" کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب طب کے موضوع پر ہے اور تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

ان کتب میں مل جائے۔ آپ مہربانی کر کے اپنے اثر و رسوخ کو اس مقصد کے لیے کام میں لائیں جس کے لیے میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔ اس کے علاوہ جو مقصد میرے زیرِ نظر ہے وہ قومی ہے انفرادی نہیں ہے۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔

مخلص محمد اقبال بیرسٹر لاہور[۴۰]

اس خط کے حاشیے پر مکتوب الیہ سراج الدین نے مندرجہ ذیل سطور لکھ کر مولوی سعید احمد کو بھیجا۔

۷۸۶

مہربان و عنایت گستر جناب مولوی سعید احمد صاحب

السلام علیکم۔ جناب ڈاکٹر اقبال صاحب کا یہ خط ہے جو میرے پاس آیا تھا۔ حسب طلب آپ کی ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

۳۰ نومبر ۱۹۳۰ سراج الدین غفرلہٗ از بہاول پور

۳

مولانا ابوالکلام آزاد کا خط

کلکتہ

۷ جون[؟] ۳۹ء

حبّی فی اللہ۔ معلوم ہوتا ہے آپ کی ڈاک کا انتظام درست نہیں ہے اور خطوط تلف ہوتے ہیں۔ یہاں سے متواتر دو خط آپ کے نام جا چکے ہیں۔ پہلا خط سکریٹری نے لکھا تھا، خط کی رسید اور میری علالت کی بنا پر اعتذار کہ جواب کے لیے کسی قدر توقف کیجیے۔ دوسرا میں نے لکھا تھا، غالباً

سے علامہ اقبال کے خط پر تاریخ درج نہیں۔ مکتوب الیہ جناب سراج الدین نے ۳۰ نومبر ۱۹۳۰ کو یہ خط ضروری کارروائی کے لیے ایک بزرگ مولوی سعید احمد کو بھیجا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے یہ خط اکتوبر یا نومبر ۱۹۳۰ کو لکھا ہوگا۔

سی دن جس دن آپ کا پہلا تار ملا۔ تعجب ہے آپ لکھتے ہیں اس وقت تک آپ کو جواب نہیں ملا۔
پ یہ خط احتیاطاً رجسٹرڈ بھیجا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبۂ خدمتِ علم و دین کو اور زیادہ کرے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سرِدست عربی کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ضروری حد تک اس کی تکمیل کر لیں۔ اگر یہ خانہ خالی رہ گیا تو نقشہ ناقص رہے گا۔ آپ تھوڑے عرصہ کے اندر یہ منزل طے کر لے سکتے ہیں۔

میں نے آپ سے بعض امور دریافت بھی کیے تھے، پھر انھیں دہراتا ہوں۔ انگریزی میں آپ کی طبیعت کو ادب سے مناسبت ہوئی یا نہیں؟ انگریزی ادبیات کے ذوق و مطالعہ کا کیا حال ہے؟ انگریزی میں تحریر و کتابت کی طرف طبیعت متوجہ رہی یا نہیں؟ کیا آپ دو چار مصنفوں کے نام لکھیں گے جن کے انشاء و اسلوبِ کتابت سے طبیعت خاص طور پر متاثر ہوئی ہے۔ ان امور سے تفصیل مطلع کیجیے۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابوالکلام کان اللہ لہ؎

؎ مندرجہ بالا تینوں خطوط میں سے اس خط کے علاوہ کسی خط پر مکتوب الیہ کا پتا درج نہیں۔ اس خط پر اردو اور انگریزی میں مکتوب الیہ کا یہ پتا درج ہے

رجسٹرڈ

مولوی فضل محمد صاحب
معرفت مولوی فیض محمد صاحب
ڈسٹرکٹ جج
بہاول نگر (بہاولپور اسٹیٹ)

R 455
CIRCUS
CALCUTTA

M. Fazal mohammad sb.
c/o M. Faiz Mohd sb.
Distt Judge
455/2014 Bahawal nagar
(Bhawalpore state

محمد عثمان صدیقی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ، قُلْنَا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، قَالَ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ، وَکَانَ مُتَّکِئًا فَجَلَسَ فَقَالَ اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ وَشَہَادَۃُ الزُّوْرِ، مَرَّتَیْنِ، فَمَا زَالَ یَقُوْلُہَا حَتّٰی قُلْتُ لَا یَسْکُتُ۔ (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر)۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ بہت بڑے بڑے گناہ کون سے ہیں؟ ہم نے عرض کیا، کیوں نہیں؟ اے اللہ کے رسول ضرور بتایئے۔ فرمایا۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔! اس وقت آپ ٹیک لگائے بیٹھے تھے، جس وقت یہ الفاظ ارشاد فرمائے تو سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ فرمایا، خبردار! جھوٹ بولنے اور جھوٹی گواہی دینے سے بچو۔ یہ لفظ آپ نے دو دفعہ فرمائے۔ اس کے بعد فرماتے چلے گئے۔ راوی کہتا ہے، آپ نے اس کثرت سے یہ لفظ ارشاد فرمائے کہ مجھے شبہ ہونے لگا شاید آپ سکوت نہیں فرمائیں گے۔

اس قسم کی اور بھی متعدد احادیث ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ گناہوں کی نشان دہی کی ہے اور ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ یہ حدیث اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں شرک باللہ اور والدین کی نافرمانی کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور ماں باپ کا جائز حکم ماننے سے انکار کرنا دونوں اکبر الکبائر کی تعریف میں آتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح طور سے ارشاد ہے:

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ط اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُہُمَآ اَوْ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلْ لَّہُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْہَرْہُمَا وَقُلْ لَّہُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ہ

(بنی اسرائیل: ۲۳)۔

یعنی تیرے رب نے تمہیں حکم دے دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت نہ کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن

سلوک کرو، اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی اف بھی نہ کہو اور نہ ڈانٹ ڈپٹ کرو، اور ان سے بات کرتے وقت ادب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھو۔

یہاں قرآن نے اللہ کی عبادت اور والدین کے ساتھ حسنِ معاملہ کو اکٹھا بیان فرمایا ہے ٹھیک اسی طرح آنحضرتؐ نے اللہ کے ساتھ شرک اور ماں باپ کی نافرمانی کو ایک ہی شے قرار دیا ہے۔ جس طرح شرک سے قباحتیں پھیلتی اور بے شمار برائیاں جنم لیتی ہیں، اسی طرح ماں باپ کی نافرمانی سے معاشرے میں ابتری پیدا ہوتی ہے۔ شرک کا خاصا یہ ہے کہ وہ اللہ سے انسان کے تعلق کو منقطع کرتا اور توحید کی نفی کرتا ہے۔ ہمت اور جرأت کے آثار کا خاتمہ کر کے بزدلی اور جبن کی فضا پیدا کرتا ہے۔ والدین کی نافرمانی سے اولاد ان کی دعاؤں سے محروم ہو جاتی ہے اور بالآخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسے ذلت اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ عواقب و نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں معصیتیں انتہائی نقصان اور خسران کا باعث بنتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی آنحضرتؐ نے جھوٹ بولنے اور جھوٹی گواہی دینے سے انتہائی سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ آپ نے کئی مقامات میں مختلف الفاظ اور پیرایۂ بیان میں کذب بیانی اور جھوٹی شہادت دینے سے لوگوں کو روکا ہے۔ جھوٹ بے شمار اخلاقی اور روحانی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح جھوٹی شہادت سے بھی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کئی خاندان متاثر ہوتے ہیں۔ غلط کردار آدمی اس سے بچ جاتے اور ناکردہ گناہ پھنس جاتے ہیں —— اسلام کا اصل مقصد لوگوں کو امن و امان اور سلامتی مہیا کرنا ہے، وہ اسی کی دعوت دیتا اور دنیائے انسانیت کو یہی راہ دکھاتا ہے، کیونکہ یہی سیدھی اور درست راہ ہے اور یہی کامرانی و کامیابی کی ضامن ہے۔ اگر وہ اس راہ کو ترک کر کے جھوٹ، فریب اور مکر و دجل کی راہ اختیار کرے گا تو ہر آن دھوکے میں مبتلا رہے گا۔ خود بھی ابتلا کا شکار ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کے منصوبے بناتا رہے گا۔

قلب کی صفائی، ذہن کی پاکیزگی اور قول و عمل کی برتری سچائی اور صدق کے ذریعے ابھرتی ہے۔ انسان جس قدر صادق القول ہوگا، اسی قدر معاشرے میں معزز و محترم گردانا جائے گا، اور جس قدر جھوٹا، غلط بیان، ماں باپ کا نافرمان اور احکامِ الٰہی سے روگردان ہوگا، اسی نسبت سے لوگوں کی نظروں میں مردود قرار پائے گا۔ کوئی شخص اس پر اعتبار نہیں کرے گا اور کسی کے دل میں اس کا وقار باقی نہیں رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو شرک سے دور رہنے، ماں باپ کی حکم عدولی سے بچنے، جھوٹ بولنے اور جھوٹی گواہی دینے سے انتہائی سخت الفاظ میں منع فرمایا ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

اردو نامہ، لاہور — اکتوبر ۱۹۸۳

اردو نثر اور یورپی اہل قلم	عطش درانی
سابق ریاست بہاول پور میں اردو بطور دفتری زبان (۱۸۷۴ء) کی دستاویزات کا جائزہ	محمد رمضان انور
مقابلے کا امتحان اور زبان کا مسئلہ	متیقن الرحمٰن
لسانی یک جہتی کے اقدامات	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

برہان، دہلی — اکتوبر ۱۹۸۳

گوہر حیات اور اس کے حصول کا بہترین ذریعہ	ڈاکٹر سید مسعود احمد
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے گم نام خلیفہ — حافظ عبدالنبی	مسعود انور علوی
الواح الصنادید	پروفیسر محمد اسلم
ماوردی، حیات اور کارنامے	احمد حسن

بینات، کراچی — نومبر ۱۹۸۳

قانونِ زکوٰۃ سے شیعوں کا استثنا	مولانا محمد اسحاق صدیقی
اسلامی جنگوں کی نوعیت	پروفیسر حبیب الرحمٰن
حضرت فاروق اعظم	ڈاکٹر محمد رشید فاروقی
مولانا شمس الحق افغانی	حافظ عبدالغفور
شہاب ثاقب کے متعلق ایک غلط فہمی	ڈاکٹر عبدالحمید بیگ

تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ — اکتوبر۔دسمبر ۱۹۸۳

عہد نبوی میں مدنی مسلم معیشت	ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی

اسلام کا تصورِ عبادت	ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی
زکوٰۃ کی معاشی اہمیت کے چند پہلو — امام ابن تیمیہ کی نظر میں	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی
سید شاہ مدن — اٹھارہویں صدی عیسوی کا ایک مجاہد	ڈاکٹر اقبال حسن
اقبال کا نظریۂ اجتہاد	ڈاکٹر عبدالمغنی
ترجمان الحدیث، لاہور — اکتوبر ۱۹۸۳	
مسنون عمرہ	مولانا محمد خالد سیف
نظریۂ پاکستان کا تاریخی ارتقا	عطا محمد جنجوعہ
تعمیرِ انسانیت، لاہور — نومبر ۱۹۸۳	
وحدتِ ملیہ اسلامیہ	علامہ جمال الدین افغانی
اسلامی معیشت	مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری
اسلامی ثقافت	ڈاکٹر نذیر احمد مغل
جامعہ، دہلی — اکتوبر ۱۹۸۳	
ادبی تنقید کی ایک نئی جہت	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
پروفیسر ہارون خاں شروانی	مسز نیرا سی لاہوتی
پنڈت موتی لال نہرو	پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم
ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی مدینہ یونیورسٹی میں ایک گفتگو	مولانا محمد عبدالملک جامعی
صوفیائے کرام اور ہندوستانی سماج	محمد الیاس قدوسی
جامعہ، دہلی — نومبر ۱۹۸۳	
[illegible]	شمیم حنفی
افکار	ضیاء الحسن فاروقی
قابوس نامہ عنصر المعالی	ڈاکٹر قمر رضا
فارسی ادب میں تنقید	ڈاکٹر شعیب اعظمی
چینی معیشت کمیون کے دور میں	ترجمہ: شعیب سعید انصاری

الحق، اکوڑہ خٹک — ستمبر ۱۹۸۳

بنگلہ دیش میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں — مولانا امین الحق قاسمی (بنگلہ دیش)

یورپ میں اصلاح مذہب کی تحریکیں۔ — پروفیسر سید علی محسن

فقہ اسلامی کی تدوین و ترتیب — قاضی اطہر مبارکپوری

مولانا پیر دل محمد حامدی — حافظ محمد ابراہیم فانی

زندگی، رامپور — اکتوبر ۱۹۸۳

تدبر قرآن پر ایک نظر — مولانا جلیل احسن ندوی

قرآن اور تشکیل کائنات — سید احمد قادری

اردو تعلیم کے ساتھ ستم ظریفی — پروفیسر محمد حیات خان غوری

سب رس، کراچی — اکتوبر ۱۹۸۳

نظری نظم کا قضیہ — ڈاکٹر زرین فرید

فاخر ہریانوی — سید مسعود ہاشمی

صراط مستقیم، برمنگھم (انگلستان) — اگست، ستمبر ۱۹۸۳

جشن ابراہیمی — ۴ بیت اللہ کی حقیقت — ———

اسلام ملت ابراہیم — محمود احمد میرپوری

دور حاضر میں اسلام کو پیش آمدہ مسائل — شہزادہ محمد نور الدین ترجمہ، حنیف اللہ [illegible]

فکر و نظر، اسلام آباد — ستمبر ۱۹۸۳

اسلامی ریاست عصر حاضر میں (مسلسل) — محمود احمد غازی

قربانی کی حقیقت — سیرت ابراہیم کی روشنی میں — ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

مشکل الحدیث — جاحظ کی البیان والتبیین کی روشنی میں — قاضی اظہار احمد تھانوی

فکر و نظر، اسلام آباد — اکتوبر ۱۹۸۳

اسلامی ریاست عصر حاضر میں (مسلسل) — محمود احمد غازی

انشورنس یا بیمہ — اس کی مروجہ صورتیں اور شرعی حل — حافظ محمد یونس

علمی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ	ڈاکٹر احسان حقی۔ترجمہ ساجدہ
یورپ میں اسلامی تہذیب کے اثرات	خالدہ اختر

محدث، لاہور — اکتوبر ۱۹۸۳

اسلامی دستور اور فقہی اختلافات	رفیق حسین نیازی ایڈووکیٹ

معارف، اعظم گڑھ — اکتوبر ۱۹۸۳

ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اثرات	قاضی زین العابدین میرٹھی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شعر وسخن کی قدردانی (مسلسل)	عبیداللہ کوٹی ندوی
ایک بین الاقوامی سیمینار کے سلسلے میں لندن کی ڈائری	سید صباح الدین عبدالرحمن

میثاق، لاہور — نومبر ۱۹۸۳

نوعِ انسانی کا واحد اور آخری سہارا	ڈاکٹر اسرار احمد
شرک اور اقسامِ شرک	ڈاکٹر اسرار احمد
تعلیم و تربیت کے اصول	مولانا وصی مظہر ندوی

چند نئی مطبوعات

لسان القرآن : مولانا محمد حنیف ندوی

یہ قرآن حکیم کا وہ جامع تفسیری و توضیحی لغت ہے جس میں مولانا محمد حنیف ندوی نے قرآن حکیم کے الفاظ ، مطالب اور معانی کو نہ صرف نکھار کر بیان کرنے کی گراں مایہ کوشش کی ہے بلکہ اس میں قرآن ، حدیث ، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ بھی لیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات ، تاریخ ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق ہے ۔ مختصر لفظوں میں قرآنی حکم و معارف کا یہ گنجینہ ہے ۔ پیرایۂ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعے سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

فقہائے برصغیر پاک و ہند : تیرھویں صدی ہجری

جلد اول محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر پاک و ہند کے حالات اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل ہے ۔ برصغیر کا یہ دور سیاسی لحاظ سے اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے اور پورا ملک انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا ہے ، مگر علمی اعتبار سے نہایت پر ثروت ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے ۔

حیات غالب : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ جدید اردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی اور قدیم اردو شاعری بھی اسی گہوارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب اسی مایہ ناز شاعر اور جلیل القدر ادیب کی سوانح حیات ہے ۔

پہلے یہ کتاب ''حکیم فرزانہ'' ہی کا ایک حصہ تھی ۔ مگر اب دونوں کو مختلف کتابوں میں پیش کیا گیا ہے ۔ ''حکیم فرزانہ'' کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ۔

مکمل فہرست کتب اور نرخ نامہ مفت طلب فرمائیں

معتمد ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

Some New Books

The Fatimid Theory of State

by

P.J. Vatikiotis

This study proposes to explore the possibilities of reconstructing a Fatimid Theory of State based, as strictly as possible, on the doctrinal and dogmatic writings of the Fatimid Ismailis. It is an attempt, in other words, at the evolution of a systematic political theory from Ismaili doctrinal teachings and an analysis of the Fatimid Caliphate itself. *Second revised edition.*

Muslim Thought : Its Origin and Achievements

by

M.M. Sharif

This handy and compact volume is meant to answer the question often asked if there is such a thing as Muslim thought. The author has mentioned only the most illustrious writers, their most outstanding works on philosophy or science and the most lasting aspects of their system.

The book obviously satisfies an urgent need.

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan

by

Dr S.M. Ikram

A scholarly account of the lives and activities of the leaders who enabled Muslim India to recover from the loss of political power culminating in the exile of the last Mughal Emperor in 1858, and who so guided its affairs as to lead to the establishment of the independent State of Pakistan. *Third revised edition.*